حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ۳۲ویں فقہی سمینار مؤرخہ 18 تا 20/نومبر 2023ء منعقدہ ''جامعہ الاسوۃ الحسنہ، شریعت کالج، پلاپٹی، ضلع کرور'' (تامل ناڈ) میں پیش کئے جانے والے علمی وتحقیقی مقالات اور مباحثات کا مجموعہ]

ایفا پبلیکیشنز-نئی دھلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل
مرتب	:	مفتی امتیاز احمد قاسمی
کمپوزنگ	:	شمیم اختر قاسمی
صفحات	:	۸۷۸
سن طباعت	:	۲۰۲۴ء
قیمت	:	۶۰۰/روپئے

باھتمام: اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

ناشر

ایفا پبلیکیشنز-نئی دھلی

161-ایف، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

ای میل: fiqhacademyindia@gmail.com

فون: 011 - 26981779

مجلس ادارت

۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی

۲- مولانا بدرالحسن قاسمی

۳- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۴- مولانا عتیق احمد بستوی

۵- مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست کتب

نمبر شمار	عنوان	نام	صفحہ نمبر
۱-	پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۳
	پہلا باب- تمہیدی امور		
۲-	فقہ اکیڈمی کے فیصلے		۱۷
۳-	سوالنامہ		۱۹
۴-	تلخیص مقالات	مفتی امتیاز احمد قاسمی	۲۲
۵-	عرض مسئلہ	مولانا کلیم اللہ عمری	۱۰۳
		مفتی امانت علی قاسمی	۱۲۷
		اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی	۱۳۳
	دوسرا باب- تفصیلی مقالات		
۱-	مال حلال وحرام کے احکام	مفتی محمد عثمان بستوی	۱۴۷
۲-	مال حرام اور مال مشتبہ سے متعلق بعض مسائل	مفتی اختر امام عادل قاسمی	۱۶۷
۳-	حرام کمائی سے متعلق چند مسائل	ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی	۱۸۴
۴-	کاروبار میں حرام کمائی	مفتی محمد سعید الرحمٰن قاسمی	۲۰۰
۵-	مال حرام- احکام ومسائل	مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی	۲۱۰

۶-	حرام کمائی سے متعلق بعض احکام	مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی	۲۲۷
۷-	حرام کمائی کی چند صورتوں کے احکام	مفتی اشتیاق احمد قاسمی	۲۳۸
۸-	حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل	مفتی عبدالرشید قاسمی	۲۴۹
۹-	حرام مال سے متعلق بعض اہم مسائل	قاضی وصی احمد قاسمی	۲۶۲
۱۰-	حرام کمائی سے متعلق چند مسائل	مفتی عبدالرزاق امروہی	۲۷۲
۱۱-	حلال وحرام کاروبار- احکام ومسائل	مولانا عبیداللہ ندوی	۲۸۴
۱۲-	حرام مال سے متعلق بعض احکام	مفتی امانت علی قاسمی	۳۰۳
۱۳-	حلال وحرام کمائی سے متعلق بعض اہم مسائل	مفتی محمد جمیل اختر جلیلی ندوی	۳۱۶
۱۴-	فقہ اسلامی میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مولانا محمد صابر حسین ندوی	۳۲۶
۱۵-	مال حرام سے متعلق چند مسائل	مفتی محمد سلیم الدین قاسمی	۳۳۸
۱۶-	حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی مفتاحی	۳۵۱
۱۷-	مجبوری میں مالِ حرام سے انتفاع کا حکم	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۳۶۱
۱۸-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی شکیل منصور القاسمی	۳۷۴
۱۹-	مال حرام- مسائل واحکام	مفتی محمد مغفور باندوی	۴۰۶
۲۰-	حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل	مولانا عبدالاحد قاسمی جہان آبادی	۴۲۴
۲۱-	حرام کمائی سے متعلق بعض اہم مسائل	مولانا محمد نثار عالم ندوی	۴۴۴
۲۲-	معیشت وتجارت میں حرام مال کے اثرات سے متعلق مسائل	مفتی محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۴۵۴
۲۳-	مالِ حرام سے متعلق چند مسائل	مفتی محمد شفیق بڑودوی غفرلہٗ	۴۶۴
۲۴-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی اکرم رشید رحمانی	۴۷۵
۲۵-	مال حرام سے متعلق بعض سوالات کے جوابات	مولانا محمد ممتاز خان ندوی	۴۸۷

۲۶-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مولانا سعید احمد ندوی	۴۹۹
۲۷-	حرام کاروبار وملازمت سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد اشرف قاسمی	۵۱۱
۲۸-	حلال وحرام تجارت وملازمت-احکام ومسائل	مفتی محمد زبیر ندوی بہرائچی	۵۲۴
۲۹-	حرام مال سے متعلق بعض اہم مسائل	مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی	۵۳۸
۳۰-	حرام کمائی سے متعلق مسائل اوران کا شرعی حل	قاضی محمد مطیع الرحمٰن قاسمی	۵۵۱
۳۱-	شریعت میں حرام کمائی سے متعلق احکام	مولانا روح الامین سعادتی	۵۶۵
۳۲-	حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل اوران کا حل	قاضی محمد ریاض ارمان القاسمی	۵۷۵
۳۳-	مال حرام سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد الیاس قاسمی	۵۸۷
۳۴-	حرام مال سے متعلق بعض مسائل کا مدلل ومفصل جواب	مولانا محمد عمار مزمل القاسمی، اڑیسہ	۵۹۹
۳۵-	حرام کمائی سے متعلق چند اہم مسائل	مولانا عبدالحکیم عبدالرحیم قاسمی پالنپوری	۶۰۹
۳۶-	حرام کمائی سے متعلق بعض سوالات کے مدلل ومفصل جوابات	مفتی محمد صالح الزماں قاسمی ازہری	۶۱۸
۳۷-	اسلامی شریعت میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی	۶۲۸
۳۸-	حرام تجارت وملازمت سے متعلق بعض احکام	مفتی صفوان احمد حلیمی قاسمی	۶۴۱
۳۹-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی أبو محمد، محمد سعد نور القاسمی	۶۵۴
۴۰-	مال حرام سے متعلق چند مسائل	مولانا احمد مکین	۶۶۶

تیسرا باب-مختصر تحریریں

۱-	حرام کمائی سے متعلق مسائل	ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی	۶۸۱
۲-	حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل	مفتی حبیب اللہ قاسمیؔ	۶۸۴
۳-	مال حرام سے متعلق چند مسائل	مولانا مفتی جمیل احمد نذیری	۶۸۹
۴-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد عفان منصور پوری	۶۹۵

۵-	مال حرام و مال مشتبہ- احکام و مسائل	ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۷۰۲
۶-	حرام کمائی کے چند شرعی مسائل	مفتی راشد حسین ندوی	۷۱۰
۷-	حلال و حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مولانا رحمت اللہ ندوی	۷۱۶
۸-	حرام کاروبار سے متعلق چند مسائل	مفتی محمد مقصود فرقانی	۷۲۵
۹-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مولانا خورشید احمد مفتاحی	۷۲۹
۱۰-	شریعت میں حرام کمائی سے متعلق چند مسائل	مفتی نثار احمد گودھروی، گجراتی	۷۳۳
۱۱-	مال حرام سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد شاکر نثار مدنی اعظمی	۷۳۹
۱۲-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مولانا محمد عثمان قاسمی	۷۴۷
۱۳-	حرام تجارت و ملازمت سے متعلق احکام	مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی	۷۵۶
۱۴-	حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل	حافظ سید فاروق عمری مدنی	۷۶۴
۱۵-	فقہ اسلامی میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی خلیل احمد، گجرات	۷۷۳
۱۶-	مال حرام سے متعلق چند مسائل	مولانا محمد صادق مبارک پوری	۷۷۹
۱۷-	حرام آمدنی و اُس کے متعلقات کا حکم	مفتی سید محمد علی مدنی	۷۸۶
۱۸-	اسلامی فقہ میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی ارشاد عالم صاحب	۷۹۱
۱۹-	مشتبہ و حرام کمائی سے متعلق چند مسائل	مفتی محمد مدثر قاسمی	۷۹۶
۲۰-	حرام کمائی سے متعلق بعض احکام	مولانا رضی احمد رحمانی ندوی	۸۰۱
۲۱-	حلال و حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد ابوبکر قاسمی عفا اللہ عنہ	۸۰۶
۲۲-	حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل کا تحقیقی جائزہ	مفتی راسخ الاسلام صاحب قاسمی اریاوی	۸۱۱
۲۳-	فقہ اسلامی میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد برکت علی قاسمی عفی عنہ	۸۱۸
۲۴-	معیشت و تجارت میں حرام مال کے اثرات	مفتی نیاز احمد ندوی	۸۲۳
۲۵-	حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل	مفتی محمد اطہر حسین رشیدی قاسمی	۸۲۹

۲۶-	حرام کمائی سے متعلق چند مسائل	مفتی محمد ابراہیم بن سلیمان وتیتھی فلاحی	۸۳۵
۲۷-	حرام کاروبار سے متعلق بعض احکام	مفتی کامران سعید رشادی	۸۴۳
۲۸-	مال حرام سے متعلق بعض احکام	مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی	۸۵۱
۲۹-	حرام اشیاء کے متعلق بعض مسائل	مولانا محمد ارشد ربانی مکی احمد	۸۵۴
۳۰-	حرام مال سے متعلق بعض مسائل	محمود اختر کیفی ابن حافظ محبوب عالم صاحب	۸۵۶
	باب چہارم- اختتامی امور		
	مناقشہ		۸۶۱

☆☆☆

پیش لفظ

اکیڈمی کا ۳۲ واں سمینار جنوبی ہند کے شہر پلا پٹی، تمل ناڈو کی درسگاہ جامعۃ الاسوۃ الحسنہ میں ۱۸-۲۰ رنومبر ۲۰۲۳ء کومنعقد ہوا تھا، ہر سمینار میں کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی موضوع میزبان کی خواہش کے مطابق رکھا جائیاور وہ اپنے علاقہ کے مسائل کوسامنے رکھتے ہوئے جوموضوع پیش کرتے ہیں ان کوسمینار میں شامل رکھ۔ جاتا ہے، اس سمینار میں میزبان نے ایک اہم موضوع رکھا جوحقیقت یہ ہے کہ صرف اس علاقہ کانہیں بلکہ پورے ملک کا بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا ہے اور وہ یہ ہے انسان کی زندگی میں جیسے صحت ودولت وثروت اور تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے نشیب وفراز آتا رہتا ہے، اسی طرح عقیدہ و عمل میں صلاح وفساد کی کیفیت بھی پیش آتی رہتی ہے۔ بعض دفعہ افراد اور خاندان پہلے علم دین سے محروم تھا، دینی تنظیموں اور جماعتوں سے بے تعلق تھا، علماء سے رابطہ نہیں تھا، پھر بعد میں صورتحال بدلتی گئی وہ شریعت کے احکام سے آشنا ہوتے رہے، دینی اداروں اور جماعتوں سے ان کا رابطہ استوار ہوتا رہا، اچھے لوگوں کی صحبت میں اکثر آتی ہے اور وہ خود اپنی اصلاح کرتے ہیں، وہ حرام اور گناہ سے بچنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے سے ان کی کمائی میں ایسا مال موجود ہوتا ہے جو شرعاً جائز نہیں یا تو وہ مال کمایا ہوا ہوتا ہے یا موروثی طور پر ان کو حاصل ہوتا ہے یا دوست واحباب اور اقارب کے پاس ایسا مال ہوتا ہے اور ان کو وہاں دعوت وغیرہ کھانی ہوتی ہے تو ایسی صورت میں اس کا کیا عمل ہونا چاہئے۔ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ حرام ہے یا حرام طریقہ سے حاصل کیا ہوا ہے بحیثیت مسلمان اس سلسلہ میں اس کا کیا درجہ ہونا چاہئے۔

چنانچہ میزبان کے ذریعہ اس عنوان کو سمینار میں زیر بحث لایا گیا، اہل علم نے مقالات لکھے اور پھر ان موضوعات پر بحث ہوئی اور اتفاق رائے سے بہت ہی متوازن قابل عمل اور مزاج شریعت سے ہم آہنگ تجاویز منظور ہوئیں۔ اکیڈمی کے ۳۲ ویں فقہی سمینار میں ان مقالات کا مجموعہ شائع کیا جاتا ہے جس کو اکیڈمی کے شعبہ علمی کے رفیق عزیز مکرم مفتی امتیاز احمد قاسمی صاحب نے مرتب کیا ہے اور محنت وتوجہ کے ساتھ اس کی پروف ریڈنگ کی ذمہ داریاں انجام دی ہیں اور مولانا منظور الرحمٰن صاحب مہتمم جامعہ قاسمیہ بالا ساتھ اس کے اپنے مؤقر ادارہ سے شائع کر رہے ہیں، ادارہ ان دوستوں کا بہت شکر گزار ہے اور ان کے حق میں دعاء گو ہے کہ ان کو زیادہ سے زیادہ دینی وعلمی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

پہلا باب

تمہیدی امور

فقہ اکیڈمی کے فیصلے:

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۳۲ویں فقہی سمینار منعقدہ ۱۸-۲۰ رنومبر ۲۰۲۳ء بمقام جامعۃ الاسوۃ الحسنۃ پلاپٹی تمل ناڈو میں ''حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل'' پر غور وخوض اور بحث ومناقشہ کے بعد درج ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

۱۔(الف) حرام (سود، غصب، رشوت، چوری، جوا، سٹہ اور عقد باطل) کے ذریعہ حاصل شدہ مال قطعی حرام ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ اصل مالک کو لوٹا دیا جائے اور اگر اصل مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو دفع وبال کی نیت سے غرباء میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

(ب) اس طرح کا مال اگر وراثت میں حاصل ہوا ہو اور اس کا مالک معلوم ہو، نیز واپس کرنا ممکن ہو تو مالک تک اس کا پہنچانا ضروری ہے، اور اگر مالک معلوم نہ ہو یا معلوم ہو، لیکن اس تک پہنچانا ممکن نہ ہو تو اس مال کو بھی فقراء میں تقسیم کرنا واجب ہے۔

(ج) اگر وارث نے وراثت میں ملے ہوئے مال حرام سے کاروبار کیا تو اس کی آمدنی حلال ہوگی؛ البتہ حرام مال کے بقدر اس پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

۲۔ اگر شوہر یا بیٹا کی پوری یا اکثر آمدنی حرام ہو اور عورت کے پاس گذارے کی کوئی اور صورت نہ ہو تو اس مجبوری کی صورت میں شوہر یا بیٹے کے مال کو استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

۳۔ جس شخص کی تعلیم مال حرام سے ہوئی ہو وہ تعلیم پانے کے بعد کوئی جائز ملازمت کرے تو اس کی آمدنی حلال ہے؛ البتہ بہتر ہے کہ کمائی کے بعد مال حرام کے بقدر حرام کی تلافی کی نیت سے صدقہ کردے۔

۴۔ اگر کسی کے پاس حلال وحرام دونوں مال ہو اور دونوں الگ الگ ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ حلال مال سے ہی خرچ کر رہا ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا اور اس سے ہدیہ لینا جائز ہے، اگر متعین طور پر معلوم ہو کہ مال حرام سے دعوت کر رہا ہے تو اس کو قبول کرنا جائز نہیں ہوگا، اگر حلال وحرام مخلوط ہو جائے تو جو وہ اپنے حلال حصے کے بقدر مال میں سے پیش کرے اس کو قبول کرنا درست ہے، اور اگر اس کا علم نہ ہو، لیکن حرام مال غالب ہو تو اس کے یہاں دعوت قبول کرنا یا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے۔

۵۔ اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ دعوت کرنے والے کا مال حرام تھا اس لئے اس نے دعوت کھالیا اور بعد میں معلوم ہوا تو اب توبہ واستغفار کرے اور بہتر ہے کہ کھانے کے بقدر مال صدقہ کردے۔

۶۔ اگر کسی کے پاس حرام مال ہو اور اب وہ جائز کاروبار کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کو غیر سودی قرض نہیں مل رہا ہے اور تمام مال کو صدقہ کرنے میں شدید حرج ہے، تو اسی مال سے کاروبار کرنے کی گنجائش ہے اور بعد میں اس کو صدقہ کردینا واجب ہے۔

۷۔ اگر کسی شخص کو دوران ملازمت جائز وناجائز دونوں طرح کے کام کرنے پڑتے ہوں اور کسی بھی شعبہ میں کام کرنا نادر نہ ہو تو ایسی ملازمت ناجائز ہے۔

۸۔ فروخت شدہ سامان کی قیمت، گاڑی یا مکان کا کرایہ اور کسی طرح کی فیس وغیرہ ایسے شخص سے وصول کرنا جائز ہے جس کا ذریعہ آمدنی بظاہر حرام ہے۔

۹۔ سودی رقم کو کسی طرح کے بھی ذاتی مفاد میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

''اکیڈمی کا ۳۲/واں فقہی سمینار ضلع کرور (تامل ناڈو) میں منعقد ہورہا ہے، اکیڈمی کی روایت رہی ہے کہ جہاں سمینار منعقد ہوتا ہے، وہاں کے میزبانوں کے مشورہ سے اس جگہ کی ضرورت کے مطابق بعض سوالات رکھے جاتے ہیں، لہذا میزبانوں سے اس سلسلہ میں درخواست کی گئی، انھوں نے ایک سوالنامہ بھیجا، جن میں بعض مسائل پر گزشتہ سمیناروں میں تفصیلی بحث ہوچکی ہے؛ اس لئے ان کو حذف کرتے ہوئے ضروری ترمیم و تبدیلی کے ساتھ یہ سوالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال ہے''۔

ہمارے علاقے میں آزادی سے پہلے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی جاری کیا گیا تھا اور اس بنیاد پر غیر مسلموں سے سود لینے کی اجازت دی گئی تھی، اس کے نتیجہ میں حرام کاروبار کا دروازہ کھل گیا، ملک کے آزاد ہونے کے بعد اس سلسلہ میں علماء کی رائے تبدیل ہوگئی، انھوں نے ہندوستان کو دارالامن قرار دیا اور سود کو منع کیا؛ لیکن لوگوں کو سودی کاروبار کی عادت پڑ گئی تھی، اس سے نجات نہیں مل سکی؛ چنانچہ یہاں کے بہت سے لوگ حرام کاروبار میں ملوث ہیں، اس پس منظر میں چند سوالات پیش خدمت ہیں:

۱- ایک آدمی فی الحال حلال کاروبار کررہا ہے؛ لیکن اس کے آباء واجداد اس حرام کاروبار میں ملوث تھے، اس کو معلوم ہے کہ اس حرام کاروبار کا مال اس کو وراثت میں ملا ہے؛ مگر اسی سے وہ اب حلال کاروبار کررہا ہے، اور گھر جائیداد بھی اسی کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے؛ لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سود کا پیسہ آزادی سے پہلے کمایا ہوا ہے یا آزادی کے بعد، تو اس کی کمائی حلال ہے یا حرام؟۔

۲- ایک غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائیداد اور مال، حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اسی حرام جائیداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، اب جو کچھ اس کے پاس موجود ہے اس کا کیا حکم ہے؟۔

۳- شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کررہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے، اور اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس عورت کو

کیا کرنا چاہئے؟ یا حرام کمائی سے اپنے بچے کو خوب پڑھایا، لکھایا، اعلیٰ تعلیم دی، اب پڑھنے کے بعد بچہ کمائی کر رہا ہے، اس کمائی کا کیا حکم ہے؟۔

۴- اکثر بستی والے شادی بیاہ اپنی بستی کے اندر ہی کرتے ہیں، اور زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے شادی وغیرہ میں جب دعوت دیتے ہیں تو ہم کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے، یا آدھا حصہ حرام اور آدھا حلال ہے، تو اس وقت اس کی دعوت میں کھانے کا کیا حکم ہے؟

۵- کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو وہ کس طرح اس کی تلافی کرے؟

۶- کیا پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ ہے؟۔

۷- ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے، وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے؛ لیکن تجارت کرنے کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں تو اپنے اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرض کو صدقہ کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟۔

۸- ایک آدمی کا بزنس آدھا حلال ہے اور آدھا حرام، اب اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصہ کا کام کرنا پڑتا ہے، جیسے: کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہے، یا دونوں کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہے، یا دونوں کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہے، تو اس کا کیا حکم ہے؟۔

۹- حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے جیسے کھیتی باڑی کا کیا حکم ہے، اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا کیا حکم ہے، یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا کیسا ہے، نیز حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا کیسا ہے؟

۱۰- آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے ایک خطیر رقم رشوت دے کر لی جاتی ہے، کیا اس پر سود کی رقم کا استعمال جائز ہے؟

۱۱- کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو، اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام؟ ناگواری اور اختلاف کا باعث بنتا ہے، تو کیا پوچھے بغیر یہ ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے؛ حالانکہ اس کے حرام ہونے کا بھی امکان ہے، اسی طرح بچوں کو کوئی ٹافی وغیرہ دے دیتا ہو، کبھی پانی چائے پلاتا ہو اور کبھی ضروری چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو؛ لیکن اس شخص کی کمائی کیسی ہے، معلوم نہیں، تو ایسی صورت

میں اس چیز کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

۱۲- جس کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کرنے کے لئے کہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی امتیاز احمد قاسمی☆

إن الحمد لله و الصلاة والسلام على رسول الله و على آله و صحبه أجمعين۔

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بتیسویں فقہی سمینار میں جن تین اہم موضوعات پر بحث وتحقیق اور مناقشہ ہونا ہے ان میں ایک موضوع ''حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل'' ہے، جس میں کل بارہ سوالات قائم کئے گئے ہیں، اور اہل علم وتحقیق اور مفتیان کرام سے گزارش کی گئی تھی کہ وہ ان سوالات کا مفصل جواب قرآن وسنت، آثار صحابہ، اجتہادات فقہاء کی روشنی میں تحریری فرمائیں۔

چنانچہ اکیڈمی کو اس موضوع پر کل ۲۷ مقالات موصول ہوئے جن کی تلخیص کی ذمہ داری اکیڈمی نے مجھے دی ہے، تاکہ شرکاء سمینار ایک دوسرے کی آراء اور دلائل سے واقف ہوسکیں، ان مقالات میں سے بعض بہت مفصل ہیں، جس میں موضوع کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کا احاطہ ہے، بلکہ بہت سے متعلقات بھی ذکر کئے ہیں جن سے اصل مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، بعض مفصل ہیں اور سوالات کے مکمل جوابات مع دلائل موجود ہیں، بعض مقالے مختصر ہیں، جبکہ بعض مقالے ایسے ہیں جو اس موضوع پر تو ہیں، لیکن ترتیب وار جوابات نہیں دیئے گئے اور نہ ہی اپنی آراء کا خلاصہ درج کیا ہے۔

خوش آئند بات یہ ہے کہ اس موضوع کے اکثر سوالات پر مقالہ نگار حضرات کا اتفاق رائے ہے، بہت کم ایسے سوال ہیں جن پر اختلاف رائے ہے، اسی لئے ہر سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کے نام درج نہیں کئے گئے ہیں، البتہ دلائل کے ساتھ مقالہ نویس حضرات کے نام درج کئے گئے ہیں، اسی طرح کسی مقالہ نگار کی رائے مختلف ہوئی یا کوئی خاص بات نظر آئی تو اس کو اخیر میں درج کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ کسی کی رائے درج ہونے سے نہ رہ جائے، مقالہ نگار کے اسماء گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی،

☆ باحث اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی محمد عثمان بستوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا اشتیاق احمد قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہوی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا صابر حسین ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد شاکر نثار مدنی اعظمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی ارشاد عالم، مولانا محمد تبریز حلیمی قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی سید محمد علی مدنی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی مفتاحی، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا روح الامین سعادتی، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا اکرر شید رحمانی، مولانا فیاض احمد محمود برمارے، مولانا رضی احمد رحمانی ندوی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی محمد شفیق بڑودوی، مفتی خلیل احمد، مفتی سعید احمد ندوی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، حافظ سید فاروق عمری ندوی، مولانا عبدالحکیم ابن مولانا عبدالرحیم، مولانا حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی محمد ابراہیم بن سلیمان وریٹھی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مولانا صفوان احمد حلیمی قاسمی، مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی، مفتی محمد صالح الزماں قاسمی، مفتی نیاز احمد ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی کامران سعید رشادی، مولانا احمد مکین، مفتی محمد شہاب الکوثری، مفتی شفیق الکوثری، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، خواجہ نظام الدین یوسفی، مولانا محمد مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مولوی محمد ارشد ربانی مکی احمد، مولوی محمود اختر کیفی، مفتی ضیاء الحق قاسمی، مولانا محمد عمار مزمل قاسمی، ڈاکٹر مولوی عبدالہادی الباقوی قاسمی، مفتی محمد برکت علی قاسمی۔

سوال نمبر ۱: ایک آدمی فی الحال حلال کاروبار کر رہا ہے؛ لیکن اس کے آباء واجداد اس حرام کاروبار میں ملوث تھے، اس کو معلوم ہے کہ اس حرام کاروبار کا مال اس کو وراثت میں ملا ہے؛ مگر اسی سے وہ اب حلال کاروبار کر رہا ہے، اور گھر جائیداد بھی اسی کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے؛ لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سود کا پیسہ آزادی سے پہلے کمایا ہوا ہے یا آزادی کے بعد، تو اس کی کمائی حلال ہے یا حرام؟

اس سوال کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ وراثت میں ملا ہوا مال یا اتنی مقدار حرام ہے تو اصول شرع کا تقاضا ہے کہ حرام مال اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے اور لوٹانا ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب اس مال حرام کو فقراء ومساکین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔

لیکن حرام مال دوسرے حلال مال کے ساتھ مخلوط ہو، حلال وحرام غیر متمیز ہو تو وہ مال اور اس سے حاصل شدہ منافع حلال ہوں گے، البتہ احتیاط اور دیانت کا تقاضہ یہ ہے کہ مشتبہ اور مخلوط مال کے بقدر آہستہ آہستہ صدقہ کر دیا جائے۔

مقالہ نگاران نے مندرجہ ذیل فقہی عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

☆ علامہ حصکفیؒ تحریر فرماتے ہیں: "وعلى هذا لو مات مسلم وترك ثمن خمر باعه مسلم لا يحل لورثته، كما بسطه الزيلعي وفي الأشباه: الحرمة تنتقل مع العلم إلا للوارث إلا إذا علم ربه، ولكن في المجتبى: مات وكسبه حرام، فالميراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية، وهو حرام مطلقا على الورثة، فتنبه" (الدرالمختار مع ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ ۶/۳۸۵)۔

☆ علامہ ابن عابدین شامیؒ اس کی شرح میں رقم طراز ہیں: "قوله باعه مسلم عدل عن قول الزيلعي: باعه هو، يشمل ما إذا كان البائع هو المسلم الميت أو مسلم غيره بالوكالة عنه.....وعلى هذ قالو: لو مات الرجل وكسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئا وهو أولى بهم ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه الخ، قوله وفي الأشباه.....: قال الشيخ عبد الوهاب الشعراني في كتاب المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى إلى ذمتين، سألت عنه الشهاب ابن الشلبي فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك، أما من رأى المكاس يأخذ من أحد شيئا من المكس، ثم يعطيه آخر، ثم يأخذه من ذلك الآخر فهو حرام اھ....."قوله: وهو حرام مطلقا على الورثة" أي: سواء علموا أربابه أولا، فإن علموا أربابه رد وه عليهم، وإلا تصدقوا به.....ولا يشكل ذلك بما قدمنا آنفا عن الذخيرة والخانية؛ لأن الطعام أو الكسوة ليس عين المال الحرام؛ فإنه إذا اشترى به شيئا يحل أكله، على تفصيل تقدم في كتاب الغصب، بخلاف ما تركه ميراثا؛ فإنه عين المال الحرام، وإن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام فإنه لا يحل له التصرف فيه قبل أداء ضمانه، وكذا لوارثه، ثم الظاهر أن حرمته على الورثة في الديانة لا الحكم..... "قوله: فتنبه" أشار به إلى ضعف ما في الأشباه" (ابن عابدین، ردالمحتار، کتاب الحظر، فصل في البیع ۶/۳۸۶، بیروت، دارالفکر، ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۰ء)

مقالہ مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد راشد ندوی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی عبدالرزاق امروہوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مولانا قمرالزماں ندوی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی روح الامین سعادتی، مفتی شفیق بڑودوی، مفتی گودھروی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی خلیل احمد، مولانا نیاز احمد، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی

زبیر ندوی وغیرہ۔

☆ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

"مطلب فيمن ورث مالا حراما قوله (إلا فى حق الوارث الخ) أى فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له لكن إذا علم المالک بعينه فلا شک فى حرمته ووجوب رده عليه وهذا معنى قوله وقيده فى الظهيرية الخ ، وفى منية المفتى مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لا يحل ولكن لا يعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه ا هـ وكذا لا يحل إن علم عين الغصب مثلا وإن لم يعلم مالكه لما فى البزازية أخذ مورثه رشوة أو ظلما إذا علم ذلک بعينه لا يحل له أخذه وإلا فله أخذه حكما أما فى الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء ا هـ والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه ففى الذخيرة سئل الفقيه أبو جعفر عمن اكتسب ماله من أمراء السلطان ومن الغرامات المحرمات وغير ذلک هل يحل لمن عرف ذلک أن يأكل من طعامه قال أحب إلى فى دينه أن لا يأكل ويسعه حكما إن لم يكن ذلک الطعام غصبا أو رشوة وفى الخانية امرأة زوجها فى أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلک الطعام غصبا فهى فى سعة من أكله وكذا لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهى فى سعة من تناوله والإثم على الزوج ا هـ قوله (وسنحققه ثمة) أى فى كتاب الحظر والإباحة قال هناک بعد ذكره ما هنا لكن فى المجتبى مات وكسبه حرام فالميراث حلال ثم رمز وقال لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقا على الورثة فتنبه ا هـ ح ومفاده الحرمة وإن لم يعلم أربابه وينبغى تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه إذ لو اختلط بحيث لا يتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف فيه ما لم يؤد بدله كما حققناه قبيل باب زكاة المال فتأمل (ردالمحتار علی الدرالمختار ۵/ ۹۹، طبع بیروت) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ فتاوی ہندیہ میں ہے:

اخْتَلَفَ الناس فى أَخْذِ الْجَائِزَةِ من السُّلْطَانِ قال بَعْضُهُمْ يَجُوزُ ما لم يَعْلَمْ أَنَّهُ يُعْطِيهِ من حَرَامٍ قال مُحَمَّدٌ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى وَبِهِ نَأْخُذُ ما لم نَعْرِفْ شيئا حَرَامًا بِعَيْنِهِ وهو قَوْلُ أبى حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى

وَأَصْحَابِهِ كَذَا فی الظَّهِيرِيَّةِ وفی شَرْحِ حِيَلِ الْخَصَّافِ لِشَمْسِ الْأَئِمَّة رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى أَنَّ الشَّيْخَ أَبَا الْقَاسِمِ الْحَكِيمَ كان يَأْخُذُ جَائِزَةَ السُّلْطَانِ وكان يَسْتَقْرِضُ لِجَمِيعِ حَوَائِجِهِ وما يَأْخُذُ من الْجَائِزَةِ يَقْضِي بها دُيُونَهُ وَالْحِيلَةُ فی هذه الْمَسَائِلِ أَنْ يَشْتَرِيَ نَسِيئَةً ثُمَّ يُنْقَدُ ثَمَنَهُ من أَيِّ مَالٍ شَاءَ وقال أبو يُوسُفَ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى سَأَلْتُ أَبَا حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى عن الْحِيلَةِ فی مِثْلِ هذا فَأَجَابَنِی بِمَا ذَكَرْنَا كَذَا فی الْخُلَاصَةِ وَلَا يَنْبَغِی لِلنَّاسِ أَنْ يَأْكُلُوا من أَطْعِمَةِ الظَّلَمَةِ لِتَقْبِيحِ الْأَمْرِ عليهم وَزَجْرِهِمْ عَمَّا يَرْتَكِبُونَ وَإِنْ كان يَحِلُّ كَذَا فی الْغَرَائِبِ وَسُئِلَ أبو بَكْرٍ عن الذی لَا يَحِلُّ له أَخْذُ الصَّدَقَةِ فَالْأَفْضَلُ له أَنْ يَقْبَلَ جَائِزَةَ السُّلْطَانِ وَيُفَرِّقَهَا على من يَحِلُّ له أو لَا يَقْبَلَ قال لَا يَقْبَلُ لِأَنَّهُ يُشْبِهُ أَخْذَ الصَّدَقَةِ قِيلَ أَلَيْسَ إنَّ أَبَا نُصَيْرٍ أَخَذَ جَائِزَةَ إسْحَاقَ بن أَحْمَدَ وَإِسْمَاعِيلَ قال كانت لَهُمَا أَمْوَالٌ وَرِثَاهَا عن أَبِيهِمَا فَقِيلَ له لو أَنَّ فَقِيرًا يَأْخُذُ جَائِزَةَ السُّلْطَانِ مع عِلْمِهِ أَنَّا لسُّلْطَانَ يَأْخُذُهَا غَصْبًا أَيَحِلُّ له قال إنْ خَلَطَ ذلک بِدَرَاهِمَ أُخْرَى فإنه لَا بَأْسَ بِهِ وَإِنْ دَفَعَ عَيْنَ الْمَغْصُوبِ من غَيْرِ خَلْطٍ لم يَجُزْ قال الْفَقِيهُ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى هذا الْجَوَابُ خَرَجَ على قِيَاسِ قَوْلِ أبی حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى لِأَنَّ من أَصْلِهِ أَنَّ الدَّرَاهِمَ الْمَغْصُوبَةَ من أُنَاسٍ مَتَى خُلِطَ الْبَعْضُ بِالْبَعْضِ فَقَدْ مَلَكَهَا الْغَاصِبُ وَوَجَبَ عليه مِثْلُ ما غَصَبَ وَقَالَا لَا يَمْلِكُ تِلْكَ الدَّرَاهِمَ وَهِيَ على مِلْكِ صَاحِبِهَا فَلَا يَحِلُّ له الْأَخْذُ كَذَا فی الْحَاوِی لِلْفَتَاوَی (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۴۲) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ "والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه" (ردالمحتار مع الدر المختار ۷/ ۳۰۱) مفتی امانت علی قاسمی، مولانا عفان منصور پوری، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد راشد ندوی، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا اکرم رشید رحمانی، مفتی رضی احمد رحمانی وغیرہ۔

☆ علامہ حموی فرماتے ہیں:

"قوله إلا فی حق الوارث الخ،قيل:عليه يخالفه ما فی البزازية:أخذ مورثه رشوة أو ظلما، إن علمه ذلک بعينه لا يحل له أخذه، وإن لم يعلمه بعينه له أخذه حكما، فأما الديانة فيتصدق به بنية الخصماء۔

قوله: وقيده فی الظهيرية، أی الاستثناء المذكور، وحاصله أنه حلال للوارث بشرط أن لا يعلم أرباب الأصول، فإن علم وجب عليه رد كل شئ إلى صاحبه" (شرح الحموی علی الاشباہ والنظائر، کتاب الحظر والإباحۃ ۲/ ۴۶۳)، جب یہ مال حرام میراث میں ملے، اس کا حکم یہ ہے تو اس مال سے تجارت وغیرہ کی جائے تو اس کا حکم بھی

واضح ہے، کہ اندازہ کر کے حرام کے بقدر مال صدقہ کردے (مفتی اقبال محمد ٹنکاروی وغیرہ)۔

☆ علامہ شامی منیۃ المفتی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لايحل ولايعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه" (ردالمحتار ۷/۳۰۱) مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا مغفور احمد باندوی، مولانا عبدالحکیم، مفتی راسخ الاسلام قاسمی وغیرہ۔

☆ حاشیہ طحطاوی علی الدرالمختار میں ہے: **"وفي البزازية إن علم المال الحرام بعينه لا يحل له(للوارث)أخذه وإن لم يعلمه بعينه أخذه حكما وأما في الديانة فإنه يتصدق به بنية الخصماء"** (حاشیۃ الطحطاوی علی الدرالمختار ۴/۱۹۳) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ قواعد فقہ کا ایک قاعدہ ہے: **"الحرمة تتعدى في الأموال مع العلم"** جس کا حاصل یہ ہے کہ مال میں حرمت متعدی ہوتی ہے اور ملکیت کی تبدیلی مال حرام کو حلال نہیں کرسکتی، چنانچہ صاحب موسوعۃ القواعد الفقہیہ اس قاعدہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"الحرمة تتعدى في الأموال مع العلم، معنى هذه القاعدة ومدلولها: أن اكتساب المال من حرام لاتقف حرمته عند مكتسبه بل لكل متعامل معه إذا علم أن هذا المال حرام" (موسوعۃ القواعد الفقہیہ ۵/۱۱۴) مفتی مغفور احمد باندوی، مفتی روح الامین سعادتی، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی وغیرہ۔

☆ امام غزالی فرماتے ہیں: **"وكيف يكون موت الرجل مبيحا للحرام المتيقن المختلط ومن أين يوخذ هذا"** (احیاء علوم الدین ۲/۱۳۰) مفتی مغفور باندوی۔

حرام مال میراث کے سلسلہ میں احناف کی مختلف آراء:

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی روح الامین سعادتی اور بعض دوسرے مقالہ نگار اس مسئلہ میں حنفیہ کے درمیان پائے جانے والے اختلاف رائے کو اچھی طرح واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"سود یا مال حرام وارث کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور ورثاء کو اس کا علم نہیں ہے، تب تو ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے، لیکن اگر ورثاء کو علم ہے تو ایسی صورت میں ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے یا حرام؟ اس سلسلے میں فقہ حنفی میں اختلاف ہے:

(الف) ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے، اس کا استعمال کرنا جائز ہے۔

(ب) علامہ حصکفیؒ نے مذکورہ قول کی تردید کرتے ہوئے دوسری رائے اختیار کی کہ ایسا مال ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ مطلقاً حرام ہے، خواہ اصل مالک معلوم ہو یا نہ ہو، درمختار میں ہے:

"في المجتبى: مات وكسبه حرام، فالميراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية، وهو حرام مطلقًا على الورثة، فتنبه" (الدرالمختار: ٦٨٣ /٦)۔

(ج) تیسری رائے ابن نجیم مصریؒ کی ہے کہ اگر اصل مالک معلوم ہے تو ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، لیکن اگر مالک کا علم نہ ہو تو پھر ورثاء کے لیے حلال ہے۔

"الحرمة تتعدى في الأموال مع العلم إلا في حق الوارث، فإن مال مورثه حلال له، وإن علم بحرمته منه (من الخانية)، وقيّده في الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال" (الاشباہ والنظائر/ ٣٢٠)

(د) علامہ شامیؒ نے تفصیلی رائے اختیاری کی ہے کہ حرام مالِ میراث کی تین صورتیں ہیں:

١- مالک معلوم ہو تو وارث کے لیے حلال نہیں ہے۔

٢- مالک معلوم نہ ہو، لیکن حرام ہونے کا علم ہو، اور متعین وممتاز بھی ہو، مخلوط نہ ہو، تو یہ بھی حلال نہیں ہے۔

٣- یہی حال ہو، لیکن وہ ممتاز نہ ہو؛ بلکہ مخلوط ہو، تو قضاءً ورثاء کے لیے حلال ہے، لیکن دیانۃً حرام مال کے بقدر صدقہ کر دینا چاہیے۔

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه، وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه، حل له حكما، والأحسن ديانة التنزه عنه" (ردالمحتار مع الدرالمختار ٥/ ٩) مفتی روح الامین سعادتی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی عبدالرزاق امروہوی، مفتی راشد حسین ندوی۔

ائمہ ثلاثہ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک اس مسئلہ کی تفصیل:

مالکی دبستان فقہ:

فقہاء مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مال حرام کو اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے، بس اس مال سے اتنا لے سکتا ہے کہ اس کی ستر پوشی ہو جائے اور ایک دن کی خوراک حاصل ہو جائے۔

علامہ قرطبی محمد بن احمد، ابوعبداللہ انصاری خزرجی اندلسی مالکیؒ (و: ٦٧١ھ/ ١٢٧٣ء) لکھتے ہیں: "قال علمائنا: إن سبيل التوبة مما بيده من الأموال الحرام، إن كانت من ربا فليردها على من أربى عليه، ويطلبه إن لم يكن حاضرا، فإن أيس من وجوده، فليتصدق بذلك عنه.....حتى لا يبقى في يده إلا أقل مايجزئه في الصلاة من اللباس، وهو ما يستر العورة، وهو من سرته إلى ركبته، وقوت يومه؛ لأنه الذي يجب له

أن يـأخـذه مـن مـال غيـره إذا اضـطـر إليـه، وإن كـره ذلـك من يـأخذه منـه" (الجامع الاحکام القرآن للقرطبی ۳/ ۳۶۶-۳۶۷، ریاض، دار عالم الکتب ۱۴۲۳ھ)۔

فقہ شافعی:

فقہاء شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مال حرام کو مالک کو لوٹا دے اگر معلوم ہو، اگر معلوم نہ ہو تو مسلمانوں کے عمومی مصالح میں خرچ کر دے، ورنہ ایک یا چند فقراء پر صدقہ کر دے، اور مال حرام رکھنے والا شخص بھی اپنی حاجت کے بقدر لے سکتا ہے، اس لئے کہ وہ بھی فقیر ہے۔

امام نووی یحیی بن شرف بن مری، ابوزکریا، محی الدین شافعیؒ (و:۶۷۶ھ/ ۱۲۷۷ء) تحریر فرماتے ہیں:"**إذا كـان مـعـه مـال حـرام وأراد التـوبـة والبـراء ة منه، فإن كان له مالك معين، وجب صرفه إليه، أو إلى وكيـلـه، فـإن كـان ميتا وجب دفعه إلى وارثه، وإن كان لمالك لا يعرفه، ويئس من معرفته، فينبغي أن يـصـرفـه فـي مـصـالح المسلمين العامة.....وإلا فيتصدق به على فقير أوفقراء.....وإذا دفعه إلى الفقير لـايكون حراما على الفقير، بل يكون حلالا طيبا.....وله أن يأخذ منه قدر حاجته؛لأنه أيضا فقير**" (المجموع شرح المہذب ۹/ ۳۳۲، بیروت، دار الفکر، ۱۹۷ء)۔

فقہ حنبلی:

حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مال حرام کو اس کے مالک کو لوٹا دے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو مالک کی طرف سے صدقہ کر دے یا مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کر دے، اور اگر مال حرام رکھنے والا اس مال کا محتاج ہو تو وہ اپنی ضرورت کے بقدر لے سکتا ہے اور باقی کو صدقہ کر دے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ احمد بن عبد الحلیم بن عبد اللہ نمیری حرانی دمشقی حنبلیؒ (و:۷۲۸ھ/ ۱۳۲۸ء) رقمطراز ہیں:"**الـمـال إذا تـعـذر مـعـرفـة مالكه صرف في مصالح المسلمين عندجماهير العلماء كما لك وأحـمـد وغيـرهـمـا، فـإذا كـان بيـدالإنسان غصوب أو عوار أو ودائع أورهون، قد يئس من معرفة أصـحـابهـا فـإنـه يتـصـدق بهـا عنهم، أو يصرفها في مصالح المسلمين، أو يسلمها إلى قاسم عادل يـصـرفـهـا فـي مصالح المسلمين المصالح الشرعية**" (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۲۱ طبع: ۳، دار الوفاء، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری مدنی۔

علامہ ابن تیمیہ:

☆ علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے بھی جمہور کے ساتھ ہے:"**ذهب الجمهور من الحنفيه والمالكيه والشافعيه والحنابله وهو اختيار شيخ الاسلام ابن تيميه إلى ان الموت لا يطيب المال الحرام بل الواجب فيه الرد على مالكه إن كان معروفا فإن لم يكن معروفا تصدق به على الفقراء والمساكين**" (حاشیۃ ابن عابدین ۵/ ۱۰۴، المجموع ۹/ ۴۲۸، الانصاف ۸/ ۳۲۸، الفتاوی الکبری ۱/ ۴۸۷) ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری۔

علامہ ابن رشد:

☆ علامہ ابن رشد (الجد) نے فرمایا:"**وأما الميراث فلا يطيب المال الحرام، هذا هو الصحيح الذى يوجبه النظر،وقد روى عن بعض من تقدم أن الميراث يطيبه للوارث، وليس ذلک بصحيح**" (المقدمات الممہدات ۲/ ۶۱۷) ڈاکٹر کلیم اللہ عمری۔

امام غزالی اور علامہ نووی:

علامہ نووی امام غزالی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"**إذا كان معه مال حرام وأراد التوبة والبرائة منه:**

۱- **فإن كان له مالک معين: وجب صرفه إليه أو إلى وكيله, فإن كان ميتا وجب دفعه إلى وارثه۔**

۲- **وإن كان لمالک لا يعرفه، ويئس من معرفته، فينبغى أن يصرفه فى مصالح المسلمين العامة، كالقناطر والربط والمساجد ومصالح طريق مكة، ونحو ذلک مما يشترک المسلمون فيه، وإلا فيتصدق به على فقير أو فقراء ...وإذا دفعه إلى الفقير لا يكون حراما على الفقير، بل يكون حلالا طيبا، وله أن يتصدق به على نفسه وعياله إذا كان فقيرا؛ لأن عياله إذا كانوا فقراء فالوصف موجود فيهم، بل هم أولى من يتصدق عليه، وله هو أن يأخذ منه قدر حاجته لأنه أيضا فقير**"۔

"**هذا الذى قاله الغزالى فى هذا الفرع ذكره آخرون من الأصحاب، وهو كما قالوه، نقله الغزالى أيضا عن معاوية بن أبى سفيان وغيره من السلف، عن أحمد بن حنبل والحارث المحاسبى وغيرهما من أهل الورع؛ لأنه لا يجوز إتلاف هذا المال ورميه فى البحر، فلم يبق إلا صرفه فى مصالح المسلمين**" انتهى (المجموع/ ۹/ ۴۲۸، ۴۲۹) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ علامہ نووی دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

"من ورث مالاولم یعلم من أین کسبه مورثه، أمن حلال أم من حرام؟ ولم تکن علامة فهو حلال بإجماع العلماء، وإن علم أن فیه حراما وشک فی قدره أخرج قدر الحرام بالاجتهاد" (المجموع شرح المہذب ۹/ ۴۲۸) مفتی شکیل منصور قاسمی، ڈاکٹر کلیم اللہ عمری، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا عبد الحکیم وغیرہ۔

بعض مقالہ نگار نے شیخ عباس احمد محمد باز کے حوالہ سے لکھا کہ اس سلسلہ میں ائمہ اور فقہاء کی دو رائیں ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ مال حرام وراثت میں ملا ہو تو وارث کے لئے طیب اور حلال ہے اور اس سے انتفاع بھی جائز ہے، خواہ وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ، مال حرام کمانے کا گناہ مورث پر ہوگا، نہ کہ وارث پر، یہی رائے حسن بصری، امام زہری، سفیان ثوری، سحنون مالکی رحمہم اللہ کی ہے اور یہی حنفیہ کا بھی ایک قول ہے، بطور دلیل قرآن کریم کی آیت: "**ولا تزر وازرة وزر أخری**" (سورۂ فاطر: ۱۸) پیش کی گئی ہے۔

عباس احمد محمد باز رقمطراز ہیں:

"اختلف العلماء فی ملکیة المال الحرام إذا کان الوارث یعلم أن مورثه قد اکتسب هذا المال بطریق حرام، وسبب اختلافهم هل للوارث أن یجوز هذا المال، مع علمه بحرمة کسبه، وعدم إقرار الشارع للوسیلة التی جاء بوساطتها؟ أم أنه یجوز له أن یأخذه، والإثم فی ذمة المورث الذی سعی فی کسب هذا المال بطریق محرم؟"

انقسم العلماء فی هذه المسألة إلی فریقین:

الفریق الأولی:

یری أن المال الحرام إذا انتقل إلی الوارث بالمیراث فإنه یطیب له، ویحل له الانتفاع به، قلیلاً کان أم کثیرا، ویکون الإثم واقعاً علی المورث الذی اکتسب هذا المال من مصدر حرام، أما الوارث فلا إثم علیه، وقد ذهب إلی هذاالقول طائفة من أهل العلم کالحسن البصری، والزهری، وسفیان الثوری وسحنون من المالکیة، وهو قول فی مذهب الحنفیة" (احکام المال الحرام: الفصل الثانی، المبحث الاول ملکیۃ المال الحرام بطریق المیراث ر ۷۴، ۷۵، ط: دار النفائس، اردن) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، دیکھئے مقالہ: مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی امانت علی قاسمی وغیرہ

دوسری رائے جمہور یعنی فقہاء اربعہ اور علامہ ابن تیمیہؒ کی ہے کہ موت مذکور حرام مال کو حلال و پاکیزہ بنانے کا ذریعہ اور سبب نہیں ہے، مالک معلوم ہونے کی صورت میں یہ مال ان تک لوٹایا جائے گا اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں فقراء

ومساکین کوصدقہ کردیا جائے گا،جیسا کہ اس کی تفصیل کتب فقہیہ میں موجود ہے، چنانچہ علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"الحرمة تتعدد مع العلم بها إلا فی حق الوارث وقیده فی الظهیریة بأن لا یعلم أرباب الأموال"۔

قوله:(إلا فی حق الوارث) أی فإنه إذا علم أن کسب مورثه حرام یحل له، لکن إذا علم المالک بعینه فلا شک فی حرمته ووجوب رده علیه، وهذا معنی قوله "وقیده فی الظهیریة....."

(ردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب البیوع ۷/ ۳۰۰، ۳۰۱) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی وغیرہ۔

غریب وارث کے لئے حرام ترکہ کا استعمال:

مفتی محمد الیاس قاسمی اور مولانا عبیداللہ ندوی لکھتے ہیں:

غریب شخص کو ملنے والا ترکہ اگر عین حرام نہ ہوتو حرام ترکہ اور کرایہ غریب انسان اپنے اوپر صرف کرسکتا ہے، لیکن بطور صدقہ، نہ کہ بطور میراث، چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"وله أن یتصدق به علی نفسه وعیاله إذا کان فقیرا لأن عیاله إذا کانوا فقراء فالوصف موجود فیهم بل هم أولی من یتصدق علیه وله أن یأخذ منه قدر حاجته لأنه أیضا فقیر، قال النووی بعد أن نقل قول الغزالی المذکور:وهذا الذی قاله الغزالی فی هذا الفرع ذکره الآخرون من الأصحاب وهو کما قالوه ونقله الغزالی أیضا عن معاویة بن أبی سفیانؓ وغیره من السلف وعن أحمد بن حنبل والحارث المحاسبی وغیرهما من أهل الورع لأنه لایجوز إتلاف هذا المال ورمیه فی البحر فلم یبق إلا صرفه فی مصالح المسلمین" (الموسوعۃ الفقہیہ ۳۴/ ۲۴۵)۔

کتنی مقدار مال حرام نکالا جائے:

اگر ترکہ میں مال حرام کی مقدار قطعیت کے ساتھ معلوم نہ ہوتو تطہیر اور پاکیزگی کا طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ غور وفکر سے اندازہ اور تحری کے ذریعہ اتنی مقدار نکال دی جائے:

"قال فی البحر:وقعت حادثة هی أن من شک هل أدی جمیع ماعلیه من الزکاة أم لا بأن کان یؤدی متفرقا ولا یضبطه هل یلزمه إعادته؟ومقتضی ماذکرنا لزوم الإعادة حیث لم یغلب ظنه دفع قدر معین لأنه ثابت فی ذمته بیقین فلا یخرج عن العهدة بالشک اه

قلت:وحاصله أنه یتحری فی مقدار المؤدی کما لوشک فی عددالرکعات فما غلب علی ظنه أنه أداه سقط عنه وأدی الباقی وإن لم یغلب علی ظنه شئ أتی الکل والله أعلم" (ردالمحتار ۳/ ۲۲۳، فقہ

البیوع ۸/۱۰۳۸) مفتی محمد عثمان بستوی۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے بہت سے مقالہ نویس حضرات نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے یا نہ ہونے اور یہاں سودی کاروبار کے حلال ہونے یا نہ ہونے کے سلسلہ میں بھی بحث کی ہے، جس میں دونوں طرح کی رائیں ہیں، لیکن بیشتر نے آزادی سے پہلے بھی ہندوستان میں سود کے عدم جواز کی رائے ظاہر کی ہے اور جواز کی رائے کی سخت تردید کی ہے، چنانچہ مفتی اشتیاق احمد قاسمی لکھتے ہیں:

دارالحرب میں سود:

سود دارالاسلام میں بھی حرام ہے اور دارالحرب میں بھی، دنیا کے ہر خطے میں سود حرام ہے، قرآن مجید میں حکم مطلق ہے، سورہ بقرہ (۲۷۵) کی آیت کے اطلاق کو ہی احناف میں سے امام ابو یوسفؒ نے مستدل بنایا ہے، یہی راجح موقف ہے، امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے (دارالاسلام سے آئے ہوئے) مسلمان اور حربی کے درمیان سود کے نہ ہونے کی جو بات ارشاد فرمائی ہے (امداد الفتاوی ۳/۱۱۷) وہ بھی مطلق نہیں ہے؛ بلکہ وہ سود کی ایک خاص شکل ہے کہ دارالاسلام سے کوئی مسلمان ویزا لے کر دارالحرب آئے، ظاہر ہے کہ اس کے معاملات غیر مسلموں سے ہوں گے، غیر مسلمین سود کے عادی ہیں؛ اس لئے اس کے لئے لین دین میں سود کی نوبت آئے گی، بلاسودی کاروبار اگر وہ کرنا بھی چاہے گا تو نہیں کر سکے گا، ایسی صورت میں دارالحرب کے غیر مسلم کو دھوکہ دیئے بغیر ان کے طریقہ کے مطابق اگر وہ سود حاصل کر لیتا ہے اور اسے اپنے ملک میں لے جا کر کھاتا ہے تو حربی کا مال چونکہ بلا کسی جعل سازی کے اس کے پاس آیا ہے؛ اس لئے اس کو کھانے کی اجازت ہوگی، اسی صورت میں جواز ہے اور جواز ربوا کی حلت کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ حربی کے مال پر بلا دھوکہ قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے ہے؛ اس لئے جن لوگوں نے مطلقا سود کے جواز کی بات سمجھی ہے وہ غلط اور مرجوح ہے، اور جب حلت اور حرمت میں اختلاف ہو تو حرمت کو ترجیح دینا تو متفق علیہ اصل ترجیح ہے (الاشباہ والنظائر ص ۱۰۹)۔

خلاصہ یہ کہ سود ہر جگہ حرام ہے چاہے دار الحرب ہو اور ہندوستان دارالمعاہدہ یا دار الامن ہے (فتوی دارالعلوم دیوبند ۳۸۵۲) تو سود کی حلت کا سوال ہی نہیں اور اگر دارالحرب کی قسم میں سے تسلیم بھی کیا جائے تب بھی سود لینے کی اجازت نہیں ہوگی، یہاں کے مستقل باشندے کے لئے تو حلت واباحت کا سوال ہی نہیں (مفتی اشتیاق احمد قاسمی، نیز دیکھئے مقالہ مفتی محمد شاہجہاں ندوی، حافظ سید فاروق عمری، مولانا عبدالاحد قاسمی وغیرہ)۔

جبکہ مفتی اختر امام عادل قاسمی وغیرہ لکھتے ہیں کہ یہ مال مخلوط کا مسئلہ ہے، اس لئے کہ آزادی سے قبل جب ہندوستان کے دارالحرب ہونے اور غیر مسلموں سے سود لینے کے جواز کا فتوی دیا گیا تھا، اس اثناء اس کے آباء واجداد نے غیر مسلموں سے سود وغیرہ کے ذریعہ جو مال کمایا وہ حلال تھا، اور آزادی کے بعد جب علماء نے ہندوستان کو دارالامن یا

دار العہد قرار دیا اور غیر مسلموں سے سود کے جواز کا قول تبدیل ہو گیا، اس اثناء سود وغیرہ سے حاصل شدہ مال حرام ہے، تو جو کاروبار اس کو وراثت میں ملا ہے اس میں دونوں طرح کے مال غیر ممیّز طور پر موجود ہیں اور ان کی مقدار معلوم نہیں ہے، ایسی صورت میں گو کہ احتیاط یہی ہے کہ ایسے مال کو استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے، لیکن از روئے فتوی پورے مال کو علی الاطلاق استعمال کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ اباحت اصل ہے۔

مفتی عبد الرشید کانپوری چند اکابر کے فتاوی جن میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی بنیاد پر سودی لین کو درست قرار دیا گیا ہے، درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے ان حضرات علماء کرام کی رائے پر عمل کیا جنھوں نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی صورت میں سودی لین دین کو مباح قرار دیا ان لوگوں نے جو کچھ کمایا وہ ان کے لیے حلال تھا، لہٰذا ان کے ورثاء کے لیے بھی یہ مال حلال ہوگا، یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ وارثین کو علم ہو کہ میراث میں جو سودی مال ملا ہے وہ سب آزادی سے پہلے کا ہے، اگر وارثین کو یقینی علم نہ ہو کہ یہ سودی پیسہ آزادی سے پہلے کا ہے یا بعد کا، تب بھی وارثین کے لیے یہ اموال حلال ہوں گے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ سودی پیسہ آزادی کے بعد کا ہو، لیکن یہ ایک شک اور وہم کی صورت ہے اور اس رقم کا آزادی سے پہلے کی کمائی ہونا ایک امر یقینی ہے، لہٰذا "**الیقین لایزول بالشک**" کی وجہ سے اس کو وارثین کے لیے حرام قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، بلکہ یہ جائز اور حلال ہوگا اور اس کا استعمال بھی درست ہوگا، ہاں اگر کسی ذرائع سے یقین یا ظن غالب ہو جائے کہ کمائی اتنا حصہ آزادی کے بعد کا ہے تو اتنا حصہ صدقہ کرنا لازم ہوگا، وارثین کے لیے اس کا استعمال جائز نہ ہوگا''۔

یہی رائے مفتی شاکر نثار قاسمی مدنی کی بھی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''جو مال وراثت میں ملا ہے وہ اگر آزادی سے پہلے سودی کاروبار کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا تو بلا شک وشبہ حلال ہے، اس لئے کہ آزادی سے پہلے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی وجہ سے کفار کے ساتھ سودی کاروبار کی اجازت تھی''، نیز دیکھئے مقالہ مولانا قمر الزماں ندوی۔

مولانا عبید اللہ ندوی نے لکھا ہے کہ کسی بھی مال میں حرمت پیدا ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ اس میں حرمت حقوق اللہ میں تعدی کی وجہ سے آئی ہو، دوسری یہ کہ اس میں حرمت حقوق العباد میں تعدی کی وجہ سے آئی ہو۔

پہلی صورت: جبکہ اس کا تعلق حقوق اللہ میں تعدی سے ہو، جیسے سود کی رقم، یا وہ مال جو شراب بیچ کر حاصل کیا گیا ہو، یا زنا کی اجرت یا ناچ گانے سے حاصل کی گئی رقم وغیرہ، تو اس کا اس پر باقی رہنا جائز ہوگا، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱- ''**لا تکسب کل نفس إلا علیها ولا تزر وازرة وزر أخری**'' (انعام:۱۶۴)۔

۲- نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں یہودیوں سے لین دین کا معاملہ کرتے تھے، ان کے ہدایا قبول فرماتے تھے، حالانکہ ان

کی بیشتر کمائی سود کی تھی، نیز آپ ﷺ نے اس یہودی عورت کا ہدیہ قبول فرمایا تھا جس نے آپ ﷺ کو زہر دیا تھا، اور اُکیدر دومہ، (دومۃ الجندل کا بادشاہ تھا، نصاری میں سے تھا جس سے آپ ﷺ نے صلح فرمائی تھی)، فروہ بن عمرو (جذامی نفاثی، آپ ﷺ پر ایمان لایا تھا، جنوب اردن کے علاقہ معان کا سردار تھا، آپ ﷺ کے لئے ہدیہ میں خچر بھیجا تھا) اور مقوقس وغیرہ کے ہدایا قبول فرمائے۔

۳- حضرت عمرؓ نے اہل ذمہ سے ان کی شراب کی قیمت میں سے جزیہ لیا ہے، چنانچہ امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اپنی ''کتاب الاموال،، میں لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے کہا کہ آپ کے عمال خراج میں شراب اور خنزیر لیتے ہیں تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''**لا تأخذوها منهم، ولكن ولُّوهم بيعها، وخذوا أنتم من الثمن**''

(کتاب الاموال، ص: ۶۲۱، ط: دار الشروق، قاہرہ، بیروت، مصنف عبدالرزاق ۲۸/۸، ط: دار إحیاء التراث العربی)۔

دوسری صورت: جب کہ مال کی حرمت حق العباد سے متعلق ہو، جیسے چوری، غصب، مال غنیمت میں خیانت وغیرہ تو اس کو اپنے پاس رکھنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ اگر مالک زندہ ہو تو اس کو ورنہ اس کے ورثاء کو لوٹانا واجب ہوگا، دلائل یہ ہیں:

۱- ''**لايقبل الله صلاة بغير طهور ولا صدقة من غلول**'' (بخاری تعلیقا، مسلم، رقم: ۲۲۴)۔

۲- حضرت مغیرہ بن شعبہؓ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے ساتھ رہتے تھے، پھر انہیں قتل کر دیا اور ان کا مال لوٹ لیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**أما الإسلام فأقبل وأما المال فلست منه في شئ**'' (بخاری، رقم: ۲۵۸۳، ابن حبان، رقم: ۴۸۷۲)۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے تمہیدی طور پر چند مقالہ نویس حضرات نے حلال مال حاصل کرنے اور کھانے کی ترغیب، رزق حلال کی فضیلت، حرام مال کی لعنت، حرام مال کا مصرف، ان معاملات کا حکم جن میں حلال وحرام مخلوط ہوں، حرام کی معفو عنہ مقدار کیا ہے، حرام مال ومنافع کی تطہیر کا شرعی طریقہ اور حرام کمائی سے چھٹکارا پانے کی شکلیں وغیرہ عناوین پر تفصیل سے لکھا ہے (دیکھئے: مقالہ مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شفیق بڑودوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی مغفور باندوی وغیرہ)۔

سوال نمبر ۲: ایک غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائیداد اور مال، حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اسی حرام جائیداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، اب جو کچھ اس کے پاس موجود ہے اس کا کیا حکم ہے؟۔

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ حرام ذرائع سے حاصل شدہ مال، جائداد، آمدنی، نفع اور کرایہ کا اصل حکم شرعا یہ ہے کہ اسے اصل مالک کو لوٹا دیا جائے، اگر ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، اپنے

لئے اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

مقالہ نگاران نے مندرجہ ذیل آیات واحادیث اور فقہی عبارتوں سے استدلال کیا ہے:

☆ قرآن کریم میں ہے:"**ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل**" (سورۂ بقرہ:۱۸۸)،

☆ "**يايها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم**" (النساء:۲۹) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ نیز حدیث میں ہے:"**إن دماء كم وأموالكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا فى شهركم هذا، فى بلدكم هذا**" (صحیح بخاری مع الفتح ۳/ ۵۷۳، حدیث نمبر:۱۷۳۹، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۲۱۸) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:"**إن الله إذا حرم شيئا حرم ثمنه**" (سنن ابی داؤد، البیوع حدیث نمبر:۳۴۸۸، مسند احمد ۱/ ۲۴۷، دار قطنی ۳/ ۷) مولانا صابر حسین ندوی۔

☆ بذل المجہود میں ہے:

"**وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه لعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولايمكنه أن يرد إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه، فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء لأنه لو أنفق على نفسه فقد استحكم ما يرتكبه من الفعل الحرام**" (بذل المنہو د ا/ ۳۵۹) مولانا عبید اللہ ندوی۔

☆ موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"**والواجب فى الكسب الخبيث تفريغ الذمة والتخلص منه برده إلى أربابه إن علموا وإلا إلى الفقراء**" (الموسوعۃ الفقہیہ ۴/ ۳۴۵/ ۲۴۵) مولانا عبید اللہ ندوی۔

☆ "**صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيع الفاسده والاستئجار على المعاصى والطاعات أو بغير عقد كالسرفة والغصب والخيانة والغلول ففى جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه و لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه وإلا ففى جميع الصور يجب عليه أن يصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء**" (بذل المجہود، کتاب الطہارۃ ۲/ ۲۹۱) مفتی امانت علی قاسمی۔

☆ امام سرخسی فرماتے ہیں:

"**فإنما حصل له الربح فيه بسبب خبيث شرعا والسبيل فى الكسب الخبيث التصدق**"

(المبسوط للسرخسی ۱۲/ ۱۴۸) مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ "**وما حصل بسبب خبيث فالسبيل رده**" (شرح السیر الکبیر للشیبانی ۴/ ۱۱۱۶) مفتی عبدالرشید قاسمی۔

☆ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**ولا يطيب له: لأنه استفادها بسبب خبيث**" (فتاوی ہندیہ کتاب الغصب ۵/ ۱۴۰) مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ علامہ کاسانی رقم طراز ہیں:

"**وأما التصدق بالغلة وهي الأجرة عندهما، ملأنها خبيثة لحصولها بسبب خبيث، فكان سبيلها التصدق**" (بدائع الصنائع، کتاب الغصب ۷/ ۱۵۴)۔ مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"**والغاصب إذا آجر يملك الأجرة ويتصدق بها، لأنها حصلت بسبب خبيث، وهو استعمال مال الغير، فكان سبيله التصدق**" (ردالمحتار کتاب العاریہ ۸/ ۳۹۳) مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ دارالعلوم دیوبند کا فتوی ہے:

''سوال: ایک آدمی نے پوری حرام کمائی سے گھر بنایا، اب اس کا انتقال ہوگیا، اور اس کا کوئی لڑکا نہیں ہے، لڑکیوں کی شادی کر چکا تھا، اب اس کی صرف بیوی بچی ہے، تو کیا اب یہ عورت گھر کا کچھ حصہ کرایہ پر دے کر اپنا خرچہ چلا سکتی ہے جبکہ یہ گھر حرام کمائی سے بنا ہوا ہے؟ عورت کے پاس اپنے گذر بسر کے لئے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

جواب: ''فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ خالص حرام مال سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر مال حرام وحلال دونوں مخلوط ہوں، حرام کو حلال سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے تو اکثر حصہ مالِ حرام ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے؛ البتہ اگر حلال حصہ زیادہ اور حرام کم ہے تو اس سے کرایہ حاصل کرنے کی اجازت ہے، یہاں جب کہ مکان بقول آپ کے حرام کمائی سے بنا ہوا ہے تو اس کو کرایہ پر دے کر اس سے کرایہ حاصل کرنا پھر اسے اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ جب تک مکان میں لگی ہوئی ساری رقم صدقہ نہ کردی جائے، بیوہ کو اپنی گذر بسر کا اور کوئی انتظام کرنا چاہیے'' (آن لائن فتویٰ نمبر 50-97/B+02/1441) مفتی شاکر نثار قاسمی مدنی۔

غریب ومحتاج کے لئے لینے کی گنجائش:

البتہ ان حضرات کی یہ بھی رائے ہے کہ اگر وہ خود غریب اور محتاج ہے اور کرایہ اور نفع کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو بقدر ضرورت استعمال کر سکتا ہے، باقی مال لوٹانا ضروری ہے۔

☆ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

"كاد الفقر أن يكون كفرا وكاد الحسد أن يغلب القدر" (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر ۶۶۱۲) مولانا صابر حسین ندوی۔

☆ "ذهب جمهور الفقهاء إلى أنه يجوز للمسلم إذا كان عنده مال حرام أن ينفق هذا المال على نفسه وعياله إذا كان فقيرا محتاجا إليه ولم يعرف له مالكا يرده إليه" (أحکام المال الحرام/۸۹) ڈاکٹر مولانا اشتیاق احمد اعظمی۔

☆ کوئی شخص اتنا غریب ہے کہ اس کی پوری جائداد اسی میں چلی جائے گی تو اس کے لئے اس رقم کو استعمال کرنے یا حلال کاروبار کی پونجی کے بقدر لینے کی گنجائش ہوگی، علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

"فطريق التخلص منه وتمام التوبة بالصدقة به، فإن كان محتاجا فله أن يأخذ قدر حاجته ويتصدق بالباقي، فهذا حكم كل خبيث لخبث عوضه، عينا كان أو منفعة" (زاد المعاد ۵/۶۹۱) مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا ممتاز خان ندوی۔

اس طرح مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی وغیرہ لکھتے ہیں کہ: اگر مالک متعین نہیں ہے اور یہ خود محتاج اور فقیر ہے تو اس مال کو استعمال کرنے کی گنجائش ہے:

☆ "ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف في ملك الغير والفرع يحصل على صفة الأصل والملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة بنفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله وإن كان فقير ألايتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/۷۰)

☆ ہدایہ میں ہے:

"إلا إذا كان لا يجد غيره، لأنه محتاج إليه، وله أن يصرفه إلى حاجة نفسه، فلو أصاب ما لاتصدق بمثله إن كان غنيا وقت الاستعمال وإن كان فقيرا فلا شئ عليه لما ذكرنا" (الہدایہ للمرغینانی ۴/۱۴)

مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی عبد الرزاق امروہوی۔

☆ امام سرخسی نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس کی اپنی حاجت دیگر فقراء پر مقدم ہے:

"وحاجته تقدم على حق الفقراء فإذا أصاب بعد ذلك مالا تصدق بمثله إن كان استهلك الثمن يوم استهلكه وهو غني عنه وإن كان محتاجا يوم استهلك الثمن لم يكن عليه أن يتصدق بشيء من ذلك لأن وجوب الضمان عليه باعتبار استهلاكه الثمن ولو استهلك الغلة مكان الثمن فإن كان محتاجا فليس عليه أن يتصدق بشيء منه وإن كان غنيا فعليه أن يتصدق بمثله فكذلك في استهلاك

الثمن وإنما قلنا ذلک لأن حق الفقراء فی هذا المال بمنزلة حقهم فی اللقطة علی معنی أن له أن یتصدق وله أن یردها علی المالک إن شاء ثم الملتقط إذا کان محتاجا فله أن یصرف اللقطة إلی حاجة نفسه بخلاف ما إذا کان غنیا فکذلک حکم هذه الغلة" (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۱۴۰) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ "**وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور إن أکلت من طعامه ولم یکن عین ذلک الطعام غصبا فهی فی سعة من أکله وکذا لو اشتری طعاما أو کسوة من ماله أصله لیس بطیب فهی فی سعة من تناوله والإثم علی الزوج**" (ردالمحتار مع الدرالمختار ۷/ ۳۰۲) مولانا مغفور احمد باندوی۔

☆ مفتی اقبال محمد ٹنکاروی نے اس مسئلہ میں فقہاء حنفیہ کے درمیان اختلاف رائے کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

اس پر فقہاء کی آراء مختلف ہیں: امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ اس سے حاصل شدہ نفع کو صدقہ کردے، امام کرخی بعض صورتوں میں اس میں گنجائش مانتے ہیں اور بعض صورتوں میں نہیں مانتے اور فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے تاتارخانیہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

قوله: (اکتسب حراماً ...الخ) توضیح المسألة ما فی التتار خانیة حیث قال: رجل اکتسب مالاً من حرام، ثم اشتری، فهذا علی خمسة أوجه : أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولاً ثم اشتری منه بها، أو اشتری قبل الدفع بها ودفعها، أو اشتری قبل الدفع بها ودفع غیرها، أو اشتری مطلقاً ودفع تلک الدراهم، أو اشتری بدراهم آخر ودفع تلک الدراهم، قال أبو نصر : یطیب له ولا یجب علیه أن یتصدق إلا فی الوجه الأول، وإلیه ذهب الفقیه أبو اللیث، لکن هذا خلاف ظاهر الروایة، فإنه نص فی الجامع الصغیر: إذا غصب ألفاً فاشتری بها جاریة وباعها بألفین تصدق بالربح .

وقال الکرخی: فی الوجه الأول والثانی لا یطیب، وفی الثلاث الأخیرة یطیب۔ وقال أبو بکر: لا یطیب فی الکل، لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعاً للحرج عن الناس۔

وفی الولوالجیة ؛ وقال بعضهم : لا یطیب فی الوجوه کلها وهو المختار، لکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعاً للحرج لکثرة الحرام (ردالمحتار علی الدرالمختار: کتاب البیوع، باب المتفرقات ۷/ ۴۹۰، الفتاوی التاتارخانیۃ: کتاب البیوع، رقم المسئلہ: ۱۲۱۴۵، ص: ۸/ ۳۴۶، ط: زکریا بک ڈپو دیوبند) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، نیز دیکھئے مقالہ مفتی عفان منصور پوری، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا عبیداللہ ندوی۔

ڈاکٹر کلیم اللہ عمری نے شیخ عثیمین کا فتوی نقل کیا ہے:

"**قال الشیخ ابن عثیمینؒ فی أموال المرابی: أما بالنسبة لأولاده : فلاحرج علیهم أن یأکلوا**

منه فی حیاة أبیهم و یجیبوا دعوته ، لأن النبی ﷺ أجاب دعوة الیهود مع أنهم یأکلون الربا" (لقاء الباب المفتوح:۱۹/۱۸۱)۔

"**وقال الشیخ ابن عثیمینؒ: و أما ماکان محرما لکسبه، فإنما إثمه علی الکاسب لا علی من أخذه بطریق مباح من الکاسب بخلاف ماکان محرما لعینه کالخمر و المغصوب و نحوهما ، وهذا القول وجیه قوی ، بدلیل أن الرسول ﷺ اشتری من یهودی طعاما لأهله ، وأکل من الشاة التی أهدتها الیهودیة بخیبر ، وأجاب دعوة الیهودی، ومن المعلوم أن الیهود معظمهم یأخذون الربا ویأکلون السحت و ربما یقوی هذا القول قوله ﷺ فی اللحم الذی تصدق به علی بریرة: (هو لها صدقة و لنا منها هدیة)**" (القول المفید علی کتاب التوحید:۳/۱۱۲)۔

مال حرام لقطہ کی طرح ہے:

مولانا اختر امام عادل قاسمی نے امام سرخسی کے حوالہ سے لقطہ کے سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیان کرتے ہوئے مال حرام کو اس پر قیاس کیا ہے:

☆ لقطہ اٹھانے والا اگر مالدار ہو تو اس کے لئے اس سے انتفاع درست نہیں ہے، لیکن اگر حاکم کی اجازت سے وہ اس کو بطور قرض استعمال کرے تو اس کی گنجائش ہے، اور وہ اس پر قرض رہے گا، یہی حکم لقطہ سے حاصل شدہ آمدنی کا بھی ہے، لیکن اگر لقطہ اٹھانے والا غریب ہو اور اسے اس مال کی حاجت ہو تو اس کو اپنی ضرورت کے لئے استعمال کرسکتا ہے اور یہ قرض نہیں ہوگا، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"**وعن أبی سعید مولی أسید قال وجدت خمسمائة درهم بالحرة وأنا مکاتب فذکرت ذلک لعمر بن الخطاب رضی الله عنه فقال اعمل بها وعرفها فعملت بها حتی أدیت مکاتبتی ثم أتیته فأخبرته بذلک فقال ادفعها إلی خزان بیت المال وفی هذا دلیل أن للإمام ولایة الإقراض فی اللقطة والدفع مضاربة لأن قول عمر رضی الله عنه اعمل بها وعرفها إما أن یکون بطریق المضاربة أو الإقراض مضاربة وقد علمنا أنه لم یرد المضاربة حتی لم یتبین نصیبه من الربح فکان مراده الإقراض منه وفی هذا معنی النظر لصاحب المال لأنه یعرض للهلاک فیهلک من صاحبه قبل الإقراض وبعد الإقراض یصیر دینا فی ذمة المستقرض یؤمن فیه التوی بالهلاک وکذلک بالجحود لأنه متأکد بعلم القاضی ولهذا کان للقاضی ولایة الإقراض فی أموال الیتامی وربما یکون معنی النظر فی الدفع**

إليه مضاربة أو إلى غيره فذلک کله إلى القاضى لأنه نصب ناظرا وفيه دليل على أن الملتقط إذا كان محتاجا فله أن ينتفع باللقطة بعد التعريف لأن هذا المكاتب كان محتاجا إلى العمل فيها فيؤدى مكاتبته من ربحها فأذن له عمر رضى الله عنه فى ذلک" (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷، طبع بیروت)۔

بلکہ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر حاکم موجود نہ ہو تو قاضی یا مفتی یا کسی متقی عالم دین کی اجازت بھی قرض کے جواز کے لئے کافی ہوگی، فقہائے مالکیہ کے یہاں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں:

"**فَإِنْ لم يكن حاكم فصالحو البلد يقومون مقام الحاكم وَالْعُدُولُ يَقُومُونَ مَقَامَ الْحَاكِمِ عِنْدَ تَعَذُّرِهِ إمَّا لِعَدَمِ أَمَانَتِهِ أو لِعَدَمِ اعْتِنَائِهِ بِالْأُمُورِ، اعْلَمْ أَنَّ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ الْعُدُولِ يَقُومُونَ مَقَامَ الْحَاكِمِ فى ذلک وفى كل أَمْرٍ يَتَعَذَّرُ الْوُصُولُ فيه إلَى الْحَاكِمِ أو لِكَوْنِهِ غير عَدْلٍ ..... وَالْوَاحِدُ منهم كَافٍ كما قَالَهُ شَيْخُنَا**" (حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۲/ ۵۱۹)۔

☆ "**قال النووى نقلا عن الغزالى: اذا كان معه ما ل حرام وأراد التوبة والبرائة منه، فإن كا ن له ما لک معين وجب صرفه إليه أوالىٰ وكيله، فإن كان ميتاوجب دفعه إلىٰ وارثه، و إن كا ن لما لک لا يعرفه ويئس من معرفته فينبغى أن يصرفه فى مصالح المسلمين العامة، كالقناطر والربط والمساجد والمصالح طريق مكة ونحو ذالک ممايشترک المسلمون فيه، وإلافيتصدق علىٰ فقير أو فقراء، وينبغى أن يتولىٰ ذالک القاضى إن كا ن عفيفا، وفإن لم يكن عفيفالم يجز التسليم إليه، فإن سلمه إليه صار المسلم ضامنا، بل ينبغى أن يحكم رجلا من أهل البلد دينا عالما، فإن التحكم أولىٰ من الإنفراد، فإن عجزعن ذالک تولاه بنفسه، فإن المقصود هوانصراف إلىٰ هٰذه الجهة، وإذا دفعه إلى الفقيرلايكون حراماعلى الفقير، بل يكو ن حلا لاطيبا، وله أن يتصدق به علىٰ نفسه وعيا له إذا كا ن فقيرا، لأن عياله إذاكا نوا فقراء فالوصف موجود فيهم، بل هم اولىٰ من يتصدق عليه، وله هو أن يأخذ منه قدرحاجته، لأنه أيضا فقير**" (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ ۳۴/ ۲۴۵) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ عالم اسلام کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی بھی یہی رائے ہے، چنانچہ وہ فقہ البیوع میں فرماتے ہیں: "**ماوجب التصدق به واحتاج إليه يجوز صرفه إلى نفسه فإن كان فقيرا لا يجب عليه التصدق بمثله وإن كان غنيا وجب عليه أن يتصدق بمثله ويجوز له إذا لم يكن المال الحلال كافيا لسدحاجته يسوغ للمفتى بعد النظر فى أحواله أن يفتيه بجواز الاقتراض من عنده من**

المال الحرام بشرط أن يلزم نفسه تسديد هذا القرض إلى الفقراء من المال الحلال كلما تيسر له ذلك" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۵۵) مفتی نثار احمد گودھروی۔

☆ مال حرام سے محتاج کتنی مقدار رکھ سکتا ہے؟

مفتی محمد شاہجہاں ندوی لکھتے ہیں کہ فقہاء نے محتاج کے لئے مال حرام سے جہاں بقدر ضرورت لینے کی گنجائش دی ہے اس سے مراد؛ سال بھر کا اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ اور چھوٹی موٹی تجارت کا خرچ شامل ہے۔

حرام مال اور اس کے منافع کے حکم میں فرق ہے:

غیر شرعی طریقہ سے حاصل مال حرام، اس کا بدل، یا اس کے بقدر مالک کو لوٹانے یا صدقہ کر دینے سے پہلے اس سے نفع یعنی کرایہ وغیرہ حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس بابت احناف کے دو نقطہائے نظر ہیں:

۱- طرفین کے یہاں اصل مالک کو ضمان ادا کرنے سے قبل اس حرام جائیداد کے منافع سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے، ابوبکر اسکاف نے اس کو راجح کہا ہے، ہمارے یہاں فتویٰ بھی اسی پر ہے، بدائع وہدایہ اور ہندیہ وغیرہ میں اسی کو راجح کہا گیا ہے۔

شرنبلالی لکھتے ہیں:

"**قالوا والضابط فيه أنه متى تغيّرت العين المغصوبة بفعل الغاصب حتى زال اسمها ومعظم منافعها أو اختلطت بملك الغاصب بحيث لا يمكن تمييزها أصلًا أو زال ملك المغصوب منه عنها وملكها الغاصب وضمنها ولا يحل له الانتفاع بها حتى يؤدِيَ بدلها كي لا يلزم منه فتح باب الغصوب وفي منعه حسم مادّته**" (حفظ الاصغرین ۶/) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

"**وَقَالَ مَشَايِخُنَا: – رَحِمَهُمُ اللّٰهُ – لَا يَطِيبُ بِكُلِّ حَالٍ أَنْ يَتَنَاوَلَ مِنْهُ قَبْلَ أَنْ يَضْمَنَ وَبَعْدَ الضَّمَانِ لَا يَطِيبُ الرِّبْحُ بِكُلِّ حَالٍ، وَهُوَ الْمُخْتَارُ، وَإِطْلَاقُ الْجَوَابِ فِي الْجَامِعَيْنِ وَالْمُضَارَبَةِ يَدُلُّ عَلَى ذَلِكَ وَوَجْهُهُ أَنَّهُ بِالنَّقْدِ مِنْهُ اسْتَفَادَ سَلَامَةَ الْمُشْتَرِي وَبِالْإِشَارَةِ اسْتَفَادَ جَوَازَ الْعَقْدِ لِتَعَلُّقِ الْعَقْدِ بِهِ فِي حَقِّ الْقَدْرِ وَالْوَصْفِ فَتَثْبُتُ فِيهِ شُبْهَةُ الْحُرْمَةِ لِمِلْكِهِ بِسَبَبٍ خَبِيثٍ وَاخْتَارَ بَعْضُهُمْ الْفَتْوَى عَلَى قَوْلِ الْكَرْخِيِّ فِي زَمَانِنَا لِكَثْرَةِ الْحَرَامِ، وَهَذَا كُلُّهُ عَلَى قَوْلِهِمَا، وَعِنْدَ أَبِي يُوسُفَ – رَحِمَهُ اللّٰهُ – لَا يَتَصَدَّقُ**

بِشَیْءٍ مِنْهُ، وَالْوَجْهُ مَا بَیّنّا" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق وحاشیۃ الشلبی ۵/ ۲۲۶ شاملہ) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

مبسوط سرخسی میں ہے:

"وَفِی مَسْأَلَةِ الشِّرَاءِ بِالدّرَاهِمِ الْمَغْصُوبَةِ لَا تَتَعَیّنُ تِلْکَ الدّرَاهِمُ حَتّی لَوْ أَخَذَهَا الْمَغْصُوبُ مِنْهُ کَانَ عَلَی الْغَاصِبِ مِثْلُهَا دَیْنًا، وَلَکِنّهُ اسْتَعَانَ فِی الْعَقْدِ وَالنّقْدِ بِمَا هُوَ حَرَامٌ فَیَتَمَکّنُ فِیهِ الْخُبْثُ فَلِهَذَا لَا یَحِلّ لَهُ تَنَاوُلُهُ" (مبسوط السرخسی ۱۴/ ۱۷) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

ملک العلماء علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"وَلَوْ اشْتَرَی بِالدّرَاهِمِ الْمَغْصُوبَةِ شَیْئًا هَلْ یَحِلّ لَهُ الِانْتِفَاعُ بِهِ أَوْ یَلْزَمُهُ التّصَدّقُ؟

ذَکَرَ الْکَرْخِیّ – رَحِمَهُ اللّهُ – وَجَعَلَ ذَلِکَ عَلَی أَرْبَعَةِ أَوْجُهٍ: إمّا أَنْ یُشِیرَ إلَیْهَا وَیَنْقُدَ مِنْهَا، وَإِمّا أَنْ یُشِیرَ إلَیْهَا وَیَنْقُدَ مِنْ غَیْرِهَا، وَإِمّا أَنْ یُشِیرَ إلَی غَیْرِهَا وَیَنْقُدَ مِنْهَا، وَإِمّا أَنْ یُطْلِقَ إطْلَاقًا وَیَنْقُدَ مِنْهَا، وَإِذَا ثَبَتَ الطّیّبُ فِی الْوُجُوهِ کُلِّهَا، إلّا فِی وَجْهٍ وَاحِدٍ وَهُوَ أَنْ یَجْمَعَ بَیْنَ الْإِشَارَةِ إلَیْهَا وَالنّقْدِ مِنْهَا، وَذَکَرَ أَبُو نَصْرٍ الصّفّارُ وَالْفَقِیهُ أَبُو اللّیْثِ رَحِمَهُمَا اللّهُ أَنّهُ یَطِیبُ فِی الْوُجُوهِ کُلِّهَا، وَذَکَرَ أَبُو بَکْرٍ الْإِسْکَافُ – رَحِمَهُ اللّهُ – أَنّهُ لَا یَطِیبُ فِی الْوُجُوهِ کُلِّهَا وَهُوَ الصّحِیحُ"۔

"(وَجْهُ) قَوْلِ أَبِی نَصْرٍ وَأَبِی اللّیْثِ رَحِمَهُمَا اللّهُ تَعَالَی أَنّ الْوَاجِبَ فِی ذِمّةِ الْمُشْتَرِی دَرَاهِمُ مُطْلَقَةٌ، وَالْمَنْقُودَةُ بَدَلٌ عَمّا فِی الذّمّةِ، أَمّا عِنْدَ عَدَمِ الْإِشَارَةِ فَظَاهِرٌ، وَکَذَا عِنْدَ الْإِشَارَةِ؛ لِأَنّ الْإِشَارَةَ إلَی الدّرَاهِمِ لَا تُفِیدُ التّعْیِینَ، فَالْتَحَقَتْ الْإِشَارَةُ إلَیْهَا بِالْعَدَمِ، فَکَانَ الْوَاجِبُ فِی ذِمّتِهِ دَرَاهِمَ مُطْلَقَةً، وَالدّرَاهِمُ الْمَنْقُودَةُ بَدَلًا عَنْهَا، فَلَا یَخْبُثُ الْمُشْتَرَی، وَالْکَرْخِیّ کَذَلِکَ یَقُولُ: إذَا لَمْ تَتَأَکّدْ الْإِشَارَةُ بِمُؤَکّدٍ وَهُوَ النّقْدُ مِنْهَا فَإِذَا تَأَکّدَتْ بِالنّقْدِ مِنْهَا تَعَیّنَ الْمُشَارُ إلَیْهِ، فَکَانَ الْمَنْقُودُ بَدَلَ الْمُشْتَرَی، فَکَانَ خَبِیثًا"۔

"(وَجْهُ) قَوْلِ أَبِی بَکْرٍ أَنّهُ اسْتَفَادَ بِالْحَرَامِ مِلْکًا مِنْ طَرِیقِ الْحَقِیقَةِ، أَوْ الشُّبْهَةِ، فَیَخْبُثُ الْخَبَثُ، وَهَذَا لِأَنّهُ إنْ أَشَارَ إلَی الدّرَاهِمِ الْمَغْصُوبَةِ فَالْمُشَارُ إلَیْهِ إنْ کَانَ لَا یَتَعَیّنُ فِی حَقّ الِاسْتِحْقَاقِ یَتَعَیّنُ فِی حَقّ جَوَازِ الْعَقْدِ بِمَعْرِفَةِ جِنْسِ النّقْدِ وَقَدْرِهِ، فَکَانَ الْمَنْقُودُ بَدَلَ الْمُشْتَرَی مِنْ وَجْهٍ نُقِدَ مِنْهَا، أَوْ مِنْ غَیْرِهَا"۔

"وَإِنْ لَمْ یُشِرْ إلَیْهَا وَنَقَدَ مِنْهَا، فَقَدْ اسْتَفَادَ بِذَلِکَ سَلَامَةَ الْمُشْتَرَی فَتَمَکّنَتْ الشُّبْهَةُ فَیَخْبُثُ الرّبْحُ، وَإِطْلَاقُ الْجَوَابِ فِی الْجَامِعَیْنِ وَالْمُضَارَبَةُ دَلِیلُ صِحّةِ هَذَا الْقَوْلِ، وَمِنْ مَشَایِخِنَا مَنْ اخْتَارَ الْفَتْوَی فِی زَمَانِنَا بِقَوْلِ الْکَرْخِیّ تَیْسِیرًا لِلْأَمْرِ عَلَی النّاسِ لِازْدِحَامِ الْحَرَامِ، وَجَوَابُ الْکُتُبِ أَقْرَبُ إلَی

التّنَزُّهِ وَالِاحْتِيَاطِ، وَاللّٰهُ تَعَالَى أَعْلَمُ ، وَلِأَنّ دَرَاهِمَ الْغَصْبِ مُسْتَحَقّةُ الرّدّ عَلَى صَاحِبِهَا، وَعِنْدَ الِاسْتِحْقَاقِ يَنْفَسِخُ الْعَقْدُ مِنْ الْأَصْلِ، فَتَبَيّنَ أَنّ الْمُشْتَرَى كَانَ مَقْبُوضًا بِعَقْدٍ فَاسِدٍ، فَلَمْ يَحِلّ الِانْتِفَاعُ بِهِ'' (بدائع الصنائع ۷/ ۱۵۵) مفتی شکیل منصور قاسمی، نیز دیکھئے مقالہ مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ''فقہ البیوع'' میں لکھا ہے:

''**وعلى هذا يخرج ما إذا غصب ألفا، فاشترى جارية، فباعها بألفين، ثم اشترى بالألفين جارية، فباعها بثلاثة آلاف أنه يتصدق بجميع الربح في قولهما، وعند أبي يوسفؒ: لايلزمه التصدق بشئ، لأنه ربح مضمون مملوك، لأنه عند أداء الضمان يملكه مستندا إلى وقت الغصب ومجرد الزمان يكفي الطيب فكيف إذا اجتمع الضمان والملك**'' (فقہ البیوع ۱/ ۱۰۴۳) مفتی عثمان بستوی۔

حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ کا ایک فتوی اس سلسلہ میں موجود ہے:

''الجواب: جوئے کے پیسے سے جو زمین خریدی گئی ہے، اس زمین کی پیداوار اس وقت تک مشتبہ رہے گی، جب تک یہ شخص ان لوگوں کو اتنی مقدار میں پیسہ واپس نہ کردے، جس مقدار کا پیسہ جوئے میں ہارنے والوں سے وصول کیا ہے، ہارنے والوں ہی کو وہ پیسہ واپس کردینا ضروری ہے، اس کے بعد زمین کی پیداوار بلا شک وشبہ حلال ہوگی'' (فتاوی محمودیہ ڈابھیل ۱۸/ ۴۱۵، احسن الفتاوی ۸/ ۱۰۴) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

اسی طرح مفتی محمد شاہجہاں ندوی اور مفتی مقصود فرقانی نے موروثی حرام جائداد اور خود کمائی کے ذریعہ جمع کی ہوئی حرام جائیداد کے حکم میں فرق کو بیان کیا ہے۔

سوال نمبر ۳: (الف) شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کر رہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے، اور اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس عورت کو کیا کرنا چاہئے؟

اس سوال کے جواب میں تقریبا تمام ہی مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ ایسی خاتون کے لئے جبکہ کمائی کا کوئی دوسرا ذریعہ بھی نہ ہو اپنے شوہر اور بیٹے کی حرام کمائی سے بقدر ضرورت کھانے کی گنجائش ہے، حرام کمائی کا گناہ شوہر اور بیٹے پر ہوگا۔

دلائل:

☆ قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**إلا من تاب وآمن وعمل عملا صالحا فأولئک يبدل الله سيئاتهم حسنات**'' (سورۂ فرقان: ۷۰)۔

☆ "عن عمرو بن العاصؓ.....أما علمت أن الإسلام يهدم ما كان قبله أى يسقطه ويمحوأثره" (صحیح مسلم مع شرح النووی)۔

☆ ردالمحتار میں ہے:"اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها والإثم على الزوج" (ردالمحتار ۶/۱۹۱) مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عفان منصور پوری، مولانا وصی احمد قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا قمر الزمان ندوی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مولانا روح الامین سعادتی، مولانا نثار احمد گودھروی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا عبدالحکیم، مولانا حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی رضی احمد رحمانی، مفتی اکرم رشید، مفتی محمد زبیر ندوی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی۔

☆ "وفى الخانيه: امرأة زوجها فى أرض الجور، إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصبا أو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهى فى سعة من ذلك، والإثم على الزوج" (ردالمحتار، کتاب الحظر والإباحۃ ۶/۳۸۶) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی عبدالرشید کانپوری، مفتی وصی احمد قاسمی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی زبیر محمد ندوی، مفتی صالح زماں، مفتی مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا عبدالحکیم، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی۔

☆ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب "بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرۃ" میں رقم طراز ہیں:"يجب على الزوجات فى مثل هذا الحال أن يبذلوا أقصى ما فى وسعهم فى تحذير أزواجهن عن العمل فى بيع الخمور والخنازير ولكنهم إن أبوا إلا العمل فيه، فإن تيسرلهن تحمل نفقات أنفسهن بطريق مباحة، فلايجوز لهن الأكل من أموال أزواجهن وإن لم يتيسر لهن ذلك، فيسع لهم الأكل والإثم على الأزواج والآباء، للأطفال الصغار حكم الزوجات، أما الأولاد الكبار فعليهم أن يكسبوا لأنفسهم، ولا يأكلوا من هذا المال، و جواز الأكل للزوجة فى مثل هذه الحالة قد صرح به بعض الفقهاء" (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ۱/۳۴۷) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ فتاوی ہندیہ میں ہے:"وكذا لواشترى لها طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهى فى سعة من تناوله ذلك الطعام والثياب ويكون الإثم على الزوج" (فتاوی ہندیہ ۵/۳۳۵) مولانا اکرم رشید رحمانی، مولانا عبد الأحد قاسمی۔

☆ ہدایہ میں شرط بھی ہے کہ اس محتاج کے پاس کوئی اور مال نہ ہو جو اس کی ضرورت پوری کرے تو ہی وہ خرچ کر سکتا ہے:

"إلا إذا كان لا يجد غيره، لأنه محتاج إليه وله أن يصرفه إلى حاجة نفسه، فلو أصاب ما لاتصدق بمثله إن كان غنيا وقت الاستعمال وإن كان فقيرا فلا شئ عليه" (الہدایہ مع فتح القدیر ۸/۲۵۷) مفتی

اشتیاق احمد قاسمی، مفتی عبدالرزاق امروہوی۔

☆ ''فتاوی اللجنۃ الدائمۃ میں ہے:

"إذا كانت تعلم أن الكسب الذى يأتى به إلى البيت حرام فلا يجوز لها أن تأكل منه، عليها أن تطالبه بالنفقة من كسب طيب أو ترفع أمره إلى الجهة المسئولة كالمحكمة الشرعية" (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۲۱/ ۱۶۷) مولانا فیاض احمد برمارے۔

☆ الفتاوی الرئیسیۃ میں ہے:

"وأما انتفاع الزوجة والأولاد بهذا المال المحرم، فله حالتان:الأولى: أن تكون الزوجة والأولاد غير قادرين على تحصيل المال الحلال إما لعجز أو صغر، فحكمهم حكم المضطر فيأخذون منه ما يكفيهم، وينكرون بألسنتهم إن استطاعوا، فإن عجزوا فبقلوبهم إلى أن يصبحوا قادرين على الكسب والاستغناء فيحرم عليهم عندئذ الأكل مما مصدره حرام.*الثانية: أن يكون لهم القدرة على الاعتماد على أنفسهم والاستغناء عن مال الأب الحرام، فلا يجوز لهم الأكل منه،فإذا كان مال زوجك كله من الحرام فلا يجوز لكم الأكل من ماله إلا أن تضطروا فتأكلوا بقدر الحاجة" (الفتاوی الرئیسیۃ ۴/ ۹۳) مفتی فیاض احمد برمارے۔

☆ شیخ ابن عثیمین فرماتے ہیں:**"وأما الخبيث لكسبه فمثل الماخوذ عن طريق الغش،أو عن طريق الربا أو عن طريق الكذب وما أشبه ذلك وهذا محرم على مكتسبه وليس محرما على غيره إذا اكتسبه منه بطريق مباح"** (تفسیر سورۂ بقرہ:۱/ ۱۹۸) ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی۔

☆ فتاوی محمودیہ میں ہے:''اگر وہ رشوت اور غصب نہ ہو تو گنجائش ہے، یعنی بعینہ حرام مال کا لینا ناجائز ہے، البتہ اس کے عوض کی چیزوں میں وسعت ہے اور گناہ شوہر پر ہے'' (فتاوی محمودیہ، کتاب الحظر والاباحہ ۱۸/ ۴۱۲) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

☆ اس مسئلہ پر شیخ عباس احمد باز لکھتے ہیں:

"أما الأبناء ففى حكم إنفاقهم من المال الحرام الذى عند الأب ينبغى التفريق بين حالتين:

الأولى: أن يكون الابن غير قادر على تحصيل المال الحلال، إما لعجزه أو لصغر سنه، وكانت نفقته واجبة على أبيه أو كان طالب علم ليس له مصدر رزق للعيش ودفع نفقات الدراسة إلا هذا المال الحرام الذى عند الأب، فإن حكمه فى الأخذ من هذا المال حكم المضطر إلى دفع الأذى عن نفسه بالميتة، فيجوز له أن يأخذ ما ينفقه عليه والده، وأن ينتفع به مع إنكاره فى قلبه لهذا الأمر إلى

أن يصبح قادراً على الاعتماد على نفسه فى تحصيل الكسب الحلال أو أن يأتيه مال من مصدر حلال، فيستغنى به عما عند والده من مال حرام، لأنه عند حصول المال الحلال تزول ضرورته إلى الإنفاق على نفسه من المال الحرام، ويكون لزاماً عليه أن ينفق على نفسه من هذا المال الحلال، ويحرم عليه أن يقبل نفقة والده من المال الحرام۔

الثانية: أن يكون الابن قادراً على الاعتماد على نفسه والاستغناء عن والده، وله قدرة على تحصيل المال من مصدر حلال، فإنه يحرم عليه أن يقبل نفقة والده من المال الحرام لاستغنائه بنفسه عن هذا المال، فإن قبل الإنفاق على نفسه من هذا المال الحرام كان آثماً لاعتدائه على مال غيره بهذا الإنفاق، ولعدم وجود ما يستلزم الأخذ من هذا المال ما دام أن المال الحلال موجود أو ممكن الوجود بالعمل والجد سلوك الطريق المشروع فى التحصيل، فإذا بلغ الصغير قادراً على الكسب، واستغنى الطالب بنفسه عن مال أبيه، حرم عليه أن يقبل نفقة والده من المال الحرام۔

فهو فى حال عجزه وصغره حاله كحال الفقير العاجز عن الكسب، يجوز له أن ينفق على نفسه من المال الحرام للحاجة، أما فى حال استغنائه بنفسه فهو غنى بقدرته على الكسب، فتزول حاجته إلى المال الحرام" (احکام المال الحرام: الفصل الرابع، المبحث الثانی الانتفاع بالمال الحرام، المطلب الأول، ص/۲۸۹، ۲۹۰، ط: دار النفائس، الأردن) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

سوال نمبر ۳(ب) حرام کمائی سے اپنے بچے کو خوب پڑھایا، لکھایا، اعلیٰ تعلیم دی، اب پڑھنے کے بعد بچہ کمائی کر رہا ہے، اس کمائی کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں تقریبا تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگر حرام کمائی سے بچے کی تعلیم وتربیت کی اور اس کو اعلی تعلیم دلائی، اب وہ حلال کاروبار یا حلال ملازمت کر رہا ہے تو اس بچے اور بیٹے کی کمائی حلال ہے۔

دلائل:

حرام کمائی سے پڑھانے کا گناہ باپ پر ہوگا، اس لئے کہ تعلیم وتربیت اور اولاد کے نفقہ کی ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے:

☆ قرآن کریم میں اپنے کو اور اپنی اولاد کو گناہ سے بچانے اور بہتر تعلیم وتربیت کا حکم دیا گیا ہے: "**يأيها الذين آمنوا قوا**

أنفسكم وأهليكم نارا....." (سورۂ تحریم:۶) مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ اسی آیت کی تفسیر میں علامہ بیضاوی فرماتے ہیں:"**بترک المعاصی و فعل الطاعات "وأهليكم"بالنصح والتأديب**" (تفسیر بیضاوی ۵/۳۵۷) مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ "**مانحل والدولدا من نحل أفضل من أدب حسن**" (سنن ترمذی، حدیث نمبر:۱۹۵۲، مسند احمد، حدیث نمبر:۱۵۴۰۳) مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ اس لئے کہ بیٹے کی کمائی کا تعلق اس کے عمل سے ہے اور عمل حلال ہے، علامہ نووی نے امام غزالیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے:

☆ **قال الغزالی: "الأسواق التی بناها السلاطین بالأموال الحرام تحرم التجارة فیها وسکناها فإن سکنها بأجرة وکسب شیئا بطریق شرعی کان عاصیا بسکناه ولا یحرم کسبه وللناس أن یشتروا منه ولکن إن وجدوا سوقا أخری فالشراء منها أولی لأن الشراء من الأولی إعانة لسکانها وترغیب فی سکناها وکثرة أجرتها والله سبحانه وتعالی أعلم**" (المجموع شرح المہذب، کتاب البیوع، باب ماینہی عنہ من بیع الغرر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۰/۳۸۰) مفتی امانت علی قاسمی۔

☆ **والأجرة تستحق باستیفاء المعقود علیه...فإذا استوفی المعقود علیه استحق الأجرة عملا بالمساواة، وإذا اشترط التعجیل أو عجلها فقد رضی بإسقاط حقه فی التأجیل فیسقط.قال: (وإذا تسلم العین المستأجرة فعلیه الأجرة وإن لم ینتفع بها)**" (الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الإجارہ، فصل ماتستحق بہ الاجرۃ، ج، ط: مطبعۃ الحلبی - القاہرۃ ۲/۵۵) مفتی امانت علی قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی وصی احمد قاسمی۔

☆ ہدایہ میں ہے:"**ثم أجرة تستحق بأحدی معانی ثلاثة، أما بشرط التعجیل أو التأجیل من غیر شرط أو باستیفاء المعقود علیه**" (الہدایہ ۳/۲۹۳) مفتی وصی احمد قاسمی، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی۔

☆ فتاوی محمودیہ میں ایک سوال ہے کہ ایک آدمی نے رشوت دے کر سرکاری ملازمت حاصل کی، اب اس ملازمت سے جو پیسہ کمایا ہے وہ جائز ہے یا نہیں، اس کے جواب میں حضرت مفتی محمود الحسنؒ نے فرمایا:"اگر ملازمت کا کام جائز ہے تو اس کی ملازمت کی آمدنی، تنخواہ بھی جائز ہے، ابتداء اگر ملازمت حاصل کرنے کے لئے رشوت دی تو اس کی وجہ سے اس ملازمت کی آمدنی جو کہ درحقیقت خدمت ومحنت کا معاوضہ ہے ناجائز نہیں ہے، رشوت کا گناہ اس آمدنی تک نہیں پہنچا" (فتاوی محمودیہ، باب الرشوۃ ۲۴/۲۲۶، طبع جامعہ فاروقیہ) مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی راشد حسین ندوی۔

البتہ بعض مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ جتنا مال حرام اس کی پڑھائی میں خرچ ہوا ہے اس کا اندازہ کر کے اتنے پیسے اس بچے کی کمائی سے صدقہ کر دیئے جائیں۔

"و على هذا لو مات رجل و كسبه من ثمن الباذق والظلم وأخذ الرشوة تعود الورثة ولايأخذون منه شيئا وهو الأولى لهم ويردونه على أربابه إن عرفوهم وإلا يتصدقوا به لأن سبيل الكسب التصدق إن تعذر الرد" (البحر الرائق، کتاب الکراہیۃ ۸/۳۶۹) مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی اشرف قاسمی، مفتی مغفور باندوی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی مقصود فرقانی، حافظ سید فاروق عمری۔

سوال نمبر ۴: اکثر بستی والے شادی بیاہ اپنی بستی کے اندر ہی کرتے ہیں، اور زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے شادی وغیرہ میں جب دعوت دیتے ہیں تو ہم کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے، یا آدھا حصہ حرام اور آدھا حلال ہے، تو اس وقت اس کی دعوت میں کھانے کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں چند ایک کے علاوہ تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ دعوت دینے والا حرام مال سے دعوت کر رہا ہے تو ایسی دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہے، البتہ احتیاط کرنا بہتر ہے۔

دلائل:

☆ مسند احمد کی روایت ہے: "عن أنس بن مالكؓ أنه مشى إلى رسول الله ﷺ بخبز وشعير و إهالة سخته ولقدرهن درعه عند يهود فأخذ شعيرا لأهله" (مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۱۳۱۶۹)۔

اس روایت کے ذیل میں ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں: "فإن النبي ﷺ رهن درعه من يهودي بشعير أخذه لقوت أهله مع أنهم يربون في معاملتهم ويستحلون أثمان الخمور" (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح ۶/۱۱) مولانا قمر الزماں ندوی، ڈاکٹر کلیم اللہ عمری، مفتی محمد زبیر ندوی۔

☆ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إذا دخل أحدكم على أخيه مسلم فليأكل من طعامه ولا يسأل ويشرب من شرابه ولا يسأل" (رواہ البیہقی فی شعب الإیمان) (مشکوۃ المصابیح مع مرقاۃ المفاتیح ۶/۳۴۶) مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا خورشید احمد مفتاحی۔

مسند احمد بن حنبل میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ ہے: "إذا دخل أحدكم من أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولا يسئله عنه، فإن سقاه شرابا من شرابه فليشرب من شرابه ولا يسأل عنه" (مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر: ۹۰۹۶) مفتی محمد اشرف قاسمی۔

اس حدیث کی شرح لمعات التنقیح میں مولانا عبد الحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"(ولا يسأل) بحيث يفضي إلىٰ سوء الظن وإيذائه ويستكشف حقيقة الحال من غير سوال وإيذاء وذالک إذا لم يعلم فسقه وظلمه وتجاوزه عن الحد وبالجملة إذا علم بيقين أو غلبة الظن أنه محتاط في أمر طعامه فذاک، وإن تساويا فالاحتياط في الترک، وإن كان له وجوه متعددة في الرزق بعضها طيب وبعضها خبيث وأحسن الظن باحتمال أنه يأكل من الوجوه الطيبة فله وجه الجواز، وإن تعين أنه لايحتاط وتعين أنه يأكل الحرام أو ليس له إلا مدخل سوء فكلّا" (لمعات التنقیح ۴/۱۰۰) مفتی جمیل احمد نذیری۔

☆ حضرت حارث بن سوید کا بیان ہے:

"جا رجل إلى عبد الله يعنى ابن مسعود فقال: إن لى جارا ولا أعلم له شيئا إلا خبيثا أو حراما وإنه يدعونى فأحرج أن آتيه وأتحرج أن لا آتيه، فقال:أئته واجبه فإنما وزره عليه" (بلوغ الأرب بتقرب کتاب الشعب ۱/۳۹۰) مولانا اختر امام عادل قاسمی۔

☆ حضرت سفیان ثوریؒ نے اس پر وضاحتی نوٹ لگایا کہ البتہ اگر بعینہ حرام مل جائے تو اس سے احتیاط کی جائے:

"عن ذربن عبد الله عن بن مسعود قال جاء إليه رجل فقال إن لى جارا يأكل الربا وإنه لا يزال يدعونى فقال

مهنأه لک وإثمه عليه قال سفيان فإن عرفته بعينه فلا تصبه" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۰، حدیث نمبر ۱۴۶۷۵)

☆ حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے بھی وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی ہے:

"أخبرنا عبد الرزاق قال:أخبرنا معمرعن أبى إسحاق عن الزبير بن عدى عن سلمان الفارسى قال : إذا كان لک صديق عامل ، أو جار عامل أو ذو قرابة عامل ،فأهدى لک هدية، أو دعاک إلى طعام ، فاقبله ، فإن مهنأه لک، وإثمه عليه" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۰، حدیث نمبر ۱۴۶۷۵)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے بھی اباحت ہی کی ہے:

☆ "عن ربيع بن عبد الله سمع رجلاً سأل ابن عمر: إن لى جاراً يأكل الربا، أو قال خبيث الكسب، وربما دعانى لطعامه أفأجيبه؟ قال: نعم، قَالَ الشَّيْخُ: "وَهَذَا عَلَى الْإِبَاحَةِ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِى، الَّذِى أَطْعَمُهُ مِنْ كَسْبِهِ الْخَبِيثَ، أَمْ لَا، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ حَقٌّ" (سنن البیہقی الکبری ۵/۳۳۵، حدیث نمبر ۱۰۶۰۵) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی عبدالرزاق امروہوی، مفتی روح الامین سعادتی، مفتی مغفور باندوی۔

"عن منصور، قال: قلت لإبراهيم إن لى جارا عاملا، وإنه دعانى إلى طعام، فأبيت أن أجيبه،

فقال:إن الشيطان عرض بينكم ليوقع بينكم العداوة ، وقد كانت الأمراء يهمطون ثم يدعون فيجابون" (جامع معمر بن راشد ۴/۴۲۱، حدیث نمبر ۱۶۴۱) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ مصنف عبدالرزاق میں روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"**أخبرنا عبد الرزاق قال أخبرنا معمر عن منصور قال قلت لإبراهيم عريف لنا يهبط ويصيب من الظلم فيدعونى فلا أجيبه قال: الشيطان عرض بهذا ليوقع عداوة وقد كان العمال يهبطون ويصيبون ثم يدعون فيجابون**" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۱)۔

☆ "**أخبرنا عبد الرزاق قال: أخبرنا معمر عن منصور قال: قلت لابراهيم: نزلت بعامل، فنزلنى وأجازنى، قال: اقبل، قلت: فصاحب ربا، قال: اقبل ما لم تأمره أو تعينه**" (حوالہ سابق)۔

☆ "**أخبرنا عبد الرزاق قال: أخبرنا معمر قال: سئل الحسن أيؤكل طعام الصيارفة؟ فقال: قد أخركم الله عن اليهود والنصارى، إنهم يأكلون الربا، وأحل لكم طعامهم**" (حوالہ سابق) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ علامہ ابن قدامہ مقدسی لکھتے ہیں:

"**وَمِمَّنْ كَانَ يَقْبَلُ جَوَائِزَهُمْ ابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبّاسٍ، وَعَائِشَةُ وَغَيْرُهُمْ مِنْ الصّحَابَةِ، مِثْلُ الْحَسَنِ، وَالْحُسَيْنِ وَعَبْدِ اللّهِ بْنِ جَعْفَرٍ .وَرَخّصَ فِيهِ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَمَكْحُولٌ، وَالزُّهْرِيُّ وَالشّافِعِيُّ. وَاحْتَجّ بَعْضُهُمْ بِأَنّ النّبِيّ – صَلّى اللّهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ – اشْتَرَى مِنْ يَهُودِيٍّ طَعَامًا، وَمَاتَ وَدِرْعُهُ مَرْهُونَةٌ عِنْدَهُ .وَأَجَابَ يَهُودِيًّا دَعَاهُ، وَأَكَلَ مِنْ طَعَامِهِ. وَقَدْ أَخْبَرَ اللّهُ تَعَالَى أَنّهُمْ أَكّالُونَ لِلسُّحْتِ وَرُوِيَ عَنْ عَلِيٍّ، – رَضِيَ اللّهُ عَنْهُ –، أَنّهُ قَالَ: لَا بَأْسَ بِجَوَائِزِ السُّلْطَانِ، فَإِنّ مَا يُعْطِيكُمْ مِنْ الْحَلَالِ أَكْثَرُ مِمّا يُعْطِيكُمْ مِنْ الْحَرَامِ .وَقَالَ: لَا تَسْأَلُ السُّلْطَانَ شَيْئًا، وَإِنْ أَعْطَى فَخُذْ، فَإِنّ مَا فِي بَيْتِ الْمَالِ مِنْ الْحَلَالِ أَكْثَرُ مِمّا فِيهِ مِنْ الْحَرَامِ**" (المغنی لابن قدامۃ، ۴/۲۰۲، ط مکتبۃ القاہرۃ) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ "**وقد رُوى عن الإمام محمد رحمه الله تعالى حِلُّ الانتفاع بقدر الحلال بصراحة .جاء فى التتار خانية عنه: غَصب عشرة دنانير، فألقى فيها ديناراً، ثمّ أعطى منه رجلاً ديناراً، جاز، ثم ديناراً آخر، لـ. والحلال ههنا أقل، ولكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة**" (فقہ البیوع ص/۱۰۲۱/ ۱۰۳۴) مفتی عثمان بستوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی۔

لیکن ایسی صورت میں بھی احتیاط بہتر ہے:

"**والأولى فى هذه الصورة التنزه، ولكن يجوز للآخذ أن يأخذ منه بعض ماله هبة أو شراء، لأن**

الأصل الإباحة .وينبغي أن يُقيَّد ذلک بأن يغلب على ظن الآخذ أن الحلال فيه بقدر ما يأخذه أو أكثر منه وهو مَحْمِل ماجاء في العبارات الآتية:

قال الإمام محمد رحمه الله تعالى في كتاب الآثار: "أخبرنا أبو حنيفة، قال: حدثنا محمد بن قيس أن أبا العوجاء العشار كان صديقاً لمسروق، فكان يدعوه، فيأكل من طعامه ويشرب من شرابه، ولا يسأله" قال محمد وبه نأخذ، ولا بأس بذلک، مالم يعرف خبيثاً بعينه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى۔

أخرج عبد الرزاق في مصنفه عن الثوري عن سلمة بن كهيل عن زربن عبدالله عن ابن مسعود رضي الله تعالى عنه قال: "جاء إليه رجل، فقال: إن لي جاراً يأكل الربوا، وإنه لا يزال يدعوني، فقال: مهناه لک وإثمه عليه" قال سفيان: فإن عرفته بعينه، فلا تصبه" (فقہ البیوع ص/ ۱۰۳۸/۱۰۳۹) مفتی عثمان بستوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی۔

☆ **امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں ہے:"أخبرنا أبوحنيفه، حدثنا محمد بن قيس أن أبا العوجاء العشار كان صديقا لمسروق فكان يدعوه فيأكل من طعامه ويشرب من شرابه ولا يسأله، قال محمد وبه نأخذ ولا بأس بذلک مالم يعرف خبيثاً بعينه وهو قول أبي حنيفةؒ"** (کتاب الآثار، باب الدعوۃ/۱۹۹) مفتی روح الامین سعادتی۔

البتہ مقالہ نگار حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر دعوت دینے والے کی غالب آمدنی یا غالب کاروبار حرام ہو تو ایسے لوگوں کی دعوت قبول نہیں کرنا چاہئے۔

دلائل:

☆**"عن عمران بن حصينؓ قال: نهى النبي ﷺ عن إجابة طعام الفاسقين"** (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۸/۱۶۸) مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا شاکر نثار مدنی، مولانا خورشید احمد مفتاحی۔

☆ **"قال في القنيه من الكراهة:غلب ظنه، أن أكثر بيوعات أهل السوق لا تخلو عن الفساد فإن كان الغالب هو الحرام تنزه عن شراء ه ولكن مع هذا لو اشتراه يطيب له"** (الاشباہ والنظائر علی مذہب أبی حنیفہ النعمان ۱/۱۱۳) مولانا اختر امام عادل قاسمی۔

☆ **"إذا كان غالب مال المهدى حلالا فلا بأس بقبول هديته وأكل ماله مالم يتبين أنه من حرام و إن**

كان غالب ماله من الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه، قال الحلوانی: وكان الإمام أبو القاسم الحاكم يأخذ جوائز السلطان، والحيلة فيه أن يشترى شيئا بمال مطلق ثم ينقده من أي مال شاء كذا رواه الثانی عن الإمام وعن الإمام أن المبتلى بطعام السلطان والظلمة يتحرى فإن وقع فی قبله حله قبل وأكل وإلا لا، لقوله عليه السلام: استفت قلبك" (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۱۲) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی۔

☆ مجمع الانہر میں ہے:"**وفی الخلاصة: السلطان إذا قدم شيئا من الماكولات إن اشتراه يحل وإن لم يشتره ولكن الرجل لا يعلم أن فی الطعام شيئا مغصوبا بعينه يباح أكله وفی الخانية :رجل غصب لحما فطبخه أو حنطة فطحنها قال أبوبكر البلخی: يحل له أكله وعليه الضمان فی قول الإمام وهذا ظاهر قوله لأن قول الإمام و محمد: إذا غصب حنطة فطحنها أولحما فطبخه يقطع حق المالك ويصير ملكا للغاصب**" (مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر ۴/ ۱۸۷) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

☆ "**لايجيب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راض بفسقه وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال وبالعكس يجيب مالم يتبين عنده أنه حرام كذا فی التمرتاشی**" (ہندیہ کتاب الکراہیہ ۵/ ۳۴۳) مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی محمد عفان منصور پوری۔

☆ مجمع الأنہر میں ہے:"**وفی البزازيه:غالب مال المهدی إن حلالا، لا بأس بقبول هديته وأكل ماله مالم يتبين أنه من حرام، لأن أموال الناس لا يخلو عن حرام وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال أورثته واستقرضته**" (مجمع الانہر کتاب الکراہیۃ ۴/ ۱۸۶) مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی رضی احمد رحمانی۔

☆ المحیط البرہانی میں ہے:"**رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحرام لا ينبغی أن يقبل ويأكل من طعامه مالم يخبر أن ذلك المال حلال استقرضه أو ورثه**" (المحیط البرہانی ۵/ ۲۳۰) مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا جمیل اختر جلیلی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی عبد الرشید قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی شفیق بڑودوی، مفتی سلیم قاسمی، مولانا اکرم رشید رحمانی۔

☆ ردالمحتار میں ہے:"**وفی الذخيره:سئل أبو جعفر عمن اكتسب ماله من أمر السلطان والغرامات المحرمة وغير ذلك، هل يحل لمن عرف ذلك:أن يأكل من طعامه؟قال:أحب إلي فی دينه أن لايأكل ويسعه حكما وإن لم يكن غصبا أورشوة**" (ردالمحتار کتاب الحظر والاباحۃ ۶/ ۳۸۶) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی

امانت علی قاسمی۔

☆ فقہ البیوع میں ہے:"وقد روى عن الإمام محمدؒ حل الانتفاع بقدر الحلال بصراحة، جاء فى التتارخانية عنه: غصب عشرة دنانير، فألقى فيها دينارا ثم أعطى منه رجلا دينارا جاز، ثم دينارا آخر، لا، والحلال ههنا أقل ولكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة" (فقہ البیوع ۱۰۲۱/۲، ۱۰۲۴) مفتی عثمان بستوی۔

☆ الفتاوی التاتارخانیہ میں آیا ہے:"إن كان غالب ماله من حلال فلا بأس به بأن يقبل الهدايا ويأكل مالم يبين له أن ذلك من الحرام" (الفتاوی التاتارخانیہ ۱۷۵/۱۸) مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی۔

☆ شرح السنہ میں ہے:"قالوا إذا كان المال فيه الحلال والحرام فلا بأس أن يوكل منه إلا أن يعلم أن الذى يطعمه أو يهديه إليه حرام بعينه فلا يحل" (شرح السنہ ۱۴/۸) مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی۔

☆ "آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو اضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل وإن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها" (الفتاوی الہندیہ، کتاب الکراہیۃ ۳۴۲/۵) مفتی امانت علی قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی۔

☆ علامہ حموی لکھتے ہیں:"معاملة من أكثر ماله حرام ولم يتحقق الماخوذ من ماله عين الحرام فلا تحرم مبايعته لإمكان الحلال وعدم التحريم ولكن يكره خوفا من الوقوع فى الحرام، كذا فى فتح القدير" (غمز عیون البصائر ۱۹۲/۱) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ علامہ عینی لکھتے ہیں:"إن كان أكثر ماله حلالا، بأن كان صاحب تجارة، أو زرع حل قبول هديته وأكل طعامه وإلا حرم، لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام ويخلو عن كثير، فكانت العبرة للغالب والأحوط ألا يقبل، لأن شبهة الحرام ربما توقعه فى أخذ الحرام" (منحۃ السلوک شرح تحفۃ الفقہاء ۷۷۴/۲) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

مال مخلوط کا حکم:

"إن الحلال بين وإن الحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرا لدينه وعرضه ومن وقع فى الشبهات وقع فى الحرام" (صحیح مسلم، حدیث:۱۵۹۹)۔

دکتور رائد بن عبد الرحمٰن الشعلان لکھتے ہیں:

"لا خلاف بين العلماء فى جواز إجابة دعوة صاحب المال المختلط، إذا علم أن طعامه من

حلال، كما أنه لا خلاف بينهم فى حُرمة إجابة دعوته إذا علم أن طعامه من حرام۔

واختلفوا فى مشروعية إجابة دعوته فيما جهلت عينه من طعامه، بأن يعلم المدعو أن لدى الداعى كسباً محرماً، لكنه يجهل عين الطعام الذى دعى إليه، هل هو من الحلال، أم من الحرام؟ على ثلاثة أقوال:

القول الأول: تجوز إجابة دعوة صاحب المال المختلط مع الكراهة ، وهو القول المعتمد عند المالكية، وقول الشافعية، والمذهب عند الحنابلة، وقول بعض الحنفية، وبه قال ابن حزم۔

القول الثانى: تحرم إجابة دعوة صاحب المال المختلط، وهو قول بعض المالكية، ورواية عن الإمام أحمد۔

القول الثالث: التفريق بين إجابة دعوة من أكثر ماله من الحلال، وبين إجابة دعوة من أكثر ماله من الحرام، فتجوز إجابة دعوة صاحب المال المختلط الذى أكثر ماله من الحلال، وتحرم إجابة دعوة صاحب المال المختلط الذى أكثر ماله من الحرام، وهو قول الحنفية، والغزالى من الشافعية، ورواية عن الإمام أحمد (المال المختلط دراسة فقهية تطبيقية: الباب الثانی أحكام المال المختلط ،الفصل الثالث،المبحث الثالث ۲۱۰،۲۰۹،ط: وزارة التعليم العالی، جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية ،كلية الشريعة بالرياض) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

امداد الفتاوی میں ہے:

(سوال) جس شخص کی آمدنی مختلط ہو یعنی سودی کاروبار کرتا ہے، نیز کھیتی وغیرہ حلال آمدنی بھی کرتا ہے، ایسے شخص کے مکان میں خورد ونوش کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بر تقدیر جواز لم بھی ارشاد ہو، اس لئے کہ بظاہر تو عدم جواز کو ترجیح ہے، حسب قواعد اصول "**اذا اجتمع الحلال والحرام فغلب الحرام**"۔

(جواب) اس میں غالب کا اعتبار ہے، اگر حلال غالب ہے تو حلال ہے اور اگر حرام غالب ہے یا دونوں متساوی ہیں تو حرام ہے اور واقعی "**اذا اجتمع الحلال والحرام**" کا مقتضی حرمت علی الاطلاق تھا، لیکن دفع حرج کے لئے اعتبار غالب کا کیا گیا (امداد الفتاویٰ: کتاب الحظر والاباحت، مال حرام ومشتبہ کے احکام، ۴/ ۱۴۸، سوال نمبر ۱۸۳، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

حلال وحرام معلوم کرنے کا طریقہ:

فتاوی ہندیہ میں مذکور ہے: "**رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السوال أنه حلال أم حرام؟ قالوا: ينظر إن كان فى بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال فى أسواقهم ليس على المشترى**

أن يسأل أنه حلال أم حرام ومبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (الفتاوی الہندیہ ۳/۲۱۰) مفتی شاکر ثار مدنی۔

مفتی اقبال محمد ٹنکاروی اور مولانا عبید اللہ ندوی لکھتے ہیں: جب یہ معلوم نہ ہو کہ غالب کیا ہے تو تحقیق کر لی جائے، اور تحقیق ممکن نہ ہو تو حالت اضطراری میں تحری کرے اور حالت اختیار میں دعوت قبول نہ کرے،"**وعن الإمام أن المبتلى بطعام الظلمة يتحرى، إن وقع فى قلبه حله قبل وأكل وإلا لا، لقوله عليه السلام استفت قلبك**" (مجمع الأنہر، کتاب الکراہیہ ۴/۱۸۶)۔

جبکہ مفتی حبیب اللہ قاسمی صاحب لکھتے ہیں کہ جب بستی والے زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہوں تو ان کی دعوت میں کھانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ تعاون علی المعصیت کے قبیل سے ہے، جس کی ممانعت نص قطعی سے ثابت ہے،"**وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (سورۂ مائدہ:۲)۔

سوال نمبر ۵: کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو وہ کس طرح اس کی تلافی کرے؟

اس سوال کے جواب میں تمام مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ اگر دعوت میں کھانا کھانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ حرام مال سے ہے تو کھانے والا گنہگار نہیں ہوگا، اس کی تلافی کی ایک شکل یہ ہے کہ اگر کھانا پیٹ میں ہو ہو اور قے کرنا ممکن ہو تو حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی جائے۔

تلافی کی شکل اور اس کا ثبوت:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

كانَ لأبى بَكْرٍ الصِّدِّيقِ غُلامٌ يُخرِجُ لَهُ الخَراجَ، وكانَ أَبو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهِ، فَجَاءَ يَومًا بِشَيءٍ، فَأَكَلَ مِنهُ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ لَهُ الغُلامُ: تَدْرِى مَا هَذا؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: ومَا هُوَ؟ قَالَ: كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لإِنْسَانٍ فى الجاهِلِيَّةِ، ومَا أُحْسِنِ الكَهَانَةَ إِلا أَنِّى خَدَعْتُهُ، فَلَقِينى، فَأَعْطَانى بِذلكَ هَذَا الَّذِى أَكَلْتَ مِنْهُ، فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَه، فَقَاءَ كُلَّ شَيءٍ فِى بَطْنِهِ" (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۲۴۸۳) مفتی جمیل اختر ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی عبد الرشید کانپوری، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی نیاز احمد ندوی، مفتی محمد ابراہیم ورتھی۔

اس حدیث کے تحت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

وقال ابن الملک: أخذ منه الشّافعی – رحمه الله– أن من أكل الحرام وهو عالم به أو جاهل، ثمّ علم لزمه أن يتقيأ جميع ما أكله فورا۔ وقد جعله الغزالی فی المنهاج من باب الورع الخ''
(مرقاۃ المفاتیح:۵/۱۹۰۶، کتاب البیوع/ باب الکسب وطلب الحلال، ط: دار الفکر بیروت)۔

فیض الباری میں ہے:

''**فيه: أن الإنسان إذا أكل شيئًا خبيثًا، فليفعل به هكذا**'' (فیض الباری:۴/۵۱۴، قبیل باب القسامۃ فی الجاھلیۃ، ط: الکتب العلمیۃ بیروت-لبنان)۔

☆ حرام کمانے والا عند اللہ مجرم ہوگا اور مسئول ہوگا، جس نے اس کی دعوت قبول کی یا دعوت میں شریک رہا یا اس کا تحفہ قبول کیا وہ عند اللہ ذمہ دار نہیں ہوگا، اس لئے کہ آپ ﷺ نے یہودی سے گھر والوں کے خاطر غلہ خریدا تھا، ان کے تحفہ (گوشت) کو قبول فرمایا تھا، یہود کی دعوت کو بھی قبول فرمایا تھا، حالانکہ اکثر یہود کی تجارت اور لین دین سود اور حرام کمائی پر مشتمل تھی، نیز حضرت بریرہؓ کے ہدیہ اور تحفہ کے بارے میں فرمایا تھا: ''**لها صدقة ولنا هدية**''، اطمینان قلب کے لئے صدقہ کرے (مقالہ حافظ کلیم اللہ عمری مدنی)۔

☆ حضرت ابوبکرؓ کے پاس ایک شخص نے کھانا بھیجا اور آپؓ نے تناول فرمالیا، بعد کو معلوم ہوا کہ اس نے کہانت کے ذریعہ اسے حاصل کیا ہے تو آپؓ نے اپنا ہاتھ حلق میں ڈال کر قے کردی:

''**أدخل يده فی حلقه فاستقائه**'' (مصنف عبد الرزاق، حدیث نمبر:۲۰۳۴۶، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی تبریز عالم حلیمی۔

☆ ''**الحرمة تتعدد مع العلم بها وفی الشامی فی تحته: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام تتعدى ذمتين، سألت عن الشهاب بن الشلبی ''فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلک**''
(الدر المختار ورد المحتار ۴/۱۴۶) مفتی رضی احمد رحمانی، مفتی ضیاء الحق قاسمی و دیگر۔

توبہ واستغفار کرے:

تلافی کی دوسری شکل یہ ہے کہ توبہ واستغفار کرے اور صدقہ ادا کرے۔

☆ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**واستغفروا الله إن الله غفور رحيم**'' (سورۂ بقرہ:۱۹۹) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی۔

☆ ''**قل يا عبادی الذين اسرفوا على أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله، إن الله يغفر الذنوب جميعا إنه هو الغفور الرحيم**'' (سورۂ زمر:۵۳) مفتی جمیل اختر جلیلی ندوی۔

☆ "والذين إذا فعلوا فاحشةذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم ومن يغفر الذنوب إلا الله ولم يصروا على مافعلوا وهم يعلمون" (آل عمران:۱۳۵)مفتی محمد شاہجہاں ندوی۔

☆ "إنما التوبة على الذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئک يتوب الله عليهم وكان الله عليما حكيما" (سورۂ نساء:۱۷)مفتی اقبال محمد ٹنکاروی،مفتی وصی احمد قاسمی،مولانا قمرالزماں ندوی،مفتی محمد زبیر ندوی،مفتی محمد اشرف قاسمی،مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی۔

☆ "ومن يعمل سوء أو يظلم نفسه، ثم يستغفر الله يجد الله غفور رحيما" (سورۂ نساء:۱۱۰)مفتی محمد شاہ جہاں ندوی۔

☆ رسول اللہ ﷺ نے تاجروں کی ایک جماعت سے فرمایا:"عن قيس بن أبي عرزة قال خرج علينا رسول الله ﷺ ونحن نسمى السماسرة فقال: يا معشر التجار إن الشيطان والإثم يحضران البيع فشوبوا بيعكم بالصدقة" (سنن الترمذی ۳/ ۵۱۴)مفتی اختر امام عادل قاسمی،مفتی امانت علی قاسمی،مولانا عبیداللہ ندوی،مفتی محمد سلیم قاسمی،مفتی محمد اشرف قاسمی،مولانا سعید احمد ندوی،قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی۔

جتنی مقدار کھایا ہے اتنی مقدار صدقہ کردے:

"الملک الخبيث سبيله التصدق به، ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله وإن كان فقيرا لا يتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۶۱)مفتی عثمان بستوی،مولانا رحمت اللہ ندوی،مفتی وصی احمد قاسمی،مولانا قمرالزماں ندوی،مفتی محمد زبیر ندوی،مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی۔

ردالمحتار میں ہے:"ويردونها على أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (ردالمحتار ۶/ ۳۸۵)مفتی اشتیاق احمد قاسمی،مفتی جمیل احمد نذیری،مولانا ممتاز خان ندوی،قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی۔

☆ علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے ہے کہ اتنی قیمت اس تک پہنچادینا بہتر ہے:"ولو أطعم المال لضيف لم يعلم بالظلم، ثم علم المالک فهل له مطالبة الضيف؟على قولين:أحدهما:ليس له مطالبته: ومن قال إن له مطالبته، لا يقول: إن أكله حرام، بل يقول: لا إثم عليه في أكله، وإنما عليه أداء ثمنه بمنزلة ما اشتراه" (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۲۵)مفتی جمیل اختر جلیلی ندوی۔

☆ علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:"قال ابن التين:إنما استقاء أبوبكر تنزها؛لأن أمر الجاهلية وضع ولو كان في الإسلام لغرم مثل ما أكل أو قيمته ولم يكفه القئ،كذا قال، والذي يظهر أن أبابكر إنما قاء لما

ثبت عنده من النهی عن حلوان الکاهن وحلوان الکاهن ما یأخذه علی کهانته" (فتح الباری ۷/ ۱۵۴) مفتی امانت علی قاسمی۔

اس سوال کے ذیل میں بعض مقالہ نگار نے حلال رزق کھانے اور حرام سے بچنے پر وارد احادیث کا بھی ذکر کیا ہے:

☆ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"**یا سعد اطب مطعمک تکن مستجاب الدعوة والذی نفس محمد بیده إن العبد لیقذف اللقمه الحرام فی جوفه ما یتقبل الله منه عمل أربعین یوما، وأیما عبد نبت لحمه من سحت فالنار أولی به**" (جامع العلوم والحکم بشرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم ۱۲/ ۵) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی۔

☆ ہر شخص پر حلال کھانا واجب ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**یأیها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا، إنی بما تعملون علیم**" (المؤمنون:۵۱) مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی حبیب اللہ قاسمی۔

مولانا مغفور باندوی لکھتے ہیں اگر دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کھانا حرام مال سے تیار کیا گیا تھا تو ایسی صورت میں اس کی تلافی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے سوال کیا کہ میرا پڑوسی سود کھاتا ہے اور وہ برابر میری دعوت کرتا ہے تو آپ نے فرمایا: کہ کھانے کا مزہ تمہیں ملے گا اور گناہ اس پر ہوگا۔

"**عن ابن مسعود قال: جاء رجل فقال: إن لی جارا یأکل الرباء وأنه لا یزال یدعونی فقال: مهناه لک وإثمه علیه**" (المصنف لعبدالرزاق ۸/ ۱۱۷) مفتی مغفور باندوی۔

مفتی شکیل منصور قاسمی نے حرمت کے تعدیہ وعدم تعدیہ پر اصولی بحث کی ہے جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:

اموال میں حرمت متعدی ہوتی ہے یا نہیں؟

یہ انتہائی اہم عنوان ہے، ہمارے فقہاء کی عبارتیں بادی النظر میں اس بابت قدرے متعارض نظر آتی ہیں، اس لئے اس کی تنقیح وتشریح ازبس ضروری ہے، مال حرام سے متعلق پوچھے گئے اکثر سوالات اور ویسے بھی مال حرام کے بیشتر احکام اسی ضابطے کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

یہ بات کہ حرمت دو شخصوں کی جانب متعدی نہیں ہوتی الفاظ وصیغے کے قدرے تفاوت کے ساتھ مختلف مصادر میں کچھ اس طرح منقول ہوئی ہے:

۱- "**الْحَرَامُ لَا یَتَعَدّٰی ذِمَّتَیْن**" (غمز عیون البصائر فی شرح الأشباہ والنظائر، الحموی، أحمد بن محمد مکی ۳/ ۲۳۴ شاملة، ورد المحتار ۵/ ۹۸، وشرح الزرقانی علی مختصر خلیل)۔

۲– "و الحرامُ لایتعدی إلی ذمتین"(ردالمحتار ۲/ ۲۹۲)۔

۳– "الحرامُ لَا یَتَعَلّقُ بِذِمّتَین" (کتاب حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر= بلغۃ السالک لأقرب المسالک،أحمد الصاوی ۳/ ۵۸۶ شاملۃ)۔

۴– "الحرام لا یتعدی لذمتین" (حفظ الأصغرین عن اعتقاد من زعم أن الحرام لایتعدی لذمتین-حسن بن عمار الشرنبلالی المصری الحنفی/ ۲)۔

حرمت کے عدم تعدیہ کا مفہوم

کتابوں میں مختلف صیغوں سے مذکور اس قاعدے کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کی ملکیت میں غیر شرعی طریقہ اکتساب مثلاً غصب وچوری ورشوت وغیرہ کے ذریعے کوئی مال آیا، پھر یہ مال حرام کسی مباح تصرف ولین دین کے ذریعے دوسرے شخص کی ملکیت میں چلا گیا اور دوسرے شخص کو یقین یا غلبہ ظن سے یہ نہ معلوم ہو کہ اس نے جو مال لیا ہے وہ مال حرام یعنی مسروق یا مغصوب ہے تو کسب حرام کا گناہ اس دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں ہوگا؛ بلکہ حرمت پہلے کاسب کے ذمہ کے ساتھ ہی خاص رہے گی؛ کیونکہ عدم علم عذر ہے اور اس صورت میں یہ معذور سمجھا جائے گا۔

لیکن جب دوسرے یا تیسرے بندے کو مال کے ذریعۂ حصول کی حرمت کا علم ہو، پھر اس نے غاصب وسارق سے مال لیا تو اب حرمت کاسبِ اوّل سے تمام ذموں کی طرف متعدی ہوگی، بیع وشراء، وراثت، شرکت ووقف اور ہبہ وغیرہ تمام احکام میں حرمت متعدی ہوگی۔

اس قاعدے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کسی حرام کام میں ایک سے زائد افراد شریک ہوں تو حرمت صرف شخص واحد سے متعلق ہوگی اور بقیہ لوگ بری الذمہ ہونگے؛ بلکہ امر حرام کے ارتکاب میں جتنے افراد شریک ہونگے سب کی طرف حرمت متعدی ہوگی اور سب حسب واردات گناہ میں شریک رہیں گے۔

عدم تعدیہ کی شرط

اموال حرام میں ایک سے زائد ذموں کی طرف حرمت کا عدم تعدیہ (الحرامُ لایتعدی إلی ذمتین) مطلق نہیں ہے؛ بلکہ ذمہ ثانی کے عدم علم اور شئ مغصوب کے عدم تغیر وتبدل (جس طرح اصل مالک کے پاس تھی) کے ساتھ مشروط ہے، مال کی اصلیت وحرمت کا پتہ ہوتے ہوئے خریدار کے لئے مال حلال نہیں ہوگا بلکہ حرمت مال اس کے ذمہ میں بھی منتقل ہوگی۔

"عَنِ الْأَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ: أَنّ رَجُلًا مِنْ كِنْدَةَ وَرَجُلًا مِنْ حَضْرَمَوْتَ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ فِي أَرْضٍ بِاليَمَنِ، فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَرْضِي اغْتَصَبَهَا هَذَا وَأَبُوهُ فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: يَارَسُولَ اللهِ، أَرْضِي وَرِثْتُهَا مِنْ أَبِي فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَا رَسُولَ اللهِ، اسْتَحْلِفُهُ أَنَّهُ مَا يَعْلَمُ أَنّهَا أَرْضِي وَأَرْضُ

وَالِدِی، وَالّذِی اغْتَصَبَهَا أَبُوهُ .فَتَهَيّأَ الْكِنْدِیُّ لِلْيَمِينِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ:" إِنّهُ لَا يَقْتَطِعُ، عَبْدٌ أَوْ رَجُلٌ، بِيَمِينِهِ مَالًا إِلّا لَقِيَ اللهَ يَوْمَ يَلْقَاهُ وَهُوَ أَجْذَمُ "فَقَالَ الْكِنْدِیُّ: هِیَ أَرْضُهُ، وَأَرْضُ وَالِدِهِ" (مسند أحمد، حدیث:۲۱۸۴۹، وأخرجہ أبوداود (۳۲۴۴) و(۳۶۲۲)، والنسائی فی الکبری ۶۰۰۲)۔

علامہ داؤدی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے:

"إن الأموال إذا أخذت بغير وجهها فهی علی ملک مالکها، حيث ماوقعت ، إذ لا خلاف بين العلماء أن من أثبت عين شيئه كان له أخذه حيثما وجده، لا ينظر إلی ما صار به، إلی من صار بيده" (الداودی، أبوجعفر أحمد نصر، الأموال/ ۱۶۰)۔

علامہ حموی لکھتے ہیں:

"قَوْلُهُ: الْحُرْمَةُ تَتَعَدّى فِي الْأَمْوَالِ مَعَ الْعِلْمِ بِهَا۔

قَالَ الشّيْخُ عَبْدُ الْوَهّابِ الشّعْرَانِيُّ – رَحِمَهُ اللّهُ – فِي كِتَابِ الْمِنَنِ: وَمَا نُقِلَ عَنْ بَعْضِ الْحَنَفِيّةِ مِنْ أَنّ الْحَرَامَ لَا يَتَعَدّى ذِمّتَيْنِ سَأَلْتُ عَنْهُ الشّهَابَ ابْنُ الشّبْلِيّ فَقَالَ: هَذَا مَحْمُولٌ عَلَى مَا إذَا لَمْ يَعْلَمْ بِذَلِكَ أَمّا مَنْ رَأَى الْمُكّاسَ مَثَلًا يَأْخُذُ مِنْ أَحَدٍ شَيْئًا مِنْ الْمَكْسِ ثُمّ يُعْطِيهِ آخَرَ ثُمّ يَأْخُذُهُ مِنْ ذَلِكَ الْآخَرِ فَهُوَ حَرَامٌ (انْتَهَى" (غمز عیون البصائر فی شرح الأشباہ والنظائر، الحموی، أحمد بن محمد مکی ۳/ ۲۳۴ شاملۃ)۔

مشہور حنفی فقیہ صاحب نور الایضاح علامہ شرنبلالی مصری رحمہ اللہ المتوفی سنۃ ۱۰۶۹ھ، جنہوں نے اس موضوع پہ ایک مستقل رسالہ حفظ الأصغرین عن اعتقاد من زعم أن الحرام لایتعدی لذمتین تحریر فرمایا ہے کی تحقیق یہ ہے کہ اس قاعدے کی نسبت فقہ حنفی کی طرف درست نہیں ہے، یہ صرف لوگوں؛ بلکہ جہلاء کا زبان زد جملہ ہے، فرماتے ہیں:

"وإطلاق قول الكنز (وملک بلا حل انتفاع) تصريح ببقاء الحرمة وشاملٌ كُلَّ مَنْ علم بالغصب مع تبدُّل العين قبل أداء بدلها وطيب خاطر المغصوب منه فلم يصح مانسب إلی الحنفية من أن الحرام لا يتعدَّی ولا ينتقل إلی ذمتين إذ لا أصل لذلک فی المذهب ولذا صرح بحرمة تناول المغصوب ولو خُلط بغيره بحيث لا يتميّز أو يعسر تمييزه كما فی كثير من الكتب المعتمدة وهی صريحة فی بُطلان ما يجری علی لسان الجهلة من أنّ الحرمة لاتنتقل إلی ذمّتين وينسبون ذلک لمذهب الإمام أبی حنيفة، وكيف يُنسب ذلک لمذهب الإمام وقد امتنع عن أكل اللحم لمّا غُصبت شاةٌ فی زمنه فسأل كم تعيش الشاة وتوقاه خشية وصول لحم المغصوب إليه لعلمه بوقوع الغصب۔ وهذا ردّ علی من يزعم عدم تَعَدِّی الحرام لذمتين" (صفحہ ۶)۔

بظاہر اس تردید کا مقصد بھی یہی ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا عدم تعدیہ والی بات مطلق نہیں ہے؛ بلکہ جہل اصل جیسی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

علامہ شرنبلالی وغیرہ کی تردید مطلق تعدیہ کی نفی پر محمول ہے، ورنہ جب اصل مال کی حرمت کا پتہ ہوتو حرمت کا سبب ثانی کے ذمہ کی طرف باتفاق فقہاء منتقل ہوتی ہے۔

علامہ حموی نے نقل کیا ہے:

"مَنْ رَأَى الْمُكَّاسَ مَثَلًا يَأْخُذُ مِنْ أَحَدٍ شَيْئًا مِنَ الْمَكْسِ ثُمَّ يُعْطِيهِ آخَرَ ثُمَّ يَأْخُذُهُ مِنْ ذَلِكَ الْآخَرِ فَهُوَ حَرَامٌ"۔

"أَخَذَ مُورِثُهُ رِشْوَةً أَوْ ظُلْمًا إنْ عَلِمَهُ ذَلِكَ بِعَيْنِهِ لَا يَحِلُّ لَهُ أَخْذُهُ، وَإِنْ لَمْ يَعْلَمْهُ بِعَيْنِهِ لَهُ أَخَذَهُ حُكْمًا' (غمز عیون البصائر فی شرح الأشباہ والنظائر، الحموی، أحمد بن محمد مکی ۳/ ۲۳۴ شاملۃ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں نہ تعدیہ حرمت مطلق ہے نہ عدم تعدیہ، دونوں حکم مشروط حالات اور مخصوص شرطوں کے ساتھ مشروط ومخصوص ہیں۔

پھر مختلف ذموں کی طرف عدم تعدیہ حرمت فقہ حنفی کا تفرد نہیں ہے، دیگر فقہی مذاہب میں بھی کسی نہ کسی درجے میں مشروط طور پر الحرامُ لایتعدی إلی ذمتین کا ثبوت ملتا ہے۔

لہٰذا قاعدہ "**الحرام لا يتعدى إلى ذمتين**" کسی نہ کسی درجے میں سب کے یہاں معمول بہ ہے، جس طرح تعدیہ حرمت بھی مخصوص حالات میں سب کے یہاں معمول بہ ہے۔

اسی قاعدے پر سوال ہذا کا جواب متفرع ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے حرام مال کھانا خواہ دوسرے کا کمایا ہوا ہو یا خود کمایا ہوا حرام ہے، اگر لاعلمی اور انجانے میں حرام مال سے کی گئی دعوت کسی نے کھالی ہے تو اللہ کے یہاں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

سوال نمبر ۶: کیا پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ ہے؟

اس سوال کے جواب میں ابتداءً تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ حرام مال اس کے اصل مالک تک لوٹانا لازم وواجب ہے، اگر مالک کا علم نہ ہوتو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین کے درمیان صدقہ کرنا ضروری ہے۔

فقہاء کرام نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے:

"سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (ردالمحتار، کتاب الحضر والاباحۃ ۶/ ۳۸۵)

☆ **"الحرام ينتقل أى ينتقل حرمته وإن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاك.....والحاصل أنه إن علم**

أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه"

(ردالمحتار، باب البیع الفاسد ۷/ ۳۰۰) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی رضی احمد رحمانی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی صالح زمان قاسمی، مولانا محمود اختر کیفی۔

☆ **"أما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه لعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرد إلى مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء"** (بذل المجہود ۱/ ۳۷) مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی ارشاد عالم، مولانا ارشد ربانی وغیرہ۔

☆ شیخ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"الف: حائز المال الحرام لخلل في طريقة اكتسابه لا يملكه مهما طال الزمن، ويجب عليه رده إلى مالكه أو وارثه إن عرفه، فإن يئس من معرفته وجب عليه صرفه في وجوه الخير للتخلص منه وبقصد الصدقة عن صاحبه۔

ب: إذا أخذ المال أجرة عن عمل محرم فإن الآخذ يصرفه في وجوه الخير ولا يرده إلى من أخذه منه۔

ج: لا يرد المال الحرام، إلى من أخذ منه إن كان مصرا على التعامل غير المشروع الذى أدى إلى حرمة المال كالفوائد الربوية بل يصرف في وجوه الخير أيضا۔

د: إذا تعذر ردالمال الحرام بعينه وجب على حائزه ردمثله أو قيمته إلى صاحبه إن عرفه وإلاصرف المثل أو القيمة فى وجوه الخير وبقصد الصدقة عن صاحبه" (الفقہ الإسلامی وادلتہ ۱۰/ ۹۴۵) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

مجمع الأنہر میں ہے: **"أى لا يجوز أخذ الأجرة على المعاصى (كالغناء والنوح، والملاهى)؛ لأن المعصية لا يتصور استحقاقها بالعقد فلا يجب عليه الأجر، وإن أعطاه الأجر وقبضه لا يحل له ويجب عليه رده على صاحبه"** (کتاب مجمع الأنہر فی شرح ملتقی الأبحر ۲/ ۳۸۴) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

لیکن مقالہ نگار کے درمیان اس بات پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ کیا حرام کمائی کو حلال کے دائرہ میں لانے کے لئے کوئی تدبیر یا حیلہ اختیار کرنی چاہئے؟

بیشتر مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اس کے لئے کوئی تدبیر اور حیلہ نہیں ہے اور نہ ہی حرام مال کو حلال کرنے کی کوئی تدبیر اختیار کرنی چاہئے (مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی محمد عفان منصور پوری، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی راشد حسین ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی شاکر نثار مدنی، مولانا خورشید مفتاحی،

مولانا عبدالحکیم، حافظ سید فاروق عمری، مفتی رضی احمد رحمانی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مفتی صالح زمان قاسمی، مفتی ارشاد عالم، مفتی تبریز جلیمی، مفتی راسخ الاسلام، مفتی محمد علی مدنی، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا ارشد ربانی، مفتی ذکاء اللہ شبلی، مفتی ضیاء الحق قاسمی، مولانا محمود اختر، مفتی محمد شاداب، مفتی شکیل کوثری وغیرہ)۔

دلائل:

☆ "**یـأیهـا الـذیـن آمـنـوا لـاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم**" (سورۂ نساء: ۲۹) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ "**ولا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل**" (سورۂ بقرہ:۱۸۸) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ "**یـأیهـا الـنبی لم تحرم ما أحل الله لک تبتغی مرضات أزواجک والله غفور رحیم**" (سورۂ تحریم:۱) مولانا صابر حسین ندوی۔

☆ "**الحلال بین والحرام بین وبینهما مشتبهات**" (صحیح بخاری) حافظ کلیم اللہ عمری۔

☆ حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار جانور، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے، تو سوال ہوا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مردار کی چربی کے بارے میں بتادیجئے؛ کیونکہ اس سے کشتیوں کا رنگ وروغن کیا جاتا ہے، چمڑوں کو رنگا جاتا ہے، لوگ اس سے چراغ جلاتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں وہ حرام ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: اللہ تعالی یہودیوں پر لعنت بھیجے، جب اللہ تعالی نے مردار جانوروں (گائے، بکری) کی چربی حرام قرار دی تو انہوں نے اس کو بدل دیا (پگھلا دیا) پھر اس کو بیچ کر اس کے پیسے کھالئے'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر:۲۲۳۶) حافظ سید فاروق عمری۔

☆ زادالمعاد فی ہدی خیر العباد میں ہے: "**فإن قیل: فما تقولون فی کسب الزانیة إذا قبضته، ثم تابت هل یجب علیها ردماقبضته إلی أربابه، أم یطیب لها، أم تصدق به؟قیل: هذا یبنی علی قاعدة عظیمة من قواعد الإسلام، وهي أن من قبض ما لیس له قبضه شرعا، ثم أراد التخلص منه، فإن کان المقبوض قد أخذ بغیر رضی صاحبه، ولا استوفی عوضه رده علیه، فإن تعذر رده علیه، قضیٰ به دینا یعلمه علیه، فإن تعذر ذلک، رده إلی ورثته، فإن تعذر ذلک، تصدق به عنه، فإن اختار صاحب الحق ثوابه یوم القیامة، کان له، وإن أبی إلا أن یأخذ من حسنات القابض، استوفی منه نظیر ماله، وکان ثواب الصدقة للمتصدق بها، کما ثبت عن الصحابة.**

وإن كان المقبوض برضى الدافع وقد استوفى عوضه المحرم، كمن عاوض على خمر أوخنزير، أو على زنى أو فاحشة، فهذا لا يجب رد العوض على الدافع؛ لأنه أخرجه باختياره، واستوفى عوضه المحرم، فلا يجوز أن يجمع له بين العوض والمعوض، فإن في ذلك إعانة له على الإثم والعدوان، وتيسيرأصحاب المعاصى عليه، وما ذا يريد الزانى وفاعل الفاحشة إذا علم أنه ينال غرضه ويسترد ماله، فهذا مما تصان ا لشريعة عن الإتيان به، ولا يسوغ القول به، وهو يتضمن الجمع بين الظلم والفاحشة والغدر۔ ومن أقبح القبيح أن يستوفي عوضه من المزنى بها، ثم يرجع فيما أعطاها قهرا، وقبح هذا مستقر فى فطر جميع العقلاء، فلا تأتى به شريعة، ولكن لا يطيب للقابض أكله، بل هو خبيث كما حكم عليه رسول الله ﷺ ولكن خبثه لخبث مكسبه، لا لظلم من أخذ منه، فطريق التخلص منه، وتمام التوبة بالصدقة به'' (فصل ماتفعل الزانیۃ بکسبہا إذا قبضتہ ثم تابت ۵/ ۶۹۰، مکتبۃ المنار الاسلامیہ) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ حضرت تھانویؒ امداد الفتاوی میں رقم طراز ہیں: ''حرام کو حلال کرنے کے لئے کوئی حیلہ مفید نہیں ہے اور اگر تبدل ملک کے طور پر مال حرام کو دوسرے حلال پیسے سے ملایا تو حصہ رسد اس کی نسبت سے اس میں حرمت وخباثت پیدا ہوجائے گی اور اسی طرح جو چیز اس نے خریدی ہو اس میں بھی (امداد الفتاوی ۹/ ۱۰۷) مولانا عبد الحکیم، مولانا محمود اختر کیفی۔

☆ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کا فتوی ہے:

''حرام مال کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو، اور وہ بلا عوض حاصل کیا گیا ہو جیسے سود، چوری، رشوت وغیرہ تو اس کو مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی وہ جہاں سے آیا ہے وہیں اس کو واپس دے دیا جائے، مالک وفات پاچکا ہے تو ورثاء کو لوٹا دیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے مستحق زکوۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ بالعوض حاصل کیا گیا ہو جیسے حرام ملازمت وغیرہ کے ذریعہ تو اسے مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی یہی مصرف ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردیا جائے، باقی حرام مال کسی کو استعمال میں دینا جائز نہیں ہے، اور نہ ہی اس کی وجہ سے وہ مال پاک ہوگا'' (فتوی نمبر: ۱۴۳۰۹۲۰۲۲۹۷) مفتی راشد حسین ندوی۔

☆ حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب ایک سوال ''حرام رقم کو حلال کرنے کا بعض علماء یہ حیلہ بتاتے ہیں کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے لے اور مال حرام سے قرض ادا کردے، کیا حضرت والا کے نزدیک یہ حیلہ درست ہے'' کے جواب میں لکھتے ہیں:

''اس حیلہ سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی ہے، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہوجائے گا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۲۵) مفتی اشتیاق احمد قاسمی،

مولانا عبدالحکیم وغیرہ۔

ان حضرات میں سے بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ البتہ اس مال حرام سے کوئی چیز خرید لے یا تجارت میں لگا دے تو حرام مال سے کی ہوئی تجارت کا نفع حلال ہوگا، لیکن اصل مال ہر حال میں واجب الاعادہ یا واجب التصدق ہوگا۔

دلائل:

☆ علامہ مرغینانیؒ لکھتے ہیں: "**إذا غصب حنطة فزرعها ونواة فغرسها غير أن عند أبي يوسفؒ يباح الانتفاع فيهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاک من كل وجه**" (ہدایہ، کتاب الغصب ۴/۳۷۷) مفتی جمیل اختر جلیلی۔

☆ "**امرأة زوجها في أرض الجور إذاأكلت من طعامه ولم يكن عينه غصبا أو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من ذلک والإثم على الزوج**" (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ ۹/۵۳، ۵۵۴) مفتی جمیل اختر جلیلی ندوی۔

جبکہ بعض دوسرے مقالہ حضرات کی رائے ہے کہ حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کے لئے فقہاء نے چند تدبیریں اور صورتیں بتاتی ہیں، جن کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ (مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی عبدالرشید کانپوری، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی مغفور احمد باندوی، مفتی اشرف قاسمی، مفتی روح الامین سعادتی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی مقصود احمد فرقانی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی اکرم رشید لونا واڑا، مفتی فیاض برمارے، مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مولانا محمد ابراہی، مفتی ارشاد عالم، مولانا صفوان حلیمی، مولانا نیاز احمد ندوی، مفتی ریاض ارمان قاسمی، مولانا کامران رشادی، مولانا احمد مکین، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا ابواحمد، مولانا عمار قاسمی، مولانا آزاد بیگ، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا الہادی، مفتی برکت علی قاسمی، مولوی نظام الدین یوسفی)۔

بعض مقالہ نگار نے پہلے حیلہ کی تعریف، اس کی مشروعیت وغیرہ کو ذکر کیا ہے:

ضرورت کے وقت حیلہ کرنا شرعاً جائز ہے، جیسے حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک معاملہ میں اللہ تعالی نے حیلہ کی اجازت عطا کی اور فرمایا: "**وخذبيدک ضغثا فاضرب به ولا تحنث**" (سورہ ص: ۴۴)۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیوی کو کسی وجہ سے سو کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی، اور ظاہر ہے کہ اس کو پورا کرنا انتہائی خطرناک تھا، تو اللہ تعالی نے یہ حیلہ بتلایا۔

شریعت اسلامی میں جائز حیلہ یہی ہے کہ آدمی حرام کے ارتکاب سے بچنے کے لئے ایسی تدبیر اختیار کرے جس کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے، المحیط البرہانی میں ہے:

"وكل حيلة يحتال بها الرجل لتخلص بها عن الحرام أو ليتوصل بها إلى الحلال فهي حسنة" (المحیط البرہانی ۲۱/ ۶۷)۔

لیکن بلاضرورت صرف حرام کو استعمال کرنے کے لئے علی الاطلاق حیلہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں، کیونکہ حرام مال کو ملکیت میں لانے اور اس کو جان بوجھ کر اپنے فائدہ میں خرچ کرنے کا گناہ کیوں کر ختم ہوسکتا ہے، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس پر نکیر کی ہے، ہاں اگر وہ شخص محتاج اور ضرورت مند ہو اور اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ ہو تو:

اول: چونکہ وہ خود مستحق صدقہ ہے، اس لئے اس میں سے اپنے گذر بسر کے لئے رکھ لے اور باقی صدقہ کردے:

☆ "الملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله و إن كان فقيرا لا يتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۷۰) مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی اختر امام عادل، مفتی مغفور باندوی۔

☆ حرام مال کا کسی مستحق زکوۃ کو مالک بنا کر قبضہ بھی دلا دے، اس کے بعد اس سے ہدیہ کی صورت میں اپنے استعمال میں لائے، جیسے حضرت بریرہؓ کے واقعہ میں ہے: اللہ کے رسول ﷺ کے لئے صدقہ حرام تھا، لیکن حضرت بریرہؓ نے اس صدقہ کے مال کو بصورت ہدیہ آپ کو دے دیا تو آپ ﷺ کے لئے حلال ہوگیا۔

☆ "عن عائشةؓ وأتى النبي ﷺ بلحم بقر فقيل –هذا ماتصدق به على بريرة فقال هو لها صدقة ولنا هدية" (صحیح مسلم/ ۱۷۸۵)۔ مفتی محمد سلیم قاسمی۔

دوم: ضرورت مند شخص حرام مال کو تجارت میں لگائے، اس تجارت سے جو آمدنی ہو اس سے رفتہ رفتہ حرام مال کی مقدار کو صدقہ کرتا رہے، یہاں تک کہ حرام کی پوری مقدار صدقہ میں ادا ہوجائے تو اب بقیہ سارا مال اس کے لئے حلال ہوجائے گا (مفتی محمد سلیم قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی روح الامین سعادتی، مفتی فیاض برمارے)۔

قاری ظفر الاسلام صدیقی نے ایک حیلہ یہ بھی بیان فرمایا ہے: "تجارت کے لئے کوئی بھی تیار ہوسکتا ہے، آپ اس کو یہ پیسہ تجارت کے لئے دے دیں اور پھر اس سے کہہ دیں یہ تجارت تمہاری ہے، تم اتنی رقم مجھے دے دو"۔

سوم: جس شخص کے پاس حرام مال ہو وہ حاکم یا حاکم نہ ملنے کی صورت میں کسی معتبر صالح مفتی کی اجازت سے پورا مال بطور قرض لے لے اور اس سے کوئی کاروبار شروع کردے اور پھر اپنی آمدنی کے تناسب سے تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا جائے، یہاں تک کہ حرام کے بقدر پورا مال صدقہ میں خرچ ہوجائے، اب جو کچھ اس کے پاس بچے گا وہ حلال قرار پائے گا، فقہاء نے مالدار کو بھی کاروبار کے لئے مال حرام بطور قرض لینے کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ اس کے پاس کوئی دوسرا مال موجود نہ ہو۔

☆ "وفي هذا دليل أن للإمام ولاية الإقراض في اللقطة والدفع مضاربة لأن قول عمرؓ اعمل بها

وعرفها إما أن يكون بطريق المضاربة أو الإقراض مضاربة وقد علمنا أنه لم يرد المضاربة حتى لم يتبين نصيبه من الربح فكان مراده الإقراض منه وفي هذا معنى النظر لصاحب المال لأنه يعرض للهلاك فيهلك من صاحبه قبل الإقراض وبعد الإقراض يصير دينا في ذمة المستقرض يؤمن فيه التوى بالهلاك وكذلك بالجحود لأنه متأكد بعلم القاضي ولهذا كان للقاضي ولاية الإقراض في أموال اليتامى" (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷، بیروت، لبنان) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی اکرم رشید رحمانی، مفتی صفوان حلیمی۔

☆ "وكثيرا ما يقع في زماننا أن ماكسبه المرء مدى سنين طويلة كله حرام عن طريق الربا أو الرشوة وغيرها من التعاملات المحظوره ولا سبيل إلى ردذلك الأموال إلى أصحابها فوجب عليه التصدق بها، ثم يوفقه الله سبحانه و تعالى أن يتوب عن الكسب الحرام ولكن ليس عنده مال سواه ليسد به حاجته وحاجة عياله فيحتمل أن يعتبر ذلك المرء فقيرا من حيث أنه لا يملك من المال الحلال شيئا وما في يده ليس مملوكا له شرعا، فتجرى عليه أحكام الفقراء في هذه المسالة، فيجوز له أن يصرف ذلك المال في حاجة نفسه إلى أن يملك نصاب الزكاة من مال الحلال۔

فإذا ملك النصاب وصار غنيا شرعا ولا يكفي النصاب لحاجته وحاجة عياله فحينئذ يجوز له الاقتراض مما عنده من المال المكتسب بطريق الحرام بشرط أن يلتزم أداء مثله إلى الفقراء" (فقہ البیوع ۱۰۴۹)۔

☆ "ثم إن هذا الحكم من حل الانتفاع للفقير لحاجته، وجواز اقتراضه للغني بإذن الإمام مختص بالملك الخبيث الذى وجب التصدق به، أما المغصوب الذى وجب رده أو رد بدله إلى المالك الأصلي، فلا يجوز له أن يصرفه في حاجة نفسه قبل أداء بدله،ولو كان بنية أداء بدله إلى المالك فيما بعد، والفرق بينهما أن ما وجب التصدق به لا يتعلق به مطالبة أحد بعينه، وإنما يتعلق به حق الفقراء دون تعيين، وهذا بخلاف المال الخبيث الذى وجب ردبدله إلى مالكه الأصلي، فإن له مطالبا معينا، فلا يجوز التاخير في أداء حقه إلا برضاه، وإن كان الغاصب فقيرا۔

ولكن الظاهر أنه إن لم يعرف المالك الأصلي، وانتقلت الفريضة من رد العين إلى التصدق على الفقراء، فيكون حكمه حكم الغلة والربح، حيث يجوز الانتفاع بها عند الحاجة،ولا يجوز للغنى إلا بطريق الاقتراض باذن الإمام و أداء مثله إلى الفقراء" (فقہ البیوع ص ۱۰۴۵ تا ۱۰۴۹)، مفتی عثمان بستوی، مفتی صفوان حلیمی، مولوی نظام الدین یوسفی۔

چہارم: چوتھی صورت یہ ہے کہ کسی ایک یا چند فقراء کو مال حرام صدقہ کردے اور پھر وہ فقراء بطیب خاطر اسے ہدیہ کردے، اس لئے کہ تبدل ملک اور تبدل ذمہ سے شئ کی حقیقت تبدیل ہوجاتی ہے۔

☆ **"وذكر في البزازية هنا أن من لا يحل له أخذ الصدقة فالأفضل له أن لا يأخذ جائزة السلطان ثم قال وكان العلامة خوارزم لا يأكل من طعامهم ويأخذ جوائزهم فقيل له فيه فقال تقديم الطعام يكون إباحة والمباح له يتلفه على ملك المبيح فيكون آكلا طعام الظالم والجائزة تمليك فيتصرف في ملك نفسه اه قلت ولعله مبنى على القول بأن الحرام لا يتعدى إلى ذمتين وسيأتي تحقيق خلافه في البيع الفاسد والحظر والإباحة"** (ردالمحتار مع الدرالمختار ۲/ ۲۹۲) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی۔

پنجم: پانچویں صورت یہ ہے کہ مطلقا کوئی سامان ادھار خریدلے اور پھر اس کی قیمت اپنے پاس موجود مال حرام سے ادا کردے، اس طرح جو مال حاصل ہوگا وہ اس کے لئے جائز ہوگا، پھر مال حرام کو آہستہ آہستہ صدقہ وغیرہ کے ذریعہ اپنے پاس سے خارج کرتا رہے، اس لئے کہ دفعتا سارا مال صدقہ کرنا ممکن نہیں، یہ باعث حرج ہوگا۔

☆ **"قال الحلواني: وكان الإمام أبو القاسم الحاكم يأخذ جوائز السلطان، والحيلة فيه أن يشترى شيئا بمال مطلق ثم ينقده من أى مال شاء كذارواه الثانى عن الإمام"** (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۱۲) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی مغفور باندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی محمد ابراہیم ورتھی۔

☆ **فتاوی ہندیہ میں ہے: "والحيلة فى هذه المسائل أن يشترى نسيئة، ثم ينقد ثمنه من أى مال شاء"** (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۲) مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی وصی احمد قاسمی، مولانا قمر الزمان ندوی، مفتی مغفور باندی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی محمد زبیر ندوی، مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی۔

☆ **"لو كان لمسلم على نصرانى دين فباع النصرانى خمرا أو أخذ ثمنها وقضاه المسلم من دينه جاز له أخذه لأن بيعه لها مباح"** (فتاوی ہندیہ ۵/ ۲۶۷) مفتی محمد الیاس قاسمی۔

☆ **امام نووی لکھتے ہیں: "إذا اتجر الغاصب فى المال المغصوب، فقولان: الجديد أنه إن باعه أو اشترى بعينه فالتصرف باطل وإن باع سلما أو اشترى فى الذمة وسلم المغصوب فيه فالعقد صحيح والتسليم فاسد، فلا تبرأ ذمته مما التزم ويملك الغاصب ما أخذ وأرباحه له"** (روضۃ الطالبین ۵/ ۵۹) مفتی فیاض احمد برمارے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ مختلف جزئیات کی روشنی میں فرماتے ہیں:

''مال حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مال حرام نہیں بلکہ صرف وہ مال حرام ہے جس کے مالک نہ معلوم یا لا پتہ ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جا سکتا، نیز ایسی صورت میں بحکم لقطہ ہو جاتا ہے، اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے، اس لئے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لئے حرام نہیں، اور اسی بنا پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر کر سکتا ہے، کیونکہ اس (شخص قابض) کا صدقہ نہیں بلکہ اصل مالک کا ہے، کما فی عبارۃ الہندیہ'' (جواہر الفقہ ۳/ ۲۸۲ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مکتبہ تفسیر القرآن، دیوبند ۱۴۰۷ھ) مفتی محمد اشرف، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی۔

☆ حضرت مفتی نظام الدین اعظمیؒ کا فتوی ہے:

''غیر مسلموں کے نزدیک سودی لین دین بھی حلال ہے، اس لئے سودی رقم یا حرام رقم غیر مسلم کو قرض میں دے سکتے ہیں، جبکہ غیر مسلم کی حرام رقم مسلمان قرض کے طور پر لے سکتا ہے، کیونکہ اس کے مذہب میں حرام رقم اس کے لئے حلال ہے'' (مستفاد: منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۲۴۴) مفتی محمد الیاس قاسمی۔

☆ امام احمد رضا خاں بریلویؒ نے مال حرام کو صدقہ کے ذریعہ پاک کرنے کی صورت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اگر وہ اسے پاک کرنا چاہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی محتاج کو اگر چہ اس کا کیسا ہی عزیز و قریب ہو، اپنا وہ کل مال ایک ایک پیسہ ایک ایک تار بہ نیت صدقہ دے دے، اس میں سے کچھ اپنے پاس نہ رکھے، اور زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ چند محتاجوں پر اس حساب سے تصدق کرے کہ ہر ایک کو چھپن روپئے سے کم کا مال پہنچے، پھر جن کو اس نے بطور تصدق دیا ہے، وہ اپنی خوشی سے اپنی طرف سے تھوڑا یا جتنا اسے ہبہ کر دیں، وہ اس کے لئے حلال وطیب ہو جائے گا، اگر چہ کل دے دیں'' (فتاوی رضویہ ۹/ ۷۷) مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی۔

ششم: چھٹی صورت یہ ہے کہ الگ سے کچھ جائز سرمایہ کما کر یا قرض لے کر فراہم کرے، پھر اس جائز سرمایہ میں ناجائز مال کا خلط کر دے، خلط کرنے پر امام ابوحنیفہؒ کے اصول پر ملکیت حاصل ہو جاتی ہے، پھر آہستہ آہستہ صدقہ کے ذریعہ مال حرام کو اپنی ملکیت سے نکالتا رہے، البحر الرائق میں ہے:

☆ **''ولو أن سلطانا غصب مالا وخلطه صار ملكا له، حتى وجبت عليه الزكاة وورث عنه على قول أبي حنيفه''** (البحر الرائق ۲/ ۲۲۱) مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں: **''ولذا قالوا: لو أن سلطانا غصب مالا وخلطه صار ملكا له، حتى وجبت عليه الزكاة وورث عنه''** (فتح القدیر، کتاب الزکاۃ ۲/ ۱۵۴)۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ خلط ملط کر لینے کی صورت میں تاوان کی ادائیگی کے بعد ہی تصرف حلال ہے، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"**فإنه لا يحل التصرف فيه قبل أداء ضمانه و كذا لوارثه**" (ردالمحتار کتاب الحظر والاباحۃ ۶/۳۸۶)، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی۔

☆ فتاوی ہندیہ میں بھی یہ جزئیہ موجود ہے:

"**والثانی إن علم أن المال الحرام بعينه قائم إلا أنه اختلط بالغير بحيث لا يمكن التميز عنه، فإن على أصل أبى حنيفه بالخلط يدخل فى ملكه إلا أنه لا ينبغى أن يشترى منه**" (فتاوی ہندیہ ۵/۳۶۴) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی محمد ابراہیم، مفتی محمد شاہ جہاں ندوی وغیرہ۔

☆ "**إذا غصب حنطة فزرعها أو نواة فغرسها غير أنه عند أبى يوسف يباح انتفاع فيهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاک من كل وجه**" (ہدایہ علی فتح القدیر ۹/۳۴۲) مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی۔

سوال نمبر ۷: ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے، وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے؛ لیکن تجارت کرنے کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں تو اپنے اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرض کو صدقہ کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

تقریبا تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ حرام مال سے قرض لینا درست نہیں ہے، اس پر لازم ہے کہ اس مال کو لوٹائے، ورنہ صدقہ کر دے، البتہ اگر وہ ضرورت مند، محتاج اور فقیر ہے تو فقیر کی حیثیت سے وہ اس مال حرام سے اپنی ضرورت اور چھوٹے موٹے حلال کاروبار کے بقدر لے سکتا ہے، فقہاء نے ایسے لوگوں کے لئے اجازت دی ہے۔

مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی اختر امام عادل، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد جمیل اختر جلیلی، مولانا اشتیاق اعظمی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا صابر صابر حسین، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی امانت علی، مفتی راشد حسین ندوی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی عبد الرشید قاسمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا محمد قمر الزماں ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، مولانا مغفور باندوی، مفتی شاکر نثار مدنی، مفتی روح الامین سعادتی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مفتی نثار احمد گودھروی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا خان حبیب، مولانا فیاض احمد محمود برمارے، مولانا عبد الحکیم، مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا عبد الاحد قاسمی، مولانا ابراہیم وریٹھی، مفتی رضی احمد رحمانی،

قاضی محمد مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی صفوان احمد حلیمی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مفتی نیاز احمد ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا صالح زماں قاسمی، مولانا کامران رشادی، مفتی خلیل احمد، مفتی تبریز حلیمی، مولانا راسخ الاسلام، مولانا سید محمد علی مدنی، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا ارشد ربانی، مولانا محمود کیفی، مفتی شاداب، مولانا شکیل کوثری، مولانا احمد مکین، مفتی ابوبکر، مولانا محمد سعد، مولانا عمار، مولانا محمد آزاد قاسمی، مولانا محمد نثار عالم ندوی، مولانا برکت علی قاسمی، مولانا نظام الدین یوسفی۔

دلائل:

☆ امام غزالیؒ احیاء علوم میں رقم طراز ہیں:

إذا حصل فی یده مال لا مالک له جوزنا له أن یأخذ قدر حاجته لفقره ففی قدر حاجته نظر ذکرناه فی کتاب أسرار الزکاة فقد قال قوم یأخذ کفایة سنة لنفسه وعیاله وإن قدر علی شراء ضیعة أو تجارة یکتسب بها للعائلة فعل وهذا ما اختاره المحاسبی ولکنه قال: الأولی أن یتصدق بالکل إن وجد من نفسه قوة التوکل وینتظر لطف الله تعالی فی الحلال فإن لم یقدر فله أن یشتری ضیعة أو یتخذ رأس مال یتعیش بالمعروف منه وکل یوم وجد فیه حلالًا أمسک ذلک الیوم عنه فإذا فنی عاد إلیه فإذا وجد حلالًا معینا تصدق بمثل ما أنفقه من قبل ویکون ذلک قرضًا عنده" (احیاء علوم الدین: ۱۳۲، ط: دار المعرفۃ- بیروت) مفتی عبد الرشید قاسمی، مفتی فیاض برمارے، مولانا نثار عالم ندوی۔

☆ امام نووی نے امام غزالیؒ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قال النووی نقلا عن الغزالی: اذا کان معه ما ل حرام وأراد التوبة والبرائة منه، فإن کا ن له مالک معین وجب صرفه إلیه أو إلیٰ وکیله، فإ ن کان میتا وجب دفعه إلیٰ وارثه، و إن کا ن لما لک لا یعرفه ویئس من معرفته فینبغی أن یصرفه فی مصالح المسلمین العامة، کالقناطر والربط والمساجد والمصالح طریق مکة ونحو ذالک ممایشترک المسلمون فیه، وإلافیتصدق علیٰ فقیر أو فقراء، وینبغی أن یتولیٰ ذالک القاضی إن کا ن عفیفا، فإن لم یکن عفیفالم یجز التسلیم إلیه، فإن سلمه إلیه صار المسلم ضامنا، بل ینبغی أن یحکم رجلا من أهل البلد دینا عالما، فإن التحکم أولیٰ من الإنفراد، فإن عجزعن ذالک تولاه بنفسه، فإن المقصود هو إنصراف إلیٰ هٰذه الجهة، وإذا دفعه إلی الفقیرلایکون حراماعلی الفقیر، بل یکو ن حلا لاطیبا، وله أن یتصدق به علیٰ نفسه وعیا له إذا کا ن فقیرا، لأن عیاله إذاکا نوا فقراء فالوصف موجود فیهم، بل هم أولیٰ من أن یتصدق علیه، وله أن یأخذ

منه قدر حاجته، لأنه أيضا فقير" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۴/۲۴۵) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ **زادالمعاد** میں ہے:"**فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ قدر حاجته، ويتصدق بالباقي، فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه، عينا كان أو منفعة**" (زادالمعاد ۵/۷۷۸) مفتی محمد شاہجہاں ندوی، مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی عفان منصور پوری۔

☆ علامہ ابن قیمؒ رقم طراز ہیں:

"**إذا عاوض غيره معاوضة محرمة وقبض العوض، كالزانية والمغني وبائع الخمر وشاهد الزور ونحوهم ثم تاب والعوض بيده .فقالت طائفة: يرده إلى مالكه؛ إذ هو عين ماله ولم يقبضه بإذن الشارع ولا حصل لصاحبه في مقابلته نفع مباح.**

وقالت طائفة: بل توبته بالتصدق به ولا يدفعه إلى من أخذه منه، وهو اختيار شيخ الإسلام ابن تيمية وهو أصوب القولين" ..... **انتهى**" (مدارج السالکین ۱/۳۸۹)۔

وقد بسط ابن القيم الكلام على هذه المسألة في "زاد المعاد" وقرر أن طريق التخلص من هذا المال وتمام التوبة إنما يكون بالتصدق به، فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ قدر حاجته، ويتصدق بالباقي" انتهى (زادالمعاد ۵/۷۷۸) مفتی عفان منصور پوری۔

☆ "**الملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، فإن كان غنيا تصدق بمثله وإن كان فقيرا لا يتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/۷۰) مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا قمر الزمان ندوی، مفتی روح الامین سعادتی، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی زبیر ندوی، مفتی ابراہیم ورتیٹھی، مولانا محمد سعد نور قاسمی۔

☆ علامہ ابن تیمیہؒ زانیہ اور شراب کا کاروبار کرنے والے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"**فإن تابت هذه البغي وهذا الخمار وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال قدر حاجتهم فإن كان يقدر يتجر أويعمل صنعة كالنسج والغزل، أعطى مايكون له رأس مال**" (مجموع الفتوی ۲۹/۳۰۸) مولانا عبیداللہ ندوی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خان حبیب الرحمٰن، مفتی زبیر ندوی، مولانا ارشد ربانی، مولانا محمود اختر کیفی۔

☆ نیز مال حرام سے خلاصی کے لئے فقراء پر صدقہ کرنے کا حکم ہے اور جب یہ شخص خود محتاج وفقیر ہو تو اپنی ذات کو عام فقراء پر ترجیح دینے کی امام سرخسی نے اجازت دی ہے،"**وحاجته تقدم على حق الفقراء في هذا المال بمنزلة حقهم في اللقطة على معنى أن له أن يتصرف وله أن يردها على المالك إن شاء**" (المبسوط ۱۱/۷۷)

مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی برکت علی قاسمی۔

☆ فتاوی ہندیہ میں ہے: "**غصب حانوتا واتجرفيه وربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردي**" (۵/۱۴۲) مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا ممتاز خاں ندوی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی تبریز عالم حلیمی، مفتی محمد علی مدنی وغیرہ۔

☆ علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: "**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" (الأشباہ والنظائر/۷۹) مفتی جمیل اختر جلیلی۔

☆ "**الحاجة تنزل منزلة الضرورة**" (موسوعہ فقہیہ ۲۲/۲۹۱) مفتی سلیم قاسمی، مفتی ابوبکر قاسمی۔

☆ مولانا ظفر احمد عثمانی لکھتے ہیں: "**فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ بقدر حاجته ويتصدق في الباقي فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه عينا كان أو منفعة**" (اعلاء السنن ۱۶/۱۹۵) مفتی جمیل اختر جلیلی۔

☆ اگر اس مسئلہ کو "مغصوب قبل الضمان انتفاع" والے مسئلہ پر قیاس کرتے ہیں تو صورت مسئولہ کا حکم جواز کا ہونا چاہئے:

"**واختلفوا في أنه هل يباح له الانتفاع به بأن يأكله بنفسه أو يطعمه غيره قبل أداء الضمان فإذا حصل فيه فضل هل يتصدق بالفضل۔**

قال أبوحنيفة و محمدؒ لا يحل له الانتفاع حتى يرضى صاحبه وقال أبويوسفؒ يحل له الانتفاع ولا يلزمه التصدق وهو قول الحسن وزفرؒ وهو القياس وقول أبوحنيفة ومحمد استحسان" (بدائع) مفتی ارشاد عالم آسام۔

☆ "**توضيح المسئلة ما في التتارخانيه حيث قال رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا، ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها و دفعها أو اشترى قبل الدفع بها و دفع غيرها أو اشترى مطلقا و دفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر و دفع تلك الدراهم ..... و قال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لايطيب و في الثلاث الأخيرة يطيب و قال أبو بكر: لايطيب في الكل لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج على الناس.....**" (ردالمحتار ۷/۳۷۴) مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا راشد حسین ندوی، مفتی مغفور باندوی، مفتی شاکر نثار مدنی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی رضی احمد رحمانی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا مدثر احمد قاسمی، مولانا کامران رشادی۔

☆ علامہ ابن تیمیہؒ نے اس نوع کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"**فإن الرجل قد يعيش مدة طويلة لا يصلي ولا يزكي، وقد لا يصوم أيضا، ولا يبالي من أين كسب المال أمن حلال أم من حرام، ولا يضبط حدود النكاح والطلاق، وغير ذلك، فهو في جاهلية إلا أنه منتسب إلى الإسلام، فإذا هداه الله وتاب عليه فإن أُوجب عليه قضاء جميع ما تركه من الواجبات،**

وأُمر برد جميع ما اكتسبه من الأموال، والخروج عما يحبه من الأبضاع إلى غير ذلک صارت التوبة فی حقه عذابا، وكان الكفر حينئذ أحب إليه من ذلک الإسلام الذی كان عليه، فإن توبته من الكفر رحمة، وتوبته وهو مسلم عذاب۔ وأعرف طائفة من الصالحين من يتمنى أن يكون كافرا ليُسلم فيغفرله ما قد سلف؛ لأن التوبة عنده متعذرة عليه أو متعسرة على ما قد قيل له واعتقده من التوبة، ثم هذا منفّر لأكثر أهل الفسوق عن التوبة، وهو شبيه بالمؤيِّس للناس من رحمة الله، ووضع الآصار الثقيلة والأغلال العظيمة على التائبين الذين هم أحباب الله، فإن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين، والله أفرح بتوبة عبده من الواجد لماله الذی به قوامه بعد اليأس منه" (مجموع الفتاوی ۲۲/۲۱)

"فإن تابت هذه البغی وهذا الخَمَّار ، وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال قدر حاجتهم ، فإن كان يقدر يتجر أو يعمل صنعة كالنسج والغزل ، أعطی ما يكون له رأس مال۔ وإن اقترضوا منه شيئا ليكتسبوا به ... كان أحسن" (مجموع الفتاوی ۲۹/۳۰۸) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ مفتی نظام الدین صاحبؒ کا فتوی ہے:

''سودی قرض لینے کی شریعت مطہرہ نے صرف اس وقت اجازت دی ہے جب کہ بغیر قرض لئے کام نہ چلے اور غیر سودی قرض نہ ملے، اور بغیر اس قرض کو لئے ہوئے نا قابل تحمل و برداشت تکلیف کا سامنا ہو، معیشت باقی نہ رہے، یا کاروبار معطل ہوجائے، تو بوجہ مجبوری اور بقدر مجبوری سودی قرض لے لینے کی گنجائش ہوجائیگی: **"الضرورات تبيح المحضورات"** (الاشباہ والنظائر مع شرح الحموی ص ۴۱۰) (نظام الفتاوی: جلد ۷ جزو ۲ ص ۴۹، زکریا)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: جب اور کوئی جائز ذریعہ معاش نہ رہے اور نا قابل تحمل تنگی و پریشانی کا سامنا ہو تو بینک سے قرض لیکر کام چلا لینے کی گنجائش رہتی ہے۔ (نظام الفتاوی جلد ۷/ ۲۲۲، زکریا) مفتی عبدالرشید قاسمی۔

☆ فتاوی محمودیہ میں ہے:

''جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ حرام کمائی سے حاصل ہے تو اس کو چاہیئے کہ اگر جس سے وہ مال بطور رشوت یا ظلم حاصل ہوا ہے اس کو فوراً واپس کردے اور اگر معلوم نہ ہو تو صدقہ کردے اور گر وہ غریب شخص ہے اور تجارت کرنے کے لئے اس کے پاس مال نہیں ہے تو کسی سے قرض لیکر کاروبار شروع کردے اور اگر قرض نہ ملے تو بوجہ مجبوری بطور قرض کے اس حرام مال کو تجارت میں اس وقت تک استعمال کرے جب تک فائدہ حاصل نہ ہوجائے اور جب استغنا ہوجائے تو فوری طور پر اس حرام مال کو بغیر نیت ثواب صدقہ کردے'' (محمودیہ ۲۸/ ۳۷۳) مولانا خورشید احمد مفتاحی۔

لیکن اگر وہ غنی اور مالدار ہے تو ایسے شخص کے لئے حاکم کی اجازت اور حاکم نہ ہو تو اس علاقہ کے معتبر صالح مفتی

سے اجازت لینے کے بعد قرض لینے کی گنجائش ہے۔

"ولكن الظاهر أنه إن لم يعرف المالک الأصلی وانتقلت الفريضة من رد العين إلى التصدق علی الفقراء فيكون حكمه حكم الغلة والربح، حيث يجوز الانتفاع به للفقير عند الحاجة ولا يجوز للغنی إلا بطريق الاقتراض بإذن الإمام وأداء مثله إلى الفقراء" (فقہ البیوع ۱۰۴۹/۲) مفتی عثمان بستوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ "ثم إن هذا الحكم من حل الانتفاع للفقير لحاجته، وجواز اقتراضه للغنی بإذن الإمام مختص بالملک الخبيث الذی وجب التصدق به .أمّا المغصوب الذی وجب ردُّه أو رد بدله إلى المالک الأصلی، فلا يجوز له أن يصرفه فی حاجة نفسه قبل أداء بدله، ولو كان بنية أداء بدله إلى المالک فيما بعد .والفرق بينهما أن ما وجب التصدق به لا يتعلق به مطالبة أحدٍ بعينه، وإنّما يتعلّق به حقُّ الفقراء دون تعيين، وهذا بخلاف المال الخبيث الذی وجب ردُّ بدله إلى مالكه الأصلی، فإن له مطالباً معيناً، فلا يجوز التأخير فی أداء حقه إلا برضاه، وإن كان الغاصب فقيراً ۔

ولكن الظاهر أنه إن لم يُعرف المالک الأصلی، وانتقلت الفريضة من رد العين إلى التصدق على الفقراء، فيكون حكمه حكم الغلّة والربح، حيث يجوز الانتفاع بها عند الحاجة، ولا يجوز للغنی إلا بطريق الاقتراض بإذن الإمام وأداء مثله إلى الفقراء" (فقہ البیوع ۱۰۴۵/۲ تا ۱۰۴۹) مفتی عثمان بستوی۔

☆ خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور میں ایک شخص کو مال لقطہ ملا تو اسے آپؓ نے بطور قرض لے کر کاروبار کرنے کی اجازت دی، اس سے فقہاء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ایسا مال جس پر انسان کا حق نہیں ہے حاکم کی اجازت سے بطور قرض لے کر اس سے کاروبار کیا جا سکتا ہے، یہ مسئلہ فقہاء نے امیر شخص کے لئے بیان کیا ہے۔

امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"وعن أبی سعيد مولى أسيد قال وجدت خمسمائة درهم بالحرة وأنا مكاتب فذكرت ذلک لعمر بن الخطاب رضی الله عنه فقال اعمل بها وعرفها فعملت بها حتى أديت مكاتبتی ثم أتيته فأخبرته بذلک فقال ادفعها إلى خزان بيت المال وفی هذا دليل أن للإمام ولاية الإقراض فی اللقطة والدفع مضاربة لأن قول عمر رضی الله عنه اعمل بها وعرفها إما أن يكون بطريق المضاربة أو الإقراض مضاربة وقد علمنا أنه لم يرد المضاربة حتى لم يتبين نصيبه من الربح فكان مراده الإقراض

منه وفی هذا معنی النظر لصاحب المال لأنه یعرض للهلاک فیهلک من صاحبه قبل الإقراض وبعد الإقراض یصیر دینا فی ذمة المستقرض یؤمن فیه التوی بالهلاک وکذلک بالجحود لأنه متأکد بعلم القاضی ولهذا کان للقاضی ولایة الإقراض فی أموال الیتامی وربما یکون معنی النظر فی الدفع إلیه مضاربة أو إلی غیره فذلک کله إلی القاضی لأنه نصب ناظرا وفیه دلیل علی أن الملتقط إذا کان محتاجا فله أن ینتفع باللقطة بعد التعریف لأن هذا المکاتب کان محتاجا إلی العمل فیها فیؤدی مکاتبته من ربحها فأذن له عمر رضی الله عنه فی ذلک" (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷ طبع بیروت) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ "کثیرا ما یقع فی زماننا أن ماکسبه المرأ مدی سنین طویلة کله حرام عن طریق الربا أو الرشوة وغیرها من التعاملات المحظورة، ولا سبیل إلی رد تلک الأموال إلی أصحابها فوجب علیه التصدق بها، ثم یوفقه الله سبحانه وتعالی أن یتوب عن الکسب الحرام ولکن لیس عنده مال سواهُ لیسد به حاجته وحاجة عیاله فیحتمل أن یعتبر ذلک المرء فقیرا من حیث أنه لا یملک من المال الحلال شیئا وما فی یده لیس مملوکا له شرعا، فتجری علیه أحکام الفقراء فی هذه المسالة، فیجوز له أن یصرف ذلک المال فی حاجة نفسه إلی أن یملک نصاب الزکاة من مال الحلال۔

فإذا ملک النصاب وصار غنیا شرعا ولا یکفی النصاب لحاجته وحاجة عیاله فحینئذ یجوز له الاقتراض مما عنده من المال المکتسب بطریق الحرام بشرط أن یلتزم أداء مثله إلی الفقراء" (فقہ البیوع ۱۰۴۹) مفتی عثمان بستوی، مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ "أما المغصوب الذی وجب رده أو رد بدله إلی المالک الأصلی فلا یجوز له أن یصرفه فی حاجة نفسه قبل أداء بدله ولو کان بنیة أداء بدله إلی المالک فیما بعد" (فقہ البیوع ۱۰۴۹/) مفتی عثمان بستوی۔

☆ شدید مجبوری میں اس نیت سے قرض لیتا ہے کہ گنجائش ہوجانے پر بعد میں اتنی رقم صدقہ کردے گا تو ایسا کرنا درست ہے، لیکن پورا حساب رکھنا اور بعد میں صدقہ کرنا لازم ہے۔

فقہ البیوع میں ہے: "ما وجب التصدق به لکاسب الحرام واحتاج إلیه لنفقته ونفقة عیاله، یجوز صرفه إلی نفسه، فإن کان فقیرا لا یجب علیه التصدق بمثله وإن کان غنیا ولم یکن المال الحلال کافیا لسدحاجته، یسوغ للمفتی بعد النظر فی أحواله أن یفتیه بجواز الاقتراض مما عنده من المال الحرام بشرط أن یلزم نفسه تسدید هذا القرض إلی الفقراء من المال الجلال کما تیسر له ذلک فیجب علیه

أن يتصدق بمثله" (فقہ البیوع ۲/۱۰۲۱) مولانا عبدالحکیم پالنپوری۔

جبکہ بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر مالدار ہے تو اس کے لئے اس مال سے قرض لینا جائز نہیں ہے (مولانا صابر حسین ندوی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی ذکاء اللہ شبلی، مولانا عبدالہادی، حافظ سید فاروق عمری، مفتی ضیاء الحق قاسمی)۔

سوال ۸: ایک آدمی کا بزنس آدھا حلال ہے اور آدھا حرام، اب اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصہ کا کام کرنا پڑتا ہے، جیسے: کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہے، یا دونوں کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہے، یا دونوں کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہے، تو اس کا کیا حکم ہے؟۔

اس سوال کے جواب میں بیشتر مقالہ نویس حضرات کی رائے ہے کہ عام حالات میں ایسی ملازمت جائز نہیں ہے، اگر پہلے سے ملازمت ہے تو جب تک دوسری حلال ملازمت نہیں مل جاتی اس وقت تک اس کو باقی رکھا جاسکتا ہے (مفتی شاہجہاں ندوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا اشتیاق اعظمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا عفان منصور پوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی سلیم قاسمی، مفتی مغفور باندوی، مولانا شاکر نثار مدنی، مولانا روح الامین سعادتی، مولانا خورشید مفتاحی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی خان حبیب الرحمٰن، مولانا فیاض برمارے، مولانا اکرم رشید رحمانی، مولانا عبدالحکیم، حافظ سید فاروق عمری، مفتی زبیر ندوی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مولانا ابراہیم پالنپوری، مولانا ارشاد عالم، مولانا رضی احمد ندوی، مولانا مطیع قاسمی، مولانا صفوان حلیمی، مولانا مدثر قاسمی، مولانا نثار احمد ندوی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مفتی صالح زماں)۔

دلائل:

☆ یہ تعاون علی المعصیۃ کی قبیل سے ہے، جو بنص قرآن ناجائز ہے: "**ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (سورہ مائدہ:۲) مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی تبریز عالم حلیمی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی شاکر نثار مدنی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی فیاض برمارے، مفتی اکرم رشید رحمانی، مفتی زبیر ندوی، مفتی ارشاد عالم، مفتی رضی احمد رحمانی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی۔

☆ "**عن سويد بن غفله أن بلالا قال لعمر بن الخطابؓ: إن عمالك يأخذون الخمر والخنازير في الخراج، فقال: لا تأخذوها منهم و لكن و لوهم ببيعها، و خذوا أنتم من الثمن، فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة ببيع الخمر والخنازير و أجاز المسلمين أخذ أثمانهما في الجزية و الخراج وذلك بمحضر من الصحابة ولم ينكر عليه منكر**" (اعلاء السنن ۱۴/ ۱۳۴، ۱۳۵) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

☆ "**وأما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة، فلا يجوز قبولها لاشتمالها**

علی عمل محرم۔ ولکن إن قبل أحد مثل هذه الوظیفة، فما حکم الراتب الذی أخذه علیها؟ لم أجد فیها نقلاً فی کلام الفقهاء، إلا ما ذکره ابن قدامة رحمه الله تعالی :

"قال (أی للأجیر: استأجرتک) لتَحْمِل لی هذه الصبرة والتی فی البیت بعشرة ...فإن کانا یعلمان التی فی البیت لکنّها مغصوبة، أو امتنع تصحیح العقد فیها لمانع اختص بها، بطل العقد فیها، وفی صحة الأخری وجهان بناء علی تفریق الصفقة، إلا أنهما إن کانت قفزانهما معلومة، أو قدر أحدهما معلوم من الأخری، فالأولی صحته، لأنّ قسط الأجر فیها معلوم .وإن لم یکن کذلک" فالأولی بطلانه لجهالة العوض فیها۔

والحاصل أن الإجارة فی الخدمة المباحة إنّما تصح إذا کانت أجرتها معلومة بانفرادها. ولاتصح فیما إذا لم تکن أجرتها معلومة .فإن کان کذلک فی خدمات الفنادق والمطاعم والبنوک وشرکات التأمین صارت أجرة الموظف فیها مرکبة من الحلال والحرام .فدخلت فی الصورة الثالثة من القسم الثالث، وحلّ التعامل معه بقدر الحلال .أما إذالم تُعرف أجرةُ الخدمة المباحة علی حدتها، فالإجارة فاسدة، ولکن الأجیر یستحق أجر المثل فی الإجارات الفاسدة، کما صرح به ابن قدامة رحمه الله تعالی بذلک فی إجارات فاسدة أخری۔

وعلی هذا فإن ما یقابل أجر المثل للخدمة المباحة فی راتبه ینبغی أن یکون حلالا، فصار راتبه مخلوطا من الحلال والحرام فی هذه الصورة أیضا فینبغی أن یجوز معه التعامل بقدر الحلال"

(فقہ البیوع ۱/۱۰۵۶، ۱۰۵۷) مفتی عثمان بستوی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی روح الامین سعادتی، مولانا عبدالحکیم، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی صفوان حلیمی۔

☆ **"من مشی مع ظالم لیعینه وهو یعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام"** (المعجم الکبیر ۱/۱۹۷) مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی زبیر ندوی۔

☆ **"و علی هذا یخرج الاستئجار علی المعاصی أن لایصلح لأن استئجار علی منفعة غیر مقدرة الاستیفاء شرعاً، کاستئجار الانسان للعب واللهو و کاستئجار المغنیة والنائحة للغناء"** (بدائع ۴/۱۸۹) مفتی وصی احمد قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا خان حبیب الرحمٰن، مفتی زبیر ندوی۔

☆ **"و کاتبه، لأن کتابة الربا إعانة علیه و من هنا ظهر أن التوظف فی البنوک الربویة لایجوز، فإن کان عمل المؤظف فیما یعین علی الربا کالکتابة أو الحساب فذلک حرام لوجهین: الأول إعانة علی المعصیة، و الثانی أخذ الأجرة من الحرام"** (تکملہ فتح الملہم ۱/۶۱۹) مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی الیاس قاسمی،

مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی۔

ہدایہ میں ہے:"**ولایجوز الاستئجار علی الغناء والنوح و کذا سائر الملاهی، لأنه استئجار علی المعصیة والمعصیة لاتستحق بالعقد**" (ہدایہ ۳/۳۰۶) مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی مغفور احمد باندوی، مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی محمد زبیر ندوی۔

☆ "**إذااجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**" (الاشباہ والنظائر) مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی الیاس قاسمی۔

☆ **و إذا استئجار الذمی مسلما لیحمل له میتة أو دما یجوز عندهم جمیعا ولو استئجر ذمی من ذمی بیتا لیصلی فیه لایجوز ولو استئجر مسلما لیرعی له الخنازیر یجب أن یکون علی الخلاف کما فی الخمر ولو استأجره لیبیع له میتة لم یجز، هکذا فی الذخیرة، مسلم آجر نفسه من مجوسی لیوقد له النار لا بأس به .کذا فی الخلاصة--وسئل إبراهیم بن یوسف – رحمه الله تعالی – عمن آجر نفسه من النصاری لیضرب لهم الناقوس کل یوم بخمسة ویعطی کل یوم خمسة دراهم فی ذلک العمل وفی عمل آخر درهمان قال لا یؤاجر نفسه منهم ویطلب الرزق من طریق آخر، ویکره أن یؤاجر نفسه منهم لعصر العنب لیتخذوا منه خمرا، کذا فی الحاوی للفتاوی**" (الفتاوی الہندیۃ ۴/۴۵۰) مفتی امانت علی قاسمی، مفتی ارشاد عالم آسام۔

☆ "**ولایجوز الاستئجار علی حمل الخمر لمن یشربها ولا علی الخنزیر**" (موسوعہ ۱/۲۹۰) مفتی محمد اشرف قاسمی۔

☆ "**فالواجب ترک العمل فی هذا المجال والاقتصاد علی الأعمال المباحة، و من ترک شیئا لله عوضه الله خیراً منه**"۔

"**اتفقوا علی أنه لایجوز للمسلم أن یؤجر نفسه للکافر لعمل لایجوز فعله کعصر الخمر ورعی الخنازیر وما أشبه ذلک**" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۱۹/۴۵) مفتی شاکر نثار مدنی۔

اجرت حلال ہوگی:

البتہ اس کی کمائی اور اجرت حلال ہوگی (مفتی اختر امام قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی جمیل اختر ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی شکیل منصور قاسمی)۔

دلائل:

☆ "**و فی العتابیة و أما المعصیة نحو أن یستأجر نائحة أو مغنیة أو لتعلیم الغناء و فی فتاوی اهل**

سمر قند استأجر رجلا لينحت له مزماراً أو طنبوراً أوبربطا ففعل يطيب له الأجر إلا أنه يأثم فی الإعانة علی المعصية و استأجر المسلم ليبنی له بيعة أو كنيسة جاز و يطيب له الأجر'' (البحرالرائق شرح کنزالدقائق ۸/ ۲۳) مفتی اخترامام عادل قاسمی۔

☆ ''**إن استأجرها ليزنی بها ثم أعطاها مهرها أوشرط لها لا بأس بأخذه لأنه إجارة فاسدة فيطيب له و إن كان السبب حراما**'' (البحرالرائق ۸/ ۱۹) مفتی اخترامام عادل قاسمی۔

☆ ''**و أما مسئلة ما إذا اختلط الحلال بالحرام فی البلد، فإنه يجوزالشراء والأخذ إلا أن تقوم دلالة علی أنه من الحرام، كذا فی الأصل**'' (الاشباہ والنظائر ۱/ ۱۴۸) مولانا محمد ابراہیم۔

☆ **قَالَ الْفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ – رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى – اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي أَخْذِ الْجَائِزَةِ مِنْ السُّلْطَانِ قَالَ بَعْضُهُمْ يَجُوزُ مَا لَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ يُعْطِيهِ مِنْ حَرَامٍ قَالَ مُحَمَّدٌ – رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى – وَبِهِ نَأْخُذُ مَا لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ – رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى – وَأَصْحَابِهِ، كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّة**

(الفتاوی الہندیۃ، الْبَابُ الثَّانِي عَشَرَ فِي الْهَدَايَا وَالضِّيَافَاتِ ۵/ ۳۴۲)

هذا ونقل البيضاوی أن من يقول الأصل فی الأشياء الإباحة يعنی فی المنافع، وأما فی المضار فالأصل فيها التحريم، وقال الأسنوی:" هذا بعد ورود الشرع بمقتضی أدلته، وأما قبله فالمختار الوقف، وفی أصول البزدوی بعد ورود الشرع الأموال علی الإباحة بالإجماع ما لم يظهر دليل الحرمة؛ لأن الله تعالی أباحها بقوله: ''خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا'' [البقرۃ:۲۹] (تیسیرالتحریر ۲/ ۱۷۲) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ مفتی نظام الدین اعظمیؒ کا فتوی ہے:

''ذمہ دار افراد جو بینک میں سودی قرض لینے اور سود دینے کا کام کرتے ہیں ان کا تو یہ کام ناجائز ہوگا، باقی چونکہ سود کا پیسہ اپنے پاس آتا نہیں بلکہ سود کا پیسہ دینا پڑتا ہے، اس لیے اس طرح قرض لینے میں جو پیسہ آئے گا وہ خود خبیث نہ ہوگا، البتہ خبیث طریقے سے آنے کی وجہ سے اس قرض لینے دینے میں قدرے خباثت آئے گی، باقی وہ لیا ہوا روپیہ اور اس سے کمائی ہوئی آمدنی حرام نہ ہوگی، سب جائز وحلال رہے گی''۔

جب یہ حکم ان ذمہ داروں کی آمدنی ونفع کا نکلا جو بینک سے سودی قرض لیتے اور دیتے ہیں، تو جو لوگ اس ذمہ داری کے علاوہ ہیں اور بینک سے خود سودی قرض نہیں لیتے، تو ان کا حکم بدرجۂ اولی نکل آیا کہ ان کی آمدنی اور نفع وغیرہ اس وجہ سے حرام وناجائز نہ ہوگا؛ بلکہ حلال وجائز رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی: کتاب البیوع، باب الربوا ۳/ ۲۴۱، ط: ایفا) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

☆ حضرت فقیہ الامتؒ رقمطراز ہیں:

(سوال): یہاں پر ایک ایسی فیکٹری ہے جہاں شراب وغیرہ کا ایڈوٹائز بھی ہوتا ہے جو کہ حرام چیزوں میں سے ہے، اصل کام دوسرا ہے، کیا اس جگہ کی آمدنی میرے لئے درست ہے یا کہ نہیں؟

(جواب): جب اصل کام شراب کے اعلان واشتہار کا نہیں؛ بلکہ جائز چیز کا ہے، تو ملازمت جائز ہے، شراب کے متعلق جہاں تک ہو سکے بچنا چاہئے (فتاوی محمودیہ: کتاب الاجارہ، باب الاجارۃ الصحیحۃ، ۱۶/ ۵۶۰، ۵۶۱، ط: دارالمعارف، دیوبند) مفتی اقبال محمد ٹنکاروی۔

اگر حلال ملازمت میں بہت معمولی کچھ حرام کام کرنا پڑتا ہے تو اس کی گنجائش ہے۔

☆ "**غير أن بعض المعاصرين أجازوا شراء أسهمها إن كانت نسبه المحظورات فيها قليلة تابعة غير مقصوده ولاتتجاوز خمسة فی المأة من ايرادته المباحة و بشرط أن يتصدق مالک السهم تلک النسبة من أرباح تلک الأسهم**" (المعیار الشرعی رقم ۲۱، بشأن الأوراق المالیۃ، فقہ البیوع: ۱۰۵۷) مفتی عثمان بستوی، نیز دیکھئے مقالہ مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا ممتاز خان ندوی وغیرہ۔

☆ اگر اس اسٹور میں فروخت کی جانے والی اکثر چیزیں از قبیل حلال ہیں، ضمناً کچھ حرام چیزیں بھی فروخت ہوتی ہیں تو ایسی جگہ ملازمت کرنے کی گنجائش ہے، البتہ حرام چیزوں کا حساب کرنے کی وجہ سے ملنے والی تنخواہ میں جو خبث پیدا ہوا اس کے بقدر صدقہ کر دیا جائے (دارالعلوم آن لائن فتوی) مفتی جمیل اختر جلیلی۔

مولانا عبید اللہ ندوی لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی ایسی جگہ ملازمت کرے جہاں حرام کام ہوتا ہو یا منکرات کی بیع وشراء ہوتی ہو، اور یہ اس میں براہ راست شریک عمل ہو، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے جس سے قرآن نے روکا ہے، اور جہاں تک بات ہے اس کام کی کمائی اور تنخواہ کی تو وہ سب کا سب حرام نہیں ہوگا، بلکہ اس کی یہ تفصیل ہے:

الف: اگر کام کرنے والا براہ راست حرام کام نہ انجام دیتا ہو اور نا ہی کسی طرح کا تعاون کرتا ہو تو کام بھی مباح اور کمائی بھی حلال ہے۔

ب: اور اگر وہ براہ راست حرام کام میں شریک ہے یا کسی طرح کا تعاون کرتا ہے تو یہ ملازمت حرام ہے، اور اس ملازمت پر باقی رہنا جائز نہیں ہے إلا یہ کہ مضطر (مجبور وپریشان) ہو یا اسے کام کی شدید ضرورت ہو اس کے بغیر چارہ نہ ہو، تو ملازمت پر باقی رہ سکتا ہے، مگر حتی الامکان کوشش کرے کہ حرام کام نہ کرنا پڑے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم إليه**" (انعام: ۱۱۹)، البتہ اس صورت میں اس پر ضروری ہوگا کہ حرام کام

کے مقابل اپنی کمائی کا کچھ حصہ صدقہ کرے، یعنی وقت کا اندازہ لگائے کہ کتنی دیر حرام کام میں ملوث رہا پھر اسی تناسب سے اتنا مال صدقہ کردے، اللہ فرماتے ہیں: "**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه**" (بقرۃ:۱۷۳)، نیز فقہ کا قاعدہ ہے: "**الضرورة تقدر بقدر الضرورة**"۔

مفتی شکیل منصور قاسمی لکھتے ہیں:

ہدیہ اور دعوت کھانے جیسے مسائل میں تو غالب مال کی حلت وحرمت مدار حکم بنتی ہے؛ لیکن مالی معاملات (بشمول کرایہ داری) میں غلبے کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ جمہور ائمہ متاخرین نے امام کرخی کے قول پر فتوی دیا ہے جس کا ماحصل یہی ہے کہ مالی معاملات میں ملنے والے زر وثمن کے بعینہ حرام ہونے کا جب تک علم نہ ہوجائے، (اور علم ہونے کی صورت میں بھی جب تک عقد ونقد دونوں اس مال حرام پر جمع نہ ہوجائے) تو وہ اکل حلال ہوگا اور قابل انتفاع ہوگا:

قَالَ مُحَمَّدٌ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى وَبِهِ نَأْخُذُ مَا لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى وَأَصْحَابِهِ، كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّةِ (الفتاوی الہندیۃ، البَابُ الثَّانِي عَشَرَ فِي الْهَدَايَا وَالضِّيَافَاتِ ۵/۳۴۲)

لَكِنْ الْفَتْوَى الْآنَ عَلَى قَوْلِ الْكَرْخِيِّ دَفْعًا لِلْحَرَجِ عَنْ النَّاسِ اھ" (ردالمحتار ۵/۲۳۵ شاملۃ)

مالی معاملات کی حرمت کی وجہ کبھی اعانت علی المعصیت ہوتی ہے تو کبھی سببیت (تسبب)۔

گناہ کے کاموں پر وہ اعانت ممنوع ومحرم ہے جس میں معصیت کا مقصد وارادہ شامل فعل ہو، یا تو:

(الف): حقیقۃً شامل ہو جیسے دل میں نیت موجود ہو، صلب عقد میں احد المتعاقدین کی طرف سے اس معصیت کی تصریح آجائے۔

یا (ب): معصیت کا مقصد وارادہ حکماً شامل ہو، یعنی وہ چیز معصیت کے سوا دوسرے کام میں استعمال ہی نہ ہو، جیسے آلات معازف، طبلہ، سارنگی اور مختلف قسم کے آلات وموسیقی کہ ان چیزوں کا بنانا اور بیچنا اگرچہ مقصد معصیت نہ ہو مگر حکماً وہ بھی قصد معصیت میں داخل ہے، اور جہاں کسب معصیت نہ حقیقۃً ہو نہ حکماً وہ اعانت علی المعصیت میں داخل نہیں (جواہر الفقہ ۲/۴۵۳)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

"**أما قبول الوظائف في مثل هذه الفنادق والمطاعم فإن كانت الوظيفة متمحضة لخدمة مباحة فهي جائزة، وتجرى على راتبها حكم المال الحلال .وإن كانت متمحضة للحرام، مثل بيع الخمر، فهي حرام، وراتبها حرام۔**

وأما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة، فلا يجوز قبولها لاشتمالها

على عمل محرم .ولكن إن قبل أحد مثل هذه الوظيفة، فما حكم الراتب الذى أخذه عليها؟ لم أجد فيها نقلاً فى كلام الفقهاء، إلا ما ذكره ابن قدامة رحمه الله تعالى:

قال (أى للأجير: استأجرتك) لتَحْمِل لى هذه الصبرة والتى فى البيت بعشرة ...فإن كانا يعلمان التى فى البيت لكنها مغصوبة، أو امتنع تصحيح العقد فيها لمانع اختص بها، بطل العقد فيها، وفى صحة الأخرى وجهان بناءً على تفريق الصفقة، إلا أنهما إن كانت قفزانهما ،معلومة، أو قدر أحدهما معلوم من الأخرى، فالأولى صحته، لأنّ قسط الأجر فيها معلوم .وإن لم يكن كذلك، فالأولى بطلانه لجهالة العوض فيها" (المغنی لابن قدامۃ، کتاب الإجارات ۶/۹۰)(فقہ البیوع ۲/۱۰۵۶)۔

سوال۹: حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے جیسے کھیتی باڑی کا کیا حکم ہے، اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا کیا حکم ہے، یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا کیسا ہے، نیز حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا کیسا ہے؟

عدم جواز:

اس سوال کی پہلی شق (حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کھیتی باڑی کرنا) کے جواب میں مقالہ نگار کی آراء مختلف ہیں، بعض کی رائے ہے کہ حرام کمائی سے حاصل کردہ جائیداد میں کام کرنا جیسے کھیتی باڑی کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ مکروہ ہے۔

مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی مقصود فرقانی، مفتی تبریز حلیمی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی اکرم رشید رحمانی، حافظ فاروق عمری، مفتی ابراہیم وریٹھی، مفتی خان حبیب الرحمان ندوی، مولانا عبدالحکیم پالنپوری، مفتی کامران رشادی، مفتی خلیل احمد گجرات، مفتی ضیاء الحق قاسمی، مفتی شاداب کوثری، مولوی عبدالہادی باقوی۔

دلائل

اس لئے کہ اس عمل میں ایک گونا تعاون علی المعصیۃ پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"**وتعاونوا على البر والتقوى، ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (سورہ مائدہ:۲) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی،

مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی محمد سلیم قاسمی۔

☆ **"المال الحرام كالمأخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أونحوذلك ليس مملوكاً لمن هو بيده"** (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۳/۲۴۸) مفتی وصی احمد قاسمی۔

اس شق کے تحت مفتی وصی احمد قاسمی نے تفصیل ذکر کی ہے:

اگر نفس جائیداد حرام نہ ہو؛ بلکہ حرام مال سے خریدی گئی ہو، تو اس میں تفصیل ہے، اگر اس جائیداد کو مال حرام کی طرف اشارہ کر کے خریدی ہو، اور وہی حرام رقم ادا کی ہو، تو پھر وہ ناجائز ہوگی اور اس کی آمدنی بھی ناجائز ہوگی اور واجب التصدق ہوگی، لیکن اگر مال حرام کی طرف اشارہ کئے بغیر اس مال سے جائیداد خریدی یا مطلقا جائیداد کی خریداری کا معاملہ کرلیا اور مال حرام ہی سے قیمت ادا کردی، تو بیشتر فقہاء کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہے؛ لیکن امام کرخیؒ کے قول کے مطابق اصل زمین تو حرام ہوگی اور اس کو صدقہ کرنا واجب ہوگا، لیکن اس میں کھیتی باڑی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع جائز ہوگا، امام کرخیؒ کے قول کی تفصیل نقل کرتے ہوئے علامہ حصکفی رقم طراز ہیں: **"رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه... قال الكرخي في الوجه الاول والثاني لايطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكر: لايطيب في الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس"** (الدرالمختار مع ردالمحتار: ۵/۲۳۵، سعید)۔

چناں چہ صورت مسئولہ میں گنجائش ہے کہ حرام مال سے خرید کردہ جائیداد کی قیمت جائز آمدنی سے صدقہ کردے، اور اس میں کھیتی باڑی کرنا درست ہوگا، اور بہتر یہی ہے کہ کھیتی باڑی بھی رقم صدقہ کرنے کے بعد ہی کرے، چنانچہ امام طحطاوی وغیرہ نے لکھا ہے: **"نعم لايباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب"** (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار: ۴/۱۹۲)۔

"قد اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله" (الفتاوی الھندیہ: ۵/۲۴۹، رشیدیہ)۔

حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنے کی بنیادی طور پر تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) اس کے پاس حرام حلال دونوں طرح کا مال آتا ہے اور وہ سب کو خلط ملط کر دیتا ہے اور اسی سے تنخواہ دیتا ہے تو ایسی صورت میں کوئی حرج نہیں ہے:

"لو أن فقيرا يأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان يأخذها غصبا أيحل ذلك له، قال: إن خلط ذلك بدراهم أخرى فإنه لابأس به" (الفتاوی الھندیہ: ۵/۳۴۲، طبع رشیدیہ)۔

(۲) اس کے پاس صرف مال حرام آتا ہے اور وہ اسی میں سے تنخواہ دیتا ہے اور لینے والے کو معلوم بھی ہے تو پھر اس کے لیے

اس رقم کا لینا جائز نہیں ہوگا:

"**وإن دفع عين المغضوب من غير خلط لم يجز**" (الفتاوی الھندیہ:۳۴۶/۶،رشیدیہ)۔

(۳) ملازم کو مال کی تفصیلات معلوم نہیں ہے، اور نہ یہ معین ہے کہ حرام مال سے ہی تنخواہ مل رہی ہے یا حلال سے؟ اور اس کا کام فی نفسہ حلال ہے تو پھر بنا تفتیش کے اس کے یہاں کام کرنا اور تنخواہ لینا درست ہے: "**وفی الجملة أن طلب الحلال من هذه البلاد صعب، وقد قال بعض مشايخنا: عليک بترک الحرام المحض فی هذا الزمان، فإنک لا تجد شيئا لا شبهة فيه، كذا فی جواهر الفتاوی**" (الفتاوی الھندیہ:۳۴۲/۵)۔

جواز مع الشرط:

اس سوال کی دوسری شق (حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا) کے جواب میں یہ حضرات اور بعض دوسرے مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر حرام کمائی کرنے والے کے دوسرے حلال ذرائع بھی ہوں جن سے مزدوری ادا کی جاتی ہو، نیز حرام کام میں تعاون مقصود نہ ہو تو ایسی صورت میں حرام کمائی کرنے والے کے گھر نوکری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی عثمان بستوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی جمیل نذیری، مفتی عبدالرشید قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی اشتیاق قاسمی، مفتی صابر حسین ندوی، مفتی عثمان منصور پوری، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی مغفور باندوی، مفتی شاکر نثار مدنی، مفتی روح الامین سعادتی، مفتی محمد اشرف قاسمی وغیرہ۔

دلائل:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"**ولاتزر وازرة وزر أخرى**" (سورہ انعام:۱۶۴) مفتی جمیل اختر جمیلی۔

☆ اس لئے کہ اجرت ملازم کے عمل پر ملتی ہے اور ملازم کے عمل کا تعلق مالک کی حرام کمائی سے نہیں ہے، بلکہ روزمرہ کے اعمال سے ہے، فقہی قاعدہ ہے:

"**الأمور بمقاصدها**" (الاشباہ والنظائر/ ۵۳) مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی جمیل اختر جلیلی۔

علامہ زیلعی رقمطراز ہیں:

"**وحمل خمر لذمی بأجر، أی: جاز ذلک أيضا و هذا عند أبی حنيفةؒ و قالا: هومكروه، لأنه عليه الصلاة والسلام لعن فی الخمر عشرة، و عد منها حاملها وله أن الإجارة على الحمل وهو ليس بمعصية ولا تسبب لها وإنما تحصل المعصية بفعل فاعل مختار .....والحديث محمول على الحمل**

المقرون بقصد المعصية'' (تبیین الحقائق ۶/ ۲۹) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ ''**و أن ما تقوم المعصية بعينه ما توجد فيه وصف الموجود حالة البيع كالأمر والسلاح**'' (ردالمحتار ۶/ ۳۹۱) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

☆ مالی معاملات میں امام کرخی کے قول پر عمل کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اسے متعین کر کے نہ دے، لہٰذا اجرت دینے والا جب تک ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کر دے کہ میں تم کو حرام کمائی سے دے رہا ہوں اس وقت تک وہ حرام نہ ہوگا، بلکہ وہ پیسے جائز سمجھے جائیں گے:

''**رجل اكتسب مالا من حرام ثم الاشترى فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أو لا، ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها و دفعها، أو اشترى قبل الدفع بها و دفع غيرها أو اشترى مطلقا و دفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر و دفع تلك الدراهم ..... قال الكرخى فى الوجه الأول والثانى لايطيب و فى الثلاثة الأخيرة يطيب**'' (ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب البیوع ۷/ ۴۹۰) مفتی تبریز عالم حلیمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی محمد سلیم قاسمی۔

☆ ''**و لهذا يجب الأجر بمجرد التسليم ولا معصية فيه، و إنما المعصية بفعل المستأجر وهومختار فيه لقطع نسبته عنه**'' (تبیین الحقائق ۶/ ۲۹) اختر امام عادل قاسمی۔

☆ ''**وقد روى عن الإمام محمدؒ حل الانتفاع بقدر الحلال بصراحة، جاء فى التتارخانية عنه: غصب عشره دنانير، فألقى فيها ديناراً، ثم أعطى منه رجلا ديناراً، جاز، ثم ديناراً آخر، لا، والحلال ههنا أقل، و لكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة**'' (فقہ البیوع ۱/ ۱۰۲۱، ۱۰۳۴) مفتی عثمان بستوی۔

''**والأجر يطيب و إن كان السبب حراماً**'' (ردالمحتار ۹/ ۶۲) مفتی صابر حسین ندوی۔

☆ **والظاهر من قول أبى حنيفة رحمه الله تعالى أنه ينفذ البيع بمعنى أنه ينتقل إلى المشترى الغاصب ملك مااشتراه، ولكن لا يحل له الانتفاع به إلى أن يؤدى الضمان إلى المغصوب منهم. أما البائع الذى باع إليه، فالظاهر أنه يحل له الانتفاع بالثمن الذى قبضه، ولو كان الثمن من النقود لأن فريضة الرد إلى المغصوب منهم انتقل بالخلط إلى الزمان الواجب فى ذمة المشترى الغاصب، فلم يكن ما قبضه البائع عين المغصوب**'' (فقہ البیوع ۱/ ۱۰۲۷) مفتی عثمان بستوی۔

☆ ''**ولم يذكر عن الكرخى حكم البائع الذى أخذ من المشترى النقود المغصوبة، هل يسوغ له استعمال تلك النقود؟ و قد أفتى كثير من علمائنا أنه يجوز له ذلك أيضاً**'' (فتاوی دارالعلوم ۱۴/ ۳۹۳،

فقہ البیوع ۱۰۱۶/۲) مفتی عثمان بستوی۔

☆ علامہ ابن عثیمین فرماتے ہیں:

"ما كان محرماً لكسبه، فإنما إثمه على الكاسب لا على من أخذه بطريق مباح من الكاسب"

(القول المفید علی کتاب التوحید ۱۱۲/۳)، مفتی جمیل اختر جلیلی۔

جواز:

جبکہ اس سوال کی پہلی اور دوسری شق کے جواب میں بیشتر مقالہ نویس کی رائے ہے کہ حرام کمائی سے حاصل کردہ جائیدادوں میں کام کرنا یا حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں ملازمت کرنا فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ اسے خود کسی ناجائز عمل میں مبتلا نہ ہونا پڑتا ہو (مفتی اختر امام عادل قاسمی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی عثمان بستوی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی عبدالرشید کانپوری، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی شاکر نثار مدنی، مفتی روح الأمین سعادتی، مفتی مغفور باندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا ممتاز خان ندوی، قاضی ذکاء اللہ شبلی، مفتی ارشاد عالم آسام، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی رضی احمد رحمانی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مفتی صادق مبارکپوری، مفتی صفوان حلیمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مولانا حمد مکین، مولانا سعد نور قاسمی، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، مولانا ارشد ربانی، مولانا عمار قاسمی، مفتی صالح زماں قاسمی، مفتی نیاز احمد ندوی، مفتی سید محمد علی مدنی، مولانا نثار عالم ندوی، مولانا نظام الدین یوسفی)۔

مفتی شکیل منصور قاسمی نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اصول بیان کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

ملک خبیث یعنی غیر مشروع طریقہ اور ناجائز ذرائع سے جو مال حاصل کیا جاتا ہے اس مال کی عین وذات میں حرمت نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ حرمت حرام مال کے کاسب وحامل کے ذمہ سے متعلق ہوتی ہے، مال حرام کی تطہیر اور اس سے گلوخلاصی کے مشروع ومتعین طریقوں سے انحراف کرتے ہوئے اگر کوئی شخص اس مال حرام میں بیع وشراء جیسا تصرف کرلے اور اس سے کوئی چیز خرید لے تو یہ اس کا ناجائز عمل اسی کے سر رہے گا، اس کا جواب دہ ومسئول وہ خود ہوگا، حرمت فعل اسی کے ذمہ سے متعلق ہوگی، دوسرے لوگوں کے ذموں تک یا مال حرام سے خریدی گئی چیزوں کی عین وذات تک اس کی حرمت اثر انداز نہ ہوگی:

"كُلُّ امْرِءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ" (الطور:۲۱)، ویقول: "وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى" (الأنعام:۱۶۴)۔

فقہاء متاخرین نے ہر مالی لین دین میں مال حرام پر عقد ونقد جمع نہ ہونے کی صورت میں ہر متعاقد کے لئے اسے لینے اور اس سے انتفاع کی گنجائش دی ہے، اور مزدوری دینے والا ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کردے کہ یہ پیسے میں تم کو خالص حرام کمائی کے دے رہا ہوں، اس وقت تک وہ بائع واجیر کے لئے حرام نہ ہوگا؛ ہاں وہ لیکر صدقہ کردے تو بہتر بات ہے، یعنی قضاء جائز ہے دیانۃً جائز نہیں!

قضاء مزدور و بائع کو مزدوری یا ثمن کے پیسے کی کھود کر یدکرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

لہٰذا مال حرام سے خریدی گئی زمین میں کھیتی باڑی سمیت محنت مزدوری کا عمل کرنا، یا کاسب حرام کے گھر میں کام کرنا، مال حرام سے خرید کردہ گاڑی میں سفر کرنا، کاسب حرام سے تعلیمی یا طبی فیس یا دیگر واجبی حقوق واجرت وصولنا مال حرام پہ عقد ونقد جمع نہ ہونے کی شرط کے ساتھ بر بنائے روایت کرخی جائز ہے، اور اجیر کے لئے بھی قابل انتفاع اور مباح الاول ہے۔

"قَالَ الْفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ – رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى – اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي أَخْذِ الْجَائِزَةِ مِنْ السُّلْطَانِ قَالَ بَعْضُهُمْ يَجُوزُ مَا لَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ يُعْطِيهِ مِنْ حَرَامٍ قَالَ مُحَمَّدٌ – رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى – وَبِهِ نَأْخُذُ مَا لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ – رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى – وَأَصْحَابِهِ، كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّةِ" (الفتاوی الہندیۃ ،الْبَابُ الثَّانِي عَشَرَ فِي الْهَدَايَا وَالضِّيَافَاتِ ۵/ ۳۴۲)

عدم جواز:

اس سوال کی شق (حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں سفر کرنا) کے بارے میں بعض مقالہ نویس کی رائے ہے کہ متعین حرام کمائی سے خریدی ہوئی بائک پر بیٹھ کر سفر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے (مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی تبریز عالم حلیمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی مغفور احمد باندوی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی صفوان حلیمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی کامران رشادی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، مولانا عمار قاسمی، مفتی محمد برکت علی قاسمی)۔

دلائل:

☆ **"يـأيهـا الـذين آمنوا اتقوا الله و ذورا ما بقى من الربا إن كنتم مؤمنين فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله و رسوله"** (سورہ بقرہ:۲۷۹-۲۷۸) مفتی محمد الیاس قاسمی۔

☆ **"ولو لاينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم و أكلهم السحت لبس ما كانوا يصنعون"** (سورہ مائدہ: ۶۳) مفتی محمد شاہ جہاں ندوی۔

☆ **"والـحـرام ينتقل أى تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى و تبدلت الأملاک"** (ردالمحتار ۷/ ۳۰۰) مفتی محمد سلیم قاسمی۔

☆ "یہ انتفاع من مال الحرام ہے جو شرعاً جائز نہیں" (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۱۰۴) مفتی حبیب اللہ قاسمی۔

☆ اس مسئلہ کو ہدیہ والے مسئلہ پر قیاس کیا جائے گا، چنانچہ فتاوی خانیہ میں ہے:

☆ ”صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه“ (بذل المجہود ۱/ ۳۷) مفتی حبیب اللہ قاسمی۔

☆ اس کی بائک یا کار میں بیٹھ سفر کرنے سے اس کے ناجائز کاروبار کی حوصلہ افزائی ہوگی، اللہ تعالیٰ نے حرام اور سودی کاروبار سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے:”يأيها الذين آمنوا اتقوا الله و ذروا ما بقى من الربا إن كنتم مؤمنين، فإن تفعلوا فأذنوا بحرب من الله و رسوله“ (سورہ بقرہ:۲۷۸،۲۷۹) مفتی محمد الیاس قاسمی۔

جواز:

جبکہ اس تیسری شق کے جواب میں بعض دوسرے مقالہ نگار کی رائے ہے کہ حرام مال سے خریدی ہوئی کار یا بائک پر سفر کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے (مفتی عثمان بستوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی جمیل اختر جلیلی، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی روح الامین سعادتی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی محمد زبیر ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی مقصود فرقانی، حافظ سید فاروق عمری، مفتی شاکر نثار مدنی، مفتی محمد ابراہیم، مفتی رضی احمد رحمانی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مولانا صادق مبارک پوری، مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی، مولانا محمود اختر کیفی، مفتی شکیل کوثری، مولانا احمد مکین، مولانا ابو محمد نور قاسمی، مولانا آزاد بیگ قاسمی)۔

دلائل:

”ولاتزر وازرة وزر أخرى“ (سورہ انعام:۶۴) مفتی جمیل اختر جلیلی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی۔

علامہ ابن عثیمین فرماتے ہیں:

☆ ”ما كان محرما لكسبه، فإنما إثمه على الكاسب لا على من أخذه بطريق مباح من الكاسب“ (القول المفید علی کتاب التوحید ۳/ ۱۱۲) مفتی جمیل اختر جلیلی، حافظ کلیم اللہ عمری وغیرہ۔

معاصر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، چنانچہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں دار الافتاء دار العلوم سے جواز کا فتوی صادر کیا گیا ہے:

”صورت مسئلہ میں آپ اپنے آفس کے ساتھی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر یا آفس وغیرہ آجا سکتے ہیں، جائز ہے، کیونکہ انہوں نے گاڑی کے لئے جو سودی قرض لیا ہے، یہ بلاشبہ حرام اور ناجائز کام کیا، کیونکہ مذہب اسلام میں سود لینا اور سود دینا دونوں ہی حرام ہیں اور سودی قرض لینے والا قرض دینے والے کو اصل قرض کی واپسی کے ساتھ جو مزید دیتا ہے وہ شرعاً سود ہوتا ہے.....اور ان سے خریدی ہوئی کار یا کوئی چیز حرام نہیں، پس گاڑی کے مالک کے لئے اس طرح اس کی اجازت سے دوسروں کے لئے سودی قرض سے خریدی ہوئی گاڑی میں سوار ہونا اور سفر کرنا جائز ہے“ (فتوی نمبر:ID:022/13=2/1438)

مولانا اشتیاق احمد اعظمی۔

☆ ضروری نہیں کہ گاڑی یا سفر خرچ حرام آمدنی ہی سے ہو، اور اگر ہو بھی تو اس کی ذمہ داری براہ راست گاڑی والے پر عائد ہوتی ہے:

"**ولا تزر وازرة وزر اخری**" (سورہ انعام: ۱۶۴) مفتی اختر امام عادل قاسمی۔

گنجائش:

اس سوال کی چوتھی شق (حرام کمائی کرنے والے کا اپنے بچوں کی فیس ادا کرنا) کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار کی رائے ہے کہ حرام کمائی کرنے والا اگر اپنے بچے کی تعلیمی فیس ادا کرتا ہے تو فیس وصول کرنا جائز ہے، اس کی گنجائش ہے، البتہ متعین طور پر معلوم ہو جائے کہ یہ رقم حرام کمائی کی ہے تو فیس واپس کرنا یا مدرسہ کے رفاہی کاموں پر صرف کرنا بہتر ہے۔

اسی طرح بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ اگر فیس دینے والے کی اکثر آمدنی حلال مال سے ہے تو فیس لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ورنہ احتراز کیا جائے۔

دلائل:

☆ "**آكل الربا و كاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه و غالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه و إن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها، كذا في الملتقط**" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۳) مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی مغفور باندوی۔

☆ دارالافتاء بنوری ٹاؤن کا فتوی ہے:

"جن بچوں کے والد کا ذریعہ معاش حلال نہ ہو، ان سے وصول کردہ فیس کی رقم میں کراہت ہوگی" (فتوی نمبر 200002) مفتی تبریز حلیمی۔

بلا کسی صراحت کے حرام میں سے دے رہا ہے تو لینا درست ہے، علامہ کرخی کی یہی رائے ہے، لوگوں سے حرج کو دفع کرنے کے لئے اسی پر فتوی ہے (ردالمحتار ۷/ ۴۹۰) مفتی اشتیاق احمد قاسمی۔

☆ امام محمدؒ کا قول جواز کا ہے:

"**قال الفقيه أبو الليثؒ: اختلف الناس في أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: يجوز مالم**

يعلم أنه يعطيه من حرام، قال محمدؒ: و به نأخذ مالم يعرف شيئا حراما بعينه وهو قول أبي حنيفة و أصحابه، كذا في الظهيرية" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۲) مفتی محمد زبیر ندوی وغیرہ۔

سوال ۱۰: آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے ایک خطیر رقم رشوت دے کر لی جاتی ہے، کیا اس پر سود کی رقم کا استعمال جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کی آراء مختلف ہیں، بعض کی رائے ہے کہ سودی رقم کا اصل مصرف تو یہ ہے کہ اسے اصل مالک تک کسی طرح واپس کر دیا جائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی جائے یا اس کو افادہ عامہ کے کاموں میں لگا دیا جائے، جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت پائی جاتی ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں جن ذرائع سے سود کی رقم حاصل ہوتی ہے وہ عام طور سے بنک ہیں جو سرکاری ہیں یا سرکار کی نگرانی میں ہیں، اگر ان بنکوں سے ملنے والی سودی رقم رشوت کے طور پر براہ راست حکومتی ادارہ میں جمع کر دی جائے تو اس کی گنجائش ہے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ یہ رشوت افسران کی جیب میں چلی جاتی ہے، وہ حکومت تک نہیں پہنچتی ہے، البتہ اگر یہ تاویل کی جائے کہ حکومت کے افسران حکومت کے نمائندے ہوتے ہیں اور نمائندہ کا قبضہ بھی اصل کے قبضہ کی طرح ہے تو شاید کسی حد تک جواز کی شکل نکل جائے (دیکھئے مقالہ مفتی اختر امام عادل قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی جمیل اختر ندوی، مفتی عبد الرشید قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی الیاس قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی مولانا محمد اشرف قاسمی، مولانا شاکر نثار مدنی، مفتی مقصود فرقانی، حافظ سید فاروق عمری، مفتی ارشاد عالم، مفتی رضی احمد رحمانی، مولانا مدثر قاسمی، مولانا نیاز احمد ندوی، مفتی صالح زماں قاسمی، مفتی سید محمد علی مدنی، مفتی ذکاء اللہ شبلی، مولانا عمار قاسمی، مولوی عبد الہادی)۔

دلائل

☆ "**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه و ماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع**" (شامی ۶/ ۴۲۳) مفتی عفان منصور پوری، مفتی رضی احمد رحمانی۔

☆ اسی طرح رشوت والے مسئلہ میں بھی حکم حکومت ہی کی طرف منسوب ہوگا اور ایسا سمجھا جائے گا کہ رشوت کی یہ رقم خود حکومت نے لی ہے، اور جب ایسا ہے تو پھر سوال نامہ میں ذکر کردہ امور میں سودی رقم دینا شرعاً جائز اور درست ہوگا (مفتی عبد الرشید کانپوری)۔

☆ مفتی جمیل اختر جلیلی نے مذکورہ سوال کی دوصورتیں لکھی ہیں:

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ دفع ظلم اورحق کی وصولی کے لئے رشوت دینا جائز ہے،اب مذکورہ سوال کی دوصورتیں ہیں:

۱) نقشہ کی منظوری کے لئے جورقم دی جاتی ہے،وہ حکومت کے اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔

۲) وہ رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں نہیں جاتی؛بل کہ متعلقہ افراد کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے۔

پہلی صورت میں سود کی رقم سے رشوت دے سکتے ہیں؛ کیوں کہ سود مال حرام ہےاور مال حرام کا حکم یہ ہے کہ اسے اس کے مالک تک پہنچادیا جائے،علامہ شامی لکھتے ہیں: ''**وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ**'' (شامی:۹ /۳۸۵)اور یہاں یہی کیا جارہا ہے۔

دوسری صورت میں بھی سود کی رقم سے رشوت دینادرست ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں مال حرام کواپنے اوپر استعمال کرنانہیں پایا جارہا ہے؛ بل کہ ایک رفاہی کام کی منظوری لی جارہی ہے،اس کا استعمال نادرست اس وقت ہوتا، جب کہ انسان اپنی ذات کے لئے کرتا، یہاں اپنی ذات کے لئے سود کا استعمال نہیں پایا جارہا ہے ؛ اس لئے درست ہونا چاہئے۔

☆ مفتی محمد الیاس قاسمی نے کتاب الفتاوی کے حوالہ سے لکھا ہے:

''مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے ایک خطیر رقم بطور رشوت دی جاتی ہے،اس رشوت کے بغیر نقشہ کی منظوری میں بہت دشواری ہوتی ہے، اس لئے بدرجۂ مجبوری مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم بطور رشوت دینا جائز ہے'' (مستفاد: کتاب الفتاوی ۸۰۳/۵)۔

☆ مفتی محمد اشرف قاسمی اور مولانا قمر الزماں ندوی نے حضرت مولانا مفتی عبید اللہ اسعدی صاحب کی کتاب مقالات اسعدی سے نقل کیا ہے:

''ایک جماعت کے نزدیک رفاہی کاموں میں اس کا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔۔۔۔لقطہ واجب التصدق ہوتا ہے،لیکن واجب التملیک نہیں اور لقطے کے مصارف میں کارِ خیر کو مثلاً حکومت کی ضرورت کے مختلف کام، عامۃ الناس اور عامۃ المسلمین کی ضرورت کے کاموں میں بھی استعمال کیا ہے،لہٰذا یہ رقم رفاہی کاموں میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے،اس لیے کہ اس میں تملیک کا مسئلہ نہیں ہے،زکوۃ کی طرح اوراس کی حیثیت زکوۃ سے مختلف ہے،لہٰذا اس کو ہر طرح کے رفاہی کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے ، جو عام انسانوں کے لیے مفید ہوں'' (مقالات اسعدی، جدید فقہی مباحث، ۸/

۲۲۶/و۲۲۷ مکتبہ احسان، لکھنؤ، ۲۰۲۲ء)۔

جبکہ دوسرے بعض مقالہ نگاران کی رائے ہے کہ رشوت کی رقم چونکہ افسروں کی جیب میں جاتی ہے، لہٰذا رشوت میں سود کی رقم کا استعمال جائز نہیں ہے (مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا اشتیاق اعظمی، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ممتاز خان ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی الیاس قاسمی، مفتی مغفور باندوی، مفتی روح الامین سعادتی، مولانا خورشید مفتاحی، مولانا نثار عالم ندوی، خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی فیاض برمارے، مفتی اکرم رشید رحمانی، مفتی زبیر ندوی، مولانا عبد الاحد قاسمی، مفتی ابراہیم ورتھی، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا ریاض ارمان قاسمی، مولانا کامران رشادی، مولانا خلیل احمد، مولانا راسخ الاسلام، مولانا صادق مبارکپوری، مولانا ارشد ربانی، مولانا محمود کیفی، مفتی ضیاء الحق قاسمی، مولانا شاداب کوثری، مولانا شکیل کوثری، مولانا احمد مکیں، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا ابو محمد نور، مولانا آزاد بیگ قاسمی، مولانا محمد نثار ندوی، مفتی برکت علی قاسمی، مولانا نظام الدین یوسفی)۔

دلائل:

کیونکہ اس کا مصرف رفاہی کاموں میں صرف کرنا ہے یا بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دینا ہے:

"**سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**" (تبیین الحقائق ۲۷/۶) مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مولانا خورشید مفتاحی، مفتی ارشاد عالم، مولانا محمود کیفی، مولانا آزاد بیگ قاسمی۔

☆ "**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه**" (ردالمحتار ۹۹/۶) مولانا صابر حسین ندوی، مفتی اشتیاق قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی شکیل قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، مفتی سلیم قاسمی، مولانا خورشید مفتاحی، مفتی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مفتی زبیر ندوی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مولانا احمد مکیں، مولانا ابو محمد سعد قاسمی، مولانا محمد نثار عالم ندوی۔

☆ مفتی نظام الدین اعظمی کا فتوی اس موضوع پر موجود ہے:

"(۱) وکیل سرکاری ہو یا آزاد ہو، اس کو جو فیس دی جاتی ہے وہ خزانہ سرکار میں نہیں پہنچتی ہے، اس لئے اس میں یہ پیسہ دینا درست نہ ہوگا، ہاں جو پیسہ ٹکٹ یا اسٹامپ میں یا مقدمہ چالو وغیرہ میں جو رقوم حکومت کو ادا کی جائے وہ خزانہ سرکار میں پہنچتی ہے، اس لئے ٹکٹ یا اسٹامپ یا رقوم سرکاری میں جو پیسہ دیا جائے گا وہ "**رد المال إلى رب المال**" کے ضابطہ شرعیہ کے مطابق ہوگا اور یہ دینا اس سودی روپیہ سے جائز رہے گا"۔

☆ دارالعلوم کا فتوی:

اسی طرح دارالعلوم دیوبند نے اپنے فتوی میں لکھا ہے: "رشوت میں سود کی رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ

سود کی رقم یا تو مالک (بینک یا حکومت وغیرہ) کو لوٹانا ضروری ہے یا پھر غریبوں مسکینوں کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے، رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضہ میں نہیں جاتی؛ بلکہ افسران کے جیب میں جاتی ہے''، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک دوسرے فتوی میں ہے: ''سود کی رقم مال حرام اور مال خبیث ہے اس کو اپنے استعمال میں لانا حرام و ناجائز ہے، اس رقم کو بلا نیت ثواب غریبوں اور محتاجوں پر صدقہ کرنا واجب ہے، یہ رقم رشوت میں دینا جائز نہیں''، واللہ تعالیٰ اعلم (مولانا صابر حسین ندوی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی نثار احمد گودھروی)

ان فتاوی کو نقل کرنے کے بعد مولانا صابر حسین ندوی لکھتے ہیں:

ان فتاوی کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدارس یا دوسری عمارتوں کا نقشہ پاس کروانے کیلئے افسران کو سود کی رقم بطور رشوت نہ دی جائے، خصوصاً اہل مدارس اور اصحاب علم دین کو اس سے مزید بچنا چاہئے، تاکہ عوام میں سود اور رشوت دونوں کی شناعت بیٹھ جائے؛ نیز ان فرمان الٰہی کو سامنے رکھنا چاہے، ''**وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجعَل لَهُ مَخرَجًا، وَيَرزُقهُ مِن حَيثُ لا يَحتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّل عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسبُهُ إِنَّ اللَّهَ بـٰلِغُ أَمرِهِ قَد جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيءٍ قَدرًا** (سورۃ الطلاق)

ذاتی کام اور اداروں کے کام میں فرق:

مفتی جمیل احمد نذیری اور مفتی عثمان بستوی، اسی طرح مولانا صفوان حلیمی نے ذاتی کام کے لئے اور اداروں کے کام کے لئے رشوت دینے کے مسئلہ میں فرق بیان کیا ہے، چنانچہ مفتی جمیل احمد نذیری کی رائے ہے کہ ذاتی عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لیے سودی رقم سے رشوت دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اپنے کام میں اپنے سود کی رقم کا استعمال کرنا ہوا، جو کہ جائز نہیں ہے۔

البتہ مدارس یا رفاہی اداروں کے نقشوں کی منظوری کے لئے سودی رقم بطور رشوت دی جاسکتی ہے، کیونکہ سودی رقم کا ایک مصرف رفاہی امور بھی ہیں۔

جبکہ مفتی عثمان بستوی اور مولانا صفوان حلیمی کی رائے ہے کہ ذاتی عمارت کے نقشے کی منظوری کے سلسلہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس میں سود کی رقم کا استعمال اسی صورت میں جائز ہے، جبکہ دینے والا فقیر ہو۔

لیکن مدارس کی عمارتوں کے لئے اور مالدار شخص کے لئے سود کا اس مد میں دینا جائز نہیں ہوگا۔

سوال ۱۱: کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو، اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال

ہے یا حرام؟ ناگواری اور اختلاف کا باعث بنتا ہے، تو کیا پوچھے بغیر یہ ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے؛ حالانکہ اس کے حرام ہونے کا بھی امکان ہے، اسی طرح بچوں کو کوئی ٹافی وغیرہ دے دیتا ہو، کبھی پانی چائے پلاتا ہو اور کبھی ضروری چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو؛ لیکن اس شخص کی کمائی کیسی ہے، معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں اس چیز کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں چند ایک مقالہ نگار کے علاوہ تمام کی رائے ہے کہ جس آدمی کا اکثر مال حلال ہو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے اور جس کا اکثر مال حرام ہو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، اور یہ شریعت اسلامی کا مسلمہ ضابطہ بھی ہے (مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی عثمان بستوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی، مولانا رحمتاللہ ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی جمیل نذیری، مفتی جمیل اختر ندوی، مولانا اشتیاق اعظمی، مفتی اشتیاق قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی عفان منصور پوری، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی اشرف قاسمی، مفتی سلیم قاسمی، مفتی روح الامین سعادتی، مولانا خورشید مفتاحی، مفتی نثار گودھروی، مولانا سعید ندوی، مفتی مقصود فرقانی، وغیرہ)

☆ ''**الأصل أن أمور المسلمين محمولة على السداد والصلاح حتى يظهر غيره**'' (من اصل الکرخی، قواعد الفقہ ۱۲/) مفتی ارشاد عالم آسام، مفتی صالح زماں قاسمی، مولانا محمود کیفی۔

☆ اگر یقینی طور پر کسی کے بارے میں معلوم نہ ہو تو محض ظن کی بنیاد پر کسی کے مال کے حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے جب تک کہ قوی دلیل سے نہ معلوم ہو جائے، قاعدہ ہے: ''**اليقين لايزول بالشک**'' (مجلّہ الاحکام العدلیہ، مادہ: ۴) مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی مغفور باندوی، مفتی نثار گودھروی، مفتی خان حبیب ندوی، مفتی زبیر ندوی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی صالح زماں قاسمی۔

☆ ''**عن ابن مسعود قال: جاء إليه رجل فقال: إن لی جارا يأكل الربا و أنه لايزال يدعونی فقال: مهناه لک وأثمه عليه، قال إن عرفته بعينه فلا تصب**'' (مصنف عبدالرزاق ۸/ ۱۵۰) مفتی زبیر ندوی، مفتی روح الامین سعادتی وغیرہ۔

☆ ''**ولايجوز قبول هدية أمراء الجور، لأن الغالب فی مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله من حل، بأن كان صاحب تجارة أوزرع فلا بأس به ..... فيعتبر الغالب، و إن كان غالب ماله الحرام لايقبلها و لا يأكل إلا إذا قال إنه حلال أورثته و استقرضته**'' (مجمع الأنہر ۴/ ۱۸۶) مفتی شاہ جہاں ندوی، مفتی خان حبیب ندوی، مولانا محمود کیفی، مفتی ابوبکر قاسمی۔

☆ ''**و إن كان غالب مال المهدی من الحلال لا بأس بأن يقبل الهدية، و يأكل مالم يتعين عنه أنه حرام لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فيعتبر الغالب و إذا مات عامل من عمال السلطان و أوصى**

أن يعطى الحنطة قالوا: إن كان ما أخذه من الناس مختلطا بماله لا بأس به و إن كان غير مختلط لايجوز للفقراء أن يأخذوا إذا علموا أنه مال الغير و إن لم يعلم الآخذ أنه من ماله أو من مال غيره فهو حلال حتى يتبين أنه حرام" (خانیہ علی الہندیہ ۳/۴۰۰، ۴۰۱) مفتی مغفور احمد باندوی، مولانا ابراہیم پالنپوری۔

☆ فقہ البیوع میں ہے:

"**الصورة الرابعة أن المال مركب من الحلال والحرام، ولا يعرف أن الحلال مميز من الحرام أو مخلوط غير مميز، وإن كان مخلوطًا فكم حصة الحلال فيه، والأولى فى هذه الصورة التنزه، ولكن يجوز للآخذ أن يأخذ منه بعض ماله هبةً أو شراءً، لأن الأصل الإباحة، وينبغى أن يقيد ذلك بأن يغلب على ظن الآخذ أن الحلال فيه بقدر مايأخذه أو أكثر منه**" (فقہ البیوع: ۲/۱۰۳۸) مفتی روح الأمین سعادتی۔

☆ ہدیہ دینے والے کے بارے میں تحقیق نہ ہو تو ایسی صورت میں کھود کرید کرنے اور پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"**رجل اشترى من التاجر شيئاً هل يلزمه السوال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان فى بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال فى أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه خلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام** (الفتاوی الہندیۃ کتاب البیوع، الباب العشرون فی البیاعات) مفتی عثمان بستوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی اختر امام عادل قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی جمیل اختر ندوی، مفتی اشتیاق قاسمی، مفتی سلیم قاسمی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی صفوان حلیمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی، مفتی صالح زماں قاسمی، مفتی تبریز حلیمی، مفتی شاکر نثار مدنی، مولانا سعید احمد ندوی۔

☆ "**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه و لايسأله عنه فإن سقاه شراباً ليشربه فليشرب من شرابه ولم يسأله عنه**" (مسند احمد ۲/۲۹۹) مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی جمیل اختر ندوی، مفتی اشتیاق قاسمی، مفتی وصی احمد قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مفتی عبد الرشید قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مفتی محمد سلیم قاسمی، مفتی خان حبیب ندوی، مفتی زبیر ندوی، مفتی ابراہیم ورتیٹھی، مولانا محمود کیفی، مولانا آزاد بیگ قاسمی۔

☆ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ مناوی لکھتے ہیں: "**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم**" **لزيارة أو غيرها (فأطعمه) من (طعامه فليأكل) منه ندبا، هكذا هو ثابت فى الحديث وإن كان صائما نفلا؛ جبرا لخاطره (ولا يسأل عنه) أى عن الطعام من أى وجه اكتسبه ليقف على حقيقة حله؛ فإن ذلك غير مكلف به ما لم تقو الشبهة فى طعامه، والمراد: لا يسأل منه ولا من غيره، (وإن سقاه من شرابه فليشرب) منه أيضا (ولا يسأل عنه) كذلك؛ لأن السؤال عن ذلك يورث الضغائن ويوجب التباغض، والظاهر أن**

المسلم لا يطعمه ولا يسقيه إلا حلالا، فينبغي إحسان الظن وسلوک طريق النوادر فيتجنب عن إيذائه بسؤاله" (فیض القدیر للمناوی:۱/۷ ۳۳،المکتبۃ التجاریۃ الکبری) مفتی عبدالرشید قاسمی۔

☆ "**أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية،ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال أورثته أو استقرضته من رجل،كذا في الينابيع ،ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور،لأن الغالب في مالهم الحرمة،إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال ،بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به،لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام، فالمعتبر الغالب، وكذا أكل طعامهم،كذا في الاختيار شرح المختار**" (۸۱۷/۴،ط:دارالکتب العلمیہ، بیروت،فتاوی ہندیہ ۲۴۳/۵،کتاب الکراھیۃ،ط: المطبعۃ الکبری الامیریہ،بولاق،مصر) مولانا عبیداللہ ندوی،مفتی وصی احمد قاسمی،مفتی شکیل منصور قاسمی،مفتی شاکر نثار مدنی،مولانا خورشید مفتاحی،مفتی اکرم رشید رحمانی،مفتی ضیاء الحق قاسمی،مولانا محمود کیفی۔

☆ "**و إن أهدى هدية فإنها تصرف في وجوه البر**" (فقہ البیوع ۱۰۲۳/۲)،مفتی تبریز جلیسی۔

☆ "**الأشياء يحكم ببقائها على أصولها حتى يتيقن خلاف ذلک، ولا يضر الشک الطارى عليها**" (شرح النووی علی صحیح مسلم ۴۹/۴)مفتی جمیل اختر جلیلی۔

☆ فتاوی بزازیہ میں ہے:"**ولا يختلف عن دعوة العامة كدعوةالختان و العروس فإذا جاء قعد، فإن شاء أكل والأفضل الأكل إن لم يعلم بالحرمة**" (بزازیہ علی الہندیہ ۳۶۴/۶،کتاب الکراہیۃ)مولانا عبدالأحد قاسمی۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"**ما في الوجود من الأموال المغصوبة والمقبوضة بعقود لا تباح بالقبض إن عرفه المسلم اجتنبه فمن علمت أنه سرق مالا أو خانه في أمانته أو غصبه فأخذه من المغصوب قهراً بغير حق لم يجز لي أن آخذه منه لا بطريق الهبة ولا بطريق المعاوضة ولا وفاء عن أجرة ولا ثمن مبيع ولا وفاء عن قرض فإن هذا عين مال ذلک المظلوم، وإن كان مجهول الحال فالمجهول كالمعدوم والأصل فيما بيد المسلم أن يكون ملكاً له إن ادعى أنه ملكه، فإذا لم أعلم حال ذلک المال الذى بيده بنيت الأمر على الأصل، ثم إن كان ذلک الدرهم في نفس الأمر قد غصبه هو ولم أعلم أنا كنت جاهلاً بذلک، والمجهول كالمعدوم، لكن إن كان ذلک الرجل معروفا بأن في ماله حراماً ترک معاملته ورعا، وإن كان أكثر ماله حراما ففيه نزاع بين العلماء، وأما المسلم المستور فلا شبهة في معاملته أصلاً، ومن ترک معاملته ورعاً كان قد ابتدع في الدين بدعة ما أنزل الله بها من سلطان**" (مجموع الفتاوی ۳۲۳/۲۹)مفتی شکیل منصور قاسمی۔

دوسری جگہ علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"فجميع الأموال التى بأيدى المسلمين واليهود والنّصارى التى لا يُعلم بدلالة ولا أمارة أنّها مغصوبة أو مقبوضة قبضا لا يجوز معه معاملة القابض ، فإنّه يجوز معاملتهم فيها بلا ريب ، ولا تنازع فى ذلك بين الأئمّة أعلمه" (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۲۷) مفتی شکیل منصور قاسمی۔

☆ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ "کتاب الفتاوی" میں فرماتے ہیں:

"اگر معلوم نہ ہو کہ یہ کھانا یا مٹھائی پوجا کی ہے اور کوئی واضح قرینہ بھی ایسا نہ ہو جس سے شبہ کی تصدیق ہوتی ہو تو ایسی صورت میں شرکت درست ہے، کیونکہ شریعت میں احکام کی بنیاد یقین یا یقین کے قریب گمان پر رکھی جاتی ہے محض شبہ پر عام مسائل میں فیصلہ نہیں کیا جاتا ہے، معمولی درجے کا شبہ تو ہر جگہ موجود ہے، حضور ﷺ اور صحابہ کرام نے غیر مسلموں کی دعوتیں قبول کی ہیں اور اس سلسلے میں تجسس کئے بغیر کھانا کھایا ہے۔ (کتاب الفتاوی: ۶/ ۲۰۲۔ حلال وحرام سے متعلق سوالات) مولانا عبدالاحد قاسمی۔

مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی فیاض محمود برمارے کی رائے ہے کہ ایسی دعوت سے احتراز کرنا چاہئے۔

اسی طرح مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا کامران رشادی، مفتی محمد علی مدنی، مولانا عبدالہادی باقوی کی رائے ہے کہ کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام؟ ناگواری اور اختلاف کا باعث بنتا ہے تو بھی پوچھے بغیر ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، کیونکہ بستی کی اکثریت کا کاروبار حرام پر مشتمل ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فاسقوں کی دعوت قبول کرنے سے منع فرمایا ہے:

"عن عمران بن حصين قال نهىٰ رسول ﷺ عن إجابة طعام الفاسقين" (مشکوٰۃ المصابیح علی مرقاۃ المفاتیح حدیث نمبر ۷۲۲۳)۔

لیکن مفتی اقبال محمد ٹنکاروی، مولانا عبید اللہ ندوی اور مفتی محمد عفان منصور پوری کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کی آمدنی کے مشتبہ ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو، محض وہم یا وسوسہ ہو، تو ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کئے بغیر اس کا ہدیہ قبول کرنا درست ہے، بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اسکے ذریعۂ آمدنی پر شبہ کرنا درج ذیل آیت کی وجہ سے جائز نہیں ہے:

"**يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن إن بعض الظن إثم ولا تجسسوا .....**" (حجرات: ۱۲)۔

اسی طرح مفتی اختر امام عادل قاسمی لکھتے ہیں کہ معاشرتی زندگی میں اس طرح کے تحفظات رکھنے کی گنجائش نہیں ہے، اس سے باہمی عداوت اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے اور احتیاط کے نام پر ایک فریق کے دماغ میں اپنے لئے تقدس کا گمان پیدا ہوتا ہے، جب تک کہ حرام کا یقین نہ ہو بے تکلف ایک دوسرے کے تحائف اور تعاون کو قبول کرنا چاہئے اور ہر مسلمان

کے بارے میں بہتر خیال رکھنا چاہئے، صحابہ اور تابعین کے جو آثار اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے یہی روش ملتی ہے۔

سوال ۱۲: جس کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کرنے کے لئے کہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں چند مقالہ نگار کے علاوہ تمام کی رائے ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں کے لئے ضرور دعا کرنا چاہئے اور ان کی ہدایت کے لئے بھی دعا کرنا چاہئے۔

دلائل:

☆ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**ربنا اغفرلی ولوالدی و للمؤمنین یوم یقوم الحساب**" (سورہ ابراہیم:۴۱) مفتی شاہ جہاں ندوی، قاضی مطیع الرحمٰن قاسمی، قاضی ریاض ارمان قاسمی۔

☆ "**اللھم اھد ثقیفا**" (سنن ترمذی، حدیث نمبر:۳۹۴۲) مفتی اشتیاق قاسمی، مفتی مغفور باندوی۔

☆ "**عن أبی ھریرۃ جاء الطفیل بن عمر الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال: إن دوسا قد ھلکت عصت وأبت فادع اللہ علیھم فقال: اللھم اھد دوسا وأت بھم**" (صحیح بخاری:۴۳۹۲) مفتی مغفور باندوی، مولانا سعید احمد ندوی۔

☆ "**عن أنس بن مالکؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: شفاعتی لأھل الکبائر من أمتی**" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۲۵۳۳) مولانا ارشد ربانی، مولانا محمود کیفی۔

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے حق میں دعا فرمائی ہے، صحیح بخاری میں حضرت مسروق فرماتے ہیں: "**قال عبید اللہ: إن اللہ بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم و قال: قل ماأسألکم علیہ من أجرہ وما أنا من المتکلفین .{فإن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما رأی قریشًا استعصوا علیہ قال: (اللھم أعنی علیھم بسبع کسبع یوسف) .فأخذتھم السنۃ حتی حصلت کل شیء، حتی أکلوا العظام والجلود، فقال أحدھم: حتی أکلوا الجلود والمیتۃ، وجعل یخرج من الأرض کھیئۃ الدخان، فأتاہ أبو سفیان، فقال: أی محمد، إن قومک قد ھلکوا، فادع اللہ أن یکشف عنھم، فدعا، ثم قال: (تعودون بعد ھذا) .فی حدیث منصور: ثم قرأ: "فارتقب یوم تأتی السماء بدخان مبین – إلی – عائدون" أیکشف عذاب الآخرۃ؟ فقد مضی: الدخان، والبطشۃ، واللزام .وقال أحدھم:**

القمر۔ وقال الآخر: الروم'' (صحیح البخاری، باب ثم تولوا عنہ وقالوا معلم مجنون، حدیث نمبر: ۴۸۲۴، ط: المکتبۃ السلفیۃ) مفتی جمیل اختر جلیلی ندوی۔

☆ اسی طرح حضرت انسؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''**اسْتَسْقَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَقَاهُ يَهُودِيٌّ، فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: جَمَّلَكَ اللَّهُ فَمَا رَأَى الشَّيْبَ حَتَّى مَاتَ**'' (عمل الیوم واللیلۃ ر ۱۴۳) مفتی جمیل اختر ندوی۔

☆ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کے لئے دعا فرمائی: ''**اللهم اغفر لقومي فإنهم لايعلمون**'' (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳۴۷۷، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۷۹۲) مفتی اشتیاق احمد قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی صالح زماں قاسمی وغیرہ۔

تقریباً تمام مقالہ نگار نے اس سوال کے جواب سے پہلے دعا کی قبولیت وعدم قبولیت کے اسباب ووجوہ اور اس پر وارد احادیث وآثار اور فقہی عبارات کو درج کیا ہے۔

اسی طرح اہل طاعت واہل معصیت دونوں کے لئے پانی پر دم کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے (مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی مغفور احمد باندوی)

دلائل:

☆ ''**عن أبی سعید قال: انطلق نفر من أصحاب رسول الله ﷺ فی سفرة سافرنا ها حتی نزلوا علی حی من أحیاء العرب فاستضافوهم ،قالوا أن یضیفوهم فلدغ سیدذلک الحی فسعوا له بکل شیء لاینفعه شیء فقال بعضهم لواتیتم هولاء الرهط الذین نزلوا لعله أن یکون عند بعضهم شیء فأتوهم فقالوا یا أیها الرهط إن سیدنا لدغ وسعینا له لکل شیء لاینفعه فهل عند أحدکم من شیء ؟فقال بعضهم: نعم والله إنی لاأقی ولکن والله لقد استضفیناکم فلم یضیفونا فما أنا براقٍ لکم حتی یجعلوا لنا جعلاً فصالحوهم علی قطیع من الغنم فانطلق یتفل علیه ویقرأ ''الحمد لله رب العالمین'' فکأنما نشط من عقال فانطلق یمشی و مابه قطبة قال فاوفوهم جعلهم الذی صالحوهم علیه فقال بعضهم أقسموا فقال الذی رقی لایفعلوا حتی نأتی النبی ﷺ فنذکر له الذی کان، فنظرما یأمرنافقدموا علی رسول الله ﷺ فذکروا له ، فقال: و ما یدریک إنها رقیة ؟ ثم قال: قد أصبتم أقسموا وا ضربوا لی معکم سهماً فضحک رسول الله ﷺ**'' (الصحیح للبخاری کتاب الإجارۃ باب

مایعطی فی الرقیۃ، رقم ۶۷۲۲)۔

اس طویل حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحابیؓ نے ایک کافر پر دم کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر کوئی نکیر نہیں کی تو جب کسی کافر کو دم کرنا جائز ہے تو حرام کاروبار کرنے والے اور مال حرام کمانے والے کو بھی دم کرنا جائز ہے (مفتی محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی مغفور احمد باندوی)۔

☆ جب کافر کے لئے حضورؐ نے دعائیں کی ہیں تو مسلمان کے لئے کیوں نہیں، علامہ نووی الاذکار میں فرماتے ہیں:

"اعلم أنه لایجوز أن یدعی له (أی الذمی) بالمغفرة و ما أشبهها مما لایقال للکفار، لکن یجوز أن یدعی له بالهدایة و صحة البدن و العافیة و شبه ذلک۔ لما روی عن أنس رضی الله عنه قال: استسقی النبی صلی الله علیه وسلم فسقاه یهودی، فقال له النبی صلی الله علیه وسلم جملک الله فمارأی الشیب حتی مات" (الموسوعۃ الفقہیۃ:۲۰ / ۲۶۷)

اسی طرح فتاوی ھندیہ میں ہے:

" الکافر إذا دعا هل یجوز أن یقال یستجاب دعائه؟ ذکر فی فتاوی أهل سمرقند: فیه اختلاف المشائخ: بعضهم قالوا، منهم أبو الحسن الرستغفنی: أنه لایجوز، و بعضهم قالوا، منهم أبوالقاسم الحاکم و أبوالنصر الدبوسی: یجوز، قال الصدر الشهید: هو الصحیح کذا فی المحیط" (الفتاوی الھندیۃ:۵ / ۳۱۹ کتاب الکراھیۃ) مولانا عبدالاحد قاسمی، مفتی صالح زماں قاسمی۔

جبکہ بعض مقالہ نگار کی رائے ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے دعا نہیں کرنی چاہئے اور نہ ان کے یہاں جانا چاہئے (حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا صادق مبارکپوری)۔

☆☆☆

عرض مسئلہ :

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

(سوال نمبر:۱/تا ۴،۱۱)

ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری☆

راقم الحروف کو کل (۶۸) مقالات موصول ہوئے ہیں، مقالہ نگار حضرات کے اسمائے گرامی ان کی آراء کے ساتھ پیش خدمت ہیں:

مولانا ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا حافظ سید فاروق عمری مدنی، مولانا محمد مقصود فرقانی رامپوری، ڈاکٹر مولوی عبدالہادی باقوی، محمد مطیع الرحمٰن قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی، مفتی سعید احمد ندوی، محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، مولانا محمد عفان منصور پوری، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی کامران سعید رشادی، مولانا احمد مکین، مولانا اکرم رشید رحمانی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مفتی محمد صالح الزمان قاسمی، مولانا محمد ضیاء الحق قاسمی، مولانا ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا روح الامین سعادتی، مولانا محمد شاکر نثار اعظمی مدنی، مفتی خلیل احمد، مفتی شکیل منصور پوری، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا محمد زبیر ندوی، مفتی سید محمد علی مدنی، مفتی ابراہیم بن سلیمان فلاحی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مولانا صفوان احمد حلیمی قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مولانا حبیب الرحمٰن ندوی، مولانا عبدالحکیم بن عبدالرحیم، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی نیاز احمد ندوی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، مولانا خواجہ نظام الدین الیوسفی، مفتی ارشاد عالم، مفتی عثمان بستوی، مفتی محمد شباب کوثری، مفتی شفیق الکوثری، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، عبدالحکیم قاسمی پالنپوری، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی محمد شفیق بڑودوی، مولانا عبیداللہ ندوی، قاضی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا قمر الزمان ندوی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا محمد سعد نور قاسمی، مولانا عبدالاحد قاسمی، محمد صادق مبارکپوری، مولانا ارشد ربانی

☆ عمرآباد

مکی، مولانا فیاض احمد محمود برماوے، مفتی محمد برکت علی قاسمی، مفتی عبدالرزاق قاسمی امروہی، مفتی جمیل احمد نذیری، مولوی محمود اختر کیفی، مفتی راشد حسین ندوی، مولانا عمار مزمل قاسمی۔

سوال نمبر:(۱) ایک آدمی فی الحال حلال کاروبار کررہا ہے، لیکن اس کے آباء واجداد حرام کاروبار میں ملوث تھے، اس کو معلوم ہے کہ اس حرام کاروبار کا مال اس کو وراثت میں ملا ہے، مگر اسی سے وہ اب حلال کاروبار کررہا ہے، اور گھر جائداد بھی اسی کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سود کا پیسہ آزادی سے پہلے کا کمایا ہوا ہے، یا آزادی کے بعد تو اس کی کمائی حلال ہے یا حرام؟

مذکورہ سوال نمبر ا کے جواب میں علماء کرام کے تقریبا (۷) آراء ہیں۔

پہلی رائے:

سودی کاروبار/سود کا لینا دینا شرعا حرام ہے، خواہ سود کا پیسہ آزادی سے قبل کمایا ہوا ہو یا آزادی کے بعد، اس لئے اس مال موروث کو مالک کے معلوم ہونے پر واپس لوٹایا جائے، یا ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردیا جائے، اگر اس سے کاروبار بھی کیا گیا ہو تو سود کے مال کے بقدر صدقہ وخیرات کرتا رہے، اگر اس کی قدرت نہ ہو تو توبہ واستغفار میں مشغول رہے۔

دلائل:

اس رائے کے حاملین نے درج ذیل دلائل پیش کیا ہے۔

"**اتق الله حيثما كنت**" (سنن ترمذی:۱۹۸۷)

"**إن الله طيب لايقبل إلا طيبا**" (مسلم:۲۳۹۳)

"**لاربا بين أهل الحرب و أهل الإسلام**" (السلسلۃ الضعیفۃ:۶۵۳، منکر)

نیز حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا روم کے غالب ہونے اور اہل فارس کے مغلوب ہونے کی خبر پر ابی بن خلف کے ساتھ شروط طے کرنا اور اس شرط پر پورا اترنا، اور ضامن سے سو اونٹ حاصل کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ کے حکم سے صدقہ کردینا ثابت ہے (معالم التنزیل:۳/۵۷۴، تفسیر ابن کثیر:۶/۷۸، سندہ حسن)

اس رائے کے حاملین درج ذیل ہیں:

مولانا محمد شاہ جہاں ندوی، مفتی خلیل احمد، مفتی نیاز احمد ندوی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، مولانا خواجہ نظام الدین الیوسفی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی ارشاد عالم، مفتی عثمان بستوی، محمد تبریز حلیمی قاسمی، مفتی کامران سعید رشادی، مفتی محمد شباب

کوثری، مفتی شفیق الکوثری، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی، عبدالحکیم قاسمی پالنپوری، مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا خورشید احمد صاحب مفتاحی، مفتی حبیب اللہ صاحب قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی۔

☆ مولانا سعید احمد ندوی فرماتے ہیں کہ مال موروث اگر مطلقا حرام ہے تو اس کا لینا بھی مطلقا حرام ہے، اگر مشتبہ ہو تو اسے بھی حرام تصور کیا جائے گا، جیسا کہ کتے کے شکار کے تعلق سے حضرت عدی بن حاتم طائی سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تمہارے کتے کے ساتھ دوسرا کتا شریک ہو تو نہ کھاؤ۔ (بخاری: ۱۷۵)

☆ مولانا عبدالاحد قاسمی کی رائے یہ ہے کہ حرام مال وارث کے لئے بھی حرام ہے۔

– مولانا عبید اللہ ندوی، محمد سعد نور قاسمی اور محمد ارشد ربانی مکی احمد نے فرمایا ہے کہ مال موروث کا مالک متعین ہو تو لوٹانا ضروری ہے، ورنہ اس مال کو صدقہ کر دیا جائے اور اگر وہ وارث خود غریب ہو تو بطور صدقہ اپنے لئے رکھ سکتا ہے۔ دلیل۔ **وآتوھم من مال اللہ الذی آتاکم**" (نور: ۳۳)

☆ جب کہ محمد مطیع الرحمٰن قاسمی نے فرمایا کہ مال حرام کو دیانۃ صدقہ کیا جائے، قضاء کے اعتبار سے اس کا استعمال جائز ہے جب کہ مالک معلوم نہ ہو۔

☆ مفتی محمد صالح الزمان قاسمی کی رائے یہ ہے کہ دار الحرب میں بھی سود حرام ہے، اگر وہ شرعا غریب اور مستحق زکاۃ ہو تو استعمال کرے، ورنہ نہیں۔

☆ مولانا ڈاکٹر عبدالہادی باقوی قاسمی کی رائے یہ ہے کہ مال موروث حرام ہے، علم ہو تو لوٹا دے ورنہ خود استعمال کرے۔

☆ جب کہ مولانا عبدالرزاق قاسمی کی رائے یہ ہے کہ مال حرام کی دو قسمیں ہیں، ایک مال وہ ہے جو رضامندی کے ساتھ حاصل ہو، جیسے سود، جوا، دوسرا وہ مال حرام رضامندی کے بغیر حاصل ہو، جیسے چوری، غصب وغیرہ، مالک کا علم ہو تو واپس لوٹا دیا جائے۔

☆ آزادی سے قبل سود جائز تھا اس لئے آزادی کے بعد بھی جائز اور حلال ہے جب تک حرام ہونے کا یقین نہ ہو، البتہ اگر کچھ حصہ پر ظن غالب ہو کہ آزادی کے بعد کا ہے تو اس حصہ کے بقدر صدقہ کرنا لازم ہے، یہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے۔

مولانا عبدالرشید قاسمی، محمد شاکر نثار اعظمی مدنی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، محمد عمار مزمل قاسمی، مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی۔

☆ مولانا محمد قمر الزمان ندوی کی رائے یہ ہے کہ حرمت وحلت جمع ہوں تو حرمت کا پہلو غالب سمجھا جائے گا۔ نیز محمد زبیر

ندوی نے فرمایا ہے کہ اگر حلت وحرمت مل جائے تو عوض ادا کر دیا جائے، مالک متعین ہو تو مال حرام واپس کیا جائے ورنہ نہیں۔

☆ مولانا محمود اختر کیفی کی رائے یہ ہے کہ صاحب مال کا علم نہ ہو اور مال حرام کی تعیین ہو تو صدقہ کیا جائے، اگر مالک معلوم ہو تو واپس کیا جائے اگر مالک معلوم نہ ہو اور حرام متعین نہ ہو تو اس کا استعمال جائز ہے، یہی رائے راشد حسین ندوی کی بھی ہے۔

دوسری رائے:

اختر امام عادل قاسمی اور مفتی شکیل منصور قاسمی نے فرمایا: احتیاط اور تقوی کا تقاضا یہ ہے کہ مال حرام استعمال نہ کیا جائے، ورنہ فتوی کے لحاظ سے اس مال کا استعمال جائز ہے۔

دلائل:

مذکورہ رائے کے حاملین نے درج ذیل دلائل پیش کیا ہے:

"**عن ابن مسعودؓ قال ائته و أجبه فانما وزره عليه**" (السنن الکبری للبیہقی:۵/۳۳۸)۔

"**قاعده فقهيه: الأصل فى المعاملة الإباحة**" (بلوغ الارب بتقریب کتاب الشعب)۔

ائمہ کرام اور اسلاف کا طریقہ یہی تھا کہ وہ مال حرام سے دور بھاگتے تھے، جب کہ مولانا حافظ سید فاروق صاحب عمری مدنی کی رائے میں زہد اور ورع کا تقاضا یہ ہے کہ پورا مال غرباء میں تقسیم کیا جائے، یا کم سے کم اتنا مال صدقہ کیا جائے جس قدر اطمنان ہو جیسا کہ اسلاف کرام کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، یہی رائے تقریبا مفتی ابوبکر قاسمی کی ہے، یعنی صدقہ کر دیا جائے، یا رفاہی کاموں میں خرچ کیا جائے، یا غرباء میں تقسیم کیا جائے۔

تیسری رائے:

مفتی محمد شفیق صاحب، مولانا روح الامین سعادتی کی رائے یہ ہے کہ اگر ورثاء کو یقینی طور پر علم نہ ہو کہ مورث کے مال میں حرام مال شامل تھا تو کل مال ورثاء کے لئے حلال ہوگا، اور مورث پر گناہ لازم ہوگا، دلیل کے طور پر شامی کی عبارت نقل کی گئی ہے۔

"**الحرمة تنتقل مع العلم إلا للوارث الا إذا علم به**" (الشامی:۹/۵۵۲)۔

☆ نیز مولانا روح الامین صاحب نے فرمایا: اگر مال حرام مخلوط ہو تو بقدر حلال مال کا مالک ہوگا اور بقدر حرام لوٹانا

ہوگا، اگر وہ ضرورتمند ہو تو بطور قرض کچھ مال اٹھالے پھر اس کے بعد اتنی رقم صدقہ کردے۔

☆مفتی ضیاء الحق قاسمی، مفتی محمد عفان منصور پوری کی رائے یہ ہے کہ اگر مال حرام متعین نہ ہو، مقدار بھی معلوم نہ ہو اور مخلوط ہو، تو وارث کے لئے حلال ہے قضاء جب کہ دیانۃ صدقہ کردیا جائے، نیز مولانا صفوان احمد حلیمی قاسمی نے لکھا ہے کہ مال حرام کی مقدار قطعا معلوم نہ ہو تو اندازہ لگا کر مال حرام صدقہ کردیا جائے، مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کی رائے یہ ہے کہ کمائی حلال ہے، بشرطیکہ سابقہ رکارڈ سے پتہ نہ چلے۔

چوتھی رائے:

مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، مفتی نثار احمد گودھرا، مولانا صفوان احمد قاسمی، کی رائے یہ ہے کہ مال حرام سے تجارت کرنے والے کو چاہئے کہ ظن غالب کے طور پر حرام مال کی مقدار طئے کر کے صدقہ کردے، اگر اللہ نے دوسرے حلال ذرائع میسر فرمائے ہوں تو حرام مال کلی طور پر صدقہ کردے۔

پانچویں رائے:

مفتی محمد مقصود صاحب، اکرم رشید رحمانی، مفتی اقبال صاحب اور مفتی سید محمد علی مدنی کی رائے یہ ہے کہ مال موروث اگر حرام ہے تو اس کا مسؤل مورث ہے، وارث کے لئے وہ مال حلال ہے، پھر بھی اس مال کو اندازہ لگا کر صدقہ کرنا بہتر ہے، تاکہ مورث قیامت کے دن بری الذمہ ہوجائے، اگر وارث غریب ہو تو خود کھا سکتا ہے، البتہ مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی کی رائے یہ ہے کہ مال حرام جو مال موروث ہے اسے حرام قرار دینا ہی زیادہ قوی ہے، اگر وارث اشد ضرورتمند ہو تو اسے استعمال کرنا جائز ہے۔

☆یہی رائے مفتی محمد ابراہیم صاحب، مفتی محمد مدثر صاحب قاسمی، مولانا مفتی اشتیاق اعظمی عمری مدنی، محمد جمیل اختر جلیلی ندوی کی ہے۔

دلیل: ''ولا تزر وازرة وزر أخرى'' (سورۃ الانعام:۱۶۴)

'' لها صدقة ولنا هدية'' (البخاری)

چھٹی رائے:

آزادی سے قبل کی کمائی خواہ وہ سود ہی کیوں نہ ہو حلال ہے، اگر کچھ حصہ پر ظن غالب ہو کہ یہ آزادی کے بعد کا ہے اس مال کا صدقہ کرنا لازم ہے، محمد صادق مبارکپوری، مفتی جمیل احمد نذیری۔

☆مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی کی رائے یہ ہے کہ آزادی سے قبل یا بعد کا صحیح علم نہ ہو تو اس کی کمائی حلال ہے۔

ساتویں رائے:

مفتی فیاض احمد محمود کی رائے یہ ہے کہ سرمایہ اور منافع میں فرق کیا جائے، دلیل شیخ ابن بازؒ کا فتوی پیش کیا ہے، یعنی اصل سرمایہ حرام ہو اور کاروبار حلال کا ہو تو صرف منفعت حلال ہے (فتاوی ابن باز، التہذیب: ۴/ ۳۹۲، الحاوی الکبیر: ۸/ ۳۴)۔

☆جب کہ قاضی وصی احمد قاسمی کی رائے یہ ہے کہ اگر حرمت کا پہلو غالب ہو تو مجبوراً استعمال کرے۔

عارض کی رائے:

فتوی اور تقوی میں فرق کیا جائے گا، فتوی کے لحاظ سے مال حرام وارث کے لئے جائز ہے، مگر تقوی کے لحاظ سے اجتناب اولی ہے، یہی رائے مفتی محمد برکت علی قاسمی کی ہے۔

وجہ ترجیح:

مال حرام کی شناعت وخباثت شرعاً وعرفاً معروف ہے، عبادات کی قبولیت کا دارومدار مال حلال پر ہے، اکل مال حلال عبادت ہے، بڑی سے بڑی عبادات خواہ حج بھی کیوں نہ ہو مال حرام کی وجہ سے منہ پر ماردی جاتی ہے۔

"ذهب الجمهورمن الحنفية و المالكية و الشافعية و الحنابلة و هو اختيار شيخ الإسلام ابن تيمية إلى أن الموت لايطيب المال الحرام بل الواجب فيه الرد على مالكه إن كان معروفا فإن لم يكن معروفا تصدق به على الفقراء والمساكين" (حاشیۃ ابن عابدین: ۵/ ۱۰۴، المجموع: ۹/ ۴۲۸، الانصاف: ۸/ ۳۲۸، الفتاوی الکبری: ۱/ ۴۷۸)۔

"قال ابن رشد الجد: و أما الميراث فلا يطيب المال الحرام ، هذا هو الصحيح الذى يوجبه النظر، وقد روى عن بعض من تقدم أن الميراث يطيبه للوارث، وليس ذلك بصحيح" (المقدمات الممہدات: ۲م ۶۱۷)۔

وقد سئل يحى بن ابراهيم المالكى عن المال الحرام: هل يحله الميراث أم لا؟ فأجاب: لايحل المال الحرام فى قول مالك، انتهى" (المعیار المعرب: ۶/ ۴۷)۔

''قال النوويؒ: من ورث مالا ولم يعلم من أين كسبه مورثه، أمن حلال أم من حرام؟ ولم تكن علامة، فهو حلال باجماع العلماء، فان علم أن فيه حراما وشك فى قدره أخرج قدر الحرام بالاجتهاد، انتهى" (المجموع ۹/ ۴۲۸)۔

امام نوویؒ نے فرمایا: اگر وارث کو یہ نہ معلوم ہو کہ مال میراث مورث نے کہاں سے کمایا ہے، حرام راستہ سے یا

حلال راہ سے؟ کیا یہ مال وارث کے حق میں حلال ہوگا؟ اس سلسلہ میں کوئی خاص قرینہ یا علامت بھی نہیں ہے، جواب میں فرمایا: پس یہ مال علماء کے اجماع کے مطابق حلال ہے، ہاں اگر وارث کو معلوم ہوجائے کہ اس مال میں حرام بھی شامل ہے، اور شک ہو اس مال حرام کی مقدار کے متعلق تو اپنے اجتہاد سے حرام مال کا اندازہ لگائے اور اسے خارج کردے۔

شیخ ابن عثیمینؒ نے سودی مال کے تعلق سے فرمایا: سود کی کمائی کرنے والے کی اولاد کے حق میں اس کا مال اس کی زندگی میں کھانے اور اس کی دعوت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے یہود کی دعوت کو قبول کیا تھا، حالانکہ وہ یہودی سودخور تھے۔

"**وقال الشيخ ابن عثيمينؒ: و أما ماكان محرما لكسبه ، فانما اثمه على الكاسب لا على من أخذه بطريق مباح من الكاسب بخلاف ماكان محرما لعينه كالخمر والمغصوب و نحوهما، وهذا القول وجيه قوى، بدليل ان الرسول ﷺ اشترى من يهودى طعاما لأهله، واكل من الشا ة التى أهدتها اليهودية بخيبر، وأجاب دعوة اليهودى، ومن المعلوم أن اليهود معظمهم يأخذون الربا ويأكلون السحت و ربما يقوى هذا القول قوله ﷺ فى اللحم الذى تصدق به على بريرة: (هو لها صدقة ولنا منها هدية)**" (القول المفید علی کتاب التوحید: ۳/ ۱۱۲)۔

آپؒ نے یہ فرمایا: جو مال کسب کے لحاظ سے حرام ہو وہ مال کمائی کرنے والے پر حرام ہے نہ کہ اسے قبول کرنے والے پر جسے اس نے مباح صورت میں پایا تھا، لیکن جو مال بعینہ حرام ہو جیسے سور یا غصب شدہ مال وغیرہ یہ تو حرام ہے اس کے حرام ہونے میں کوئی دورائے نہیں ہے۔ یہ قول مناسب قول ہے، جیسا کہ آثار سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے یہودی سے گھر والوں کی خاطر غلہ خریدا تھا، ان کے تحفہ کو (گوشت) قبول کیا تھا، یہود کی دعوت کو بھی قبول فرمایا تھا، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ اکثر یہودیوں کی تجارت اور لین دین سودخوری اور حرام پر مشتمل تھی، نیز حضرت بریرہؓ کے ہدیہ اور تحفہ کے بارے میں فرمایا تھا۔ وہ تو ان کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے تحفہ ہے۔

سوال نمبر: (۲) ایک غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائداد اور مال، حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اسی حرام جائداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، اب جو کچھ اس کے پاس موجود ہے اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں علماء کرام کے تین آراء ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی رائے:

مذکورہ مال اس غریب کے لئے اضطراری صورت میں حلال ہے، چونکہ وسائل وذرائع، بیت المال وغیرہ کا تعاون میسر

نہیں ہے، دوسری طرف غربت ومجبوری کا بھی مسئلہ ہے، لہٰذا اس غریب شخص کو چاہئے کہ وہ بقدر ضرورت اس مال کو لینے کے بعد باقی مال صدقہ کردے، نیز توبہ واستغفار کا اہتمام کرے، البتہ صاحب حیثیت ہونے کے بعد اس قدر مال کا صدقہ کرنا مستحب ہے۔

اس رائے کے حاملین مندرجہ ذیل ہیں۔ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی، محمد صابر حسین ندوی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، محمد آزاد بیگ قاسمی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد شفیق، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مولانا احمد مکین، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، محمد مغفور باندوی، عبد الحکیم بن مولانا عبد الرحیم قاسمی، مولانا روح الامین سعادتی، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، مفتی نثار احمد قاسمی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مفتی محمد ابراہیم فلاحی، صفوان احمد حلیمی قاسمی، مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی۔

☆ جب کہ مفتی ارشاد عالم، مفتی ابوبکر قاسمی اور محمد جلیل اختر جلیل ندوی نے فرمایا کہ: ملکیت کے بدلنے سے مال کی حیثیت بدل جاتی ہے، یہ مال غریب کے لئے حلال ہے، اور کرایہ بھی حلال ہے، مستقبل میں مستطیع ہونے پر اس قدر مال صدقہ کردے۔

☆ مولانا محمد مطیع الرحمٰن قاسمی نے حرام کمائی سے حاصل شدہ جائداد اور مال کے بارے میں نے علامہ شامی کے وہ پانچ اقوال نقل کئے، بطور خلاصہ یہ فرمایا: کہ مالک معلوم ہو تو مال واپس کردے، ورنہ صدقہ کردے۔

☆ مفتی سید محمد علی مدنی اور محمد صادق مبارکپوری کی رائے یہ ہے کہ حرام مال سے حاصل شدہ نفع کراہت کے ساتھ حلال ہے، کرایہ بھی جائز ہے۔

دلائل:

"**فمن اضطر غير باغ ولاعاد فلا إثم عليه**" (البقرۃ)۔

"**كاد الفقر أن يكون كفرا**" (جامع الاحادیث للسیوطی)۔

"**من ورث مالا و لم يعلم من أين اكتسبه مورثه أمن الحلال أم من الحرام و لم تكن علامة فهو حلال بإجماع العلماء**" (المجموع شرح مہذب: ۹/۴۲۸)۔

غرباء اور ونادار حضرات اس رقم کے مستحق ہیں (کتاب الفتاوی: مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی: ۵/۳۲۲)۔

دوسری رائے:

اگر اس مال حرام کا مالک موجود ہو تو واپس کرے، اگر مالک یا اس کے ورثاء موجود نہ ہوں تو اس غریب کے لئے حلال مال ملنے تک بقدر ضرورت استفادہ کی گنجائش ہے، اگر وہ جائداد مغصوب ہے یا مال حرام بعینہ ہے تو اس کا صدقہ کردینا ضروری

ہے، گروہ غنی ہوتو بطور قرض استعمال کرے، لیکن دیانۃ مستحقین کی طرف لوٹانا ضروری ہے، البتہ اس مال کا کرایہ حلال ہے۔

اس رائے کے حاملین:

مفتی محمد اشرف قاسمی، راشد حسین ندوی، عمار مزمل قاسمی، اکرم رشید رحمانی، عبدالرزاق امروہی، عبدالہادی باقوی، مولانا ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی، محمد عثمان قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا سعید احمد ندوی، عبید اللہ ندوی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا ابومحمد سعد نور قاسمی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مولانا حبیب الرحمٰن ندوی، مولانا محمد عفان منصور پوری۔

☆ مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی نے مزید یہ لکھا ہے کہ: مال حرام کا اصل مالک لاپتہ ہوتو فقیر اپنے اور اہل وعیال پر خرچ کرے، بطور دلیل یہ آیت نقل کیا ہے، **فمن اضطر غیر باغ ولاعاد فلا اثم علیه** ، اور یہ فتوی نقل کیا ہے: ''**ذهب جمهور الفقهاء إلى أنه يجوز للمسلم إذا كان عنده مال حرام أن ينفق هذا المال على نفسه وعياله إذا كان فقيرا محتاجا إليه ولم يعرف له مالكاً يرده إليه**'' (ملخص المال الحرام ص۸۹)۔

اور ہدایۃ سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں، نیز بطور دلیل مالی معاملات ۲/ ۵۴۳، مال خبیث کی صورتیں اور احکام اور فقہ البیوع از مفتی تقی عثمانی کی عبارتوں کو پیش کیا ہے۔

☆ مولانا سید فاروق عمری مدنی کی رائے یہ ہے کہ: مذکورہ شخص غریب کہاں ہے؟ جب کہ وہ جائداد کا مالک ہے، کرایہ مل رہا ہے، لہذا اس شخص کو چاہئے کہ پورا مال غرباء میں بلا نیت ثواب تقسیم کردے، تقسیم کے بعد وہ اگر فقیر ہوتو دیگر غرباء کی طرح اپنا حق حاصل کرلے، مال کا مالک اگر معلوم اور متعین ہوتو واپس کیا جائے ورنہ فقراء میں تصدق واجب ہے، اگر خود مستحق ہوتو بقدر ضرورت استعمال کرے، اگر ترکہ مخلوط مال ہو اور مالک بھی معلوم نہ ہوتو استفادہ کی اجازت ہے۔

دلائل: بطور دلیل فقہاء کی عبارتیں نقل کی ہیں۔

''**الملک الخبیث سبیله التصدق و لوصرفه فی حاجة نفسه جاز ثم إن كان غنيا تصدق بمثله و إن كان فقيرا لايتصدق**'' (الاختیار لتعلیل المختار: ۳/ ۶۱)۔

☆۔ مفتی محمد الیاس قاسمی، جب کہ مفتی محمد صالح الزمان قاسمی ازہری نے اسے لقطہ سے مشابہ قرار دیا ہے۔

☆ مولانا مفتی امانت علی قاسمی کی رائے یہ ہے کہ: مال حرام کی تعیین نہ ہوتو اندازہ سے صدقہ کرتا رہے، مال حرام متعین ہوتو مال حرام واپس کرے یا صدقہ کرے۔

تیسری رائے:

حرام کمائی کا قطعی علم ہوتو وہ مال حرام ہے، اس کا مال صدقہ کرنا واجب ہے، کرایہ بھی شرعاً حرام ہے، اس رائے کے حاملین درج ذیل ہیں:

مفتی رحمت اللہ ندوی، محمد قمر الزمان ندوی، مفتی ریاض ارمان قاسمی، مفتی برکت علی قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، مفتی محمد شباب کوثری، مفتی شکیل منصور القاسمی، مفتی شکیل کوثری، خواجہ نظام الدین الیوسفی، محمد شاکر نثار مدنی اعظمی۔

☆ محمد تبریز عالم قاسمی نے فرمایا کہ حرام مال بطور قرض رکھے، حرام مال حساب کرکے صدقہ کرتا رہے، بعد میں اس سے انتفاع جائز ہوگا۔

☆ جب کہ محمد زبیر ندوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ: مال حرام کی دو صورتیں ہوں گی، اگر مال بعینہ حرام نہ ہوتو کرایہ درست ہے، اگر بعینہ حرام ہوتو صدقہ واجب ہے۔

☆ عبد الرشید قاسمی، مفتی فیاض احمد برمارے کی رائے یہ ہے کہ: مالک موجود نہ ہوتو سارا مالِ حرام حرام ہے، اضطرار کی صورت میں فقر وفاقہ سے بچے، بقیہ مال صدقہ کردے، البتہ کرایہ وغیرہ آہستہ آہستہ سارا ہی صدقہ کردے، تاکہ حرام سے بچ جائے۔

دلائل:

"**إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما.....**" (النساء:۱۰)۔

"**إذا خاف الرجل الفقير ذو المال الحرام من أن يصير فقيرا.....**" (امداد الفتاوی)۔

"**رد المال الحرام إلى صاحبه ان علمه و إن لم يعلم فالتصدق ثم يجوز أن ينتفع بالأجرة**" (فتاوی دار العلوم دیوبند)۔

"**الحرمة تتعدى مع العلم بها**" (الاشباہ والنظائر ص ۲۳۵)۔

"**المال الحرام كالمأخوذ غصبا أوسرقة أو رشوة أو نحو ذلک ليس مملوكا لمن هو بيده**" (الموسوعۃ الفقہیۃ: ص ۲۳)۔

"**لايجوز لأحد أن يتصرف فى ملک الغير بلا إذنه**" (مجلۃ الاحکام العدلیۃ)۔

عارض کی رائے:

اگر اس مال حرام کا مالک موجود ہوتو واپس کرے، اگر مالک یا اس کے ورثاء موجود نہ ہوں تو اس غریب کے لئے

حلال مال ملنے تک بقدر ضرورت استفادہ کی گنجائش ہے، اگر وہ جائداد مغصوب ہے، مال حرام بعینہ موجود ہو تو اس کا صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

وجہ ترجیح: "إن الذين يأكلون أموال اليتامى ظلما....." (النساء:۱۰) ۔

"إن اللّٰه طيب لايقبل إلا طيبا" (صحیح الترمذی:۲۹۸۹)۔

"وقوله ﷺ اتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينه وبين الله حجاب" (بخاری:۲۴۴۸)۔

"إذا خاف الرجل الفقير ذو المال الحرام من أن يصير فقيرا" (امدادالفتاوی)۔

"رد المال الحرام إلى صاحبه إن علمه و إن لم يعلم فالتصدق ثم يجوز أن ينتفع بالأجرة" (فتاوی دیوبند)۔

"الحرمة تتعدى مع العلم بها" (الاشباہ والنظائر ص ۲۳۵)۔

'المال الحرام كالمأخوذ غصبا أوسرقة أو رشوة أو نحو ذلک ليس مملوكا لمن هو بيده" (الموسوعۃ الفقہیۃ: ص ۲۳)۔

"لايجوز لأحد أن يتصرف فی ملک الغير بلا إذنه" (مجلۃ الاحکام العدلیۃ)۔

سوال نمبر:(۳) شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کر رہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے، اور اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا دوسرا راستہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اس عورت کو کیا کرنا چاہئے؟

اس سوال کے جواب میں علماء کرام کے تین آراء قابل ذکر ہیں:

پہلی رائے:

اگر خاتون کے لئے کمائی کا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے، تو تذکیر و نصیحت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ ادا کرنے کے بعد شوہر یا بیٹے کی کمائی پر بقدر ضرورت اس مال سے گذر بسر کر سکتی ہے، مگر اس حرام کمائی کا گناہ شوہر یا بیٹے پر ہے، عورت کے لئے یہ کمائی بدرجہ مجبوری حلال ہے اور وہ توبہ و استغفار کا اہتمام کثرت سے کرتی رہے۔

دلائل:

بیوی بچوں کا نفقہ شوہر پر واجب ہے۔

"وعلى المولود له رزقهن و كسوتهن بالمعروف" (البقرة:۲۳۳)۔

"فمن اضطر غير باغ و لاعاد فلا إثم عليه" (البقرة:۱۷۳)۔

قاعده فقهية: "الضرورات تبيح المحظورات"۔

"إذا اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله و لبسها و الإثم على الزوج" (درمختار:۶/۱۹۱)۔

"قال الشيخ ابن عثيمينؒ: و أما الخبيث لكسبه فمثل المأخوذ عن طريق الغش، أو عن طريق الربا أو عن طرق الكذب و ما أشبه ذلك وهذا محرم على مكتسبه وليس محرما على غيره إذا اكتسبه منه بطريق مباح..." (تفسیر سورۃ البقرۃ:۱/۱۹۸)۔

یعنی شیخ ابن عثیمینؒ نے فرمایا ہے: مال حرام جو کسب/کمائی کی حرام صورتوں میں سے آئے مثلاً دھوکہ دہی، سودی لین دین، جھوٹ وغیرہ یہ سارے راستے حرام راستے ہیں، یہ کمائی کرنے والے پر حرام ہے، البتہ دوسرے لوگ جو اس مال کو مباح طریقہ سے حاصل کریں جیسے میراث، ہبہ یا تحفہ وغیرہ ان کے لئے اس کا قبول کرنا جائز ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھا تھا، حالانکہ وہ سود خور تھے، لوگوں کا مال حرام طریقہ سے ہڑپ کرتے تھے، سود خوری عام تھی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مال حرام کا گناہ کمائی کرنے والے پر ہے نہ کہ حاصل کرنے والے پر۔

اس رائے کے حاملین:

ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا اختر امام عادل، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی، ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا حافظ سید فاروق عمری مدنی، مولانا محمد مقصود فرقانی رامپوری، د.عبدالہادی باقوی، محمد عثمان قاسمی، محمد مطیع الرحمٰن قاسمی، عبدالرشید قاسمی، سعید احمد ندوی، محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، محمد عفان منصور پوری، قاضی وسیع احمد قاسمی، مفتی کامران سعید رشادی، احمد مکین، اکرم رشید رحمانی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، مفتی محمد صالح الزمان قاسمی، محمد ضیاء الحق قاسمی، مولانا ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا محمد مغفور باندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا روح الامین سعادتی، محمد شاکر نثار اعظمی مدنی، مفتی خلیل احمد، مفتی شکیل منصور پوری، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی نیاز احمد ندوی، مولانا خورشید احمد مفتاحی،، محمد زبیر ندوی، مفتی سید محمد علی مدنی، مفتی ابراہیم بن سلیمان فلاحی، مفتی محمد مدثر قاسمی، صفوان احمد حلیمی قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، خان حبیب اللہ ندوی، مولانا عبدالحکیم بن عبدالرحیم، مفتی نثار احمد گودھروی۔

☆مفتی فیاض احمد محمود: اگر شوہر کی کمائی مکمل حرام ہو تو بیوی کے لئے یہ مال جائز نہیں ہے، عورت کو چاہیے کہ حلال

کمائی کا مطالبہ کرتے رہے، یا دارالقضاء کی طرف رجوع کرے، اگر ایسا نہ ہو سکے تو بقدر ضرورت استعمال کرے۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی کی مزید یہ رائے ہے کہ بالغ بچے کمائی کریں۔

☆ مفتی محمد برکت علی قاسمی: اگر مال بعینہ حرام ہو تو خاتون نہ کھائے ورنہ حرام کمائی ہو تو کھا سکتی ہے۔

☆۔ مفتی جمیل احمد نذیری نے فرمایا: خاتون کے لئے اگر دوسری کمائی میسر نہ ہو تو اس نیت سے حاصل کرے کہ استطاعت پر اتنا مال صدقہ کرے گی۔

☆۔ محمد شباب کوثری اور مفتی شکیل کوثری کی رائے یہ ہے کہ۔ زوجین دونوں کے دونوں گناہ میں شریک ہوں گے جب کہ خاتون شوہر کو حرام سے منع نہ کرے، اگر اس نے منع کیا تھا تو اس کے لئے شوہر کی حرام کی کمائی سے استفادہ کی گنجائش ہے۔

☆ محمد عمار مزمل قاسمی نے فرمایا کہ اگر خاتون کے لئے دوسرا کوئی حلال ذریعہ نہ ہو تو اضطراری حالت میں کسی سے قرض لے کر حرام آمدنی سے قرض ادا کرے تو حرام مال اس حیلہ کی وجہ سے حلال ہو جائے گا۔

سوال: یا حرام کمائی سے اپنے بچے کو خوب پڑھایا، لکھایا، اعلی تعلیم دی، اب پڑھنے کے بعد بچہ کمائی کر رہا ہے، اس کمائی کا کیا حکم ہے؟

جواب:

بچہ کی کمائی حلال ہے، گناہ باپ کے ذمہ ہے۔ کمائی کا مسؤل اور بچہ کی تعلیم کی ذمہ داری باپ پر ہے، البتہ بچہ پر کمائی کے بعد مال حلال سے بقدر حرام تلافی کی نیت سے صدقہ کرتے رہے تا کہ باپ/سرپرست سے گناہ ساقط ہو جائے۔

اس رائے کے حاملین:

ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی، عبدالرشید قاسمی، مولانا مفتی ارشاد عالم قاسمی، مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی، محمد عثمان قاسمی، محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا عبدالحکیم بن عبدالرحیم، محمد ارشد ربانی مکی، مفتی محمد برکت علی قاسمی، مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی، محمد عمار مزمل قاسمی، محمد عفان منصور پوری، مفتی کامران سعید رشادی، محمد ممتاز خان ندوی، مفتی محمد الیاس قاسمی، مفتی سلیم الدین قاسمی، صفوان احمد حلیمی قاسمی، راشد حسین ندوی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، محمد مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی شکیل منصور پوری، محمد آزاد بیگ قاسمی، د/عبدالہادی باقوی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، عبدالاحد قاسمی، خوجہ نظام الدین یوسفی، اکرم رشید رحمانی، ابو محمد محمد سعد نور قاسمی، محمد جمیل اختر جلیلی ندیری، قاضی وسیع احمد قاسمی، مفتی محمد صالح الزمان قاسمی، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، احمد مکین، مفتی خلیل احمد، مولانا محمد مقصود فرقانی رامپوری، مولانا

رحمت اللہ ندوی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی محمد مدثر قاسمی اور مفتی ابراہیم بن سلیمان فلاحی۔

☆محمد شاکر نثار اعظمی مدنی کی رائے یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے دوران معلوم ہو کہ حرام کمائی سے میری تعلیم کا انتظام ہو رہا ہے تو وہ اسی دوران تعلیم سے انکار کر دے۔

☆محمد شباب کوثری، مفتی شکیل کوثری کی رائے یہ کہ: وہ بچہ قدر مستطاع واپس کرے یا صدقہ وخیرات کرتے رہے۔

☆مولانا عبید اللہ ندوی کی رائے یہ ہے : کہ اس بچہ کی کمائی اس وقت حلال ہوگی جب کہ اس کی ملازمت جائز کام کی ہو۔

☆مفتی نیاز احمد ندوی نے بچہ کی کمائی بہ کراہت درست قرار دیا ہے۔

☆محمد اختر کیفی، خوجہ نظام الدین یوسفی، راشد حسین ندوی، مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی، محمد صادق مبارکپوری، مولانا رحمت اللہ ندوی، محمد زبیر ندوی، مفتی سید محمد علی مدنی، محمد ارشد ربانی مکی کی رائے درج ذیل ہے۔

بیوی اگر کوئی دوسرا مال انتظام نہ کر سکے، کوئی حلال ذریعہ نہ ہو یا خود کفیل بننے کی صلاحیت نہ ہو تو مجبوری میں جائز ہے بشرطیکہ وہ مال بعینہ حرام نہ ہو، اس خاتون کو چاہیے کہ وہ مسلسل کسب حلال کی نصیحت کرتی رہے۔

دوسری رائے:

محمد اختر کیفی کی رائے یہ ہے کہ بلوغت سے قبل کا خرچ باپ کی ذمہ داری ہے، لہٰذا بلوغت سے قبل کے اخراجات کے سلسلہ میں باپ مسؤل ہوگا، البتہ بعد بلوغت جو کچھ حرام مال خرچ کیا گیا اس قدر صدقہ کرنا لازم ہے۔

☆مفتی جمیل احمد نذیری :حرام کا مالک معلوم ہو تو اس تک مال لوٹائے یا اس قدر صدقہ کرے۔

☆محمد جمیل اختر جلیلی نذیری کی رائے یہ ہے کہ خاتون کے پاس بقدر کفاف مال ہو یا بسہولت حصول مال حلال ممکن ہو تو شوہر یا بیٹے کی کمائی اس کے لئے درست نہیں، اگر دونوں صورتیں ممکن نہ ہو تو بہ کراہت شوہر کی حرام کمائی اس خاتون کے لئے جائز ہے۔

تیسری رائے:

خاتون کے لئے وہ مال اس وقت حلال ہے جب کہ بعینہ حرام نہ ہو، یا وہ عورت اگر مالدار ہو تو اس کے لئے بھی جائز نہیں۔محمد ابوبکر قاسمی، مولانا مفتی ارشاد عالم قاسمی،، بحوالہ فتاوی محمودیہ، محمد ممتاز خان ندوی نے فرمایا کہ عورت کو حرام سے بچنا

لازم ہے، خواہ اسے دوسروں کے گھر کام کرنے کی نوبت آئے، آخری صورت یہ ہے کہ وہ حرام کو حرام سمجھ کر کھائے اور توبہ استغفار کرتے رہے۔

دلائل:

"**الا من أكره وقلبه مطمئن بالايمان**" (النحل:۱۰۶)۔

"**الأقل تبع للأكثر و للأكثر حكم الكل**" (المبسوط للسرخسی:۳/۳۹)۔

☆مفتی راسخ الاسلام قاسمی اور مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی کی رائے یہ ہے کہ: خالص حرام کمائی ہو تو اس خاتون اور دیگر لوگوں کے حق میں حرام ہے، اس عورت پر روکنا اور حرام سے چھڑانا ضروری ہے، یا وہ خاتون کوئی ہنر سیکھے، آخری صورت مجبوری میں اس عورت کے لئے جائز ہے۔

☆جب کہ ابو محمد محمد سعد نور قاسمی اور عبد الاحد قاسمی کی رائے یہ ہے کہ عورت پر انکار منکر لازم ہے، نصیحت کرتی رہے، دعا اور استغفار کا اہتمام کرے، خود حلال روزی تلاش کرے، ورنہ بحالت مجبوری جائز ہے۔

بچہ کی کمائی کا حکم:

بچہ جب مستقبل میں خود کفیل ہو جائے تو اس کی کمائی حلال ہوگی، البتہ تقوی کے اعتبار سے اس عورت اور بچہ کو چاہئے کہ توبہ واستغفار کی کثرت کے ساتھ مال حلال سے خوب صدقہ وخیرات کرے، تا کہ اللہ کا غضب ٹھنڈا ہو، اور انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے، یہاں تک کہ اسے یقین ہو جائے کہ مال حرام کی تلافی ہوگئی، توبہ نصوح کا اہتمام بھی برابر جاری وساری ہو، "**إلا من تاب و آمن وعمل عملا صالحا فأولئک يبدل الله سيئاتهم حسنات**" (الفرقان:۷۰)۔

عارض کی رائے اور وجہ ترجیح:

اولاد اور بیوی کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اگر باپ یا سرپرست روکنے کے باوجود حرام مال کی کمائی سے نہ رکے تو روکنے والے کی ذمہ داری ادا ہوگئی، وہ عند اللہ بری ہوں گے، البتہ حرام کمائی کرنے والا ہی عند اللہ مسؤل ہوگا، اس غریب خاتون نے اپنے فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ادا کر دیا، آخری شکل اس خاتون کو حرام مال کے تعلق سے اپنے دل میں کراہت محسوس کرنی چاہئے، ساتھ ہی ساتھ بقدر ضرورت اس مال کو استعمال کرنے کی اجازت بھی ہوگی، اس مال حرام کو اتنا ہی لے جتنا اس کی ضرورت ہو، یہ بھی تقوی کا تقاضا ہے کہ حرام مال سے تعیش پسندی ہرگز نہ آنے پائے، نیز اس کے بچہ کی تعلیم

وتربیت پر حرام مال بقدر ضرورت استعمال کرے۔

دلیل:

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:''أن الاسلام یهدم ما کان قبله و أن الهجرة تهدم ما کان قبلها، و أن الحج یهدم ما کان قبله'' (مسلم ۱۲۱)،ارشادنبوی ﷺ ہے:''أن الاسلام یهدم ما کان قبله و التوبة تجب ما کان قبلها'' (مجموع فتاوی ابن باز:۱/ ۱۶۲)،واللہ اعلم بالصواب۔

سوال نمبر:(۴)اکثر بستی والے شادی بیاہ اپنی بستی کے اندر ہی کرتے ہیں،،اور زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے شادی وغیرہ میں جب دعوت دیتے ہیں،تو ہم کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے، یا آدھا حصہ حرام اور آدھا حصہ حلال ہے،تو اس وقت اس کی دعوت میں کھانے کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں علماء کرام کے کل (۵) آراء قابل ذکر ہیں:

پہلی رائے:

صورت مسؤلہ میں نصف مال حلال اور نصف مال حرام کا ہو تو شرکت کا جواز تو ہے،لیکن ایسی دعوتوں سے بچا جائے، یہی اولی واحسن ہے،اگر پورا مال حرام ہے یا مال مغصوب ہو تو تو دعوت قبول نہ کی جائے۔

اس رائے کے حاملین:مولانا ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی،مفتی ارشاد عالم قاسمی،مولانا احمد مکین،مفتی راسخ الاسلام قاسمی۔

''عن سلمان فارسی قال: إذا کان لک صدیق عامل أو جار عامل أوذو قرابة عامل فأهدی لک هدیة أو دعاک إلی طعام قابله فإن مهنأ ه لک و إثمه علیه'' (مصنف عبدالرزاق:۸/ ۱۱۷)۔

☆مفتی محمد جمیل اختر جلیلی ندوی کی رائے یہ ہے کہ ولیمہ کی دعوت قبول کرنا مشروع ہے،اگر داعی کی دعوت پوری یا غالب حرام ہو تو یہ دعوت ناجائز ہے،اور یہ دلیل پیش کی ہے۔

''فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین'' (الانعام۔۶۸)۔

''نهی رسول الله عن مطعمین عن الجلوس علی مائدة یشرب علیها الخمر، أن یأکل الرجل و هو منبطح علی بطنه'' (ابوداؤد:۳۷۷۶)۔

☆راشد حسین ندوی نے لکھا ہے کہ اکثر مال حلال ہو تو دعوت قبول کرنا جائز ہے،اگر مال حلال تو ہے مگر حرام سے دعوت کرے تو قبول نہیں کی جائے گی۔الحلال بین والحرام بین و بینهما امور مشتبهات (سنن الترمذی:۱۲۰۵)۔

☆عبد الرشید قاسمی، مفتی محمد شفیق، محمد ضیاء الحق قاسمی، محمد عثمان قاسمی، ابو محمد محمد سعد نور قاسمی، عبد الاحد قاسمی، محمد عمار مزمل قاسمی، مفتی فیاض احمد محمود کی رائے یہ ہے کہ حرام مال یقینی ہو تو دعوت کو ٹال دے اور قبول نہ کرے، اگر حرام کا علم نہ ہو تو دعوت قبول کی جاسکتی ہے، یا حلال وحرام دونوں میں حلال کی مقدار غالب ہو تو دعوت قبول کی جاسکتی ہے، مال مخلوط ہو یا کمائی کا یقینی علم نہ ہو تو بھی قبول کی جاسکتی ہے۔

"**سموا الله و كلوا**" (سنن ابی داؤد:۲۸۳۱)۔

"**الحلال بين والحرام بين و بينهما امور مشتبهات**" (سنن الترمذی:۱۲۰۵)۔

☆باوثوق ذرائع سے معلوم ہو کہ اکثر یا غالب مال/آمدنی حلال سے ہے تو دعوت قبول کی جائے گی، اگر اکثر مال حرام کا ہو یا علانیہ حرام تجارت ہو تو دعوت قبول نہ کی جائے، مال مشکوک ہو تو احتیاط اولی، اگر غالب کمائی حرام کی ہو تو سوال کیا جائے کہ دعوت کونسے مال سے ہے؟ حرام یا حلال سے؟ غالب مال حلال ہو تو دعوت یا تحفہ قبول کرنا درست ہے، اگر حرام کمائی کا علم نہ ہو تو کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

اس رائے کے حاملین درج ذیل ہیں:

مفتی محمد اشرف قاسمی، عبید اللہ ندوی، محمود اختر کیفی، راشد حسین ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری، محمد رندوی رحمت اللہ ندوی، مفتی شکلیل منصور قاسمی، خان حبیب اللہ ندوی، محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، مفتی کامران سعید رشادی، محمد شباب کوثری، مفتی شکیل کوثری، محمد عفان منصور پوری، مفتی امانت علی قاسمی، مفتی محمد صالح الزمان قاسمی ازہری، محمد شاکر نثار اعظمی مدنی، مفتی خلیل احمد ندوی، مفتی نیاز احمد ندوی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی، مفتی نثار احمد گودھروی، مفتی سلیم الدین قاسمی۔

☆جب متعین طور پر معلوم نہ ہو اس کا مال حلال ہے یا حرام؟ یا حلال وحرام کی مقدار معلوم نہ ہو تو دعوت قبول کی جاسکتی ہے، تو ایسے حالات میں اس کا دل فیصلہ کرے یا ظن غالب پر عمل، یا اگر معلوم ہو کہ کل مال یا اکثر حرام ہے تو اس صورت میں تورعا دعوت قبول نہ کرنا اولی ہے، اس رائے کے حاملین درج ذیل ہیں۔ سعید احمد ندوی، مفتی محمد ابراہیم بن سلیمان فلاحی، خوجہ نظام الدین یوسفی، محمد صادق مبارکپوری، محمد ارشد ربانی مکی، اکرم رشید رحمانی، محمد آزاد بیگ۔

دوسری رائے:

ایسی دعوت قبول نہ کی جائے، اگر کھانے کے بعد علم ہو تو اس قدر صدقہ کرے، خصوصا وہ مدعو جو معاشرہ میں خاص مقام رکھتا ہو ہرگز شرکت نہ کرے، اگر مخلوط مال ہو اور غالب گمان حلال کا ہو تو دعوت قبول کی جائے گی، اس رائے کے حاملین

درج ذیل ہیں:

صابر حسین ندوی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، محمد مقصود فرقانی، محمد ممتاز خان ندوی، محمد ابوبکر قاسمی، مفتی سید محمد علی مدنی۔

دلیل:

"**و لاتعاونوا على الإثم و العدوان**" (المائدۃ)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "**أما أنا فلا أصلي عليه**" (سنن نسائی:۱۱۶۶)۔

"**نهى رسول الله ﷺ عن إجابة دعوة الفاسقين**" (مشکوۃ:۵/۲۷۹)۔

"**من نبت لحمه من السحت فالنار أولى به**" (شعب الایمان:۵۵۱۸)۔

"**اتقوا مواضع التهم**" (السلسلۃ الضعیفۃ:۱۱۳)۔

☆ قاضی وصی احمد قاسمی: اکثر کمائی حرام کی ہو تو دعوت قبول نہ کی جائے، الا یہ ہے کہ وضاحت کرے کہ یہ دعوت حلال سے ہے تو دعوت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر تھوڑا مال حرام سے ہو تو دعوت قبول کی جائے گی۔

☆ مولانا محمد مغفور باندوی نے لکھا ہے کہ یہ سوال کرنا خود مشکل ہو تو دعوت قبول کی جائے گی۔

دلائل:

"**إذا دخلت عل مسلم لايتهم فكل من طعامه ويشرب من شرابه**" (بخاری:۵۴۶۱)۔

"**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولايسأله عنه فإن سقاه شرابا من شرابه فليشرب من شرابه ولا يسأله عنه**" (مسند احمد:۹۱۸۴)۔

نبی کریم ﷺ کے پاس جب ہدیہ آتا تھا تو سوال کرتے تھے کہ کہ یہ مال صدقہ ہے یا ہدیہ ہے؟

"**إن لي جارا يأكل الربا و أنه لايزال يدعوني فقال مهنأه لك وإثمه عليه**" (مصنف عبدالرزاق:۸/۱۱۷)۔

"**عن سلمان فارسي قال: إذا كان لك صديق عامل أو جار عامل أوذو قرابة عامل فأهدى لك هدية أو دعاك إلى طعام قابله فإن مهنأ ه لك و اثمه عليه**" (مصنف عبدالرزاق:۸/۱۱۷)۔

☆ مولانا اشتیاق اعظمی کی رائے یہ ہے کہ مال حرام سے ہدیہ/ دعوت ہو تو قبول نہ کی جائے۔

"**آكل الربا و كاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه و غالب ماله حرام لايقبل ولايأكل**" (الفتاوی الہندیۃ:۵/۳۴۲)۔

"**إذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام الحلال**" (مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی:۲/ ۱۵۶۵۴)۔

تیسری رائے:

ایسی دعوت بکراہت قبول کی جاسکتی ہے، مولانا ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی، مولانا سید فاروق عمری مدنی۔

دلائل:

"**حق المسلم علی المسلم ست إذا دعاک فاجبه**" (مسلم:۵۷۷۸)۔

"**سموا الله و کلوا**" (سنن ابی داؤد:۲۸۳۱)۔

نبی کریم ﷺ کا یہود کی دعوت قبول کرنا اور داعی کے سلسلہ میں کھوج نہ لگانا۔

☆مفتی برکت علی قاسمی کی رائے :احوط یہی ہے کہ دعوت قبول نہ کی جائے اگر چہ دعوت میں شرکت جائز ہے۔

دلائل:

"**د ع ما یریبک إلی مالایریبک**" (ترمذی۔۲۵۱۸)۔

"**البر حسن الخلق و الإثم ماحاک فی صدرک و کرهت أن یطلع علیه الناس**" (مسلم ۲۵۵۳)۔

چوتھی رائے:

داعی سے سوال کرنا درست نہیں ہے، اس صورت میں داعی کی توہین ہوگی، مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھنا لازم ہے، امکان کی وجہ سے حکم نہیں لگا سکتے، وہم یا وسوسہ رکھنا صحیح نہیں ہے، انتشار کا باعث نہ بنیں، احتیاط ضرور کریں ورنہ دعوت میں شریک ہوجائیں، مفتی محمد مدثر قاسمی، محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی محمد الیاس قاسمی، محمد قمر الزمان ندوی، محمد مطیع الرحمٰن قاسمی، قاری ظفر الاسلام صدیقی۔

دلائل:

"**إذا دخل أحدکم علی أخیه المسلم فلیأکل من طعامه ولایسأل ویشرب من شرابه ولایسأل**" (مشکوۃ:۵/ ۲۷۹)۔

"الاصل فی المعاملة الإباحة"۔

پانچویں رائے:

جوکھلا یا جارہا ہے حلال ہوتو دعوت قبول کی جائے گی، کمائی سے مدعو کا کوئی تعلق نہیں۔ مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی، جب کہ ڈاکٹر عبدالہادی باقوی کی رائے اس سے مختلف ہے: کھانا اگر حرام مال سے کھلا یا جارہا ہے اور اس کا علم بھی ہو ایسی دعوت قبول نہ کی جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دعوت قبول نہ کرنے میں کسی ضرر کا اندیشہ ہوتو دعوت قبول کرلے۔

عارض کی رائے:

ایسی دعوت بکراہت قبول کی جاسکتی ہے۔

دلائل:

"حق المسلم علی المسلم ست إذا دعاک فاجبه" (سنن ترمذی)۔

"لاتصاحب إلا مؤمنا و لایأکل طعامک إلا تقی" (سنن ابی داؤد)۔

نبی کریم ﷺ کا یہود کی دعوت قبول کرنا اور داعی کے سلسلہ میں کھوج نہ لگانا۔

وجہ ترجیح:

اس سلسلہ میں فرمان نبوت اور اسوہ محمدی کو مدنظر رکھنے سے ایسے حضرات کی دعوت قبول کرنے اور اس میں شریک ہونے میں شرعا کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے ایک یہودی سے گھر والوں کی خاطر غلہ خریدا تھا، ان کے تحفہ کو (گوشت) قبول کیا تھا، یہود کی دعوت کو بھی قبول فرمایا تھا، حالانکہ اکثر و بیشتر یہودیوں کی تجارت اور لین دین سود خوری اور حرام پر مشتمل تھی، نیز حضرت بریرہؓ کے ہدیہ اور تحفہ کے بارے میں فرمایا تھا: وہ تو اس کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے تحفہ ہے "لها صدقة و لنا هدية"۔

سوال نمبر: (۱۱) کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام؟ ناگواری اور اختلاف کا باعث بنتا ہے، تو کیا پوچھے بغیر یہ ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا بھی امکان ہے، اسی طرح بچوں کو کوئی ٹافی وغیرہ دے دیتا ہو، کبھی پانی چائے پلاتا ہو اور کبھی ضروری

چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو، لیکن اس شخص کی کمائی کیسی ہے، معلوم نہیں، تو ایسی صورت میں اس چیز کے استعمال کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں علماء کرام کے چار آراء قابل ذکر ہیں:

پہلی رائے:

اگر غالب مال حلال ہو تو ایسے مال کا ہدیہ قبول کیا جا سکتا ہے، صریح حرام ہو یا مال مخلوط ہو تو قبول نہیں کیا جا سکتا، اگر ہدیہ دینے والا فاسق بعینہ ہے اس کا تحفہ قبول نہیں کیا جائے گا، نیز غلبہ حرام کا ہو یا اکثر آمدنی حرام کی ہو یا مال حرام مساوی ہو تو بھی ہدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، نیز سودی

کاروبار کے سوا دوسری آمدنی کا راستہ ہو تو شبہ کرنا یا سوال کرنا درست نہیں، حسن ظن بھی شرعا مطلوب ہے، اگر ظن غالب ہو تو پوچھ لیں۔

اس رائے کے حاملین مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر شاہ جہاں ندوی، اکرم رشید رحمانی، مولانا رحمت اللہ ندوی، محمد ابوبکر قاسمی محمد ریاض ارمان قاسمی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، مفتی ارشاد عالم قاسمی، صفوان احمد حلیمی قاسمی، مفتی خلیل احمد، محمد اختر کیفی، مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی، محمد ضیاء الحق قاسمی، مولانا اشتیاق احمد اعظمی قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی، مفتی محمد ابراہیم بن سلیمان فلاحی، مفتی محمد برکت علی قاسمی، مولانا ڈاکٹر کلیم اللہ عمری مدنی، سعید احمد ندوی، عبید اللہ ندوی، احمد مکین، محمد شبا کوثری، محمد شکیل کوثری، محمد زبیر ندوی،، خوجہ نظام الدین یوسفی، محمد مطیع الرحمٰن قاسمی۔

☆ مفتی سید محمد علی مدنی، مولانا محمد شاکر نثار اعظمی اورد/عبد الہادی باقوی، مولانا مفتی محمد الیاس قاسمی، قاضی وصی احمد قاسمی، محمد ارشد ربانی مکی، محمد عمار مزمل قاسمی کی رائے یہ ہے: "**لـلاکثـر حکـم الکل**"، اگر لوگ ناراض بھی ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ دلیل۔

"**لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق**" (مصنف ابن ابی شیبۃ: ۱۲)(الاصل فی المعاملۃ الاباحۃ)۔

☆ جب کہ مفتی سلیم الدین قاسمی کی رائے یہ ہے کہ: اگر رنجش کا ڈر ہو تو حسن تدبیر سے ٹال دے، یا ہدیہ قبول کرنے کے بعد کسی غریب کو صدقہ کر دے۔

☆ مولانا خورشید احمد مفتاحی کی رائے یہ ہے کہ: بستی کے ہر شخص کا سود میں ملوث ہونا لازم نہیں آتا، اگر معلوم ہو

کہ کمائی حلال ہے تو جائز ہے، مشکوک ہو تو احتیاط اولی ہے۔

☆مفتی جمیل احمد نذیری: حرام متعین ہو تو قبول نہ کرے، اگر لے لیا ہو تو غریب کو دے دے، اگر کھالیا ہو تو اس قدر صدقہ کرے۔

دلائل:

"**درء المفاسد أولى من جلب المصالح**" (الاشباہ والنظائر)۔

"**أمور المسلمين محمولة على السداد حتى يظهر غيره**" (القواعد الفقہیۃ: ۳۲، فتاوی عالمگیری: ۳۴۲/۵)۔

مخلوط مال ہو تو امام ابوحنیفہ کے پاس جائز ہے "**الأصل فى المعاملة الإباحة**"۔

دوسری رائے:

یہ تحفے قبول کئے جاسکتے ہیں، اصل تو حلت ہے، جب تک کہ حرمت کی وجہ ظاہر نہ ہو، بحث وتفتیش کی شرعا اجازت نہیں، تحقیق ضروری نہیں، بدگمانی، دل آزاری شرعا اچھی چیز نہیں ہے، یقینی علم نہ ہو تو قبول نہ کرے، اگر تحقیق کی وجہ سے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو تو ہدیہ لے کر صدقہ خیرات کرے، مذکورہ رائے مندرجہ ذیل حضرات کی ہے۔

مولانا اختر امام عادل، مفتی محمد صالح الزمان قاسمی، عبدالرشید قاسمی، محمد آزاد بیگ قاسمی، محمد قمر الزمان ندوی، مفتی اقبال بن محمد ٹنکاوری، محمد جمیل اختر جلیلی نذیری، حافظ سید فاروق عمری مدنی، مفتی محمد مدثر قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی۔

دلائل:

"**يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن**....." (الحجرات)۔

"**فبظلم من الذين هادوا** ....." (المائدہ: ۱۶۰-۱۶۱)۔

نبی کریم ﷺ یہود کا ہدیہ قبول کرتے تھے جب کہ اکثریت سودی کاروبار کرتے تھے، رشوت خوری عام تھی، آپ ﷺ ان سے قرض لیتے/ غیر مسلم سے ہدیہ قبول کرتے تھے مگر کریدتے نہ تھے۔

"**عن ابن مسعود** ..... **مهتأه لك وإثمه عليه** ..... (جامع العلوم)۔

"**عن عائشة قالت: إن قوما يأتوننا باللحم لاندرى أذكروا اسم الله عليه أم لا؟ قال** ﷺ **سموا**

الله عليه و كلوا'' (سنن ابی داؤد:۲۸۳۱)۔

''**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولايسأل عنه** .....'' (مسند احمد)۔

''**لاينصرف حتى يجد ريحا او يسمع صوتا**'' (مسلم ۸۰۴)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب حفظہ اللہ کا فتوی جواز پر۔

☆ جب کہ عبدالاحد قاسمی کی رائے یہ ہے کہ: شبہ کی بنیاد پر حرام نہیں کہہ سکتے۔

دلائل:

''**إن لی جارا يأكل الربا و أنه لايزال يدعونی فقال مهنأ ه لک وإثمه عليه**'' (مصنف عبدالرزاق:۸/۱۱۷)۔

''**الحلال بين و الحرام بين و بينهما أمور مشتبهات**'' (متفق علیہ)۔

''**د ع مايريبک إلى ما لايريبک**'' (سنن ترمذی)۔

تیسری رائے:

حرام کا امکان ہو/یقینی علم ہو کہ یہ مال مال حرام ہے تو حتی الامکان یہ ہدیہ قبول نہیں کیا جاسکتا، نیز جب تک حلال کا علم نہ ہو کوئی چیز نہ لی جائے، صراحۃ سوال نہ کر سکے تو کنایۃ سوال کر لے، مولانا صابر حسین ندوی، مفتی کامران سعید رشادی خان حبیب الرحمٰن ندوی، مولانا روح الامین، مفتی نثار احمد گودھروی، محمد صادق مبارکپوری، محمد عفان منصور پوری کی رائے یہ ہے کہ مکمل آمدنی حرام کی ہو تو بچنا اولی ہے، الا یہ کہ گاؤں کا باوثوق آدمی ہو اور ضرر کا اندیشہ ہو تو مجبورا دعوت قبول کر لے اور بعد میں اس قدر صدقہ کرتے رہے۔

دلائل:

''**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه و لايسأل عنه** ...'' (مسند احمد)۔

قواعد فقهية: ''**اليقين لايزول بالشک، الأصل فی الأشياء الإباحة**''۔

چوتھی رائے:

تقوی اور فتوی میں فرق کیا جائے۔ تقوی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس ہدیہ کو قبول نہ کیا جائے، فتوی کا تقاضا یہ ہے کہ مومنین سے حسن ظن رکھا جائے۔

محمد مقصود، لیکن ممتاز خان ندوی کی رائے یہ ہے کہ شک کرنا درست نہیں ہے۔

"**دلائل ۔استفت قلبک**" (مسند احمد)۔

"**د ع مایریبک إلی مالا یریبک**" (سنن ترمذی)۔

پانچویں رائے:

مال مشکوک، مال مخلوط، مال مجہول، مال مشتبہ کی دعوت میں شرکت/تحفہ قبول کرنے سے پرہیز کرنا بہتر ہے، مولانا محمد مغفور باندوی، مولانا روح الامین سعادتی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی فیاض احمد محمود۔

عارض کی رائے اور وجہ ترجیح:

اگر غالب مال حلال ہو تو ایسے مال کا ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، صریح حرام ہو یا بعینہ مال حرام ہو تو قبول نہیں کیا جاسکتا، اگر ہدیہ دینے والا فاسق بعینہ ہے اس کا تحفہ قبول نہیں کیا جائے گا، نیز غلبہ حرام کا ہو یا اکثر آمدنی حرام کی ہو یا مال حرام مساوی ہو تو بھی ہدیہ قبول نہیں کیا جائے گا، نیز سودی کاروبار کے سوا دوسری آمدنی کا راستہ ہو تو شبہ کرنا یا سوال کرنا درست نہیں، حسن ظن بھی شرعاً مطلوب ہے، اگر ظن غالب ہو تو پوچھ لیں۔

"**درء المفاسد أولی من جلب المصالح**" (الاشباہ والنظائر)۔

"**أمور المسلمین محمولة علی السداد حتی یظهر غیره**" (القواعد الفقہیۃ ص:۳۲، فتاوی عالمگیری:۵/۳۴۲)۔

مخلوط مال ہو تو امام ابوحنیفہ کے پاس جائز ہے "**الأصل فی المعاملة الإباحة**"۔

هـذا ما تبین لی والله أعلم بالصواب وصلی الله علی نبینا محمد و بارک وسلم والحمد لله رب العالمین۔

☆☆☆

عرض مسئلہ بابت:

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

سوال نمبر ۵ تا ۷)

مفتی امانت علی قاسمی☆

مال حرام سے متعلق بعض مسائل کا عرض مسئلہ آپ کے سامنے پیش ہے، عرض تحریر کرتے وقت تک ۶۸/مقالات موصول ہوئے تھے، جن کے اسمائے گرامی آپ کے سامنے پیش ہو چکے ہیں، یہاں پر موضوع سے متعلق سوال نمبر ۵ تا ۷ کا عرض مسئلہ پیش کیا جاتا ہے، کوشش کی گئی ہے کہ تمام آراء کا احاطہ کیا جائے اور ان کے دلائل کو بھی ذکر کیا جائے پھر اگر کسی کے رائے نہ آسکے تو اس کے لیے معذرت خواہ ہوں، وہ حضرات دوران مناقشہ اپنی رائے پیش کر سکتے ہیں۔

سوال نمبر: (۵) کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو وہ کس طرح اس کی تلافی کرے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کے درمیان بظاہر کوئی اختلاف نہیں ہے، صرف جزوی تفصیلات وتعبیرات میں فرق ہے۔ تمام مقالہ نگار حضرات نے مشترکہ طور پر لکھا ہے کہ اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ اس کا مال حرام تھا اس لیے اس نے اس کی دعوت قبول کر لی بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا مال حرام تھا تو توبہ استغفار کرے اور ساتھ میں کچھ صدقہ کر دے، بہتر ہے کہ جس قدر مال کھایا ہے اسی قدر صدقہ کر دے تو انشاء اللہ حرام مال کھانے کے وبال سے بچ جائے گا اور جو حرام اس کے پیٹ میں گیا ہے چوں کہ وہ غلطی سے گیا اس پر اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔ اکثر حضرات نے صدقہ کرنے کو مستحب لکھا ہے جب کہ مفتی صفوان حلیمی صاحب نے غیر مستحق شخص کے لیے صدقہ کو واجب لکھا ہے۔ مفتی مطیع الرحمٰن قاسمی اور مفتی محمد علی مدنی نے لکھا نے کہ کسی بہانے سے داعی کو ہی کھانے کے بقدر پیسے واپس کر دے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو صدقہ کرے، بعض حضرات نے حضرت ابوبکر کے عمل کو پیش نظر رکھ کر یہ لکھا ہے کہ اگر وہ پیٹ میں ہوا اور قئی کے ذریعہ اس کا نکالنا ممکن ہو تو قئے کے ذریعہ اس کو اپنے جسم سے علاحدہ کر لیا جائے۔ اس مسئلے پر حضرات مقالہ نگار نے قرآن کریم کی آیات، آحادیث اور فقہی عبارات

☆ استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

سے استدلال کیا ہے، ان میں سے چند دلائل یہ ہیں:

قرآن کریم کی آیات:

"إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا" (سورۃ النبا:۱۷)۔

"وَمَنْ يَعْمَلْ سُوئًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا" (النساء:۱۱۰)۔

"وعبارة المازری اتفقوا علی أن التوبة من جمیع المعاصی واجبة، وأنها واجبة علی الفور، ولا یجوز تأخیرها سواء کانت المعصیة صغیرة أو کبیرة" (فیض روح المعانی:۲۸/۸)۔

احادیث سے استدلال:

عن قیس بن أبی غرزة قال: کنا نسمی فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم "السماسرة"، فمر بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فسمانا باسم هو احسن منه، فقال: یا معشر التجار! ان البیع یحضره اللغو والحلف، فشوبوه بالصدقة" (سنن ابن ماجۃ، باب فی التوقی فی التجارۃ، حدیث نمبر: ۳، ۲۱۴۵/۲۷۶)۔

"عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ لِأَبِي بَكْرٍ غُلاَمٌ يُخْرِجُ لَهُ الخَرَاجَ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهِ، فَجَاءَ يَوْمًا بِشَيْءٍ فَأَكَلَ مِنْهُ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ لَهُ الغُلاَمُ: أَتَدْرِي مَا هَذَا؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: وَمَا هُوَ؟ قَالَ: كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِإِنْسَانٍ فِي الجَاهِلِيَّةِ، وَمَا أُحْسِنُ الكِهَانَةَ، إِلَّا أَنِّي خَدَعْتُهُ، فَلَقِيَنِي فَأَعْطَانِي بِذَلِكَ، فَهَذَا الَّذِي أَكَلْتَ مِنْهُ، فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَهُ، فَقَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِي بَطْنِهِ -"قال ابن حجر رحمه الله : قَالَ اِبْن التِّين : إِنَّمَا اسْتَقَاءَ أَبُو بَكْر تَنَزُّهًا ;لِأَنَّ أَمْر الْجَاهِلِيَّة وُضِعَ وَلَوْ كَانَ فِي الْإِسْلَام لَغَرِمَ مِثْل مَا أَكَلَ أَوْ قِيمَته وَلَمْ يَكْفِهِ الْقَيْء،كَذَا قَالَ وَالَّذِي يَظْهَر أَنَّ أَبَا بَكْر إِنَّمَا قَاءَ لِمَا ثَبَتَ عِنْده مِنْ النَّهْي عَنْ حُلْوَان الْكَاهِن، وَحُلْوَانُ الْكَاهِنِ مَا يَأْخُذهُ عَلَى كِهَانَته" (فتح الباری، باب قولہ فی ایام الجاہلیۃ ۷/ ۱۵۴)۔

ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح میں اسی حدیث کے تحت لکھا ہے: "أن من أکل الحرام وهو عالم به أو جاهل، ثم علم لزمه أن یتقیأ جمیع ما أکله فورا .اهـ. وقد جعله الغزالی فی المنهاج من باب الورع" (مرقاۃ المفاتیح ۱۹۰۶/۵)۔

فقہی عبارت سے استدلال:

بہت سے حضرات نے علامہ شامی کی اس عبارت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ حرمت کا تعدیہ علم ہونے کی صورت میں ہوتا ہے، ورنہ نہیں "**الحرمة تتعد مع العلم بها—وما نقل عن بعض الحنيفة من أن الحرام لايتعدى ذمتين، سألت عنه الشهاب ابن الشلبى فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك**" (ردالمحتار، ۵/۹۸)۔

"**ففى التتارخانية اشترى جارية أو ثوبا، وهو لغير البائع فوطء أو لبس، ثم علم روى عن محمد أن الجماع واللبس حرام إلا أنه وضع عنه الإثم، وقال أبو يوسف، الوطء حلال مأجور عليه**" (ردالمحتار ۹/ ۵۵۴)

مولانا اشتیاق احمد اعظمی اور مفتی عبدالاحد صاحب جہاں آباد نے اس جگہ مفتی تقی عثمانی صاحب کا فتوی نقل کیا ہے کہ اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آجائے تو توبہ اور راستغفار کرنا چاہیے اور تلافی کے لیے اتنی رقم صدقہ کر دینا چاہیے (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۲۶) مفتی ممتاز صاحب ندوی نے اسی طرح ایک فتوی دارالعلوم دیوبند کا بھی ذکر کیا ہے۔ مفتی اقبال صاحب ٹنکاروی نے باقیات فتاوی رشیدیہ کے ایک مسئلہ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ اگر علم حرام کا علم ہو تو استعمال کرنا حرام ہے لیکن اگر علم نہ ہو تو معاف ہے (مقالہ مفتی اقبال ٹنکاروی)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کھانے کے بعد معلوم ہو کہ فلاں کا مال حرام تھا تو توبہ و استغفار کرے، آئندہ احتیاط کرے اور کھانے کے بقدر صدقہ وخیرات کر دے۔

سوال نمبر: (۶) کیا پہلے کے کمائی ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ ہے؟

اس سوال کے جواب میں زیادہ تر مقالہ نگار حضرات نے لکھا ہے کہ مال حرام کو حلال کرنے کا کوئی حیلہ نہیں ہے؛ بلکہ مال حرام کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ بلاعوض کے حاصل کیا گیا ہے جیسے کہ غصب کا پیسہ ہے یا رشوت کا پیسہ ہے تو جس کا مال ہے اس کو واپس کر دیا جائے اور اگر مالک کا انتقال ہو گیا ہو تو ورثہ کو لوٹا دے، اسی طرح سود کا پیسہ جس کا ہے اس کو واپس کر دیا جائے، بینک کا سودی پیسہ اگر سرکار کو کسی دوسرے طریقے سے جس میں بظاہر اپنا کوئی نفع نہ ہو واپس کر دیا جائے تو جائز ہے یا پھر اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے اسی طرح اگر مال بالعوض حاصل کیا گیا ہے مثلاً حرام ملازمت کے ذریعہ مال حاصل کیا ہے تو اس کو واپس کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے، چوں کہ مال حرام کا حکم متعین ہے کہ یا تو مالک کو واپس کیا جائے یا پھر صدقہ کر دیا جائے اس لیے کسی حیلہ کے ذریعہ حلال کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا حیلہ ہے جس سے مال حرام حلال ہو جائے۔

"الحرام ينتقل أی تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدی وتبدلت الأملاک ....والحاصل إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه" (ردالمحتار:باب البیع الفاسد،۷/۳۰۰،ط:زکریا)۔

"أما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد و لا يمكنه أن يرد إلى مالكه و يريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء" (بذل المجہود ۱/۳۷)۔

"لَا يَجُوزُ أَخْذُ الْأُجْرَةِ عَلَى الْمَعَاصِي (كَالْغِنَاءِ، وَالنَّوْحِ، وَالْمَلَاهِي) ؛ لِأَنَّ الْمَعْصِيَةَ لَا يُتَصَوَّرُ اسْتِحْقَاقُهَا بِالْعَقْدِ فَلَا يَجِبُ عَلَيْهِ الْأَجْرُ، وَإِنْ أَعْطَاهُ الْأَجْرَ وَقَبَضَهُ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَجِبُ عَلَيْهِ رَدُّهُ عَلَى صَاحِبِهِ" (مجمع الانہر،۲/۳۸۴)مقالہ،مفتی شکیل منصور قاسمی)۔

"من اكتسب مالا بغير حق يجب رده على مالكه" (بذل المجہود ۱/۳۵۹)۔

اس مسئلہ میں مفتی شکیل منصور صاحب نے مختلف کتب فتاوی سے عربی عبارتیں پیش کی ہیں تمام کا حاصل یہی ہے کہ اس سلسلے میں کسی حیلے کی گنجائش نہیں ہے۔بعض مقالہ نگار حضرات نے فتاوی ہندیہ کے حوالے سے یہ حیلہ نقل کیا ہے کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے کر اپنی ضرورت پوری کرلی جائے اور قرض کی ادائیگی کے طور پر حرام مال دے دیا جائے (ہندیۃ ۵/۳۴۲)،لیکن اکثر مقالہ نگار نے اس حیلہ کو لکھ کر اس کی تردید بھی کی ہے کہ اس حیلہ سے حرام مال حلال نہیں ہوجائے گا؛ بلکہ حرام کے استعمال کا گناہ علی حالہ باقی رہے گا،اس سلسلے میں مفتی عبدالاحد صاحب نے کفایت المفتی سے ایک فتوی نقل کیا ہے جس میں ہے کہ" حرام رقم کا یہ استعمال جو اس نے اپنا قرضہ ادا کرنے میں کیا ہے اس شخص کو استعمال حرام کے مواخذہ سے نہیں بچا سکے گا" (کفایت المفتی ۹/۲۱۳)۔

حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ" اس حیلے سے رقم حلال نہیں ہوتی صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہوجائے گا؛لیکن حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا" (فتاوی عثمانی ۳/۱۲۴)۔

ایک رائے مفتی مغفور ندوی صاحب کی ہے وہ لکھتے ہیں:سب سے آسان اور قابل شکل حیلہ یہ ہے کہ کوئی سامان ادھار خریدے اور ادائیگی مال حرام سے کردے جیسا کہ امام ابو یوسف کی رائے راقم الحروف کے نزدیک یہ سب سے آسان شکل ہے (مقالہ مفتی مغفور ندوی)،ظاہر ہے کہ اس حیلہ سے حرام مال کے استعمال کا حکم ختم نہیں ہوسکتا ہے،جیسا کہ مفتی تقی عثمانی صاحب وغیرہ کے حوالے سے اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

سوال نمبر:(۷) ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے،وہ اس کو صدقہ کرکے ختم کرنا چاہتا ہے لیکن تجارت کے لیے قرض

کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو اپنے اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرضہ کو صدقہ کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگار حضرات کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلے نمبر پر یہ وہ اپنے کئے ہوئے عمل سے توبہ کرے اور آئندہ حرام استعمال کرنے سے باز آنے کا پختہ عزم کرے۔ پھر جس قدر اس کے پاس مال حرام ہے اتنا مال وہ صدقہ وخیرات کر دے اور اگر اس کا کل مال ہی حرام ہے اس کا گھر، اس کا کاروبار سب مال حرام سے ہے تو جس وقت وہ اپنے عمل سے توبہ کرتا ہے اس وقت اپنی ساری جائداد کا حساب کر لے اور کچھ حلال مال قرض لے کر حلال کاروبار شروع کرے اور دھیرے دھیرے وہ سارا مال جس کا اس نے تخمینہ کیا ہے بلا نیت ثواب صدقہ کر دے اس طرح اس کا سارا مال حلال اور پاک ہو جائے گا۔ یہاں یہ ضروری ہے کہ عزیمت پر عمل کرتے ہوئے شروع میں ہی تمام مال صدقہ کر دے انشاء اللہ اس کے لیے راستے نکلیں گے اور وہ حلال مال سے بھی کاروبار کر پائے گا لیکن اگر اس کے آثار نہ ہو تو جس قدر مال کاروبار کے لیے ضروری ہو اس قدر مال رکھ کر باقی تمام مال کو صدقہ کر دے یا اسی مال سے بقدر ضرورت رکھ کر اور باقی کو صدقہ کر کے کاروبار شروع کرے پھر جب نفع ہو جائے تو مکمل حرام مال کا تصدق کر دے۔ مال حرام سے حاصل شدہ نفع کا تصدق لازم نہیں ہے بلکہ عین مال حرام کا تصدق لازم ہے، بہت سے مقالہ نگار حضرات نے علامہ ابن تیمیہ کی عبارت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مال کو قرض لے کر کاروبار کر کرنا پھر بعد میں واپس کرنا بھی درست ہے۔

"فَإِنْ تَابَتْ هَذِهِ الْبَغِيُّ وَهَذَا الْخَمَّارُ وَكَانُوا فُقَرَاءَ جَازَ أَنْ يُصْرَفَ إلَيْهِمْ مِنْ هَذَا الْمَالِ مِقْدَارُ حَاجَتِهِمْ فَإِنْ كَانَ يَقْدِرُ يَتَّجِرُ أَوْ يَعْمَلُ صَنْعَةً كَالنَّسْجِ وَالْغَزْلِ أُعْطِيَ مَا يَكُونُ لَهُ رَأْسُ مَالٍ وَإِنْ اقْتَرَضُوا مِنْهُ شَيْئًا لِيَكْتَسِبُوا بِهِ وَلَمْ يَرُدُّوا عِوَضَ الْقَرْضِ كَانَ أَحْسَنَ" (مجموع الفتاوی ۲۹/۳۰۸).

عام طور پر حضرات مقالہ نگاران کی رائے وہ ہے جو اوپر ذکر کیا گیا، تاہم بعض مقالہ نگار حضرات کی آراء میں جزوی اور انفرادی تبدیلی ہے یا کہیں پر محض تعبیرات کا فرق ہے مثلاً: مفتی قمر الزماں ندوی اور مولانا رحمت اللہ ندوی صاحب کی رائے ہے کہ "بہتر شکل یہ ہے کہ وہ شخص پہلے ان روپیوں کو کسی غریب کو صدقہ کر دے اور پھر اسی غریب سے قرض لے لے بعدہ اس کو واپس کر دے، اسی طرح بیوی، بالغ فقیر اولاد اور محتاج والدین پر صدقہ کر دے پھر ان سے قرض یا ہدیہ لے لے یہ صورت زیادہ بہتر ہے" (مقالہ: مفتی قمر الزماں ندوی صاحب)، مفتی جمیل احمد نذیری نے اعلاء السنن کی ایک عبارت کو سامنے رکھ کر لکھا ہے کہ ضرورت کی وجہ سے اسی مال کو قرض کے طور پر استعمال کرنے کی گنجائش ہے: "**فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ بقدر حاجته و يتصدق في الباقي فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه عينا كان أو منفعة**" (اعلاء السنن ۱۹۵، ۱۶) مفتی تبریر عالم حلیمی اور مفتی سعد نور قاسمی نے فقہ البیوع کے حوالے سے لکھا ہے کہ مذکورہ شخص کو

چاہیے کہ کسی ماہر مفتی یا اہل علم سے یہ فتوی حاصل کرے کہ وہ یہ جائداد بطور قرض اپنے پاس رکھ رہا ہے پھر حرام مال کا حساب کر کے تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا رہے تو اس جائداد سے انتفاع حلال ہو جائے گا۔ (مقالہ مفتی تبریز عالم قاسمی (فقہ البیوع ۱۰۲۱/۲)

لیکن مفتی محمد عثمان صاحب حلیمی کی رائے کی کسی مفتی سے اس سلسلے میں فتوی لینے کی ضرورت نہیں، ان کی رائے ہے کہ مال دار آدمی کے لیے حرام مال جس کا مالک معلوم نہ ہو حلال تجارت کے لیے بطور قرض استعمال کرنا جائز ہے، بعض اہل علم نے امام کی اجازت یا مفتی کے فتوی کو ضروری قرار دیا ہے لیکن امام کی اجازت یا مفتی کا فتوی جواز کے لیے ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے، بلکہ اپنے اور وارثین کے پاس کوئی تحریر لکھ کر رکھ دینا کافی ہے تا کہ اس کو محل میں خرچ کرنا یقینی ہو سکے، مسئلہ دیانت کا ہے جس کے لیے نیت کافی ہے قضاء شرط نہیں البتہ تحریری ثبوت رکھنے کا آیت مداینہ میں جو حکم ہوا ہے اس پر عمل کر لینا کافی ہوگا (مقالہ مفتی محمد عثمان حلیمی صاحب)

مقالہ نگار حضرات کی آراء کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں تقریبا آراء کا اتفاق ہے البتہ بعض مقالہ نگاران نے فقیر اور غنی کا فرق کیا ہے چناں چہ مالدار کے لیے مال حرام سے قرض لینے کو ناجائز اور فقیر کے لیے قرض لینے کو جائز قرار دیا ہے، مفتی شاہ جہاں ندوی کی رائے یہی ہے کہ مال حرام سے قرض لینا درست نہیں ہے ہاں اگر وہ فقیر ہے تو فقیر کی حیثیت سے اپنی ضرورت کے بقدر لے سکتا ہے (مفتی شاہ جہاں ندوی) لیکن اس رائے میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ فقیر کے لیے قرض لینے کی کیا ضرورت ہے وہ تو فقیر اور مستحق زکوۃ ہونے کی وجہ سے اس مال کا ایک مصرف ہے اس لیے اس میں سے بقدر ضرورت بلا قرض کے بھی لینا درست ہوگا پھر قرض لینے کی کیا ضرورت۔ مفتی صابر حسین ندوی نے اس سلسلے میں تفصیل ذکر کی ہے انہوں نے اس کی تین صورتیں ذکر کی ہے: (۱) غریب مستحق زکات شخص کے لیے بلا قرض کے مال حرام کا استعمال کرنا اور اس سے تجارت کرنا درست ہے، (۲) غریب تو نہ ہو لیکن متمول بھی نہ ہو تو اس کے لیے قرض لے کر کاروبار کرنا درست ہے تاہم دو باتوں کا خیال کرے بقدر ضرورت استعمال کرے اور وصیت لکھ کر رکھے، (۳) مال دار شخص ہے جو محض مال بڑھانے کے لیے مال حرام کو بطور قرض استعمال کرنا چاہتا ہے اس کے لیے درست نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مال حرام کو اگر تجارت کے لیے استعمال کرنے کی ضرورت ہو اور کوئی دوسری صورت نہ ہو تو بقدر ضرورت استعمال کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

☆☆☆

عرض مسئلہ بابت:

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

(سوال نمبر:۸/تا۱۰، ۱۲)

اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی☆

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے بتیسویں فقہی سمینار کے لئے ایک اہم موضوع: ''حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل'' کے سوال نمبر (۸، ۹، ۱۰، اور ۱۲) کے عرض مسئلہ کی ذمہ داری بندۂ ناچیز کے سپرد کی گئی ہے، بندہ کو اس مسئلہ سے متعلق اکیڈمی کی طرف سے کل ۶۸ مقالے موصول ہوئے تھے، حتی الامکان تمام مقالہ نگاران کی آرا مع دلائل سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم فروگذاشت انسانی خاصہ ہے، اسلئے اگر کہیں چوک ہوگئی ہو تو اس سے انکار کی گنجائش نہیں۔

سوال نمبر:(۸) ایک آدمی کا آدھا بزنس حلال ہے اور آدھا حرام، اب اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصوں کا کام کرنا پڑتا ہے، جیسے: کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہے یا دونوں کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہے، یا دونوں کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہے، تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب میں بنیادی طور پر مقالہ نگار حضرات کی دو آرا سامنے آئی ہیں، جواز وعدم جواز کی۔

رائے (۱) عدم جواز:

بیشتر حضراتِ علماء کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ: اگر کسی ملازم کو دوران ملازمت حلال وحرام، دونوں کام کرنے پڑتے ہوں تو ایسی ملازمت جائز نہیں؛ کیونکہ اس میں عملِ حرام کرنا پڑے گا؛ لیکن اگر کوئی آدمی اس جیسی ملازمت اختیار کر ہی لے اور حلال وحرام دونوں کاموں کی اجرت متعین ہو تو حلال ملازمت کی مقدار اجرت جائز ہوگی اور زائد اجرت کو صدقہ کرنا لازم ہوگا، اور اگر اجرت متعین نہ ہوسکتی ہو تو اجرت مثل کے برابر لے کر بقیہ کو صدقہ کرنا لازم ہوگا، اور اگر حلال ملازمت میں بہت معمولی حرام کام کرنا پڑتا ہے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

☆ دارالعلوم مئو

اسی رائے کا اظہار مولانا عبدالحکیم قاسمی پالنپوری، مولانا محمد سلیم الدین قاسمی، مولانا امانت علی قاسمی، مولانا عبدالرشید کانپور، مولانا محمد عثمان گورینی، مولانا صفوان احمد حلیمی، مولانا خلیل احمد دساڑا اور مولانا روح الامین سعادتی نے فرمایا ہے۔

استدلال میں فقہ البیوع کی طویل عبارت نقل کی گئی ہے: ''**أما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة فلا يجوز قبولها لاشتمالها على محرم**''، آگے عبارت یوں ہے: ''**ولكن إن قبل أحد مثل هذه الوظيفة فما حكم الراتب الذى أخذ عليها ،،والحاصل أن الإجارة فى الخدمة المباحة إنما تصح إذا كانت أجرتها معلومة بانفرادها ولا تصح فيما إذا لم تكن أجرتها معلومة فإن كان كذلك فى خدمات الفنادق والمطاعم والبنوك وشركات التأمين صارت أجرة المؤظف فيها مركبة من الحلال و الحرام فدخلت فى الصورة الثالثة من القسم الثالث وحل التعامل معه بقدر الحلال وأما إذا لم تعرف أجرة الخدمة المباحة على حدتها فالإجارة فاسدة ولكن الأجير يستحق أجر المثل فى الإجارات الفاسدة --وعلى هذا فإنما يقابل أجر المثل للخدمة المباحة فى راتبه ينبغى أن يكون حلالا، فصار راتبه مخلوطا من الحلال والحرام فى هذة الصورة أيضافينبغى أن يجوز معه التعامل بقدر الحلال**'' (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۶، ۱۰۵۷)

مولانا روح الامین سعادتی اور مولانا اختر امام عادل صاحبان بھی عام حالات میں اس کے عدم جواز کے قائل ہیں؛ کیونکہ یہ جائز و ناجائز، دونوں طرح کے معاملات سے مرکب ہے؛ لیکن اس سے حاصل شدہ آمدنی کے حلال ہونے کے قائل ہیں، مولانا اختر امام عادل صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی معاملہ کی بنیاد ناجائز امر پر ہو اور اس سلسلے میں کی جانے والی محنت پر اجرت حاصل ہو تو اجارہ فاسد اور باعث گناہ ہونے کے باوجود، اس کی کمائی جائز ہوگی۔ مولانا روح الامین سعادتی لکھتے ہیں کہ: حلال وحرام دونوں کاموں کی اجرت الگ الگ معلوم ہو تو اجارہ صحیح ہوگا اور مباح کام کی اجرت جائز ہوگی؛ لیکن الگ الگ معلوم نہ ہو تو اجارہ فاسد ہوگا اور اجارہ فاسدہ میں اجرتِ مثل کا مستحق ہوتا ہے، لہذا مباح کام کی اجرتِ مثل کے بقدر اس کے لئے مال حلال ہوگا، جیسا کہ مفتی تقی عثمانی مدظلہ نے فقہ البیوع میں لکھا ہے۔ مولانا اختر امام عادل نے استدلال میں البحر الرائق کی یہ عبارت پیش کی ہے: ''**وفى العَتَّابية : وأما المعصية نحو أن يستاجر نائحة أو مغنية أو لتعليم الغناء وفى فتاوىٰ أهل سمرقند: استأجر رجلا لِيَنُحِتَ له مِزمارا أو طُنبورا أو بَرْبَطا ففعل يطيب له الأجر إلّا أنه يأثم فى الإعانة على المعصية**'' (البحر ۸/۲۳)، بحر ہی کی دوسری عبارت نقل کی گئی ہے: ''**وإن استأجرها ليزني بها ثم أعطاهامهرهاأوماشرط لها لابأس بأخذه لأنه إجارة فاسدة ،فيطيب له وإن كان السبب حراما**'' (البحر الرائق ۸/۱۹)۔

بہت سے مفتیان کرام اس قسم کی ملازمت کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کا کہنا ہے کہ: پوری کوشش کرے کہ حلال ملازمت مل جائے، جب تک نہ مل سکے توبہ استغفار کرتا رہے (ڈاکٹر محمد شاہ جہاں ندوی، مولانا مفتی محمد مدثر قاسمی، مولانا شاکر نثار قاسمی اور مولانا مفتی عبدالاحد قاسمی)۔

رائے (۲) جواز:

کچھ مفتیان کرام نے بعض قیود کا اعتبار کرتے ہوئے جواز کا قول اختیار فرمایا ہے:

۱- مثلاً مفتی اقبال ٹنکاروی صاحب کی رائے ہے کہ: اصل کاروبار جائز کام کا ہو اور شراب وغیرہ کی ایڈورٹائز اور اس کا اشتہار بھی ہوتا ہو تو اصل ملازمت جائز ہے اور شراب سے متعلق کام سے بچنا چاہئے، ایسے ہی غیر مسلم کے مختلف کاروبار میں شراب کا بھی پیشہ ہے اور آمدنی سب کی مخلوط ہے تو اس کے یہاں ملازمت اور اس کی اجرت جائز ہوگی، بشرطیکہ مسلمان ملازم کی ڈیوٹی حرام کام پہ نہ لگائی گئی ہو۔

۲- مولانا مفتی راسخ الاسلام قاسمی لکھتے ہیں: ایسا بزنس جس میں آدھا حلال اور آدھا حرام ہو، کسی مسلمان کا ایسی ملازمت کرکے حساب کتاب اور لین دین وغیرہ کرنا جائز ہے اور اس کی تنخواہ بھی ناجائز نہیں، البتہ تقویٰ اختیار کرنا اولیٰ اور بہتر ہے، ''**وإنما المعصية في صورة اتخاذ المعصية بفعل المستأجر وهو مختار فيه فقطع نسبة ذلك الفعل عن الموجر**'' (فتح القدیر ۱۰/ ۷۳، وردالمحتار ۹/ ۵۶۲)۔

۳- مفتی سید محمد علی مدنی بھی جواز مع الکراہۃ کے قائل ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں: حرام کام میں تعاون کا گناہ ہوگا، تاہم اس کی تنخواہ بہرصورت کراہت تنزیہی کے ساتھ حلال ہوگی (اسی جیسی رائے مفتی ارشاد عالم آسامی اور خواجہ نظام یوسفی کی بھی ہے) استدلال اس عبارت سے ہے: ''**استأجر رجلا ليحمل له خمرا فله الأجر في قول أبي حنيفة**'' (ہندیہ ۱/ ۴۴۹) ''**وإن استأجره ليكتب له غناء بالفارسية أو العربية ، قيل : لا يحل له الأجر، والمختار أنه يحل**'' (بزازیہ، ۴/ ۴۵۰)۔

۴- مفتی نثار احمد گودھرا، مفتی نیاز احمد ندوی اور مفتی محمد برکت علی قاسمی نے اپنی آرا کا اظہار گو الفاظ کے فرق کے ساتھ کیا ہے، تاہم سب کا ماحصل مفتی نثار احمد گودھرا کے الفاظ میں یوں ہے: مال دونوں طرح کا ہے اور قرائن سے پتہ نہ چلتا ہو تو اس کیلئے اس کام کو انجام دینا، امام کرخیؒ کے قول کو بنیاد بناتے ہوئے درست ہوگا؛ لیکن کوئی اس سے احتراز کرے تو اس کے افضل ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔

۵-مولانا مفتی جمیل اختر جلیلی ندوی کی رائے ہے کہ: حلال کام کی تنخواہ حلال ہوگی اور حلال وحرام دونوں کے عوض تنخواہ ملتی ہو تو حلال کام کے بقدر تنخواہ حلال ہوگی اور حرام کام کے عوض ملنے والی تنخواہ کو صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

رائے (۳) غلبہ کا اعتبار:

اس سوال کے جواب میں بہت سے مقالہ نگاران نے غلبہ کی رائے کا اعتبار فرمایا ہے، چنانچہ مولانا رحمت اللہ ندوی تحریر فرماتے ہیں: اگر حلال کام کی مقدار زیادہ ہے تو آمدنی حلال ہوگی اور اگر حرام کام کی مقدار زیادہ ہے تو حرام کی نوعیت پر غور کیا جائے گا کہ آیا وہ ملازم حرام کام میں سبب بن رہا ہے یا مباشر؟ اگر سبب بن رہا ہے تو جائز، اور اگر مباشر بن رہا ہے تو ناجائز۔۔۔۔انہی خیالات کا بعینہ اظہار مولانا قمر الزماں ندوی نے بھی فرمایا ہے۔غلبہ کا اعتبار کرنے والوں میں: مولانا حافظ سید فاروق عمری مدنی، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا احمد مکین باندہ، مفتی شباب کوثری، مفتی شفیق کوثری، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا صابر حسین ندوی اور خود راقم الحروف کی بھی رائے غلبہ کے اعتبار کرنے کی ہے کہ جس کمپنی کی اکثر آمدنی ناجائز ہو تو اس حرام آمدنی سے اجرت حاصل کرنا جائز نہیں اور اگر آمدنی نصف حلال اور نصف حرام ہو تو بھی اجرت حرام ہوگی: "**إذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام**"، فتاوی ہندیہ میں ہے: "**فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام**" (۵/۳۴۲)۔

چونکہ سوال میں ہے: بزنس آدھا حلال اور آدھا حرام ہو اور کبھی کبھی دونوں کا کام کرنا پڑتا ہو تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو بہر حال اس صورت میں ملازمت، تعاون علی المعصیۃ کی بنا پر بالکل ناجائز ہونی چاہئے، مگر چونکہ مالک کے کاروبار میں نصف نصف کا تناسب ہے یا حرام کا غلبہ ہے تو بھی اس کی ملازمت جائز نہیں ہونی چاہئے؛ کیونکہ معاملات میں احتیاط کا پہلو حرمت کو اختیار کرنے میں ہے، الا یہ کہ وہ صراحت کردے کہ میں تنخواہ مال حلال سے دیتا ہوں تو اس کے جائز ہونے میں کس کو اشکال ہوسکتا ہے۔

سوال نمبر: (۹) حرام کمائی سے خرید کردہ جائدادوں میں کام کرنے، جیسے کھیتی باڑی کا کیا حکم ہے؟ اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا کیا حکم ہے؟ یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا کیسا ہے؟ نیز حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا کیسا ہے؟

چونکہ اس سوال کے کئی اجزا ہیں، اس لئے ہر ایک شق کے جواب میں جو آرا مقالہ نگاران کی سامنے آئی ہیں، ان کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جائے گا۔

شق (الف) حرام کمائی سے خرید کردہ جائدادوں میں کام مثلاً کھیتی باڑی کرنے کا حکم:

اس سوال کے دو پہلو مقالہ نگاران کے ذہن میں آئے ہیں، ایک تو یہ کہ حرام کمائی سے خرید کردہ زمین میں خود مالک کھیتی باڑی کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟ دوسرے، مالک کھیتی خود نہ کرے بلکہ کسی دوسرے سے کرائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اگر مالک خود کھیتی کرے تو اسے اس وقت تک جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا؛ جب تک کہ وہ حرام رقم، جس سے زمین خریدی گئی ہے، اس کے اصل مالک کو لوٹا نہ دے۔ (اس رائے کے قائلین میں مولانا مفتی محمد عثمان منصور پوری، مولانا احمد مکین باندہ، مولانا محمد تبریز عالم حلیمی، مولانا محمد زبیر ندوی اور مولانا محمد مغفور باندوی صاحبان ہیں، مولانا محمد مغفور صاحب نے مالک کی دو قسم: فقیر اور مالدار فرض کرنے کے بعد لکھا ہے کہ فقیر کھیتی کی پیداوار سے خرچ نکالنے کے بعد بقدر ضرورت پیداوار کو استعمال کرے گا اور ماقی کو صدقہ کرے گا، اور اگر مالک مالدار ہے اور اس حرام جائداد کے علاوہ بھی حلال مال موجود ہے تو اسے اس حرام جائداد سے استفادہ کا حق نہیں ہوگا، پیداوار کے اخراجات کو نکالنے کے بعد ماقی کو صدقہ کرے گا۔

اور اگر حرام کمائی سے خریدی زمین میں مالک کسی دوسرے آدمی سے کھیتی کراتا ہے تو اس کے جواب میں دو طرح کی آرا موصول ہوئی ہیں: جواز کی بھی اور عدم جواز کی بھی۔

جواز کے قائلین کے اسماء گرامی یہ ہیں:

مولانا صابر حسین ندوی، مولانا اختر امام عادل، مولانا مفتی محمد اشرف قاسمی، حافظ ڈاکٹر کلیم اللہ عمری، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، مفتی محمد مقصود فرقانی، مولانا محمد مدثر قاسمی، مولانا ضیاء الحق قاسمی، مولانا محمد صالح الزماں قاسمی ازہری، مولانا محمد شاکر نثار اعظمی مدنی، مولانا نیاز احمد ندوی، مولانا مفتی امانت علی قاسمی، مفتی ارشاد عالم قاسمی آسامی، مفتی محمد ریاض ارمان قاسمی، مولانا مفتی محمد عثمان گورینی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مولانا ابوبکر قاسمی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا راسخ الاسلام قاسمی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا خواجہ نظام یوسفی، مولانا مطیع الرحمٰن قاسمی، مفتی شکیل منصور قاسمی، مولانا سید محمد علی مدنی، مولانا سعد نور قاسمی، مولانا عبد الاحد قاسمی، مولانا عبد الرشید قاسمی کانپور، مولانا محمد صادق مبارکپوری، مولانا محمد عمار مزمل قاسمی، مفتی اقبال ٹنکاروی، مفتی جمیل احمد نذیری، مفتی محمد برکت علی قاسمی اور مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی اور راقم کی بھی رائے جواز کی ہی ہے بشرطیکہ مال حرام سے متعین کرکے اجرت نہ دے، یہ شرط مفتی محمد عفان منصور پوری، مولانا ممتاز خان ندوی اور مولانا عبد الرشید کانپور نے بھی لگائی ہے۔ مفتی محمد عثمان گرینی صاحب نے جواز کو اجرت کے عین مال حرام سے دینے کے علم نہ ہونے کے ساتھ مشروط کیا ہے، یا یہ گمان ہو کہ اجرت، مجموعۂ حلال سے دی جارہی ہے۔

فقہ البیوع کی اس عبارت سے استدلال کیا گیا ہے: ''**وقد روی عن الإمام محمد حل الانتفاع بقدر**

الحلال بصراحة .....الخ" (فقہ البیوع ۲/۱۰۲۱، ۱۰۲۷، ۱۰۳۴)، "**رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى ،فهذا على خمسة أوجه ....الخ**"۔

مفتی محمد مقصود فرقانی رامپوری نے جواز کو ضرورت کے ساتھ مقید فرمایا ہے۔

دوسری رائے: عدم جواز کی:

اس رائے کے قائلین کے اسماء گرامی یہ ہیں: مولانا مفتی شاہ جہاں ندوی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مولانا محمد شفیق بڑودوی، مفتی سلیم الدین قاسمی، مولانا حبیب اللہ قاسمی، مفتی نثار احمد گودھرا، مفتی خلیل احمد دساڑا، مفتی محمد شباب کوثری، مفتی شفیق کوثری، مولانا اکرم رشید رحمانی، ڈاکٹر عبدالہادی باقوی قاسمی، اور مفتی فیاض احمد محمود برمارے صاحبان۔

ان حضرات علماء کرام نے مال حرام سے خریدی زمین میں کاشتکاری، خواہ مالک کرے یا کوئی ملازم، دونوں جائز نہیں۔ استدلال میں قرآنی آیت پیش کی ہے: **ولاتعاونوا على الاثم والعدوان** (مائدہ/۲) (مولانا شاہجہاں ندوی، مفتی محمد سلیم الدین قاسمی) وقولہ تعالیٰ: "**ولاتتبدلوا الخبيث بالطيب**" (نساء/۲) (مفتی محمد شفیق بڑودہ) "**أهدى إلى رجل شيئاأو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلابأس**" **الخ** (ہندیہ ۵/۳۴۲) (مقالہ: مفتی محمد شباب کوثری ومفتی شفیق کوثری) مؤخر الذکر دونوں حضرات اور مفتی محمد شفیق بڑودہ کے یہاں عدم جواز اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مالک کا غالب مال، حرام کے قبیل سے ہو۔

شق (ب): حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کا حکم:

اس شق کے جواب میں مقالہ نگاران نے دو شقیں نکالی ہیں: (۱) یا تو نوکری کی اجرت مالِ حلال سے دے گا، (۲) یا نوکری کی اجرت مال حرام سے دے گا۔

اگر اجرت مالِ حلال سے دے تو نوکری کرنا جائز اور اگر مالِ حرام سے اجرت دے تو نوکری کرنا، ناجائز ہوگا۔ یہی رائے مولانا شاہجہاں ندوی، مولانا سعید احمد ندوی، مفتی محمد ابراہیم ورتھی، مولانا صفوان احمد حلیمی، مولانا صالح الزمان قاسمی ازہری اور مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی صاحبان کی ہے۔ بعض حضرات نے نوکری کے جواز کے لئے غالب مال کے حلال ہونے کی قید لگائی ہے، مثلاً مولانا محمد مزمل قاسمی، مفتی اقبال ٹنکاروی صاحبان نے جواز ملازمت کے رائے دی ہے اور احتراز کرنے کو اولیٰ بتایا ہے۔ قاضی وصی احمد قاسمی، مولانا عبدالرشید قاسمی کانپوری صاحبان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ مال مخلوط سے اجرت دے تو جواز اور اگر مال حرام سے دیتا ہے اور اجیر جانتا بھی ہے تو عدم جواز اور اگر اجیر کو کوئی تفصیل نہیں معلوم ہے تو جائز

ہے، کچھ حضرات نے عدم جواز کو غالب مال حرام کیساتھ مشروط کیا ہے، مولانا عبدالاحد قاسمی نے عدم جواز کو مقید فرمایا ہے کہ اس کا مال بالیقین حرام ہوتو ملازمت اس کے جائز نہ ہوگی، مولانا محمد عثمان گورینی نے جواز ملازمت کو اجیر کو اجرت کے عین مال حرام سے ہونے کا علم نہ ہونے کے ساتھ مقید کیا ہے، اسی طرح مفتی عفان منصور پوری صاحب نے جواز کو اجرت کے مال حرام سے نہ دینے کے ساتھ مشروط فرمایا ہے، مولانا محمد مغفور ندوی اور مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی نے لکھا ہے کہ حلال کام کی اجرت حلال ہوگی اور حرام کام کی اجرت حرام ہوگی، وعلی ہذا القیاس مولانا سید فاروق عمری مدنی نے جائز ملازمت کو جائز ٹھہرایا ہے اور مفتی نثار احمد گودھرا نے ملازمت کو مکروہ اور اس کی آمدنی کو حلال لکھا ہے۔

شق (ج): مال حرام سے خریدی گئی بائک یا کار پر سواری کرنے کا مسئلہ:

اس مسئلہ کے جواب میں جواز وعدم جواز، دونوں طرح کی آرا موصول ہوئی ہیں اور پھر ہر ایک میں کچھ شرطیں بھی ملحوظ رکھنے کی بات بھی کہی گئی ہے۔

عدم جواز کی رائے کے قائلین میں مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد مفتاحی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی، مولانا محمد ممتاز خان ندوی، مولانا محمد الیاس قاسمی، مفتی راسخ الاسلام قاسمی، مولانا محمد زبیر ندوی اور مولانا وصی احمد قاسمی ہیں، مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مولانا وصی احمد قاسمی، نیز مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے عدم جواز کی دلیل، نکیر کے فقدان اور انتفاع من المال الحرام کو بنیاد بنایا ہے؛ کیونکہ فرمان باری ہے: "**لولا ينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم و أكلهم السحت ، لبئس ما كانوا يصنعون**" (مائدہ/ ۶۳)، شامی کی یہ عبارت بھی ذکر کی گئی ہے: "**اشترى بالثوب المغصوب جارية يحرم عليه وطؤها حتى يدفع قيمة الثوب إلى صاحبه، وأن الصحيح لايحل له الأكل ولاالوطى لأن فى السبب نوعَ خبث**" (شامی ۹/ ۲۷۸)، بذل المجہود کی یہ عبارت بھی پیش نظر ہے: "**صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق أو بغير عقد كالسرقة والغصب و الخيانة والغلول ففى جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه**" (بذل المجہود: ۱/ ۳۷، سہارنپور)۔

مفتی راسخ الاسلام قاسمی لکھتے ہیں: حرام کمائی سے خریدی بائک کا کسی بھی طرح استعمال جائز نہیں۔ آگے لکھتے ہیں: البتہ جتنے پیسوں کی بائک خریدی گئی ہے، اگر اتنی رقم، حلال مال سے صاحب مال کو ادا کردے یا ان کی طرف سے صدقہ کردے تو اس بائک کا استعمال خود اس کے لئے اور دوسرے کے لئے بھی حلال ہوگا (مقالہ: مفتی راسخ الاسلام قاسمی)

قاضی وصی احمد قاسمی لکھتے ہیں: اگر گاڑی کا مالِ حرام سے ہونا متعین ہو یا غالبِ مال حرام سے خریدی گئی ہو تو "**الحرمة تتعدى مع العلم بها**" کے تحت اس پر سواری کرنا درست نہیں، یہی رائے مولانا احمد مکین باندہ، مولانا شباب

کوثری اور مولانا شفیق کوثری کی بھی ہے۔

مقالہ نگاران کی دوسری رائے بائک پہ سواری کے جواز کی ہے، مولانا اختر امام عادل صاحب رقمطراز ہیں: حرام کمائی کرنے والے شخص کے ساتھ گاڑی یا بائک پر سفر کرنے میں کچھ بھی حرج نہیں؛ کیونکہ ضروری نہیں کہ گاڑی یا اس کا سفر خرچ حرام آمدنی ہی سے ہو اور اگر ہو بھی تو اس کی ذمہ داری براہ راست گاڑی والے پہ عائد ہوتی ہے، نہ کہ اس کے ساتھ سفر کرنے والے پر، مولانا سعید احمد ندوی بھی جواز کے قائل ہیں، مگر وہ کہتے ہیں کہ گاڑی اگر سودی قرض سے لی گئی ہو تو سفر کرنا اس میں جائز ہے؛ کیونکہ گاڑی کے لئے سودی قرض لینا یقیناً حرام ہے، سودی قرض لینے والا، قرض دینے والے کو اصل قرض کی واپسی کے ساتھ جو مزید رقم دیتا ہے، وہ شرعاً سود ہے، لیکن سودی قرض میں جو پیسے قرض لینے والے کو ملتا ہے، وہ قبضہ کے بعد اس کا مالک ہو جاتا ہے، نیز وہ قرض واپس کر کے اس کا عوض لوٹا دیتا ہے، اس لئے یہ پیسے اس کے لئے حرام نہیں اور ان سے خریدی ہوئی گاڑی میں سوار ہونا جائز ہے، بدائع کی اس عبارت سے سودی قرض پر قبضہ کے بعد ملکیت کو ثابت کیا گیا ہے: ''**وأما حكم القرض فهو ثبوت الملك للمستقرض في القرض للحال و ثبوت مثله في ذمة المستقرض للحال وهذا جواب ظاهر الرواية ، وروى عن أبي يوسف في النوادر ؛لايملك القرض بالقبض ما لم يستهلك**'' (بدائع: ۱۰/۶۰۰)، اسی طرح سودی قرض کی شرط کے ساتھ گاڑی میں سفر کرنے کے جواز کی بات مولانا محمد ریاض امان قاسمی نے بھی لکھی ہے اور اس سلسلے میں ناچیز راقم کی بھی یہی رائے ہے اور دار العلوم دیوبند کا فتوی سودی قرض سے حاصل کردہ گاڑی میں سفر کرنے کے جواز کی بات کو بطور استدلال پیش کیا ہے۔ مولانا روح الامین سعادتی نے جواز کو مشروط کیا ہے کہ گاڑی کے عین مال حرام سے خریدنے کا ظن غالب نہ ہو، مفتی محمد مقصود فرقانی نے ضرورۃً جواز کی بات لکھی ہے، مفتی محمد ابراہیم ورتھی، مفتی برکت علی قاسمی اور مولانا عمار مزمل قاسمی نے جواز کے قول کو کراہت کے ساتھ مقید کیا ہے، مفتی محمد جمیل اختر جلیلی ندوی نے جواز لکھا ہے مگر خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، مولانا محمد تبریز عالم اور مولانا عبد الاحد قاسمی نے سواری نہ کرنے کو احتیاط لکھا ہے۔

شق (د): حرام کمائی والے شخص کے بچوں کی اسکولی فیس کی وصولی:

جس شخص کی کمائی حرام ہے، اس کے بچے مدارس یا اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو ان سے فیس کی وصولی جائز ہے یا نہیں؟

اس کے جواب میں مفتیان کرام کی دو بنیادی آرا ہیں: ایک جواز کی، دوسرے عدم جواز کی، پھر جواز و عدم جواز، ہر ایک میں کچھ قیود کی بات کہی گئی ہے۔

عدم جواز کی رائے:

اگر فیس دینے والا مال حرام متعین کر کے یا حرام کی صراحت کے ساتھ دیتا ہے تو عدم جواز کی رائے ہے اور اگر صراحت

کر کے نہ دے تو جواز کا قول ہے (یہی رائے ہے مفتی عبدالرشید کانپوری، مفتی سید محمد علی مدنی، مولانا عبدالاحد قاسمی، مولانا سعد نور قاسمی، مولانا ضیاء الحق قاسمی، مولانا محمد عمار مزمل قاسمی، مفتی امانت علی قاسمی، مولانا رحمت اللہ ندوی، مفتی جمیل احمد نذیری اور راقم اشتیاق اعظمی کی بھی یہی رائے ہے۔ عقد ونقد پر حرام کا اجتماع نہ ہو تو جواز کا قول ہے مفتی شکیل منصور قاسمی کا، حرام ہونے کا علم نہ ہو تو جواز کی رائے دی ہے مفتی محمد عثمان گورینی اور قاضی وصی احمد قاسمی نے، اگر غالب مال حرام ہو تو عدم جواز کا قول ہے مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی، مولانا ممتاز خان ندوی، مولانا محمد الیاس قاسمی، مولانا احمد مکین باندہ، مفتی شباب کوثری، مفتی شفیق کوثری اور مفتی محمد شفیق بڑودہ وغیرہ کا)۔

جواز علی قول الامام الکرخی کے قائل یہ حضرات ہیں: مولانا سعید احمد ندوی، مفتی محمد صادق مبارکپوری، مولانا ممتاز خان ندوی، اور مولانا عبدالرشید کانپوری نے مع عدم العلم بالحرام کی قید کے ساتھ جواز کو مقید کیا ہے۔ حلال مال سے دے تو جائز اور اگر حرام مال سے دے تو حرام ہے (مفتی محمد صالح الزماں قاسمی، مفتی خلیل احمد دساڑا، مفتی ریاض امان قاسمی، مفتی محمد اشرف قاسمی اور مفتی محمد راسخ الاسلام قاسمی)۔ غالبِ مال حرام ہے تو فیس کے عدم جواز کے استدلال میں ہندیہ کی یہ عبارت پیش کی گئی ہے جو اس سے قبل بھی گذر چکی ہے: "**أهدىٰ إلى رجل شيئا أو أضافه إن كا ن غالب ماله من الحلال فلابأس**"، محمود الفتاویٰ میں بھی غالبِ مال کے حرام ہونے پر عدم جواز کی بات کہی گئی ہے..... ہمارے اکابر کے فتاویٰ اس طرح کے معاملات میں چونکہ دونوں طرح (جواز وعدم جواز) کے ہیں، اس لئے مقالہ نگاران نے ان دونوں ہی سے استدلال فرمایا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا فتوی نمبر ۱۴ / ۳۹۸، اور فتوی نمبر ۱۴ / ۳۹۵، اس کا یہ جز بطور خاص قابل استدلال ہے: ''اسی طرح ڈاکٹروں اور طبیبوں کو جو فیس ملے وہ بھی قطعی حرام نہیں، ہاں احتیاط ہے کہ اس کو صدقہ کر دے''۔ حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ تحریر فرماتے ہیں: '' آمدنی اگرچہ سب ناجائز ہو؛ لیکن جب تک متعین طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ جو چیز یہ فروخت کر رہا ہے، یہ حرام وناجائز ہے، یا جو قیمت یہ دے رہا ہے، وہ حرام وناجائز پیسے کی ہے، اس کے ہاتھ خرید وفروخت کا ناجائز ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے حاصل شدہ رقم کا حرام وناجائز ہونا ضروری ہے'' (منتخبات نظام الفتاویٰ ۳/ ۸۵) (مقالہ: مولانا اکرم رشید رحمانی، لوناواڑہ)۔

عدم جواز پر مبنی علماء دیوبند کے فتاوے:

فتاویٰ رشیدیہ، امداد الفتاویٰ، فتاویٰ محمودیہ، فتاویٰ رحیمیہ، احسن الفتاویٰ، محمود الفتاویٰ، کتاب النوازل، اور فتاویٰ قاسمیہ وغیرہ میں اس مسئلہ میں عدم جواز کی بات کہی گئی ہے، انہی فتاویٰ کو بنیاد بنا کر عدم جواز کے قائلین نے استدلال فرمایا ہے، طوالت کے باعث، ان کے ذکر سے صرف نظر کی گئی ہے، (دیکھئے: مقالہ: مولانا اکرم رشید رحمانی)۔

سوال نمبر:(۱۰) آجکل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے ایک خطیر رقم رشوت دے کر لی جاتی ہے، کیا اس پر سود کی رقم کا استعمال جائز ہے؟

اس سوال کے جواب میں مقالہ نگاران کی دو بنیادی آرا، جواز وعدم جواز کی موصول ہوئی ہیں:

بنیادی بات سودی رقم کے مصرف کی ہے؛ کیونکہ سود کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، فرمان باری ہے: ''**أحل الله البيع وحرم الربوا**'' (بقرہ/۲۷۵)، دوسری بات رشوت کی بابت ہے، رشوت لینا اور دینا عام حالات میں دونوں حرام ہیں، ''**عن عبد الله بن عمروؓ قال: لعن رسول الله ﷺ الراشي والمرتشي**'' (مرقاۃ المفاتیح ۷/۲۹۵)۔

اپنے جائز ثابت شدہ حق کے حصول کے لئے بشرط ضرورت شدیدہ، جب کہ کوئی دوسرا متبادل نہ ہو تو مجبوراً رشوت دینے کی گنجائش ہے۔ شامی میں ہے: ''**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ،ليس برشوة يعنى فى حق الدفع**'' (شامی، الحظر والاباحۃ ۹/۶۰۷) (مقالہ مولانا محمد عفان منصور پوری، مفتی محمد ابراہیم وریٹھی، مولانا محمد صابر حسین ندوی، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی۔

لیکن رشوت میں سودی رقم دینا جائز ہے یا نہیں؟

تقریباً تمام مقالہ نگاروں کی رائے میں سود کی رقم اپنے ذاتی کام کے لئے بطور رشوت دینا جائز نہیں، کیونکہ سود بھی حرام ہے اور رشوت دینا بھی حرام ہے، اس لئے سودی رقم ذاتی مفاد میں استعمال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

ہاں مدارس یا دیگر رفاہی اداروں کے تعمیری نقشوں کی منظوری کی بابت کارپوریشن یا متعلقہ اداروں کو سودی رقم بطور رشوت دینے کے کئی مقالہ نگاران نے حالات حاضرہ کے تناظر میں گنجائش دی ہے (مفتی محمد اشرف قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی، مولانا رحمت اللہ ندوی،، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبدالاحد قاسمی وغیرہ نے مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا محمد رفیع عثمانی اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم کے فتاویٰ کی روشنی میں رفاہی امور میں سودی رقم دینے کے جواز کی بات لکھی ہے، کچھ مقالہ نگار حضرات نے سود کو بطور رشوت دینے کی گنجائش کی بنیاد یہ بنائی ہے کہ رشوت لینے والے افسران، چونکہ حکومت ہی کے نمائندے ہوتے ہیں، اگر وہ رشوت کی رقم حکومت کو نہیں پہنچاتے تو اس میں وہ خود خائن ہیں نہ کہ رشوت دینے والا کا اس میں کوئی قصور ہے، انہی خیالات کا اظہار مولانا اختر امام عادل نے فرمایا ہے، اور اسی جیسی بات مولانا عبدالرشید قاسمی کانپور نے بھی لکھی ہے کہ: حکومت بہت سے محکموں کے افسران کی تنخواہ بہت معمولی متعین کرتی ہے؛ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یہ رشوت میں موٹی موٹی رقمیں وصول کرتے ہیں۔ گویا حکومت رشوت خوری کرنے پر ان لوگوں کی پشت پناہی کرتی ہے اور وہی اس کی مسبب ہے، اور حقیقت بھی کچھ اسی طرح کی ہے کہ رشوت کے پیسے نیچے سے اوپر تک کے ادھیکاریوں کو پہنچائے جاتے ہیں، اسی لئے حکومت اس قسم

کے رشوت خوروں پر کبھی قدغن بھی نہیں لگاتی، جب کہ وہ سب کچھ جانتی ہے، ایسے میں رشوت کی رقم گویا حکومت کو حکماً پہنچتی ہے، اس لئے سود کی رقم رشوت میں دینے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

بعض مقالہ نگار نے حیلۂ تملیک کو اختیار کر کے سودی رقم رشوت میں دینے کی گنجائش دی ہے، جیسے مولانا عبدالحکیم قاسمی، مولانا ارشاد عالم آسامی، مفتی اقبال ٹنکاروی اور مولانا عمار مزمل قاسمی نے یہی رائے اختیار فرمائی ہے۔

کچھ مقالہ نگار حضرات نے لکھا ہے کہ اگر رشوت کی رقم سرکاری ادارہ میں جمع ہوتی ہو تو جائز ہوگا ورنہ نہیں (مفتی نثار احمد گودھرا، مولانا کامران سعید رشادی، مولانا ممتاز خان ندوی اور مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی)

مفتی محمد عثمان گورینی صاحب نے مدارس اور اغنیاء کے لئے بطور خاص عدم جواز کی رائے دی ہے اور اگر صاحب معاملہ فقیر شخص ہو تو سودی رقم بطور رشوت دینے کو جائز قرار دیا ہے، مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی، مولانا محمد مدثر قاسمی اور مفتی محمد مقصود فرقانی نے مطلقا جواز کی بات کہی ہے۔

سوال نمبر: (۱۲) جس کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دیگر موقع پر دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کرنے کے لئے کہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: بیشتر مقالہ نگار نے حرام کمائی والے کے بچہ کے نام رکھنے کے موقع پر دعا کرنے اور پانی پر دم کرنے کی اجازت دی ہے۔ بیشتر حضرات علماء نے دعا کے جواز کی یہ دلیل دی ہے کہ مال حرام کمانے والا شخص ہے تو مسلمان؛ لیکن فاسق، اور فاسق کے حق میں دوسرے مسلمان کا دعا کرنا جائز ہے؛ بلکہ کافر کے حق میں مغفرت کے علاوہ، ہدایت وعافیت کی دعا کرنا ثابت اور جائز ہے تو مسلمان فاسق کے حق میں بدرجۂ اولیٰ جائز ہوگا۔

کافروں کے حق میں دعا کے جواز کی دلیل:

(۱) بخاری شریف کی یہ روایت: ''**اللهم أعنی علیه بسبع کسبع یوسف**''، اس بددعا کے بعد ابوسفیان نے حضور اکرم ﷺ سے کہا: ''**إن قومک قد هلکوا فادع الله أن یکشف عنهم ،فدعا**'' (بخاری/ ۸۴۲۴)۔

دلیل (۲):

نماز جنازہ کی دعا: ''**اللهم اغفر لحینا ومیتنا و شاهدنا و غائبنا.....**'' ملا علی قاریؒ نے اس دعا میں جمع کا صیغہ لانے کا مقصد یہ بیان فرمایا کہ یہ تمام مسلمانوں (فاسق وغیر فاسق) سب کو شامل ہو جائے (مرقاۃ ۳/ ۱۲۰۸)۔ مال حرام کمانے والے کی جنازہ کی نماز میں بھی یہ دعا پڑھی جاتی ہے تو اس کے بچوں کے حق میں دعا کرنا بھی جائز ہوگا۔

دلیل (۳)

علاوہ ازیں حرام کمائی والے کی دعا کے عدم قبولیت کا بیان جو حدیث پاک میں مذکور ہے، اس کا تعلق من باب الترہیب ہے، اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ اس کو اپنے لئے دعا کرنی ہی نہیں چاہئے کہ یہ اللہ تعالی کی رحمت عامہ سے مستبعد بات ہے؛ جبکہ اللہ تعالی کافروں کی بھی دعا قبول فرماتے ہیں، حدیث میں وارد ہے: "**اتق دعوة المظلوم وإن كانت من كافر ليس لها حجاب دون الله عز وجل**" (الدعاء للطبرانی) (مقالہ: مولانا اختر امام عادل)۔

رہا پانی پہ دم کرنے کا مسئلہ: تو بیشتر مقالہ نگار نے اس کی گنجائش دی ہے، بعض حضرات نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے، جس میں ڈسے ہوئے سردار پر سورۂ فاتحہ دم کرکے اجرت لینا منقول ہے (تفصیل بخاری شریف میں موجود ہے) (مقالہ: مولانا محمد مغفور باندہ)

ڈاکٹر مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی نے از راہ تقویٰ دعا اور پانی پر دم کرنے اور ایسے مال حرام کے استعمال کرنے والوں کی محفلوں میں جانے سے بچنے کو کہا ہے؛ تاکہ انہیں تنبہ حاصل ہو اور وہ اپنی حرکتوں سے باز آسکیں۔

جملہ مقالہ نگاران میں سے صرف مولانا مفتی محمد صادق مبارکپوری نے دعا کے عدم جواز کی بات کہی ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

تفصیلی مقالات

مال حلال وحرام کے احکام

مفتی محمد عثمان بستوی☆

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين أما بعد!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"**يـأيهـا الـذيـن آمـنـوا أنـفـقـوا من طيبت ما كسبتم و مما أخرجنا لكم من الأرض ولا تيمموا الخبيث منه تنفقون ولستم بآخذيه إلا أن تغمضوا فيه**" (سورہ بقرہ:۲۶۷)۔

"**يا أيها الرسل كلوا من الطيبت واعملوا صالحا**" (سورہ مومنون:۵۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسب حلال اعمال پر مقدم ہے اور صلاح وتقوی کا پیدا ہونا اکل حلال کا نتیجہ ہے (یعنی حلال کھانے سے آدمی کے اندر تقوی پیدا ہوتا ہے اور اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے)، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ بعض آدمی طویل سفر کرتے ہیں (یعنی طلب علم اور کار خیر میں) پراگندہ حال، غبار آلود، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعاء کرتے ہیں، ان کی دعاء کیسے قبول ہوگی؛ جبکہ ان کا کھانا حرام ہے اور لباس حرام کا ہے اور غذا حرام کی ہے (مسلم شریف ترغیب فی الزکاۃ ۲/ ۳۴۴)۔

اور ارشاد فرمایا:"**لا يدخل الجنة لحم نبت من السحت و كل لحم نبت من السحت كانت النار أولى به**" (مشکوۃ شریف، ترغیب ۷/ ۵۴۳ و ۹۴۳)۔

اور ارشاد فرمایا:" حلال روزی کا تلاش کرنا فرائض کے بعد فرض ہے"۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:" اللہ تعالیٰ اس شخص کو دوست رکھتا ہے جو مؤمن ہو اور (حلال روزی) کماتا ہو"، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمایا:"**يـا سـعـد أطـب مـطـعمك تكن مستجاب الدعوة**" (ترغیب ۲/ ۳۴۴)۔

(اے سعد! حلال کھانے کی عادت بناؤ مستجاب الدعوات بن جاؤ گے)، یعنی رزق حلال کی یہ برکت ہوگی کہ تم جو

☆ استاذ ومفتی مدرسہ عربیہ ریاض العلوم گورینی، جونپور

دعاء مانگو گے وہ قبول ہوگی اور اکل حرام کی نحوستوں میں سے ایک نحوست یہ ہے کہ اس کی وجہ سے دعاء قبول نہیں ہوتی۔

اس مختصر تمہید کے بعد چند باتیں اصولی طور پر تحریر کی جاتی ہیں:

(۱) موجودہ ہندوستان کا حکم:

ہندوستان کی حالت اہل اسلام کے حق میں امن وامان کے اعتبار سے انگریزوں کے زمانے سے بہتر نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس سے بدرجہا بدتر ہوتی محسوس ہورہی ہے، ناپاک عزائم اور منصوبے تیار کئے جاچکے ہیں اور اس کا کھلم کھلا اعلان بھی کیا جارہا ہے، اور شعائر اسلام کو انگریزوں کے زمانے میں قانونی اعتبار سے جو تحفظ حاصل تھا اب تو اس کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں وہ ایسا خواب معلوم ہوتا ہے جس کی تعبیر کی کوئی امید بھی نظر نہیں آتی اور اس ملک کی شرعی حیثیت کیا ہے تحقیقی طور پر اس کو سمجھنے کے لئے ابوحنیفۂ وقت حضرت اقدس گنگوہی قدس سرہ نے رسالہ مرتب فرمایا ہے جو تالیفات رشیدیہ کے ص: ۶۵۵ تا ۶۶۸ پر موجود ہے، یہ رسالہ نہایت ہی محقق، مدقق اور حضرات اکابر کی آراء کا مظہر بھی ہے، ومن شاء فلیراجع۔

لہٰذا حکم شرعی کے اعتبار سے جو حکم انگریزوں کے زمانے کا تھا وہی حکم بدرجہ اولیٰ موجودہ ہندوستان کا بھی ہوگا، حکم شرعی کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۲) غیر اسلامی ممالک میں سود کی حرمت:

غیر دارالاسلام میں سود کی حرمت مجتہد فیہ مسائل میں سے ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک سود کے نام پر لیا جانے والا مال، مال غیر معصوم میں داخل ہونے کی وجہ سے سود میں داخل نہیں، بلکہ مال فیٔ میں داخل ہے، البتہ جمہور فقہاء اس صورت میں بھی سود کو حرام قرار دیتے ہیں، یہی رائے احناف میں قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہے اور اسی کے قائل امام مالک وشافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ بھی ہیں، البتہ فقہاء مالکیہ میں ابن رشد رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے جواز کے قائل نظر آتے ہیں۔

اس مسئلے پر دلائل جانبین کے پاس ہیں جس میں موازنہ کا بندہ نہ تو اہل ہے اور نہ ہی ہمارا منصب ہے اور نہ ہی قلت اوراق اس کی اجازت دیتے ہیں، دلائل کے لئے کتب فقہیہ اور اعلاء السنن بھی دیکھی جاسکتی ہیں، البتہ ضرورت ومجبوری کے وقت طرفین کے قول پر عمل کی گنجائش حضرات اکابرین نے ہمیشہ دی ہے اور ان کے قول سے امت کے لئے یسر وسہولت کی راہ نکال لینا علماء امت کا دستور وطریقہ رہا ہے، لہٰذا ضرورت ومجبوری کے وقت اسی طرح حرج وتنگی اور مشقت سے بچنے کے لیے بھی طرفین کے قول کو بقدر ضرورت اختیار کرنے کی بہرحال گنجائش ہے۔

(۳) سود مال مملوک ہے یا غیر مملوک:

دار الکفر میں لیا گیا سود ''مال حرام مملوک بشراء فاسد'' کے حکم میں داخل ہے، کیونکہ اس کی حرمت مجتہد فیہ اور مختلف فیہ ہے خواہ ربا فضل ہو یا ربا نساء ہو یا ربا قرض ہو، اسی طرح حربی کا مال مغصوب اور مال مسروق جس میں استیلاء کامل ہو جائے تو وہ بھی ''مال حرام مملوک بشراء فاسد'' میں داخل ہے۔

''ذكر البزدوی رحمه الله تعالیٰ فی غناء الفقهاء ''من جملة صور البيع الفاسد جملة العقود الربوية، يملك العوض فيها بالقبض'' (البحر الرائق، باب الربوا ۶/ ۱۲۵، شامی ۷/ ۴۰۰، م زکریا)۔

و حاصله: أنه إذا حرم الفعل وهو الأكل لايلزم منه أن يكون الأكل حراما، لأنه قد يكون المأكول حراماً كالميتة و ملك الغير، و قد لايكون حراماً كما هنا، و كالمشرى فاسداً بعد قبضه لأنه ملكه و مثله ما لودخل دار الحرب بأمان و سرق منهم شيئاً و أخرجه إلى دارنا ملكه ملكاً خبيثاً يجب عليه رده عليهمْ و كذا لو غصب شيئاً واستهلكه بخلط و نحوه حتى ملكه ولم يؤد ضمانه يحرم عليه التصرف فيه بأكل و نحوه و إن كان ملكه'' (شامی ۷/ ۳۷۳، زکریا)۔

بحر اور درمختار وغیرہ کی عبارتوں سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ غیر اسلامی ممالک کا سود وغیرہ مال حرام مملوک ہے، یعنی ادائے بدل سے قبل اس میں تصرف جائز نہیں، لیکن ملکیت بہر حال ثابت ہے، اور جب غیر اسلامی ممالک کا سود حرام مملوک ہوا تو اگر وہ عروض واجناس کی قبیل سے ہے تو اس کا ربح حلال نہیں، لیکن اگر وہ نقود یعنی دراہم ودنانیر کی شکل میں ہے تو اس کا ربح حلال اور طیب ہے، اسی طرح حرام مملوک عروض واجناس جب نقود میں تبدیل کر دیے جائیں، پھر ان نقود سے نفع حاصل ہو تو وہ بھی حلال ہوگا جس کی تصریح علامہ طحطاوی نے کی ہے، اس لیے کہ جب اس پر شراء فاسد کے احکام مرتب ہوتے ہیں تو شراء فاسد میں مبیع یعنی عروض واجناس کا ربح طیب نہیں ہوتا؛ لیکن اگر اس کو نقود میں تبدیل کر دیا جائے تو نقود کا ربح حلال ہوجاتا ہے، اسی طرح جب اس کو فروخت کر کے نقود میں تبدیل کر دیا جائے تو اس کا ربح بھی حلال ہوجانا چاہئے۔

''لايطيب (للمشترى) ما ربح فی بيع يتعين بالتعيين بأن باعه بأزيد لتعلق العقد بعينه فتمكن الخبث فی الربح فيتصدق به قوله (بأن باعه بأزيد) تصوير لظهور الربح فلا يطيب له ذلك الزائد عما اشترى به، و أفاد أن ذلك فی أول عقد، و أما إذا أخذ الثمن واتجر و ربح بعده أيضاً يطيب له لعدم التعين فی العقد الثانی كما نبه عليه، ط، وهوظاهر كما مر'' (الدر المختار مع رد المحتار ۷/ ۲۲۹ م زکریا)۔

(۴) شبہ کا اعتبار ہے شبہۃ الشبہۃ کا اعتبار نہیں:

نفع کے حلت وحرمت کا ایک ضابطہ یہ ہے کہ جب حرام مملوک ''مما یتعین'' یعنی عروض کی قبیل سے ہوتو اس سے حاصل ہونے والے نفع میں شبہۃ الخبث ہوتا ہے، لہٰذا ربح طیب نہیں ہوگا، لیکن اگر حرام مملوک ''**مما لایتعین بالتعیین**'' یعنی نقود دراہم ودنانیر کی قبیل سے ہوں تو اس کے نفع میں شبہۃ شبہۃ الخبث پایا جاتا ہے اور شریعت مقدسہ میں شبہ کا تو اعتبار ہے شبہۃ الشبہۃ کا نہیں، اسی وجہ سے مبیع کا نفع بیع فاسد میں طیب نہیں، بلکہ واجب التصدق ہے، اور ثمن کا نفع طیب ہے واجب التصدق نہیں، لیکن اگر حرام غیر مملوک ہوتو اس میں حقیقت الخبث پایا جاتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے نفع میں تفصیل یہ ہے کہ حرام غیر مملوک ''**مما یتعین بالتعیین**'' یعنی عروض کے نفع میں خبث حقیقتاً پایا جاتا ہے، کیونکہ حرام مملوک ''**مما یتعین**'' کی ذات سے عقد متعلق ہوتا ہے، لہٰذا اس کے نفع میں خبث حقیقتا موجود ہوگا، کیونکہ یہ مال غیر کا بدل ہے، اس لیے اس کا تصدق واجب ہے اور حرام غیر مملوک ''**مما لایتعین**'' کی ذات میں اگر چہ حقیقت الخبث ہوتا ہے، لیکن اس سے حاصل ہونے والے نفع میں شبہۃ الخبث پایا جاتا ہے، اس لئے کہ ثمن غیر مملوک کے ذریعہ سے جو چیز حاصل کی جائے گی تو وہ چونکہ غیر مملوک کا بدل ہوگی، اس لیے اس میں بھی حقیقت الخبث ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ جو حکم اصل کا ہوتا ہے وہی بدل کا ہوتا ہے، لیکن ثمن چونکہ ذمہ میں لازم ہوتا ہے، لہٰذا اس کا بدل یہ مال غیر کا بدل نہیں؛ بلکہ مافی الذمہ کا بدل ہے؛ البتہ مال غیر ہی حصول ربح کا سبب اور ذریعہ ہے، اس لیے اگر چہ یہ مال غیر کا ربح حقیقتاً نہیں، لیکن شبہتً مال غیر کا ربح ہے، لہٰذا یہ نفع بھی طیب نہیں، تو حاصل یہ نکلا کہ مال غیر مملوک چاہے مما یتعین کی قبیل سے ہو یا ''مما لایتعین'' کی قبیل سے ہو اس کا نفع خبیث اور واجب التصدق ہوگا (تبیین الحقائق ۷/ ۴۰۷، شامی ۷/ ۲۹۹، البحر الرائق ۶/ ۹۸، فتح القدیر معہ ہدایہ ۴/ ۴۷۳)۔

تحقیق طلب ایک مسئلہ:

مال حرام غیر مملوک ''**مما لایتعین**'' (نقود دراہم ودنانیر) کو کاروبار میں لگا کر نفع کمایا جائے، پھر نفع کے بعد اس کا ضمان ادا کر دیا جائے تو ضمان کی ادائیگی کے بعد مال حرام کے ربح میں ایک سوال باقی رہتا ہے کہ مال حرام کا ربح یہ واجب التصدق ہوگا یا نہیں تو اس سلسلے میں بندہ کا رجحان یہ ہے کہ مال حرام ''لایتعین'' کا ربح واجب التصدق نہیں، کیونکہ مال حرام لایتعین میں شبہۃ الخبث ہے تو لازمی طور پر اس کے ربح میں شبہۃ الشبہہ ہوگا اور شریعت میں شبہۃ الشبہہ کا اعتبار نہیں، جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا تو جس میں شبہہ ہے تو اس کا نفع خبیث ہے، اور جس میں شبہۃ الشبہ کا اعتبار نہیں، جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا، تو جس میں شبہہ ہے تو اس کا نفع خبیث ہے، اور جس میں شبہۃ الشبہہ ہے اس کا نفع خبیث نہیں، اسی بناء پر بیع

فاسد کی مبیع میں چونکہ شبہۃ الخبث ہے؛ اس لیے اس کا نفع طیب نہیں اور مبیع کے عوض حاصل ہونے والے نقود کے ربح میں شبہۃ الشبہہ ہے اس لئے واجب التصدق نہیں۔

"(لا) يطيب (للمشترى) ما ربح فى بيع يتعين بالتعيين بأن باعه بأزيد لتعلق العقد بعينه فتمكن الخبث فى الربح فيتصدق به قوله (بأن باعه بأزيد) تصوير لظهور الربح فلايطيب له ذلك الزائد عما اشترى به، و أفاد أن ذلك فى أول عقد، و أما إذا أخذ الثمن واتجر و ربح بعده أيضا يطيب له لعدم التعين فى العقد الثانى كما نبه عليه، ط، وهوظاهر ما مر" (شامی ۷/۲۹۹م، زکریا)۔

اسی طرح سے دراہم مغصوبہ مضمونہ میں شبہہ ہے تو اس کے ربح میں شبہۃ الشبہہ ہوگا، لہٰذا اس کا ربح واجب التصدق نہیں، اور اشیاء مغصوبہ مضمونہ کے ربح میں شبہہ ہے، اس لیے اس کا نفع واجب التصدق ہے۔

"نحن نقول فى ربح المغصوب المضمون شبهة الخبث و فى ربح الدراهم المغصوب المضمون شبهة شبهة الخبث" (حاشیہ علامہ چلپی ہدایہ مع فتح القدیر ۴/۴۷۴)۔

خلاصہ یہ ہے کہ عروض مغصوبہ سے حاصل کیا گیا ربح ادائے ضمان کے بعد بھی طیب نہیں ہوگا اور دراہم مغصوبہ سے حاصل کیا گیا ربح ادائے ضمان وتصدق کے بعد حلال ہوجائے گا؛ جس سے معلوم ہوا کہ عروض مغصوبہ کے ربح میں شبہۃ پایا جاتا، گرچہ بعد میں ضمان ادا کردے۔

"(إذا كان متعيناً بالإشارة) و ذلك كالعروض فلا يحل له الربح: أى ولو بعد ضمان القيمة قال الزيلعى فإن كان مما يتعين لايحل له التناول منه قبل ضمان القيمة و بعده يحل إلا فيما زاد على قدر القيمة وهو الربح فإنه لايطيب له و يتصدق به" (شامی ۹/۲۷۶)۔

(۵) خریداری مافی الذمہ کے ذریعہ کی جائے اور ادائیگی نقود غیر مملوکہ سے کی جائے تو اس کا ربح اداء بدل تک یا تصدق تک حلال نہیں، یہ حکم تقریباً اتفاقی ہے، البتہ ادائے بدل یا تصدق کے بعد پہلے والا نفع حلال ہوگا یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، جمہور علماء اداء بدل اور تصدق سے قبل حاصل ہونے والے ربح کو حلال نہیں مانتے ہیں، لیکن امام ابو یوسف اور امام کرخی کے مذہب کے مطابق اس سے پہلے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا۔

"والمختار أنه لايحل مطلقاً، كذا فى الملتقى، ولو بعد الضمان هوالصحيح كما فى فتاوى النوازل.

قال الزيلعى: و وجهه أن بالنقد منه استفاد سلامة المشرى، و بالإشارة استفاد جواز العقد، لتعلق العقد به فى حق القدر والوصف، فيثبت فيه شبهة الحرمة لملكه بسبب خبيث" (شامی ۹/۲۷۷)۔

تصدق کو واجب کہنے والے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ نفع کا ذریعہ "**تصرف فی مال الغیر**" ہے؛ جس کی وجہ سے ربح خبیث ہوگا اور یہ خبث عقود کے تکرار سے اور ملکیت کے تبدیل ہونے سے زائل نہیں ہوسکتا، لہٰذا مال مغصوب کا ربح واجب التصدق ہوگا۔

"**و یؤمر أن یتصدق بها لاستفادتها ببدل خبیث وهو التصرف فی مال الغیر**" (شامی ۹/ ۲۷۴)۔

اور بعض فقہاء کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف صرف عروض (مما یتعین) کے ربح کے بارے میں ہے؛ کیونکہ عروض مغصوبہ مضمونہ میں عقد کا تعلق عین سے ہوتا ہے، لہٰذا ربح بھی عین کا ہوگا اور عین کا خبث یقینی ہے کہ اس کے ربح میں کم از کم شبہۃ الخبث ضرور پایا جائے گا اور شبہ شریعت میں معتبر ہے، اس لئے وہ ادائے ضمان کے بعد بھی طیب نہیں، اس کے برعکس مما لا یتعین کے ربح میں ادائے ضمان کے بعد شبہۃ الشبہہ ہوجاتا ہے، کیونکہ عقد کا تعلق نقود کے عین سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ عاقد کے ذمہ سے ہوتا ہے، اس لیے حاصل ہونے والا عوض حقیقتاً نقود مغصوبہ کا عوض نہیں، بلکہ ما فی الذمہ کا عوض ہوتا ہے؛ البتہ نقود مغصوبہ سبب اور ذریعہ ایک درجے میں بنتے ہیں، اس لئے اس کے عوض میں کم از کم شبہۃ الخبث ہوگا اور جب اس میں شبہۃ الخبث ہے، تو اس کے ربح میں شبہۃ الشبہہ ہوگا، اور شبہۃ الشبہہ شریعت میں معتبر نہیں؛ لہٰذا ادائے ضمان کے بعد نقود مغصوبہ کا ربح حلال ہونا چاہئے۔

"**رجل غصب ألفاً واشتری بها جاریة، فباعها بألفین، واشتری بألفین جاریة، فباعها ثلاثة آلاف فإنه یتصدق بجمیع الربح**" (جامع صغیر مع النافع الکبیر/ ۴۴۷)۔

صاحب ہدایہ اس عبارت کی تشریح میں یہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ ربح مما یتعین کا ہو، یعنی عروض مغضوبہ کا ہو یا نقود متعینہ بالاشارۃ (نقود مغصوبہ کی طرف اشارہ کرکے وہی حوالے کیا جائے یا نقود مغصوبہ پہلے ادا کردیے جائیں پھر اس کے عوض خریداری کی جائے) تو اس صورت میں اس کا ربح واجب التصدق ہوگا، لیکن اگر وہ ربح "مما لا یتعین" کا ہے (عروض مغصوبہ اور دراہم مشارالیہ کا نہیں ہے) تو اس صورت میں اس کا ربح واجب التصدق نہیں ظاہر الروایہ کی درج بالا عبارت کی یہ تشریح مان لی جائے تو پھر امام کرخی کا قول ظاہر الروایہ کے موافق ہوگا۔

اور جو حکم علامہ کرخی کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہی حکم جامع صغیر سے بھی مستفاد ہوتا ہے، جیسا کہ ہدایہ اور نافع کبیر کی تشریحات سے واضح طور پر سمجھ میں آتا ہے، بہرحال جامع صغیر اور علامہ کرخی کی باتوں میں اختلاف ہو یا اتفاق اس سے قطع نظر فتوی علامہ کرخی کے قول پر ہونے کی صراحت تمام کتب فقہیہ میں موجود ہے جس کے لیے (شامی ۹/ ۲۷۷/ ۲۷۶، بدائع ۶/ ۱۵۰، ۱۴۹، محیط برہانی ۶/ ۲۲۷۳، نافع کبیر/ ۴۶۷، عنایہ معتکملہ فتح القدیر ۹/ ۳۳۱) وغیرہ کی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے، لہٰذا

موجودہ زمانے میں ادائے ضمان کے بعد پہلے والا نفع حلال مانا جائے گا، واللہ اعلم۔

صاحب ہدایہ کی یہ تشریح اصول وضوابط کے مطابق ہے، اس لیے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ نقود مغصوبہ غیر متعینہ فی العقد کا ربح ادائے ضمان کے بعد واجب التصدق نہ ہو، اس کی تائید علامہ چلپی کے حاشیہ سے بھی ہوتی ہے۔

"نحن نقول فی ربح المغصوب المضمون شبهة الخبث و فی ربح الدراهم المغصوب المضمون شبهة شبهة الخبث" (حاشیہ علامہ چلپی ہدایہ مع فتح القدیر ۴/ ۴۷۴)۔

(۶) مال حرام مخلوط کا حکم:

اگر حرام غیر مملوک مملوک ہوجائے تو اس کی دو صورتیں ہیں: اگر وہ خلط واستہلاک سے مملوک ہوجائے تو بھی اس کا نفع ادائے ضمان کے بعد واجب التصدق ہے، اور اگر وہ کسی صنعت اور عمل کی وجہ سے مملوک ہو تو اس کا نفع ادائے ضمان کے بعد واجب التصدق نہیں بلکہ مستحب ہے۔

"وعلى هذا يخرج ما إذا غصب ألفاً، فاشترى جارية، فباعها بألفين، ثم اشترى بالألفين جارية، فباعها بلثاثة آلاف أنه يتصدق بجميع الربح فی قولهما، و عند أبی يوسف رحمه الله تعالىٰ: لايلزمه التصدق بشئ؛ لأنه ربح مضمون مملوک، لأنه عند أداء الضمان يملكه مستنداً إلى وقت الغصب، و مجرد الضمان يكفی للطيب، فكيف إذا اجتمع الضمان والملک، وهما يقولان: الطيب كما لايثبت بدون الضمان لايثبت بدون الملک من طريق الأولى وفی هذا الملک شبهة العدم على ما بينا فيما تقدم، فلا يفيد الطيب" (فقہ البیوع ص/ ۱۰۴۳)۔

"وليتنبه أن المذكور هنا أن التصدق بالغلة والربح واجب عليه، و هذا بخلاف القسم الثانی وهو ما أحدث فيه الغاصب صنعة، ثم أدى الضمان إلى صاحبه، حيث ذكرنا هناک أن التصدق به مستحب، كما نقلنا عن كتاب الآثار للإمام محمد رحمه الله تعالىٰ فی حديث الشاة المصلية و لعل الفرق أن سبب الملک فی مسئلة الربح ليس إلا الاستهلاک بالخلط، أما فی القسم الثانی، فلعمله وصنعته دخل فی تملكه، فثبوت ملكه فيه أقوى، والخبث فيه أقل بعد أداء الضمان، فالتصدق به لايجب عليه، ولكن يستحب" (فقہ البیوع/ ۱۰۴۴)۔

حاصل ان عبارتوں کا یہ ہے کہ دراہم مغصوبہ کو اپنے دوسرے مال کے ساتھ ملا کر اگر کاروبار کیا جائے، پھر اس کے بعد دراہم مغصوبہ کا ضمان ادا کر دیا جائے تو ادائے ضمان کے بعد جو نفع دراہم مغصوبہ کا پہلے حاصل کیا گیا ہے وہ ادا ضمان سے

پاکیزہ بنے گا یا نہیں؟ تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پاکیزہ ہوجائے گا اور حضرات طرفین کے نزدیک ادائے ضمان کے بعد بھی ماقبل کا نفع پاکیزہ نہیں ہوگا، کیونکہ اس میں شبہہ الخبث بہرحال موجود ہے، البتہ اگر شئ مغصوب میں تغیر و تبدل کردے تو ادائے ضمان کے بعد طرفین کے نزدیک بھی اس کا نفع پاکیزہ ہوجائے گا، کیونکہ تغیر وتبدل سے غاصب کی جوملکیت ثابت ہوگی وہ خلط سے ثابت ہونے والی ملکیت کے مقابل میں قوی ہوگی، لہٰذا جس میں ملکیت قویہ ہے اس میں ادائے ضمان کے بعد ماقبل کا ربح واجب التصدق نہیں، اور جس میں ملکیت ضعیفہ ہے اس میں ادائے ضمان کے بعد بھی ماقبل کا ربح واجب التصدق ہے، لیکن امام ابو یوسف کے نزدیک ربح کے طیب ہونے کے لیے صرف ادائے ضمان کافی ہے، لہٰذا ان کے نزدیک بہر دوصورت ربح طیب ہوگا۔

"**وعند أبی یوسف یطیب لأن عنده شرط الطیب الضمان و قد وجد۔ اه**" (تبیین الحقائق ۴/۴۰۹)۔

(۷) حرام مخلوط ممیّز وغیر ممیّز کا حکم:

اگر کسی کی ملکیت میں حلال وحرام دونوں ہوں اور ممتاز وعلیحدہ ہوں تو دونوں پر اس کے الگ الگ احکام نافذ ہوں گے، لیکن اگر ممتاز وعلیحدہ ہونے کے باوجود اس کی تفصیل کا علم نہ ہو کہ معاملہ مال حرام سے ہورہا ہے یا حلال مال سے تو غلبہ کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر اس کے پاس غالب آمدنی حلال ہے تو اس کا ہدیہ اس کی دعوت وغیرہ جائز ہے، اور اگر غیر ممتاز ہوں تو بقدر حلال انتفاع حلال ہے۔

"**إذا کان غالب مال المهدی حلالاً، فلابأس بقبول هدیته و أکل ماله، مالم یتبین أنه من حرام، و إن کان غالب ماله الحرام، لا یقبلها، ولا یأکل إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه**" (الاشباہ والنظائر مع الحموی ۱/۳۰۹)۔

"**غصب عشرة دنانیر، فألقی فیها دیناراً، ثم أعطی منه رجلاً دینارا، جاز، ثم دیناراً آخر، لا، والحلال ههنا أقل، ولکنه أجیز بقدر الحلال بدون اعتبارا لغلبة**" (فقہ البیوع ۱/۱۰۲۱، ۱۰۳۴)۔

(۸) عدم علم کی صورت میں ظن غالب کا اعتبار:

اگر کسی کے پاس حلال وحرام دونوں ہوں اور اس سے معاملہ کرنے والے کو اس کا علم ہو کہ اس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کا مال ہے، لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ حلال وحرام مخلوط ہے یا غیر مخلوط، اور حلال وحرام میں غالب اور مغلوب کا بھی علم نہ ہو تو ایسی صورت میں معاملہ کرنے والا ظن غالب کا مکلّف ہے، اگر ظن غالب اس کو یہ ہے کہ اس کو جو مال حاصل

ہورہا ہے وہ مال حلال کے اندر ہے، اس سے زائد نہیں تو اس شخص کا ہدیہ لینا اور اس کی دعوت کھانا وغیرہ جائز ہے، اور اگر اس کو ظن غالب یہ ہو کہ جو مال اس کو حاصل ہورہا ہے دینے والے کے مال حلال کی مقدار سے زائد ہے، یعنی اس میں مال حرام بھی شامل ہے تو اس کا ہدیہ لینا اور اس کی دعوت کھانا وغیرہ جائز نہیں ہے۔

"والأولی فی هذه الصورة التنزه، و لكن يجوز للآخذ يأخذ منه بعض ماله هبة أو شراء، لأن الأصل الإباحة، و ينبغی أن يقيد ذلک بأن يغلب علی ظن الآخذ أن الحلال فيه بقدر ما يأخذه أو أكثر منه، و وهو محمل ما جاء فی العبارات الآتية:

قال الإمام محمد رحمه الله تعالیٰ فی كتاب الآثار: "أخبرنا أبو حنيفة، قال: حدثنا محمد بن قيس أن أبا العوجاء العشار كان صديقا لمسروق، فكان يدعوه، فيأكل من طعامه و يشرب من شرابه، ولا يسأله"، قال محمد و به نأخذ، ولا بأس بذلک، مالم يعرف خبيثاً بعينه، وهو قول أبی حنيفة رحمه الله تعالیٰ".

أخرج عبد الرزاق فی مصنفه عن الثوری عن سلمة بن كهيل عن زر بن عبد الله عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه قال: "جاء إليه رجل، فقال: إن لی جاراً يأكل الربوا، و إنه لايزال يدعونی، فقال: مهناه لک و إثمه عليه"، قال سفيان: فإن عرفته بعينه، فلا تصبه،.

بعينه و دل قوله: "فإن عرفته بعينه، فلا تصبه "و كذلک قول محمد:" مالم يعرف خبيثاً بعينه "علی أن حل الأكل مفروض فيما إذا لم يعرف أن الحلال مميز عن الحرام عنده، ولا نسبة حصة الحلال فی ماله، و لذلک لم يشترطا غلبة الحلال" (فقہ البیوع ۱۰۳۸/۲، ۱۰۳۹)۔

(۹) حرام حرام سے مخلوط کا حکم:

خلط چونکہ استہلاک ہے، لہٰذا خلط سے ملکیت خبیثہ ثابت ہوگی اور اداء بدل یا ارضاء خصم کے بغیر اس کا ربح خبیث ہوگا اور اس کا ربح فقیر کے لئے بقدر ضرورت اپنے اوپر خرچ کرنا جائز ہے اور صاحب نصاب کے لئے بھی خرچ کرنا جائز ہے، لیکن اس کے اوپر اس کے مثل کا تصدق لازم ہوگا۔

"إلا إذا كان لايجد غيره، لأنه محتاج إليه، و له أن يصرفه إلی حاجة نفسه، فلو أصاب مالاً، تصدق بمثله إن كان غنياً وقت الاستعمال، و إن كان فقيراً فلا شئ عليه" (الہدایۃ مع تکملہ فی القدیر، کتاب الغصب ۳۳۰/۹)۔

(۱۰) نقود غیر مملوکہ مخلوطہ سے خریداری کا حکم:

اگر کوئی شخص مال حرام کی رقم اپنی حلال رقم سے یا دوسری حرام رقم سے گڈ مڈ کردے اور حلال وحرام کے درمیان امتیاز باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اگر اس رقم سے کوئی چیز خریدی جائے تو بائع کے لئے ایسے نقود کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے، کیونکہ خلط سے اس رقم پر ملکیت ثابت ہوگئی ہے اور مغصوب منہ کا حق اس کے ذمے سے متعلق ہو چکا ہے اور بائع کو جو رقم مل رہی ہے وہ عین حرام نہیں ہے، لیکن مشتری کے لئے اس کے عوض حاصل کردہ چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ مال حرام کا بدل ہے۔

"والظاهر من قول أبی حنيفة رحمه الله تعالیٰ انه ينفذ البيع بمعنى أنه ينتقل إلى المشترى الغاصب ملک مااشتراه، و لكن لايحل له الانتفاع به إلى أن يؤدى الضمان إلى المغصوب منهم، أما البائع الذى باع إليه، فالظاهر أنه يحل له الانتفاع بالثمن الذى قبضه، ولو كان الثمن من النقود، لأن فريضة الرد إلى المغصوب منهم انتقل بالخلط إلى الضمان الواجب فى ذمة المشترى الغاصب، فلم يكن ما قبضه البائع عين المغصوب" (فقہ البیوع ۱۰۲۷/۲)۔

الجواب الاول:

مذکورہ تفصیل سے جو امور مستفاد ہوتے ہیں ان کو ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کا جو حکم انگریزوں کے زمانے میں تھا وہی حکم آج بھی باقی ہے، غیر دار الاسلام میں غیروں کا مال فی نفسہ معصوم نہیں ہوتا ہے، لہٰذا جس طریقے سے بھی ملکیت میں آجائے ملکیت ثابت ہوجائے گی، اور زیادہ سے زیادہ اس میں شبہۃ الخبث پایا جائے گا، اور اس کے ذریعہ سے جو تجارت ہوگی اس میں شبہۃ الشبہہ پایا جائے گا اور شبہۃ الشبہہ واجب التصدق نہیں ہوگا، نیز مال حرام جب دوسری جنس میں تبدیل ہوجائے تو اس سے انتفاع کی حرمت بھی مختلف فیہ ہے اور کثرت حرام کے زمانہ میں جس کی حرمت مختلف فیہ ہو اس میں مزید توسع اور گنجائش پیدا ہوجاتی ہے، اسی طرح جب اصل مالک معلوم نہ ہو تو یہ گنجائش بڑھ جاتی ہے، امور مذکورہ کے دلائل تمہیدی مسائل کے ضمن میں درج کردیے گئے ہیں وہ ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں، ان امور سے مستفاد ہوا کہ جو مال غیر دار الاسلام میں غیر شرعی طریقہ سے اپنی جہالت یا کسی مفتی کے فتوی یا کسی اور اشتباہ کی بناء پر حاصل کیا جائے اور اس سے زمین جائداد بنائی جائے تو وہ جائداد فی نفسہ حلال ہوگی، البتہ احتیاطی حکم یہ ہے کہ تحری اور غور وفکر سے یہ اندازہ کرلے کہ آباء واجداد سے ترکہ میں حاصل شدہ مال میں کتنا مال عین حرام کا شامل تھا، اندازہ لگا کر عین حرام کے بقدر صدقہ کردے؛ خواہ وہ حرام مال آزادی

سے پہلے حاصل کیا گیا ہو یا آزادی کے بعد، اندازہ لگا کر عین حرام کے بقدر صدقہ کر دینے سے اب پورا کاروبار اور اس کا نفع خواہ آباء واجداد نے حاصل کیا ہو یا ورثہ نے سب حلال اور جائز شمار ہوگا، اس لئے کہ جب حرام کا ملنا یقینی طور سے معلوم ہے اور مقدار معلوم نہیں تو اس کی پاکیزگی کا طریقہ یہی ہے کہ اگر اس کے مالک معلوم ہوں تو تحری کے ذریعہ اندازہ لگا کر ان کو واپس لوٹا دیا جائے، ورنہ صدقہ کر دیا جائے۔

"فأما إذا لم يعلم الآخذ منه كم حصة الحلال فی المخلوط، يعمل بغلبة الظن، فإن غلب على ظنه أن قدر ما يتعامل به حلال، عنده فلا بأس بالتعامل" (فقہ البیوع ۱۰۳۸/۲)۔

یہی رائے حضرت تھانویؒ کی بھی معلوم ہوتی ہے (امداد الفتاوی ۸۴۱/۴)۔

علامہ ابن تیمیہ کی رائے:

اور اسی سے ملتی جلتی بات علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی فرمائی ہے۔

"فالمسلم المتأول الذی يعتقد جواز ما فعله من المبايعات والمؤاجرات والمعاملات التی يفتی فيها بعض العلماء إذا أقبض بهاأموال و تبين لأصحابها فيما بعد أن القول الصحيح تحريم ذلک: لم يحرم عليهم ما قبضوه بالتاويل" (مجموع الفتاوی ۴۴۳/)۔

و قال: "فمن فعل شيئاً لم يعلم أنه محرم ثم علم: لم يعاقب، و إذا عامل معاملات ربوية يعتقدها جائزة و قبض منها ما قبض، ثم جائه موعظة من ربه فانهى، فله ما سلف، "انتهى من **"تفسير آيات أشكلت على كثير من العلماء"** (۵۷۸/۲)۔

خلاصہ از تطہیر الاموال فی تحقیق الحلال والحرام:

مال حرام کے کل دو درجے ہیں:

۱-حرام قطعی

۲-حرام مشتبہ یعنی جس کی دلیل ومعرفت میں تردد ہو، علماء مجتہدین کا اختلاف ہو اور اس کی کل تین قسمیں ہیں:

۱-موہوم، ۲-مشکوک، ۳-مظنون۔

موہوم ومشکوک ہونا واجب الترک نہیں ہے؛ البتہ مظنون (یعنی مختلف اور مجتہد فیہ) علماء سلف نے اس سے اجتناب پر بہت زور دیا ہے اور بلا توقف اسے صریح حرام کے ساتھ ملحق فرمایا ہے۔

کیونکہ احکام فقہیہ اکثر ظنی ہیں "و للأکثر حکم الکل" مسلم ہے، جب حلال وحرام میں تعارض ہوتو حرام کو ترجیح ہوتی ہے، لہٰذا ایسے مال کو حرام و ناپاک قرار دے کر ان سے اجتناب کرنا سلف صالحین کا معمول رہا ہے اور کتابیں ایسے اموال کے استعمال سے ممانعت کے ساتھ بھری ہوئی ہیں۔

مشتبہ مال کے متعلق متاخرین کی رائے:

مگر اسی کے ساتھ مصلحت شناس علماء کرام اور صوفیاء عظام کی یہ بھی کوشش رہی ہے کہ شریعت مطہرہ میں جہاں تک گنجائش ہو احکام میں گنجائش دی جائے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھیں اور حرام ومشتبہات کو چھوڑنے کی فکر ہی چھوڑ دیں۔

چنانچہ احکام فقہیہ پر مرتبہ کتابوں پر نظر کرنے والے جانتے ہیں کہ ترک مشتبہات کے مسئلہ میں ہر صدی کی بعد کچھ سہولت ضرور ہوتی ہے، اس بارے میں امام غزالی رحمہ اللہ کی تصانیف ملاحظہ ہوں، فتاوی عالمگیری کے مصنفین کا بھی یہی قول ہے کہ ہمارے زمانے میں مشتبہات سے احتراز کرنا مشکل ہے تو جب تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ بعینہ یہی مال حرام ہے تو اس مال کے استعمال کو ترک کرنا واجب نہیں ہے۔

"قد قال بعض مشائخنا: علیک بترک الحرام المحض فی هذا الزمان فإنک لاتجد شیئاً لاشبهة فیه کذا فی جواهر الفتاوی"۔

تو ہمارا زمانہ جو فضولیات ولغویات سے بھرا ہوا ہے جس کی فضول کاریوں اور آزادیوں سے نہ حکومت محفوظ ہے، نہ تجارتیں بچ سکیں، نہ ملازمتیں اس سے پاک ہیں، نہ اجارہ کا معاملہ صحیح ہے، نہ زراعتیں سود ورشوت سے پاک ہیں، اسی طرح بیوع فاسدہ کے علاوہ ایک دو نہیں، ہزاروں بلائیں ہیں تو کس طرح ممکن ہے کہ ترک مشتبہات پر زور دیا جائے (تظہیر الاموال فی تحقیق الحلال والحرام ۱۴ تا ۹۳)۔

لہٰذا حرام مال چاہے مملوک ہو یا غیر مملوک جب اس کو کاروبار میں لگا دیا جائے اور اس سے نفع ہوتا رہے تو اس کے نفع کے بارے میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہے؛ چنانچہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کا نفع واجب التصدق نہیں ہے، اسی طرح غیر اسلامی ممالک کا سود وغیرہ مجتہد فیہ ہے، نیز سود "مملوک بشراء فاسد" کے حکم میں ہے، ان سب وجوہات کی بنا پر نفع کی حرمت ظنی ہوگی جس کا حکم یہ ہے کہ آج کے کثرت حرام کے زمانہ میں احتراز کرلے تو بہتر ہے، ورنہ استعمال کی گنجائش ہے، البتہ جتنا مال عین حرام سے لگنے کا ظن غالب ہو اس کا تصدق کافی ہے۔

الجواب الثانی:

اگر وہ جائداد عین حرام ہے؛ یعنی رشوت، غصب وغیرہ کے ذریعہ بعینہ وہی جائداد حاصل کی گئی ہے، تو اگر اس کا مالک معلوم ہے تو مالک کو واپس لوٹا دینا واجب ہے، کرایہ وغیرہ لینا جائز نہیں ہے؛ خواہ غصب کرنے والا فقیر ہو یا مالدار، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "**لا یأخذ أحدکم مال صاحبه لاعبا و لا جاداً فإذا أخذ أحدکم عصا صاحبه فلیرد علیه**" (بخاری الادب المفرد، ترمذی کتاب الفتن)، البتہ اگر مالک معلوم نہیں ہے تو فقیر کے لئے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے بقدر استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور غنی کے لئے بطریق قرض استعمال کی گنجائش ہے، اس لئے کہ مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں وہ بحکم لقطہ ہے: "**فی الدر المنتقی و أفاد أنه لایصرفه لحاجته إلا إذا کان فقیراً فالغنی لو تصرف تصدق بمثله**" (شامی ۹/ ۲۷۴)، اور اگر وہ جائیداد عین حرام نہیں بلکہ حرام کاروبار کے نفع سے حاصل شدہ ہے تو ایسی صورت میں جتنا مال اس میں حرام ہے اس کو تخمینہ کے ذریعہ سے صدقہ کرنے کے بعد جائیداد اور اس کی آمدنی حلال ہوجائیگی، اس لئے کہ حرام کاروبار کے نتیجہ میں حاصل شدہ جائیداد کی حرمت ظنی ہے جس میں حضرات فقہاء کا اختلاف موجود ہے اور حضرات فقہاء نے حرام کی کثرت کے زمانے میں تسہیل کو ملحوظ رکھتے ہوئے صرف عین حرام کے تصدق کو کافی کہا ہے اور اس کے نفع کو استعمال کرنے کی گنجائش دی ہے۔

الجواب الثالث:

ماتحت اور مجبور اہل وعیال کے لئے جن کا ذمہ دار اور کفیل حرام ذریعہ آمدنی اختیار کیے ہو، باوجود کوشش کے اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو تو ایسی مجبوری کے وقت بقدر ضرورت اس کے مال سے انتفاع کی گنجائش ہے۔

"**لو اشتری طعاماً أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من تناوله و الإثم علی الزوج**" (ردالمحتار ۷/ ۳۰۲، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۲۴، عطر ہدایہ/ ۳۳)۔

اور حرام کمائی کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے کی جائز ملازمت کی آمدنی حلال ہے اور اس پر خرچ کی گئی رقم کے بارے میں تفصیل ہے کہ وہ رقم اگر عین حرام کی ہو اور اس کی مقدار قطعیت کے ساتھ معلوم ہو تو اتنی مقدار، اور اگر معلوم نہ ہو تو تخمینہ لگا کر اس کے بقدر صدقہ کرنا ضروری ہے، بشرطیکہ وہ بوقت تعلیم مستحق زکاۃ نہ رہا ہو؛ لیکن اگر وہ بوقت تعلیم مستحق تھا تو تصدق ضروری نہیں ہے، اسی طرح اگر اس کے اوپر عین حرام خرچ نہ کیا گیا ہو؛ بلکہ حرام مال کے ربح اور نفع کو خرچ کیا گیا ہو تو ربح کی حرمت چونکہ ظنی ہے اس لئے تصدق واجب نہیں، بلکہ بہتر ہے۔

فإذا كان المال الحرام فی يد الوالد ينفق منه على نفسه و أبنائه لغير حاجة أو فقر، فإن الأب يكون آثما بهذاالإنفاق إذا وجد المال الحلال أو كان قادراً على تحصيله كما سبق ذكره، أما إن كان عاجزاً عن تحصيل المال الحلال فعندئذ يكون إنفاقه من المال الحرام جائزاً للضرورة و حفظ النفس بحيث ينتهى حكم هذا الإنفاق بزوال هذه الضرورة و حصول المال الحلال فی يده، أما الأبناء ففی حكم إنفاقهم من المال الحرام الذی عند الأب ينبغی التفريق بين حالتين:

الأولى: أن يكون الابن غير قادر على تحصيل المال الحلال، إما لعجزه أو لصغر سنه و كانت نفقته واجبة على أبيه أو كان طالب علم ليس له مصدر رزق للعيش و دفع نفقات الدراسة إلا هذا المال الحرام الذی عند الأب، فإن حكمه فی الأخذ من هذا المال حكم المضطر إلى دفع الأذى عن نفسه بالميتة، فيجوز له أن يأخذ ما ينفقه عليه والده و أن ينتفع به مع إنكاره فی قلبه لهذا الأمر إلى أن يصبح قادراً على الاعتماد على نفسه فی تحصيل الكسب الحلال أو أن يأتيه مال من مصدر حلال فيستغنى به عما عند والده من مال حرام لأنه عند حصول المال الحلال تزول ضرورته إلى الإنفاق على نفسه من المال الحرام و يكون لزاماً عليه أن ينفق على نفسه من هذا المال الحلال ويحرم عليه أن يقبل نفقة والده من المال الحرام" (احکام المال الحرام وضوابط الانتفاع والتصدق بہ فی الفقہ الإسلامی لعباس احمد محمد البازص ۲۸۹/)۔

"**والملک الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز ثم إن كان غنياتصدق بمثله و إن كان فقيرا لايتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار ۱۶/۳)۔

الجواب الرابع:

اگر دعوت کرنے والے کے پاس حلال وحرام سے مخلوط مال اور ذریعۂ آمدنی ہے اور دعوت کھانے والے کو اس کا علم بھی ہے، لیکن اس کو حرام وحلال کی مقدار کا علم نہیں، اسی طرح یہ بھی نہیں معلوم کہ دعوت کس مال سے کی جارہی ہے تو ایسی صورت میں اس کی دعوت میں شریک ہونے سے احتراز بہتر ہے اور شرکت کر لینے کی گنجائش ہے؛ بشرطیکہ حالات وقرائن کے ذریعہ حرام مال سے دعوت کیا جانا معلوم نہ ہو، بلکہ دعوت کا حلال مال سے ہونے کا ظن غالب ہو تو شرکت کی گنجائش ہے۔

الجواب الخامس:

اگر دعوت کھانے والا فقیر اور مستحق زکوۃ ہے تو اس کے لیے تلافی کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن اگر مستحق زکوۃ نہیں ہے تو

بقدر اکل تصدق سے تلافی کر دینا بہتر ہے، واجب نہیں۔

"سئل الفقيه أبو جعفر عمن اكتب ماله من أمراء السلطان وجمع المال من أخذ الغرامات المحرمات و غير ذلک هل يحل لمن عرف ذلک أن يأكل من طعامه؟ قال: أحب إلى أن لايأكل منه ويسعه حكماً أن يأكله إن كان ذلک الطعام لم يكن فى يد المطعم غصباً أورشوة اه: أى إن لم يكن عين الغصب أو الرشوة لأنه لم يملكه فهونفس الحرام فلا يحل له ولا لغيره، و ذكر فى البزازية هنا أن من لايحل له أخذ الصدقة والأفضل له أن لا يأخذ جائزة السلطان" (شامی/۲۱۹)۔

الجواب السادس:

پہلے سے کمائے ہوئے مال حرام کی جتنی مقدار قطعیت کے ساتھ معلوم ہو اور اس کے مالک کا بھی پتہ ہو تو اس کے ذمے مالک کو واپس لوٹا دینا واجب ہے اور کوئی حیلہ مفید نہیں اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو فقیر اور ضرورت مند کے لیے مال حلال ہے، اور غیر ضرورت مند کے لیے اس مال میں جتنا حصہ عین حرام کا ہو اتنا صدقہ کر دینے سے بقیہ مال پاکیزہ ہو جائے گا؛ خواہ صدقہ ایک مشت کیا جائے یا تھوڑا تھوڑا، تاہم غیر ضرورت مند کے لئے پورے مال کو صدقہ کر دینا ہی بہتر ہے۔

"فلو أخذ قول الكرخى رحمه الله تعالىٰ على ما فسرناه، فرجحانه مسلم، أما إذا أخذ مبيحاً لما اشترى بالنقود المغصوبة و ربحه، فالذى يميل إليه القلب أن ما رجحه صاحب الهداية والكاسانى بناءً على قول الإمام أبى حنيفة ومحمد رحمهم الله تعالى، هو الأولى بالترجيح، وهوالاحتياط، و إن كان كثير من الفقهاء المتأخرين أفتوا بذلک لعموم البلوى، و لذا فمن ابتلى بمثل هذا يرجى أن يسوغ له الأخذ بهذا القول عند حاجة شديدة والتنزه أولى ولم يذكر عن الكرخى حكم البائع الذى أخذ من المشترى النقود المغصوبة، هل يسوغ له استعمال تلک النقود؟ و قد أفتى كثير من علمائنا أنه يجوز له ذلک أيضا" والله سبحانه و تعالىٰ أعلم (فقہ البیوع/۱۰۱۶)۔

الجواب السابع:

اگر کسی کے پاس حرام مال موجود ہو اور اس کا مالک معلوم نہ ہو یا حرام مال کا نفع ہو تو حلال تجارت کے لئے بطور قرض استعمال کرنے کی گنجائش ہے، لیکن بعد میں اس کو تصدق کے ذریعہ حلال اور پاک کر لینا واجب ہے۔

"والملک الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه فى حاجة نفسه جاز ثم إن كان غنيا تصدق

بمثله و إن كان فقيرا لايتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۶۱)۔

نوٹ: مالدار آدمی کے لیے حرام مال جس کا مالک معلوم نہ ہو حلال تجارت کے لیے بطور قرض استعمال کرنا جائز ہے، بعض اہل علم نے امام کی اجازت یا مفتی کے فتوی کو ضروری قرار دیا ہے، لیکن امام کی اجازت یا مفتی کا فتوی جواز کے لیے ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے، بلکہ اپنے اور اپنے وارثین کے پاس کوئی تحریر لکھ کر رکھ دینا کافی ہے، تاکہ اس کو محل میں خرچ کرنا یقینی ہو سکے، مسئلہ دیانت کا ہے جس کے لیے نیت کافی ہے، قضاء شرط نہیں، البتہ تحریری ثبوت رکھنے کا آیت مداینہ میں جو حکم ہے اس پر عمل کر لینا کافی ہوگا۔

الجواب الثامن:

اگر کسی ملازمت میں حلال وحرام دونوں کام کرنا پڑتا ہو تو ایسی ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، جیسے کہ غلام اور آزاد اور ذبیحہ و مردار دونوں کو ملا کر خرید و فروخت کرنا جائز نہیں، اسی طرح سے حلال وحرام دونوں کی مشترکہ ملازمت جائز نہ ہوگی، کیونکہ عقد اجارہ میں کام اور منفعت کا وہی درجہ ہے جو عقد بیع میں مبیع کا درجہ ہوتا ہے، لہٰذا جس طرح سے مبیع کے مال اور غیر مال پر مشتمل ہونے کی صورت میں عقد بیع ناجائز اور حرام ہوتا ہے، اسی طرح سے حلال وحرام پر مشتمل کام اور حلال وحرام کے درمیان مشترک منفعت کا اجارہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا (تبیین الحقائق ۴/ ۳۹۴، ۳۹۳، درر الحکام ۱/ ۴۴۲)۔

البتہ اگر کبھی کبھار حرام کام تبعا اور ضمنا انجام دینا پڑ جائے تو عقد اجارہ کے جواز کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس لیے کہ تابع اور ضمنی کام معدوم کے حکم میں ہوتے ہیں وہ مقصود نہیں ہوا کرتے؛ لہٰذا ایسی صورت میں عقد اجارہ درست اور جائز تو ہو جائے گا اور اجرت بھی حلال ہوگی، لیکن حرام کام کرنا بہر حال حرام ہی رہے گا؛ خواہ ضمنا کیا جائے یا مستقلا کیا جائے (تطہیر الاموال فی تحقیق الحلال والحرام صفحہ ۳۱۱)۔

"**يغتفر في التوابع مالا يغتفر في غيرها كبيع من له حق في شرب أياما من حقه في الشرب لايجوز إلا إذا بيع تبعا للأرض**" (درر الحکام ۱/ ۵۰)۔

اور حلال وحرام کام پر مشتمل ملازمت کی اجرت کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر حلال وحرام دونوں کاموں کی اجرت الگ الگ متعین ہو؛ خواہ یہ تعیین عرف سے ہو جائے یا صراحت سے تو حلال کام کی اجرت حلال ہوگی اور حرام کی اجرت حرام ہوگی، لہٰذا اجرت کا جتنا حصہ حرام کام کا عوض بنے وہ واجب التصدق ہوگا، اور اگر دونوں کاموں کی اجرت الگ الگ متعین نہ ہو سکتی ہو تو اجرت مثل کا مستحق ہوگا تو اس میں جائز کام کی جو اجرت مثل بنے گی وہ حلال ہوگی اور جو اجرت مثل سے زائد ہو وہ حرام ہوگی جس کا صدقہ واجب ہوگا۔

"و أما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة، فلا يجوز قبولها لاشتمالها على عمل محرم، ولكن إن قبل أحد مثل هذه الوظيفة، فما حكم الراتب الذى أخذه عليها؟ لم أجد فيها نقلاً فى كلام الفقهاء، إلا ما ذكره ابن قدامة رحمه الله تعالىٰ: قال (أى للأجير) استأجرتک لتحمل لی هذه الصبرة والتی فی البیت بعشرة ..... فإن كانا يعلمان التی فی البیت لكنها مغصوبة، أو امتنع تصحيح العقد فيها لمانع اختص بها، بطل العقد فيها، و فی صحة الأخرى وجهان بناء على تفريق الصفقة، إلا أنهما إن كانت قفزانهما معلومة، أو قدر أحدهما معلوم من الأخرى، فالأولى صحته، لأنه قسط الأجر"۔

الجواب التاسع:

حرام آمدنی والے کے یہاں حلال اور جائز ملازمت جائز ہے، اور اس کی اجرت بھی جائز ہے، بشرطیکہ اجرت عین حرام سے دیئے جانے کا علم نہ ہو، لہٰذا اس کے گھر نوکری اور اس کے بچوں کو تعلیم دے کر اس کی فیس لینا جائز ہے، جب تک کہ اجرت کے حرام مال سے دیئے جانے کا ظن غالب نہ ہو "**أما البائع الذى باع إليه، فالظاهر أنه يحل له الانتفاع بالثمن الذى قبضه، ولو كان الثمن من النقود، لأن فريضة الرد إلى المغصوب منهم انتقل بالخلط إلى الضمان الواجب فى ذمة المشترى الغاصب، فلم يكن ما قبضه البائع عين المغصوب**" (فقہ البیوع ۱۰۲۷)۔

اور حرام کمائی سے خریدی گئی جائیداد میں کھیتی باڑی کرنے کی اجازت ہے، اور اسی طرح سے حرام کمائی سے حاصل کی جانے والی کار یا بائک پر بیٹھنے اور سفر کرنے کی بھی گنجائش ہے، بشرطیکہ کھیتی، کار اور بائک وغیرہ عین حرام کی نہ ہو، یعنی غصب، رشوت اور سرقہ کے ذریعہ حاصل نہ کی گئی ہو "**وفى الملتقى و شرحه ولو اشترى بألف الغصب أو الوديعة جارية تعدل ألفين فوهبها أوطعاماً فأكله، أو تزوج بأحدهما امرأة أو سرية أو ثوباً حل الانتفاع ولا يتصدق بشئ اتفاقاً لأن الحرمة عند اتحاد الجنس اه و نحوه فى القهستانى، و نقل ط عن الحموى عن صدر الإسلام أن الصحيح لايحل له الأكل ولا الولطء لأن فى السبب نوع خبث اه فيتأمل**" (شامی ۹/۲۷۸، ۵۵۵، الاشباہ والنظائر ۲/۴۶۲)۔

شامی کی نقل کردہ عبارت سے معلوم ہوا کہ حرام آمدنی سے بنائی گئی جائداد وغیرہ سے انتفاع کی حلت میں اختلاف ہے اور اس اختلاف کی وجہ سے حکم میں تخفیف کا پیدا ہوجانا لازم ہے، اور معاشی معاملات تسہیل کے متقاضی ہوتے ہیں اس لیے حلت والے قول کو اختیار کرنے کی گنجائش ہے، لیکن اگر ایسے لوگوں کے ساتھ معاملات میں نرمی اختیار کرنے سے لوگوں کے اندر

حرام و ناجائز کاروبار کی حوصلہ افزائی ہواور حرمت کا دروازہ چوپٹ کھل جانے کا اندیشہ ہوتو سد اللباب ان کے ساتھ جائز معاملات کی اجازت نہیں دی جائے گی، لیکن اس کا فیصلہ مقامی اہل علم، کاروبار اور ملازمت وغیرہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کرسکتے ہیں، پورے حالات کو دیکھے بغیر کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جاسکتا" **ولأن الملک من وجه حصل بسبب محظور أو وقع محظوراً بابتدائه فلا يخلو من خبث، و لأن إباحة الانتفاع قبل الإرضاء يؤدى إلى تسليط السفهاء على أكل أموال الناس بالباطل و فتح باب الظلم على الظلمة وهذا لايجوز**" (بدائع ۱۳۹/۶)۔

الجواب العاشر:

بینک سے حاصل شدہ سودی رقم کا حکم اس لقطہ کا حکم ہے جس کو مالک تک پہنچانا ممکن نہیں اور اس طرح کے لقطہ کا حکم یہ ہے کہ اس کو پانے والا اگر خود ضرورت مند ہوتو اس کے لیے اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز ہے، اسی طرح عامۃ المسلمین کی ضروریات یعنی رفاہی کاموں میں بھی خرچ کرنے کی اجازت ہے؛ البتہ مالدار کے لئے اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا رفاہی کاموں کی رشوت اور فقیر آدمی کے لئے اپنی ذاتی ضروریات کی رشوت میں سودی رقم دینا جائز ہے اور مالدار کے لئے اپنے ذاتی کاموں کی رشوت میں دینا جائز نہیں ہے، اگر مالدار خرچ کردے تو اس کی مقدار کے بقدر اس کے اوپر تصدق لازم ہوگا۔

"**و رابعها فمصرفه جهات الخ موافق لما نقله ابن الضياء فى شرح الغزنوية عن البزدوى من أنه يصرف إلى المرضى والزمنى واللقيط و عمارة القناطر والرباطات والثغور وما أشبه ذلک**" (شامی ۲۸۲/۳، ۲۸۳)، "**و له أن يصرفه إلى حاجة نفسه، فلو أصاب مالاً، تصدق بمثله إن كان غنياً وقت الاستعمال، و إن كان فقيراً فلا شئ عليه**" (الہدایہ مع فتح القدیر ۳۳۰/۹، کتاب الغصب)۔

نوٹ: سودی رقم کو رفاہ عام میں خرچ کرنے کی اجازت حضرات اکابر نے بھی دی ہے، تفصیل کے لئے دیکھا جائے (فتاوی رحیمیہ ۲۷۸، ۲۸۰/۹)۔

الجواب الحادی عشر:

اگر کسی شہر یا زمانہ میں یا مارکیٹ میں حرام کسب کا رواج ہو، لیکن مارکیٹ وغیرہ میں حلال ذریعہ آمدنی غالب ہوں اور جس شخص سے معاملہ کرنا ہو اس کے بارے میں کوئی تحقیق نہ ہوتو ایسی صورت میں پوچھنے کی ضرورت نہیں، بغیر استفسار کے اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، اس کا ہدیہ لینا دعوت کھانا، چائے پینا سب جائز ہے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان تاجر یہود ونصاریٰ سے مال خریدنے میں زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتے تھے، حالانکہ ان کی حرام کاری قرآن میں منصوص ہے: "**لو لاينهاهم الربانيون و الأحبار عن قولهم الإثم و أكلهم السحت**" (المائدہ: ۶۳)، تطہیر الاموال فی تحقیق الحلال والحرام/ ۴۳)۔

جس شہر یا بازار میں اکثریت، حرام کھانے کی ہو وہاں کا کھانا کھانا بغیر تحقیق کے جائز نہیں "**فلينظر أيها أزكى طعاما**" (معارف القرآن ۵/ ۱۴۰)۔

البتہ اگر مارکیٹ میں غالب ذریعۂ آمدنی حرام ہو تو احتیاطاً پوچھ لینا بہتر ہے۔

"**رجل اشترى من التاجر شيئاً هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان فى بلد و زمان كان الغالب فيه هو الحلال فى أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام و بينى الحكم على الظاهر، و إن كان الغالب هوالحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال و الحرام يحتاط و يسأل أنه حلال أم حرام**" (الفتاوی الہندیہ کتاب البیوع، الباب العشرون فی البیاعات)۔

لیکن جس شخص سے معاملہ کرنا ہے اس کے بارے میں یقین سے معلوم ہو کہ اس کی آمدنی میں حرام آمدنی شامل ہے اور کھانا کس آمدنی سے ہے، یہ معلوم نہیں تو ایسی صورت میں ظن غالب پر عمل کرے، لہٰذا اگر اس بات کا ظن غالب ہو کہ اس کا ہدیہ، دعوت وغیرہ مال حلال کی مقدار سے زائدہ ہے تو اس کا ہدیہ دعوت وغیرہ جائز نہیں ہے، ورنہ گنجائش ہے، البتہ احتراز ہر حال میں بہتر ہے۔

الجواب الثانی عشر:

بارہویں سوال کے الفاظ یہ ہیں کہ جس کا مال یا کمائی حرام ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر دعا کراتا ہے یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کا مقصد بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حرام کمائی والے کی تقریبات میں شریک ہونے سے اس کی حوصلہ افزائی اور عملی تائید ہوتی ہے تو کیا اس کی تقریبات میں شریک ہو کر اس کی حوصلہ افزائی اور تائید کرنا جائز ہے، یا اس سے دوری بنالینا ضروری ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص کا ذریعہ آمدنی حرام ہو اور تعلیم وتنبیہ کے باوجود اس کو ترک کرنے کی کوشش نہ کرے اور حلال ذریعہ آمدنی کے لیے کوئی توجہ نہ دے تو ایسی صورت میں اس کی تقریبات میں شرکت سے تعزیراً احتراز کرنا ضروری ہے۔

اس لئے کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کا فرمان ہے:"**من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ، فإن لم یستطع فبلسانه، فإن لم یستطع فبقلبه، و ذلک أضعف الإیمان**"(صحیح مسلم)۔

اور اگر سوال کا مقصد یہ ہے کہ جب وہ خود آکل حرام ہے اور آکل حرام کی دعا قبول نہیں ہوتی تو جب اس کے حق میں دعا قبول نہیں ہوتی ہے تو اس کی آل واولاد کے حق میں دعا کیسے قبول ہوگی؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقصد یہ نہیں کہ حرام کھانے والا دعا کرنا اور دعا کرانا چھوڑ دے، بلکہ روایت کا مقصد ترک حرام کی تاکید کرنا ہے نہ کہ ترک دعا کی، دعا تو سب کی سنی جاتی ہے اور قبول ہوتی ہے۔

البتہ متقی و پرہیزگار کی دعا"**أسرع إلی الإجابه**" ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمایا:"**یا سعد أطب مطعمک تکن مستجاب الدعوة**" (الترغیب والترہیب ۲/ ۵۴۵)۔

☆☆☆

مال حرام اور مال مشتبہ سے متعلق بعض مسائل

مفتی اختر امام عادل قاسمی☆

آزادی سے پہلے ہندستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا گیا تھا، اور اس بنیاد پر غیر مسلموں سے سود لینے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن ملک کے آزاد ہونے کے بعد علماء کی رائے تبدیل ہوگئی اور انہوں نے ہندستان کو دارالحرب سے نکال کر دارالامن قرار دیا، اور عام ملکوں کی طرح سود کی ممانعت کا فتویٰ دیا، لیکن جن لوگوں کو سودی کاروبار کی عادت پڑ گئی تھی، ان کو اس سے نجات نہیں مل سکی، چنانچہ آزادی کے بعد بھی ہندستان کے بہت سے لوگ سودی اور حرام کاروبار میں ملوث رہے، اس پس منظر میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ایک سوالنامہ مرتب کیا ہے، جس کے جوابات پیش خدمت ہیں:

وراثت کے مال میں اگر حلال وحرام مخلوط ہوں:

الجواب:ا

یہ مال مخلوط کا مسئلہ ہے جس میں حرام وحلال غیر متمیز طور پر مخلوط ہوں اور حرام وحلال کی مقدار معلوم نہ ہو، اس لئے کہ آزادی سے قبل جب ہندستان کے دارالحرب ہونے اور غیر مسلموں سے سود لینے کے جواز کا فتویٰ دیا گیا تھا، اس اثناء اس کے آباء واجداد نے غیر مسلموں سے سود وغیرہ کے ذریعہ جو مال کمایا وہ حلال تھا، اور آزادی کے بعد جب علماء نے ہندستان کو دارالامن یا دارالعہد قرار دیا اور غیر مسلموں سے سود کے جواز کا قول تبدیل ہوگیا، اس اثناء سود وغیرہ سے حاصل شدہ مال حرام ہے، تو جو کاروبار اس کو وراثت میں ملا ہے اس میں دونوں طرح کے مال غیر ممیّز طور پر موجود ہیں، اور ان کی مقدار معلوم نہیں ہے ممکن ہے کہ سارا مال آزادی سے قبل کا کمایا ہوا ہو اور حلال ہو، اسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ یہ تمام مال آزادی کے بعد کا ہو اور حرام ہو، ایسی صورت میں گو کہ احتیاط یہی ہے کہ ایسے مال کو استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے، لیکن از روئے فتویٰ پورے مال کو علی الاطلاق استعمال کرنے کی اجازت ہے، کیونکہ اباحت اصل ہے، البتہ استعمال کرنے والے کو یہ سمجھنا چاہئے کہ میں

☆ مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف بہار

حلال حصہ سے استفادہ کر رہا ہوں، متعدد صحابہ وتابعین سے کئی آثار وروایات منقول ہیں جن سے اس مضمون پر روشنی پڑتی ہے:

☆ حضرت حارث بن سویدؒ کا بیان ہے:

"جاء رجل إلى عبد الله يعنى ابن مسعود فقال: إن لى جاراً ولا أعلم له شيئاً إلا خبيثاً أو حراماً و إنه يدعونى فأحرج أن آتيه وأتحرج أن لا آتيه! فقال: ائته وأجبه فإنما وزره عليه"۔(بلوغ الأرب بتقریب کتاب الشعب ۱/۳۹۰، (تہذیب لکتاب شعب الإیمان للبیہقی)، ہذبہ: محمد خلف سلامۃ)۔

(ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جس کی پوری آمدنی میرے علم کی حد تک حرام ہے، وہ مجھے کھانے کی دعوت دیتا ہے تو مجھے اس کے یہاں جانے میں گرانی محسوس ہوتی ہے، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کی دعوت قبول کرو، اس کا گناہ اس پر ہوگا)۔

حضرت سفیان ثوریؒ نے اس پر وضاحتی نوٹ لگایا کہ البتہ اگر بعینہ حرام مل جائے تو اس سے احتیاط کی جائے:

"عن ذربن عبد الله عن بن مسعود قال جاء إليه رجل فقال إن لى جارا يأكل الربا وإنه لا يزال يدعونى فقال مهنأه لك وإثمه عليه قال سفيان فإن عرفته بعينه فلا تصبه" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۰، حدیث نمبر: ۱۴۶۷۵، المؤلف: أبوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الناشر: المکتب الإسلامی بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۳، تحقیق: حبیب الرحمٰن الأعظمی عدد الأجزاء: ۱۱)۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی رائے بھی وہی ہے جو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی ہے:

"أخبرنا عبد الرزاق قال: أخبرنا معمر عن أبى إسحاق عن الزبير بن عدى عن سلمان الفارسى قال: إذا كان لك صديق عامل، أو جار عامل أو ذو قرابة عامل ،فأهدى لك هدية،أو دعاك إلى طعام، فاقبله، فإن مهنأه لك، وإثمه عليه" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۰، حدیث نمبر: ۱۴۶۷۵، المؤلف: أبوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی، الناشر: المکتب الإسلامی بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۳، تحقیق: حبیب الرحمٰن الأعظمی، عدد الأجزاء: ۱۱)۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے بھی اباحت ہی کی ہے:

"عن ربيع بن عبد الله سمع رجلاً سأل ابن عمر: إن لى جاراً يأكل الربا، أو قال خبيث الكسب، وربما دعانى لطعامه أفأجيبه؟ قال: نعم، قَالَ الشَّيْخُ: "وَهَذَا عَلَى الْإِبَاحَةِ، فَإِنَّهُ لَا يَدْرِى، الَّذِى أَطْعَمُهُ مِنْ كَسْبِهِ الْخَبِيثَ، أَمْ لَا، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ حَقٌّ" (سنن البیہقی الکبری: ۵/۳۳۵، حدیث نمبر: ۱۰۶۰۵، المؤلف: أحمد بن الحسین بن علی بن موسی أبوبکر البیہقی الناشر: مکتبۃ دار الباز، مکۃ المکرمۃ، ۱۴۱۴ھ، ۱۹۹۴ء، تحقیق: محمد عبدالقادر عطا، عدد الأجزاء: ۱۰)۔

(ربیع بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سوال کیا کہ میرا ایک پڑوسی سود خور ہے، یا اس کی آمدنی خبیث ہے، وہ مجھے کھانے کی دعوت دے تو کیا میں اسے قبول کرسکتا ہوں، آپ نے فرمایا، ہاں، امام بیہقیؒ کہتے ہیں

کہ یہ اجازت اس صورت میں ہے، جب حلال وحرام میں امتیاز نہ ہو، اس لئے کہ دعوت قبول کرنا حق ہے)۔

"أخبرنا عبد الرزاق قال: أخبرنا معمر قال: سئل الحسن أيؤكل طعام الصيارفة؟ فقال: قد أخركم الله عن اليهود والنصارى، إنهم يأكلون الربا، وأحل لكم طعامهم" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۱، حدیث نمبر: ۱۴۶۸۱، المؤلف: أبوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الناشر: المکتب الإسلامی بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۳، تحقیق: حبیب الرحمٰن الأعظمی، عدد الأجزاء: ۱۱)۔

حضرت مکحولؒ، امام زہریؒ اور حضرت فضیل بن عیاضؒ وغیرہ اکابر علماء سے بھی اسی طرح منقول ہے، علامہ ابن رجبؒ جامع العلوم والحکم میں لکھتے ہیں:

"ورخَّص قومٌ من السَّلف في الأكل ممن يعلم في ماله حرام ما لم يعلم أنّه من الحرام بعينه، كما تقدَّم عن مكحولٍ والزُّهريِّ. وروى مثلُه عن الفُضيل بن عياض، وروى في ذلك آثارٌ عن السَّلف، فصحَّ عن ابن مسعود أنَّه سُئِلَ عمَّن له جارٌ يأكلُ الرِّبا علانيةً ولا يتحرَّجُ من مالٍ خبيثٍ يأخُذُه يدعوه إلى طعامه، قال: أجيبوهُ، فإنَّما المَهْنأُ لكم والوِزْرُ عليه. وفي رواية أنَّه قال: لا أعلمُ له شيئاً إلاّ خبيثاً أو حراماً، فقال: أجيبوه. وقد صحح الإمام أحمد هذا عن ابن مسعود، ولكنَّه عارضه بما رُوي عنه أنَّه قال: الإثم حَوَازُّ القلوب" (جامع العلوم والحکم ۸/۱۲، فی شرح خمسین حدیثاً من جوامع الکلم تألیف الإمام الحافظ الفقیہ زین الدین أبی الفرج عبدالرحمٰن بن شہاب الدین البغدادی ثم الدمشقی الشہیر بابن رجب المتوفی سنۃ (۷۹۵ھ)، حقق نصوصہ وخرّج أحادیثہ وعلّق علیہ الدکتور ماہر یاسین الفحل)۔

اس کے علاوہ کتب فقہ میں بھی تصریحات موجود ہیں کہ وراثت کے سرمائے میں حرام وحلال اس طرح مخلوط ہوں کہ ان میں تمیز مشکل ہو اور ان کے متعین مالکین کا پتہ نہ ہو (مثلاً رشوت یا غصب کے طور پر حاصل نہ ہوا ہو) تو وارثین کے لئے ایسے مال کو استعمال کرنے کی اجازت ہے، البتہ احتیاط کرنا بہتر ہے، نیز جائیداد کے کسی حصہ کے بارے میں متعین طور پر معلوم ہو کہ یہ غصب یا رشوت کے ذریعہ حاصل ہوا ہے اور اس کے مالکین موجود ہوں تو ان کو لوٹانا واجب ہے:

☆ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"مطلب فيمن ورث مالا حراما قوله (إلا في حق الوارث الخ) أي فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له لكن إذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه وهذا معنى قوله وقيده في الظهيرية الخ، وفي منية المفتي: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لا يحل ولكن لا يعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه اهـ وكذا لا يحل إن علم عين الغصب مثلا وإن لم يعلم مالكه لما في البزازية: أخذ مورثه رشوة

أو ظلما إذا علم ذلک بعینه لا یحل له أخذه وإلا فله أخذه حکما أما فی الدیانة فیتصدق به بنیة إرضاء الخصماء اھ والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم وإلا فإن علم عین الحرام لا یحل له ویتصدق به بنیة صاحبه وإن کان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا یعلم أربابه ولا شیئا منه بعینه حل له حکما والأحسن دیانة التنزه عنه .....لکن فی المجتبی مات وکسبه حرام فالمیراث حلال ثم رمز وقال لا نأخذ بهذه الروایة وهو حرام مطلقا علی الورثة فتنبه اھ ح ومفاده الحرمة وإن لم یعلم أربابه وینبغی تقییده بما إذا کان عین الحرام لیوافق ما نقلناه إذ لو اختلط بحیث لا یتمیز یملکه ملکا خبیثا لکن لا یحل له التصرف فیه ما لم یؤد بدله کما حققناه قبیل باب زکاة المال فتأمل''

(حاشیۃ ردالمختار علی الدرالمختار شرح تنویرالأبصار ۵/۹۹، الناشر دارالفکر للطباعۃ والنشر، سنۃ النشر ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰م، مکان النشر بیروت، عدد الأجزاء ۸)۔

شامی میں ہی ایک دوسرے مقام پر ہے:

وفی حاشیة الحموی عن الذخیرة سئل الفقیه أبو جعفر عمن اکتسب ماله من أمراء السلطان وجمع المال من أخذ الغرامات المحرمات وغیر ذلک هل یحل لمن عرف ذلک أن یأکل من طعامه قال أحب إلی أن لا یأکل منه ویسعه حکما أن یأکله إن کان ذلک الطعام لم یکن فی ید المطعم غصبا أو رشوة اه أی إن لم یکن عین الغصب أو الرشوة لأنه لم یملکه فهو نفس الحرام فلا یحل له ولا لغیره وذکر فی البزازیة هنا أن من لا یحل له أخذ الصدقة فالأفضل له أن لا یأخذ جائزة السلطان ثم قال وکان العلامة بخوارزم لا یأکل من طعامهم ویأخذ جوائزهم فقیل له فیه فقال تقدیم الطعام یکون إباحة والمباح له یتلفه علی ملک المبیح فیکون آکلا طعام الظالم والجائزة تملیک فیتصرف فی ملک نفسه اه قلت ولعله مبنی علی القول بأن الحرام لا یتعدی إلی ذمتین وسیأتی تحقیق خلافه فی البیع الفاسد والحظر والإباحة قوله (لأنه لیس بحرام بعینه الخ) یوهم أنه قبل الخلط حرام لعینه مع أن المصرح به فی کتب الأصول أن مال الغیر حرام لغیره لا لعینه بخلاف لحم المیتة وإن کانت حرمته قطعیة إلا أن یجاب بأن المراد لیس هو نفس الحرام لأنه ملکه بالخلط وإنما الحرام التصرف فیه قبل أداء بدله ففی البزازیة قبیل کتاب الزکاة ما یأخذه من المال ظلما ویخلطه بماله وبمال مظلوم آخر یصیر ملکا له وینقطع حق الأول فلا یکون أخذه عندنا حراما محضا نعم لا یباح الانتفاع به قبل أداء البدل فی الصحیح من المذهب اه'' (حاشیۃ ردالمختار علی الدرالمختار شرح تنویرالأبصار ۲/۲۹۲، الناشر دارالفکر للطباعۃ والنشر، سنۃ النشر ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء، مکان النشر بیروت، عدد الأجزاء ۸)۔

مجمع الانہر میں ہے:

"ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب فى مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله من حل بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به وفى البزازية غالب مال المهدى إن حلالا لا بأس بقبول هديته وأكل ماله ما لم يتبين أنه من حرام لأن أموال الناس لا يخلو عن حرام فيعتبر الغالب وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل إلا إذا قال إنه حلال أورثته واستقرضته ..... وفى الخلاصة السلطان إذا قدم شيئا من المأكولات إن اشتراه يحل وإن لم يشتره ولكن الرجل لا يعلم أن فى الطعام شيئا مغصوبا بعينه يباح أكله وفى الخانية رجل غصب لحما فطبخه أو حنطة فطحنها قال أبو بكر البلخى يحل له أكله وعليه الضمان فى قول الإمام وهذا ظاهر قوله لأن قول الإمام ومحمد إذا غصب حنطة فطحنها أو لحما فطبخه ينقطع حق المالك ويصير ملكا للغاصب وقال أبو يوسف أكله حرام قبل أن يرضى صاحبها" (مجمع الأنہر فی شرح ملتقی الأبحر ۴/ ۱۸۷، عبدالرحمٰن بن محمد بن سلیمان الکلیبولی المدعو بشیخی زادہ سنۃ الولادۃ، سنۃ الوفاۃ ۱۰۷۸ھ، حقق وخرج آیاتہ وأحادیثہ خلیل عمران المنصور الناشر دار الکتب العلمیۃ سنۃ النشر ۱۴۱۹ھ، ۱۹۹۸ء، مکان النشر لبنان بیروت، عدد الأجزاء ۴)۔

حرام مال کے وارثین اگر غریب ہوں:

الجواب: ۲

اگر جائیداد کے کسی حصہ کا کوئی متعین مالک ہے، تب تو ہر حال میں مالک تک اس حصہ کی واپسی واجب ہے، لیکن اگر ایسی صورت حال نہ ہو اور جائیداد کے کسی حصے کے کسی متعین مالک کا پتہ نہ ہو تو اصولاً یہ پورا سرمایہ فقراء پر قابل تصدق ہے، اس لئے کہ مال حرام کا مصرف یہی ہے، لیکن اگر انسان خود ہی فقیر ہو، یا اس سرمایہ کے ختم ہوجانے پر فقر کا اندیشہ ہو، اور اس کے اہل وعیال کی ضرورت کے لئے کوئی دوسرا مال موجود نہ ہو تو بھی ایسے مال سے پرہیز کرنا ہی تقاضائے احتیاط ہے، لیکن درجہ جواز میں اس جائیداد سے استفادہ کی گنجائش ہے، اس لئے کہ بحیثیت فقیر دیگر فقراء کے مقابلے میں اس سرمایہ پر اس کا حق مقدم ہے کہ وہ اس کے قبضے میں ہے، البتہ یہ نیت رکھنی چاہئے کہ صاحب استطاعت ہونے پر حرام کے بقدر پورا مال صدقہ کردے گا، اور مجبوری کے دنوں میں جو حرام مال اس نے استعمال کیا اس پر توبہ واستغفار بھی کرتا رہے۔

علامہ موصلی رقمطراز ہیں:

"ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف فى ملك الغير، والفرع يحصل على صفة

الأصل، والملک الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنیا تصدق بمثله، وإن کان فقیرا لا یتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۷۰، المؤلف: عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی دار النشر: دار الکتب العلمیۃ- بیروت، لبنان ۱۴۲۶ھ، ۲۰۰۵ء، الطبعۃ: الثالثۃ تحقیق: عبداللطیف محمد عبدالرحمٰن، عدد الأجزاء/ ۵)۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"إِلَّا إِذَا كَانَ لَا يَجِدُ غَيْرَهُ ؛ لِأَنَّهُ مُحْتَاجٌ إِلَيْهِ ، وَلَهُ أَنْ يَصْرِفَهُ إِلَى حَاجَةِ نَفْسِهِ ، فَلَوْ أَصَابَ مَالًا تَصَدَّقَ بِمِثْلِهِ إِنْ كَانَ غَنِيًّا وَقْتَ الِاسْتِعْمَالِ ، وَإِنْ كَانَ فَقِيرًا فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ لِمَا ذَكَرْنَا" (الہدایۃ شرح بدایۃ المبتدی ۴/ ۱۴، أبی الحسن علی بن أبی بکر بن عبدالجلیل الرشدانی المرغینانی، سنۃ الولادۃ ۵۱۱ھ، سنۃ الوفاۃ ۵۹۳ھ، الناشر المکتبۃ الإسلامیۃ)۔

حضرت امام سرخسیؒ نے اس کی توجیہ یہی کی ہے کہ اس کی اپنی حاجت دیگر فقراء پر مقدم ہے:

"وحاجته تقدم علی حق الفقراء فإذا أصاب بعد ذلک مالا تصدق بمثله إن کان استهلک الثمن یوم استهلکه وهو غنی عنه وإن کان محتاجا یوم استهلک الثمن لم یکن علیه أن یتصدق بشیء من ذلک لأن وجوب الضمان علیه باعتبار استهلاکه الثمن ولو استهلک الغلة مکان الثمن فإن کان محتاجا فلیس علیه أن یتصدق بشیء منه وإن کان غنیا فعلیه أن یتصدق بمثله فکذلک فی استهلاک الثمن وإنما قلنا ذلک لأن حق الفقراء فی هذا المال بمنزلة حقهم فی اللقطة، علی معنی أن له أن یتصدق وله أن یردها علی المالک إن شاء ثم الملتقط إذا کان محتاجا فله أن یصرف اللقطة إلی حاجة نفسه بخلاف ما إذا کان غنیا فکذلک حکم هذه الغلة" (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۱۴۰، تألیف: شمس الدین أبوبکر محمد بن أبی سہل السرخسی، دراسۃ وتحقیق: خلیل محی الدین المیس الناشر: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان الطبعۃ الأولی، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء)۔

اسی طرح لقطہ کے ضمن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بیان کیا گیا ہے کہ لقطہ اٹھانے والا اگر مالدار ہو تو اس کے لئے اس سے انتفاع درست نہیں ہے، لیکن اگر حاکم کی اجازت سے وہ اس کو بطور قرض استعمال کرے تو اس کی گنجائش ہے، اور وہ اس پر قرض رہے گا، یہی حکم لقطہ سے حاصل شدہ آمدنی کا بھی ہے، لیکن اگر لقطہ اٹھانے والا غریب ہو اور اسے اس مال کی حاجت ہو تو اس کو اپنی ضرورت کے لئے استعمال کرسکتا ہے اور یہ قرض نہیں ہوگا، امام سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"وعن أبی سعید مولی أسید قال وجدت خمسمائة درهم بالحرة وأنا مکاتب فذکرت ذلک لعمر بن الخطاب رضی الله عنه فقال اعمل بها وعرفها فعملت بها حتی أدیت مکاتبتی ثم أتیته فأخبرته بذلک فقال ادفعها إلی خزان بیت المال وفی هذا دلیل أن للإمام ولایة الإقراض فی اللقطة والدفع مضاربة لأن قول عمر رضی الله عنه اعمل بها وعرفها إما أن یکون بطریق المضاربة أو

الإقراض مضاربة وقد علمنا أنه لم يرد المضاربة حتى لم يتبين نصيبه من الربح فكان مراده الإقراض منه وفي هذا معنى النظر لصاحب المال لأنه يعرض للهلاک فيهلک من صاحبه قبل الإقراض وبعد الإقراض يصير دينا في ذمة المستقرض يؤمن فيه التوى بالهلاک وكذلک بالجحود لأنه متأكد بعلم القاضي ولهذا كان للقاضي ولاية الإقراض في أموال اليتامى وربما يكون معنى النظر في الدفع إليه مضاربة أو إلى غيره فذلک كله إلى القاضي لأنه نصب ناظرا وفيه دليل على أن الملتقط إذا كان محتاجا فله أن ينتفع باللقطة بعد التعريف لأن هذا المكاتب كان محتاجا إلى العمل فيها فيؤدي مكاتبته من ربحها فأذن له عمر رضي الله عنه في ذلک" (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷، تألیف: شمس الدین أبوبکر محمد بن أبی سہل السرخسی دراسۃ وتحقیق: خلیل محی الدین المیس الناشر: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان الطبعۃ الأولی، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء)۔

بلکہ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی مقام پر حاکم موجود نہ ہو تو قاضی یا مفتی یا کسی متقی عالم دین کی اجازت بھی قرض کے جواز کے لئے کافی ہوگی، فقہائے مالکیہ کے یہاں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں:

"**فإن لم يكن حاكم فصالحو البلد يقومون مقام الحاكم**" (الخرشی علی مختصر سیدی خلیل ۴/ ۹۸، الناشر دار الفکر للطباعۃ مکان النشر بیروت عدد الأجزاء ۴)۔

"**وَالْعُدُولُ يَقُومُونَ مَقَامَ الْحَاكِمِ عِنْدَ تَعَذُّرِهِ إمَّا لِعَدَمِ أَمَانَتِهِ أو لِعَدَمِ اعْتِنَائِهِ بِالْأُمُورِ**" (حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۳/ ۱۷، محمد عرفہ الدسوقی تحقیق محمد علیش الناشر دار الفکر مکان النشر بیروت عدد الأجزاء ۴)۔

"**اعْلَمْ أَنَّ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ الْعُدُولِ يَقُومُونَ مَقَامَ الْحَاكِمِ في ذلک وفي كل أَمْرٍ يَتَعَذَّرُ الْوُصُولُ فيه إلَى الْحَاكِمِ أو لِكَوْنِهِ غير عَدْلٍ اه وَالْوَاحِدُ منهم كَافٍ كما قَالَهُ شَيْخُنَا**" (حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر ۲/ ۵۱۹، محمد عرفہ الدسوقی تحقیق محمد علیش الناشر دار الفکر مکان النشر بیروت عدد الأجزاء ۴)۔

"**قال النووی نقلا عن الغزالی: إذا كان معه ما ل حرام وأراد التوبة والبرائة منه، فإن كان له مالک معين وجب صرفه إليه او إلىٰ وكيله، فإن كان ميتاوجب دفعه إلىٰ وارثه، و إن كا ن لما لک لايعرفه ويئس من معرفته فينبغي أن يصرفه في مصالح المسلمين العامة، كالقناطر والربط والمساجد والمصالح طريق مكة ونحو ذالک ممايشترک المسلمون فيه، و إلافيتصدق علىٰ فقير أو فقراء، وينبغي أن يتولىٰ ذالک القاضي إن كا ن عفيفا، وفإن لم يكن عفيفا لم يجز التسليم إليه، فإن سلمه إليه صار المسلم ضامنا، بل ينبغي أن يحكم رجلا من أهل البلد دينا عا لما، فإن التحكم أولىٰ من الانفراد، فإن عجزعن ذالک تولاه بنفسه، فإن المقصود هوانصراف إلىٰ هٰذه الجهة، و إذا دفعه إلى**

الفقير لايكون حراما على الفقير، بل يكو ن حلا لاطيبا، وله أن يتصدق به علىٰ نفسه وعياله إذا كان فقيرا، لأن عياله إذاكا نوا فقراء فالوصف موجود فيهم، بل هم أولىٰ من يتصدق عليه، وله هو أن يأخذ منه قدر حاجته، لأنه أيضافقير" (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ: ۴۳/ ۵۴۲)۔

ہمارے دور میں عالم اسلام کے ممتاز فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی بھی یہی رائے ہے (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۴۷، حضرت مفتی محمد تقی عثمانی، ناشر مکتبہ معارف القرآن کراچی، ربیع الاول ۱۴۳۶ھ)۔

جس شخص کے پاس حرام کمائی کے سوا کوئی مال موجود نہ ہو:

الجواب: ۳

اصولی طور پر پاک مال صرف وہ ہے جو پاک ذرائع سے حاصل ہو، حرام طریقہ سے یا حرام مال کے ذریعہ حاصل شدہ آمدنی خبث سے پاک نہیں ہے، اور اس کا مصرف صدقہ ہے، لیکن ایسا شخص جس کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا پاک مال موجود نہ ہو، اور نہ جائز طریق پر کمانے کی اس میں صلاحیت ہو، اس کے لئے بدرجہ مجبوری ایسے مال کو اپنی ضرورت میں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

"**الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم بها**" (الاشباہ والنظائر/ ۴۳۲۳)۔

علامہ حمویؒ نے اس پر تفریع کرتے ہوئے لکھا ہے:

"**من رأى المكاس مثلاً يأخذ من أحد شيأً من المكس ثم يعطيه آخر ثم يأخذه من ذلك الآخر فهو حرام**" (حاشیۃ الاشباہ/ ۴۳۲۳)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"**وَسُئِلَ أبو بَكْرٍ عن الذى لَا يَحِلُّ له أَخْذُ الصَّدَقَةِ فَالْأَفْضَلُ له أَنْ يَقْبَلَ جَائِزَةَ السُّلْطَانِ وَيُفَرِّقَهَا على من يَحِلُّ له**" (الفتاوی الہندیۃ فی مذہب الإمام الأعظم أبی حنیفۃ النعمان الشیخ نظام وجماعۃ من علماء الہند ۵/ ۳۴۲، الناشر دار الفکر سنۃ النشر ۱۴۱۱ھ، ۱۹۹۱ء، مکان النشر عدد الأجزاء ۶)۔

صاحب بدائع لکھتے ہیں:

"**وَلِأَنَّ الطَّيِّبَ لَايَثْبُتُ إلَّابِالْمِلْكِ الْمُطْلَقِ وفى هذا الْمِلْكِ شُبْهَةُ الْعَدَمِ لِأَنَّهُ يَثْبُتُ من وَقْتِ الْغَصْبِ بِطَرِيقِ الِاسْتِنَادِ وَالْمُسْتَنَدُ يَظْهَرُمن وَجْهٍ وَيَقْتَصِرُعلى الْحَالِ من وَجْهٍ فَكَانَ فى وُجُودِهِ من**

وَقْتِ الْغَصْبِ شُبْهَةُ الْعَدَمِ فَلَا يَثْبُتُ بِهِ الْحِلُّ وَالطَّيِّبُ وَلِأَنَّ الْمِلْكَ من وَجْهٍ حَصَلَ بِسَبَبٍ مَحْظُورٍ أو وَقَعَ مَحْظُورًا بِابْتِدَائِهِ فَلَا يَخْلُو من خُبْثٍ" (بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۷/ ۱۵۳، علاء الدین الکاسانی سنۃ الولادۃ، سنۃ الوفاۃ ۵۸۷، الناشر دار الکتاب العربی سنۃ النشر ۱۹۸۲ء، مکان النشر بیروت عدد الأجزاء ۷)۔

علامہ موصلی رقمطراز ہیں:

والفرعی حصل علی صفة الأصل، والملک الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنیا تصدق بمثله، وإن کان فقیرا لایتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۷۰، المؤلف: عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی الحنفی دار النشر: دار الکتب العلمیۃ - بیروت، لبنان ۱۴۲۶ھ، ۲۰۰۵ء، الطبعۃ: الثالثۃ تحقیق: عبداللطیف محمد عبدالرحمٰن عدد الأجزاء ۵)۔

حرام کاروبار میں ملوث شخص کی دعوت قبول کرنا:

الجواب: ۴

اگر یقین کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ دعوت دینے والا شخص حرام کمائی ہی سے دعوت کھلا رہا ہے تو ایسی دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہے، البتہ احتیاط بہتر ہے؛ بشرطیکہ کسی فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو، اوپر متعدد صحابہ اور تابعین کے جو آثار نقل کئے گئے ہیں ان سے یہی حکم ثابت ہوتا ہے، علاوہ فقہاء کی تصریحات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے:

"قَالَ فِي الْقُنْيَةِ مِنْ الْكَرَاهَةِ: غَلَبَ عَلَى ظَنِّهِ أَنَّ أَكْثَرَ بُيُوعَاتِ أَهْلِ السُّوقِ لَا تَخْلُو عَنْ الْفَسَادِ فَإِنْ كَانَ الْغَالِبُ هُوَ الْحَرَامَ تَنَزَّهَ عَنْ شِرَائِهِ، وَلَكِنْ مَعَ هَذَا لَوْ اشْتَرَاهُ يَطِيبُ لَهُ،(انْتَهَى)" (-الأشباہ والنظائر علی مذہب أبی حنیفۃ النعمان ۱/ ۱۱۳، المؤلف: الشیخ زین العابدین بن إبراہیم بن نجیم ۹۷۰-۹۲۶ھ)، المحقق: الناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان الطبعۃ ۱۴۰۰ھ، ۱۹۸۰ء، عدد الأجزاء ۱)۔

"إذَا كَانَ غَالِبُ مَالِ الْمُهْدِي حَلَالًا، فَلَا بَأْسَ بِقَبُولِ هَدِيَّتِهِ،وَأَكْلِ مَالِهِ مَالَمْ يَتَبَيَّنْ أَنَّهُ مِنْ حَرَامٍ ، وَإِنْ كَانَ غَالِبُ مَالِهِ الْحَرَامَ لَا يَقْبَلُهَا، وَلَا يَأْكُلُ إلَّا إذَا قَالَ: إنَّهُ حَلَالٌ وَرِثَهُ أَوْ اسْتَقْرَضَهُ .قَالَ الْحَلْوَانِيُّ: وَكَانَ الْإِمَامُ أَبُو الْقَاسِمِ الْحَاكِمُ يَأْخُذُ جَوَائِزَ السُّلْطَانِ، وَالْحِيلَةُ فِيهِ أَنْ يَشْتَرِيَ شَيْئًا بِمَالٍ مُطْلَقٍ ثُمَّ يَنْقُدُهُ مِنْ أَيِّ مَالٍ شَاءَ كَذَا رَوَاهُ الثَّانِي عَنْ الْإِمَامِ ،وَعَنْ الْإِمَامِ أَنَّ الْمُبْتَلَى بِطَعَامِ السُّلْطَانِ، وَالظَّلَمَةِ يَتَحَرَّى فَإِنْ وَقَعَ فِي قَلْبِهِ حِلُّهُ قَبِلَ وَأَكَلَ، وَإِلَّا لَا ، لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: اسْتَفْتِ قَلْبَكَ" (الأشباہ والنظائر علی مذہب أبی حنیفۃ النعمان ۱/ ۱۱۲، المؤلف: الشیخ زین العابدین بن إبراہیم بن نجیم ۹۷۰-۹۲۶ھ، المحقق: الناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان الطبعۃ ۱۴۰۰ھ، ۱۹۸۰ء، عدد الأجزاء ۱)۔

مجمع الانہر میں ہے:

"وفی الخلاصة السلطان إذا قدم شیئا من المأکولات إن اشتراہ یحل وإن لم یشترہ ولکن الرجل لا یعلم أن فی الطعام شیئا مغصوبا بعینه یباح أکله وفی الخانیة رجل غصب لحما فطبخه أو حنطة فطحنها قال أبو بکر البلخی یحل له أکله وعلیه الضمان فی قول الإمام وهذا ظاهر قوله لأن قول الإمام ومحمد إذا غصب حنطة فطحنها أو لحما فطبخه ینقطع حق المالک ویصیر ملکا للغاصب" (مجمع الأنہر فی شرح ملتقی الأبحر ۴/ ۱۸۷، عبدالرحمٰن بن محمد بن سلیمان الکلیبو لی المدعو بشیخی زادہ سنۃ الولادۃ، سنۃ الوفاۃ ۱۰۷۸ھ، حقق و خرج آیاتہ وأحادیثہ خلیل عمران المنصور الناشر دار الکتب العلمیۃ سنۃ النشر ۱۴۱۹ھ، ۱۹۹۸ء، مکان النشر لبنان، بیروت عدد الأجزاء/ ۴)

عالمگیری میں ہے:

"والثانی إن علم أن المال الحرام بعینه قائم إلا أنه اختلط بالغیر بحیث لا یمکن التمیز عنه فإن علی أصل أبی حنیفة بالخلط یدخل فی ملکه إلا أنه لاینبغی أن یشتری منه" (عالمگیری، کتاب الکراھیۃ: ۵/ ۳۶۳)۔

حرام مال کھانے کے بعد اس کی تلافی کا طریقہ:

الجواب: ۵

اگر پہلے سے معلوم نہیں تھا، بعد میں معلوم ہوا تو یہ ایک غیر اختیاری غلطی ہے، اس کا کفارہ توبہ واستغفار ہے، اور بہتر ہے کہ کچھ صدقہ وخیرات بھی کر دیا جائے، جیسا کہ ایسے مواقع پر رسول اکرم ﷺ کی ہدایت یہی ہے، ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! بسا اوقات کاروبار کے وقت شیطان دخیل ہوجاتا ہے، اور بہت سی لغویات اور غیر واقعی چیزیں بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر شامل ہوجاتی ہیں (جن کے اثرات آمدنی پر پڑتے ہیں)، اس لئے صدقات بھی دیتے رہو، تاکہ کسی حد تک تمہاری غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی بھی ہوتی رہے:

"عَنْ قَیْسِ بْنِ أَبِی غَرَزَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَیْنَارَسُولُ اللَّهِ–صلی الله علیه وسلم– وَنَحْنُ نُسَمَّی السَّمَاسِرَةَ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ التُّجَّارِ إِنَّ الشَّیْطَانَ وَالإِثْمَ یَحْضُرَانِ الْبَیْعَ فَشُوبُوا بَیْعَکُمْ بِالصَّدَقَةِ" (الجامع الصحیح سنن الترمذی ۳/ ۵۱۴، المؤلف: محمد بن عیسی أبوعیسی الترمذی السلمی الناشر: دار إحیاء التراث العربی بیروت تحقیق: أحمد محمد شاکر وآخرون عدد الأجزاء: ۵ الأحادیث مذیلۃ بأحکام الألبانی علیہا)۔

نیز احادیث میں حرام کھانے سے بچنے کی بڑی تاکید کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"یا سعد أطِبْ مطعَمَک تکن مستجاب الدَّعوة، والذی نفس محمد بیده إنَّ العبد لیقذف

اللُّقمة الحرام فی جوفه ما یتقبل الله منه عمل أربعین یوماً، وأیُّما عبدٍ نبت لحمُه من سُحتٍ فالنارُ أولی به" (جامع العلوم والحکم بشرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم ۱۲/۵، المؤلف: ابن رجب الحنبلی المحقق: ماہر یاسین فحل، وقد جعل تحقیقہ للکتاب مجانا فجزاہ اللہ خیرا مصدر الکتاب: موقع صید الفوائد إعداد البرنامج: المفتی محمد عارف باللہ القاسمی)۔

حرام مال کو حلال دائرے میں لانے کی تدبیر:

الجواب:(۶)

حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی ایک صورت یہ ہے کہ جس شخص کے پاس حرام مال ہو وہ حاکم یا حاکم نہ ملنے کی صورت میں کسی معتبر صالح مفتی کی اجازت سے پورا مال بطور قرض لے لے اور اس سے کوئی کاروبار شروع کردے ،اور پھر اپنی آمدنی کے تناسب سے تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا جائے، یہاں تک حرام کے بقدر پورا مال صدقہ میں خرچ ہوجائے، اب جو کچھ اس کے پاس بچے گا وہ حلال قرار پائے گا، فقہاء نے مالدار کو بھی کاروبار کے لئے مال حرام بطور قرض لینے کی اجازت دی ہے؛ بشرطیکہ اس کے پاس کوئی دوسرا مال موجود نہ ہو:

"**وفی هذا دلیل أن للإمام ولایة الإقراض فی اللقطة والدفع مضاربة لأن قول عمر رضی الله عنه اعمل بها وعرفها إما أن یکون بطریق المضاربة أو الإقراض مضاربة وقد علمنا أنه لم یرد المضاربة حتی لم یتبین نصیبه من الربح فکان مراده الإقراض منه وفی هذا معنی النظر لصاحب المال لأنه یعرض للهلاک فیهلک من صاحبه قبل الإقراض وبعد الإقراض یصیر دینا فی ذمة المستقرض یؤمن فیه التوی بالهلاک وکذلک بالجحود لأنه متأکد بعلم القاضی ولهذا کان للقاضی ولایة الإقراض فی أموال الیتامی**" (المبسوط للسرخسی ۱۱/۷، تألیف: شمس الدین أبوبکر محمد بن أبی سہل السرخسی دراسۃ وتحقیق: خلیل محی الدین المیس الناشر: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان الطبعۃ الأولی، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء)۔

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی ایک یا چند فقراء کو مال حرام صدقہ کردے اور پھر وہ فقراء بطیّب خاطر اسے ہدیہ کردیں، اس لئے کہ تبدل ملک اور تبدل ذمہ سے شئ کی حقیقت تبدیل ہوجاتی ہے:

"**وذکر فی البزازیة هنا أن من لا یحل له أخذ الصدقة فالأفضل له أن لا یأخذ جائزة السلطان ثم قال وکان العلامة بخوارزم لا یأکل من طعامهم ویأخذ جوائزهم فقیل له فیه فقال تقدیم الطعام یکون إباحة والمباح له یتلفه علی ملک المبیح فیکون آکلا طعام الظالم والجائزة تملیک فیتصرف**

فی ملک نفسه اه قلت ولعله مبنی علی القول بأن الحرام لا یتعدی إلی ذمتین وسیأتی تحقیق خلافه فی البیع الفاسد والحظر والإباحة" (حاشیۃ ردالمختار علی الدرالمختار شرح تنویر الأبصار ۲/ ۲۹۲، الناشر دار الفکر للطباعۃ والنشر، سنۃ النشر ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء، مکان النشر بیروت، عدد الأجزاء ۸)۔

☆ تیسری صورت یہ ہے کہ مطلقاً کوئی سامان ادھار خرید لے اور پھر اس کی قیمت اپنے پاس موجود مال حرام سے ادا کردے، اس طرح جو مال حاصل ہوگا وہ اس کے لئے جائز ہوگا، پھر مال حرام کو آہستہ آہستہ صدقہ وغیرہ کے ذریعہ اپنے پاس سے خارج کرتا رہے، اس لئے کہ دفعتاً سارا مال صدقہ کرنا ممکن نہیں، یہ باعث حرج ہوگا۔

"**قَالَ الْحَلْوَانِيُّ: وَكَانَ الْإِمَامُ أَبُو الْقَاسِمِ الْحَاكِمُ يَأْخُذُ جَوَائِزَ السُّلْطَانِ، وَالْحِيلَةُ فِيهِ أَنْ يَشْتَرِيَ شَيْئًا بِمَالٍ مُطْلَقٍ ثُمَّ يَنْقُدُهُ مِنْ أَيِّ مَالٍ شَاءَ كَذَارَوَاهُ الثَّانِي عَنْ الْإِمَامِ**" (الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِيْ حَنِيْفَةَ النُّعْمَانِ ۱/ ۱۱۲، المؤلف: الشَّيْخ زَيْنُ الْعَابِدِيْنَ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ نُجَيْمٍ ۹۷۰-۹۲۶، المحقق: الناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان الطبعۃ: ۱۴۰۰ھ، ۱۹۸۰ء، عدد الأجزاء ۱)۔

☆ ایک شکل یہ بھی ہے کہ الگ سے کچھ جائز سرمایہ فراہم کرے کما کر یا کسی سے قرض لے کر، پھر اس جائز سرمایے میں ناجائز مال کا خلط کردے، خلط کرنے پر امام ابوحنیفہؒ کے اصول پر ملکیت حاصل ہوجاتی ہے، پھر آہستہ آہستہ تصدق کے ذریعہ مال حرام کو اپنی ملکیت سے خارج کرتا جائے۔

عالمگیری میں ہے:

"**والثانی إن علم أن المال الحرام بعینه قائم إلا أنه اختلط بالغیر بحیث لا یمکن التمیز عنه فإن علی أصل أبی حنیفة بالخلط یدخل فی ملکه إلا أنه لا ینبغی أن یشتری منه**" (عالمگیری، کتاب الکراھیۃ: ۵/ ۳۶۳)۔

اپنے پاس موجود حرام مال کو بطور قرض لے کر کاروبار کرنا:

الجواب: ۷

موجودہ حالات میں بشرط دیانت اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، البتہ خود قرض لینے کے بجائے حاکم یا قاضی اور یہ نہ ہوں تو کم از کم اپنے علاقے کے مفتی کے سامنے پوری صورت حال رکھ کر ان کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے، حاکم یا مفتی کی اجازت کے بغیر قرض لینے کا عمل درست نہ ہوگا، خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطابؓ کے دور میں ایک شخص کو مال لقطہ ملا تو اسے آپؓ نے بطور قرض لے کر کاروبار کرنے کی اجازت دی، اس سے فقہاء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ ایسا مال جس پر انسان کا حق نہیں ہے، حاکم کی اجازت سے بطور قرض لے کر اس سے کاروبار کیا جاسکتا ہے، یہ مسئلہ فقہاء نے امیر شخص کے

لئے بیان کیا ہے (دیکھئے: المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷، الموسوعہ الفقہیۃ ۴۳/ ۵۴۲)۔

(المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷، تألیف: شمس الدین أبوبکر محمد بن أبی سہل السرخسی دراسۃ وتحقیق: خلیل محی الدین المیس الناشر: دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان الطبعۃ الأولی، ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء)۔

ناجائز کام کی ملازمت کی اجرت:

الجواب: ۸

یہ صورت بھی خبث اور فساد سے خالی نہیں ہے، اور جائز اور ناجائز دونوں طرح کے معاملات سے مرکب ہے، عام حالات میں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، لیکن اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال ہوگی، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی معاملہ کی بنیاد ناجائز امر پر ہو اور اس سلسلے میں کی جانے والی محنت پر اجرت حاصل ہو تو اجارہ فاسد اور باعث گناہ ہونے کے باوجود اس کی کمائی جائز ہوگی:

"وفی الْعَتَّابِيَّةِ وَأَمَّا الْمَعْصِيَةُ نَحْوَ أَنْ يَسْتَأْجِرَ نَائِحَةً أو مُغَنِّيَةً أو لِتَعْلِيمِ الْغِنَاءِ وفی فتاوی أَهْلِ سَمَرْقَنْدَ اسْتَأْجَرَ رَجُلًا لِيَنْحِتَ له مِزْمَارًا أو طَنْبُورًا أو بَرْبَطًا فَفَعَلَ يَطِيبُ له الْأَجْرُ إلَّا أَنَّهُ يَأْثَمُ فی الْإِعَانَةِ علی الْمَعْصِيَةِ وَلَوْ اسْتَأْجَرَ الْمُسْلِمَ لِيَبْنِيَ له بِيعَةً أو كَنِيسَةً جَازَ وَيَطِيبُ له الْأَجْرُ" (البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۸/ ۲۳، زین الدین ابن نجیم الحنفی سنۃ الولادۃ ۹۲۶ھ، سنۃ الوفاۃ ۹۷۰ھ، الناشر دار المعرفۃ مکان النشر بیروت)۔

"وإن استأجرها ليزنی بها ثم أعطاها مهرها أوماشرط لها لابأس بأخذه لأنه إجارة فاسدة فيطيب له وإن كان السبب حراماً" (البحر الرائق ۸/ ۹۱)۔

حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنا:

الجواب: ۹

حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنا یا حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں ملازمت کرنا فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ اسے خود کسی ناجائز عمل میں مبتلا نہ ہونا پڑے، اور اس سے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی حلال اور طیب ہے، اس لئے کہ اجرت ملازم کے عمل پر ملتی ہے، اور ملازم کے عمل کا تعلق مالک کی حرام آمدنی سے نہیں ہے، بلکہ روزمرہ کے جائز اعمال سے ہے، اور اگر کبھی کسی ناجائز امر میں ملوث بھی ہونا پڑے تو وہ معاملہ کی اصل بنیاد نہیں ہے، اس لئے گو کہ ناجائز امر میں ملوث ہونا گناہ ہے اور اس سے بچنا واجب ہے، لیکن مجموعی خدمات پر ملنے والی اجرت پاک اور جائز ہے:

"**الأمور بمقاصدها**" (الاشباہ والنظائر،ص ۳۵)۔

"**وأن ما تقوم المعصية بعينه ما توجد فيه على وصفه الموجود حالة البيع كالأمرد والسلاح**" (حاشیۃ ردالمختار علی الدرالمختار شرح تنویر الأبصار ۶/ ۳۹۱، الناشر دار الفکر للطباعۃ والنشر، سنۃ النشر ۱۴۲۱ھ، ۲۰۰۰ء، مکان النشر بیروت. عدد الأجزاء ۸)۔

"**وَلَهُ أَنَّ الْإِجَارَةَ على الْحَمْلِ، وهو ليس بِمَعْصِيَةٍ، وَلَا تَسَبُّبٍ لها, وَإِنَّمَا تَحْصُلُ الْمَعْصِيَةُ بِفِعْلِ فَاعِلٍ مُخْتَارٍ**" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۶/ ۲۹، فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی، الناشر دار الکتب الإسلامی، سنۃ النشر ۱۳۱۳ھ، مکان النشر القاہرۃ، عدد الأجزاء ۶)۔

"**وَلِهٰذَا يَجِبُ الْأَجْرُ بِمُجَرَّدِ التَّسْلِيمِ، وَلَا مَعْصِيَةَ فيه، وَإِنَّمَا الْمَعْصِيَةُ بِفِعْلِ الْمُسْتَأْجِرِ، وهو مُخْتَارٌ فيه لِقَطْعِ نِسْبَتِهِ عنه**" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۶/ ۲۹، فخر الدین عثمان بن علی الزیلعی الحنفی، الناشر دار الکتب الإسلامی، سنۃ النشر ۱۳۱۳ھ، مکان النشر القاہرۃ، عدد الأجزاء ۶)۔

حرام کمائی کرنے والے سے ان کے بچوں کی فیس لینا

حرام کمائی کرنے والا شخص اپنے بچے کی طرف سے مدرسہ یا اسکول میں فیس جمع کرے تو اسے وصول کرنا جائز ہے، اس میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ حرام کمائی سے دے رہا ہے یا حلال کمائی سے، اس لئے کہ یہ فیس اس کی واجبات میں شامل ہے، اور آدمی اپنے واجبات کو کہاں سے ادا کرے گا یہ اس کی ذمہ داری ہے، واجبات وصول کرنے والے کی نہیں، جیسے کہ دائن اگر مدیون کے بارے میں یہ فکر کرنے لگے کہ وہ اپنا دین جائز آمدنی سے ادا کر رہا ہے یا ناجائز آمدنی سے تو اس کا دین کبھی وصول نہ ہوگا، علاوہ یہ بھی امکان ہے کہ اس شخص نے اپنی جائز آمدنی ہی سے یہ فیس ادا کی ہو۔

اسی طرح حرام کمائی کرنے والے شخص کے ساتھ گاڑی یا بائک پر سفر کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں، کیونکہ ضروری نہیں کہ گاڑی یا اس کا سفر خرچ حرام آمدنی ہی سے ہو اور اگر ہو بھی تو اس کی ذمہ داری براہ راست گاڑی والے پر عائد ہوتی ہے، نہ اس کے ساتھ سفر کرنے والے پر۔

سرکاری دفاتر کی رشوتوں میں سودی رقم خرچ کرنا:

الجواب: ۱۰

☆ اس سوال میں ایک جزو تو یہ ہے کہ کیا مجبوری کی حالت میں جائز مقاصد کے حصول کے لئے رشوت دینے کی اجازت ہے یا نہیں؟ تو اس میں کسی فقیہ کا اختلاف نہیں کہ مجبوری کے وقت رشوت دے کر اپنا کام نکالنے کی اجازت ہے

،جیسا کہ کتب فقہیہ میں مذکوراس جزئیہ سے ظاہر ہوتا ہے:

"وفی الْقُنْیَةِ من الْکَرَاهِیَةِ یَجُوزُ لِلْمُحْتَاجِ الِاسْتِقْرَاضُ بِالرِّبْحِ اھ" (البحرالرائق شرح کنزالدقائق ۶/ ۱۳۷، زین الدین ابن نجیم الحنفی سنۃ الولادۃ ۹۲۶ھ، سنۃ الوفاۃ ۹۷۰ء، الناشر دارالمعرفۃ مکان النشر بیروت *الْأَشْبَاهُ وَالنَّظَائِرُ عَلَى مَذْهَبِ أَبِیْ حَنِیْفَةَ النُّعْمَانِ ص ۹۷، المؤلف: زین الدین بن إبراہیم بن محمد، الشہیر بابن نجیم (ت ۹۷۰ھ) وضع حواشیہ وخرج أحادیثہ: الشیخ زکریا عمیرات الناشر: دارالکتب العلمیۃ، بیروت لبنان الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۹ھ، ۱۹۹۹م عدد الصفحات: ۳۷۳)۔

دوسرا جزو یہ ہے کہ کیا اس ضرورت کے لئے سودی رقم خرچ کی جاسکتی ہے؟، دراصل اس حکم کی بنیاد اس پر ہے کہ سود کے ذریعہ حاصل کردہ رقم اس کے اصل مالک کو کسی طرح واپس کرکے اپنا ذمہ فارغ کرلیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ رقم خود استعمال کرنے کے بجائے غرباء ومساکین میں بلانیت ثواب تقسیم کردی جائے یا اس کو رفاہ عام کے کاموں میں لگادیا جائے:

علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں:

"قال فی النِّهَایَةِ قال بَعْضُ مَشَایِخِنَا کَسْبُ الْمُغَنِّیَةِ کَالْمَغْصُوبِ لم یَحِلَّ لِأَحَدٍ أَخْذُهُ قالوا وَعَلَی هذا لو مَاتَ رَجُلٌ وَکَسْبُهُ من ثَمَنِ الْبَاذِقِ وَالظُّلْمِ أو أَخْذِ الرِّشْوَةِ تَعُودُ الْوَرَثَةُ وَلَا یَأْخُذُونَ منه شیئا وهو الْأَوْلَی لهم وَیَرُدُّونَهُ علی أَرْبَابِهِ إنْ عَرَفُوهُمْ وَإِلَّا یَتَصَدَّقُوا بِهِ لِأَنَّ سَبِیلَ الْکَسْبِ الْخَبِیثِ التَّصَدُّقُ إذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ" (البحرالرائق شرح کنزالدقائق ۸/ ۲۲۹، زین الدین ابن نجیم الحنفی، سنۃ الولادۃ ۹۲۶ھ، سنۃ الوفاۃ ۹۷۰ھ، الناشر دار المعرفۃ مکان النشر بیروت)۔

اس لئے اگر بینک کے سود کی رقم انسان کے پاس ہو اور وہ سرکاری کارپوریشن یا حکومتی اداروں کے توسط سے رشوت کے نام پر یہ رقم حکومت کو واپس کردے تو اس کی گنجائش ہوگی، مگر مشکل یہ ہے کہ رشوت کی جو رقم افسران کو دی جاتی ہے وہ حکومت تک نہیں پہونچتی، بلکہ وہ ان کی جیبوں میں ہی رہ جاتی ہے، البتہ اگر یہ تاویل کی جائے کہ جب وہ جملہ معاملات میں حکومت کی نمائندگی کرتے ہیں تو اس میں بھی ان کو نمائندہ تصور کرلیا جائے، تو حرج نہیں، اور اگر وہ رقوم حکومت تک نہیں پہونچتی تو یہ ان افسران کی خیانت اور قصور ہے، ہم تو اپنے ذمہ سے فارغ ہوجائیں گے ان شاء اللہ، تو شاید کسی حد تک اس کا جواز نکل جائے، نیز اس کی یہ تصویر بھی بن سکتی ہے کہ گویا عملی طور پر ان رقوم کو ان کے اصل مالکوں تک پہونچانا مشکل ہے، پس ایسی صورت میں مدارس ان کا بہترین مصرف ہیں، اسی طرح وہ مسلمان بھی جو نقشہ اور تعمیرات کے بھاری اخراجات کے ساتھ رشوت کی گراں رقم کی ادائیگی کے متحمل نہ ہوں، آج مسلمانوں کے ساتھ سرکاری دفاتر میں جو امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اس کے پیش نظر اکثر مسلمان قابل رحم حالت میں نظر آتے ہیں، اس لحاظ سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔

سودی کاروبار میں ملوث لوگوں کے تحائف قبول کرنا

الجواب:۱۱

معاشرتی زندگی میں اس طرح کے تحفظات رکھنے کی گنجائش نہیں ہے، اس سے باہمی عداوت اور بدگمانی پیدا ہوتی ہے، اور احتیاط کے نام پر ایک فریق کے دماغ میں اپنے لئے تقدس کا گمان پیدا ہوتا ہے، جب تک کہ حرام کا یقین نہ ہو بے تکلف ایک دوسرے کے تحائف اور تعاون کو قبول کرنا چاہئے، اور ہر مسلمان کے بارے میں بہتر خیال رکھنا چاہئے، صحابہ کرام اور تابعین کے جو آثار اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے یہی روشنی ملتی ہے، دیکھئے:

"**عن الحارث بن سويد قال: جاء رجل إلى عبد الله يعنى ابن مسعود فقال: إن لى جاراً ولا أعلم له شيئاً إلا خبيثاً أو حراماً وإنه يدعونى فأحرج أن آتيه وأتحرج أن لا آتيه! فقال: ائته وأجبه فإنما وزره عليه**" (بلوغ الأرب بتقریب کتاب الشعب ۱/۳۹۰، (تہذیب لکتاب شعب الإیمان للبیہقی) ہذبہ: محمد خلف سلامۃ)۔

"**عن ذربن عبد الله عن بن مسعود قال جاء إليه رجل فقال إن لى جارا يأكل الربا وإنه لا يزال يدعونى فقال مهنأه لک وإثمه عليه قال سفيان فإن عرفته بعينه فلا تصبه**" (مصنف عبدالرزاق ۸/۱۵۰، حدیث نمبر ۱۴۶۷۵، المؤلف: أبوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی الناشر: المکتب الإسلامی بیروت الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۳، تحقیق: حبیب الرحمٰن الأعظمی عدد الأجزاء: ۱۱)۔

حرام کمائی کرنے والے کی درخواست دعا کا جواب:

الجواب:۱۲

ایسے مواقع پر دعا ضرور کرنی چاہئے، ان کو مایوس نہیں کرنا چاہئے، اور دعا کرانے والے کی ہدایت کی بھی دعا کرنی چاہئے، علاوہ ازیں دعا اس شخص کی قبول نہیں ہوتی جو حرام لقمے کھاتا ہو، یہاں تو دعا ایسے شخص سے کرائی جارہی ہے جو اس میں ملوث نہیں ہے، پھر اس کو دعا سے پرہیز کرنے کا کیا جواز ہے؟

اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس طرح کی احادیث جن میں حرام کھانے والوں کی دعا قبول نہ ہونے کی بات کہی گئی ہے، یہ ترغیب وترہیب سے متعلق ہیں، تاکہ انسان اس کے خوف سے رزق حرام سے پرہیز کرے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کو اپنے لئے دعا ہی نہیں کرنی چاہئے کہ اللہ پاک کی رحمت عامہ سے یہ مستبعد بات ہے، دعا تو اللہ پاک کافروں کی بھی قبول کرتے ہیں؛ جیسا کہ بہت سی روایات میں یہ مضمون آیا ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ''اتَّقُوا دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ وَإِنْ كَانَتْ مِنْ كَافِرٍ لَيْسَ لَهَا حِجَابٌ دُونَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ'' (الدعاء للطبرانی ص ۳۹۳، المؤلف: أبوالقاسم سلیمان بن أحمد الطبرانی (ت ۳۶۰ھ) المحقق: مصطفیٰ عبدالقادر عطا الناشر: دار الکتب العلمیۃ بیروت الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۳ عدد الصفحات: ۶۱۶)۔

علاوہ حدیث پاک میں تو یہ بھی آیا ہے کہ حرام لقمہ کھانے والے کی نماز اور عبادات بھی قبول نہیں ہوتیں، تو کیا آدمی نماز بھی چھوڑ دے؟ کہ قبول ہی نہیں ہوتیں، معاذ اللہ، غرض ان روایات کا تعلق وعیدات اور دعوت واصلاح سے ہے، احکام سے نہیں۔

واللہ اعلم بالصواب وعلمہ اتم واحکم

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق چند مسائل

ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی ☆

تمہید:

اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو حلال وحرام کا تصور دیتا ہے، حلال مال کمانے کی ترغیب دیتا ہے اور حرام سے باز رہنے کو لازم قرار دیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کو بھی حلال و پاکیزہ مال استعمال کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ''**یا أیها الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا إنی بما تعملون علیم**'' (المؤمنون:۵۱) (اے پیغمبرو! پاکیزہ رزق کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں تمہارے کاموں سے واقف ہوں)۔

علامہ ابن کثیرؒ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: ''**یأمر تعالیٰ عباده المرسلین – علیهم الصلوة والسلام أجمعین بالأکل من الحلال، والقیام بالصالح من الأعمال، فدل هذا علی أن الحلال عون علی العمل الصالح**'' (ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۳/ ۳۰۲، بیروت، دار الفکر، ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء) (اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو حلال کھانے اور نیک اعمال انجام دینے کا حکم دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حلال مال (کا استعمال) نیک عمل کے سلسلہ میں معاون ومددگار ہے)۔

حلال مال کے استعمال سے نیکی کی توفیق ہوتی ہے، آدمی برائی سے باز رہتا ہے کہ یہ حرام لقمہ ہی ہے جو انسان کو معصیت کی طرف لے جاتا ہے، لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ مال حرام سے اجتناب کرے اور حلال مال کی سعی اور جدوجہد میں لگا رہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- حرام کاروبار سے حاصل مال کی وراثت کے سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر:

سود لینا حرام لعینہ ہے اور ہر حال میں حرام ہے، خواہ ''دار الاسلام'' میں لیا جائے یا ''دار الحرب'' میں یا ''دار

☆ جامعہ سید احمد شہیدؒ احمد آباد، کٹولی، ملیح آباد، لکھنؤ

الامن والمعاہدۃ'' میں، لہٰذا ملک ہندوستان میں بھی سود لینا حرام ہے، آزادی سے پہلے یا آزادی کے بعد کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے، جہاں تک کہ اس سلسلہ میں اس بات سے استدلال کیا جاتا ہے کہ سورۂ روم کی آیات ''**الم غلبت الروم فی أدنی الأرض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین للہ الأمر من قبل و من بعد و یؤمئذ یفرح المؤمنون بنصر اللہ ینصر من یشاء وھو العزیز الرحیم**'' (الروم:۱-۵)۔(الف۔لام-میم-(رموز واشارت) قریبی اور زیریں علاقہ میں رومیوں کو (ایرانیوں کے ہاتھوں) شکست ہوگئی ہے، وہ اپنی اس شکست کے بعد چند سالوں میں غالب آجائیں گے، سارا اختیار اللہ کے ہاتھ میں پہلے بھی تھا، اور بعد میں بھی رہے گا) کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابی بن خلف سے شرط لگائی تھی کہ چند سالوں میں رومی غالب آجائیں گے اور مدت پہلے پانچ سال کی مقرر کی گئی تھی اور اونٹ کی تعداد دس تھی، لیکن نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشورہ سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کردی گئی اور مدت دس سال کے اندر کی مقرر کی گئی اور دونوں فریق اس شرط پر راضی ہوگئے، عین بدر کے دن جبکہ مسلمانوں کو مشرکین پر فتح حاصل ہوئی ۶۲۴ء میں رومیوں کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہوئی (دیکھئے: سنن ترمذی، کتاب التفسیر، باب نمبر ۳۱، باب تفسیر سورۃ الروم، حدیث نمبر ۳۱۹۳، مسند احمد، حدیث نمبر ۲۴۹۵)۔

رومیوں کے غلبہ کے بعد ابی بن خلف کے وارثوں نے ہار مان کر شرط کے اونٹ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ کردیئے، اس سے استدلال اس لیے درست نہیں ہے کہ یہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں قمار و جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا ''**وذلک قبل أن یحرم القمار علیھم**'' (دیکھئے: طحاوی، شرح مشکل الآثار ۷/۴۴۰، حدیث نمبر ۲۹۸۹، ط:۱، بیروت، مؤسسہ الرسالہ، ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء، تحقیق: شعیب الأرنؤوط)، (یہ مسلمانوں کے حق میں جوئے کی حرمت سے قبل کا واقعہ ہے)۔

لہٰذا اس واقعہ سے اس بات پر استدلال کرنا کہ دار الحرب میں غیر مسلم کا مال اس کی رضامندی سے کسی طرح بھی لے سکتے ہیں، درست نہیں ہے، اسی طرح حضرت مکحول رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مرسل روایت کہ: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لا ربا بین أھل الحرب و أھل الإسلام**'' (دیکھیے: بیہقی، معرفۃ السنن والآثار ۱۳/۲۷۶، حدیث نمبر ۵۶۵۶، ابن المنذر، الأوسط ۱۰/۱۴۲)، (حربیوں اور مسلمانوں کے درمیان سود نہیں)۔

اگرچہ حنفیہ کے نزدیک قرون ثلاثہ مفضلہ کے عادل راوی جبکہ وہ ثقہ سے ہی ارسال کرتا ہو، کی مرسل روایت مقبول ہے، لیکن یہ مرسل روایت صحیح حدیث سے متعارض ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے سود کو ساقط کردیا، اور فرمایا: ''**و أول ربا أضع ربانا ربا عباس بن عبد المطلب، فإنہ موضوع کلہ**'' (صحیح مسلم، کتاب الحج، حدیث نمبر ۱۲۱۸)

(اورسب سے پہلے میں اپنے گھرانہ یعنی عباس بن عبدالمطلب کا سود ساقط کرتا ہوں، وہ پورا کا پورا ساقط ہے)۔

اگر دارالحرب میں کفار کے ساتھ باہمی رضامندی سے کیا ہوا سودی معاملہ درست ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ساقط نہیں فرماتے، یہی وجہ ہے کہ امام اوزاعی اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے نزدیک دارالحرب میں بھی مسلمان پر سود حرام ہے۔

اور یہی راجح ہے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: "**يا أبا ذر! اتق الله حيث كنت**" (المستدرک علی الصحیحین للحاکم ۱/۱۲۱، حدیث نمبر ۱۷۸، مسند احمد، حدیث نمبر ۲۱۳۵۴، اور یہ حسن درجہ کی حدیث ہے) (اے ابوذر! جہاں بھی رہو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو)، لہٰذا سودی کاروبار سے حاصل ہونے والا مال جو میراث میں ملا ہے اس کا اصل حکم یہ ہے کہ جن لوگوں سے سود لیا گیا ہے اسے لوٹا دیا جائے، اور اگر وہ معلوم نہ ہوں تو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے، لیکن یہ حکم دیانتاً ہے، اب اگر وارث نے اس مال کو صدقہ نہیں کیا، بلکہ اس سے وہ حلال کاروبار کر رہا ہے تو اس کی کمائی حلال ہے اور جو گھر، جائداد اور املاک اس کے نتیجے میں حاصل ہوئی ہیں، وہ سب اس کے لیے حلال ہیں، البتہ اس پر لازم ہے کہ جتنا مال میراث میں ملا ہے اس کے بقدر آہستہ آہستہ صدقہ کرتا رہے اور اگر بہ تدریج بھی اتنے مال کو صدقہ کرنے کی قدرت نہ ہو تو پھر برابر توبہ واستغفار کرتا رہے۔

علامہ حصکفی، علاء الدین محمد بن علی حنفیؒ تحریر فرماتے ہیں: "**وعلى هذا لو مات مسلم و ترک ثمن خمر باعه مسلم لايحل لورثته، كما بسطه الزيلعي وفي "الأشباه": الحرمة تنتقل مع العلم إلا للوارث إلا إذا علم ربه..... لكن في المجتبى: مات و كسبه حرام، فالميراث حلال، ثم رمز و قال: "لا نأخذ بهذه الرواية، وهو حرام مطلقاً على الورثة، فتنبه**" (الدرالمختار، کتاب الحظر، فصل فی البیع ۶/۳۸۵، بیروت) (اسی جزئیہ سے یہ مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ اگر مسلمان مر گیا اور اس نے شراب کی قیمت پر جس شراب کو مسلمان نے فروخت کیا تھا (نہ کہ کسی ذمی کافر نے) تو وہ قیمت اس کے وارثین کے لیے حلال نہیں ہے، جیسا کہ علامہ زیلعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسے تفصیل سے لکھا ہے، "الاشباہ" میں ہے: "حرمت علم کے ساتھ منتقل ہوتی ہے، مگر وارث کے لیے منتقل نہیں ہوتی ہے، لیکن جبکہ اس کا مالک معلوم ہو..... لیکن "مجتبیٰ" نامی کتاب میں ہے: "کوئی شخص مر گیا اور اس کی کمائی حرام ہو تو میراث حلال ہے، پھر انہوں نے رمز کا استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے: ہم اس روایت کو نہیں لیتے ہیں، (بلکہ) میراث ورثہ کے لیے مطلقاً حرام ہے۔ لہٰذا اس سے آگاہ ہو جاؤ)۔

علامہ شامی ابن عابدین محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز دمشقی حنفیؒ اس کی شرح میں رقمطراز ہیں: "**قوله: باعه مسلم" عدل عن قول الزيلعي: باعه هو، يشمل ما إذا كان البائع هو المسلم الميت أو مسلم غيره**

بالوكالة عنه ..... و على هذا قالوا: لو مات الرجل و كسبه من بيع الباذق، أو الظلم، أو أخذ الرشوة يتورع الورثة، ولا يأخذون منه شيئاً، وهو أولى بهم، و يردونهاعلى أربابها إن عرفوهم، و إلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه اه ..... "قوله و فى الأشباه.....: قال الشيخ عبد الوهاب الشعرانى فى كتاب المنن: و ما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لايتعدى إلى ذمتين، سألت عنه الشهاب ابن الشلبى فقال: هومحمول على ما إذا لم يعلم بذلك، أما من رأى المكاس يأخذ من أحد شيئاً من المكس، ثم يعطيه آخر، ثم يأخذه من ذلك الآخر فهو حرام اه ..... "قوله: وهو حرام مطلقاً على الورثة" أى: سواء علموا أربابه أولا، فإن علموا أربابه ردوه عليهم، و إلا تصدقوا به ..... ولايشكل ذلك بما قدمنا آنفا عن الذخيرة والخانية؛ لأن الطعام أو الكسوة ليس عين المال الحرام، فإنه إذا اشترى به شيئاً يحل أكله، على تفصيل تقدم فى كتاب الغصب، بخلاف ما تركه ميراثا، فإنه عين المال الحرام، و إن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام، فإنه لايحل له التصرف فيه قبل أداء ضمانه، و كذا لوارثه، ثم الظاهر أن حرمته على الورثة فى الديانة لا الحكم ..... "قوله: فتنبه" أشار به إلى ضعف ما فى الأشباه" (ردالمحتار، کتاب الحظر، فصل فی البیع ۶/۳۸۶، بیروت) (مصنف کا قول: ''جس شراب کو مسلمان نے فروخت کیا ہو'' زیلعی - رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ - کی عبارت ''جس شراب کو اس نے بیچا ہو'' سے الگ عبارت ذکر کی، تاکہ یہ عبارت اس صورت کو بھی شامل ہوجائے جس میں فروخت کنندہ مرنے والا مسلمان ہو، یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا مسلمان ہو جو اس کی طرف وکالتاً فروخت کرے.....اور اسی بنیاد پر فقہاء نے فرمایا ہے اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کی کمائی ''باذق'' (ایک خاص قسم کی شراب) کی بیع یا ظلماً مال لینے یا رشوت لینے سے حاصل ہوئی ہو، تو ورثہ احتیاط کریں اور اس میں سے کچھ نہ لیں، اور یہی ان کے لیے زیادہ سزاوار ہے، اور مال کو مالک کو لوٹا دیں اگر ان کو جانتے ہوں، ورنہ (بغیر ثواب کی نیت کے) صدقہ کردیں، اس لیے کہ حرام مال کا مصرف صدقہ کرنا ہے، جبکہ اس کے مالک کو لوٹا دینا دشوار ہو.....مصنف کا قول ''الأشباہ'' نامی کتاب میں ہے.....: شیخ عبدالوہاب شعرانی نے ''کتاب المنن'' میں تحریر فرمایا ہے: ''بعض احناف سے منقول ہے کہ حرام دوذمے کی طرف تجاوز نہیں کرتا ہے، اس کے بارہ میں میں نے شہاب ابن شلبی سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ اس کے حرام ہونے کا علم نہ ہو، بہرحال جو (ظالمانہ) ٹیکس وصول کرنے والے کو کسی سے کچھ ٹیکس وصول کرتے ہوئے دیکھا، پھر وہ مال دوسرے کو دے، پھر دیکھنے والا شخص اس دوسرے شخص سے اس مال کو لے، تو یہ حرام ہے، ان کی بات ختم ہوئی.....مصنف کا قول: ''وہ ورثہ پر مطلقاً حرام ہے'' یعنی: خواہ مالک کو جانتے ہوں یا نہیں، سو اگر

مالک کو جانتے ہوں تو ان کو لوٹا دیں، ورنہ صدقہ کر دیں.....اس پر ''ذخیرۂ'' اور ''خانیہ'' کی ابھی پیش کردہ عبارت سے اشکال نہیں ہوتا ہے؛ اس لیے کہ کھانا یا لباس بعینہ مال حرام نہیں، کیونکہ اس سے کوئی چیز خریدے تو اس کا کھانا حلال ہے،'' کتاب الغصب میں گزری ہوئی تفصیل کے مطابق، برخلاف اس صورت کے کہ مال حرام کو میراث کے طور پر چھوڑے (تو اس کا استعمال جائز نہیں)، کیونکہ یہ بعینہ مال حرام ہے، اگرچہ قبضہ اور خلط ملط کر دینے سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک اس کا مالک ہوجاتا ہے، لیکن تاوان کی ادائیگی کے وقت تک اس میں تصرف حلال نہیں ہے، اور ایسے ہی اس کے وارث کے لیے بھی تصرف حلال نہیں ہے، پھر بہ ظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مال حرام کی حرمت ورثہ کے حق میں دیانتاً (یعنی فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ) ہے، قانوناً نہیں ہے.....،مصنف کا قول: لہٰذا آگاہ ہوجاؤ'' اس قول کے ذریعہ ''الأشباہ'' کی عبارت میں جو کچھ مذکور ہے اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ ہے)۔

مالکی دبستان فقہ:

فقہاء مالکیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مال حرام کو اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے، بس اس مال سے اتنا لے سکتا ہے کہ اس کی ستر پوشی ہوجائے اور ایک دن کی خوراک حاصل ہوجائے۔

امام علامہ قرطبی محمد بن احمد، ابوعبداللہ انصاری خزرجی اندلسی مالکیؒ لکھتے ہیں: ''**قال علمائنا: إن سبيل التوبة مما بيده من الأموال الحرام، إن كانت من ربا فليردها على من أربى عليه، و يطلبه إن لم يكن حاضراً، فإن أيس من وجوده، فليتصدق بذلك عنه ..... حتى لايبقى فى يده إلا أقل ما يجزئه فى الصلاة من اللباس، وهو ما يستر العورة، وهو من سرته إلى ركبته، و قوت يومه، لأنه الذى يجب له أن يأخذه من مال غيره إذا اضطر إليه، و إن كره ذلك من يأخذه منه**'' (الجامع لأحکام القرآن ۳/۳۶۶-۳۶۷، ریاض، دارعالم الکتب) (ہمارے مالکی علماء فرماتے ہیں کہ مال حرام سے توبہ کی راہ یہ ہے کہ اگر سود سے حاصل ہو، تو جس سے سود لیا ہے اسے واپس کر دے، اور اگر وہ موجود نہ ہو تو اسے تلاش کرے، سو اگر اس کو پانے سے ناامید ہوجائے تو اس کی طرف سے اسے صدقہ کر دے..... یہاں تک کہ اس کے قبضہ میں وہ لباس رہ جائے جو کم سے کم نماز میں کافی ہے، اور یہ وہ لباس ہے جو اس کے ستر کو چھپائے، اور وہ بدن کا ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے، اور اس کے آج کے دن کی خوراک رہ جائے، اس لیے کہ یہی وہ مقدار ہے جو دوسرے کے مال سے وہ لے سکتا ہے، اگر اسے لینے پر وہ مجبور ہوجائے، اگرچہ وہ شخص اسے ناپسند کرے جس کے مال سے وہ لے)۔

شافعی فقہی اسکول:

فقہاء شافعیہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مال حرام کو مالک کو لوٹا دے اگر معلوم ہو، اگر معلوم نہ ہو تو مسلمانوں کے عمومی مصالح میں خرچ کر دے، ورنہ ایک یا چند فقراء پر صدقہ کر دے، اور مال حرام رکھنے والا شخص بھی اپنی حاجت کے بقدر لے سکتا ہے، اس لیے کہ وہ بھی فقیر ہے۔

امام نووی یحی بن شرف بن مری شافعیؒ تحریر فرماتے ہیں: "**إذا كان معه مال حرام، و أراد التوبة والبراء ة منه، فإن كان له مالك معين، وجب صرفه إليه، أو إلى وكيله، فإن كان ميتا وجب دفعه إلى وارثه، و إن كان لمالك لايعرفه، و يئس من معرفته، فينبغي أن يصرفه في مصالح المسلمين العامة ..... و إلا فيتصدق به على فقير أو فقراء ..... و إذا دفعه إلى الفقير لايكون حراما على الفقير، بل يكون حلالا طيبا ..... و له أن يأخذ منه قدر حاجته ، لأنه أيضا فقير**" (المجموع شرح المہذب ۹/ ۳۳۲، بیروت، دارالفکر، ۱۹۹۷ء) (اگر کسی کے پاس مال حرام ہو، اور وہ اس سے توبہ اور نجات کا قصد کرے، سو اگر اس کا متعین مالک ہو تو اسے اس کو یا اس کے وکیل کو دینا واجب ہے، اور اگر ایسے مالک کا ہو جو معلوم نہ ہو، اور اس کو پانے سے ناامید ہو چکا ہو، تو مناسب یہ ہے کہ اسے مسلمانوں کے عمومی مصالح میں خرچ کرے..... ورنہ ایک یا چند فقراء پر صدقہ کر دے..... اور اگر فقیر کو دے دے تو اس کے حق میں حرام نہ ہوگا، بلکہ حلال و پاکیزہ رہے گا..... اور وہ اپنی حاجت کے بقدر لے سکتا ہے، اس لیے کہ وہ بھی فقیر ہے)۔

حنبلی دبستان فقہ:

حنابلہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مال حرام کو اس کے مالک کو لوٹا دے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو مالک کی طرف سے صدقہ کر دے یا مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کر دے، اور اگر مال حرام رکھنے والا اس مال کا محتاج ہو تو وہ اپنی ضرورت کے بقدر لے سکتا ہے اور باقی کو صدقہ کر دے۔

علامہ ابن تیمیہ احمد بن عبدالحلیم بن عبداللہ نمیری حرانی دمشقی حنبلیؒ رقمطراز ہیں: "**المال إذاتعذر معرفة مالكه صرف في مصالح المسلمين عند جماهير العلماء كما لك و أحمد و غيرهما، فإذا كان بيد الإنسان غصوب أو عوار أو ودائع أو رهون، قد يئس من معرفة أصحابها فإنه يتصدق بهاعنهم، أو يصرفها في مصالح المسلمين، أو يسلمها إلى قاسم عادل يصرفها في مصالح المسلمين المصالح الشرعية**" (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۲۱، ط: ۳، دارالوفاء، ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء) (مالک کی شناخت اگر دشوار ہو جائے تو جمہور اہل علم جیسے مالک و احمد

وغیرہما کے نزدیک اسے مسلمانوں کے مصالح میں صرف کیا جائے گا، تو اگر آدمی کے قبضہ میں غصب کردہ مال یا عاریتاً اور عارضی طور پر لی ہوئی چیز ہو، یا امانت کے مال ہوں، یا رہن ہوں، اور مالک کو پانے سے ناامید ہوجائے تو وہ اسے ان کی طرف سے صدقہ کردے، یا مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کردے، یا منصف تقسیم کرنے والے کے حوالہ کردے جو اسے مسلمانوں کے شرعی مصالح میں صرف کرے)۔

۲-حرام جائداد سے حاصل ہونے والے کرایہ وغیرہ کا حکم:

شرعی اعتبار سے حرام ذریعہ سے حاصل ہونے والی آمدنی، نفع اور کرایہ کا اصلاً یہ حکم ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردیا جائے، خود حرام ذریعہ سے آمدنی بنانے والے کے لیے اس کا استعمال جائز نہیں ہے، علامہ سرخسی شمس الدین ابوبکر محمد بن ابی سہل حنفیؒ تحریر فرماتے ہیں: "**فإنما حصل له الربح فيه بسبب خبيث شرعا، و السبيل فى الكسب الخبيث التصدق**" (سرخسی، المبسوط، کتاب السلم ۱۲/ ۱۴۸، ط:۱، بیروت، دارالفکر) (اس مال میں اسے نفع شرعی اعتبار سے حرام ذریعہ سے حاصل ہوا ہے اور حرام مال کا مصرف صدقہ کردینا ہے)۔

''ہندیہ'' میں ہے: "**ولا تطيب له؛ لانه استفادها بسبب خبيث**" (ہندیہ، کتاب الغصب، ۵/ ۱۴۰، بیروت، دار الفکر) (وہ پھل پودہ لگانے والے کے لیے حلال نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے اسے حرام ذریعہ سے حاصل کیا)۔

علامہ کاسانی، علاء الدین ابوبکر بن مسعود حلبی حنفیؒ تحریر فرماتے ہیں: "**وأما التصدق بالغلة وهى الأجرة عندهما، فلأنها خبيثة لحصولها بسبب خبيث، فكان سبيلها التصدق**" (بدائع الصنائع، کتاب الغصب، فصل حکم الغصب ۷/ ۱۵۴، بیروت، دارالکتاب العربی) (بہرحال طرفین کے نزدیک اجرت کو صدقہ کرنے (کا لزوم) اس وجہ سے ہے کہ وہ حرام ذریعہ سے حاصل ہونے کی وجہ سے حرام ہے)۔

علامہ ابن عابدین سیر دقرطاس فرماتے ہیں: "**والغاصب إذا أجر يملك الأجرة و يتصدق بها، لأنها حصلت بسبب خبيث، وهو استعمال مال الغير، فكان سبيله التصدق**" (ردالمحتار، کتاب العاریۃ ۸/ ۳۹۳، بیروت) (غاصب اگر کرایہ پر لگائے تو وہ اجرت کا مالک ہوجائے گا (یعنی تاوان ادا کرنے کے بعد) اور اسے صدقہ کردے گا، اس لیے کہ اجرت حرام ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے، اور وہ (بلا اجازت) دوسرے کے مال کو استعمال کرنا ہے، لہٰذا اس کی مد صدقہ کرنا ہے)۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ ابومحمد غانم بن محمد بغدادیؒ تحریر فرماتے ہیں: "**لو استعار شيئاً فأجره، فالأجرة له و يتصدق بها، كما لو غصب شيئاً فأجره، فالأجرة تكون للغاصب و يتصدق بها لحصولها بسبب**

خبیـــث'' (مجمع الضمانات ۱/ ۱۶۴، تحقیق: ا.د محمد احمد سراج، ا.د علی جمعہ محمد) (اگر کوئی چیز عاریتاً لے اور اسے اجرت پر لگا دے تو اجرت اسے ملے گی اور وہ اسے صدقہ کر دے گا، جیسے کوئی چیز غصب کر کے کرایہ پر دے دے تو کرایہ غاصب کو ملے گا اور وہ اسے صدقہ کر دے گا، کیونکہ اجرت حرام ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے)۔

علامہ علاء الدین سمرقندی، محمد بن احمد ابوبکر حنفیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''**ثم هذه الزوائد التي صارت ملكاً للغاصب لايباح له الانتفاع به، و عليه أن يتصدق لأنه حصل بسبب خبيث**'' (تحفۃ الفقہاء، کتاب الغصب ۳/ ۹۴، بیروت، العلمیہ، ۱۹۸۴ء) (پھر یہ زوائد جو غاصب کی ملکیت ہو گئے، ان سے اس کے لیے فائدہ اٹھانا مباح نہیں ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ ان کو صدقہ کر دے، اس لیے کہ وہ حرام ذریعہ سے حاصل ہوئے ہیں)۔

سطور بالا میں ذکر کردہ تفصیلات کی روشنی میں دوسرے سوال کا جواب اس طرح ہے:

(الف) جس غریب شخص کو معلوم ہو کہ اس کی پوری جائداد اور مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے اور اسی حرام جائداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، اگر یہ مال اسے موروثی طور پر ملا ہے تو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ بہ قدر ضرورت لینے کے بعد سارا مال بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دے، قدر ضرورت میں سال بھر کا اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ اور چھوٹی موٹی تجارت کا خرچ شامل ہے۔

اگر اس پر قدرت نہ ہو تو پوری جائداد کی وارث ہونے کے دن جو قیمت ہو اور جو نقد مال ملا ہو دونوں کی مجموعی مقدار کو آہستہ آہستہ صدقہ کرتا جائے، اگر پوری مقدار صدقہ کرنا تدریجی طور پر بھی ممکن نہ ہو تو جتنی مقدار ممکن ہو وہ صدقہ کر دے اور باقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرتا رہے۔

(ب) اگر اس غریب شخص نے خود ہی حرام کاروبار سے جائداد اور مال حاصل کیا ہے، تو پھر بہ قدر ضرورت لینے کے بعد سارا مال بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دینا لازم ہے، اگر اصل مالک کی طرف لوٹانا ممکن نہ ہو ضرورت کے بہ قدر لینا جائز اس لیے ہے کہ ساری جائداد صدقہ کرنے کے بعد وہ فقیر ہے، اور فقیر کو نصاب سے کم دینا جائز ہے، اور کوئی کراہت نہیں، اور نصاب کے بقدر ایک آدمی کو دینا اس وقت مکروہ ہے جبکہ وہ مدیون نہ ہو، لیکن اگر مدیون ہو کہ دین کی ادائیگی کے بعد نصاب نہ بچے، یا عیالدار ہو کہ ملی ہوئی رقم کو عیال پر تقسیم کر دے تو ہر ایک کو نصاب کے بقدر حاصل نہ ہو، تو کوئی کراہت نہیں ہے، علامہ ابن الہمام محمد بن عبدالواحد سیواسی اسکندریؒ رقمطراز ہیں: ''**قوله و يكره أن يدفع إلى واحد مائتي درهم فصاعداً، إلا أن يكون مديونا لايفضل له بعد قضاء دينه نصاب، أو يكون معيلا إذا وزع المأخوذ على عياله لم يصب كلا منهم نصاب**'' (فتح القدیر، کتاب الزکاۃ، باب المصرف ۲/ ۲۷۸، بیروت، دار الفکر)۔

۳-(الف): شوہر یا بیٹے کی کمائی حرام ہوتو ایسی خاتون کیا کرے؟

ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کرنے سے باز نہیں آ رہا ہو، اور اس غریب خاتون کے لیے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ ہو، تو ایسی صورت میں وہ غریب خاتون اپنے شوہر یا اپنے بیٹے کے ساتھ کھا پی سکتی ہے، گناہ شوہر یا بیٹے کو ہوگا۔

''فتاوی قاضی خاں'' کے حوالہ سے علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں: ''**وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور، إذا أكلت من طعامه، و لم يكن عينه غصبا، أو اشترى طعاما، أو كسوة من مال أصله ليس بطيب، فهی فی سعة من ذلک، و الإثم على الزوج**'' (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع ۶/۳۸۶)، (فتاوی قاضی خاں میں ہے: ایک عورت کا شوہر ایسی سرزمین میں کام کرتا ہے جہاں ظلم کا بازار گرم رہتا ہے، اگر عورت اس کے کھانے سے کھائے، اور وہ بعینہ غصب نہ ہو، یا شوہر کھانا یا لباس ایسے مال سے خریدے جس کی اصل حلال نہیں، تو بیوی کو استعمال کی گنجائش ہے، اور گناہ شوہر کو ہوگا)۔

۳-(ب): حرام کمائی سے اپنے بچے کو پڑھایا، پڑھنے کے بعد بچہ کی کمائی کا حکم:

حرام کمائی سے بچہ کو اعلیٰ تعلیم دی، تعلیم یافتہ ہونے کے بعد بچہ کہیں ملازم ہوجائے، یا کوئی حلال کاروبار کرے تو اس کی کمائی حلال ہے، حرام کمائی سے پڑھانے کا گناہ باپ کو ہوگا، پاک مال سے بچہ کی صحیح تعلیم وتربیت اصلاً باپ کی ذمہ داری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم و أهليكم ناراً**'' (تحریم:۶) (اے ایمان والو! اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ)۔

امام بیضاوی ناصر الدین ابوالخیر عبداللہ بن عمر شافعیؒ اس کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں: ''**بترک المعاصی و فعل الطاعات (و أهليكم) بالنصح و التأديب**'' (انوار التنزیل واسرار التأویل ۵/۳۵۷، بیروت، دار الفکر)، (یعنی خود کو معاصی ترک کرکے اور طاعتوں کو انجام دے کر جہنم سے بچاؤ، اور اپنے گھر والوں کو خیر خواہی اور ادب سکھا کر آگ سے بچاؤ)۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**ما نحل والد ولداً من نحل أفضل من أدب حسن**'' (سنن ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی أدب الولد، حدیث نمبر ۹۵۲) (کسی والد نے اپنی اولاد کو عمدہ تعلیم وتربیت سے بہتر کوئی تحفہ نہیں دیا)۔

لہٰذا باپ کی ذمہ داری ہے کہ بیٹے کو حلال مال سے تعلیم دلوائے، لیکن اس نے حرام کمائی سے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور اسے اچھی ملازمت مل گئی تو اس کی جائز ملازمت کی کمائی حلال ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

۴-مشکوک مال والے کی دعوت میں کھانے کے سلسلہ میں شرعی حکم:

اگر معلوم نہ ہو کہ دعوت دینے والے شخص کی پوری کمائی حرام ہے، یا آدھا حصہ حرام اور آدھا حلال ہے تو ایسے آدمی کی دعوت میں کھانے سے بچنا بہتر ہے، ''ہندیہ'': میں ہے: ''**إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام، أن لايقبل الهدية، و لا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته، أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع**'' (ہندیہ، کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات ۵/ ۳۴۲، بیروت، دارالفکر) (کسی آدمی نے کسی کو ہدیہ دیا یا اسے مہمان بنایا، اگر اس کا اکثر مال حلال ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر یہ کہ اسے یقین ہو کہ یہ حرام سے ہے، سو اگر حرام ہی اس کا اکثر مال ہو، تو مناسب یہ ہے کہ ہدیہ قبول نہ کرے اور کھانا نہ کھائے، مگر یہ کہ وہ اسے بتائے کہ یہ حلال ہے اور میں اس کا وارث ہوا ہوں، یا یہ کہ میں نے کسی شخص سے اسے قرض لیا ہے۔ ''الینابیع'' نامی کتاب میں اسی طرح ہے)۔

علامہ شیخی زادہ داماد آفندی عبدالرحمٰن بن محمد کلیبولی حنفیؒ تحریر فرماتے ہیں: ''**وفي البزازية: غالب مال المهدى إن حلالا، لا بأس بقبول هديته و أكل ماله مايتبين أنه من حرام، لأن أموال الناس لايخلو عن حرام، و إن غالب ماله الحرام لايقبلها ولايأكل، إلا إذا قال: إنه حلال أورثته واستقرضته**'' (مجمع الانہر، کتاب الکراہیۃ، فصل فی الکسب ۴/ ۱۸۶، بیروت، العلمیہ) (بزازیہ میں ہے کہ ہدیہ دینے والے کا زیادہ تر مال حلال ہو، تو اس کے ہدیہ کے قبول کرنے اور اسکے مال کھانے میں کوئی حرج نہیں، جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ وہ حرام مال سے ہے، اس لئے کہ لوگوں کے اموال حرام سے خالی نہیں، لہٰذا اکثر کا اعتبار ہے، پس اگر اس کا اکثر مال حرام ہو تو ہدیہ قبول نہ کرے اور نہ کھائے، مگر جب کہ دعوت دینے والا کہے کہ یہ حلال مال ہے جس کا میں وارث ہوا، یا میں نے اسے قرض لیا ہے)۔

علامہ فقیہ محمود بن احمد، ابن مازہ، بخاری مرغینانیؒ رقمطراز ہیں: ''**وفي عيون المسائل: رجل أهدى إلى إنسان، أو أضافه، إن كان غالب ماله من حرام، لاينبغي أن يقبل و يأكل من طعامه، مالم يخبر أنه ذلك المال حلال استقرضه أو ورثه**'' (المحیط البرہانی ۵/ ۲۳۰، بیروت، دار احیاء التراث العربی)۔

(عیون المسائل نامی کتاب میں ہے: ایک شخص نے کسی انسان کو ہدیہ دیا، یا مہمان بنایا، اگر اس کا زیادہ تر مال حرام ہو تو مناسب نہیں کہ اس کا ہدیہ قبول کرے اور اس کا کھانا کھائے، جب تک اسے نہ بتایا جائے کہ یہ مال حلال ہے جسے اس نے قرض لیا ہے، یا اس کا وارث ہوا ہے)۔

۵-حرام کاروبار والے کی دعوت کھانے کے بعد تلافی کا طریقہ:

اگر کھانا ابھی پیٹ میں موجود ہو اور ممکن ہو کہ حلق میں ہاتھ داخل کر کے الٹی کر دے تو ایسا ہی کرے، جیسے: حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک شخص نے کھانا بھیجا اور آپ نے تناول فرمالیا، بعد کو معلوم ہوا کہ اس نے کہانت کے ذریعہ اسے حاصل کیا ہے تو آپ نے اپنا ہاتھ حلق میں داخل کر کے قے کر لی: "**أدخل يده في حلقه فاستقائه**" (مصنف عبدالرزاق، حدیث نمبر ۲۰۳۴۶، اور یہ صحیح درجہ کا اثر ہے)۔

اگر کھانا ہضم ہو چکا ہو تو پھر توبہ واستغفار کرتا رہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**و استغفروا الله إن الله غفور رحيم**" (بقرہ:۱۹۹)، (اور استغفار کرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ بہت مغفرت فرمانے اور رحم فرمانے والا ہے)۔

نیز فرمان باری تعالیٰ ہے: "**والذين إذا فعلوا فاحشة ذكروا الله فاستغفروا لذنوبهم، و من يغفر الذنوب إلا الله، ولم يصروا على ما فعلوا وهم يعلمون**" (آل عمران:۱۳۵)، (ان کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی بڑا گناہ کر بیٹھتے ہیں، یا اپنے اوپر (کسی غلط عمل کی بنا پر) ظلم کرتے ہیں، تو اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کی مغفرت ومعافی کی درخواست کرتے ہیں، اور اللہ کے علاوہ کون گناہوں کی مغفرت کرنے والا ہے، اور اپنے کئے پر جانتے بوجھتے اڑتے نہیں)۔

۶-حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی تدبیر یا حیلہ:

پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی تدبیر یا حیلہ یہ ہے کہ سارا کا سارا مال بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دے، علامہ ابن عابدینؒ تحریر فرماتے ہیں: "**سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**" (ردالمحتار، کتاب الحظر، فصل فی البیع ۶/ ۳۸۵) (حرام مال کا مصرف صدقہ کرنا ہے جبکہ اصل مالک کو لوٹانا دشوار ہو)۔

اگر اس کے پاس سارا مال حرام ہی ہو، اور مالک نہ معلوم ہونے کی وجہ سے صدقہ کرے، تو چونکہ وہ شخص فقیر ہے، لہٰذا وہ اس مال سے اتنا لے سکتا ہے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو اور چھوٹا موٹا حلال کاروبار کر سکتا ہو۔

اور اگر اس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کا مال ہو اور اس نے حرام مال کو حلال مال کے ساتھ خلط ملط کر لیا ہو تو ایسی صورت میں حرام مال کے بقدر بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دینے سے اس پر اس کا تصرف درست ہو جائے گا۔

علامہ ابن نجیم زین الدین بن ابراہیم حنفیؒ رقمطراز ہیں: "**لو أن سلطانا غصب مالا و خلطه صار ملكا له، حتى وجبت عليه الزكاة، و ورث عنه على قول أبي حنيفه**" (البحر الرائق، کتاب الزکاۃ ۲/ ۲۲۱، بیروت، دار المعرفہ)، (اگر کوئی بادشاہ مال غصب کر لے اور اپنے حلال مال سے ملا لے، تو یہ اس کی ملکیت ہو جائے گا، یہاں تک کہ اس پر زکوۃ

واجب ہوگی، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول کے مطابق اس میں وراثت جاری ہوگی)۔

علامہ ابن ہمامؒ بھی یہی رائے رکھتے ہیں:"**ولذا قالوا: لو أن سلطانا غصب مالا و خلطه صار ملكا له، حتى وجبت عليه الزكاة يورث عنه**" (فتح القدیر، کتاب الزکاۃ ۲/ ۱۵۴، بیروت، دار الفکر)، (اور اسی وجہ سے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر بادشاہ مال غصب کرلے اور اپنے حلال مال سے ملالے تو یہ اس کی ملکیت ہوگیا، یہاں تک کہ اس پر زکوۃ واجب ہے اور اس کی طرف سے وراثت جاری ہوگی)۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ خلط ملط کر لینے کی صورت میں تاوان کی ادائیگی کے بعد ہی تصرف حلال ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:"**فإنه لايحل له التصرف فيه قبل أداء ضمانه، و كذا لوارثه**" (ردالمحتار، کتاب الحظر، فصل فی البیع ۶/ ۳۸۶)، (کیونکہ اس کے لیے اس میں تصرف اس کے تاوان کی ادائیگی سے پہلے حلال نہیں، اور ایسے ہی اس کے وارث کے لیے (تاوان کی ادائیگی سے پہلے) تصرف حلال نہیں ہے)۔

۷-حرام مال سے قرض لے کر واپسی اور صدقہ کرنے کا حکم:

حرام مال سے قرض لینا درست نہیں، اس پر لازم ہے کہ اسے صدقہ کردے، البتہ اگر اس کے پاس اور کوئی ملکیت نہیں ہے تو وہ فقیر ہے اور فقیر کی حیثیت سے وہ اس مال حرام سے اپنی ضرورت اور چھوٹے موٹے حلال کاروبار کے بقدر لے سکتا ہے۔

علامہ ابن القیم محمد بن ابی بکر زرعی دمشقیؒ تحریر فرماتے ہیں:"**فإن كان محتاجاً إليه فله أن يأخذ قدر حاجته، و يتصدق بالباقي، فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه، عينا كان أو منفعة**" (ابن القیم زاد المعاد ۵/ ۷۷۸، ط: ۲۷، بیروت، مؤسسہ الرسالہ)، (اگر مال حرام کو اپنے قبضہ میں لینے والا اس مال کا محتاج ہو تو وہ اپنی ضرورت کے بقدر لے سکتا ہے اور باقی کو صدقہ کردے، سو یہی ہر اس کمائی کا حکم ہے جو اپنے بدل کے گندہ و حرام ہونے کی وجہ سے گندہ و حرام ہو، خواہ متعین چیز ہو یا منفعت ہو)۔

۸-حرام و حلال کاروبار دونوں حصوں میں کام کرنے کے سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر:

مومن کی ذمہ داری ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور پاکیزہ رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"**ومن يتق الله يجعل له مخرجا و يرزقه من حيث لايحتسب**" (الطلاق: ۲-۳)، (اور جو بھی احکام الٰہی کا پاس ولحاظ کرے گا، اللہ اس کے لیے (مشکلات) سے نکلنے کے راستے پیدا کردے گا، اور اس کو بے شان وگمان

نواز دے گا)۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ ایک بدو صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**إنک لن تدع شیئاً اتقاء الله إلا أعطاک الله خیرا منه**" (مسند احمد، حدیث نمبر ۲۰۷۳۹، اور یہ صحیح درجہ کی حدیث ہے)، (بے شک اللہ تعالیٰ کے خوف سے تم کسی چیز کو نہیں چھوڑو گے، مگر اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بہتر چیز سے نوازے گا)۔

لہٰذا اب ایک آدمی کا بزنس آدھا حلال ہے اور آدھا حرام، اور اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصوں کا کام کرنا پڑے، جیسے: کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑے، یا دونوں کے لین دین کرنا پڑے، یا دونوں کی وصولی کے لیے جانا پڑے، تو ایسی ملازمت درست نہیں ہے، پوری کوشش کرے کہ حلال ملازمت مل جائے، اور جب تک حلال ملازمت نہ ملے توبہ واستغفار کرتا رہے۔

۹-حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے کے سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر:

(الف) حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنا جیسے کھیتی باڑی کرنا ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وتعاونوا علی البر والتقوی، ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (مائدہ:۲)، (نیکی اور تقوی کے کاموں میں آپس میں تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم وزیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

(ب) حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کے سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر:

اگر حرام کمائی کرنے والے کے دوسرے حلال ذرائع بھی ہوں جن سے مزدوری ادا کی جاتی ہو تو ایسی صورت میں حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔

علامہ زیلعی عثمان بن علی فخر الدین حنفی تحریر فرماتے ہیں: "**وحمل خمر لذمی بأجر، أی: جاز ذلک أیضا، و هذاعند أبی حنیفة رحمه الله تعالیٰ وقالا: هومکروه، لأنه – علیه الصلاة والسلام – لعن فی الخمر عشرة، و عد منها حاملها، وله أن الإجارة علی الحمل، وهو لیس بمعصیة ولا تسبب لها، وإنما تحصل المعصیة بفعل فاعل مختار .....والحدیث محمول علی الحمل المقرون بقصد المعصیة**" (تبیین الحقائق ۶/۲۹، قاہرہ، دار الکتاب الاسلامی)، (اجرت کے ساتھ ذمی کا شراب اٹھانا یہ بھی جائز ہے، یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہے، اور صاحبین کہتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، اس لیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے سلسلہ میں دس اشخاص پر لعنت فرمائی ہے، اور انہی میں سے شراب اٹھانیوالے کو بھی شمار فرمایا ہے، امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ

شراب اٹھانے پر اجرت کا معاملہ ہے اور اٹھانا معصیت نہیں اور نہ ہی معصیت کا سبب ہے، معصیت تو فاعل مختار کے عمل سے وجود میں آئے گی.....اور حدیث اس اٹھانے پر محمول ہے جو معصیت کے قصد سے ہو)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی کرنے والے کے حرام کام میں تعاون مقصود نہ ہو تو اس کے گھریلو کام کے لیے نوکر رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ کیونکہ گھر کے کام وکاج معصیت نہیں ہے، لیکن اگر حرام کمائی سے ہی اجرت ملتی ہو تو پھر حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا جائز نہیں ہے۔

(ج) حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنے کے سلسلہ میں شرعی نقطۂ نظر

اگر بائک یا کار حرام کمائی کی ہے تو اس میں بیٹھ کر سفر کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ حرام کمائی پر نکیر ہونی چاہئے، جو اس صورت میں مفقود ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**لو لاينهاهم الربانيون والأحبار عن قولهم الإثم و أكلهم السحت لبئس ما كانوا يصنعون**" (مائدہ: ۶۳)، (ان کو ان کے علماء ومشائخ ان کی مجرمانہ باتوں اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکتے؟ یہ سب بدترین کردار کے مرتکب ہیں)۔

(د) حرام کمائی کرنے والے شخص سے مدرسہ کی فیس وصول کرنا:

حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچہ کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا جائز ہے، البتہ چونکہ یہ فیس حرام مال سے ہے، لہٰذا اسے رفاہی کاموں میں صرف کیا جائے، یا فقیر بچوں پر خرچ کیا جائے، علامہ طوریؒ تحریر فرماتے ہیں: "**سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد**" (تکملۃ البحر الرائق کتاب الکراہیۃ، فصل فی البیع ۸/۲۲۹، بیروت، دار المعرفہ)، (حرام مال کا مصرف صدقہ کر دینا ہے جبکہ مالک کو لوٹانا دشوار ہو)۔

علامہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں: "**والسبيل في الكسب الخبيث التصدق**" (سرخسی، المبسوط ۱۲/۱۴۸)، (اور حرام مال کا مصرف صدقہ کر دینا ہے)۔

۱۰- مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ منظوری کے لیے سودی رقم کا استعمال:

کرپشن ایک ناسور ہے جس میں آج پورا ملک مبتلا ہے، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے کرپشن، بدعنوانی اور رشوت ستانی کی سخت مذمت کی ہے، اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کی سخت ہدایت دی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل وتلدوا بها إلى الحكام، لتأكلوا فريقا من أموال الناس بالإثم و أنتم**

تعلمون'' (بقرہ:۱۸۸)،(اورتم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے نہ کھاؤ، اوراس کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح دوسرے کے مال کا کچھ حصہ حق تلفی کرکے ہڑپ کرسکو، درآں حالیکہ تم اس حق تلفی کو جانتے ہو)۔

حتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عہدے دار، آفیسر اور ملازم کو بھی مجرم گردانا ہے جو کسی سرکاری کام اور عوامی کام کے لیے کسی فرد یا ایجنٹ سے مالی عوض یا تحفہ قبول کرتا ہے؛ جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا''**هدايا الأمراء غلول**'' (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر ۴۹۶۹، اوراس کی سند حسن درجہ کی ہے)،(حکام کو دیئے جانے والے تحفے خیانت ہیں)۔

رشوت کی رقم چونکہ آفیسروں کی جیب میں جاتی ہے، لہٰذا رشوت میں سود کی رقم کا استعمال جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس کا مصرف رفاہی کاموں میں صرف کرنا ہے، یا بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردینا ہے، علامہ زیلعیؒ تحریر فرماتے ہیں:''**سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تذر الرد على صاحبه**'' (تبیین الحقائق ۶/۲۷)،(مال حرام کی مد یہ ہے کہ اگر اصل مالک کو لوٹانا دشوار ہو تو اسے صدقہ کردیا جائے)۔

۱۱-ایسی بستی والے کے ہدیہ کا حکم جس کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو:

اس سلسلہ میں پہلے ضابطہ گزر چکا ہے کہ جس آدمی کا اکثر مال حلال ہو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، ہر بار پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ مال حلال سے ہے یا نہیں؟ اور جس کا اکثر مال حرام ہو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، مگر یہ کہ وہ خود سے کہے کہ یہ مال حلال سے ہے، میں نے قرض لے کر یہ ہدیہ خریدا ہے۔

علامہ شیخی زادہؒ تحریر فرماتے ہیں:''**ولايجوز قبول هدية أمراء الجور؛ لأن الغالب في ما لهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله من حل بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به ..... فيعتبر الغالب، و إن غالب ماله الحرام لايقبلها ولا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال أورثته واستقرضته**'' (مجمع الأنہر ۴/۱۸۶، بیروت، العلمیہ)،(ظالم حکام کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ عام طور سے ان کا مال حرام ہوتا ہے، مگر یہ کہ معلوم ہو کہ اس کا اکثر مال حلال ہے اس طرح کہ وہ تجارت یا کاشت والا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں.....لہٰذا غالب کا اعتبار ہے، اگر کسی آدمی کا اکثر مال حرام ہو تو اسے قبول نہ کرے اور نہ کھائے، مگر جبکہ وہ کہے: یہ حلال ہے میں اس کا وارث ہوا ہوں، یا میں نے قرض لیا ہے)۔

لہٰذا کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور غالب گمان ہو کہ اس کا ہدیہ مال حرام سے ہوگا، تو اسے قبول کرنا جائز نہیں ہے، مگر یہ ہدیہ دینے والا خود ہی صراحت کردے کہ یہ مال حلال سے ہے، اس نے قرض لے کر خریدا ہے، بچوں کو ٹافی دینے، چائے پلانے، دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرنے کا بھی یہی حکم ہے کہ یہ چیزیں فراہم کرنے والے کا اکثر

مال حلال ہوتو ان کو قبول کرنا جائز ہے، ورنہ نہیں۔ البتہ غریب و نادار بچے ایسی چیزوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔

۱۲-حرام کمائی کرنے والے کے لئے دعا کرنے کا شرعی حکم:

دعا کسی بھی مومن کے لیے کی جاسکتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**ربنا اغفرلی و لوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب**" (ابراہیم: ۴۱)، (اے ہمارے آقا و مولی! میری اور میرے والدین کی اور تمام اہل ایمان کی حساب و کتاب کے دن مغفرت فرما)۔

لہٰذا حرام کمائی کرنے والے کے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ان کے لیے نیکی، تقوی اور حلال روزی کی توفیق کی دعا کی جائے۔

اسی طرح اہل طاعت و اہل معصیت دونوں کے لیے پانی پر دم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

☆☆☆

کاروبار میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد سعید الرحمٰن قاسمی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أشرف الانبياء والمرسلين و على آله و صحبه أجمعين، أما بعد!

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے قائم کئے گئے سوالات کے جواب سے قبل چند امور کی اولاً وضاحت کر دینا مناسب سمجھتا ہوں، تاکہ اس سوال کے جواب کے استخراج میں آسانی ہو:

(الف) اصولی بات یہ ہے کہ عین مال حرام موجود ہو اور اس میں خلط نہ ہوا ہو تو اگر اصل مالک معلوم ہو تو اس کا اس شخص کو واپس کرنا ضروری ہے، اور اگر اس کے مالک کا علم نہ ہو تو کسی فقیر کو صدقہ کرنا یا رفاہ عام کے کاموں میں لگانا ضروری ہے، تاکہ اس کا ثواب اس کے مالک کو مل جائے اور اپنی جان چھوٹ جائے، کیونکہ ایسے مال میں جس میں خلط وتصرف نہ ہوا ہو، بعینہ موجود ہو اس میں حرمت منتقل ہوتی ہے اور ورثہ کے لئے بھی لینا جائز نہیں ہوتا ہے، مال حرام خلط سے قبل خالص حرام ہوتا ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں:

"قوله (وفي الأشباه الخ) قال الشيخ عبد الوهاب الشعرانی فی کتاب المنن: و ما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لايتعدى إلى ذمتين سألت عن الشهاب ابن الشلبی فقال: هومحمول على ما إذا لم يعلم بذلک، أما من رأى المكاس يأخذ من أحد شيئا من المكس ثم يعطية آخر ثم يأخذه من ذلک الآخر فهو حرام" (الدر المختار مع رد المحتار: ۹/ ۵۵۴، ہکذا فی الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۴۹)۔

"إن دفع عين المغصوب من غير خلط لم يجز" (الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۴۲)۔

(ب) اگر مال حرام کو اپنے مال میں اس طرح خلط کر لیا جائے کہ تمیز ممکن نہ ہو تو ملانے والا اس کا مالک ہو جاتا ہے، اس کے لئے وہ مال حرام جو مخلوط ہو گیا اس کے لئے خالص حرام کے حکم میں نہیں رہتا ہے، بلکہ صرف قبل اختیار الضمان اس کا

☆ مفتی امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ، وجھارکھنڈ، پھلواری شریف، پٹنہ

استعمال جائز نہیں ہوگا، البتہ وہ مال اصلاً حلال ہوگا، اور جب ملکیت منتقل ہوگی تو جس کی طرف ملکیت منتقل ہوگی وہ اس کے لئے حلال، طیب ہوگا۔

"إن كان مختلطا بماله على قول أبي يوسف ومحمد رحمهما الله تعالىٰ هو على ملك صاحبه لايجوز أخذه إلا ليرده على صاحبه، و على قول أبي حنيفة رحمه الله يملك المال بالخط و يكون للآخذ أن يأخذ إذا كان في بقية مال الميت وفاء بمقدار ما يؤدى به حق الخصماء" (الفتاوی الخانیۃ علی ہامش الہندیۃ: ۳/۴۰۰)۔

واضح رہے کہ اگر مال، خالص حرام نہ ہو؛ بلکہ مخلوط ہو اور مالک بھی معلوم نہ تو ورثہ، مورث کے اس مال کے مالک ہوجائیں گے۔

"مات و كسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز و قال: لا نأخذ بهذه الرواية، و هو حرام مطلقا على الورثة، (الدر المختار) و إن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام فإنه لايحل فيه التصرف قبل أداء ضمانه، و كذا لورثته، ثم الظاهر أن حرمته على الورثة في الديانة لا الحكم ..... (فتنبه) أشار به إلى ضعف ما في الأشباه" (الدر المختار مع رد المحتار: ۹/۵۵۴)۔

خلط کے بعد اصلاً وہ مال خالط کے لئے حلال ہوگیا، حرام عارض یعنی عدم اداء ضمان کی وجہ سے ہے، لہٰذا جب یہ ایک کی ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہوگا تو وہ دوسرے کے لئے حلال ہوجائے گا، چنانچہ احسن الفتاوی میں ہے: ''اگر عین مغصوب نہ ہو بلکہ خلط ہو تو غاصب اس کا مالک ہوگیا اور یہ اس کے لئے نفس حرام نہیں، بلکہ باصلہ حلال ہے، عارض یعنی عدم اداء ضمان کی وجہ سے انتفاع وتصرف حرام ہے اور جب ایک چیز اول کے لیے باصلہ حلال ہو تو دوسرے کی ملک میں جانے سے وہ حلال طیب ہوگی اور حرمت ختم ہوجائے گی (احسن الفتاوی: ۸/۳۱۹)۔

"ففي البزازية قبيل كتاب الزكوة: ما يأخذ من المال ظلماً أويختلطه بماله أو بمال مظلوم آخر يصير ملكا له و ينقطع حق الأول فلا يكون أخذه حرام محضاً، نعم لايباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب" (رد المحتار ۳/۲۲۰، مطلب فی التصدق من المال الحرام)۔

"(ملكه) ..... (ولايحل له انتفاعه به) أي المغصوب المغير (قبل أداء الضمان) ..... لكن جاز للغاصب بيعه، و هبته لأنه مملوك بجهة محظور كالمقبوض بالبيع الفاسد" (مجمع الانہر ۲/۴۶۰)۔

"وجهه ثبوت الملك المطلق للتصرف، ألا ترى أنه لو وهبه أو باعه جاز، وجه الاستحسان

قوله علیه السلام فی الشاة المذبوحة المصلیة بغیر رضاء صاحبها أطعموها الأساری" (ابوداؤد ۲/ ۴۷۳)

أفاد الأمر بالتصدق زوال ملک المالک وحرمة الانتفاع للغاصب قبل الإرضاء" (الہدایۃ، کتاب الغصب، فصل فیما یتغیر بعمل الغاصب: ۳/ ۳۷۷)۔

(ج) مال حرام یا ناجائز آمدنی سے اگر تجارت کرلی جائے تو اگرچہ اس طرح کے مال سے کسی قسم کی تجارت کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس جیسے مال سے تجارت کرلے تو اس سے حاصل شدہ آمدنی اور نفع حلال ہے، البتہ اگر کسی کو حرام مال حاصل ہو تو وہ شخص اسے اس مال کے مالک کو لوٹادے، اگر مالک کا پتہ نہ چلے تو بلا ثواب صدقہ کردے یا کسی کار خیر میں لگادے۔

"**اکتسب حراما و اشتری به أو بالدراهم المغصوبة شیئاً، قال الکرخی: إن نقد قبل البیع تصدق بالربح و إلا لا، وهذا قیاس، و فی الشامی: (اکتسب حراما) توضیح المسئلة ما فی التتارخانیة حیث قال: رجل اکتسب مالا من حرام، ثم اشتری، فهذه علی خمسة أوجه: إما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولاً، ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها، و دفعها، أو اشتری قبل الدفع بها و دفع غیرها، أو اشتری مطلقاً و دفع تلک الدراهم، قال أبو نصر: یطیب له ولایجب علیه أن یتصدق إلا فی الوجه الأول، و إلیه ذهب الفقیه أبو اللیث، لکن هذا خلاف ظاهر الروایة فإنه نص فی الجامع الصغیر: إذا غصب ألفا فاشتری بها جاریة، و باعها بألفین تصدق بالربح، وقال الکرخی: فی الوجه الأول والثانی لایطیب، وفی الثلاث الأخیرة یطیب، و قال أبوبکر: لایطیب فی الکل لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس**" (ردالمحتار: ۷/ ۴۹۰)۔

"**غصب حانوتاً واتجر فیه و ربح یطیب الربح کذا فی الوجیز للکردری**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الغصب، الباب الثامن: ۵/ ۱۴۲)۔

اس تمہید کے بعد بالترتیب سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں:

الجواب: ۱

چونکہ آزادی سے قبل ہندوستان دار الحرب تھا، اور فقہاء نے دار الحرب میں حربی کافر سے عقود ربویہ کو جائز قرار دیا ہے اور ہر قسم کا مال جو غدر و خیانت نہ ہو اس کے ذریعہ سے اکتساب مال کی اجازت دی ہے، چنانچہ کتب فقہ میں مذکور ہے:

"**لا ربا بین حربی و مسلم و مستأمن ولو بعقد فاسد و أو قمار ثمة**" (الدر المختار علی ردالمحتار، باب الربوا، ۷/ ۴۲۲)۔

"**و بین حربی ومسلم ثمة: أی لا ربا بینهما فی دار الحرب، و کذلک إذا تبایعا بیعا فاسدا**

فی دار الحرب فهو جائز" (تبیین الحقائق، باب الربا، ۴/ ۴۲۷)۔

البتہ مسلمان کا مسلمان سے سود وقمار کا معاملہ کسی بھی حال میں جائز نہیں، خواہ دار الحرب ہو یا دار الاسلام، اس لئے جو مال آزادی سے قبل غیر مسلموں سے سودی طور پر حاصل ہوا ہو وہ مال جائز ومباح ہے، اور جو مال آزادی کے بعد سودی معاملہ کے ذریعہ حاصل ہوا وہ ناجائز اور قابل رد ہے، لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ مال آزادی سے قبل کے حاصل شدہ ہیں یا آزادی کے بعد کے، گویا اس کے حلال وحرام ہونے میں شبہ ہوگیا، مزید یہ کہ جب کوئی چیز ناجائز طریقے پر حاصل ہو عین اس چیز کو مالک کو لوٹانا اسی وقت واجب ہوتا ہے جب اس میں کسی طرح کا تصرف نہ کیا ہو اور وہ عین چیز موجود ہو، لیکن جب اس مال میں تصرف کرلیا گیا ہو یا اس کو اپنے صحیح مال میں ملا لیا گیا ہو تو عین شئ'' سے استحقاق ختم ہوکر وہ ذمہ میں واجب ہوجاتی ہے، اور اس چیز میں زکوۃ وو راثت جاری ہوتی ہے، چنانچہ فقہاء کرام لکھتے ہیں: "**قال فی الدر: السلطان إذا خلط مال المغصوب بماله ملكه، فتجب الزكوة فيه و يورث عنه لأن الخلط استهلاک إذا لم يكن تميزه عند أبی حنيفة رحمه الله، و قوله أرفق بالناس إذ قلما يخلو المال عن غصب، قال الشامی: و أی بمنزلته من حيث أن حق الغير يتعلق بالذمة لا بالأعيان**" (الدر المختار مع رد المحتار: ۳/ ۲۱۷)۔

"**كذلک ما يأخذه الأعونة من الأموال ظلما و يخطله بماله و بمال مظلوم آخر يصير ملكا له و ينقطع الحق الأول فلايكون أخذه عندناحراماً محضاً، نعم لايباح له الانتفاع به قبل أداء البدل فی الصحيح من المذهب**" (الفتاوی البزازیۃ علی الفتاوی الہندیۃ: ۴/ ۸۳)۔

لہٰذا ان عبارات کی روشنی میں ان علاقے کا اگر کوئی ایسا شخص جن کے آباء واجداد کافروں سے سودی تجارت کرتے تھے، پھر اس تجارت سے حاصل مال اسے وراثت میں حاصل ہوا اور وہ اس سے حلال تجارت کرنے لگا، تو وہ کمائی اس کے لئے حلال ہے، محض شک ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے سلسلے میں دار الامن کے فتوی کے بعد بھی سودی معاملہ ہوا ہے یا نہیں، نیز یہ کہ واجب الرد اور عدم ملک ورثہ کے لئے مال کا ناجائز ہونا اور علم ضروری ہے، اگر مال ناجائز ہو اور عین مال موجود ہو، ورثہ کو معلوم بھی ہو تو جس کا ہے ان کو لوٹانا واجب ہے، ورنہ نہیں اور اگر مان بھی لیا جائے کہ دار الامن ہونے کا فتوی معلوم ہوجانے کے بعد بھی سودی معاملہ کیا گیا اور اس سے مال حاصل کیا، تو تجارت میں تصرف لازم ہے، اس لئے استحقاق ذمہ میں منتقل ہوگیا، عین میں باقی نہیں رہا، لہٰذا ایسا شخص اپنے آباء واجداد کے لئے دعا مغفرت کرے، اور احتیاطاً مشتبہ مال کے بقدر اندازہ کرکے صدقہ کرے۔

"**و إن كان كسبه من حيث لايحل و ابنه يعلم ذلک و مات الأب و لايعلم الابن ذلک بعينه**

فهو حلال له فی الشرع والورع أن یتصدق به بنیة خصماء أبیه" (الفتاوی الہندیۃ:۵/۳۴۹)۔

"**أخذ مورثه رشوة أوظلما إن علم ذلک بعینه لایحل له أخذه و إلا فله أخذه حکماً** ..... **والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم، و إلا فإن علم عین الحرام لایحل له و یتصدق به بنیة صاحبه و إن کان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولایعلم من أربابه و لاشیئاً منه بعینه حل له حکماً**" (ردالمحتار:۷/۳۰۱)۔

"**وفی الأشباه: الحرمة تنتقل مع العلم إلا للوارث، إلا إذا علم ربه، قال الشامی: قوله (وفی الأشباه الخ) قال الشیخ عبد الوهاب الشعرانی فی کتاب المنن: و ما نقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لایتعدی إلی ذمتین سالت عنه الشهاب ابن الشلبی فقال: هومحمول علی ما إذا لم یعلم بذلک، أما من رأی المکاس یأخذ من أحد شیئاً من المکس ثم یعطیة آخر ثم یأخذه من ذلک الآخر فهو حرام**" (الدرالمختارمع ردالمحتار:۹/۵۵۴)۔

امدادالاحکام میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں ہے:"اگرسود کفار سے لیا ہے تو بقول بعض علماء جائز ہے،اس کے اختلاط سے مال میں کوئی شبہ نہیں آتا"(امدادالاحکام:۳/۴۷۲)۔

الجواب:۲

اگرکوئی ایسا شخص ہوجس کی ساری جائیداد حرام کی ہو،یعنی حرام مال سے کمائی ہوئی ہوتو ایسی صورت میں اصل سرمایہ کے بقدر مال مالک یاوارث کوواپس کرے،اگر مالک یا مالک کاوارث معلوم ہواوراگراس کا مالک یاوارث معلوم نہ ہوتواصل سرمایہ کے بقدرصدقہ کرے،البتہ جواصل مال کا حاصل شدہ فائدہ ہےوہ ایسے شخص کے لئے حلال ہے،فتاوی ہندیہ میں ہے:"**غصب حانوتاً واتجر فیه و ربح یطیب الربح کذا فی الوجیز للکردری**" (الفتاوی الہندیۃ،کتاب الغصب،الباب الثامن:۵/۱۴۲)۔

البتہ اگروہ شخص خودمفلس ہوتوایسا شخص بقدرضرورت مال رکھ کرباقی صدقہ کردے،لیکن اس صورت میں اجنبی پرصدقہ کرناہی واجب نہیں ہے، بلکہ اپنے غریب اولاداورغریب والدین وبیوی پرصدقہ کرنا کافی ہوگا؛فتاوی ہندیہ میں ہے:"**له مال فیه شبهة إذا تصدق به علی أبیه یکفیه ذلک لایشترط التصدق علی الأجنبی، وکذا إذا معه حین کان یبیع و یشتری و فیها بیوع فاسدة فوهب جمیع ماله لابنه هذا خرج من العهدة**" (الفتاوی الہندیۃ:۵/۳۴۹)۔

"**لو مات الرجل و کسبه من بیع البازق أو الظلم أو أخذ الرشوة یتورع الورثة ولا یأخذون منه**

شیئاً وهو أولی و یردونها علی أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه، لکن فی الهندیة عن المنتقی عن محمد فی کسب النائحة، و صاحب طبل و مزمار، لو أخذ بلا شرط، و دفعه مالکه برضاه فهو حلال و مثله فی المواهب" (ردالمحتار:۹/۵۵۳)۔

الجواب:۳

اگر کوئی ایسی عورت ہو کہ اس کا شوہر یا لڑکا حرام کماتا ہو، حتی الوسع سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود حرام کمائی سے نہیں رکتا ہو، اور ایسی عورت کے پاس جائز طریقے سے زندگی گزارنے کے لئے کوئی راستہ نہ ہو تو اس کے لئے ایسی صورت میں حرام مال سے کھانا جائز ہے، اس حرام کھانے وکھلانے کا گناہ اس کے شوہر ولڑکے پر ہوگا۔

شامی میں ہے:"**وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاماً أو کسوة من مال خبیث جاز للمرأة أکله و لبسها والإثم علی الزوج"** (ردالمحتار:۹/۲۸۹)۔

"یجب علی الزوجات فی مثل هذه الحالة أن یبذلوا أقصی ما فی وسعهم فی تحذیر أزواجهن عن العمل فی بیع الخمور والخنازیر و لکنهم إن أبوا إلا العمل فیه، فإن تیسر لهن تحمل نفقات أنفسهن بطریق مباحة، فلا یجوز لهن الأکل من أموال أزواجهن، و إن لم یتیسر لهن الأکل من أموال أزواجهن، و إن لم یتیسر لهن ذلک، فیسع لهم الأکل، و الإثم علی الأزواج و الآباء، للأطفال الصغار حکم الزوجات، أما الأولاد الکبار فعلیهم أن یکتسبوا لأنفسهم، ولا یأکلوا من هذا المال، و جواز الأکل فی مثل الحالة قد صرح به بعض الفقهاء" (بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة:۲۴۷، وأجوبة عن استفتاء المرکز الاسلامی بواشنطن-۲۶-عمل الأزواج والآباء فی بیع الخمور:۳۳۰)۔

حرام کمائی سے اپنے بچوں کو پڑھایا ہے اور پھر بچے کمانے لگے تو بچوں کی کمائی حلال ہے۔

الجواب:۴

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"**الحلال بین والحرام بین و بینهما مشتبهات لایعلمهن کثیر من الناس، فمن اتقی من الشبهات استبرأ لدینه و عرضه و من وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کالراعی یرعی حول الحمی یوشک أن یرتع فیه ألا و إن لکل ملک حمیً ألا و إن حمی الله محارمه"** (الصحیح لمسلم:۲/۲۸)۔

اگر کوئی ایسا شخص دعوت دے کہ اس کے بارے میں شبہ ہو کہ اس کا مال حلال ہے یا حرام، یا مخلوط ہے تو ایسی صورت

میں ایسی جگہ سے حتی الامکان دور رہا جائے اور ایسی جگہ دعوت ہی قبول نہ کرے، البتہ چونکہ حرام سے مال کا بالکل پاک ہونا چونکہ بہت مشکل ہے، ہر شخص کے پاس کسی نہ کسی درجہ میں حرام مال ہے تو قرینہ وغیرہ سے اندازہ لگائے کہ اس کا غالب مال حرام ہے یا حلال، دعوت کرنے والا کس طرح کا کام کرتا ہے، اس کا غالب مال کیسا ہوگا، تو اگر کسی شخص کا غالب مال حرام ہو تو ایسی جگہ دعوت میں نہ کھائے مگر یہ کہ دعوت دینے والا واضح کردے کہ فلاں حلال مال سے کھلا رہا ہے تو کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر غالب مال حلال ہو تو ایسی جگہ دعوت کھانے کی گنجائش ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**آكل الربا، و كاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه و غالب ماله حرام، لايقبل و لا يؤكل مالم يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته**'' (الفتاوی الہندیہ: ۵/ ۴۳۴)۔

الجواب: ۵

اگر دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ بالکل حرام تھا تو ایسی صورت میں حکم شرعی یہ ہے کہ وہ شخص توبہ استغفار کرے، کیونکہ کھانے والے کو معلوم نہیں تھا، اس نے لاعلمی میں حرام کھایا ہے۔

''**إن لم يعلم الآخذ أنه من ماله أو من مال الغير فهو حلال حتى يتبين أنه حرام**'' (الفتاوی الخانیۃ علی ہامش الفتاوی الہندیۃ: ۳/ ۴۰۰، ۴۰۱)۔

الجواب: ۶

اگر کوئی شخص ایسا ہو کہ اس کے پاس کمایا ہوا مال حرام ہو تو ایسے شخص پر تصدق واجب ہے، بغیر تصدق کے حرام مال کو حلال نہیں کیا جاسکتا ہے، البتہ فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ غریب والدین، بیوی، بچوں کو صدقہ کافی ہوگا، اجنبی کو صدقہ کرنا ضروری نہیں۔

علامہ ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں: ''اگر وہ مسلمان جن سے سود لیا ہے یاد نہ رہے کہ کون ہے یا یاد ہوں مگر اب لا پتہ ہوں، اور یہ بھی اندازہ نہ ہوسکے کہ سود کی رقم کتنی تھی، تو موجودہ مال میں سے اتنی رقم صدقہ کردینے کے بعد دل میں یہ گواہی دیدے کہ سود سب ادا ہوگیا، اور اس صورت میں صدقہ کرنا اجنبی پر ہی ضروری نہیں، بلکہ اپنی غریب اولاد اور غریب والدین اور غریب بیوی پر صدقہ کردینے سے بری الذمہ ہوجائے گا..... یہ شخص بحالت موجودہ (بدون اداء حق غرماء و بدون تصدق کے) کسی کو ہدیہ دیدے، یا کھانا کھلا دے تو دوسروں کو قبول ہدیہ اور کھانا جائز ہے، مگر اس شخص کو اپنے مال میں بدون طرق مذکورہ پر عمل کئے تصرف جائز نہیں'' (امداد الاحکام: ۳/ ۴۷۲) الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۴۹)۔

الجواب:۷

اگر کسی شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہو اور وہ اس کو صدقہ کر کے حلال کاروبار کرنا چاہ رہا ہو، لیکن کسی جگہ سے حلال مال بطور قرض کے ملنا ممکن نہ ہو تو وہ شخص اسی مال سے تجارت کر لے اور اصل مال کے بقدر بعد میں صدقہ کر دے، کیونکہ اگر کسی شخص کے پاس حرام مال ہو تو اس کے لئے اس سے تجارت کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کوئی شخص کر لے تو اس سے ہونے والا فائدہ اس کے لئے حلال ہوتا ہے، البتہ اس شخص کو مجبوری لاحق ہے کہ حلال تجارت کرنے کے لئے حلال قرض دینے والا نہیں ہے، اور شرعاً حلال مطلوب ہے، شریعت نے حلال کسب پر ابھارا ہے، اس لئے ایسا شخص بقدر ضرورت تجارت کے لئے مال رکھ لے اور بقیہ صدقہ کر دے، اور جتنا مال رکھا ہے تجارت میں نفع ہونے کے بعد جلد از جلد اتنی مقدار صدقہ کر دے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "**غصب حانوتاً واتجر فيه و ربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردري**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الغصب، الباب الثامن: ۵/ ۱۴۲)۔

مزید یہ کہ أہون البلیتین کو اختیار کیا جائے، اسی میں رفق ہے۔

"**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" (الاشباہ والنظائر: ۱۱۵)۔

"**إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمها ضرراً بارتكاب أخفهما**" (الأشباہ والنظائر: تحت القاعدۃ الخامسۃ)۔

الجواب:۸

اگر دوران ملازمت کوئی حرام کام کا ارتکاب نہیں کرنا پڑتا ہو تو فی نفسہ ایسے بزنس مین (Business Man) کے یہاں ملازمت درست ہے، اور اس کی آمدنی بھی حلال ہے، لیکن اگر ملازمت کے دوران حرام کاروبار کا حساب کرنا پڑتا ہو یا اس کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہو یا اس کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہو یا ملازمت کے دوران کسی مرحلہ میں براہ راست کسی معصیت یا حرام میں شرکت کرنی پڑتی ہو تو ایسی ملازمت چھوڑ دینی چاہئے، البتہ ایسی جگہ کام کرنے پر تنخواہ کی شکل میں ملنے والا معاوضہ اس کی محنت کا بدلہ ہے، اس کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ایسی آمدنی کراہت سے خالی نہیں ہے، ایسے کاروبار کرنے والوں کے یہاں کام نہیں کرنا چاہئے اور اگر کر رہا ہو تو دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرے، جب مل جائے تو اس کو چھوڑ دے۔

"**العمل في مطاعم الكفار إنما يجوز بشرط أن لايباشر المسلم سقي الخمر، أو تقديم الخنزير أو المحرمات الأخرى، فإن سقى الخمر، أو تقديمهما إلى ما يشربها حرام بنص صريح: عن ابن عمر قال: قال رسول الله ﷺ: لعن الله الخمر و شاربها و ساقيها و بائعها و مبتاعها و عاصرها و**

معتصرها و حمالها والمحمولة إليه'' (السنن لأبی داؤد، کتاب الأشربۃ، باب العصیر للخمر: ۵۱۷، (بحوث فی قضایا معاصرۃ: ۳۲۴)۔

''**رجل استأجر رجلا ليصور له صورا، أو تماثيل الرجال في بيت أو فسطاط، فإني أكره ذلك وأجعل له الأجرة، قال هشام: تأويله إذا كان الأصباغ من قبل الأجير كذا في الخيرية**'' (الفتاوی الہندیۃ: ۴/۴۵۰)۔

الجواب:۹

حرام مال سے کمائی کرنا گرچہ حرام ہے؛ لیکن اگر کوئی حرام مال سے کچھ منافع کمائے اور اس سے خرید کردہ جائیداد ہو تو ایسی جائیداد میں کام کرنا مثلاً: کھیتی کرنا اور اس کی کمائی، اسی طرح حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں کام کرنا، یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ اس کی کار یا بائک میں بیٹھنا، اسی طرح حرام کمائی کرنے والا اگر اپنے بچے کو اسکول یا مدرسہ میں داخلہ کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ وہ حرام کمائی کی صراحت کے ساتھ اسے متعین کرکے نہ دے۔

''**أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولا يأكل بالطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل**'' (الفتاوی الہندیۃ: ۵/۳۴۲)۔

الجواب:۱۰

ناجائز اور سودی رقم کا اصل حکم یہ ہے کہ اصل مالک کو واپس کردی جائے، اور اصل مالک تک رسائی ممکن نہ ہونے کی صورت میں بلا نیت ثواب فقراء پر صرف کردینا لازم ہے، کیونکہ سودی رقم کا کسی بھی طرح اصل رقم مالک کو پہنچانا ضروری ہے، اس لئے سودی رقم کسی شخص سے لی گئی ہو تو اس کو واپس کردی جائے اور اگر بینک سے لی گئی ہو تو بلا نیت ثواب فقراء و مساکین پر صدقہ کردی جائے، رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کرنے کی گنجائش ہے، سودی رقم افسران کو رشوت میں نہیں دی جاسکتی۔

''**ولكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه و يجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك و إلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء ..... لأنه لو أنفق على نفسه فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام ..... و لكن لايريد بذلك الأجر والثواب، و لكن يريد دفع المعصية عن نفسه، يدل عليه مسائل اللقطة**'' (بذل المجہود: ۱/۳۵۹، ۳۶۰)۔

الجواب:۱۱

ہدیہ دینے والے شخص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس کی کمائی حرام ہے محض حرام کمائی کا شبہ ہے تو اصول فقہ کا مسلمہ ضابطہ "**الیقین لایزول بالشک**" (الاشباہ والنظائر:۲) کی وجہ سے ہدیہ لینے کی گنجائش ہے، لیکن نہ لینا بہتر ہے: "**قال حسان بن أبی سنان: ما رأیت شیئاً أهون من الورع دع ما یریبک إلی ما لایریبک**" (الصحیح البخاری:۱/۲۷۵)، اور اگر حرام کمائی کا یقین ہے، اور حرام کمائی غالب ہے تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ وہ صراحت کردے کہ یہ حلال کمائی سے ہے، اور اگر حرام وحلال کی دونوں کمائی ہو اور حلال غالب ہو تو ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے۔

"**ففی الأشباه: إذا كان غالب مال المهدی حلال فلا بأس بأن یقبل الهدیة و یأكل مالم یتبین أنه حرام، لأن أموال الناس لاتخلو عن قلیل حرام و یعتبر الغالب**" (الفتاوی الخانیۃ علی ہامش الفتاوی الہندیۃ:۳/۴۰۰)۔

"**لایجوز قبول هدیة أمراء الجور إذا علم أن أكثر ماله حلال لأن الغالب فی مالهم الحرمة (قوله: إلا إذا علم) بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس لأن أموال الناس لاتخلو عن قلیل حرام و المعتبر الغالب و كذلک أكل طعامهم**" (الاختیار، کتاب الکراہیۃ، فصل الکسب وأنواعہ:۴/۱۷۶)۔

جواب:۱۲

قال و ذكر الرجل یطیل السفر أشعث أغبر یده إلی السماء یا رب یا رب مطعمه حرام، و مشربه حرام، و ملبسه حرام و غذی بالحرام فأنی یستجاب لذلک" (رواہ الترمذی:۲/۱۲۸)، اس حدیث پر غور کرنے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ جس کی کمائی حرام ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، نہ کہ وہ دعا جو ایسے شخص کے لیے کوئی دوسرا کرے، اگر کوئی دوسرا شخص اس کے لئے دعا کرے تو وہ قبول ہوسکتی ہے، لہٰذا حرام کمائی کرنے والوں کے بچے کے لئے دعا کرنا یا پانی پھوک کر دینا شرعاً جائز ودرست ہے۔

☆☆☆

مال حرام-احکام ومسائل

مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی ☆

جواب: (۱)

کسی چیز کے ایک آدمی کی ملک اور قبضہ سے دوسرے کی ملک میں پہنچنے کا ایک شرعی سبب میراث بھی ہے، البتہ اسلام نے میراث کے وارث کے قبضہ وملک میں منتقلی کے لئے کچھ شرائط بھی بیان کی ہیں، من جملہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مالِ میراث مورث کی ملک ہو، مسلمان پر یہ بھی ضروری ہے کہ آمدنی کے ذرائع حلال ہو، اس لئے کہ حرام مال آدمی کی ملک میں داخل نہیں ہوسکتا، تاہم کسی آدمی نے حرام ذرائع اختیار کئے، اب وہ شخص انتقال کرجائے تو یہ مال وارثین کی ملک ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں دو رائیں ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ مال حرام میراث کی راہ سے وارثین کو مل جائے، تو وہ مال-قلیل ہو یا کثیر-وارثین کے لئے حلال ہوگا، اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی حلال ہوگا، اس کا گناہ مورث کو ہوگا، کیونکہ اس نے یہ مال حرام ذرائع سے حاصل کیا، اس کے قائل حسن بصری، ابن شہاب زہری، سفیان ثوری، مالکی فقیہ سحنون بن عبدالسلام تنوخی ہیں، مذہب حنفی میں ایک ضعیف قول یہ بھی ہے۔

عباس احمد محمد بازر قمطراز ہیں:

"اختلف العلماء فی ملكية المال الحرام إذا كان الوارث يعلم أن مورثه قد اكتسب هذا المال بطريق حرام، وسبب اختلافهم هو هل للوارث أن يجوز هذا المال، مع علمه بحرمة كسبه، وعدم إقرار الشارع للوسيلة التی جاء بوساطتها؟ أم أنه يجوز له أن يأخذه، والإثم فی ذمة المورث الذی سعی فی كسب هذا المال بطريق محرم؟

انقسم العلماء فی هذه المسألة إلى فريقين:

☆ شیخ الحدیث ومہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ، گجرات

الفريق الأولى:

يرى أن المال الحرام إذا انتقل إلى الوارث بالميراث فإنه يطيب له، ويحل له الانتفاع به، قليلاً كان أم كثيرا، ويكون الإثم واقعاً على المورث الذى اكتسب هذا المال من مصدر حرام، أما الوارث فلا إثم عليه، وقد ذهب إلى هذاالقول طائفة من أهل العلم كالحسن البصرى، والزهرى، وسفيان الثورى وسحنون من المالكية، وهو قول فى مذهب الحنفية" (أحكام المال الحرام: الفصل الثانی، المبحث الاول ملکیۃ المال الحرام بطریق المیراث، ص: ۷۴، ۷۵، ط: دار النفائس، اردن)۔

دوسری رائے جمہور یعنی فقہاء اربعہ اور علامہ ابن تیمیہ کی ہے، ان کی رائے یہ ہے کہ موت مذکور حرام مال کو حلال و پاکیزہ بنانے کا ذریعہ اور سبب نہیں ہے، بلکہ مالک معلوم ہونے کی صورت میں یہ مال مالک کو لوٹایا جائے گا اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں فقراء ومساکین کو صدقہ کر دینا چاہئے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

"وفى حظر الأشباه: الحرمة تتعدد مع العلم بها إلا فى حق الوارث، وقيده فى الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال۔

قوله: (إلا فى حق الوارث الخ) أى فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم المالک بعينه فلا شک فى حرمته ووجوب رده عليه، وهذا معنى قوله "وقيده فى الظهيرية الخ".

وفى منية المفتى: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لا يحل، ولكن لا يعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث، والأفضل أن يتورّع ويتصدق بنية خصماء أبيه .وكذا لا يحل إذا علم عين الغصب مثلا، وإن لم يعلم مالكه ، لما فى البزازية : أخذ مورثه رشوة أو ظلماً، إن علم ذلک بعينه لا يحل له أخذه، وإلا فله أخذه حكماً، أما فى الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء .

والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يجل له ويتصدق به بنية صاحبه، وإن كان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام، ولا يعلم أربابه ولا شيئاً منه بعينه حل له حكماً، والأحسن ديانة التنزّه عنه۔

قوله: وسنحققه ثمة أى فى كتاب الحظر والإباحة۔ قال هناک بعد ذكره ما هنا لكن فى المجتبى: مات وكسبه حرام فالميراث، حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية، وهو حرام مطلقاً

علی الورثة فتنبه اهح ومفاده الحرمة وإن لم يعلم، أربابه، وينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه إذ لو اختلط بحيث لا يتميز يملكه ملكاً خبيثاً، لكن لا يحل له التصرف فيه ما لم يؤدّ بدله كما حققناه قبيل باب زكاة المال، فتأمل" (ردالمحتار مع الدرالمختار: کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطلب فیمن ورث مالا حراما، ۷/ ۳۰۰-۳۰۱، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

اس کی مزید تفصیل کرتے ہوئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

"في الدرالمختار: وفي الأشباه الحرمة تتعدد مع العلم بها إلا في حق الوارث، قيده في الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال وسنحققه ثمه"۔

اور ردالمحتار میں اس پر بہت بسط سے بحث کی ہے، حاصل مجموعہ کا یہ ہے کہ اگر کوئی مالِ حرام علیحدہ رکھا ہے تو وہ بالکل حرام ہے، یعنی اس میں تصرف بھی نافذ نہ ہوگا، پس اگر اس کا مالک معلوم ہے تو اس کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر معلوم نہیں تو لقطہ کی طرح مساکین پر تصدق کردے، اور اگر وہ مال باہم مخلوط ہوگیا تو اگر مالک مستحق معلوم ہیں تو اس کا بدل واپس کردے اور اگر مالک بھی معلوم نہیں تو قضاءً اس میں تصرف نافذ ہوسکتا ہے؛ لیکن دیانۃً اس کو حلال نہیں سمجھا جائے گا" (امداد الفتاویٰ: کتاب الحظر والاباحۃ، مال حرام ومشتبہ کے احکام: سوال: ۱۷۱، ۴/ ۱۴۴-۱۴۵، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ہر چند بعض فقہاء نے مطلقاً مال حرام کو وارث کے لئے حلال کہا ہے؛ لیکن یہ روایت صحیح نہیں، مفتیٰ بہ اور معتمد یہ ہے کہ اُن کیلئے بھی حرام ہے، پس اگر اربابِ حقوق ورثہ کو معلوم ہیں، تو اگر بعینہ اُن کی چیز محفوظ ہو تو اس کو ورنہ اس کی قیمت واپس کردیں، اور اگر معلوم نہیں تو اگر مال حرام معین اور متمیز ہے، تو اس کو مالک کی نیت سے تصدق کردیں اور اگر مخلوط غیر متمیز ہے تو اگر اس کی مقدار قیمت معلوم ہو اس کو تصدق کردیں، ورنہ تخمینہ کرکے تصدق کردے، ان شاء اللہ تعالیٰ آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا" (امداد الفتاوی: کتاب الفرائض، حکم کسب حرام برائے ورثہ، سوال: ۴۳۵، ۴/ ۳۵۰، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند)۔

علامہ حموی فرماتے ہیں:

"قوله: إلا في حق الوارث إلخ، قيل: عليه يخالفه ما في "البزازية": أخذ مورثه رشوةً أو ظلماً، إن علمه ذلك بعينه لا يحل له أخذه، وإن لم يعلمه بعينه له أخذه حكماً، فأما في الديانة فيتصدق به بنية الخصماء۔

قوله: وقيده في الظهيرية، أي الاستثناء المذكور، وحاصله أنه حلال للوارث بشرط أن

لایعلم أرباب الأصول، فإن علم وجب علیه رد کل شیء إلی صاحبه" (شرح الحموی علی الأشباہ والنظائر: کتاب الحظر والإباحۃ، الفن الثانی: الفوائد، رقم المسئلۃ: ۱۷۲۸، ۲/ ۴۶۳، ط: المکتبۃ الفیصل، دیوبند)

جب یہ مالِ حرام میراث میں ملے اس کا یہ حکم ہے، تو اس مال سے تجارت وغیرہ کی جائے تو اس کا حکم بھی واضح ہے، کہ اندازہ کر کے حرام کے بقدر مال صدقہ کر دے، تاکہ اس کی آمدنی شک وشبہ سے پاک ہو جائے۔

جواب: (۲)

کسی شخص نے حرام کاروبار سے جائداد خرید لی، اور اس کو عرصہ ہو گیا، اب اسی جائداد کے کرایہ سے وہ اپنی اور اہل وعیال کی کفالت کر رہا ہے، تو اس جائداد کے بارے میں کیا حکم ہے؟

اس پر فقہاء کی آراء مختلف ہیں، امام محمدؒ نے الجامع الصغیر میں فرمایا کہ اس سے حاصل شدہ نفع کو صدقہ کر دے، امام کرخیؒ بعض صورتوں میں اس میں گنجائش مانتے ہیں اور بعض صورتوں میں نہیں مانتے اور فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے تاتارخانیہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

"**قولہ: (اکتسب حراماً ...الخ) توضیح المسألۃ ما فی التاتارخانیۃ حیث قال: رجل اکتسب مالاً من حرام، ثم اشتری، فھذا علی خمسۃ أوجہ: أما إن دفع تلک الدراھم إلی البائع أولاً ثم اشتری منہ بھا، أو اشتری قبل الدفع بھا ودفعھا، أو اشتری قبل الدفع بھا ودفع غیرھا، أو اشتری مطلقاً ودفع تلک الدراھم، أو اشتری بدراھم أخر ودفع تلک الدراھم، قال أبو نصر: یطیب لہ ولا یجب علیہ أن یتصدق إلا فی الوجہ الأول، وإلیہ ذھب الفقیہ أبو اللیث، لکن ھذا خلاف ظاھر الروایۃ، فإنہ نص فی الجامع الصغیر: إذا غصب ألفاً فاشتری بھا جاریۃ وباعھا بألفین تصدق بالربح۔**

وقال الکرخی: فی الوجہ الأول والثانی لا یطیب، وفی الثلاث الأخیرۃ یطیب۔ وقال أبو بکر: لایطیب فی الکل، لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعاً للحرج عن الناس۔

وفی الولوالجیۃ؛ وقال بعضھم: لا یطیب فی الوجوہ کلھا وھو المختار، لکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعاً للحرج لکثرۃ الحرام" (ردالمحتار علی الدرالمختار: کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب اذا اکتسب حراما ثم اشتری علی خمسۃ أوجہ، ۷/ ۴۹۰، ط: زکریا بک ڈپو، دیوبند، الفتاوی التاتارخانیۃ: کتاب البیوع، رقم المسئلہ: ۱۲۱۴۵، ۸/ ۳۴۶، ط: زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

محض توبہ کر لینے سے مال پاک نہیں ہوا، بلکہ وہ کل مال یا اس کی مقدار صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ اگر اسی مال سے زمین خریدی گئی ہے، یا اس سے کوئی جائز تجارت کی جارہی ہے، تو اس زمین وتجارت کی آمدنی حلال ہوگی، اور ان کے یہاں

خوردونوش، آمدورفت بھی جائز ہوگی، لیکن اس پر ضروری ہوگا کہ جتنے ناجائز روپے اس نے زمین یا تجارت میں لگائے ہیں اس مقدار کوصدقہ کردے، اگرچہ اس کی آمدنی سے ہی ہو، "**فی القنیة لو کان الخبیث نصابًا ، لایلزمه الزکوة؛ لأن الکل واجب التصدق علیه**" (فتاویٰ محمودیہ: کتاب الحظر والاباحۃ، باب مال الحرام ومصرفہ، سوال:۸۹۰۸، ۱۸/ ۴۱۶، ط: دارالمعارف، دیوبند)۔

سوال: کیافرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک چور نے چوری کے مال سے کوئی حلال چیز خریدی، تو وہ حلال چیز دوسرے لوگوں کے لئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: چوری کا مال اور چوری کے مال سے خریدی ہوئی چیز استعمال کرنا کسی کے لئے جائز نہیں ہے (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۱۰۴)۔

"**اشتری بالثوب المغصوب جاریة، یحرم علیه وطؤها حتی یدفع قیمة الثوب إلی صاحبه۔ أن الصحیح لا یحل له الأکل ولا الوطء؛ لأن فی السبب نوع خبث**" (الشامی، کتاب الغصب، مطلب شری دارا أوسکنها ... زکریا: ۹/ ۲۷۸)۔

"**صرح الفقهاء بأن من اکتسب مالا بغیر حق، أو بغیر عقد کالسرقة، والغصب، والخیانة، والغلول، ففی جمیع الأحوال المال الحاصل له حرام علیه**" (بذل المجہود: کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء، دارالبشائر الإسلامیۃ بیروت ۱/ ۳۵۹، تحت رقم الحدیث: ۵۹، فتاوی قاسمیہ: کتاب الحظر والاباحۃ ، باب الکسب الحلال والحرام، سوال: ۱۱۰۰۷-۱۱۰۰۸، ۲۴/ ۴۵۰، ط: اشرفی بک ڈپو دیوبند)۔

جواب: (۳)

مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلال کمائی کے ذرائع اختیار کرے، حرام کمائی اور حرام ذرائع سے اجتناب کرے، اس کے باوجود کوئی شخص حرام کاروبار سے باز نہ آرہا ہو، اور اس کے ماتحت بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جو خود کمانے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، اور مذکور شخص ان کی کفالت حرام طریقہ کی کمائی سے کررہا ہے، تو اس کا گناہ اس کمانے والے شوہر اور بیٹے پر ہوگا، اس خاتون، یا چھوٹے بچوں کو یہ مال استعمال کرنے کے باوجود گناہ نہ ہوگا، علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

"**وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور، إن أکلت من طعامه ولم یکن عین ذلک الطعام غصبا، فهی فی سعة من أکله، وکذا لو اشتری طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من تناوله والإثم علی الزوج**" (الردالمحتار علی الدرالمختار: کتاب البیع الفاسد، مطلب فی من ورث مالاً حراما، ۷/ ۳۰۲، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

یہی عبارت علامہ حموی مصریؒ نے بھی ذکر فرمائی ہے (شرح الحموی علی الأشباہ والنظائر: کتاب الحظر والاباحۃ، رقم المسئلۃ: ۱۷۲۸،

رقم الہامش:۴، ۲/ ۴۶۲، ط: المکتبۃ الفقیصل، دیوبند)۔

عباس احمد محمد باز لکھتے ہیں:

"أما الأبناء ففی حکم إنفاقهم من المال الحرام الذی عند الأب ینبغی التفریق بین حالتین:

الأولی: أن یکون الابن غیر قادر علی تحصیل المال الحلال، إما لعجزه أو لصغر سنه، وکانت نفقته واجبة علی أبیه أو کان طالب علم لیس له مصدر رزق للعیش ودفع نفقات الدراسة إلا هذا المال الحرام الذی عند الأب، فإن حکمه فی الأخذ من هذا المال حکم المضطر إلی دفع الأذی عن نفسه بالمیتة، فیجوز له أن یأخذ ما ینفقه علیه والده، وأن ینتفع به مع إنکاره فی قلبه لهذا الأمر إلی أن یصبح قادراً علی الاعتماد علی نفسه فی تحصیل الکسب الحلال أو أن یأتیه مال من مصدر حلال، فیستغنی به عما عند والده من مال حرام، لأنه عند حصول المال الحلال تزول ضرورته إلی الإنفاق علی نفسه من المال الحرام، ویکون لزاماً علیه أن ینفق علی نفسه من هذا المال الحلال، ویحرم علیه أن یقبل نفقة والده من المال الحرام۔

الثانیة: أن یکون الابن قادراً علی الاعتماد علی نفسه والاستغناء عن والده، وله قدرة علی تحصیل المال من مصدر حلال، فإنه یحرم علیه أن یقبل نفقة والده من المال الحرام لاستغنائه بنفسه عن هذا المال، فإن قبل الإنفاق علی نفسه من هذا المال الحرام کان آثماً لاعتدائه علی مال غیره بهذا الإنفاق، ولعدم وجود ما یستلزم الأخذ من هذا المال ما دام أن المال الحلال موجود أو ممکن الوجود بالعمل والجد سلوک الطریق المشروع فی التحصیل، فإذا بلغ الصغیر قادراً علی الکسب، واستغنی الطالب بنفسه عن مال أبیه، حرم علیه أن یقبل نفقة والده من المال الحرام۔

فهو فی حال عجزه وصغره حاله کحال الفقیر العاجز عن الکسب، یجوز له أن ینفق علی نفسه من المال الحرام للحاجة، أما فی حال استغنائه بنفسه فهو غنی بقدرته علی الکسب، فتزول حاجته إلی المال الحرام" (احکام المال الحرام: الفصل الرابع، المبحث الثانی الانتفاع بالمال الحرام، المطلب الأول، ص:۲۸۹، ۲۹۰، ط: دار النفائس، الأردن)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر باپ یا شوہر حرام آمدنی سے کھانا کھلاتا ہے، اور تمام قسم کی کفالت وہ حرام کمائی سے کرتا ہے، تو وہ خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے، بیوی بچوں پر اس کا کوئی وبال نہ ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ دین دار ماں یا بیوی کو اس سے طبعی تکلیف ہوتی ہے، اس لئے وہ شوہر یا بیٹے کو حلال کمائی پر آمادہ کرتے رہیں۔

حضرت فقیہ الامتؒ فرماتے ہیں:

سوال: اگر کوئی آدمی مال حرام کما کر اپنی عورت کو کھلاوے تو عورت کو کھانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اگر وہ رشوت اور غصب نہ ہو تو گنجائش ہے، یعنی بعینہ حرام مال کا لینا ناجائز ہے، البتہ اس کے عوض کی چیزوں میں وسعت ہے، اور گناہ شوہر پر ہے (فتاویٰ محمودیہ: کتاب الحظر والاباحۃ، باب مال الحرام ومصرفہ، سوال: ۸۹۰۴، ۱۸/ ۴۱۲، ط: دارالمعارف، دیوبند)۔

جب گناہ اور وبال باپ پر ہے، تو اگر اس حرام کمائی سے اولاد کی کفالت کی اور اعلیٰ تعلیم دی، اب بیٹا تعلیم کے بعد کمائی کر رہا ہے، تو اس کی کمائی حلال ہے، جب تک وہ خود حرام کسب وذرائع اختیار نہ کرے۔

جواب: (۴)

رائد بن عبدالرحمٰن الشعلان لکھتے ہیں:

"لا خلاف بين العلماء في جواز إجابة دعوة صاحب المال المختلط، إذا علم أن طعامه من حلال، كما أنه لا خلاف بينهم في حُرمة إجابة دعوته إذا علم أن طعامه من حرام.

واختلفوا في مشروعية إجابة دعوته فيما جهلت عينه من طعامه، بأن يعلم المدعو أن لدى الداعي كسباً محرماً، لكنه يجهل عين الطعام الذي دعي إليه، هل هو من الحلال، أم من الحرام؟ على ثلاثة أقوال:

القول الأول: تجوز إجابة دعوة صاحب المال المختلط مع الكراهة، وهو القول المعتمد عند المالكية، وقول الشافعية، والمذهب عند الحنابلة، وقول بعض الحنفية، وبه قال ابن حزم.

القول الثاني: تحرم إجابة دعوة صاحب المال المختلط، وهو قول بعض المالكية، ورواية عن الإمام أحمد.

القول الثالث: التفريق بين إجابة دعوة من أكثر ماله من الحلال، وبين إجابة دعوة من أكثر ماله من الحرام، فتجوز إجابة دعوة صاحب المال المختلط الذي أكثر ماله من الحلال، وتحرم إجابة دعوة صاحب المال المختلط الذي أكثر ماله من الحرام، وهو قول الحنفية، والغزالي من الشافعية، ورواية عن الإمام أحمد" (المال المختلط دراسة فقهية تطبيقية: الباب الثاني احكام المال المختلط، الفصل الثالث، المبحث الثالث ص: ۲۱۰-۲۰۹، ط: وزارۃ التعلیم العالی، جامعۃ الإمام محمد بن سعود الإسلامیۃ، کلیۃ الشریعۃ بالریاض)۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

(**سوال**) جس شخص کی آمدنی مختلط ہو یعنی سودی کاروبار کرتا ہے و نیز کھیتی وغیرہ حلال آمدنی بھی کرتا ہے، ایسے شخص کے مکان میں خورد ونوش کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ بر تقدیر جواز لِم بھی ارشاد ہو، اس لئے کہ بظاہر تو عدم جواز کو ترجیح ہے، حسب قواعد اصول ''**إذا اجتمع الحلال والحرام فغلب الحرام**''۔

''(**جواب**) اس میں غالب کا اعتبار ہے، اگر حلال غالب ہے تو حلال ہے اور اگر حرام غالب ہے یا دونوں متساوی ہیں تو حرام ہے اور واقعی ''**إذا اجتمع الحلال والحرام**'' کا مقتضی حرمت علی الاطلاق تھا، لیکن دفع حرج کے لئے اعتبار غالب کا کیا گیا'' (امداد الفتاویٰ: کتاب الحظر والاباحت، مال حرام ومشتبہ کے احکام، سوال: ۱۸۳، ۴/ ۱۴۸، ج: ۴، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

جب یہ معلوم نہ ہو کہ غالب کیا ہے تو تحقیق کر لی جائے، اور تحقیق ممکن نہ ہو تو حالت اضطرار میں تحری کرے اور حالت اختیار میں دعوت قبول نہ کرے، اور اگر داعی کی پوری کمائی حرام کی ہونے کا مدعو کو علم ہے تو اس کو ایسی دعوت قبول نہ کرنی چاہئے۔

''**(لا يجوز قبول هدية أمراء الجور) لأنَّ الغالب فى مالهم الحرمة(إلا إذا علم أنَّ أكثر ماله من حلال) بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به، وفى البزازية: غالب مال المهدى إن حلالاً لا بأس بقبول هديته وأكل ماله، ما لم يتبين أنه من حرام، لأن أموال الناس لا يخلو عن حرام، فيعتبر الغالب وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها، ولا يأكل إلا إذا قال أنه حلال أورثته واستقرضته۔**

وعن الإمام أنَّ المبتلي بطعام الظلمة يتحرى، إن وقع فى قبله حله قبل وأكل، وإلا لا، لقوله عليه الصلاة والسلام: استفت قلبك'' (مجمع الانہر: کتاب الکراہیۃ، فصل فی الکسب، ۴/ ۱۸۶، ط: مکتبہ فقیہ الأمۃ، دیوبند)۔

فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے:

''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغى أن لايقبل الهدية ، ولا يأكل الطعام 'لا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو أستقرضته من رجل، كذا فى الينا بيع، ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور، لأن الغالب فى مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به، لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب، وكذا أكل طعامهم ،كذا فى الاختيار شرح المختار..... اكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه، وغالب ماله حرام، لايقبل ولايأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال**

ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا ، لابأس بقبول هديته والأكل منها، كذا فی الملتقط"
(کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات، ۵/ ۳۴۲، ۳۴۳، ط: زکریا بکڈپو، دیوبند)۔

جواب: (۵)

اگر دعوت کھانے سے پہلے علم نہیں تھا، دعوت کھانے کے بعد علم ہوا ہے، تو اس کے عدم علم وعدم واقفیت کی وجہ سے معاف ہوگا، تاہم وہ شخص توبہ واستغفار کرلے تو اچھا ہے، اللہ پاک فرماتے ہیں: "**إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا**" (نساء:۱۷)

حضرت مفتی رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"**جواب**: جس کے یہاں رشوت یا کسی قسم کا حرام مال ہے، نہ اس کی اجرت درست، نہ اس سے شرکت کھانے میں جائز، اگر خبر ہے، نادانستہ ہو تو معاف ہے" (باقیات فتاوی رشیدیہ: کتاب الحظر والاباحۃ، مردوں اور عورتوں کے بعض مسائل، سوال: ۷۵۶، ص: ۳۸۵، ط: مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ)۔

جواب: (۶، ۷)

اسی مال کو اصل مالک یا اس کے ورثہ تک پہنچانا ضروری ہے، جبکہ اصل مالک کا علم ہو، اور اگر اصل مالک کا علم نہ ہو تو فقراء ومساکین کو اتنی مقدار صدقہ کردے۔

رائد محمود احمد الشوابکہ لکھتے ہیں:

" فما مصير المال الحرام بعد أن يقوم صاحب المال المختلط بإخراجه من ماله، لمن يدفعه؟ ومن أحق الناس به؟ العلماء متفقون على وجوب رده لصاحبه؛ لأنه مالكه الحقيقي فهو أحق الناس.

وصاحب المال له حالتان: إما أن يكون معلوماً لآخذ المال، وإما أن يكون مجهولا .

الحالة الأولى: إذا كان مالك المال معلوما:

الواجب عليه في هذه الحالة أن يدفع إليه المال إن علم مكان إقامته، وإن جهل مكان إقامته بحث وسأل عنه، وإن كان غائباً انتظره، فإن لم يجده ويئس من العثور عليه، وجب عليه أن يرده إلى ورثته ؛ لأنهم أحقُّ الناس به بعد موته، وعلى هذا نص العلماء.

الحالة الثانية: إن كان صاحبه مجهولا:

اختلف الفقهاء فی هذه المسألة:

المذهب الأول: إن جُهل صاحب المال بعد البحث عنه ولم يجد له وارثا، ولا ديناً يقضيه عنه تحلل منه عنه فلا يبقيه بيده ويجب عليه التخلّص منه، وهذا مذهب الأئمة الأربعة من الحنفية، والمالكية، والشافعية والحنابلة، وابن تيمية۔

عند الحنفية: نصّ الحنفية على أن من "عليه ديون ومظالم جهل أربابها، وأيس من عليه ذلک من معرفتهم، فعليه التصدق بقدرها من ماله، وإن استغرقت جميع ماله، هذا مذهب أصحابنا لا نعلم بينهم خلافاً، كمن فی يده عروض لا يعلم مستحقيها اعتبارا للديون بالأعيان، ومتى فعل ذلک سقط عنه المطالبة من أصحاب الديون" (اختلاط الحلال بالحرام وأثرہ علی أحکام التعامل بالمال: الفصل الثالث أثر اختلاط الحلال بالحرام...، المبحث الرابع وسائل التحلل من المال المختلط، ص: ۱۳۸، ۱۴۱، ط: جامعۃ العلوم الإسلامیۃ العالمیۃ عمان-الأردن)۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''اس مال حرام کی مقدار کو مالکوں کو یا ان کے ورثہ کو واپس کرنا لازم ہے، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اس قدر مال محتاجوں کو صدقہ کرے۔

پوری طرح وہ مال اس وقت حلال ہوسکتا ہے کہ بقدر حرام مال کے صدقہ فقراء پر کردے اور اگر کسی شخص کا حق ہے تو اس کو واپس کرے یا معاف کرائے، یا اس کے ورثہ کو دے دے یا معاف کرائے۔۔۔۔'' (فتاوی دارالعلوم دیوبند: کتاب الحظر والاباحت، متفرق مسائل، سوال: ۱۸۰۳، ۱۸۰۴، ۱۷/ ۳۷۳، ط: مکتبہ دارالعلوم دیوبند)۔

امداد الفتاوی میں ایک سوال وجواب اس طرح ہے:

سوال: رنڈی، جواری، دغابازی جیسے کسب حرام والے تائب ہوکر اگر چاہیں کہ اپنے مال کو خدا کی راہ میں صرف کریں تو اس کی کیا صورت ہے؟ اگر خدا کی راہ میں صرف ناجائز ہو تو کیا کرے؟ جلا ڈالے، ڈبادے، اور کوئی شرعی حیلہ حلال کرنے کا ہے یا نہیں؟ بعض اپنا حلال روپیہ اس حرام روپے میں ملا کر زمین خرید لیتے ہیں، یہ حیلہ کیسا ہے؟

''**جواب**: وہ مال حرام رہتا ہے، جو لوگ فقر وفاقہ سے بہت پریشان ہوں ایسوں کو وہ مال بہ نیت رفع حاجت دینا چاہئے، نہ بہ نیت حصولِ ثواب، اور اگر وہ شخص جس سے وہ مال ان لوگوں کا حاصل ہوا ہے وہ بالتعیین وبالتخصیص معلوم ہو تو اس کو واپس کردینا چاہئے، اور حرام کو حلال کرنے کے لئے کوئی حیلہ مفید نہیں، اگر دوسرے روپے میں ملایا تو حصہ رسد اس کی نسبت سے اس میں بھی حرمت وخباثت پیدا ہوجائے گی اور اسی طرح جو چیز اس سے خریدی اس میں بھی۔ فقط واللہ أعلم''

(امداد الفتاوی: کتاب الحظر والاباحۃ، مال حرام ومشتبہ کے احکام، سوال: ۱۶۸، ۴/ ۱۴۴، زکریا بکڈپو دیوبند)۔

رائد بن عبدالرحمٰن الشعلان مخلوط مال میں تطہیر کی کیفیت وطریقہ کار ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"أولاً: أن يكون الكسب الحرام متميزاً عن الحلال بعينه.

إذا كان الكسب الحرام متميزاً عن الحلال، فإن الواجب فى هذه الحالة هو إخراج هذا الكسب الحرام المتميز عن الحلال بعينه، وذلك لأنه أمكن إخراج الكسب الحرام بعينه، فلا يصار إلى بدله وعوضه۔

ثانياً: أن يكون الكسب الحرام غير متميز عن الحلال بعينه۔

إذا كان الكسب الحرام غير متميز عن الحلال بعينه، فلا يخلو من ثلاث حالات:

الحالة الأولى: أن يكون مقدار الكسب الحرام معلوماً۔

إذا كان مقدار الكسب الحرام معلوماً، إلا أنه غير متميز عن الحلال بعينه، فإن الواجب فى هذه الحالة هو إخراج مقدار الكسب الحرام، وذلك لأنه تعذر إخراج عين الكسب الحرام فيصار إلى بدله، وعوضه، فإن التحريم لم يتعلق بذات الكسب الحرام، وإنما تعلق بجهة الكسب فيه، فإذا أخرج عوضه زال التحريم عنه، كما لو كان صاحبه حاضراً فرضى بعوضه۔

الحالة الثانية: أن يكون مقدار الكسب الحرام مجهولاً جهالة قابلة للتحرى۔

إذا كان مقدار الكسب الحرام مجهولاً، فإن الواجب فى هذه الحالة هو إخراج المقدار المجهول من الكسب الحرام عن طريق الاجتهاد والتحرى، كما قرر ذلك غيرواحد من أهل العلم۔

الحالة الثالثة: أن يكون مقدار الكسب الحرام مجهولاً جهالة غير قابلةللتحرى۔

إذا كان مقدار الكسب الحرام مجهولاً جهالةً شديدةً لا يمكن معها معرفة مقدار الكسب الحرام بالاجتهاد والتحرى، فقد ذكر شيخ الإسلام ابن تيمية أن المال المختلط يجعل نصفين، يخرج أحدهما بنية إخراج الكسب الحرام، والنصف الآخر حلال له" (المال المختلط دراسة فقهية تطبيقية: الباب الثانی أحكام المال المختلط، الفصل الخامس، المبحث الثالث ص: ۲۲۲ - ۲۲۳، ط: وزارة التعليم العالی، جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، كلية الشريعة بالرياض)۔

جواب: (۸)

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں:

"ذمہ دار افراد جو بینک میں سودی قرض لینے اور سود دینے کا کام کرتے ہیں ان کا تو یہ کام ناجائز ہوگا، باقی چونکہ سود

کا پیسہ اپنے پاس آتا نہیں، بلکہ سود کا پیسہ دینا پڑتا ہے، اس لیے اس طرح قرض لینے میں جو پیسہ آئے گا وہ خود خبیث نہ ہوگا، البتہ خبیث طریقے سے آنے کی وجہ سے اس قرض لینے دینے میں قدرے خباثت آئے گی، باقی وہ لیا ہوا روپیہ اور اس سے کمائی ہوئی آمدنی حرام نہ ہوگی، سب جائز وحلال رہے گی۔

جب یہ حکم ان ذمہ داروں کی آمدنی ونفع کا نکلا جو بینک سے سودی قرض لیتے اور دیتے ہیں، تو جو لوگ اس ذمہ داری کے علاوہ ہیں اور بینک سے خود سودی قرض نہیں لیتے، تو ان کا حکم بدرجۂ اولی نکل آیا کہ ان کی آمدنی اور نفع وغیرہ اس وجہ سے حرام وناجائز نہ ہوگا؛ بلکہ حلال وجائز رہے گا'' (منتخبات نظام الفتاوی: کتاب البیوع، باب الربوا، ۳/ ۱۴۲ط: ایفا)۔

حضرت فقیہ الامتؒ رقمطراز ہیں:

(**سوال**): یہاں پر ایک ایسی فیکٹری ہے جہاں شراب وغیرہ کا ایڈوٹائز بھی ہوتا ہے جو کہ حرام چیزوں میں سے ہے، اصل کام دوسرا ہے، کیا اس جگہ کی آمدنی میرے لئے درست ہے یا کہ نہیں؟

''(**جواب**): جب اصل کام شراب کے اعلان واشتہار کا نہیں؛ بلکہ جائز چیز کا ہے، تو ملازمت جائز ہے، شراب کے متعلق جہاں تک ہوسکے بچنا چاہئے'' (فتاوی محمودیہ: کتاب الاجارہ، باب الاجارۃ الصحیحۃ، سوال: ۸۰۹۳، ۱۶/ ۵۶۰-۵۶۱، ط: دارالمعارف، دیوبند)۔

''**عن سويد بن غفلة أن بلالا قال لعمر بن الخطاب رضى الله عنه: إن عمالك يأخذون الخمر والخنازير فى الخراج، فقال: لا تأخذوها منهم، ولكن ولوهم ببيعها، وخذوا أنتم من الثمن، فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة ببيع الخمر والخنازير، وأجاز للمسلمين أخذ أثمانهما فى الجزية والخراج، وذلك بمحضر من الصحابة، ولم ينكر عليه منكر**'' (إعلاء السنن ۱۴/ ۱۳۴-۱۳۵، ط: بیروت)۔

جواب: (۹)

حرام کمائی سے جو جائداد خریدی ہے یا کاروبار کررہا ہے، پوری طرح اس کا مال اس وقت حلال ہوگا، جب حرام مال کا فقراء پر صدقہ کردے، اور اگر کسی شخص کا حق ہے تو اس کو واپس کرے یا معاف کرائے یا اس کے ورثہ کو دے دے یا معاف کرائے۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ لکھتے ہیں:

''**صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالاً بغير حق، أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول، ففى جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه**'' (بذل المجہود: کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء،

۱/۷۳، تحت رقم الحدیث: ۵۹، ط: دار البشائر الاسلامیہ بیروت)۔

تاہم حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں:

سوال: حرام روپیہ مثلاً سود، رشوت وغیرہ سے زمین خریدنے سے شرعاً مملوک ہوجاتی ہے یا نہیں؟

اس کی پیداوار کھانا اور کپڑا خریدنا، نماز پڑھنا اور اس کی پیداوار کھا کر روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مملوک ہوجاتی ہے، مگر خباثت سے خالی نہیں ہے، اور اس سے جو آمدنی حاصل ہو وہ بھی مشتبہ ہے، اور اس کپڑے سے نماز ادا ہوجاتی ہے اور روزہ بھی صحیح ہے۔

سوال: حرام آمدنی سے کوئی شخص خیرات کرتا ہے اور زمین بھی خریدتا ہے، تو وہ زمین اس کی ملک ہوتی ہے یا نہیں؟

جواب: وہ زمین اس کی ملک ہوجاتی ہے، اور جو تصرفات وہ اس کی آمدنی میں کرتا ہے؛ صحیح ہے (فتاوی دار العلوم دیوبند: متفرق مسائل، سوال نمبر: ۱۸۲۳، ۱۸۲۴، ۱۷/۹ ۳۷، ۳۸۰، ط: مکتبہ دار العلوم، دیوبند)۔

خلاصہ یہ ہے کہ آمدنی مشتبہ ہے، تاہم تصرفات صحیح ہیں، اس لئے ایسے شخص کے یہاں نوکری کرنا اور دیگر معاملات صحیح تو ہیں، لیکن اس سے بچنا بہتر ہونا چاہئے۔

اور اگر زمین جائداد نہیں خریدی ہے، بلکہ حرام ہی کی آمدنی ہے، تو اس کے یہاں جائز ملازمت کے بارے میں حضرت مفتی اسماعیل صاحب کچھولوی دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

سوال: حرام آمدنی والے شخص کے یہاں جائز کام کی ملازمت کرکے اس سے مزدوری لینا درست اور جائز ہے یا نہیں؟

جواب: حرام آمدنی والا شخص خود حرام آمدنی کا مالک نہیں بنتا، اس لئے ہمیں اس کے یہاں مزدوری کرکے ایسے حرام روپے کیوں لینے چاہئے؟ ہمارے لئے بھی اس کی حرام آمدنی لینا جائز نہیں ہے، اگر اس کے یہاں کام کرنا ہو تو مذکورہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کی جائے:

(۱) اس کی دوسری جائز آمدنی ہو تو ان روپیوں سے مزدوری مانگی جائے، (۲) یا اسے کہا جائے آپ کسی دوسرے شخص سے قرض لے کر وہ روپے مزدوری میں دو، اور آپ کی آمدنی سے اس قرض کی ادائیگی کرو، ان صورتوں میں آپ کے لئے مزدوری لینا جائز کہلائے گا۔ (فتاوی دینیہ: کتاب الاجارہ، سوال: ۲۲۹۰، ۴/۲۶۵، ط: جامعہ حسینیہ، راندیر)۔

جواب: (۱۰)

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں:

''شریعت میں کمائی کے جن طریقوں کی سخت مذمت کی گئی ہے ان میں ایک رشوت بھی ہے، رشوت کا لینا اور دینا

دونوں حرام ہے، ایک حدیث میں تو آپ ﷺ نے ان دونوں پر اپنی زبانِ مبارک سے لعنت بھیجی ہے۔

رشوت ظلم نہ کرنے کیلئے حاصل کی جانے والی رقم بھی ہے اور جائز حق دینے پر لی جانے والی رقم بھی، لینا تو بہر طور حرام ہے؛ البتہ اپنی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ اور انصاف اور جائز حق کے حصول کے لئے رشوت دینے کی گنجائش ہے؛ اسی طرح کسی دشمن اسلام کے شر سے حفاظت کے لئے اس کو رشوت دی جائے؛ یہ بھی جائز ہے، جیسا کہ خود حضور ﷺ مفسد شعراء کی زبان بندی کے لئے دیا کرتے تھے" (حلال وحرام: دسواں باب کسب معاش، ص:۳۷۵)۔

حضرت مولانا رحمانی نے کتاب الفتاوی میں لکھا ہے:

" تعمیر مکان کے لئے جو قانونی لوازم ہیں، ان کو پورا کرنے کے باوجود کوئی افسر محض رشوت کے لئے تعمیر مکان کی اجازت نہیں دیتا ہے، تو ایسی صورت میں اپنا جائز حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے۔

"دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم ...ولاستخراج حق له ليس رشوة، يعنى فى حق الدافع" (ردالمحتار:۹/۶۰۷)۔

البتہ اس میں سود کی رقم نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ سود کی رقم حکومت سے حاصل کی جاتی ہے، اور رشوت ایک سرکاری آفیسر شخصی طور پر حاصل کرتا ہے، حکومت حاصل نہیں کرتی، اس لئے بینک کا سود اس میں دینا جائز نہیں" (کتاب الفتاوی: تجارت سے متعلق سوالات: سوال:۱۸۸۵، ۵/۳۰۸، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

اس لئے سود کی رقم اصل مالکوں کو لوٹادی جائے، یا خود محتاج ہے تو خود استعمال کرلے، یا محتاجوں کو صدقہ کردے، اور بعض فقہاء کے یہاں آخری مصرف رفاہ عام ہے، اس میں دیا جائے، اور یہ مال رشوت میں نہ دیا جائے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (ردالمحتار: کتاب الحظر والاباحۃ، ۵/۵۵۳، ط: زکریا بکڈپو دیوبند)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"لا بأس بالرشوة إذا خاف على دينه ، والنبى ﷺ كان يعطى الشعراء ولمن يخاف لسانه، وكفى بسهم المؤلفة من الصدقات دليلا على أمثاله"۔

...وفيه أيضا: دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه ولاستخراج حق له ليس برشوة ، يعنى فى حق الدافع" (کتاب الحظر والاباحۃ، باب الاستبراء وغیرہ، ۹/۶۰۷، ط: زکریا بکڈپو دیوبند)۔

اسلام ویب کے ایک فتوی میں لکھا ہے:

"فإن كنت أحق بالوظيفة من غيرك وأبى القائمون على التوظيف إعطائها لك، إلا بأن تدفع لهم مقابل ذلك مالاً ، فلا حرج عليك في ذلك، لأنك لم تتوصل بما دفعته إلى حق غيرك بل إلى حقك، والإثم يلحق من أخذها منك.إلا أنه لا يجوز أن يكون ما تدفعه إليهم من الفوائد الربوية، لأنه لا يجوز لك الانتفاع بها، بل يجب أن تنفقها في مصالح المسلمين؛ لا في مصالحك، ودفعك لها للحصول على حقك الوظيفي إنفاق لها في مصلحتك، وهذا لا يجوز. والله أعلم" (فقہ المعاملات، الانتفاع بالمال الحرام، حکم دفع الفوائد الربویۃ کرشوۃ، رقم الفتوی: ۲۷۳۲۷)۔

حضرت مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

سوال: مدرسہ کا کوئی ایسا کام جو سرکاری دفاتر سے وابستہ ہو، اور کوشش کے باوجود کافی وقت کا صرفہ ہو، مثلاً سال دو سال یا اس سے زیادہ مدت لگ جائے، اور رشوت دینے پر وہ کام جلد ہو جائے، تو اگر بینک کے سود سے رشوت دے دی جائے تو کیسا ہے؟ اگر سرکاری حکام رشوت کا مطالبہ کریں تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟ غرض مطالبہ وعدم مطالبہ کی صورت میں رشوت کا کیا حکم ہے؟

الجواب: اپنا حق بغیر رشوت دیئے وصول نہ ہو سکتا ہو، اسی طرح اپنی ذات سے دفع ضرر اس کے بغیر ممکن نہ ہو، تو اس صورت میں رشوت دینے کی گنجائش ہے؛ البتہ لینے والا تو اس صورت میں بھی گنہ گار ہوگا۔

بینک سے حاصل شدہ سودی رقم اس کے وبال کو دور کرنے کی نیت سے کسی محتاج اور فقیر کو بلا نیت ثواب دے دی جائے، یہی اس کا مصرف ہے (اشباع الکلام فی مصرف صدقۃ الحرام فتاوی دار العلوم امداد المفتیین: ۴/ ۵۳)۔

اس لئے رشوت میں دینے سے مصرف میں صرف نہ سمجھی جائے گی (محمود الفتاوی: باب الربا، سود کا مصرف، ص: ۱۳۴، ج:۶، ط: جامعہ جمبوسر، گجرات)۔

ہاں! اگر کسی شخص کو سودی رقم دے کر مالک بنا دیا جائے، اور وہ اپنی طرف سے یہ رقم کسی ذمہ دار کے حوالے کر دے، تاکہ وہ کارپوریشن یا ادارے کے کاموں میں منظوری کے لئے رشوت کی ادائیگی کے لئے دی جائے، تو اس کی گنجائش ہے۔

حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرماتے ہیں:

"(۱) وکیل سرکاری ہو یا آزاد ہو، اس کو جو فیس دی جاتی ہے وہ خزانہ سرکار میں نہیں پہنچتی ہے، اس لئے اس میں یہ

پیسہ دینا درست نہ ہوگا، ہاں جو پیسہ ٹکٹ یا اسٹامپ میں یا مقدمہ چالو وغیرہ میں جو رقوم حکومت کو ادا کی جائے وہ خزانہ سرکار میں پہنچتی ہے، اس لئے ٹکٹ یا اسٹامپ یا رقوم سرکاری میں جو پیسہ دیا جائے گا وہ ''ردالمال إلی رب المال'' کے ضابطہ شرعیہ کے مطابق ہوگا اور یہ دینا اس سودی روپیہ سے جائز رہے گا۔

(۲) تملیک مستحق کے مذکورہ بالا طریقہ کے بعد تمام مذکورہ چیزوں میں، یعنی لاوارث مردوں کو نہلانے، کفنانے، تدفین میں یا مسجد کی احاطہ بندی اور دیگر تمام متفرق امور میں جو مسجد کی تعمیر یا تزئین وغیرہ سے متعلق ہوں؛ سب میں سود کا یہ پیسہ بعد حیلۂ تملیک بلا غبار درست ہوگا'' (منتخبات نظام الفتاوی: کتاب البیوع، باب الربوا، ۳/ ۱۸۲ط: ایفا)۔

جواب: (۱۱)

حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم رقمطراز ہیں:

''دعوت، ہدایا اور تحائف کے سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ کسی مسلمان شخص کے یہاں کھانا کھایا جائے تو اس حسن ظن پر کہ یہ آمدنی اس کو حلال طریقہ ہی سے حاصل ہوئی ہوگی، اس کے بارے میں تحقیق وتفتیش نہ کرے؛ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے: ''**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاماً فليأ كل من طعام ولايسأل عنه، و إن سقاه شراباً فليشرب من شرابه ولا يسأل عنه**''۔

(تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے ہاں جائے، اور وہ اسے کھانا کھلائے تو کھالے؛ اس کے بارے میں تفحص نہ کرے، کچھ پلائے تو پی لے اور تفحص نہ کرے)۔

اس لئے کہ یہ ایک مسلمان سے سوئے زن اور بدگمانی ہے، اسی لئے فقہاء کے یہاں قاعدہ ہے: **الیقین لایزول بالشک** (یقین شک سے دور نہیں ہوتا)۔

پس جب تک کسی کی آمدنی کے حرام ہونے کا یقین یا گمان غالب نہ ہو اور اس سلسلہ میں کوئی قرینہ یا شہادت موجود نہ ہو؛ ایک مسلمان کے ساتھ حسن ظن کے تحت اسے حلال ومباح سمجھا جائے گا۔

ان اصول کے تحت ایسا شخص کہ جس کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کی آمدنی ہو، کب اس کے ہدایا کا قبول کرنا جائز ہوگا اور کب نہیں؟ اس بارے میں فقہاء نے رہنمائی کی ہے کہ اگر کسی کی آمدنی کا غالب حصہ حرام آمدنی پر مشتمل ہو تو اس کے تحائف قبول کرنا یا اس کے یہاں کھانا جائز نہ ہوگا اور غالب حصہ حلال کا ہو تو ضیافت، نیز تحائف کا قبول کرنا جائز ہوگا، البتہ اگر غالب آمدنی حرام ہو اور ہدایا کی رقم کے بارے میں دینے والا صراحت کرے کہ یہ حلال کی آمدنی سے ہے تو قبول کر سکتا ہے، اسی طرح آمدنی کا غالب حصہ حرام پر مشتمل ہو، لیکن ہدیہ دینے والا کسی ایسے ذریعۂ آمد کی اطلاع دے جو حلال ہو،

جیسے قرض یا وراثت، تو قبول کیا جاسکتا ہے'' (حلال وحرام: چوتھا باب خورد ونوش، ص:۱۱۷، ط: کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند)۔

غالبًا ایسی ہی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں:

''عن سلمان الفارسیؓ قال: إذا كان لک صديق عامل أو جار عامل أو ذو قرابة عامل، فأهدى لک هدية، أو دعاک إلى طعام، فاقبله، فإن مَهْنَأَه لک، وإثمه عليه''۔

اس لئے شک وشبہ نہ کیا جائے، ہاں اگر یقینی طور پر معلوم ہو کہ داعی کی کل آمدنی یا غالب آمدنی حرام ہے، تو اس سے بچنا ضروری ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک اثر نقل کرنے کے بعد سفیان الثوریؒ فرماتے ہیں:

''عن الثوری عن سلمة بن كهيل عن ذرّ بن عبدالله عن ابن مسعود قال: جاء اليه رجل، فقال: إن لی جارًا يأكل الربا، وإنه لا يزال يدعونی، فقال مهنأه لک، وإثمه عليه، قال سفيان: فإن عرفته بعينه فلا تصبه'' (المصنف لعبدالرزاق: کتاب البیوع، باب طعام الامراء وأکل الربا، رقم:۱۴۶۷۷، ۱۴۶۷۵، ۸/۱۵۰ ط: المجلس العلمی سملک، غجرات)۔

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''حرام کی آمدنی سے اگر کسی کو ہدیہ دیا جائے اور اس شخص کو معلوم ہو جس کو دیا جائے کہ یہ حرام کی آمدنی سے دیا ہے، تو اس کو لینا درست نہیں ہے، اور اگر اس کو معلوم نہیں ہے تو حلال ہے، اور حرام کمائی سے دعوت کرنے کا بھی یہی حکم ہے، اگر معلوم ہو تو نہ کھائے، اور اگر معلوم نہ ہو تو درست ہے'' (فتاوی دار العلوم دیوبند: کتاب الحظر والاباحۃ، متفرق مسائل، سوال: ۱۸۲۲، ۱۷/۳۷۹، ط: مکتبہ دار العلوم دیوبند)۔

جواب: (۱۲)

اس صورت میں مصلحت کے پیش نظر عمل کرنا چاہئے، اگر کسی حرام کمائی والے کے مکان پر دعا کے لئے بلایا جائے، تو دعا تو اُس کی رد ہوتی ہے، جس کو بلایا گیا ہے اس کی کمائی حرام نہیں ہے، اسی کو مدنظر رکھ کر حرام کمائی والا دعا کے لئے یا دم کے لئے بلا رہا ہے تو ایسے موقع پر مصلحت کے مطابق عمل کرنا چاہئے، اگر جانے کی صورت میں حرام کمائی والے کی اصلاح کی امید ہو تو ایسی صورت میں وہاں دعا یا دم کے لئے جانا چاہئے۔

ہاں! اگر وہ کھانا وغیرہ پیش کریں تو حکمت کے ساتھ اس سے منع کر دیں اور اگر ہدیہ وغیرہ دیں تو اس کو کسی بھی عنوان سے لوٹا دیں۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض احکام

مولانا ڈاکٹر اشتیاق احمد الاعظمی القاسمی ☆

جواب:۱

مال حرام بطور میراث، کسی کو ملے تو ورثہ اس کے مالک بن جاتے ہیں یا نہیں؟ اور ورثہ کا اس مال حرام سے انتفاع جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہاء کی دو آرا ملتی ہیں:

پہلی رائے:

وراثت میں ملا ہوا مال حرام، وارث کے لئے طیب اور حلال ہے اور اس سے انتفاع بھی جائز ہے، خواہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ، مال حرام کے کمانے کا گناہ، مورث پر ہوگا، نہ کہ وارث پر، یہی رائے حضرت حسن بصریؒ، امام زہریؒ، سفیان ثوریؒ، سحنون مالکیؒ کی ہے، اور یہی حنفیہ کا بھی ایک قول ہے۔

دلیل:۱

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ولا تزر وازرة وزر أخرىٰ'' (فاطر:۱۸)۔

اسی طرح اس قول کے قائلین نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فعل سے استدلال کیا ہے کہ جب عمر بن عبدالعزیزؒ مسلمانوں کے والی بنائے گئے تو انہوں نے اپنے پہلے کے ظالم حکام اور امراء کے ذریعہ بیت المال میں لوگوں کے جمع شدہ ظلماً اموال کو ان علماء اور فقہاء میں تقسیم کر دیا جو عطا اور مال کے دئے جانے کے مستحق تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ فعل دلیل ہے کہ اگر ظالم حکام کا یہ فعل باعث گناہ اور اثم نہ ہوتا تو عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے مظلومین کو واپس لوٹانے کے بجائے علماء وفقہاء کو دینا جائز نہ ہوتا، تو اسی پر مال موروث کو بھی قیاس کیا جائے گا، ''**فيقاس عليه المال الموروث فإن إثم الآخذ يثبت في ذمة المورث في حل للوارث أن يأخذ المال الحرام ميراثاً**'' (ملخص الملا الحرام: ص۱۹، تالیف: دکتور عباس احمد محمد الباز)۔

☆ سابق پرنسپل وشیخ الحدیث دار العلوم مئو

دوسری رائے:

جمہور احناف، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کی ہے کہ مورث کی موت، مال حرام کو طیب، حلال اور پاکیزہ نہیں بنادے گی: ''**ذهبوا إلى أن الموت لايطيب المال الحرام**'' (ملخص المال الحرام/۲۰)، بلکہ ایسی صورت میں مال حرام کو اصل مالک تک واپس پہنچانا واجب ہوگا، اگر اس کا پتہ معلوم ہو، اور عدم علم کی صورت میں اس مال حرام کو فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا واجب ہوگا: ''**بل الوجب فيه الرد على مالكه إن كان معروفا، و إن لم يكن معروفا فالواجب فيه التصدق به على الفقراء والمساكين**'' (أیضاً/۲۰)۔

جمہور کا یہ موقف شریعت کے مقتضی کے عین مطابق اور قیاس سے بھی میل کھا رہا ہے:

پہلی دلیل:

علماء وفقہاء کے یہاں یہ بات مسلم ہے کہ مال حرام جو حرام طور پر کمایا گیا ہو، وہ کسی مسلم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوا کرتا؛ چونکہ مورث کے پاس جمع شدہ تمام مال، حرام طور پر حاصل کردہ تھا، اس لئے وہ مال، خود مورث کی ملکیت میں داخل نہیں ہوا، اس کا اس مال پر قبضہ، غاصبانہ قبضہ تھا، اس لئے وارث کو میراث میں پہنچا ہوا مال، چونکہ مورث کی ملکیت سے خارج ہے، اس لئے وارث اپنے مورث سے اس مال حرام کو وراثت میں کیسے پاسکتا ہے اور اس کا مالک کیونکر بن سکتا ہے؟ ''**وبما أن المال الذى حازه المورث فى حياته كان بطريق محرم، فإن هذا المال لم يدخل فى ملكه و يده عليه يد غصب، ولما كان شرط ثبوت حق الوارث فى الميراث أن يكون المورث مالكا للمال الموروث فإن ما حازه بطريق غير مشروع لايكون ملكا له، فإذا مات لم ينتقل هذا المال إلى الوارث لوجودالمانع و انتفاء الشرط وهو عدم الملك**'' (ملخص المال الحرام:/۲۱)۔

دوسری دلیل:

کسی کی موت، مال حرام کو طیب، حلال اور پاکیزہ نہیں بنایا کرتی، اس ظلم وعدوان کے ذریعہ کسی کے مال پر غاصبانہ قبضہ کی وجہ سے وہ مال، اصل مالک کی ملکیت سے ہی خارج نہیں ہوا کہ مورث کی ملکیت میں داخل ہوکر بطریق وراثت، ورثہ کو مل سکے: ''**إن الموت لايطيب المال الحرام، لأن الموت لايخرج المال الماخوذ من ملك صاحبه ظلما و عدوانا و يدخله فى ملك الوارث**'' (ملخص المال الحرام/۲۱)۔

علامہ شامیؒ بھی ردالمحتار میں یہی تحریر فرماتے ہیں:'' **ولو مات الرجل و کسبه من بیع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة، یتورع الورثة ولا یأخذون منه شیئاً وهو أولیٰ بهم ویردونها علی أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه**'' (ردالمحتار، کتاب الحظر والاباحۃ، فی البیع: ۶/ ۳۸۵، دارالفکر، بیروت)، (اور اگر کسی آدمی کی موت ہوگئی، حال یہ کہ اس کی کمائی شراب کی خرید وفروخت سے یا ظلم اور بطور رشوت حاصل کردہ ہو، تو ایسے میں ورثہ کو احتیاط برتنی چاہئے اور مورث کی کمائی میں سے کچھ بھی نہیں لینا چاہئے، یہی ان ورثہ کے لئے بہتر ہے، اور اگر وہ، مال حرام کے حقیقی مالک کو جانتے ہوں تو اسے لوٹا دیں اور اگر نہیں جانتے تو پورے مال حرام کو صدقہ کردیں؛ کیونکہ اب حرام کمائی کا واحد راستہ صدقہ کرڈالنا ہے؛ جبکہ اصل مالک کو واپس کرنا متعذر رہو)۔

ورثہ نے مورث کے مال حرام پر جانتے ہوئے بھی قبضہ کرلیا، اور اتنا ہی نہیں؛ بلکہ اس سے حلال کاروبار بھی کرلیا اور اس کے نتیجے میں جائیدادیں بھی بنالیں، تو ورثہ کی کمائی تو جائز ہوگی، مگر وراثت میں ملی ہوئی اصل حرام رقم اور پونجی، واجب الرد ہے، اگر اس کے مالک کا پتہ ہو اور پتہ نہ ہونے کی صورت میں کل حرام رقم واجب التصدق ہوگی، اور اس سے کمائی ہوئی اس کی رقم اور جائیداد وغیرہ سب طیب اور حلال ہوں گی۔

رہا یہ مسئلہ کہ مورث کی حرام کمائی اور سودی رقم، آزادی سے پہلے کی ہے یا بعد کی؟ جب بالیقین پتہ نہیں ہے کہ کب کی یہ سودی رقم ہے تو شبہہ تو ہے ہی کہ آزادی کے بعد ہی کی ہو تو بہرحال احتیاط، تقویٰ اور ورع کا تقاضا یہی ہے کہ مال حرام سے اپنے دامن کو ملوث نہ کرے:''**دع ما یریبک إلی مالا یریبک**''۔

جواب: ۲

فقیر آدمی کے پاس، مال حرام موجود ہے، اور خود وہ اور اس کے اہل وعیال اس کے اس مال کے محتاج ہیں، کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں وہ اس مال حرام کو خود اپنی ذات پر بھی اور اپنے اہل وعیال پر بھی استعمال کر سکتا ہے، بہ شرطیکہ اس مال حرام (جو اس کے پاس موجود ہے) کا اصل مالک لاپتہ ہو تو جمہور فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے:''**ذهب جمهور الفقهاء إلی أنه یجوز للمسلم إذا کان عنده مال حرام أن ینفق هذاالمال علی نفسه و عیاله إذا کان فقیرا محتاجا إلیه ولم یعرف له مالکا یرده إلیه**'' (ملخص المال الحرام/ ۸۹)۔

حنفیہ میں سے''الاختیار'' کے مصنف''ابن مودود'' نے یہی بات تحریر فرمائی ہے، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں:''**المال الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنی تصدق بمثله، و إن کان فقیرا لایتصدق**'' (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۷۰، دارالکتب العلمیۃ، لبنان، طبعۃ ثالثۃ)، یہی رائے، شوافع اور حنابلہ کی بھی ہے،

ہاں جمہور فقہاء کے برخلاف، حارث محاسبی صوفی نے فقیر کے لئے بھی مال حرام کے استعمال کی گنجائش نہیں دی ہے: ''**وذهب الحارث المحاسبی إلی أنه لایجوز للمسلم إذا کان عنده مال من کسب حرام أن ینفق منه علی نفسه أوعیاله إذا کان فقیرا، فإن فعل ذلک، کان ما أنفقه دیناً فی ذمته یلزمه سداده إذا أیسر، وقد نقل هذا الرأی عن المحاسبی: الغزالی فی کتاب إحیاء علوم الدین**'' (ملخص المال الحرام/۹۰)۔

جواب: ۳

جب غریب خاتون (ماں/ بیوی) کے پاس کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں اور بیٹا یا شوہر حرام کمائی سے باز نہیں آرہے ہیں، یہ دونوں غریب خاتون بحکم مضطر ہیں، اور مضطر کے لئے بحالت اضطرار، اکل میتہ کی گنجائش بقدر ضرورت ہوا کرتی ہے، اس لئے بقدر ضرورت ماں یا بیوی اپنا نفقہ وغیرہ اپنے بیٹے یا شوہر کی حرام کمائی سے حاصل کرسکتی ہیں۔

ایسے ہی بیٹے کی تعلیم کے لئے، باپ نے حرام مال کا استعمال کرکے خوب پڑھایا لکھایا، چونکہ بیٹا یا تو صغرسنی یا عدم قدرت کی وجہ سے خود کما کر اپنی تعلیم وغیرہ پر خرچ کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا، وہ اپنے باپ سے مال حرام لے کر تعلیم پر خرچ کرنے میں مجبور ومضطر تھا، لہٰذا حالت اضطرار میں اس بچہ کا بسلسلہ تعلیم، مال حرام کا استعمال بقدر ضرورت جائز رہا؛ لیکن بچہ سمجھدار ہے تو مال حرام کو استعمال کرتے وقت، بادل ناخواستہ ہی استعمال کرے، دل میں کڑھن اور چبھن کا احساس ضرور ہونا چاہئے۔

اب تعلیم کے مکمل ہوجانے کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہوکر جو کمائی جائز طریقہ سے کرے گا، وہ سب اس کے حق میں جائز، حلال اور طیب ہوگی: ''**أن یکون الابن غیر قادر علی تحصیل المال الحلال، أما لعجزه أولصغر سنه وکانت نفقته واجبة علی أبیه أو طالب علم لیس له مصدر رزق للعیش ودفع نفقات الدراسة إلا هذا المال الحرام الذی عند الأب، فإن حکمه فی الأخذ من هذا المال حکم المضطر إلی دفع الأذی عن نفسه بالمیتة، فیجوزله أن یأخذ ما ینفقه علیه والده و أن ینتفع به مع انکاره فی قلبه لهذا الأمر إلی ان یصبح قادرا علی الاعتماد علی نفسه فی تحصیل الکسب الحلال أو أن یأتیه مال من مصدر حلال، فیستغنی به عما عند والده من مال حرام**'' (ملخص المال الحرام/ ۹۲)۔

علامہ تقی عثمانی مدظلہ ''بسلسلہ ماں کو مجبوراً بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرنے کا حکم'' کے جواب میں رقم طراز ہیں: ''حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اسے کسی حلال ذریعہ سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ واجب ہے، اور جب تک انتظام نہ ہو، توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش جاری رکھے، حوالہ میں حاشیہ پر ردالمحتار کی یہ عبارت مرقوم ہے: ''**وفی جامع**

الجوامع: اشتری الزوج طعاما أو کسوة من مال خبیث جاز للمراة أکله ولبسها والإثم علی الزوج'' (۱۹۱/۶، ردالمحتار علی درالمختار) **''وفی رد المحتار ایضاً: "ففی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أکلت من طعامه ولم یکن عینه غصبا أو اشتری طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذلک والإثم علی الزوج''** (ردالمحتار/۶/۳۸۶)۔

جواب:۴

شادی بیاہ یا کوئی اور دعوت ہو تو داعی کے مال کو دیکھا جائے گا، اگر غالب آمدنی حرام کی ہے تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں اور اگر غالب آمدنی حلال ہے تو دعوت قبول کرنا اور کھانا کھانا جائز ہے، اور اگر آدھی کمائی حرام اور آدھی حلال ہو تو بھی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہوگا، بموجب قاعدہ: **''إذا اجتمع الحلال و الحرام، غلب الحرام''**، امدادالفتاوی میں یہ فتوی مرقوم ہے: ''اس میں غالب کا اعتبار ہوگا، اگر حلال غالب ہے تو حلال ہے اور اگر حرام غالب ہے یا دونوں متساوی ہیں تو حرام ہے'' (۱۲۴/۹)، اور فتاوی ہندیہ میں یہ عبارت مرقوم ہے: **''وکذا دعوة من کان غالب ماله من حرام مالم یخبر أنه حلال وبالعکس یجیب ما لم یتبین أنه حرام، کذا فی التمرتاشی''** (ھندیہ ۴۲۲/۵، کتاب الکراھیۃ، باب الھدایا والضیافات)۔

پتہ نہ ہونے کی صورت میں تحقیق کر لی جائے، ورنہ ظن غالب پر عمل کا دارومدار رکھا جائے۔

جواب:۵

مال حرام سے کی گئی دعوت کھانا جائز نہیں؛ لیکن کھانے سے پہلے حرام مال سے ہونے کا علم نہ تھا، اور کھانا کھانے کے بعد حرام مال سے دعوت کے ہونے کا پتہ چلا تو اگر بالکل کھانے کے معاً بعد ہی پتہ چل گیا ہو تو ورع اور تقوی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر وہ اس کھانے کی قے کر سکتا ہو تو قے کر کے اپنے پیٹ سے مال حرام کو باہر نکال دے، جیسا کہ خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ میں منقول ہے: **''عن عائشة رضی الله عنها، قالت: کان لأبی بکر رضی الله عنه غلام یخرج له الخراج و کان أبو بکر رضی الله عنه یأکل من خراجه، فجاء یوماً بشییء، فأکل منه أبوبکر، فقال له الغلام: أتدری ما هذا؟ فقال أبوبکر: ماهو؟ قال: کنت تکهنت لإنسان فی الجاهلیة، وما أحسن الکهانةَ، إلا أنی خدعته، فلقینی، فأعطانی بذلک فهٰذا الذی أکلت منه، فأدخل أبوبکر یده فقاء کل شیيء فی بطنه''** (رواہ البخاری/رقم الحدیث ۳۸۴۲، کتاب مناقب الأنصار/باب أیام الجاھلیۃ)۔

اگر قے کرنا ممکن نہ رہا ہو تو جتنا کھانا کھایا ہے، اس کی تخمینی قیمت، داعی کو واپس کرنے میں کوئی دقت، الجھن اور پریشانی لاحق ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اسے واپس کردے، اگر داعی کو واپسی بھی مشکل ہو تو آخری آپشن یہ ہے کہ وہ رقم کسی غریب، فقیر اور مسکین کو دے دے، اور مال حرام کے کھالینے سے اللہ تعالی کے حضور توبہ اور استغفار کرے، ردالمحتار میں ہے:

"**ویردونها علی أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه**" (۶/۳۸۵، دارالفکر، بیروت)۔

اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مولانا تقی عثمانی مدظلہ رقم طراز ہیں: ''اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آجائے تو توبہ اور استغفار کرنا چاہئے اور تلافی کے لئے اتنی رقم صدقہ کردینا چاہئے'' (فتاوی عثمانی ۳/۱۲۶)۔

جواب:۶

حرام مال، جس راستہ سے حاصل کیا گیا ہو اور جن سے حاصل کیا گیا ہو، خواہ سرقۃً یا غصباً یا رشوۃ، اور ان کا پتہ بھی ہو، سب سے پہلے، یہ مال حرام ان کے اصل مالکوں کو لوٹا دیا جائے، اور اس مال حرام سے جو جائز طور پر مال کمایا گیا ہے، وہ حلال اور طیب ہوگا، اور اگر اصل مالک کا پتہ نہ ہو تو یہ مال حرام، فقراء و مساکین کو بلانیت ثواب صدقہ کردیا جائے تو جو مال حلال طریقہ پر اسی مال حرام سے کمایا ہوگا، وہ طیب وحلال ہوجائے گا۔

باقی کوئی حیلہ اختیار کرکے اسے حلال بنانے کی کوئی سبیل کرنا مفید نہیں ہوسکتا، جیسا کہ مفتی تقی عثمانی مدظلہ نے مال حرام کو حلال کرنے کے لئے غیر مسلم سے قرض والے حیلہ کے جواب میں تحریر فرمایا ہے، سوال کچھ یوں کیا گیا ہے:

''حرام رقم کو حلال کرنے کا بعض علماء یہ حیلہ بتاتے ہیں کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے لے اور حرام رقم سے قرضہ ادا کردے، کیا حضرت والا کے نزدیک یہ حیلہ درست ہے؟ اگر کسی نے ایسا کرلیا تو اب کیا کرے؟''

اس کے جواب میں حضرت لکھتے ہیں: ''اس حیلے سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا، وہ حلال ہوجائے گا؛ لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا'' (فتاوی عثمانی ۳/۱۲۵، کتاب البیوع)۔

فقہ کی مختلف کتابوں میں اس قسم کے حیلے کا تذکرہ موجود ہے؛ چنانچہ فتاوی ہندیہ میں یہ عبارت موجود ہے: "**وفی شرح حیل الخصاف لشمس الأئمة رحمه اللّٰه تعالٰی أن الشیخ أبا القاسم الحکیم کان یأخذ جائزة السلطان و کان یستقرض لجمیع حوائجه و ما یأخذ من الجائزة یقضی بها دیونه و الحیلة فی هذه**

المسائل أن يشترى نسيئة ثم ينقد ثمنه من أى مال شاء، وقال أبو يوسف رحمه الله: سالت أباحنيفةرحمه الله عن الحيلة فى مثل هذا فأجابنى بما ذكرنا، كذا فى الخلاصة"(فتاوی ہندیہ:۵/۴۲۱،کتاب الکرھیۃ،باب الھدایاوالضیافات)۔

جواب:۷

حلال کاروبار اور تجارت کرنے والے کے لئے حلال مال ملنے کا جب امکان نہیں ،تو اپنے پاس موجود مالِ حرام سے بہ نیت قرض لے کر جائز کاروبار کرتا ہے، پھر زیادہ کمائی کر لینے کے بعد، اصل قرض والی رقم کو بلانیت ثواب صدقہ کردے یا مال حرام کے اصل مالک کا پتہ ہوتو اسے لوٹادے،تو ایسی صورت میں یہ کمائی جائز ہوگی۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں اسی سے ملتے جلتے ایک سوال کے جواب میں جو کچھ کہا گیا، ہم اسے بطور استناد پیش کرتے ہیں:

اصل سوال کا عنوان یوں قائم کیا گیا ہے:'' حرام مال سے جو نفع ہوا، اس کا لینا اور اپنی ہی ضروریات میں اس کا استعمال کرنا کیسا ہے؟

اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

'' حرام پیسے کسی جائز تجارت میں لگائے ، پھر اس سے جو نفع ہوا، اس کا لینا اور اپنی ضروریات میں استعمال کرنا درست ہے، وہ حرام نہیں ؛لیکن ایسا اقدام کرنا درست نہیں ،لہٰذا پچاس ہزار روپئے سودی رقم سے آپ نے جو زمین خریدی اور دو لاکھ میں فروخت کردی تو ڈیڑھ لاکھ کا منافع اپنے استعمال میں لانا درست ہے؛ البتہ بچنا احوط ہے، ہاں وہ پچاس ہزار کی رقم سود کی ناپاک ہی رہے گی، اس کو بلانیت ثواب بہت زیادہ غریب ، محتاج لٹے پٹے لوگوں پر تصدق کردینا ضروری ہے'' (دارالافتاء دارالعلوم دیوبند، جواب نمبر ۱۵۳۴۷۷)۔

جواب:۸

جس آدمی کا آدھا کاروبار حلال ہے اور آدھا حرام، اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں کے حصہ کا کام کرنا پڑتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے بزنس مین کے یہاں ملازمت اختیار نہیں کرنا چاہئے ، جہاں کبھی کبھار ہی سہی ناجائز امور میں حصہ لینا پڑتا ہے، کیونکہ اس میں تعاون علی المعصیۃ لازم آتا ہے جو بنص قرآن جائز نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**ولا تعاونوا علی الإثم و العدوان**'' (مائدہ:۲)،اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے،حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے:''**لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم آكل الربوا ومؤكله وكاتبه وشاهديه، وقال: هم سواء**'' (رواہ مسلم/رقم الحدیث ۲۹۹۵، ۲۹۹۴)۔

جس ادارے کی اکثر آمدنی سود یا دوسرے ناجائز امور پر مشتمل ہوتو اس حرام آمدنی سے اجرت حاصل کرنا جائز نہیں (دیکھئے: حاشیہ فتاوی عثمانی ۳/ ۳۹۳)،اگر آمدنی کا نصف حصہ حلال اور نصف حصہ حرام ہوتو بھی اجرت حرام ہوگی،اس لیے کہ قاعدہ شرعیہ ہے:''**إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**'' (جب حلال اور حرام اکٹھا ہوجائیں تو حرام کو غالب مانا جائے گا)۔

جواب:۹

حرام مال سے خریدی گئی زمین کی پیداوار اس وقت تک مشتبہ رہے گی، جب تک یہ شخص ان لوگوں کو اتنی مقدار میں روپئے واپس نہ کردے، جو اس نے ان لوگوں سے بطور حرام وصول کیا تھا۔

فتاوی قاسمیہ میں مفتی شبیر احمد قاسمی مدظلہ نے اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں ایسا ہی فتوی دیا ہے،دلیل میں بذل المجہود کی یہ عبارت نقل کی ہے،ملاحظہ ہو:''**صرح الفقهاء: بأن من اكتسب مالا بغير حق ..... أو بغير عقد كالسرقةوالغصب و الخيانةوالغلول، ففي جميع الأحوال ، المال الحاصل له حرام عليه**'' (بذل المجہود: باب فی فرض الوضوا/ ۳۵۹،طبعہ اولی تعلیق الدکتور تقی الدین الندوی،فتاوی قاسمیہ ۲۴/ ۴۵۱)۔

حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری: مزدور یا نوکر کسی کے یہاں مزدوری یا نوکری کرتا ہے،تو مالک جب تک مزدور یا نوکر کے ہاتھ میں روپئے دے کر یہ صراحت نہ کردے کہ میں نے تم کو یہ رقم خالص حرام کمائی سے دی ہے،اس وقت تک وہ روپیہ حرام نہ ہوگا، جب مالک،آپ کو مزدوری یا نوکری کا معاوضہ دے تو آپ کو کریدنے کی ضرورت ہی نہیں،آپ چپکے سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لیں اور اپنے استعمال میں لائیں،مزدوری یا نوکری کے یہ پیسے جائز ہی سمجھے جائیں گے۔

ایسا ہی ایک فتوی، دار الافتاء دارالعلوم دیوبند سے ،ایک سوال کے جواب میں دیا گیا ہے (دیکھئے جواب نمبر ۱۴۵۳۶۳)۔

حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ اس کی بائک میں بیٹھ کر سفر کرنا:

حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ اس کی بائک میں سفر کرنے کی معاصر فقہاء نے اجازت دی ہے،ایسے ہی ایک

سوال کے جواب میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند سے جواز کا فتوی صادر کیا گیا ہے۔

''صورت مسؤلہ میں آپ اپنے آفس کے ساتھی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر گھر یا آفس وغیرہ آجاسکتے ہیں، جائز ہے؛ کیونکہ انہوں نے گاڑی کے لئے جو سودی قرض لیا ہے، یہ بلاشبہہ حرام وناجائز کام کیا؛ کیونکہ مذہب اسلام میں سود لینا اور سود دینا، دونوں ہی حرام ہیں، اور سودی قرض لینے والا، قرض دینے والے کو اصل قرض کی واپسی کے ساتھ جو مزید دیتا ہے، وہ شرعاً سود ہوتا ہے؛ لیکن سودی قرض میں قرض لینے والے کو قرض کے نام پر جو پیسے حاصل ہوتے ہیں، قرض لینے والا قبضہ کے بعد ان کا مالک ہوجاتا ہے، نیز وہ بعد میں قرض واپس کرکے اس کا عوض لوٹا دیتا ہے، اس لئے یہ پیسے اس کے لئے حرام نہیں، اور ان سے خریدی ہوئی کار یا کوئی اور چیز بھی حرام نہیں، پس گاڑی کے مالک کے لئے، اسی طرح اس کی اجازت سے دوسروں کے لئے سودی قرض سے خریدی ہوئی گاڑی میں سوار ہونا اور سفر کرنا جائز ہے، البتہ گاڑی کے مالک نے گاڑی کے لئے سودی قرض لے کر جو گناہ کیا، اس سے اس پر سچی پکی توبہ کرنا لازم وضروری ہے، بدائع الصنائع میں ہے: ''**أما حكم القرض فهو ثبوت الملك لمستقرض في القرض للحال، وهذا جواب ظاهر الرواية'' و روى عن أبي يوسف في النوادر: لايملك القرض بالقبض ما لم يستهلك،،،،،،الخ** (بدائع الصنائع)۔

حرام کمائی کرنے والے آدمی کے بچوں سے مدرسہ یا اسکولی فیس کی وصولیابی:

جس آدمی کی مکمل یا اکثر آمدنی حرام ہو تو اس کے یہاں دعوت کھانا، اس کا ہدیہ لینا، یا مسجد، مدرسہ میں اس کا چندہ لینا اور قبول کرنا درست نہیں؛ البتہ خرید وفروخت اور کرایہ داری وغیرہ، یعنی مالی معاملات میں امام کرخیؒ کے قول کے مطابق گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ متعین کرکے اسے نہ دے، لہذا کل یا اکثر حرام مال اور اس کی آمدنی والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر یا اسکول اور مدرسہ میں ٹیوشن فیس کے طور پر اس کا مال لیا جاسکتا ہے، اس کی گنجائش ہے، اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر احتراز کرے تو اس کے افضل اور بہتر ہونے میں کچھ شبہ نہیں، ایسا ہی ایک فتوی دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے حرام کمائی والوں سے ٹیوشن پڑھا کر اجرت لینے کے حکم کی بابت صادر ہوا ہے۔

درج ذیل فقہی عبارتیں اس سلسلے میں بطور استدلال پیش کی جاسکتی ہیں:

''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية ولايأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع، ولايجوز قبول هدية أمراء الجور، لأن الغالب في مالهم الحرمة**

إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به، لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم، كذا في الاختيار شرح المختار" (فتاوی ہندیہ، کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات ۵/۴۲۰-۴۲۱)۔

جواب:۱۰

چونکہ سودی رقم، اصل مالک (بینک یا حکومت) کو واپس کرنا واجب ہوا کرتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب، غریبوں اور مسکینوں کو صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لئے نقشہ کی منظوری میں بطور رشوت جو رقم، متعلقہ افسران کو دی جاتی ہے، وہ انہی کی جیب میں رہ جاتی ہے، وہ اصل مالک خواہ بینک ہو یا حکومت کا کوئی ادارہ، اس کے کھاتے میں نہیں پہنچتی، اس بناء پر رشوت میں سود کی رقم دینا جائز نہیں، ردالمحتار میں یہ جزئیہ مرقوم ہے: "**ويردونها على أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها، لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**" (۶/۳۸۵)۔

جواب:۱۱

جس شخص کا مال اکثر حلال ہے اور کچھ حرام ہے تو اس سے ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہوگا اور یقین ہو کہ یہ ہدیہ، مالِ حرام سے ہی دے رہا ہے، تو ایسا ہدیہ لینا جائز نہیں ہوگا، اسی طرح اگر اس کی اکثر آمدنی حرام، یا حلال وحرام، دونوں مساوی ہوں تو بھی ہدیہ وغیرہ قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**وكذادعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال و بالعكس يجيب مالم يتبين أنه حرام، كذا في التمرتاشي**" (فتاوی ہندیہ ۵/۴۲۲)۔

حلال وحرام معلوم نہ ہونے کی صورت میں پوچھنا ضروری نہیں؛ بلکہ تحری سے کام لینا چاہئے، جدھر غالب گمان ہو، اس کے مطابق عمل کرے، حدیث میں ہے: "**ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمديديه إلى السماء، يا رب يا رب، ومطعمه حرام و مشربه حرام و ملبسه حرام، و غذى بالحرام فانىٰ يستجاب لذلك**" (رواہ مسلم، رقم:۱۵-۱۰)۔

جواب:۱۲

اب حرام کمائی کرنے والا اپنی اولاد کے حق میں یا دیگر مواقع پر علماء کرام سے دعا کرنے کو کہتا ہے، یا پانی پر دم

کرنے کو کہتا ہے، تو ایسے موقع پر علماء کرام کو موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اس شخص کو اولاً: حرام کمائی سے اجتناب، اور توبہ و استغفار پر آمادہ کرنا چاہئے اور ثانیاً: کسب حلال کی فضیلت اور اس کی برکات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں بیان کرتے ہوئے جائز کمانے کی ترغیب دینی چاہئے۔

رہا اس کی اولاد کے بارے میں دعاء خیر یا پانی وغیرہ پر دم کرنے کی بات، تو اس عمل کے جائز ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے، بچے یونہی معصوم ہوتے ہیں، ان کے حق میں دعا خیر کرنے کے جواز میں کوئی شبہہ نہیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار کے حق میں دعا کرنا ثابت ہے: "**اللهم اهددوساً**" (بخاری: ۲۹۳۷، ومسلم: ۲۵۲۴)، ایسے ہی آپ نے ارشاد فرمایا: "**اللهم اهدثقيفا**" (رواہ الترمذی: ۳۹۴۲)، کفار کے حق میں عفو درگذر کی دعا بھی کرنا ثابت ہے: "**اللهم اغفر لقومی فإنهم لايعلمون**" (بخاری: ۳۴۷۷، ومسلم: ۱۷۹۲)، (اے اللہ! جو زخم انہوں نے مجھے لگایا ہے، آپ انہیں معاف کردیجئے؛ کیونکہ صحیح معنوں میں یہ مجھے جانتے نہیں)، ورنہ کفار کے حق میں استغفار کے ممنوع ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے، فرمان رب کائنات ہے: "**ما كان للنبی والذين آمنوا أن يستغفروا للمشركين ولو كانوا أولی قربی**" (توبہ/ ۱۱۳)۔

هذا ما عندی والله اعلم بالصواب

☆☆☆

حرام کمائی کی چند صورتوں کے احکام

مفتی اشتیاق احمد قاسمی☆

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں سارے انسانوں کو حلال وطیب کھانے کا حکم ارشاد فرمایا ہے (بقرہ/ ۱۶۸) اور خاص طور سے مسلمانوں کو آپس میں حرام طریقے سے معاملہ کرنے کی حرمت بھی منصوص ہے؛ بس آپسی رضامندی سے تجارت کرکے مالوں کے حصول کی تاکید بھی قرآن مجید میں کی گئی ہے (نساء:۲۹) اور سود کی حرمت تو منصوص ہے (بقرہ/ ۲۷۵)، اس میں کوئی شبہ نہیں۔

دارالحرب میں سود

سود دارالاسلام میں بھی حرام ہے اور دارالحرب میں بھی؛ دنیا کے ہر خطے میں سود حرام ہے، قرآن مجید میں حکم مطلق ہے، سورہ بقرہ، آیت نمبر: ۲۷۵ کے اطلاق کو ہی احناف میں سے امام ابو یوسفؒ نے مستدل بنایا ہے، یہی راجح موقف ہے، امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ نے (دارالاسلام سے آئے ہوئے) مسلمان اور حربی کے درمیان سود کے نہ ہونے کی جو بات ارشاد فرمائی ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۱۱۷) وہ بھی مطلق نہیں ہے؛ بلکہ وہ سود کی ایک خاص شکل ہے کہ دارالاسلام سے کوئی مسلمان ویزا لے کر دارالحرب آئے، ظاہر ہے کہ اس کے معاملات غیر مسلموں سے ہوں گے، غیر مسلمین سود کے عادی ہیں؛ اس لیے اس کے لیے لین دین میں سود کی نوبت آئے گی، بلا سودی کاروبار اگر وہ کرنا بھی چاہے گا تو نہیں کرسکے گا؛ ایسی صورت میں دارالحرب کے غیر مسلم کو دھوکہ دیے بغیر ان کے طریقے کے مطابق اگر وہ سود حاصل کرلیتا ہے اور اسے اپنے ملک میں لے جاکر کھاتا ہے تو حربی کا مال چونکہ بلا کسی جعل سازی کے اس کے پاس آیا ہے؛ اس لیے اس کو کھانے کی اجازت ہوگی، اسی صورت میں جواز ہے اور جواز ربوا کی حلت کی وجہ سے نہیں ہے؛ بلکہ حربی کے مال پر بلا دھوکہ قدرت حاصل ہونے کی وجہ سے ہے؛ اس لیے جن لوگوں نے مطلقاً سود کے جواز کی بات سمجھی ہے وہ غلط اور مرجوح ہے۔

اور جب حلت اور حرمت میں اختلاف ہو تو حرمت کو ترجیح دینا متفق علیہ اصل ہے (الاشباہ والنظائر: ۱۰۹)۔

☆ مدرس دارالعلوم دیوبند

خلاصہ یہ کہ سود ہر جگہ حرام ہے، چاہے دارالحرب ہو اور ہندوستان دارالمعاہدہ یا دارالامن ہے (فتوی دارالعلوم دیوبند ۳۸۵۲) تو سود کی حلت کا سوال ہی نہیں اور اگر دارالحرب کی قسم میں سے تسلیم بھی کیا جائے تب بھی سود لینے کی اجازت نہیں ہوگی، یہاں کے مستقل باشندے کے لیے تو حلت واباحت کا سوال ہی نہیں۔

۱-وراثت میں ملے ہوئے حرام کاروبار کا حکم

اگر کوئی آدمی ایسا ہو کہ اس کے آباواجداد سود اور حرام کاروبار میں ملوث تھے، ترکہ میں انھیں کے اموال اور انھیں کی تجارت اس کو ملی؛ لیکن وہ فی الحال حلال کاروبار کر رہا ہو اور اسی کاروبار سے گھر جائداد، دوکان اور دوسری چیزیں حاصل کی ہوں تو اب وہ کیا کرے؟ اسے معلوم نہیں کہ اس کے آباء واجداد نے سود کب لیا ہے اور کتنا لیا ہے؟

تو اس کا شرعی حکم صدقہ کرنا ہے، آباواجداد کی حرام آمدنی کا اندازہ کر کے صدقہ کرنا واجب ہے، اور منافع کا یہ آدمی مالک ہے، ترکہ میں حلال کاروبار کے ذریعہ جو جائداد اور منافع حاصل کیے ہیں وہ اگرچہ طیب نہیں، مشتبہ ہیں؛ مگر حلال ہیں؛ البتہ صدقہ کرنا بہتر ہے، حرام کے منافع میں صدقہ کرنے کا مسلک طرفین کا ہے اور وہی مختار ہے (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۴۲، ۱۰۵۳)، اس حکم کو سمجھنے کے لیے چند باتوں پر غور کرنا چاہئے:

(الف) فقہاء نے قاعدہ بیان فرمایا ہے:

"**الحرام ينتقل أی تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدی و تبدلت الأملاک**" (ردالمحتار ۵/ ۹۸، بیع فاسد، ط: سعید)۔

حرام منتقل ہوتا ہے یعنی اس کی حرمت منتقل ہوتی ہے، چاہے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھوں میں جاتے رہیں اور ملکتیں بدلتی رہیں)۔

اس سے یہ سمجھ میں آیا کہ حرام مال ترکہ میں منتقل ہونے کے باوجود اصل مالک کا ہی رہتا ہے، نہ تو مورث کی ملکیت میں آتا ہے اور نہ ہی وارث کی ملکیت میں داخل ہوتا ہے۔

اس لیے جو مال مورث کے پاس سے حرام طریقے سے آیا ہے وہ واجب التصدق ہے؛ اس لئے کہ اصل مالک کا اتا پتہ نہیں ہے، چاہے مال کم ہو یا زیادہ، حرام کا وارث مالک نہیں ہوا؛ اس لیے وہ بلا مجبوری استعمال بھی نہیں کر سکتا۔

(ب) اس آدمی کے پاس جس مورث کے پاس سے مال آیا ہے وہ مخلوط تھا، اس میں حلال بھی تھا اور حرام بھی؛ خالص حرام نہ تھا تو حلال میں وراثت جاری ہوگی اور وارث حلال کی مبہم مقدار کا مالک ہوگا؛ اس لیے کہ حلال اور حرام کی مقدار الگ الگ معلوم نہیں ہے۔

(ج) خلط کو استہلاک مانا جاتا ہے (ردالمحتار علی الدر المختار ۵/ ۵۲۴، زکوۃ الغنم)۔

مورث نے حلال کو حرام سے ملا کر رکھا اور تجارت میں لگا کر حرام سے منافع بھی حاصل کیے، حرام کو بدلنے کی صورت میں مورث اس کا مالک ہوگیا؛ اگرچہ ملکیت میں حرام کی مقدار خبیث ہے: "**ملکها الغاصب ملکا خبیثاً**" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۲۳) (گندی ملکیت کی حیثیت سے غاصب اس کا مالک ہوگیا)

اس لیے کہ اب بعینہ واپس کرنے کی صورت رہی نہیں؛ اب اس مال کا بدل یا اس کی قیمت واپس کرنا متعین ہوگیا (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۱۷)۔

خلاصہ یہ کہ حرام اصل مالک سے منتقل ہوا ہے، اس لیے وہی اس کا مالک ہے، نہ تو مورث اس کا مالک ہے اور نہ وارث، حرمت منتقل ہوتی رہی ہے، خالص حلال میں میراث کا حکم جاری ہوا اور وارث اسی کا مالک ہوا، حرام چاہے مخلوط ہوکر آیا؛ اس پر ظاہری ملکیت بھی ہوگئی، اس لیے کہ بدل اور قیمت کا واپس کرنا ذمے میں لازم ہوگیا، تو وارث کے پاس بھی ملک خبیث کے ساتھ ہی منتقل ہوا، استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

اب چونکہ مقدار معلوم نہیں ہے اور مالک بھی معلوم نہیں ہے؛ اس لیے حرام کا اندازہ کرکے اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے صدقہ کردے؛ اس لیے کہ حرام میں ترکہ جاری نہیں ہوتا (فتوی جامعہ بنوری کراچی ۴/محرم ۱۴۴۵ھ)۔

"**وهو حرام مطلقاً علی الورثة فتنبه**" (ردالمحتار ۵/ ۹۹، بیع فاسد، ط: سعید) (اور وہ ورثاء پر مطلقاً حرام ہے؛ اس لیے چوکنا ہو!)۔

اور اس سے حاصل کردہ گھر، جائداد بھی چونکہ حلال وحرام کے اختلاف سے حاصل ہوا ہے؛ اس لیے حلال کے منافع حلال ہیں اور حرام کے منافع حرام ہیں، اگر مالک معلوم ہوتے تو ان کی رضامندی سے حلال ہوسکتے تھے، چونکہ مالک معلوم نہیں ہیں؛ اس لیے حرام کا اندازہ کرکے صدقہ کردے، اگر یک مشت نہ کرسکے تو دھیرے دھیرے صدقہ کرتا رہے، طرفین کا یہی مسلک ہے، یہی راجح اور مختار ہے (دیکھیے فقہ البیوع ۲/ ۱۰۴۲، ۱۰۴۴، ۱۰۵۳)۔

۲-حرام مال کی آمدنی (الف):

اگر کوئی آدمی مالدار ہو اور اس کے پاس حرام مال، حرام کاروبار یا حرام جائداد سے حاصل شدہ آمدنی ہو، مثلاً حرام مال سے گاڑی خریدی ہو، جس سے کرایہ آرہا ہو تو اس کو اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ساری کمائی کو مالک تک پہنچائے یا اس سے استعمال کی اجازت لے؛ اور مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس کی طرف سے صدقہ کرے، طرفین کا یہی مسلک ہے اور یہی مختار ہے (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۴۲، ۱۰۵۳)، حنابلہ کا بھی

یہی مسلک ہے، امام شافعی کا قول ثانی اور امام مالک کا ایک قول یہی ہے کہ منافع کو مالک کے حوالے کرنا لازم ہے، امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ جس کے پاس حرام مال ہے وہ منافع کا مالک ہے؛ مگر یہ مختار مسلک نہیں ہے، امام مالک راجح قول میں اسی کے قائل ہیں (بدایۃ المجتہد ۲/۳۲۱، غصب)۔

خلاصہ یہ کہ مالدار آدمی کے لیے حرام مال کی آمدنی کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

(ب) اور اگر آدمی غریب، نادار اور ایسا مفلوک الحال ہو جس کے پاس اس مال کے علاوہ کچھ نہ ہو تو اس کے لیے حرام مال کی آمدنی کا اپنے اوپر خرچ کرنا جائز ہے، مثلاً حرام مال سے خریدی ہوئی جائداد سے حاصل ہونے والا کرایہ وہ استعمال کرسکتا ہے؛ اور اپنے استعمال سے جو زائد ہو اس کو اصل مالک کی طرف سے صدقہ کردے، اپنے پاس نہ رکھے۔

"ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف في ملك الغير، والفرع يحصل على صفة الأصل، والملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنياً تصدق بمثله، و إن كان فقيرا لايتصدق" (الاختیار شرح المختار ۳/۶۱، غصب)۔ (اور طرفین کی دلیل یہ ہے کہ وہ مال گندے ذریعے سے ملا ہے اور وہ دوسرے کی ملکیت میں تصرف ہے، اور فرع اصل کی صفت کے مطابق ہی حاصل ہوتی ہے (یعنی حرام کی آمدنی حرام ہوتی ہے) اور گندی ملکیت کا راستہ اسے صدقہ کرنا ہے اور اگر اس نے اپنی ضرورت میں خرچ کیا تو (بھی) جائز ہے، پھر اگر وہ مالدار ہو تو اس کے برابر صدقہ کرے اور اگر محتاج ہو تو صدقہ نہ کرے)۔

ہدایہ میں یہ شرط بھی ہے کہ اس محتاج کے پاس کوئی اور مال نہ ہو جو اس کی ضرورت پوری کرے، تو ہی وہ خرچ کرسکتا ہے:

"إلا إذا كان لايجد غيره؛ لأنه محتاج إليه، و له أن يصرفه إلى حاجة نفسه، فلو أصاب تصدق بمثله؛ إن كان غنيا وقت الاستعمال، و إن كان فقيرا فلا شيئ عليه" (الہدایۃ مع فتح القدیر ۸/۲۵۷، غصب)۔

(مگر جب وہ (غریب) اس کے علاوہ مال نہ پائے؛ اس لیے کہ وہ اس کا محتاج ہے اور اس کے لیے (جائز) ہے کہ وہ اسے اپنی ضرورت میں خرچ کرے، پھر اگر حلال مال مل جائے تو اس کے برابر صدقہ کرے، اگر وہ استعمال کے وقت مالدار تھا؛ اور اگر محتاج تھا تو اس پر کچھ صدقہ کرنا نہیں ہے)۔

خلاصہ یہ کہ حرام مال کے منافع کا حکم لقطہ (گری پڑی چیز) کے حکم کی طرح ہے کہ اگر اٹھانے والا مالدار ہے تو استعمال نہ کرے اور اگر استعمال کرے تو قرض کے طور پر استعمال کرے، اور استعمال سے پہلے کسی مفتی سے اطمینان کرلے اور اگر محتاج ہے تو خود وہ صدقے کا مصرف ہے، استعمال کرسکتا ہے؛ مگر اپنی ضرورت کے بقدر ہی استعمال کرے (تفصیل کے لیے: فقہ البیوع ۲/۱۰۴۶)۔

(ج) حرام مال جو بھی اس کے پاس ہے اس کا حساب لگائے اور نیت کرلے کہ سارا صدقہ کردوں گا، پھر حسب سہولت دھیرے دھیرے تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا رہے اور حساب لکھتا رہے، جب سارا حرام مال نکل جائے تو وہ حرام سے بچ نکلا، اب ان شاء اللہ آخرت کی گرفت سے بچ جائے گا، آئندہ حلال کمانے اور کھانے کی کوشش کرے (فتوی دارالعلوم دیوبند ۱۵۸۱۰۶)۔

"**فعلم عين الحرام لايحل له و يتصدق به بنية صاحبه**" (ردالمحتار ۵/۹۹، سعید) (چنانچہ اگر عین حرام کو جان جائے تو وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگا اور وہ اس کو صاحب مال کی نیت سے صدقہ کرے گا)۔

(۳) شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی میں سے بیوی اور والدین کا لینا:

اگر مسلمان کا کوئی گھر ایسا ہو جس میں گھر چلانے والے حرام کمائی لاتے ہوں تو اس گھر میں رہنے والوں کی شرعی اور اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے کہ:

(الف) حرام کمائی سے روکیں، نصیحت کریں، احتجاج کریں۔

پھر اگر ساری کوششوں کے بعد بھی وہ حرام کمانے سے نہ مانیں تو پھر اس گھر میں رہنے والے افراد خواہ وہ بیوی اور ماں ہوں یا باپ اور دیگر افراد سب اپنی مالی حیثیت کو دیکھیں، اگر ان کے پاس کھانے پینے کے لیے مال ہو تو وہ اپنے مال میں سے کھائیں، تاکہ حرام سے بچیں، بیوی تو محض حرام سے بچنے کی نیت سے اور ماں باپ وغیرہ اس وجہ سے بھی بچیں کہ مال ہوتے ہوئے ان کا نفقہ اپنے مال میں ہی لازم ہے، کسی دوسرے پر لازم نہیں، چھوٹے بچوں کا بھی یہی حکم ہے کہ ان کا نفقہ ان کے مال میں ہی لازم ہے، اگر نہ ہو تو والد پر لازم ہوتا ہے (ہدایہ)۔

(ج) اور اگر ان سب کے پاس مال نہ ہو تو دیکھیں کہ جائز طریقے سے وہ اپنے اخراجات حاصل کرسکتے ہیں یا نہیں؟ مثلاً محنت مزدوری کرکے اگر وہ اپنے اخراجات برداشت کرسکتے ہیں تو ان کے لیے حرام کمانے والے کی کمائی سے لینا یا خرچ کرنا درست نہ ہوگا۔

(د) اور اگر مذکورہ بالا کوئی صورت نہ ہو تو اب مجبوری میں بیوی اپنے شوہر کے حرام مال سے اور غریب ماں باپ اپنے بیٹے کے حرام مال سے بقدر ضرورت کھا سکتے ہیں، پہن سکتے ہیں اور گھر میں رہ سکتے ہیں، دوسرے افراد خانہ کا یہی حکم ہے۔

"**اشترى الزوج طعاماً أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله و لبسها و الإثم على الزوج**" (ردالمحتار ۶/۱۹۱) (شوہر نے حرام مال سے کھانا یا کپڑا خریدا تو بیوی کے لیے اس کا کھانا اور اس کا پہننا جائز ہے اور گناہ شوہر پر ہوگا)۔

حرام مال سے حاصل کی ہوئی تعلیم والے کی کمائی:

بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے بچوں کی تعلیم میں حرام پیسے خرچ کرتا ہے، بچہ اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر لیتا ہے، پھر وہ ملازمت پر لگتا ہے تو اس بچے کی کمائی حلال ہے یا حرام؟ اس سلسلے میں پہلے تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حرام مال چاہے جہاں سے حاصل ہو حاصل کرنے والا اس کا مالک نہیں ہوتا:

"المال الحرام المأخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أونحو ذلک ليس مملوكا لمن هو بيده" (موسوعۃ فقہیہ کویت ۲۳/۲۴۸)، (حرام مال جو غصب کر کے لیا گیا ہو یا چوری کر کے یا رشوت کے طور پر یا سود کے ذریعے یا کسی اور طریقے سے وہ مال جس آدمی کے ہاتھ میں ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے)۔

ایسے مال کو صاحب مال کو واپس کرنا واجب ہے، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں صاحب مال کی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہے؛ اس لیے اس مال کو نہ تو اپنی ذات پر خرچ کرنا جائز ہے اور نہ ہی اپنے اہل وعیال پر؛ اس لیے حرام مال سے تعلیم حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اگر کسی نے ایسا کیا تو اتنی مقدار کو صاحب مال تک پہنچائے اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں صدقہ کرے، تعلیم کے بعد ملازمت سے حاصل شدہ کمائی کا وہ خود مالک ہے، اس کو اپنے جائز مصارف میں خرچ کرنا جائز ہے، حرام مال سے تعلیم کا حصول یہ معنوی منفعت ہے؛ اس لیے اس کے اندر صاحب مال کو واپس ہونے یا صدقہ کیے جانے کی صلاحیت نہیں ہے؛ اس لیے اس معنوی خبث کے لیے دعا کرنی چاہئے، اور اس پر ملازمت کے ذریعہ حاصل ہونے والا نفع یہ منفعت کی منفعت ہے؛ اس لیے حرمت وہاں تک نہیں پہنچے گی۔

(۴) حرام کاروبار والے کی دعوت:

(الف) بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگ دعوت کرتے ہیں، شادی بیاہ، ولیمہ، عقیقہ اور دوسری تقریبات میں بلاتے ہیں اور ان کے بارے میں تعیین کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حرام کاروبار میں ملوث ہیں یا نہیں؛ مگر علاقے کے اکثر لوگوں کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکثر حرام کمائی میں ملوث ہیں تو ہوسکتا ہے کہ داعی بھی حرام کمائی میں ملوث ہو، یہ محض ظن ہے، اس صورت میں دعوت قبول کرنے والے کے لیے قبول کرنے کی گنجائش ہے؛ اس لیے کہ یہاں تعیین کے ساتھ کچھ بھی معلوم نہیں ہے تو داعی کو مسلمان ہونے کی وجہ سے حلال کمانے والا تصور کیا جائے گا۔

(ب) غالب گمان ہے کہ دعوت دینے والا حرام کمائی میں لگا ہوا ہے تو اگر معلوم کرنا ممکن ہو تو اندازہ کر لے کہ اس کے پاس حلال اور حرام الگ الگ ہے یا مخلوط ہے؟ اگر الگ الگ ہے تو اندازہ کر لے کہ زیادہ حلال ہے یا حرام؟ اگر زیادہ

حلال ہوتو دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہے اور نہ قبول کرنا بہتر ہے اور اگر وہ بتائے کہ اس نے حلال سے دعوت کی ہے جو اسے ترکہ میں ملا ہے یا کسی سے قرض لیا ہے تو قبول کرنے میں حرج نہیں اور اگر اکثر حرام ہو تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں اور ہدیہ کا بھی یہی حکم ہے (ہندیہ ۵/ ۳۴۲، زکریا دیوبند، محیط برہانی ۵/ ۳۵۷)۔

(ج) اگر اس کے پاس حلال اور حرام دونوں ہوں اور وہ مخلوط ہوں، یہ نہ معلوم ہو کہ حلال کتنا ہے اور حرام کتنا ہے؟

اکثر ایسا ہی ہوتا ہے اور معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے تو ایسی صورت میں دعوت قبول کرنا جائز ہے، بہتر نہیں، اور اگر قبول کرے تو کھائی ہوئی یا لی ہوئی چیز کے بارے میں ظن غالب کرلے کہ وہ حلال آمدنی کی مقدار کے اندر اندر ہے، اس سے تجاوز نہ کرے۔

"**والأولیٰ فی هذه الصورة التنزه و لکن یجوز للآخذ أن یأخذ منه بعض ماله هبة أو شراء اً؛ لأن الأصل الإباحة، و ینبغی أن یقید ذلک بأن یغلب علی ظن الآخذ أن الحلال فیه بقدر ما یأخذه أو أکثر منه**" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۳۸، دیوبند) (اور اس صورت میں بچنا بہتر ہے، مگر لینے والے کے لیے اس کے مال کا بعض حصہ لینا جائز ہے، چاہے وہ ہبہ کے طور پر ہو یا خرید کر ہو؛ اس لیے کہ اصل اباحت ہے اور یہاں یہ قید بھی ہونی چاہئے کہ لینے والے کو ظن غالب یہ ہو کہ وہ جو مقدار لے رہا ہے وہ حلال ہے یا حلال اس سے زیادہ ہے)۔

۵- غلطی سے حرام کھانے کا حکم:

اگر کوئی آدمی غلطی سے حرام کھانا کھالے، خواہ دعوت میں ہو یا کسی اور جگہ تو لاعلمی میں کھانے کی وجہ سے مؤاخذہ نہ ہوگا، فتوی تو یہی ہے (فتوی دار العلوم دیوبند: ۵۱۱۶۶)، مگر تقوی یہ ہے کہ ایسی صورت میں قے کردے؛ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری شریف میں ہے (التاریخ الاسلامی للحمیدی ۱۳/ ۱۹)، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت موطا امام مالکؒ (ص: ۱۱۶، زکوۃ) میں ہے کہ ان حضرات نے مشتبہ کھانے کو قے کرکے باہر نکال دیا؛ تاکہ حرام لقمہ جزء بدن نہ بن جائے؛ اس لیے کہ حدیث شریف میں ہے:

"**لایدخل الجنة لحم بنت من سحت، النار أولی به**" (رواہ أحمد)۔ (ہر وہ گوشت (والا جسم) جنت میں داخل نہیں ہوسکتا ہے جو حرام مال سے بڑھا ہو، اس کے لیے جہنم زیادہ لائق ہے)۔

۶- کمائے ہوئے حرام مال کا حیلہ:

اگر کوئی مسلمان غفلت اور گمراہی میں حرام کاروبار میں لگا رہا اور بعد میں اسے ہوش آیا تو (الف) وہ اپنے کاروبار کو

دیکھے، اگر کاروبار حرام سے بچ کر چل سکتا ہے، یا اس کے پاس اتنا حلال ہے کہ گھر کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں تو حرام مال کو ایک ساتھ صدقہ کر دے اور نیت صاحب مال کی طرف سے صدقہ کرنے کی کرے، اگر وہ مسلمان ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت دونوں میں اسے عنایت فرمادیں اور اگر غیر مسلم ہے تو اسے دنیا ہی میں عطا فرمادیں؛ اس لیے کہ آخرت میں ملنے کے لیے ایمان شرط ہے۔

(ب) اگر وہ مفلوک الحال ہے تو اپنے گزر بسر کے لیے رکھ لے کہ وہ مستحق صدقہ ہے اور بقیہ صدقہ کر دے۔

۷- اگر کوئی کاروبار کھڑا ہے اور اس کے ختم ہونے کا خطرہ ہے تو حرام کا اندازہ کر کے اس کی مقدار ایک جگہ لکھ لے اور نیت کر لے کہ سارا صدقہ کروں گا؛ اس کے بعد دھیرے دھیرے تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا رہے، یہاں تک کہ حساب میں وہ مقدار پہنچ جائے جو حرام تھی، اور ساتھ ہی توبہ واستغفار بھی کرتا رہے، اس حیلے سے وہ آخرت کی جواب دہی سے بچ سکتا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ اور آئندہ پکا ارادہ کرے کہ حرام میں نہیں لگوں گا (فتوی دار العلوم دیوبند: ۱۵۸۱۰۶)۔

۸- حرام بزنس میں ملازمت:

(الف) اگر کسی آدمی کا کاروبار حلال بھی ہے اور حرام بھی اور دونوں الگ الگ ہیں تو حلال میں ملازمت کرنا اور تنخواہ لینا حلال ہے اور حرام میں ملازمت کرنا اور تنخواہ لینا حرام ہے (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۶)۔

(ب) اور اگر ملازم کو کبھی حلال کاروبار میں کام کرنا پڑتا ہو اور کبھی حرام میں؛ مثلاً دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہو یا دونوں کے تقاضے پر جانا پڑتا ہو تو ایسی ملازمت جائز نہیں، اس لئے کہ حلال وحرام دونوں جمع ہیں تو حرام کو ترجیح ہوگی، الاشباہ والنظائر میں قاعدہ ہے: "**إذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام**" (الاشباہ والنظائر)۔

ایسی ملازمت کو چھوڑ دے؛ مگر چھوڑنے سے پہلے کوئی متبادل معاش تلاش کر لے، شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی صاحب زید مجدہ نے لکھا ہے کہ حرام خدمت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایسی ملازمت جائز نہیں ہے (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۶)۔

البتہ اگر کوئی آدمی ایسی کمپنی کا ملازم ہو گیا ہے تو اس کی اجرت کو بقدر حلال وہ جائز قرار دیتے ہیں: "**وحل التعامل و معه بقدر الحلال**" (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۷)۔

راقم حروف یہ کہتا ہے کہ آمدنی میں حرام خدمت کے معاوضہ کا اندازہ کر کے صدقہ کر دے۔

۹- (الف) حرام کمائی سے خریدی ہوئی جائداد میں کام کرنا:

اگر صراحتاً معلوم ہو کہ فلاں آدمی نے فلاں جائداد فلاں حرام آمدنی سے حاصل کی ہے، مثلاً کھیت خریدا ہے تو ایسے کھیت

میں کام کرنا بہتر نہیں، مکروہ ہے، اس لیے کہ اس سے حرام کے ذریعہ مال کے اضافے میں ایک طرح کا تعاون نظر آرہا ہے۔

مگر چونکہ مزدور کا کھیت کی خریداری سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ الگ صفقہ (معاملہ) ہے اور یہ الگ صفقہ ہے؛ اس لیے مزدور کی مزدوری اصلاً جائز ہوگی، وہ اپنے عمل کی اجرت لے رہا ہے، یہاں تعاون بالواسطہ ہے، جس طرح کرایے پر بینک کو دیے ہوئے مکان کا کرایہ جائز ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے، واللہ اعلم۔

(ب) حرام کمانے والے کے گھر میں نوکری:

اگر کوئی آدمی حرام کمانے والے کے گھر میں نوکری کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے، بہتر نہیں، اس لیے کہ یہ اپنے کام کی مزدوری لے رہا ہے جس طرح بینک میں جھاڑو دینے والے، چوکیداری کرنے والے، بجلی کا کام کرنے والے کی مزدوری جائز ہے؛ اس لیے کہ تعاون علی المعصیۃ میں واسطہ بڑھ گیا ہے۔

(ج) حرام کمائی کرنے والے مسلمان کے ساتھ اس کی سواری؛ کار اور بائک پر کرایہ دے کر سوار ہونے میں حرج نہیں، سفر کرنے والے کو گناہ نہیں ہوگا، قرآن پاک میں ہے:

"ولا تزر وازرة وزر أخرى" (سورہ الانعام: ۱۶۴) (اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔

اور اگر کرایہ نہیں لے رہا ہے، عاریت پر سوار کر رہا ہے تو جان بوجھ کر سوار ہونا مکروہ تنزیہی ہے، دونوں صورتوں میں بہتر ہے کہ سوار نہ ہو، چونکہ منع کرنے کی صورت میں عام مسلمان حرج میں پڑ جائیں گے؛ اس لیے جواز پر فتوی دیا جانا چاہئے۔

(د) حرام کمائی کرنے والا آدمی اگر اپنے بچے کو اسکول یا مدرسہ میں داخل کرائے اور صاف صراحت کر کے حرام میں سے دے تو لینا جائز نہیں ہوگا اور اگر بلا کسی وضاحت کے حرام میں دے رہا ہے تو لینا درست ہوگا، علامہ کرخی کی یہی رائے ہے، لوگوں سے حرج کو دفع کرنے کے لیے اسی پر فتوی ہے (ردالمحتار ۷/۴۹۰، زکریا دیوبند)۔

(۱۰) عمارت کا نقشہ پاس کروانے میں سود کی رقم دینا:

بڑی عمارت کا نقشہ پاس کروانے میں بڑی رقم خرچ ہوتی ہے، کارپوریشن کا محکمہ اور متعلقہ ادارے رشوت کے بغیر کام نہیں کرتے؛ مدارس، اسکول اور کالجز پر اخراجات کا بڑا بوجھ پڑتا ہے تو کیا اس صورت میں سود کی رقم استعمال کی جاسکتی ہے؟ یا نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سود کی رقم مالک کو پہنچانا واجب ہے اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں سود کے وبال سے بچنے

کی نیت سے فقراء اور عاجزین کو بلانیت ثواب دینا ضروری ہے، سود کی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں کہ اس کا فائدہ دینے والے کو پہنچتا ہے؛ خواہ وہ نجی کام ہو یا ادارہ جاتی کام ہو، جیسے مدارس اور انجمن کی عمارت کے لیے نقشہ پاس کرانے میں دینا، وغیرہ (مستفاد از فتوی دار العلوم دیوبند: ۶۹۷۵۱)۔

۱۱- اگر کسی جگہ کے اکثر لوگ سود میں ملوث ہوں:

اگر کسی آبادی کے اکثر مسلمان سودی کاروبار میں ملوث ہوں، اور لین دین کے وقت امتیاز کرنا مشکل ہو کہ وہ آدمی سود میں ملوث ہے یا نہیں تو اس سے معاملہ نہ کرنا تقوی ہے اور یہی بہتر ہے؛ مگر معاملہ کرنا جائز ہے؛ مثلاً:

(الف) وہ ہدیہ دیتا ہے تو اصلاً اس کا ہدیہ لینا جائز ہے؛ البتہ شبہ سے بچنے کے لیے نہ لینا تقوی ہے۔

(ب) اگر ایسا آدمی بچوں کو ٹافی اور میٹھائی وغیرہ دیتا ہے تو لینا جائز ہے اور نہ لینا تقوی ہے۔

(ج) اگر ایسا آدمی چائے پانی کرائے تو بھی کھانا پینا جائز ہے اور نہ کھانا پینا تقوی ہے۔

(د) اگر ایسا آدمی ایسی چیزیں دیتا ہے جس کا تبادلہ آپس کے معمولات میں داخل ہیں، مثلاً دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے تو اس کا لینا جائز ہے، اور شبہ سے بچنے کے لیے نہ لینا تقوی ہے۔

مذکورہ بالا حکم کی شرعی وجہ یہ ہے:

(الف) جو آدمی لے رہا ہے اور معاملہ کر رہا ہے اس کو سامنے والے کی کمائی کے حلال اور حرام ہونے کا علم نہیں ہے، ہر آدمی کی کمائی کی تفصیل معلوم ہونا اور معلوم کرنا دونوں مشکل ہے اور اس کا ہر مسلمان مکلّف بھی نہیں، لاعلمی میں محض گمان کی وجہ سے ناجائز ہونے کا حکم لگانا حرج میں ڈالنے کے برابر ہے اور حرج کو فقہاء نے مدفوع قرار دیا ہے، جہاں بھی حرج آنے کا اندیشہ ہو وہاں حکم میں تخفیف اور آسانی ہوتی ہے۔

(ب) امام ابوحنیفہؒ کا قاعدہ ہے:

"**الحرمة لا تتعدى إلى ذمتين**" (ردالمحتار ۲/ ۳۱۸/ التصدق من الحرام) (حرمت دو (آدمی کی) ذمہ داریوں میں نہیں جاتی)۔

یہ قاعدہ جانکاری کے ساتھ مقید ہے (ردالمحتار ۹/ ۵۵، حظر واباحۃ) کہ اگر دوسرا آدمی حرام کو جانتا ہے تو حرمت اس کی طرف منتقل ہوگی اور اگر اسے کوئی خبر نہیں ہے کہ پہلے شخص نے کہاں سے لاکر دیا ہے تو اس کے لیے معاملہ کرنا جائز ہوگا۔

(ج) جس آدمی سے یہ معاملات ہو رہے ہیں اس کے پاس اولاً: خالص حرام مال ہونے کا یقین نہیں ہے کہ معاملہ ناجائز ہو اور ثانیاً: حرام کا احتمال ہے جو شک کے درجے میں ہے جس کا اعتبار نہیں؛ ثالثاً: حلال کا احتمال بھی اسی درجے کا ہے؛

اوراشیاء میں اصل اباحت ہے؛اس لیے اس کے پیش نظر معاملہ کرنے کی گنجائش ہے۔

رابعاً:اگر حلال وحرام دونوں کے غیر ممیّز طور پر ہونے کا احتمال ہوتب بھی حلال کی حد تک لین دین میں حرج نہیں،جیسا کہ مفتی محمد تقی مدظلہ العالی نے (فقہ البیوع ۲/۸۰۳،طبع دیوبند) میں اس کی صراحت فرمائی ہےاور معاملہ نہ کرنے کو بہتر بتایا ہے۔

۱۲-حرام کمائی والے کے لیے دعا:

حدیث شریف میں ہے کہ جس آدمی کا کھانا حرام، پینا حرام،لباس حرام ہواور حرام سے اس کی پرورش کی گئی ہوتو وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر گریہ وزاری کے ساتھ یارب یارب کہتا رہےتو (بھی) اس کی دعا قبول نہیں ہوتی (صحیح مسلم،حدیث نمبر ۱۰۱۵)۔

(الف) اگر حرام کمائی والا آدمی اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع سے دعا کے لیے بلائے، یا دوسرے موقع سے بلائے مثلاً دکان کے افتتاح کے موقع سے بلائے تو اس کے یہاں جانا جائز ہے،اس موقع سے اس کی ہدایت،حرام کمائی سے بچنے اور توبہ کی توفیق حاصل ہونے وغیرہ کی دعا کرے اور اس کے لیے اور بچے کے لیے خیر مانگے،اور دعاء میں جمع کا صیغہ استعمال کرے؛ تاکہ وہ لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہو،اور اگر مصلحت سمجھے تو سری دعاء کرے اور احتیاط کے طور پر وہاں نہ کھائے،لطیف حیلے سے بچ نکلے۔

(ب) اگر کوئی حرام کمائی والا پانی پر دم کرنے کے لیے کہےتو بھی دم کرنے کی گنجائش ہے،اس کی ممانعت نظر سے نہیں گزری؛اس لیے جائز ہی سمجھ میں آرہا ہے،وباللہ التوفیق۔

☆☆☆

حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل

مفتی عبدالرشید قاسمی☆

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم أما بعد:

سوال(۱) کا جواب:

تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا تھی اس میں علماء کا شدید اختلاف تھا، بعض علماء نے اس کو دارالحرب قرار دے کر غیر مسلم سے سودی کاروبار کرنے کی اجازت دی تھی، جبکہ بعض محققین علماء نے اس وقت بھی سودی لین دین کو سختی سے منع کیا تھا جس کی تفاصیل اکابر کے فتاوی میں موجود ہیں، اب سوال یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد چوں کہ علماء کی رائے بدل گئی اور انھوں نے ہندوستان کو دارالامن قرار دے دیا تو تقسیم سے پہلے جن لوگوں نے دارالحرب کا فتوی دینے والے علماء کرام کے فتاوی کو صحیح مانتے ہوئے اس پر عمل کیا اور غیر مسلم سے سودی لین دین جاری رکھا اس مال کی شرعی حیثیت کیا ہوگی وہ جائز اور حلال ہوگا یا ناجائز اور حرام، نیز اگر ایسے اشخاص وافراد کے اموال کسی کو میراث میں ملے تو اس کا استعمال اس کے لیے جائز رہے گا یا نہیں؟ تو اس کا مدار اس بات پر ہے کہ اس وقت جن لوگوں نے سودی کاروبار کیا ہے ان کے لیے اس کا استعمال جائز تھا یا نہیں؟ اس سلسلے میں اکابر کے چند فتاوی ملاحظہ فرمائیں:

مفتی اعظم ہند حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں: ''سیونگ بینک کا حاصل کردہ منافع اور غیر مسلم سے حاصل کردہ منافع اپنے مصارف میں لاسکتا ہے'' (کفایت المفتی جدید مطول:۱۱/۶۸۱)۔

مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اگر کاشتکار غیر مسلم ہے تو ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی تقدیر پر طرفین کے قول کے مطابق سود لینا درست ہے، پھر اس کو اپنے کام میں لانا اور مال گذاری میں دینا درست ہے'' (فتاوی محمودیہ:۱۵/۳۷۸، ڈابھیل)۔

دوسری جگہ رقمطراز ہیں: ''جن حضرات علماء کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لینا جائز ہے ان کے نزدیک

☆ مفتی مدرسہ جامع العلوم جامع مسجد، پٹکاپور، کانپور

اس فاضل رقم کو خود استعمال کرنا بھی درست ہے'' (محمودیہ:۱۵/۳۸۱، ڈابھیل)

مذکورہ بالا فتاویٰ سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے ان حضرات علماء کرام کی رائے پر عمل کیا جنھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی صورت میں سودی لین دین کو مباح قرار دیا، ان لوگوں نے جو کچھ کمایا وہ ان کے لیے حلال تھا، لہٰذا ان کے ورثاء کے لیے بھی یہ مال حلال ہوگا، یہ حکم اس صورت میں ہے جب کہ وارثین کو علم ہو کہ میراث میں جو سودی مال ملا ہے وہ سب آزادی سے پہلے کا ہے، اگر وارثین کو یقینی علم نہ ہو کہ یہ سودی پیسہ آزادی سے پہلے کا ہے یا بعد کا، تب بھی وارثین کے لیے یہ اموال حلال ہوں گے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ممکن ہے کہ سودی پیسہ آزادی کے بعد کا ہو، لیکن یہ ایک شک اور وہم کی صورت ہے اور اس رقم کا آزادی سے پہلے کی کمائی ہونا ایک امر یقینی ہے، لہٰذا ''**الیقین لایزول بالشک**'' کی وجہ سے اس کو وارثین کے لیے حرام قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ جائز اور حلال ہوگا اور اس کا استعمال بھی درست ہوگا، ہاں اگر کسی ذرائع سے یقین یا ظن غالب ہوجائے کہ کمائی کا اتنا حصہ آزادی کے بعد کا ہے تو اتنا حصہ صدقہ کرنا لازم ہوگا، وارثین کے لیے اس کا استعمال جائز نہ ہوگا۔

سوال (۲) کا جواب:

مال حرام کا تعلق اگر شخصی معاملات مثلاً چوری، رشوت، سود وغیرہ سے ہو اور مال بعینہٖ موجود ہو تو ان تمام صورتوں میں حکم یہ ہے کہ یہ اموال جن جن لوگوں سے ناجائز طریقے سے وصول کیے ہیں اگر وہ حیات ہیں تو ان تک، ورنہ ورثاء تک پہونچانا لازم ہے، امام محمد رحمہ اللہ علیہ ''شرح السیر الکبیر'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''**وما حصل بسبب خبیث فالسبیل ردہ**'' (شرح السیر الکبیر للشیبانی: ۴/۱۱۱۶، ط: شرکۃ مساہمۃ)۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ ارباب اموال معلوم ہوں، اگر ارباب اموال معلوم نہ ہوں تو اس صورت میں بلا نیت ثواب ارباب اموال کی طرف سے صدقہ کردے۔

اور اگر حرام مال کمپنی وغیرہ اجتماعی حیثیت کے ادارے کے معاملات سے آیا ہو یا شخصی معاملات میں حاصل ہوا ہو مگر معاوضہ و بدل کے طور پر حاصل ہوا ہو مثلاً شراب، خنزیر اور دم مسفوح وغیرہ جو مال متقوم نہیں، انہیں بیچ کر رقم حاصل کی ہو یا مغنیہ (گانے والی) گانے پر اجرت لی یا بدکاری پر، یا بینک یا کسی سودی ادارے کی ملازمت کے معاوضہ میں حرام مال آیا ہو تو اس کی نوعیت پہلے سے ذرا مختلف ہے، اس صورت میں ان رقوم سے فارغ الذمہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ اس کو اپنے پاس رکھنے کی بجائے صدقات کے مستحق فقراء و مساکین کو دے دے۔

اور اگر کسی نے ان اموال حرام سے زمین و جائیداد یا مکان وغیرہ خرید لی جائے تو اگرچہ خرید و فروخت کا یہ معاملہ

شرعاً ناجائز ہے؛ لیکن امام کرخی علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق مذکورہ زمین وجائیداد وغیرہ خریدنے والے کی ملک صحیح ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز اور درست ہے، البتہ جتنے رقوم سے زمین وغیرہ خریدی ہے اتنی رقم اصل مالک یا اس کے وارثین کو یا مالک اور وارثین کے نامعلوم ہونے کی صورت میں فقراء پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔

"قَوْلُهُ (اكْتَسَبَ حَرامًا إلَخْ) تَوْضِيحُ المَسْأَلَةِ ما فِي التَّتارْخانِيَّة حَيْثُ قالَ: رَجُلٌ اكْتَسَبَ مالًا مِن حَرامٍ ثُمَّ اشْتَرى فَهَذا عَلى خَمْسَةِ أوْجُهٍ: أمّا إنْ دَفَعَ تِلْكَ الدَّراهِمَ إلى البائِعِ أوَّلًا ثُمَّ اشْتَرى مِنهُ بِها أوْ اشْتَرى قَبْلَ الدَّفْعِ بِها ودَفَعَها، أوْ اشْتَرى قَبْلَ الدَّفْعِ بِها ودَفَعَ غَيْرَها، أوْ اشْتَرى مُطْلَقًا ودَفَعَ تِلْكَ الدَّراهِمَ، أوْ اشْتَرى بِدَراهِمَ أُخَرَ ودَفَعَ تِلْكَ الدَّراهِمَ .قالَ أبُو نَصْرٍ: يَطِيبُ لَهُ ولا يَجِبُ عَلَيْهِ أنْ يَتَصَدَّقَ إلّا فِي الوَجْهِ الأوَّلِ، وإلَيْهِ ذَهَبَ الفَقِيهُ أبُو اللَّيْثِ، لَكِنْ هَذا خِلافُ ظاهِرِ الرِّوايَةِ فَإنَّهُ نَصَّ فِي الجامِعِ الصَّغِيرِ: إذا غَصَبَ ألْفًا فاشْتَرى بِها جارِيَةً وباعَها بِألْفَيْنِ تَصَدَّقَ بِالرِّبْحِ .وقالَ الكَرْخِيُّ: فِي الوَجْهِ الأوَّلِ والثّانِي لا يَطِيبُ، وفِي الثَّلاثِ الأخِيرَةِ يَطِيبُ، وقالَ أبُو بَكْرٍ: لا يَطِيبُ فِي الكُلِّ، لَكِنْ الفَتْوى الآنَ عَلى قَوْلِ الكَرْخِيِّ دَفْعًا لِلْحَرَجِ عَنْ النّاسِ وفِي الوَلْوالِجِيَّةِ: وقالَ بَعْضُهُمْ: لا يَطِيبُ فِي الوُجُوهِ كُلِّها وهُوَ المُخْتارُ، ولَكِنْ الفَتْوى اليَوْمَ عَلى قَوْلِ الكَرْخِيِّ دَفْعًا لِلْحَرَجِ لِكَثْرَةِ الحَرامِ اه" (ردالمحتار: ۷/ ۴۹۰، زکریا)۔

جب کہ حضرات طرفین علیہما الرحمہ کا مذہب یہ ہے کہ اصل مال حرام کو تو اصل مالک یا اس کے وارث تک پہونچانا ضروری ہے ہی، لیکن ساتھ ہی ساتھ سارے منافع کا صدقہ کرنا بھی لازم ہے، اپنے استعمال میں کرنا جائز نہیں ہے:

"الغاصب أوالمودع إذا تصرف فی المغصوب أوالوديعة ، والوديعة أوالمغصوب عرض أو من النقود وأدى ضمانها للمالک وبقی الربح يتصدق بالربح فی قول أبی حنيفة ومحمد رحمهما الله" (النہایۃ فی شرح الہدایۃ: ۱۳/ ۲۶۳، کتاب البیوع)۔

ان تفصیلات کی روشنی میں مذکورہ غریب کے پاس موجود اموال وجائداد کا حکم درجہ ذیل ہے:۔

(۱): متعین طور پر سود، رشوت وغیرہ جو مال حرام موجود ہے اسے اس کے اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے، اگر مالک زندہ ہوں، اور اگر زندہ نہ ہوں تو ان کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔

(۲): اگر مالک موجود نہیں ہے یا وہ مال حرام بدل اور معاوضہ کے طور پر حاصل ہوا ہے تو اگر ان کے پاس سارا مال ہی ناجائز اور حرام ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے تو ضرورت واضطرار کی حالت میں تمام مال صدقہ کرنے کے بجائے ناجائز آمدنی میں سے اتنا مال اپنے پاس رکھ لے کہ فاقہ سے بچ جائے اور اپنے اور اپنے اہل وعیال کی بنیادی ضرورت پوری

کر سکے اور بقیہ مال صدقہ کر دے۔

(۳): مال حرام سے جو مکان یا جائداد وغیرہ خریدی گئی ہے؛ چونکہ اس میں خبث داخل نہیں ہوا ہے، وہ اس کی ملک صحیح ہے، لہٰذا اس جائداد سے فائدہ اٹھانا، مکان میں رہنا یا اس کے کرایہ سے نفع حاصل کرنا جائز ہے، البتہ اس پر لازم ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کی قیمت اصل مال تک یا اس کے ورثاء تک یا مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں غرباء پر صدقہ کر دے، جس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ مثلاً ناجائز آمدنی سے دو مکان بنائے تو ایک مکان میں رہائش رکھے اور دوسرے کو فروخت کر کے مال حرام کے بقدر صدقہ کر دے، یا مکان تو ایک ہی ہے مگر زیادہ مالیت کی ہے تو اسے فروخت کر کے بقدر ضرورت گھر لے لے اور بقیہ رقم صدقہ کر دے، یہی صورت زمین میں بھی اختیار کرے، بلکہ احقر کی رائے یہ ہے کہ طرفین علیہما الرحمہ کے قول کے مطابق آہستہ آہستہ سارا نفع ہی صدقہ کر دیا جائے، کیوں کہ امام کرخی علیہ الرحمہ کے قول پر عمل کرنے کی صورت میں کسی نہ کسی درجہ میں حرام کاری کو بڑھاوا دینے کا شبہ ضرور ہوتا ہے۔

سوال (۳) کا جواب:

اگر کسی کے گھر کے ذمہ دار مثلاً شوہر یا بیٹا وغیرہ کی ذریعہ آمدنی حرام کاروبار ہو تو گھر والوں کو چاہیے کہ اسے حلال کاروبار کرنے کی ترغیب دے اور حرام ذریعہ آمدنی چھڑانے کی مسلسل کوشش کرے، پوری کوشش کے باوجود اگر وہ نہ چھوڑے اور گھر والوں کے پاس حلال آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی نہ ہو کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے اخراجات اٹھا سکے تو ایسی مجبوری کی صورت میں جائز اور حلال مال کے انتظام تک حفظ نفس کی ضرورت کے پیش نظر، انکار قلب کے ساتھ بیوی یا ماں وغیرہ کے لیے بقدر ضرورت مال حرام استعمال کرنے کی اجازت ہوگی، کیوں کہ ایک اضطراری صورت حال ہے جس میں مال حرام استعمال کرنے کی شریعت نے گنجائش دی ہے، اس صورت میں حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ صرف گھر کے ذمہ دار شوہر یا بیٹے وغیرہ پر ہوگا، کھانے والے پر ان شاء اللہ کوئی گناہ نہیں ہوگا: ''**وأما عند الاضطرار فإنها يرفع عنها الإثم؛ ولذا قال تعالى: (فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ باغٍ ولا عادٍ فَلا إِثْمَ عَلَيْهِ) أى من كان فى حال ضرورة، بحيث تتعرض الحياة للهلاك إذا لم يأكل شيئا من هذه المحرمات، فإنه لا إثم عليه إذا أكل، ويكون واجبا عليه أن يأكل إن لم يجد غيرها؛ لأن ضرر الموت أشد من ضرر الأكل، والضرر القليل يتحمل فى سبيل دفع الضرر الكبير**'' (زہرۃ التفاسیر: ۱/۵۱۰، ط: دار الفکر بیروت)

''**وفِي الخانِيَّةِ: امْرَأَةٌ زَوْجُها فِي أَرْضِ الجَوْرِ، إنْ أَكَلَتْ مِن طَعامِهِ ولَمْ يَكُنْ عَيْنُ ذَلِكَ الطَّعامِ غَصْبًا فَهِيَ فِي سَعَةٍ مِن أَكْلِهِ وكَذا لَوْ اشْتَرى طَعامًا أَوْ كِسْوَةً مِن مالٍ أَصْلُهُ لَيْسَ بِطَيِّبٍ فَهِيَ فِي سَعَةٍ مِن تَناوُلِهِ والإثْمُ عَلى الزَّوْجِ**'' (ردالمحتار علی الدر المختار: ۵/۹۹، کتاب البیوع/ باب البیع الفاسد، ط: دار الفکر بیروت)۔

نیز بچوں کی تعلیم پر حرام کمائی خرچ کرنا اگر چہ ناجائز اور حرام اور باعث گناہ ہے، لیکن حرام کمائی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بچہ ملازمت وغیرہ کے ذریعہ جو کمائی کر رہا ہے اور اس سے جو آمدنی اسے حاصل ہو رہی ہے اگر وہ ملازمت جائز اور حلال ہے تو اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حرام نہیں کہلائے گی، وہ حلال اور پاک آمدنی ہے، کیوں کہ اس کی اپنی جائز محنت کی کمائی ہے، البتہ بچوں کی تعلیم پر مال حرام خرچ کرنے کا وبال بہر حال خرچ کرنے والے پر ہوگا۔

سوال نمبر: (۴) کا جواب:

جس جگہ کے اکثر و بیشتر لوگوں کا ذریعہ آمدنی حرام کاروبار پر مشتمل ہو اور ایسی جگہ سے شادی وغیرہ کے موقع پر دعوت نامہ آجائے اور دعوت دینے والے کی کمائی کا صحیح علم نہ ہو کہ اس کی کس قدر آمدنی حرام ہے، پوری یا آدھی اور نہ ہی اس بات کا صحیح علم ہو کہ اس نے حرام رقم سے دعوت کا کھانا تیار کیا ہے یا حلال رقم سے تو ایسی صورت حال میں تقوی اور پرہیز گاری کا راستہ تو یہی ہے کہ حیلہ بہانہ کے ذریعہ دعوت کو ٹالنے کی کوشش کرے، لیکن داعی ایسا شخص ہے کہ اگر اس کی دعوت قبول نہ کی جائے تو اس کی جانب سے ضرر کا اندیشہ ہو یا کوئی فتنہ کی شکل ہو سکتی ہے تو اگر چہ یہاں یہ شبہ ضرور ہے کہ جب اکثر لوگ یہاں حرام کاروبار میں ملوث ہیں تو ممکن ہے کہ اس کا کاروبار بھی حرام ہو اور اسی حرام رقم سے دعوت بھی کی ہو، لیکن چونکہ اس کا یقین نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ بھی امکان ہے کہ دعوت دینے والے کی کمائی حرام نہ ہو، بلکہ جائز اور حلال ہو، اس لیے شرعاً دعوت کھانے کی گنجائش ہوگی، کیوں کہ لوگ عموماً کھانے کے مقابلہ میں کھلانے میں احتیاط کرتے ہیں۔ ہاں اگر یقینی ذریعہ سے معلوم ہو جائے کہ دعوت کرنے والے شخص کی کل یا اکثر آمدنی حرام پر مشتمل ہے اور وہ اسی حرام پیسے سے دعوت کر رہا ہے تو پھر کھانا درست نہیں: ''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل كذا في الينابيع. ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور؛لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به؛لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب، وكذا أكل طعامهم كذا في الاختيار شرح المختار** (ردالمحتار ۴/۸۱۷، ط دار الکتب العلمیۃ بیروت، الفتاوی الھندیۃ، کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات ۵/۲۴۳، ط: مکتبۃ زکریا دیوبند)۔

سوال (۵) کا جواب:

اگر کسی شخص کا مکمل کاروبار حرام ہو اور لاعلمی یا غلطی سے اس کے یہاں کھانا وغیرہ کھا لیا جائے تو علم ہونے کے بعد

تقوی اور احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ قے کے ذریعہ اسکو واپس باہر نکالا جائے، تاکہ حرام لقمہ جزء بدن نہ بن سکے، شاید اسی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مشتبہ لقمہ حلق سے اتر جانے پر حلق میں انگلی ڈال کر قے کی تھی کہ کہیں معدے میں پہنچنے والی خوراک جزوِ بدن نہ بن جائے (بخاری: ۵/ ۴۳، رقم: ۳۸۴۲، باب أیام الجاہلیۃ)

اس حدیث کے تحت ملا علی قاری لکھتے ہیں: ''**وقال ابن الملک: أخذ منه الشّافعی – رحمه الله– أن من أكل الحرام وهو عالم به أو جاهل، ثمّ علم لزمه أن يتقيأ جميع ما أكله فورا .وقد جعله الغزالی فی المنهاج من باب الورع الخ**'' (مرقاۃ المفاتیح: ۵/ ۱۹۰۶، کتاب البیوع/ باب الکسب وطلب الحلال، ط: دار الفکر بیروت)۔

فیض الباری میں ہے: ''**فيه: أن الإنسان إذا أكل شيئًا خبيثًا، فليفعل به هكذا**'' (فیض الباری: ۴/ ۵۱۴، قبیل باب القسامۃ فی الجاہلیۃ، ط: الکتب العلمیۃ بیروت-لبنان)

اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کفارہ کی صورت یہ ہے کہ اگر وسعت ہو تو اتنی رقم صدقہ کرے اور سچے دل سے توبہ کرے اور آئندہ ایسے شخص کے یہاں کھانے پینے میں احتیاط کرے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔

سوال نمبر (۶) کا جواب:

مال حرام کو حلال کرنے کی ایک تدبیر یہ بتائی جاتی ہے کہ کسی کافر سے قرض لے کر اپنی ضروریات پوری کرلی جائے اور بعد میں اس خبیث اور حرام مال سے اس کا قرض ادا کردیا جائے، تو اس طریقہ سے مال حرام حلال ہوجائے گا، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ حرام مال کو حلال کرنے کے لیے کوئی تدبیر اور حیلہ نہیں ہے سوا اس کے کہ مال حرام کے مالک کو یا مالک نامعلوم ہونے کی صورت اسے صدقہ کردیا جائے اور کافر سے قرض لے کر مال حرام سے قرض کی ادائیگی کا جو حیلہ بتایا جاتا ہے اس سے صرف اتنا فائدہ ہوسکتا ہے کہ کافر سے قرض لے کر اس رقم سے جو فائدہ اٹھایا جائے وہ جائز اور حلال ہوگا، لیکن اس حیلہ سے حرام مال ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا جو گناہ ہے وہ زائل نہیں ہوگا اور نہ ہی اس مال حرام کا وبال ذمہ سے ساقط ہوگا، الغرض حرام مال کے لیے یہ حیلہ نافع نہیں ہے؛ بلکہ مضر و موجب گناہ ہے؛ کیوں کہ شریعت کا حکم یہ تھا کہ یہ مال ارباب اموال کو واپس کردیا جائے یا فقراء میں تقسیم کردیا جائے؛ لیکن اس نے کچھ نہیں کیا، بلکہ اس کے ذریعہ اپنا قرض ادا کردیا، اس لیے اس طرح کے حیلہ اور تدبیر سے بچنے کی کوشش کرے۔

سوال نمبر (۷) کا جواب:

ذریعہ معیشت کو اختیار کرنا بھی ایک حاجت اور ضرورت ہے اور اس کے لیے علماء نے بدرجہ مجبوری اپنے کاروبار کو

سنبھالنے اور معاشی صورت حال کو درست کرنے کے لیے سودی قرض لینے کی بھی گنجائش دی ہے، چنانچہ فقیہ العصر حضرت اقدس مفتی نظام الدین صاحب نور اللہ مرقدہ لکھتے ہیں: ''سودی قرض لینے کی شریعت مطہرہ نے صرف اس وقت اجازت دی ہے جب کہ بغیر قرض لئے کام نہ چلے اور غیر سودی قرض نہ ملے، اور بغیر اس قرض کو لئے ہوئے نا قابل تحمل و برداشت تکلیف کا سامنا ہو، معیشت باقی نہ رہے، یا کاروبار معطل ہو جائے، تو بوجہ مجبوری اور بقدر مجبوری سودی قرض لے لینے کی گنجائش ہو جائیگی۔ ''**الضرورات تبیح المحضورات**'' (الأشباہ والنظائر مع شرح الحموی ص ۴۱۰، نظام الفتاوی ۷/ ۴۹، زکریا)۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''جب اور کوئی جائز ذریعہ معاش نہ رہے اور نا قابل تحمل تنگی و پریشانی کا سامنا ہو تو بینک سے قرض لیکر کام چلا لینے کی گنجائش رہتی ہے'' (نظام الفتاوی ۷/ ۲۲۲، زکریا)۔

اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس شخص نے جانے انجانے میں حرام کاروبار کیا، اب اللہ تعالی نے اسے توبہ کی توفیق عطا فرمادی اور وہ حکم شرعی کے مطابق حرام ذرائع سے حاصل شدہ مال صدقہ کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اگر وہ سارا مال صدقہ کردے تو اس کا سارا کاروبار معطل ہو جائے گا اور چوں کہ اسی کاروبار پر خود اس کی اور اس کے گھر کے افراد کی ضروریات کی تکمیل موقوف ہے اس لیے سب مال صدقہ کرنے کی صورت میں اسے نا قابل تحمل تنگی اور پریشانی کا سامنا پڑے گا، بالخصوص جب کہ کہیں دوسری جگہ سے جائز اور حلال رقم بطور قرض ملنے کی امید بھی نہ ہو تو ایسے شخص کے لیے جائز ہوگا کہ اپنے پاس موجود مال حرام میں سے بقدر ضرورت رقم بطور قرض اپنے پاس رکھ کر تجارت کر کے اپنی اور اپنے گھر کے افراد کی ضروریات پوری کرتا رہے اور بعد میں اتنی رقم غرباء میں تقسیم کردے، جیسا کہ بعض فقہاء شافعیہ نے ایسے شخص کو جس کے پاس کل کا کل مال حرام پر مشتمل ہو اس بات کی اجازت دی ہے کہ اس مال حرام میں سے اتنا مال لے لے جس سے کھیتی باڑی کے لیے کوئی زمین یا تجارت وغیرہ کے لیے کوئی سامان وغیرہ خریدی جا سکے اور وہ زمین یا تجارت اتنی ہو کہ اہل وعیال کے اخراجات کے لیے کافی ہو، چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''**إذا حصل في يده مال لا مالك له وجوزنا له أن يأخذ قدر حاجته لفقره ففي قدر حاجته نظر ذكرناه في كتاب أسرار الزكاة فقد قال قوم يأخذ كفاية سنة لنفسه وعياله وإن قدر على شراء ضيعة أو تجارة يكتسب بها للعائلة فعل وهذا ما اختاره المحاسبي ولكنه قال الأولى أن يتصدق بالكل إن وجد من نفسه قوة التوكل وينتظر لطف الله تعالى في الحلال فإن لم يقدر فله أن يشترى ضيعة أو يتخذ رأس مال يتعيش بالمعروف منه وكل يوم وجد فيه حلالًا أمسك ذلك اليوم عنه فإذا فنى عاد إليه فإذا وجد حلالًا معينا تصدق بمثل ما أنفقه من قبل ويكون ذلك قرضًا عنده**'' (احیاء علوم الدین: ۱۳۲، ط: دار المعرفۃ- بیروت)

سوال نمبر(۸) کا جواب:

واضح رہے کہ جس طرح ناجائز اور حرام کا ارتکاب حرام ہے اور باعث گناہ ہے، اسی طرح حرام میں تعاون بھی بنص قرآنی ممنوع اور موجب گناہ ہے، لہٰذا ہر ایسی جگہ جہاں آدمی کو براہ راست حرام کام میں ملوث ہونا پڑے یا براہ راست حرام کام میں تعاون اور مدد کرنے کی نوبت آئے، مثلاً ملازم کو شراب کی خرید وفرخت، سودی لین دین یا سودی حساب وکتاب لکھنے یا کوئی اور ناجائز کام کرنا پڑے جس سے براہ راست گناہ کے کاموں میں تعاون ہو تو ایسی جگہ اس قسم کی ملازمت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، پس اگر کسی کمپنی وغیرہ کا کاروبار آدھا حرام اور آدھا حلال پر مشتمل ہو اور وہاں ملازمت کرنے والے کو دونوں طرح کے کام کرنا پڑے تو بہتر شکل تو یہی ہے کہ مذکورہ جگہ کام کرنے سے بچے یا پھر کمپنی کے مالکان اور انتظامیہ سے بات کرلے کہ ایسے کام سپرد نہ کیے جائیں جو ناجائز اور حرام ہو، تاہم اگر ایسی جگہ کام مجبوری میں کام کرنا ہی پڑے تو اس صورت میں حکم یہ ہے کہ جائز کام کی اجرت جائز اور ناجائز کام کی اجرت بھی ناجائز ہوتی ہے، اس لیے ایسے شخص کو چاہیے کہ مہینہ کے آخر میں اندازہ لگالیا کرے کہ مہینہ میں اس نے کتنے کام جائز اور کتنے کام ناجائز اور حرام کیے ہیں اور پھر اندازہ کرکے حرام کام کے بقدر اجرت اپنے استعمال میں نہ لائے، بلکہ بلا نیت ثواب صدقہ کردیا کرے اور اس پر استغفار بھی کرتا رہے، نیز اپنے لیے حلال متبادل ملازمت کی تلاش میں لگا رہے۔

سوال نمبر(۹) کا جواب:

ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل شدہ رقوم کا حکم شرعی اولاً ردالی رب المال ہے، یا تصدق علی الفقراء ہے، اسے اپنے ذاتی استعمال میں لانا یا اس سے زمین وجائیداد وغیرہ خریدنا ہرگز جائز نہیں ہے اور اگر حرام رقوم کے عوض زمین وغیرہ خرید لی جائے تو امام کرخی کے قول کے مطابق حرام رقوم سے زمین خریدنے کی وجہ سے خریدار مرتکب گناہ کبیرہ ہوگا، لیکن جو زمین وغیرہ اس نے خریدا ہے اس پر اس کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے اور اس سے استفادہ اس کے لیے جائز اور حلال ہوتا ہے، لہٰذا اگر ایسی زمین میں کھیتی وغیرہ کرکے منافع حاصل کی جائے تو وہ منافع مکمل حرام نہیں ہوں گے، بلکہ جتنی حرام رقم زمین کی خرید میں لگی تھی اس قدر رقم مالک یا اس کے ورثہ کے حوالے کرنے یا بصورتِ دیگر ثواب کی نیت کے بغیر اتنی رقم صدقہ کرنے کے بعد جو منافع بچیں گے وہ اس کے لیے جائز اور حلال ہوں گے: ”**رجل اكتسب مالا من حرام، ثم اشترى فهذا على خمسة اوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا، ثم اشترى منه بها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أواشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقاً ودفع تلك الدراهم، أو اشترى**

بدراهم أخر ودفع تلک الدراهم –إلی قوله– وقال الکرخیؒ: فی الوجه الأول والثانی لا یطیب، وفی الثلاث الأخیرة یطیب، وقال أبوبکرؒ: لا یطیب فی الکل، لکن الفتویٰ الآن علی قول الکرخیؒ دفعا للحرج عن الناس" (شامی، کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اکتسب حراما ثم اشتری علی خمسة أوجه، زکریا ۷/ ۰۹۴، کراچی ۵/ ۵۳۲، وہکذا فی الہندیة، زکریا قدیم ۳/ ۵۱۲، جدید ۳/ ۱۰۲)۔

البتہ یہاں بھی احقر کی رائے یہی ہے کہ طرفین کے قول کے مطابق اصل حرام رقم مالک کے حوالہ کرنے اور مالک معلوم نہ ہونے کی شکل میں تصدق علی الفقراء کے ساتھ ساتھ تمام منافع کا بھی صدقہ کردے اور احتیاط بھی اسی میں ہے۔

جہاں تک حرام اشیاء سے خرید کردہ زمین وجائداد میں محنت ومزدوری کرنے، یا حرام کمائی کرنے والے کے گھر نوکری کرنے، یا ایسے اشخاص افراد کے بچوں کو تعلیم دے کر فیس لینے کا تعلق ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب تک ایسا شخص یہ صراحت نہ کردے کہ یہ پیسے جو میں تم کو دے رہا ہوں، وہ خالص حرام کی کمائی سے دے رہا ہوں اس وقت تک ایسی جگہوں میں امام کرخی کے قول کے مطابق جائز کام کرکے اجرت اور فیس لینے کی بھی گنجائش ہوگی، ہاں اگر اسے پہلے ہی معلوم ہے کہ اس کی ساری کمائی ہی خالص حرام پر مشتمل ہے یا خالص حرام کمائی ہی سے اجرت اور فیس وغیرہ دے رہا ہے تو پھر کام کرنا اور اجرت وغیرہ لینا جائز نہیں ہوگا، لیکن اگر اسے پہلے سے حرام کمائی کا علم نہیں تھا، بعد میں کسی کے ذریعہ سے علم ہوا کہ اجرت وغیرہ خالص حرام کمائی سے دی گئی ہے تو اب یہ رقم اس کے لیے حرام نہیں ہوگی، کیوں کہ اگر اس صورت میں بھی اجرت کو حرام قرار دے دیا جائے تو بہت سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوجائیں گے، مثلاً: ایک غریب رکشہ چلانے والا ایک مالدار کے بچوں کو روزانہ اسکول لے کر جاتا ہے، اب اسے مہینہ کے اخیر میں تنخواہ ملی، اس وقت اسے یہ علم نہیں تھا کہ یہ تنخواہ خالص حرام رقم سے دی گئی ہے، بعد میں اسے اس کے مالک نے بتایا کہ جو تنخواہ میں نے تمہیں دی ہے وہ خالص حرام کمائی سے دی ہے تو اب اگر اس غریب رکشہ والے کو یہ حکم دے دیا جائے کہ ساری رقم صدقہ کردو تو اس کی ساری محنت بھی بیکار ہوئی اور اس کا حق بھی ضائع ہوجائے گا، اس لئے اس عدم علم کی صورت میں احقر کی رائے یہ ہے کہ تنخواہ اور فیس وغیرہ لینے والے کے لیے حرام نہیں ہے، بلکہ حلال ہے، اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر احتراز کرے تو اِس کے افضل وبہتر ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

سوال نمبر (۱۰) کا جواب:

خبیث اور مال حرام کو اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرنا ہرگز جائز نہیں ہے، بلکہ اس مال کو کسی بھی طرح اصل مالک یا اس وارث کو واپس کرنا لازم ہے اور اگر مالک کا علم نہیں ہے تو مال حرام سے چھٹکارا پانے کے لئے دوسرا حکم تصدق علی الفقراء ہے، جہاں تک سودی رقم رشوت وغیرہ میں دینے کا تعلق ہے تو اکثر علماء رشوت میں سودی رقم دینے کو جائز نہیں سمجھتے،

لیکن اگر غور کیا جائے اور حکومت اور حکومتی محکموں میں کام کرنے والوں کے طرز عمل کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومتی کارندے، بہت سے ایسے کام جن کو پورا کرنا ان کا فرض منصبی ہے ایسے کاموں کو انجام دینے کے لیے بھی بہت موٹی رقم رشوت کے طور پر مانگتے ہیں اور بغیر رشوت لیے کام نہیں کرتے اور یہ باتیں نیچے سے لے کر اوپر تک کے اعلی حکام کو معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان پر کسی بھی قسم کی کوئی کاروائی نہیں کی جاتی؛ بلکہ اگر آپ معاملہ کی تہ میں جائیں تو پتہ چلے گا کہ یہ رقم یہ سب حکام آپس میں مل بانٹ لیتے ہیں، نیز بعض محکمہ میں کام کرنے والوں کی تنخواہ بہت زیادہ ہوتی ہے جب کہ اسی درجہ کے دوسرے محکمہ والوں کی تنخواہ نسبتا کم ہوتی ہے اور تنخواہ کی یہ کمی حکومت کی جانب سے قصدا کی جاتی ہے، کیوں کہ حکومت کو معلوم ہے کہ اس محکمہ کے کارندے رشوت وغیرہ کے ذریعہ اتنی رقم وصول کرلیں گے، اسی لیے تنخواہ کم رکھی جاتی ہے؛ گویا کہ ان لوگوں کو حکومت کی پشت پناہی حاصل ہے اور حکومت ہی کے اشارے اور حکم سے یہ سب کام انجام دیے جارہے ہیں، الغرض حکومت رشوت لینے کا سبب قوی ہے اور بسا اوقات حکم سبب قوی کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے، مثلا کتب فقہ میں یہ مسئلہ ملتا ہے کہ اگر کسی انسان کو دوسرے کسی شخص کا مال ضائع کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس نے مال ضائع کردیا تو ضمان جبر کرنے والے سے لیا جائے گا، نہ کہ اس شخص سے جس نے مال ضائع کیا ہے: ''الْمُكْرَهُ عَلَى إتْلَافِ مَالِ الْغَيْرِ إذَا أَتْلَفَهُ يَجِبُ الضَّمَانُ عَلَى الْمُكْرِهِ دُونَ الْمُكْرَهِ إذَا كَانَ الْإِكْرَاهُ تَامًّا؛ لِأَنَّ الْمُتْلِفَ هُوَ الْمُكْرَهُ مِنْ حَيْثُ الْمَعْنَى، وَإِنَّمَا الْمُكْرَهُ بِمَنْزِلَةِ الْآلَةِ عَلَى مَعْنَى أَنَّهُ مَسْلُوبُ الِاخْتِيَارِ إيثَارًا وَارْتِضَاءً، وَهَذَا النَّوْعُ مِنْ الْفِعْلِ مِمَّا يُمْكِنُ تَحْصِيلُهُ بِآلَةِ غَيْرِهِ بِأَنْ يَأْخُذَ الْمُكْرَهَ فَيَضْرِبَهُ عَلَى الْمَالِ فَأَمْكَنَ جَعْلُهُ آلَةَ الْمُكْرِهِ، فَكَانَ التَّلَفُ حَاصِلًا بِإِكْرَاهِهِ فَكَانَ الضَّمَانُ عَلَيْهِ (۷/۱۷۹، کتاب الاکراہ، ط: دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

اسی طرح جس شخص کو کسی انسان کے قتل پر مجبور کیا گیا تو قصاص جبر کرنے والے سے لیا جائے گا مکرہ سے نہیں لیا جائے گا، اسے بس تعزیر کی جائے گی: ''فَأَمَّا الْمُكْرَهُ عَلَى الْقَتْلِ فَإِنْ كَانَ الْإِكْرَاهُ تَامًّا فَلَا قِصَاصَ عَلَيْهِ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٍ، وَلَكِنْ يُعَزَّرُ وَيَجِبُ عَلَى الْمُكْرِهِ'' (حوالہ سابق)۔

غور کیجیے یہاں اگرچہ مباشر قاتل اور متلف ہے اور اتلاف مال اور قتل پر جبر کرنے والا مسبب ہے، لیکن چونکہ مسبب کے فعل کا اثر مباشر کے فعل کے اثر سے زیادہ قوی ہے، اس لیے حکم اسی مسبب (جبر کرنے والے) کی طرف منسوب ہوا ہے۔

اسی طرح رشوت والے مسئلہ میں بھی حکم حکومت ہی کی طرف منسوب ہوگا اور ایسا سمجھا جائے گا کہ رشوت کی یہ رقم خود حکومت نے لی ہے اور جب ایسا ہے تو پھر سوال نامہ میں ذکر کردہ امور میں سودی رقم دینا شرعا جائز اور درست ہوگا۔

سوال نمبر(۱۱) کا جواب:

ہر مسلمان سے شریعت کا یہ نہایت ہی اہم تقاضا ہے کہ وہ حرام کمائی اور حرام مال سے بالکلیہ اجتناب کرے، وہ خود بھی حرام مال استعمال نہ کرے اور کسی دوسرے شخص کے حرام مال سے دعوت اور ہدیہ بھی قبول نہ کرے، اسی میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے، البتہ موجودہ صورتحال میں ایک بڑا طبقہ ایسا ہے کہ ان کے نزدیک حرام وحلال کی تمیز کوئی اہمیت نہیں رکھتی، وہ مال کماتے ہوئے اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ حلال ہے یا حرام، حتی کہ دوسروں کو ہدیہ دیتے یا دعوت کھلاتے وقت بھی اس کی رعایت نہیں کرتے کہ خود تو حرام میں مبتلا ہیں ہی، لیکن کم از کم دوسروں کو تو حرام نہ کھلائیں، خصوصًا خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے سرشار ہوکر حرام سے بچنے والے مسلمانوں کو تو حرام ہرگز نہ کھلایا جائے، لیکن یہ لوگ عمومًا کسی کے مقام ومرتبہ کی رعایت نہیں کرتے، گویا کہ حرام مال کمانے، اسے اپنے استعمال میں لانے اور دوسروں کو کھلانے میں ایک اِبتلائے عام ہوتا جارہا ہے، اسی تناظر میں یہ مسئلہ بھی بکثرت سامنے آتا ہے کہ ایک آدمی جو حرام سے بچنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے، لیکن اس کے رشتہ دار، احباب یا دیگر متعلقین میں ایسے بھی متعدد لوگ ہوتے ہیں جو حرام کمائی سے دریغ نہیں کرتے؛ حتی کہ دوسروں کی رعایت کیے بغیر حرام کھلا بھی دیتے ہیں، ایسی صورتحال میں ایک مسلمان کو کیا کرنا چاہیے، اس سلسلے میں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو ہدیہ تحفہ یا کھانے پینے کی اشیاء دے تو ایسے موقع پر اس کی کمائی کے متعلق بلاوجہ اور بے جا تحقیق اور کھود کرید کرنے کا ہمیں مکلَّف نہیں بنایا اور یہ شریعت کا مزاج بھی نہیں ہے، کیوں کہ اگر بندہ اس طرح کی بے جا تحقیق میں پڑ جائے تو بسا اوقات اس تحقیق وتفتیش سے نفرتیں، تنازعات اور رنجشیں جنم لیتی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے بہت ہی بُرا تأثر سامنے آتا ہے، اس لیے جس چیز کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہوجائے اس سے بچنے کی فکر کرنی چاہیے، اس کے علاوہ بے جا تحقیق میں نہیں پڑنا چاہیے، چنانچہ ایک حدیث شریف میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جب تم میں سے کوئی کسی مسلمان بھائی کے پاس جائے اور وہ اس کو کھانا کھلائے تو اس کو چاہیے کہ کھالیا کرے اور اس کے بارے میں اس سے تحقیق نہ کرے، اور اگر کچھ پلائے تو پی لیا کرے اور اس کے بارے میں تحقیق نہ کرے: ''**عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ عَلَى أَخِيهِ الْمُسْلِمِ فَأَطْعَمَهُ طَعَامًا فَلْيَأْكُلْ مِنْ طَعَامِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ، فَإِنْ سَقَاهُ شَرَابًا مِنْ شَرَابِهِ فَلْيَشْرَبْ مِنْ شَرَابِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ**'' (مسند أحمد: ۱۵/۹۹ مؤسسۃ الرسالۃ بیروت)۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ مناوی لکھتے ہیں: ''**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم) لزيارة أو غيرها (فأطعمه) من (طعامه فليأكل) منه ندبا، هكذا هو ثابت في الحديث وإن كان صائما نفلا؛**

جبر لخاطره (ولا يسأل عنه) أى عن الطعام من أى وجه اكتسبه ليقف على حقيقة حله؛ فإن ذلك غير مكلف به ما لم تقو الشبهة فى طعامه، والمراد: لا يسأل عنه ولا من غيره، (وإن سقاه من شرابه فليشرب) منه أيضا (ولا يسأل عنه) كذلك؛ لأن السؤال عن ذلك يورث الضغائن ويوجب التباغض، والظاهر أن المسلم لا يطعمه ولا يسقيه إلا حلالا، فينبغى إحسان الظن وسلوك طريق النوادر فيتجنب عن إيذائه بسؤاله" (فیض القدیر للمناوی:۱/۷۳۳، المکتبۃ التجاریۃ الکبری)۔

الغرض جب تک کسی آدمی کے بارے میں ظن غالب اور یقین کے درجہ میں معلوم نہ ہوجائے کہ اس کی پوری یا آمدنی کا اکثر حصہ حرام مال پر مشتمل ہے اس وقت تک بلاوجہ شک وشبہ کی بنیاد پر تحقیق وتفتیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ بلاتحقیق بھی ہدیہ وغیرہ قبول کیا جاسکتا ہے، ہاں یقین یا ظن غالب ہوجائے تو پھر اس کی دی ہوئی چیز لینا جائز نہیں ہوگا۔

اس تفصیل کے پیش نظر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اصلاً تو ایسے شخص سے ہدیہ وغیرہ لینے سے احتراز کرے؛ تاکہ حرام میں مبتلا ہونے کا امکان ہی نہ رہے، لیکن جب تک ہدیہ تحفہ دینے کے مال کے بارے واقعی یہ یقین اور ظن غالب نہ ہوجائے کہ اس کا مکمل کاروبار یا اکثر کاروبار حرام کا ہے اور اسی حرام رقم سے یہ ہدیہ اور بچے کو ٹافی وغیرہ کھانے پینے کی اشیاء دے رہا ہے یا یہ کہ وہ خود بتادے کہ ہدیہ وغیرہ حرام رقم سے دے رہا ہوں، اس وقت تک ہدیہ تحفہ وغیرہ قبول کرنے کی اجازت ہے، کیوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ اس کا مال پاک اور حلال ہو اور حرام کاروبار سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو، بصورت دیگر ہدیہ وغیرہ قبول کرنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ اگر قبول کرنا مجبوری بن جائے تو لے کر غریب کو دے دے۔

سوال نمبر (۱۲) کا جواب:

دعاء ایک اہم عبادت ہے جس کی اجابت کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہ ہے کہ دعاء کرنے والا رزق حلال کا اہتمام کرتا ہو، اگر کھانے پینے وغیرہ کی اشیاء میں حرام کی ملاوٹ ہو تو یہ اللہ کے نزدیک دعاء رد ہونے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے، چنانچہ ایک طویل حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ فرمایا جو اللہ کے دربار میں ہاتھ اٹھا کر دعاء کرتا ہے اور بظاہر اس میں دعاء کی قبولیت کے ظاہری اسباب بھی موجود ہیں، لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا پینا حرام ہے، کپڑے اس کے حرام اور اس کا جسم بھی حرام غذا سے پروان چڑھا ہے، اللہ کے نبی نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا: ''**فأنى يستجاب لذلك**'' کہ ایسے شخص کی دعاء کیسے قبول ہوسکتی ہے، اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے محدثین لکھتے ہیں کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حرام غذا دعاء قبول نہ ہونے کے من جملہ اسباب میں سے ایک سبب ہے، لہٰذا اس کے رہتے ہوئے آدمی کو دعاء قبول ہونے کی توقع اور امید نہیں رکھنی چاہیے، کیوں کہ ایسا شخص اس لائق ہی نہیں کہ اس کی دعاء قبول کی جائے؛ گویا یہ بات آپ

نے تغلیظ اور تشدید کے طور پر کہی ہے، تاکہ آدمی حرام سے اجتناب کرے، حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حرام کھانے والے کی دعاء کا قبول ہونا ایک امر محال ہے کہ کبھی اس کی دعاء قبول ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ اس کے حق میں بھی دعاء کا قبول ہونا ایک امر ممکن ہے، اگر چہ بعید تر ہے، لہٰذا اگر کوئی حرام کھانے والا صدق دل سے دعاء کرے تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالی اپنی شان کریمی سے اس کی دعاء کو شرف قبولیت سے نوازے اور جب کسی نہ کسی درجہ میں اس کی دعاء قبول ہونے کی امید کی جاسکتی ہے تو اگر کوئی دوسرا شخص حرام کمائی کرنے والے کو حرام کاری سے بچنے کی فہمائش کرتے ہوئے اس کے حق میں دعاء کرے تو شرعا اس کی اجازت ہوگی۔

"**(فأنى يستجاب لذلک) الرجل أی من أين يستجاب لمن هذه صفته أو كيف يستجاب له قال ابن الملک: هذا استبعاد لاستجابة الدعاء لا بيان لاستحالته قال القرطبی: أی كيف يستجاب له علی جهة الاستبعاد ومعناه أنه ليس أهلًا لإجابة دعائه لكن يجوز أن يستجيب الله له تفضلًا ولطفًا وكرمًا**" (الکوکب الوہاج شرح صحیح مسلم: ۱۲/ ۵۸، ط: دار المنہاج - دار طوق النجاۃ)۔

☆☆☆

حرام مال سے متعلق بعض اہم مسائل

قاضی وصی احمد قاسمی☆

جواب: ۱

اگر قرائن قاطعہ سے یہ معلوم ہو کہ گھر جائیداد مال حرام سے حاصل کیا گیا ہے، یا مغصوبہ ومسروقہ مال ہے، اور ورثاء کو علم بھی ہو تو ان کے لیے اس گھر جائیداد کا لینا اور اس کا استعمال میں لانا جائز نہیں ہوگا: ''**أما المیراث فلایطیب المال الحرام، هذا هو الصحیح**'' (المقدمات الممهدات: ۲/ ۶۱۷)، ''**مات وکسبه حرام فالمیراث حلال، ثم رمز الناقل وقال: لا نأخذ بهذه الروایة وهو حرام مطلقاً علی الوارث فتنبه**'' (ردالمحتار: ۵/ ۱۰۴)۔

بعض فقہاء آزادی سے قبل ہندوستان میں سود کے جواز کے قائل تھے، ان کے نزدیک غیر مسلموں سے حاصل ہونے والی سودی رقم کا استعمال کرنا جائز تھا، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس کا یقین ہو کہ وہ مال وجائیداد آزادی سے قبل خریدی گئی ہو، یہاں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، اور اصول فقہ کی روشنی میں حلت وحرمت دونوں کی تائید ہو رہی ہے، ''**الأصل فی الأشیاء الإباحة**'' اس قاعدہ کے تحت اموال وجائیداد میں اصل حلت ہے، لیکن اس میں ایک عارضی وصف پیدا ہو گیا ہے، وہ ہے حرمت: ''**إضافة الحادث إلی أقرب أوقاته**'' کے پیش نظر وہ رقم اور جائیداد آزادی کے بعد کی ہونا معلوم ہوتی ہے، اس قاعدہ کی رو سے اس مال کا حرام ہونا معلوم ہوتا ہے، اسی طرح فقہائے کرام کا ایک نہایت مشہور قاعدہ ہے: ''**اذااجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**''، اب اس مسئلہ میں چوں کہ حلت وحرمت دونوں جمع ہو گئے ہیں اس لیے حرمت والے پہلو کو ترجیح دی جائے گی، احتیاط کا تقاضہ بھی یہی ہے، اس کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ ہوسکتا ہے وہ کل گھر وجائیداد مال حرام سے نہ خریدا گیا ہو، اس میں کچھ حلال مال بھی شامل ہو، جب مال حلال مال حرام سے مختلط ہو جائے تو وہ مضمون ہو جاتا ہے اور اس کا دین یعنی عوض ادا کر دینے سے وہ مال جائز ہو جاتا ہے۔

''**اختلط المغصوب بملک الغاصب بحیث یمنع امتیازه کاختلاط بره ببره أو یمکن بحرج**

☆ نائب قاضی دارالقضاء امارت شرعیہ بہار، اڈیشہ، جھارکھنڈ، پھلواری شریف، پٹنہ

كبره بشعيره ضمنه بلا حل انتفاع قبل أدائه" (الدرالمختار مع ردالمحتار:۶/۱۹۱)۔

اس کے علاوہ وراثت میں جو مال وجائیداد حاصل ہوئی ہے، ضروری نہیں کہ وہ مال حرام کی طرف اشارہ کر کے خریدی گئی ہو؛ بلکہ عین ممکن ہے مطلقاً بیع ہوئی ہو اور مال حرام سے رقم ادا کی ہو، تو پھر اس صورت میں مفتی بہ قول کے مطابق وہ جائداد حرام نہیں ہوگی، اس سلسلے میں امام کرخی کے قول پر فتوی کی صراحت کرتے ہوئے علامہ شامی نے لکھا ہے: "**لكن الفتوى اليوم على قول الكرخي دفعا للحرج لكثرة الحرام وعلى هذا مشى المصنف**" (ردالمحتار:۷/۴۹۰)

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس گھر وجائیدا میں اصل قول کے مطابق حرمت کا پہلو غالب اور عزیمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ اسی پر عمل کیا جائے، البتہ اگر کوئی شخص بہت زیادہ پریشان ہو اور کسی دوسرے متبادل کا انتظام نہ ہو سکے تو اس کے لیے امام کرخیؒ کے قول پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی۔

جواب:۲

جس مال وجائیداد کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ حرام طریقے سے حاصل ہوئی ہے تو اس کا استعمال جائز نہ ہوگا، کیوں کہ حرمت کا علم ہونے سے حرمت متعدی ہو جاتی ہے: "**الحرمة تتعدى مع العلم بها**" (الأشباہ والنظائر لابن نجیم:۲۳۵)۔

"**المال الحرام كالماخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذلك ليس مملوكا لمن هو بيده**" (الموسوعۃ الفقہیہ:۲۳/۲۴۸)۔

اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ اگر مال حرام کئی لوگوں تک پہنچ جائے تو بھی اس کی حرمت باقی رہتی ہے اور اصل مالک کو لوٹانا واجب ہوتا ہے: "**قوله (الحرام ينتقل) أى تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاك، قوله (ولا للمشترى منه) فيكون شرائه منه شيئا لأنه ملكه بكسبه الحرام وفى شرائه تقرير للخبث**" (ردالمحتار:۴/۱۴۵، مطلب البیع الفاسد)

دو صورتیں ایسی ہیں جن میں اس غریب شخص کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے:

پہلی: اگر وہ جائیداد مطلقاً حرام رقم سے خریدی گئی ہے، یعنی ثمن کے طور پر اس رقم کو دینے کا اشارہ نہیں کیا تھا، تو پھر ایسی صورت میں اس شئی پر اس کی ملکیت ثابت ہوگئی اور اس کا کرایہ وغیرہ لینا اس کے لیے درست ہوگا؛ البتہ حرام رقم دینے کا گناہ ہوگا اور اتنی رقم اس کے اوپر اگر مالک موجود ہو یا اس کے ورثہ ہوں تو لوٹانا لازم ہوگا، ورنہ مذکورہ رقم واجب التصدق ہوگی، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے: "**أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم أخرى ودفع تلك الدراهم، قال ابو نصر يطيب ولايجب على أن يتصدق وهو قول الكرخي والمختار قول أبى**

بكر إلا أن الفتوى اليوم على قول الكرخي كذا في الفتاوى الكبرى" (الفتاوی الھندیہ:۳/۲۱۵،فصل فی الاحتکار)۔

دوسری: دوسری صورت یہ ہے شریعت میں مال حرام کو صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے؛ لیکن جس کے پاس ہے اگر وہ خود محتاج ہو اور صدقہ کا مستحق ہو تو اپنی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے، لیکن جب غربت ختم ہوجائے تو اتنی رقم کو صدقہ کردے: "**والملك الخبيث سبيله التصدق به، ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله، وإن كان فقيرا لا يتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار:۳/۷۰،دارالکتب العلمیہ)۔

یہ دونوں صورتیں اس غریب شخص کے جواز استفادہ کی ہوسکتی ہیں، باقی صورتوں میں وہ رقم لوٹانا یا صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

جواب:۳

ایسی عورت کے لیے اولا ضروری یہ ہے کہ وہ ان کو اس حرام کمائی کی شناعت وقباحت کو بتاتے ہوئے اس سے اجتناب کی سخت ہدایت کرے، اگر وہ باز نہ آئے تو اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کے لیے دوسرے گھریلو حلال ذرائع کا استعمال کرے، کڑھائی بنائی وغیرہ، اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس عورت کے لیے مجبوری میں اس مال کا استعمال کرنا جائز ہوگا، لیکن وہ ہمیشہ اس کو دل میں برا سمجھتی رہے اور توبہ واستغفار کرتی رہے، نیز اس حرام کمائی کا سارا گناہ اس کے شوہر یا بیٹے پر ہوگا: "**في جامع الفصولين اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمراة أكله ولبسها والإثم على الزوج**" (ردالمحتار علی درالمختار:۶/۱۹۱)؛ "**امراة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصبا أو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي سعة من ذالك والإثم على الزوج**" (ردالمحتار علی درالمختار:۶/۳۸۶)۔

چنانچہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی کی رائے سے بھی اس مسئلہ کی تائید وتوثیق ہوتی ہے:

"حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش جاری رکھے" (فتاوی عثمانی:۳/۱۲۶،کتاب البیوع)۔

خلاصہ یہ کہ بصورت مجبوری مذکورہ خاتون کے لیے اس کمائی سے منتفع ہونا درست ہے، البتہ عام حالات میں جائز نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر والدین نے بچے کو مال حرام سے پڑھایا ہو اور پڑھنے کے بعد وہ بچہ جائز نوکری کرتا ہے، تو اس کے لیے اور اس کے والدین اور اسکی بیوی کے لیے وہ کمائی بالکل حلال ہوگی، کیوں کہ اس کی نوکری شرعا درست ہے اور آدمی کو

چوں کہ اپنی محنت کا معاوضہ ملتا ہے، نا کہ حاصل شدہ ڈگری کا؛ اس لیے اس کی محنت وعمل کی وجہ سے اس کی نوکری اور اس کی کمائی درست ہوجائے گی: "**ثم الأجرة تستحق بإحدى معاني ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتأجيل من غير شرط أو باستيفاء المعقود عليه**" (الھدایہ: ۳/ ۲۹۳، کتاب الإجارہ، باب الاجر متی یستحق)۔

جواب: ۴

اگر اس کی کمائی کا اکثر حصہ حرام ہے، تو جائز و درست نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ خود اس بات کی وضاحت کردے کہ یہ جائز کمائی سے ہے، اور اس میں حرام رقم شامل نہیں ہے، اگر وضاحت کردے تو دعوت کھانے میں کوئی حرج نہیں: "**آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه**" (الفتاوی الھندیہ: ۵/ ۳۴۲)۔

اور اگر یہ معلوم ہو کہ اس کی کمائی کا اکثر حصہ حلال ہے، کچھ فیصد ہی حرام ہے، تو اس کی دعوت قبول کرنے میں حرج نہیں ہے؛ الا یہ کہ وہ اس بات کی وضاحت کردے کہ کھانا حرام مال سے تیار کیا گیا ہے، تو اس صورت میں درست نہیں ہے، اور اگر خاموش رہے، کچھ نہ بولے، مطلقا دعوت کا معاملہ ہو، تو بھی گنجائش ہے: "**إن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل الهدايا، ويأكل مالم يتبين له أن ذالك من الحرام**" (الفتاوی التاتارخانیہ: ۱۸/ ۱۷۵)۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حرام وحلال دونوں طرح کے مال کی آمیزش ہو تو اس کے یہاں دعوت وغیرہ کھانے کی گنجائش ہے؛ جب تک حرام مال سے کھلانے کی صراحت وہ خود نہ کردے؛ اس لیے مزید گنجائش کی راہ نکل سکتی ہے۔

جواب: ۵

اگر پہلے سے ہی اس کا علم ہو تو کھانا پینا جائز نہیں ہے، لیکن کھانے کے بعد معلوم ہوا ہو تو اولا توبہ واستغفار کرے، کیوں اگر لاعلمی میں کوئی گناہ ہوجائے تو انسان کو توبہ واستغفار کرنا چاہیے، یہی قرآن کریم کا پیغام بھی ہے: "**إنما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئك يتوب الله عليهم وكان الله عليما حكيما**" (سورۂ نساء: ۱۷)۔

اس کے بعد اس کی قیمت کا اندازہ لگا کر اتنا مال صدقہ کردے؛ اس لیے کہ مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کو بعینہ واپس کردیا جائے، یہاں چوں کہ اس نے کھانا کھالیا ہے تو اب اسے لوٹانا ناممکن ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ جب اصل

فوت ہوجائے تو بدل کو اختیار کیا جاتا ہے:"**إذا بطل الأصل يصار إلى البدل**" (مجلۃ الأحکام العدلیہ:رقم المادہ:۵۳)۔

اگر کھانے والا خود فقیر ہے، تو اس کے لیے صدقہ وغیرہ کرنا ضروری نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے اس کھانے کی گنجائش ہوگی، اس صورت میں اتنا کھانا اس کے حق میں صدقہ مان لیا جائے گا، یہ مسئلہ ان جزئیات سے مستفاد ہوتا ہے، جن میں بوقت ضرورت مال حرام کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے:"**الملک الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کا ن غنیا تصدق بمثله، و إن کان فقیرا لایتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار:۳/۷۰،دارالکتب العلمیہ)،نتیجہ یہ نکلا کہ اگر امیر کھاتا ہے تو توبہ واستغفار کرے اور اس کے بقدر صدقہ کرے اور اگر فقیر ایسی دعوت کھائے تو یہ اس کے حق میں صدقہ ہے۔

جواب: ٦

اس سلسلے میں ایک جزیہ یہ ملتا ہے کہ اگر ادھار سامان خرید کر اس حرام مال سے اس کا ثمن ادا کردیا جائے تو وہ سامان اس کے لیے حلال ہوجائے گا، اس طرح بالواسطہ اس کی رقم پاک اور استعمال درست قرار پایا:"**والحیلة فی هذه المسائل أن یشتری نسیئة،ثم ینقد ثمنه من أی مال شاء**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲،کتاب الکراہیہ،الباب الثانی عشر)، لیکن ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اور حیلہ علی الاطلاق درست نہیں ہوسکتا، کیوں کہ حرام مال کو ملکیت میں لانے اور اس کو جان بوجھ کر اپنے فائدہ میں خرچ کرنے کا گناہ کیوں کر ختم ہوسکتا ہے؟ اسی لیے دور حاضر کے مشہور فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس پر نقد وتنکیر کرتے ہوئے اس کا صحیح محمل بھی متعین کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس حیلہ سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا، وہ حلال ہوجائے گا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا'' (فتاوی عثمانی:۳/۱۲۵)۔

دوسرا طریقہ تملیک ہے، لیکن اس کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ جس سے وہ حرام رقم ملی ہے، وہ معلوم نہ ہو، اور اس کے ورثہ بھی معلوم نہ ہوں، اور آخری صورت واجب التصدق کی بچی ہو تو تملیک کے ذریعے یہ رقم حلال ہوجائیگی، اگر اصل مالک یا اس کے ورثہ معلوم ہوں تو پھر انہیں لوٹانا ضروری ہوگا۔

"**من اکتسب مالا بغیر حق، یجب رده علی مالکه**" (بذل المجہود:۲۵۹۱،کتاب الطہارہ)،"**الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم وإلا فلا، فإن علم عین الحرام لا یحل له، ویتصدق بنیة صاحبه**" (ردالمحتار:۷/۲۲۳،کتاب البیوع،زکریا)۔

واضح رہے کہ مال حرام کو صدقہ کرنے کے بعد واپس ملنے پر حلال ہونے کی علت ملکیت کی تبدیلی ہے، کیوں کہ فقہ

کا قاعدہ ہے:"**تبدل سبب الملک قائم مقام تبدل الذات**" (مجلۃ الأحکام العدلیۃ، رقم المادۃ:۹۸)۔

یہ قاعدہ واصول حدیث بریرہ سے ماخوذ ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت بریرہ کو صدقہ کے طور پر ملے ہوئے گوشت کو بطور ہدیہ قبول فرمالیا تھا، حدیث کے الفاظ ہیں:"**عن أنس بن مالک أن النبی ﷺ أتی بلحم تصدق علی بریرۃ، ھو علیھا صدقۃ، وھو لنا ھدیۃ**" (بخاری:۱۴۹۵، کتاب الزکاۃ)، نیز اگر وہ خود محتاج ہو تو اپنی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے، صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

جواب: ۷

حرام کمائی کا حکم اصولی طور پر یہ ہے کہ وہ اس کے مالک کو لوٹایا جائے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اسے صدقہ کیا جائے، لیکن بعض فقہاء نے ضرورت مند کے لیے اس کو اپنے استعمال میں لانے کی بھی اجازت دی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ وقتی طور پر اسے قرض لے لے اور بعد میں واپس کردے، چناں چہ علامہ موصلی نے ایک مقام پر اس کی صراحت کی ہے:
"**الملک الخبیث سبیلہ التصدق بہ ولو صرفہ فی حاجۃ نفسہ جاز، ثم إن کا ن غنیا تصدق بمثلہ، و إن کان فقیرا لایتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار:۳/۷۰، دار الکتب العلمیہ)

احناف کے یہاں صراحتا یہ جزیہ نظر سے نہیں گزرا، البتہ ائمہ حنابلہ میں سے امام احمد بن تیمیہ نے اپنے فتاوی میں صراحتا قرض لینے اور بعد میں واپسی کی بات لکھی، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:"**فإن کان یقدر یتجر أو یعمل صنعۃ کالنسج والغزل، أعطی مایکون لہ رأس، وإن اقترضوا منہ شیئا لیکتسبوا بہ، ولم یردوا عوض القرض کان أحسن**" (مجموع فتاوی ابن تیمیہ:۹۲/۳۰۹)۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ ایسا مجبور شخص اس طرح کے مال سے وقتی طور پر قرض لے سکتا ہے اور جب سہولت ہو تو راس المال کے بقدر مال صدقہ کردے۔

جواب: ۸

گناہ کے کاموں میں تعاون کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز نہیں ہے:"**ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (المائدہ:۲)، اسی لیے لہو لعب کا اجارہ، مغنیہ اور نوحہ کناں خواتین کا اجارہ ناجائز وباطل قرار دیا گیا ہے:"**وعلی ھذا یخرج الاستئجار علی المعاصی أنہ لایصلح، لأنہ استئجار علی منفعۃ غیر مقدرۃ الاستیفاء شرعا، کاستئجار الإنسان للعب و اللھو، و کاستئجار المغنیۃ والنائحۃ للغناء**" (بدائع الصنائع:۴/۱۸۹، کتاب الإجارہ)۔

اگر کسی شخص کو ایسی جگہ کام کرنا پڑتا ہے، جہاں اس کو صرف ناجائز اور حرام کرنا پڑتا ہے تو اس شخص کے لیے ایسی جگہ نوکری کرنا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ لہولعب اور گانے بجانے اور میت پر رونے کی نوکری کو منع کیا گیا ہے، اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے، تکملہ فتح الملہم میں سودی کام دھام کی نوکری کو مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے ناجائز قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:"**وكاتبه، لأن كتابة الربا إعانة عليه، ومن هنا ظهر أن التوظيف فى البنوك الربوية لايجوز، فإن كان عمل الموظف فيما يعين على الربا كالكتابة أو الحساب فذالک حرام لوجهين: الأول إعانة على المعصية والثانى أخذ الأجرة من الحرام**" (تکملہ فتح الملہم:۱/۶۱۹)۔

ناجائز کاموں پر اجرت کا معاملہ کرنا اس واسطے بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ اس میں عقد کا استحقاق ہی نہیں ہوتا ہے، گویا اجارہ علی المعصیہ بحیثیت عقد منعقد ہی نہیں ہوتا ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:"**ولا يجوز الاستئجار على الغناء والنوح وكذ اسائر الملاهى، لأنه استئجار على المعصية والمعصية لا تستحق بالعقد**" (الھدایۃ:۳/۳۰۶)۔

فقہاء کی عبارات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اگر آدمی کا بزنس حرام کاموں کا ہو، اور اس میں عملا تعاون بھی پایا جاتا ہے، تو پھر وہ نوکری اور اس کی اجرت لینا جائز نہیں ہے، البتہ ایسے شخص کے لئے اگر معاش کے حصول کا کوئی دوسرا جائز ذریعہ نہ ہو تو بدرجہ مجبوری اجرت لینے کی گنجائش نکل سکتی ہے، بشرطیکہ وہ جائز ذریعہ کی تلاش وجستجو میں لگا رہے، ہاں اگر صرف جائز کام ہو، ناجائز کام نہ کرنا پڑتا ہو، تو پھر اس میں حرج نہیں ہوگا۔

جواب:۹

حرام سے حاصل شدہ جائیداد اگر بعینہ حرام ہے، تو وہ زمین بالکلیہ حرام ہوگی، اس میں کھیتی باڑی کرنا، پیداوار حاصل کرنا سب ناجائز ہے، اس زمین کو فی الفور اس کے اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اس پر ملکیت کا ثبوت ہوا ہی نہیں:"**المال الحرام كالماخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذالک ليس مملوكا لمن هو بيده**" (الموسوعہ الفقہیہ:۲۳/۲۴۸)۔

اگر نفس جائیداد حرام نہ ہو؛ بلکہ حرام مال سے خریدی گئی ہو، تو اس میں تفصیل ہے، اگر اس جائیداد کو مال حرام کی طرف اشارہ کرکے خریدی ہو، اور وہی حرام رقم ادا کی ہو، تو پھر وہ ناجائز ہوگی اور اس کی آمدنی بھی ناجائز ہوگی اور واجب التصدق ہوگی، لیکن اگر مال حرام کی طرف اشارہ کئے بغیر اس مال سے جائیداد خریدی یا مطلقا جائیداد کی خریداری کا معاملہ کرلیا اور مال حرام ہی سے قیمت ادا کردی، تو بیشتر فقہاء کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہے؛ لیکن امام کرخیؒ کے قول کے مطابق اصل زمین تو حرام ہوگی اور اس کو صدقہ کرنا واجب ہوگا، لیکن اس میں کھیتی باڑی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع جائز ہوگا،

امام کرخیؒ کے قول کی تفصیل نقل کرتے ہوئے علامہ حصکفی رقم طراز ہیں:"**رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه... قال الكرخي في الوجه الأول والثاني لايطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكر: لايطيب في الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس**" (الدرالمختار مع ردالمحتار:۵/۲۳۵،سعید)

چناں چہ صورت مسئولہ میں گنجائش ہے کہ حرام مال سے خرید کردہ جائیداد کی قیمت جائز آمدنی سے صدقہ کردے، اوراس میں کھیتی باڑی کرنا درست ہوگا،اور بہتر یہی ہے کہ کھیتی باڑی بھی رقم صدقہ کرنے کے بعد ہی کرے، چنانچہ امام طحطاوی وغیرہ نے لکھا ہے:"**نعم لايباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب**"(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار:۴/۱۹۲)،"**قد اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۲۴۹،رشیدیہ)

حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنے کی بنیادی طور پر تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

پہلی:اس کے پاس حرام حلال دونوں طرح کا مال آتا ہےاوروہ سب کوخلط ملط کردیتا ہےاوراسی سے تنخواہ دیتا ہے توایسی صورت میں کوئی حرج نہیں ہے:

"**لو أن فقيرا يأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان يأخذهاغصبا ايحل ذلك له، قال: إن خلط ذلك بدراهم أخرى فإنه لابأس به**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲،طبع رشیدیہ)۔

دوسری:اس کے پاس صرف مال حرام آتا ہےاوروہ اسی میں سے تنخواہ دیتا ہےاور لینے والے کومعلوم بھی ہے تو پھر اس کے لیےاس رقم کا لینا جائز نہیں ہوگا:

"**و إن دفع عين المغضوب من غير خلط لم يجز**" (الفتاوی الھندیہ:۶/۳۴۶،رشیدیہ)۔

تیسری: ملازم کو مال کی تفصیلات معلوم نہیں ہے،اور نہ یہ معین ہے کہ حرام مال سے ہی تنخواہ مل رہی ہے یا حلال سے؟اوراس کا کام فی نفسہ حلال ہے تو پھر بنا تفتیش کے اس کے یہاں کام کرنا اور تنخواہ لینا درست ہے:"**وفي الجملة أن طلب الحلال من هذه البلاد صعب، وقد قال بعض مشايخنا:عليك بترك الحرام المحض في هذا الزمان، فإنك لا تجد شيئا لا شبهة فيه، كذا في جواهر الفتاوى**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲)۔

اگر وہ معلوم ومتعین گاڑی ہے،جس پر سوار ہورہا ہے یا معلوم ومتعین رقم سے فیس دے رہا ہے،تو"**الحرمه تتعدى مع العلم بها**" کے تحت اس پر سواری کرنا یا وہ فیس لینا درست نہیں ہے؛لیکن اگر معلوم نہیں اوراس نے مطلقا بٹھالیا یا فیس ادا

کردی تو اس کا لینا درست ہے:"**قال الفقیه أبو لیث رحمه الله تعالی: اختلف الناس فی أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: یجوز مالم یعلم أنه یعطیه من حرام، قال: محمد رحمه الله: وبه نأخذ مالم یعرف شیئا حراما بعینه، وهو قول أبی حنیفة وأصحابه، کذا فی الظهیریة**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲)۔

جواب:۱۰

سود کا اولین مصرف یہ ہے کہ جس سے وہ رقم حاصل ہوئی ہے، اس کو واپس کردی جائے، اگر اس کے اصل مالک تک پہونچانا ممکن نہ ہو، تو پھر بلا نیت ثواب اسے صدقہ کرنا ضروری ہے، اس کو اپنے مصرف ومفاد میں استعمال کرنا درست نہیں ہے، فتاوی شامی میں ہے: "**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم، و إلا فإن علم عین الحرام لا یحل له، ویتصدق به بنیة صاحبه**" (فتاوی شامی:۵/۹۹، مطلب فی من ورث مالا حراما)۔

جب ملکیت ہی ثابت نہیں تو اس کو عمارت وغیرہ کی منظوری کے لیے کارپوریشن والوں کو سود سے پیسہ دینا درست نہیں ہوگا، اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح کی رقم سرکاری خزانے میں بھی نہیں جاتی ہے کہ سرکاری بینک سے ملی رقم میں "**رد علی أرباب المال**" کی صورت پیدا ہوجائے اور جواز کی شکل نکل آئے؛ بلکہ یہ رقم ان سرکاری محکموں کے ملازمین اور کارکنان کی جیبوں میں جاتی ہے، اور جب ان کو رقم گئی تو کسی بھی اصول کے تحت سودی رقم دینا درست نہیں ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی رقوم کو کارپوریشن کے ملازمین کو بطور رشوت دینا جائز نہیں ہے۔

جواب: ۱۱

اگر یقینی طور پر کسی کے بارے میں معلوم نہ ہو تو محض ظن کی بنیاد پر کسی کے مال کے حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جائے گا؛ جب تک کہ کوئی پختہ دلیل نہ ہو، قاعدہ ہے "**الیقین لایزول بالشک**" (مجلۃ الاحکام العدلیہ: رقم المادہ:۴)۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی بلا وجہ سوال کرنے سے منع فرمایا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"**إذا دخل أحدکم علی أخیه المسلم فأطعمه طعاما فلیأکل من طعامه ولایسأله عنه، فإن سقاه شرابا فلیشرب من شرابه، ولم یساله عنه**" (مسند احمد بن حنبل:۲/۹۹۲، رقم:۹۱۷۳)۔

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس شخص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ ہو یا معلوم ہو؛ مگر عین شئ کا حرام ہونا معلوم نہ ہو، تو اس کا ہدیہ قبول کرنا، بچوں کا ٹافی لینا، پانی اور دیگر ضروریات کی چیزیں لینا درست ہوگا۔

جواب:۱۲

حدیث کے الفاظ ہیں:

"**الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء، يارب يارب! ومطمه حرام، ومشربه حرام، وغذى بالحرام، فأنّٰى يستجاب**" (صحیح مسلم:۱۰۱۵، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ)۔

اس روایت سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص حرام مال کھاتا ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، لیکن علامہ ابن رجب حنبلیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دراصل قبول دعا کے استبعاد کو بتانے کے لیے بطور تمثیل ہے:

"**وما ذكره بعد ذلك من الدعاء وأنه كيف تقبل مع الحرام فهو مثال لاستبعاد قبول الأعمال مع التغذية بالحرام**" (جامع العلوم والحکم:۴۳)۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات غالباً زجر وتوبیخ اور بیان شناعت کے لیے ہے، نہ کہ بالکلیہ کوئی بھی دعا مقبول نہ ہونے کی صراحت ہے۔

اگر وہ عالم یا بزرگ حرام میں ملوث نہیں ہے، تو اس کی دعا قبول ہوگی، کیوں کہ دوسرے کی حرام خوری سے اس کی دعا پر اثر نہیں پڑے گا۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق چند مسائل

مفتی عبدالرزاق امروہی ☆

مال و دولت کو اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں نعمت اور زینت قرار دیا ہے، اسی لیے مال کے حصول اور مالک بننے کو منع نہیں فرمایا، لیکن یہ بھی بتلا دیا کہ ہر چیز کا اصل اور حقیقی مالک اللہ تعالی ہی ہے، وہ جیسے حکم کرے، مال اس کے مطابق حاصل اور خرچ کرے، کسب مال کے شرعی طریقوں سے حاصل شدہ مال حلال و پاک ہے، جس کو شریعت نے ممدوح قرار دیا ہے، لیکن غیر شرعی طریقوں سے حاصل کیا ہوا مال حرام ہے، جس سے اجتناب کی شریعت میں تاکید آئی ہے، کسب حلال کی فضیلت شریعت اسلام نے کسب حلال کو عبادات میں شمار فرمایا ہے اور اس کے بے شمار فضائل بتلائے ہیں؛ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حلال مال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے'' (المعجم الاوسط للطبرانی: ۸۵۱۰)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''حلال مال کا طلب کرنا (اصل) فرائض کے بعد فرض ہے'' (المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۹۹۳)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مطلق مال کمانا فرض اور واجب عبادت نہیں؛ بلکہ حلال اور جائز طریقے سے مال کمانا عبادت ہے، حرام یا مشتبہ مال کمانا عبادت تو کجا الٹا سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، کسب حرام کی مذمت قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں متعدد جگہ آئی ہے، اللہ تعالی اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان والوں کو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز اور ناحق طور پر کھانے سے بڑی سختی سے منع کیا ہے؛ چناں چہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ! الا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو تو وہ جائز ہے'' (سورۃ النساء: ۲۹)۔

علماء نے ناحق طریقے سے مال کھانے کے ضمن میں بے شمار چیزیں ذکر کی ہیں، جن میں سے ڈکیتی، چوری، رشوت، سود، جوا، غصب، خیانت، ناپ تول میں کمی بیشی، دھوکہ دہی، ذخیرہ اندوزی، مال یتیم میں خرد برد اور جھوٹی قسم سے

☆ استاذ تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند

حاصل کیا گیا مال سرفہرست ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص نے دس درہم کا لباس خریدا؛ لیکن اس میں ایک درہم حرام کا تھا، تو جب تک یہ لباس اس کے بدن پر رہے گا، اُس کی نماز قبول نہیں ہوگی'' (مسند احمد: ۵۷۳۲)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت میں ہے: ''جس نے حرام مال سے کرتا پہنا تو اُس کی نماز قبول نہیں'' (مسند بزار: ۸۱۹)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اگر کسی نے حرام مال جمع کیا، پھر اُس میں سے زکوۃ ادا کی یا صدقہ دیا، تو اُس کو اس کا کچھ اجر نہیں ملے گا؛ بلکہ الٹا اس کو اس کا وبال ہوگا'' (صحیح ابن حبان: ۳۲۱۶، ۲۲۶۷، مستدرک حاکم: ۱۴۴۰، شعب الایمان: ۳۲۰۲)۔

مشتبہ مال

کسب حلال اور کسب حرام کے درمیان تیسرا ذریعہ کسب مشتبہ کا ہے، یعنی ایسے طریقے سے مال کمانا کہ جس کے حلال اور حرام ہونے میں شک وشبہ ہو کہ بعض اعتبار سے اُس کا حلال ہونا معلوم ہو رہا ہو اور بعض اعتبار سے اُس کا حرام ہونا معلوم ہو رہا ہو، تو ایسے مال کا کمانا بھی حرام ہے؛ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہ کی چیزیں ہیں، جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، سو جو شخص شبہات سے بچا اُس نے اپنے دین اور آبرو کو محفوظ کر لیا اور جو شخص شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ جائے گا'' (بخاری ومسلم)، حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات یاد رکھی ہوئی ہے: ''جو چیز شک میں ڈالے اُس کو چھوڑ دیا جائے اور اُس چیز کی طرف بڑھا جائے جو شک میں نہ ڈالے؛ اس لیے کہ صحیح چیز میں اطمینان ہوتا ہے اور غلط چیز میں شک ہوتا ہے''۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہیے کہ مال کے اندر حرمت یا خبث کا عنصر داخل ہونے کے کئی اسباب ہیں، چنانچہ خبث کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، مال کے اعتبار سے دونوں کا سبب ایک ہی ہے:

پہلی قسم: عدم ملک کی وجہ سے حاصل ہونے والا خبث: اس کے تحت دو صورتیں آتی ہیں:

۱- بلا اجازت حاصل شدہ مال جیسے: چوری، لوٹ مار، غصب اور رشوت وغیرہ، اگرچہ رشوت میں بظاہر دینے والے کی رضامندی ہوتی ہے، لیکن درحقیقت وہ دینے پر مجبور ہوتا ہے، اور عموماً دلی طور پر راضی نہیں رہتا، اس لیے رشوت بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

۲-اجازت کے ساتھ لیا گیا مال جیسے: سود، قمار، سٹہ اور جوا وغیرہ، اسی میں عقد باطل کی تمام صورتیں بھی آتی ہیں۔

دوسری قسم: ناجائز عقد کی وجہ سے مال میں واقع ہونے والا خبث: اس قسم میں عقد باطل اور عقد فاسد دونوں طرح سے حاصل شدہ مال ہوتا ہے، جو عقد نہ اصلا درست ہو اور نہ وصف کے اعتبار سے درست ہو وہ باطل ہے، عقد باطل شریعت میں بالکل معتبر ہی نہیں، اس کے ذریعے جو چیز انسان کے قبضہ میں آتی ہے وہ اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے پاس بطور امانت کے ہوتی ہے، مجلۃ الاحکام العدلیہ میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''**البيع الباطل لا يُفيدُ الحُكمَ أصْلًا۔ فَإذا قَبَضَ المشتَرِي المبيعَ بِإذْنِ البائع في البيع الباطِلِ؛ كانَ المبيعُ أمانَةً عِنْدَ المُشْتَرِي فَلَوْ هَلَكَ بِلا تَعَدٍ لا يَضْمَنُهُ**'' (مجلۃ الأحکام العدلیۃ: ۱/۷۳)۔

اب یہاں دو صورتیں ہیں کہ معقود علیہ ''عین'' ہوگا یا منفعت ہوگا۔

پہلی صورت یعنی معقود علیہ حسی اور مادی چیزوں کو بنایا جائے جو شریعت میں حرام ہو، جیسے شراب خنزیر اور خون وغیرہ، یہ سب تو شریعت میں مال ہی نہیں۔

دوسری صورت میں معقود علیہ کسی ناجائز چیز کی منفعت ہو، مثال کے طور پر گانا سننے پر مغنیہ کو اجرت دینا، زنا کر کے اجرت دینا، اور جن آلات کا جائز استعمال ممکن ہی نہیں ان کو کرایہ پر لے کر کرایہ دینا وغیرہ، ایک تو یہ اجارہ باطلہ ہے، دوسرے یہاں جو مال حاصل ہوگا وہ معصیت کے مقابلے میں ہوگا، اور معصیت پر اجرت کا استحقاق ہی نہیں ہوتا، چنانچہ اگر مال لے لیا اور قبضہ کر لیا تو ایسی صورت میں اس کو واپس کرنا ضروری ہوگا، جیسا کہ مجمع الانہر، ردالمحتار وغیرہ میں ہے:

''**لا يَجُوزُ أَخْذُ الْأُجْرَةِ عَلى المعاصِي (كالغناء، والنَّوْحِ، والملاهي)؛ لأنَّ المَعْصِيَةَ لَا يُتَصَوَّرُ اسْتِحْقَاقُهَا بِالعَقْدِ فَلا يَجِبُ عَلَيْهِ الأَجْرُ ، وإنْ أَعْطاهُ الأجْرَ وقَبَضَهُ لا يَحِلُّ لَهُ ويَجِبُ عَلَيْهِ رَدُّهُ عَلَى صَاحِبِهِ۔ وفي شرح الكافي: لا يَجُوزُ الإجارَةُ عَلى شَيْءٍ مِن الغِناء والنَّوْح، والمزامير، والطَّبْلِ أَوْ شَيْءٍ مِن اللَّهْوِ ولا عَلى قِرائَةِ الشعر ولا أَجْرَ في ذَلِكَ**'' (باب الإجارۃ الفاسدۃ: ۲/۳۸۴)۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غصب، سود قمار، چوری اور رشوت اور عقود باطلہ سے حاصل شدہ مال اور فعل معصیت پر لی گئی اجرت کی حرمت میں اور اس کے حکم میں کوئی فرق نہیں ہے، سب کا حکم یکساں ہے، حرمت کی بنیاد عدم ملک ہے جس کی وجہ سے اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے، اگر مالک معلوم نہ ہو یا وہ مر گیا ہو تو اس کے ورثاء کو پہنچانا ضروری ہے، اگر انکا بھی علم نہ ہو تو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

حکم میں فرق: فرق صرف اتنا سا ہے کہ فعل معصیت پر حاصل شدہ مال اگر منفعت کے بدلے میں ہو جیسے: زنا کی

اجرت، نائحہ اور مغنیہ کی اجرت، تو اس کا اصل حکم یہی ہے کہ اس کو اصل مالک کو لوٹا دیا جائے، لیکن منفعت کو واپس کرنا محال ہے، تو اب اگر مغنیہ، نائحہ اور مزنیہ کو حکم دیا جائے کہ اس فعل معصیت پر حاصل شدہ رقم کو واپس کر دے تو وہ واپس کر دیں گے، ایسی صورت میں ''رد'' ایک طرف سے ہو جائے گا، لیکن دوسری طرف سے ''تراد'' پر عمل کرنا محال ہے، نیز اس میں تعاون علی الاثم کا شبہ بھی ہے، اس لیے زانی، گانا اور نوحہ سننے والے کو اجرت واپس نہیں کی جائے گی، البتہ صدقہ کرنا واجب ہے۔

چنانچہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، انہوں نے فرمایا: ''**فإن الزانی ومستمع الغناء والنوح قد بذلوا هذا المال عن طيب نفوسهم، واستوفوا العوض المحرم، والتحريم الذی فيه ليس لحقهم، وإنما هو لحق الله تعالى، وقد فاتت هذه المنفعة بالقبض، والأصول تقتضی: أنه إذا رد أحد العوضين يرد الآخر، فإذا تعذر على المستأجر رد المنفعة لم يرد عليه المال**'' (اقتضاء الصراط المستقیم: ۲/ ۴۷)۔

(زانی اور گانا سننے والے نے مال اپنی خوشی سے خرچ کیا ہے اور اس کے بدلے حرام عوض بھی وصول کیا ہے، جہاں تک حرمت کی بات ہے تو وہ ان (زانی اور گانا نوحہ سننے والے) کے حق کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ اللہ کے حق کی وجہ سے ہے، اور یہ منفعت (زنا، سماعت) حاصل کر لینے کے بعد ختم اور معدوم ہو گئی، اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جب ایک فریق نے عوض لوٹا دیا تو دوسرا فریق بھی لوٹا دے، جبکہ یہاں مستاجر (زانیہ، نائحہ، مغنیہ) کو اس کی منفعت لوٹانا مشکل ہے تو دوسرے فریق کو اس کا مال بھی نہیں لوٹایا جائے گا)۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے: ''اگر دینے والے کی رضامندی سے مال پر قبضہ کیا گیا ہو اور دینے والے نے اس کے بدلے عوض بھی وصول کر لیا ہو جیسے شراب خنزیر یا کسی اور فحش کام کے بدلے عوض دینا، ایسا مال دینے والے کو واپس کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اس نے اپنے اختیار سے دیا ہے اور اس کے بدلے عوض بھی لے چکا ہے، لہٰذا عوض اور معوض دونوں اس کو دینا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس میں گناہ اور ظلم پر تعاون ہے، گناہ گاروں کے لیے آسانی پیدا کرنا ہے، زنا کرنے والا اور فحش کام کرنے والا اسکے علاوہ اور کیا چاہتا ہے کہ اپنی غرض بھی پوری ہو اور مال بھی بچ جائے، ایسے مال سے خلاصہ حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے صدقہ کیا جائے، اگر خود ضرورت مند ہو تو بقدر ضرورت لے لے بقیہ صدقہ کرے'' (زاد المعاد فی ہدی خیر العباد: ۵/ ۶۹۱)۔

اجرت کی حرمت کی بنیاد:

سابقہ تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ سود، چوری اور رشوت غصب کی صورتوں میں اجرت کی حرمت کی بنیاد عدم ملک ہے، اسی طرح غناء، نوحہ اور زنا میں معصیت کی بنا پر عدم ملک ہے، نیز تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے بھی یہ اجرت حرام ہے، لیکن

تھوڑا سا حکم میں فرق ہے کہ اجرت علی المعصیت صاحب مال کو واپس نہیں کی جائے گی، البتہ اس کو بھی صدقہ کرنا ضروری ہے۔

مال حرام کی وراثت:

اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے، اور اس کی ملکیت میں حرام مال موجود تھا تو جو ترکہ کی صورت میں مرحوم کے ورثاء کی طرف منتقل ہو گیا، کیا ایسا مال ورثاء کے لیے حلال ہے؟ اگر ورثہ کو یہ علم ہی نہیں کہ ہمارے مرحوم مورث کے مال میں حرام مال بھی ہے، تو اس صورت میں فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ ورثاء کے لیے مال حلال ہے، ایسے مال کے استعمال سے ورثاء کو گناہ نہ ہوگا، بلکہ مورث گناہگار ہوگا، لیکن اگر حرام مال کا علم ہو تو اس سلسلے میں چار اقوال ہیں:

۱- بعض علماء نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اس صورت میں بھی ورثاء کے لیے ترکہ کا حرام مال لینا اور استعمال کرنا حلال ہے۔

۲- علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے اس قول پر رد کرتے ہوئے دوسری رائے اختیار کی ہے، چنانچہ انہوں فرمایا کہ ورثاء کے لیے ایسا مال حلال نہیں ہے، بلکہ مطلقا حرام ہے، خواہ اس کا مالک معلوم ہو یا نہ ہو: ''**قال فی الدر المختار: فی المجتبی ماتَ وَكَسْبُهُ حَرامٌ فالميراثُ حَلالٌ ثُمَّ رَمَزَ وقَالَ لَا نَأْخُذُ بِهَذِهِ الرِّوايَةِ وَهُوَ حرام مُطْلَقًا عَلى الوَرَثَةِ فَتَنَبَّه**'' (ردالمحتار مع الدر المختار، الحظر والإباحة: فصل فی البیع)۔

۳- تیسری رائے ابن نجیم رحمہ اللہ کی ہے، آپ نے فرمایا کہ حرام مال میراث کا مالک اگر معلوم ہے تو یہ مال اصل مالک کو واپس کیا جائے، ورثاء کے لیے حلال نہیں ہوگا، لیکن اگر اس حرام مال کا مالک معلوم نہیں تو پھر ورثاء کے لیے حلال ہے، جیسا کہ الاشباہ میں ہے: ''**الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم بها، إلا فى حق الوارث فإن مال مورثه حلال له وإن علم بحرمته منه من الخانية، وقيده فى الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال**'' (۳/۳۳۳)۔

۴- چوتھی رائے علامہ شامی کی ہے، آپ کی رائے کا حاصل یہ ہے کہ حرام مال میراث کی تین صورتیں ہیں: پہلی صورت: اگر مالک معلوم ہے تو ورثاء کے حلال نہیں؛ بلکہ مالک کو لوٹانا ضروری ہے، دوسری صورت: اگر مالک کا علم نہیں لیکن حرام مال معلوم اور متعین الگ موجود ہے، مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو یہ بھی ورثاء کے لیے حلال نہیں، بلکہ اسے اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا، تیسری صورت یہ کہ حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے اور حرام مال مرحوم کے دیگر اموال میں مخلوط ہو گیا ہے، جس میں متعین طور پر پتہ نہ چلے کہ کونسا مال حرام ہے اور کونسا مرحوم کا اپنا حلال ہے، تو ایسی صورت میں قضاء یہ مال ورثاء کے لیے حلال ہوگا، لیکن دیانۃ ترکہ سے حرام مال کے بقدر صدقہ کرنا چاہیے: ''**والحاصِلُ أَنَّهُ إِنْ عَلِمَ أَرْبابَ الأَمْوالِ وجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الحَرَامِ لا يَحِلُّ**

لَـهُ ويَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صاحِبِهِ، وإِنْ كانَ مالًا مُخْتَلِطاً مُجْتَمِعًا مِن الحَرامِ ولا يَعْلَمُ أَرْبابَهُ ولا شَيْئًا مِنهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، والأَحْسَنُ دِيانَةً التَّنَزُّهُ عَنْه" (باب البیع الفاسد، مطلب فی من ورث مالا حراما: ۵/۴۹)۔

صدقہ کرنا واجب یا مستحب؟

امام صاحب کی رائے کے مطابق حرام مال کو خلط کرنے کی وجہ سے مرحوم شخص حرام کا مالک بن گیا تھا، لیکن ملکیت خبیث تھی، لہٰذا اس پر لازم تھا کہ حرام مال کا بدل اصل مالک کو لوٹاتا، یا اگر اس کا علم نہ تھا تو صدقہ کرتا، یہ حکم واجب تھا، اسی طرح ورثاء کے لیے بھی یہی حکم ہوگا۔

علامہ سرخسی لکھتے ہیں: "وإذا غصب درهما فألقاه فی دراهم له فعليه؟ لأنه خلط المغصوب بماله خلطا يتعذر على صاحبه الوصول إلى عينه، فيكون مستهلكا ضامنا لمثله، والمخلوط يصير مملوكا له عند أبی حنيفة، وعندهما لصاحبه الخيار بين التضمين والشركة، وكذلك الخلاف فی كل ما يخلط" (المبسوط: ۱۴/۵۲)۔

یعنی امام صاحب کے نزدیک خلط کرنے والے نے مال کو ہلاک کر دیا، اس لیے بدل کا ضامن ہوگا اور مخلوط کا مالک بن جائے گا، صاحبین کے نزدیک درہم کے مالک کو اختیار ہے، ضمان وصول کرے یا ساتھ میں شریک ہو جائے، علامہ شامی کی تین طرح کی عبارتیں ہیں: "باب البيع الفاسد" میں ہے: "ولا يَعْلَمُ أَرْبابَهُ ولا شَيْئًا مِنهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، والأَحْسَنُ دِيانَةً التَّنَزُّهُ عَنْهُ اور "كتاب الحظر والاباحه" میں ہے: "قالوا لَوْ مَاتَ الرَّجُلُ وَكَسْبُهُ مِن بَيْعِ الباذِقِ أَوْ الظُّلْمِ أَوْ أَخْذِ الرِّشْوَةِ يَتَوَرَّعُ الوَرَثَةُ، ولا يَأْخُذُونَ مِنهُ شَيْئًا وَهُوَ أَوْلى بِهِيمُ"۔

ان عبارتوں سے ایسے مال کا تصدق مستحب معلوم ہوتا ہے، لیکن کتاب الحظر والاباحہ میں ہی درج ذیل عبارت ہے: وإِنْ مَلَكَهُ بِالقَبْضِ والخَلْطِ عِنْدَ الإمامِ فَإِنَّهُ لا يَحِلُّ لَهُ التَّصَرُّفُ فِيهِ وَ عَلَيْهِ أَداءُ ضَمَانِهِ، وَكَذَا لِوارِثِهِ ثُمَّ الظَّاهِرُ أَنَّ حُرْمَتَهُ عَلى الوَرَثَةِ فِي الدّيانَةِ لا الحُكْمِ فَلا يَجُوزُ لِوَصِيّ القاصِرِ التَّصَدُّقُ بِهِ وَيُضَمِّنَهُ القَاصِرُ إِذَا بَلَغَ تَأَمَّلْ (قَوْلُهُ فَتَنَبَّهُ) أَشارَ بِهِ إلى ضُعْفِ ما فی الأشباه" (الحظر والإباحۃ: ۶/۳۸۶)۔

اس سے وجوب ہی معلوم ہوتا ہے، آپ کی رائے بھی دیانت سے متعلق ورثہ پر صدقہ کے وجوب ہی کی ہے۔

ورثاء اگر غریب ہوں:

جس طرح غربت کی صورت میں خود بھی بقدر ضرورت حرام مال سے استفادہ کر سکتا ہے، اس کے ورثاء بھی اگر ایسی

حالت میں ہوں کہ انکے پاس مال حرام کے علاوہ کچھ نہ ہوتو ان کے لیے بھی بقدر ضرورت استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اس نیت سے کہ جیسے ہی حلال رقم آجائے گی تو اتنی رقم صدقہ کریں گے، توبہ واستغفار کو لازم پکڑے رکھے۔

ہدایہ میں ہے: ''إلا إذا كانَ لا يَجِدُ غَيْرَهُ؛ لأَنَّهُ مُحتاجٌ إلَيْهِ، ولَهُ أنْ يَصْرِفَهُ إلى حاجَةِ نَفْسِهِ ، فَلَوْ أَصابَ مَالًا تَصَدَّقَ بِمِثْلِهِ إنْ كانَ غَنِيًّا وقت الاستعمال، وإنْ كَانَ فَقِيرًا فَلا شَيْءَ عَلَيْهِ''۔

حرام مال سے خریداری:

مشائخ احناف نے مال حرام سے خریداری کی پانچ قسمیں ذکر کی ہیں:

(۱) اولاً بائع کو وہ غصب کردہ نقود دے، پھر ان سے کوئی چیز خریدے۔

(۲) غصب کردہ نقود کی جانب اشارہ کرکے ان سے خریدے، پھر انہی سے ثمن ادا کرے۔

(۳) غصب کردہ نقود کی جانب اشارہ کرکے انہی سے عقد کرے، لیکن ثمن ان کے علاوہ سے ادا کرے۔

(۴) نقود کی جانب بالکل بھی اشارہ نہ کرے؛ بلکہ مطلقاً عقد کرے، پھر ثمن ان غصب کردہ نقود سے ادا کرے۔

(۵) غیر مغصوب نقود کی جانب اشارہ کرکے ان سے خریدے، لیکن ثمن غصب کردہ نقود سے ادا کرے، ردالمحتار میں ہے: ''مطلب إذا اكْتَسَبَ حَرامًا ثُمَّ اشْتَرَى فَهُوَ عَلَى خَمْسَةِ أَوْجُه (قَوْلُهُ اكْتَسَبَ حَرامًا الخ) تَوْضِيحُ المَسْأَلَةِ ما فى التتارخانِيَّة حَيْثُ قالَ: رَجُلٌ اكْتَسَبَ مَالًا مِن حَرامٍ ثُمَّ اشْتَرَى فَهَذَا عَلَى خَمْسَةِ أَوْجُهٍ: أَمَّا إنْ دَفَعَ تِلْكَ الدَّرَاهِمَ إلى البائِعِ أَوَّلًا ثُمَّ اشْتَرَى مِنْهُ بِهَا أَوْ اشْتَرَى قَبْلَ الدَّفْعِ بِهَا ودَفَعَهَا، أَوْ اشْتَرَى قَبْلَ الدَّفْعِ بها ودَفَعَ غَيْرَها، أو اشْتَرى مُطْلَقًا ودَفَعَ تِلْكَ الدَّرَاهِمَ، أَوْ اشْتَرَى بِدَرَاهِمَ أُخَرَ ودَفَعَ تِلْكَ الدَّرَاهِم'' (کتاب البیوع ۵/۲۳۵)۔

مذکورہ صورتوں کے احکام کے سلسلے میں حنفیہ کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول: ضمان کی ادائیگی سے پہلے ان سے خریدی جانے والی چیز سے انتفاع حلال نہیں ہے، اگر ضمان ادا کرنے سے پہلے بیچ کرکے نفع کمالے تو وہ نفع اس کے لیے حلال نہیں ہوگا، حتی کہ ضمان کی ادائیگی کے بعد بھی، مذکورہ تمام صورتوں کا یہی حکم ہے، یہی ظاہر الروایہ کا مقتضی ہے، علامہ ابوبکر اسکاف نے اسی کو اختیار کیا ہے، ہدایہ، بدائع اور ہندیہ میں تبیین کے حوالے سے اس کو راجح قرار دیا گیا ہے: ''وقال أبو بَكْرٍ: لا يَطِيبُ فِي الكُل، وفى الوَلْوالجيَّةِ : وقالَ بَعْضُهُمْ لا يَطِيبُ فِي الوُجُوهِ كُلِّهَا وهُوَ المخْتارُ''۔

دوسرا قول: امام ابواللیث اور ابونصر دانیہ کا قول ہے کہ مذکورہ تمام صورتوں میں خریداری سے جو نفع حاصل ہو وہ حلال ہے، البتہ پہلی صورت مستثنیٰ ہے، لیکن یہ ظاہر الروایہ کے خلاف ہے: ''**قال أبو نَصْرٍ: يَطِيبُ لَهُ ولا يَجِبُ عَلَيْهِ أَنْ يَتَصَدَّقَ إِلَّا فِي الوَجْهِ الأَوَّلِ، وَإِلَيْهِ ذَهَبَ الفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ، لَكِنْ هَذَا خِلافُ ظَاهِرِ الرِوايَةِ فَإِنَّهُ نَصَّ فِي الجامع الصَّغِيرِ: إِذا غَصَبَ أَلْفًا فَاشْتَرى بِهَا جَارِيَةً وبَاعَهَا بِأَلْفَيْنِ تَصَدَّقَ بِالربح**'' (ردالمحتار:۵/۲۳۵)۔

تیسرا قول: امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پہلی دوصورتوں میں اس مال سے خریدا ہوا نہ سامان حلال ہے اور نہ نفع، اخیر کی تینوں صورتوں میں حلال ہے: ''**وقال الكَرْخِيُّ: فِي الوَجْهِ الأَوَّلِ والثَّانِي لا يَطِيبُ، وفِي الثَّلاثِ الأَخِيرَةِ يَطِيبُ**'' (المرجع السابق)۔

علامہ شامی کی تصریح کے مطابق متاخرین نے فساد زمانہ کے پیش نظر امام کرخی کے قول پر فتویٰ دیا ہے، ہمارے اکابرین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

امام کرخی کے قول کا مطلب: امام کرخی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے حرام مال سے کپڑا خرید کر نفع کے ساتھ بیچ دیا، تو یہ نفع اس کے لیے حلال نہیں جب تک کہ وہ اس کا ضمان ادا نہ کردے، جب اس نے ضمان ادا کر دیا تو ادائے ضمان سے قبل حاصل شدہ نفع اس کے لیے حلال ہو جائے گا، ظاہر الروایہ کے مطابق حلال نہیں ہوگا، اس کی دلیل صاحب ہدایہ کی عبارت ہے، ملاحظہ فرمائیں: وہ پورا نفع صاحبین کے اصول کے مطابق صدقہ کرے گا۔

''**قال: ومن غصب ألفا فاشترى بها جارية فباعها بألفين ثم اشترى بالألفين جارية فباعها بثلاثة آلاف درهم فإنه يتصدق بجميع الربح، وهذا عندهما**'' (کتاب الغصب:۴/۲۹۸)، (کسی شخص نے ایک ہزار غصب کر کے باندی خرید لی، پھر اس کو دو ہزار میں بیچ دیا، پھر دو ہزار سے ایک باندی خریدی جس کو تین ہزار درہم میں بیچ دیا تو صاحبین کی رائے ہے کہ تمام منافع کو صدقہ کردے، آگے صاحب ہدایہ نے لکھا ہے: ''**فقوله في الكتاب "اشترى بها "إشارة إلى أن التصدق إنما يجب إذا اشترى بها ونقد منها الثمن .أما إذا أشار إليها ونقد من غيرها أو نقد منها وأشار إلى غيرها أو أطلق إطلاقا ونقد منها يطيب له، وهكذا قال الكرخي؛ لأن الإشارة إذا كانت لا تفيد التعيين لا بد أن يتأكد بالنقد ليتحقق الخبث. وقال بعض مشايخنا: لا يطيب له قبل أن يضمن وكذا بعد الضمان بكل حال، وهو المختار لإطلاق الجواب في رحمهم الجامعين والمبسوط**'' (المرجع السابق)۔

''**إذا اشترى بها**'' کا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ صدقہ کرنے کا حکم اس صورت میں ہے جب کہ اس نے

مغصوبہ نقود سے خریداری کی ہو اور انہی سے ثمن ادا کیا ہو؛ البتہ اگر ان کی جانب صرف اشارہ کیا، ان سے ثمن ادا نہیں کیا، یا انہی سے ثمن ادا کیا، لیکن دوسرے کی جانب اشارہ کیا تھا یا مطلق بیع کی اور مغصوبہ نقود سے ثمن ادا کیا تو امام کرخی رحمہ اللہ کے نزدیک ربح حلال ہے؛ کیوں کہ جب اشارہ سے تعیین نہیں ہوتی تو ادا کرنے سے ہو جائے گی، تاکہ خبث پایا جائے، اور ہمارے مشائخ کہتے ہیں: ضمان ادا کرنے سے پہلے ربح حرام ہے، اسی طرح ضمان کے بعد بھی ہر حال میں، اور جامع صغیر و کبیر اور کتاب المضاربہ کی مطلق عبارت کی بنا پر یہی مختار ہے، اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام کرخی رحمہ اللہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ادائے ضمان سے پہلے حاصل کیا ہوا نفع ادائے ضمان کے بعد حلال ہو جائے گا، ایک صورت میں حرمت متعدی ہو جاتی ہے، اور اگر ثمن میں ایسی چیز لی ہے جو کہ متعین بالاشارہ نہ ہوتی ہو جیسے: دراہم و دنانیر تو اس میں تفصیل ہے جو کہ شامی و درمختار وغیرہ میں مذکور ہے، اگر بائع کو یقین ہے کہ یہ روپے بعینہ وہی روپے ہیں جو کہ مشتری کو حرام میں ملے ہیں تو بیع کرنا جائز نہیں، ورنہ جائز ہے، اسی طرح ٹیوشن کی فیس لینے کا حکم ہے۔

وراثت کے مسئلہ میں علامہ شامی فرماتے ہیں: "**أخذ مورثه رشوة أو ظلما إن علم ذلک بعينه لا يحل له أخذه وإلا فله أخذه حكمًا .... والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئًا منه بعينه حل له حكمًا والأحسن ديانة التنزه عنه الخ ملخصا**" (کتاب البیوع: مطلب فیمن ورث مالا حراما وفیہ وفی الأشباہ: الحرمۃ تتعدی مع العلم بہا الخ الحظر والإباحۃ فصل فی البیع)۔

حرام کمائی والے کو سامان بیچنا اور ان ٹیوشن کی فیس لینا: اگر بائع کو مشتری کے مال کے حرام ہونے کا علم ہے تو بیع کرنا جائز نہیں، نیز فتاوی دار العلوم میں ہے: "جس شخص کی کل یا اکثر آمدنی حرام ہو، اس کے یہاں دعوت کھانا، اُس کا ہدیہ لینا یا مسجد و مدرسہ وغیرہ میں اُس کا چندہ قبول کرنا تو درست نہیں؛ البتہ خرید و فروخت اور کرایہ داری وغیرہ، یعنی: مالی معاملات میں امام کرخی کے قول پر گنجائش ہے؟ بہ شرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اُسے متعین کر کے نہ دے؛ لہذا کل یا اکثر آمدنی حرام والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اُن سے اجرت لے سکتے ہیں، گنجائش ہے، اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر احتراز کرے تو اس کے افضل و بہتر ہونے میں کچھ شبہ نہیں" (فتاوی دار العلوم، فتوی: ۴۱۴)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "**آكل الربا وكاسِبُ الحَرام أهدى إلَيْهِ أو أضافَهُ وغالِبُ مالِهِ حَرامٌ لا يَقْبَلُ، ولا يَأْكُل ما لم يُخبِرُهُ أنَّ ذَلِكَ المالَ أَصْلُهُ حَلالٌ ورِثَهُ أَوْ اسْتَقْرَضَهُ، وإنْ كانَ غَالِبُ مالِهِ حَلالا لا بَأسَ بِقَبُولِ هَدِيَّتِهِ والأَكْلِ مِنهَا، كَذا فى الملتقط**" (ہندیہ: ۵/۳۹۷)۔

حرام مال مخلوط میں غلبہ کا اعتبار:

امام ابوحنیفہؒ کا ضابطہ یہ ہے کہ غاصب مال مغصوب اپنے یا کسی اور کے مال کے ساتھ ملا دینے کی وجہ سے مخلوط مال کا مالک ہوجائے گا، درمختار میں ہے: "أَوْ اخْتَلَطَ الْمَغْصُوبُ بِمِلْكِ الْغَاصِبِ بِحَيْثُ يَمتَنِعُ امْتِيَازُهُ ضَمِنَهُ وَمَلَكَهُ بِلَا حِلِ انْتِفَاعٍ قَبْلَ أَدَاءِ ضَمَانِهِ" (مغصوب غاصب کی ملکیت کے ساتھ اس طرح خلط ہوجائے کہ امتیاز ناممکن ہوتو غاصب اس کا ضامن ہوگا اور اس کا مالک ہوجائے گا؛ البتہ ضمان ادا کرنے سے قبل انتفاع حلال نہیں ہوگا)، علامہ شامی اس کے تحت لکھتے ہیں: "قَوْلُهُ مِلْكِ الْغَاصِبِ) وَكَذَا بِمَغْصُوبٍ آخَرَ" (یہی حکم اس صورت میں بھی ہے جب کہ ایک مال مغصوب دوسرے مغصوب کے ساتھ ملادے)۔

اس عبارت سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اپنے مال کے ساتھ ملائے گئے مال مغصوب اور دوسرے کے مال کے ساتھ ملائے گئے مال مغصوب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، دونوں صورتوں میں کل مال سے انتفاع حلال نہیں ہوگا، بلکہ اصل مقصد دونوں میں صرف اس حکم کے اندر مساوات بیان کرنا ہے کہ غاصب مخلوط کا مالک ہوجائے گا، رہا انتفاع کا حلال ہونا تو اس حکم میں دونوں کے درمیان فرق ہے، وہ یہ کہ اگر دوسرے مغصوب کے ساتھ ملائے تو کسی بھی جزء سے انتفاع حلال نہیں ہو گا؛ کیوں کہ کل مال خبیث ہے، اور اگر اپنے مال کے ساتھ ملائے تو صرف اس حصہ سے انتفاع حرام ہوگا جو مغصوبہ ہے، اور اپنے مال کے بقدر انتفاع حلال ہے، خواہ وہ کم ہو یا زیادہ۔

خلاصہ کلام:

اگر کسی شخص کے پاس حرام وحلال دونوں مال ملے جلے ہوں تو اس کے ساتھ معاملہ کے حکم کے سلسلے میں یہ مشہور ہے کہ اگر حلال کثیر ہوتو معاملہ جائز ہے، اور بعض فتاوی میں بھی یہی حکم ذکر کیا گیا ہے؛ لیکن فقہائے احناف کے کلام کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلال کے غلبہ کا اعتبار اس صورت میں ہے جب کہ آدمی کے پاس دونوں الگ الگ رکھے ہوں، اور معاملہ کرنے والے کو یہ علم نہ ہو کہ وہ حرام میں سے دے رہا ہے یا حلال میں سے، اس وقت غلبہ کا اعتبار ہوگا، مطلب یہ کہ اگر اکثر مال حلال ہوتو یہ مانا جائے گا کہ وہ حلال ہی میں سے دے رہا ہے، اور اکثر مال حرام ہوتو یہ کہا جائے گا کہ وہ حرام ہی میں سے دے رہا ہے، اگر حلال وحرام اس طرح مخلوط ہوں کہ امتیاز نہ ہوتو حنفیہ کے نزدیک اس میں غلبہ کا اعتبار نہیں ہوگا؛ بلکہ مخلوط سے حلال کے بقدر انتفاع جائز ہوگا، خواہ قلیل ہو یا کثیر۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ نے متعدد مسائل میں یہ فتوی دیا ہے کہ جس شخص کے پاس حرام وحلال مخلوط مال ہو اس

سے معاملہ کرنا جائز ہے۔

وراثت میں حصہ نہ دینے والے کی دعوت کا حکم:

چنانچہ اگر کسی نے اپنے بھائیوں اور بہنوں کا حصہ نہیں دیا تو ایسے غلے سے اس کی دعوت قبول کرنا جائز ہے، کیونکہ امام صاحب کے ضابطہ کے مطابق وہ مالک ہوگیا، پھر اگر لینے والے کو یہ معلوم نہ ہو کہ مخلوط میں دینے والے کا کتنا حصہ ہے تو ظن غالب پر عمل کرے گا، اگر غالب گمان یہ ہو کہ جتنی مقدار میں وہ معاملہ کر رہا ہے وہ حلال ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، اور چوں کہ مال مخلوط میں حلال کی مقدار جاننے میں دشواری ہوتی ہے یا یہ جاننا دشوار ہوتا ہے کہ غاصب نے حلال ہی میں سے خرچ کیا ہے؛ اس لیے اس سے بچنا ہی اولی ہوگا؛ الا یہ کہ حلال مال غالب ہو، لیکن یہ فتوی سے تعلق رکھتا ہے، تقوی سے نہیں، واللہ سبحانہ وتعالی اعلم۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**قالَ الفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ – تَعالى – اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي أَخْذِ الجائِزَةِ مِن السُّلْطَانِ قَالَ بَعْضُهُمْ يَجُوزُ ما لَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ يُعْطِيهِ مِن حَرامٍ، قالَ مُحَمَّدٌ وبِهِ نَأْخُذُ ما لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ وأصحابِهِ، كَذا فِي الظَّهِيرِيَّةِ**''۔

اس عبارت سے یہ معلوم ہوا، جب تک حرام ہونے کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ دینے والا حرام ہی سے دے رہا ہے تب تک اس شخص سے لینا بھی جائز ہے اور انتفاع بھی حلال ہے، امام محمدؒ لکھتے ہیں: ''**أن أبا العوجاء العشار كان صديقا لمسروق ، فكان يدعوه ، فيأكل من طعامه ويشرب من شرابه ولا يسأله، قال محمد و به نأخذ ، ولا بأس بذلك، ما لم يعرف خبيثاً بعينه ، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى**'' (کتاب الاثار باب الدعوۃ:۱۰۰)۔

(ابوالعوجاء عشار حضرت مسروق کے دوست تھے، وہ ان کی دعوت کرتے تھے اور آپ ان کے پاس جا کر کھاتے پیتے تھے اور کچھ نہیں پوچھتے تھے، امام محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمارا اسی پر عمل ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ بعینہ اس کے خبیث ہونے کا علم نہ ہو جائے، امام ابوحنیفہ کا بھی یہی قول ہے)۔

مصنف عبدالرزاق میں یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے: ''**عن ابن مَسْعُودٍ قَالَ: جَاءَ إِلَيْهِ رَجُلٌ فَقَالَ: إِنَّ لِي جَارًا يَأْكل الربا، وَإِنَّهُ لَا يَزَالُ يَدْعُونِي، فَقَالَ: مهنأ لَكَ وَإِثْمُهُ عَلَيْهِ، قَالَ سُفْيَانُ: فَإِنْ عَرَفْتَهُ بِعَيْنِهِ فَلَا تُصِبْهُ**'' (۱۴۷۱۱) (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا: میرا ایک پڑوسی سود خور ہے، اور وہ میری دعوت کرتا رہتا ہے، تو آپ نے کہا: مزیدار کھانا تیرے لیے اور گناہ اس کے لیے، امام ثوری یہ کہتے ہیں: اگر بعینہ اس کا حرام ہونا

معلوم ہوجائے تو دعوت مت کھاؤ)۔

امام محمدؒ اور امام ثوریؒ نے جو وضاحت کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلت اس صورت میں ہے جب کہ یہ معلوم نہ ہو کہ غاصب کے پاس حلال وحرام دونوں جدا ہیں، اسی طرح مخلوط مال میں حلال کتنا فیصد ہے وہ بھی معلوم نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے حلال کے غلبہ کی شرط نہیں لگائی ہے۔

مذکورہ تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ جس محلّہ میں ناجائز کاروبار ہوتا ہو وہاں دکان کرنا جائز ہے، اجرت ثمن اور ہدیہ لیتے وقت جائز یا ناجائز ہونے کی تحقیق کرنے کا مکلّف نہیں ہے، ہاں البتہ یہ یقینی علم ہو کہ وہ ناجائز کاروبار کرتا ہے۔

☆☆☆

حلال وحرام کاروبار-احکام ومسائل

مولانا عبیداللہ ندوی☆

تمہید:

اللہ تعالی نے انسانوں کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص رزق حلال وحرام میں تمیز کرنے کا حکم دیا ہے، رزق حلال کھانا اور رزق حرام سے اجتناب کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز، روزہ اور دیگر فرائض پر عمل پیرا ہونا، چنانچہ انبیاء کرام کو اور ان کی معرفت اصلا امتیوں کو یہ حکم دیا گیا: ''**یـأیهـا الـرسـل کـلوا من الطیبات واعملوا صالحا**'' (مومنون:۵۱)، نیز فرمایا گیا:''**کـلوا مما فی الأرض حلالا طیبا ولا تتبعوا خطوات الشیطان إنه لکم عدو مبین**،، (بقرہ:۱۶۸)، اس سے معلوم ہوا کہ مطلقا مال کمانا فرض اور واجب عبادت نہیں، بلکہ حلال اور جائز طریقہ سے مال کمانا عبادت ہے، حرام اور مشتبہ مال کمانا عبادت تو کجا، الٹا سخت گناہ اور اللہ کی نافرمانی ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کل لوگ مال کمانے کی حرص میں اس بات کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کرتے کہ حلال طریقے سے کمارہے ہیں یا حرام طریقے سے، ان کے مطمح نظر صرف یہ ہے کہ'' پیسہ ہو چاہے جیسا ہو؛ بلکہ آج کل مسلم معاشرہ میں بھی لوگ، کچھ تو اپنی بے دینی کی وجہ سے اور کچھ دنیا نے جو حرام اور سودی نظام کا شیطانی جال پھیلایا ہے اس کی وجہ سے جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی، اور دونمبری کے ذریعہ مال کمانے کو ہنر سمجھتے ہیں اور اسے اپنی چالاکی اور ہوشیاری خیال کرتے ہیں، اور حلال وحرام میں بالکل تمیز نہیں کرتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مسلم معاشرہ کے نوجوان یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ یہ چیز حرام کیوں ہے؟ اس کے استعمال میں حرج ہی کیا ہے؟ حالانکہ مسلمان کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ اللہ کے نازل کردہ نظام کو بسر وچشم قبول کرے، نہ کہ اس کے قوانین پر سوالات اٹھائے۔

علماء نے ناحق طریقے سے کمائی کی مختلف شکلیں بیان کی ہیں: مثلاً چوری، ڈکیتی، سود، رشوت، جوا، غصب، خیانت، ناپ تول میں کمی بیشی اور دھوکہ دہی وغیرہ، آج کے اس مقالہ میں ہم حرام کمائی سے متعلق بعض اہم مسائل پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

☆ استاد حدیث وادب دارالعلوم ماٹلی والا، بھروچ گجرات

سوال نامہ کے اہم نکات اوران سے متعلق شرعی اصول:

مطالعہ وتحقیق سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ موجودہ دور میں اکثر معاملات میں حرام کی آمیزش ضرور پائی جاتی ہے، جس سے بچنا آدمی کے لئے تقریبا ناممکن ہے، البتہ حرام کا تناسب معاملہ کی نوعیت کے اعتبار سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اور اس صورتحال کی وجہ سے کچھ فقہی ومالی مسائل پیدا ہوگئے ہیں، مثلا:

۱-ان معاملات کا کیا حکم ہوگا جس میں حلال وحرام دونوں ملے ہوئے ہوں۔

۲-حرام کی وہ مقدار کتنی ہے جو ضرورتا معفو عنہ ہے یا اس کی گنجائش دی جاسکتی ہے۔

۳-حرام مال ومنافع کی تطہیر کا شرعی طریقہ کیا ہے؟ جو کم سے کم اسے استعمال کے قابل بنادے۔

۴-ان اموال پر زکوۃ کا حکم کیسے لگایا جائے گا جن میں حرام کی آمیزش ہو، اور زکوۃ کیسے نکالی جائے گی؟

۵-حرام کمائی سے چھٹکارے کی کیا شکل ہوگی؟

مذکورہ بالا تمام مسائل ومعاملات کے لئے درج ذیل فقہی قواعد استعمال کئے جاسکتے ہیں:

الف: ''**المشقة تجلب التيسير**'' (مشقت آسانی پیدا کرتی ہے)۔

ب: ''**للأكثر حكم الكل**'' (اکثر پر کل کا حکم لگایا جائے گا)۔

ج: ''**اليسير الحرام معفو عنه في كثير من الأحكام**،، (تھوڑا اور معمولی حرام بہت سے احکام میں معفو عنہ ہے)، اس آخری قاعدہ کو اصول فقہ کی کتابوں میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، مثلاً: ''**اليسير مغتفر**'' (تھوڑی مقدار معاف ہے) اور ''**اليسير معفو عنه**'' (معمولی مقدار معفو عنہ ہے)، نیز ''**اليسير تجري فيه المسامحة**'' (معمولی مقدار میں تسامح چلتا ہے) وغیرہ۔

۱-لہٰذا اگر معاملات یا اموال یا اس کی تجارتی سرگرمیوں میں غالب حلال ہو اور اس کی نیت بھی یہی ہو تو ''**للأكثر حكم الكل**'' کے تحت معمولی حرام کو برداشت کیا جائے گا اور سارا مال حلال ہوگا، اور اگر غالب مال حرام ہو تو سب حرام مانا جائے گا۔

۲-خود مختار یا علاقائی یا عالمی قوانین کی وجہ سے یا کام کی تمام شکلوں میں فساد رائج ہونے کی وجہ سے مال حرام یا کسب حرام سے بچنا مشکل ہو؛ بایں معنی کہ حرام معاملات سے بچنے کی صورت میں کام کی پریشانی ہوجائے تو ''**إذا عمت البلية خفت**'' (جب مصیبت عام ہوجائے تو ہلکی ہوجاتی ہے) کے تحت گنجائش ہوگی۔

۳-نیت اور مقصود حلال تعامل کی ہی ہونی چاہئے ''**الأمور بمقاصدها**''۔

۴-کام کی شدید ضرورت ہو، اور اضطراری کیفیت ہو جائے تو یہ اصل قاعدہ سے مستثنی ہوگا اور "**فمن اضطر غیر باغ ولا عادفلاإثم علیه**"، نیز "**الضرورات تبیح الحظورات**" میں داخل ہوگا۔

۵-ہر زمان ومکان میں مخلوط مال میں حرام کے تناسب کا اندازہ لگانے میں علاقائی، صوبائی، اور عالمی پیمانہ پر معاملات آس پاس کے ماحول اور حالات کے اعتبار سے معیار بدلتا رہتا ہے، مثلا اسلامی تہذیب وتمدن اور گلوبلائزیشن کے دور میں فرق ہوگا، اسی طرح جدید عالمی معاشی نظام اور قدیم معاشی نظام میں فرق ہوگا۔

۶-جمہور فقہاء سلف وخلف کا اس پر اتفاق ہے کہ مال مخلوط سے حرام کی مقدار نکال دی جائے تو باقی حلال ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ:

۱-حرام ملازمت، پیشہ اور کمائی چھوڑنا واجب ہے، اور سچی توبہ کے بعد اس مال حرام کو خیر کے راستے میں صدقہ کرنا واجب ہے۔

۲-حتی الامکان جتنی جلدی ہو سکے صدقہ وغیرہ کر کے، حرام کمائی سے چھٹکارا حاصل کرے۔

۳-حرام کمانے والے کے لئے اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں، نہ بالواسطہ اور نہ بلاواسطہ۔

۴-حرام مال کے بقدر صدقہ کر دینے کے بعد باقی حلال ہو جائے گا۔

۵-حرام کمائی سے بچنے کے لئے ہر ممکن اسباب ووسائل اختیار کئے جائیں، اور اس راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں انہیں توکلاً علی اللہ برداشت کیا جائے۔

حرام مال سے وراثت اور اس سے کی گئی تجارت اور بنایا گیا گھر وجائیداد کا حکم؟

علماء کا حرام مال میں وراثت کے ذریعہ ملکیت کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف ہے، جبکہ وارث جانتا ہو کہ مورث نے اس کو حرام ذریعہ سے کمایا ہے اور سبب اختلاف یہ ہے کہ کیا وارث کے لئے جائز ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ مال، حرام کمائی سے حاصل کیا گیا ہے، حاصل کر لے، حالانکہ شریعت میں وہ ذریعۂ آمدنی معتبر ہی نہیں ہے، یا اس کے لئے گنجائش ہے کہ وہ مال لے لے اور گناہ مورث کے سر ہو جس نے حرام ذریعہ سے کمائی کی ہے؟ اس میں علماء کے تین آراء ہیں:

۱-بعض نے اجازت دی ہے اور ملکیت کو مباح مانا ہے۔

۲-بعضوں نے اسے حرام مانا ہے۔

۳-بعضوں نے یہ تفصیل بیان کی ہے کہ مالک معلوم ہے یا نہیں، اگر معلوم ہے تو حرام ہے، اگر مجہول ہے تو مباح ہے۔

اس سلسلہ میں صحیح بات یہ ہے کہ وہ مال حرام ہی رہے گا، اس سے انتفاع جائز نہیں ہوگا، اور موت مال حرام کو مباح کرنے کا سبب نہیں بن سکتی، اس پر ائمۂ اربعہ کا اتفاق ہے، اسی کو شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے (دیکھئے: حاشیہ ابن عابدین شامی ۵/ ۱۰۴، المجموع ۹/ ۴۲۸، الانصاف ۸/ ۳۲۳، الفتاوی الکبری ۱/ ۴۷۸)، یہ کہنا کہ گناہ مورث پر ہوگا وارث پر نہیں، اس سے اس مال حرام کی حقیقت نہیں بدلے گی، چنانچہ ابن رشد فرماتے ہیں: ''**وأما الميراث فلا يطيب المال الحرام، هذا هو الصحيح الذى يوجبه النظر**'' (المقدمات الممہدات ۲/ ۶۱۷) (اور جہاں تک میراث کی بات ہے تو مال حرام اس سے حلال وطیب نہیں ہوگا، اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے جس کو عقل ونظر اور غور وفکر واجب کرتے ہیں)۔

امام نووی فرماتے ہیں: ''**من ورث مالا ولم يعلم من أين كسبه مورثه أ من حلال أمن حرام؟ ولم تكن علامة، فهو حلال بإجماع العلماء، فإن علم أن فيه حراما وشك فى قدره أخرج قدر الحرام بالاجتهاد**'' (المجموع ۹/ ۴۲۸) (اگر کسی کو وراثت میں مال ملا اور اسے معلوم نہیں کہ مورث نے کہاں سے کمایا ہے؟ حلال ذریعہ سے کمایا ہے یا حرام سے؟ اور کوئی علامت بھی موجود نہ ہو، تو باجماع علماء وہ حلال سمجھا جائے گا، اور اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس میں حرام ملا ہوا ہے اور اس کی مقدار میں شک ہو تو اجتہاد سے (اندازہ لگا کر) حرام مقدار نکال دے گا)۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں: ''**وهو حرام مطلقاً على الورثة، أى سواء علموا أربابه أولا، فإن علموا أربابه ردوه عليهم، وإلا تصدقوا به**'' (ردالمحتار ۵/ ۲۴۷) وہ (یعنی مال حرام سے ملنے والی میراث) ورثاء کے لئے مطلقا حرام ہے، یعنی چاہے انہیں مالکان کا پتہ ہو یا نہ ہو، اگر مالک کا پتہ ہے تو ان کو لوٹانا ضروری ہے، ورنہ اس مال کو صدقہ کردیں گے)۔

اگر مال کا حقیقی مالک معلوم ہو (مثلا چوری کیا تھا یا رشوت لی تھی یا غصب کیا تھا یا ڈاکہ ڈالا تھا وغیرہ) اور وہ خود یا اس کے ورثاء موجود بھی ہوں تو میت کو ذمہ سے بری کرنے کے لئے، اور ناحق مال لینے سے بچنے کے لئے وہ مال اس کو لوٹانا واجب ہوگا، اور اگر مالک معلوم نہیں جیسا کہ آج کل حرام مال میں ہوتا ہے، مثلا سودی رقم ہو، یا مالک تک لوٹانا دشوار ہو تو یہ مال اللہ کی ملکیت شمار ہوگی، وارثت کے ذریعہ حاصل کرنا جائز نہیں ہوگا، چنانچہ اللہ فرماتا ہے: ''**وأنفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه**'' (الحدید: ۷) (اور خرچ کرو اس میں سے جو تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اپنا نائب بنا کر)، نیز فرمایا: ''**وآتوهم من مال الله الذى آتاكم**'' (نور: ۳۳)، (اور ان کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو دیا ہے) اور اللہ چونکہ بے نیاز ہے، اس لئے یہ مال فقراء ومساکین پر یا کسی کار خیر میں بلا نیت ثواب صدقہ کردیا جائے گا اور اگر ورثاء خود محتاج ہوں تو مالک کے مجہول ہونے کی صورت میں ان کو لینے کی گنجائش ہوگی، لیکن بطور صدقہ نہ کہ بطور میراث، اب صدقہ کرنے کے

بعداس کے لئے کاروبار کرنااوراس مال سے بنے ہوئے گھر میں رہنا سہنا بلا کراہت جائز ہوگا، چنانچہ شامی میں ہے: ''**مات وكسبه حرام ،فالميراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية،وهو حرام مطلقا على الورثة، فتنبه**'' (ردالمحتار، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد ۷/ ۳۰۲، ط: دارالکتب العلمیۃ)، (اگر کوئی مرگیااوراس کی کمائی حرام تھی، تو بھی میراث حلال ہوگی، پھر رمز کیا ہے اور فرمایا: ہم اس روایت کو نہیں لیتے ہیں، بلکہ وہ ورثاء کے لئے مطلقا حرام ہے، سوآ گاہ ہوجاؤ)۔

مال حرام کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ اس میں حرمت کا تعلق یا تو حقوق اللہ میں تعدی سے ہوگا، دوسری یہ کہ اس میں حرمت کا تعلق حقوق العباد میں تعدی سے ہوگا۔

پہلی صورت: جبکہ اس کا تعلق حقوق اللہ میں تعدی سے ہو، جیسے سود کی رقم، یا وہ مال جو شراب بیچ کر حاصل کیا گیا ہو، یا زنا کی اجرت یا ناچ گانے سے حاصل کی گئی رقم وغیرہ، تو اس کا اس پر باقی رہنا جائز ہوگا، اس کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

۱-''**لا تكسب كل نفس إلا عليها ولا تزر وازرة أخرى**'' (انعام: ۱۶۴) (اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اس کے ذمہ پر ہے، اور بوجھ نہ اٹھائے گا ایک شخص دوسرے کا)۔

۲- نبی اکرم ﷺ مدینہ منورہ میں یہودیوں سے لین دین کا معاملہ کرتے تھے، ان کے ہدایا قبول فرماتے تھے، حالانکہ ان کی بیشتر کمائی سود کی تھی، نیز آپ ﷺ نے اس یہودی عورت کا ہدیہ قبول فرمایا تھا جس نے آپ ﷺ کو زہر دیا تھا، اور اُکیدر دومہ، (دومۃ الجندل کا بادشاہ تھا، نصاری میں سے تھا جس سے آپ ﷺ نے صلح فرمائی تھی)، فروہ بن عمرو (جذامی نفاثی، آپ ﷺ پر ایمان لایا تھا، جنوب اردن کے علاقہ معان کا سردار تھا، آپ ﷺ کے لئے ہدیہ میں خچر بھیجا تھا) اور مقوقس وغیرہ کے ہدایا قبول فرمائے۔

۳-حضرت عمرؓ نے اہل ذمہ سے ان کی شراب کی قیمت میں سے جزیہ لیا ہے، چنانچہ امام ابوعبید قاسم بن سلام نے اپنی'' کتاب الاموال،، میں لکھا ہے کہ حضرت بلالؓ نے حضرت عمر بن خطابؓ سے کہا کہ آپ کے عمال خراج میں شراب اور خنزیر لیتے ہیں، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''**لا تأخذوها منهم،ولكن ولُّوهم بيعها،وخذوا أنتم من الثمن**'' (کتاب الاموال، ص: ۱۲۶، ط: دار الشروق، قاہرہ، بیروت، مصنف عبدالرزاق ۸/ ۸۲، ط: دار إحیاء التراث العربی)، (تم ان سے اسے (شراب اور خنزیر) نہ لو، بلکہ ان کو اسے بیچنے کا مکلّف بناؤ اور اس کی قیمت میں سے جزیہ وصول کرو)۔

۴-ایک آدمی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا اور عرض کیا: ''**إن لي جارا يأكل الربا وإنه لا يزال يدعوني، فقال: مَهْنَأُه لك وإثمه عليه**'' (مصنف عبدالرزاق ۸/ ۶۴) (میرا ایک پڑوسی ہے جو سود کھاتا ہے، اور ہمیشہ مجھے مدعو کرتا ہے (کیا میں اس کی دعوت قبول کرسکتا ہوں) تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: اس کا نفع تمہارے لئے ہے

اور گناہ اس پر ہوگا)۔

۵-حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے تھے: ''**إذا كان لك صديق عامل، أو جار عامل،أو ذو قرابة عامل،فأهدى لك هديةأو دعاك إلى طعام،فاقبله،فإن مَهْنَأُه لك وإثمه عليه**'' (حوالہ سابق)(اگر تمہارا کوئی دوست عامل (گورنر) ہو یا پڑوسی عامل ہو، یا رشتہ دار عامل ہو، اور وہ تمہیں کوئی چیز ہدیہ کرے یا کھانے کی دعوت دے تو قبول کرلو، اس لئے کہ اس کا نفع تمہارے لئے ہے اور گناہ اس پر ہوگا)۔

اس باب میں یہ صریح احادیث وآثار ہیں، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حرام مال سے دو لوگوں کا ذمہ متعلق نہیں ہوسکتا۔

دوسری صورت: جب کہ مال کی حرمت حق العباد سے متعلق ہو، جیسے چوری، غصب، مال غنیمت میں خیانت وغیرہ تو اس کو اپنے پاس رکھنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ اگر مالک زندہ ہو تو اس کو ورنہ اس کے ورثاء کو لوٹانا واجب ہوگا، دلائل یہ ہیں:

۱-''**لا يقبل الله صلاة بغير طهور ولا صدقة من غلول**'' (بخاری تعلیقا، مسلم، رقم:۲۲۴)(اللہ تعالی بغیر طہارت (وضو) نماز قبول نہیں کرتے اور نہ چوری کے مال سے صدقہ قبول کرتے ہیں)۔

۲-حضرت مغیرہ بن شعبہؓ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے ساتھ رہتے تھے، پھر انھیں قتل کردیا اور ان کا مال لوٹ لیا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**أما الإسلام فأقبلُ وأما المال فلستُ منه في شئي**'' (بخاری، رقم:۲۵۸۳، ابن حبان، رقم:۴۸۷۲)(جہاں تک اسلام کی بات ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں، اور رہا مال تو اس سے میرا کوئی تعلق نہیں)۔

حرام مال سے حاصل شدہ جائیداد اور کرایہ کا حکم؟

حرام اور ناجائز مال سے کسی بھی قسم کی تجارت کرنا درست نہیں ہے، لیکن اگر کسی شخص نے اس طرح کے مال سے تجارت کرلی یا کوئی جائیداد بنالی اور کرایہ پر دیدیا تو اس سے حاصل شدہ آمدنی اور نفع کو حرام نہیں کہا جائے گا، البتہ اگر حرام مال (غصب اور رشوت وغیرہ) سے حاصل ہوا ہے تو اصل مالک کی طرف اس اصل رقم کا لوٹانا ضروری ہے، اور اگر سودی رقم ہے یا مالک کا پتہ ہی نہیں ہے تو ایسی صورت میں اصل رقم کو غرباء ومساکین وغیرہ پر صدقہ کردیا جائے، چنانچہ شامی میں ہے:

''**اكتسب حراماواشترى به أو بالدراهم المغصوبةشيئا،قال الكرخي:إن نقد قبل البيع تصدق بالربح وإلالا، وهذا قياس،وقوله:** (اكتسب حراما)**توضيح المسئلة ما في التتارخانيةحيث قال:رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه:إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أوّلاً ثم اشترى منه بها،أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها،أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها،أو اشترى مطلقا ودفع**

تلک الدراهم،أو اشتری بدراهم أخرودفع تلک الدراهم،قال أبو نصر :یطیب له ولا یجب علیه أن یتصدق،إلا فی الوجه الأول،وإلیه ذهب الفقیه أبو اللیث ،لکن هذا خلاف ظاهر الروایةفإنه نص فی الجامع الصغیر: إذا غصب ألفافاشتری بها جاریة وباعهابألفین تصدق بالربح،وقال: الکرخی :فی الوجه الأول والثانی لا یطیب،وفی الثلاث الأخیرة یطیب،وقال أبو بکر :لا یطیب فی الکل،لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس" اھ (شامی،ردالمحتار۷/۴۹۰،ط: زکریا بکڈپو،دیوبند)۔

علامہ خلیل احمد سہارنپوری لکھتے ہیں:"اور اگر کسی آدمی کے پاس مال خبیث (حرام) ہے،تو وہ یا تو عقد فاسد کے ذریعہ اس کا مالک بنا ہوگا یا بغیر عقد کے حاصل ہوا ہوگا،نیز اس کے لئے مالک کو لوٹانا بھی ممکن نہیں ہے،اور وہ اپنی ذات سے حق لوٹانا بھی چاہتا ہے،تو اس کے لئے سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ وہ مال حرام فقراء کے حوالہ کردے،کیونکہ اگر اس نے اپنی ذات پر خرچ کرلیا تو جس فعل حرام کا ارتکاب کیا تھا وہ مستحکم (پکا اور پختہ) ہوجائیگا" (بذل المجہود،کتاب الطہارۃ۱/۳۵۹،ط:بیروت)۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے:" **والواجب فی الکسب الخبیث تفریغ الذمة والتخلص منه برده إلی أربابه إن علموا وإلاإلی الفقراء**،، (الموسوعہ الفقہیۃ الکویتیۃ ۳۴/۲۴۵،ط:بیروت) (حرام وخبیث مال میں تفریغ ذمہ اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے،اس کے مالکوں کو لوٹا کر اگر وہ معلوم ہوں،ورنہ فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہوگا)۔

البتہ اگر کوئی شخص اتنا غریب ہے کہ اس کی پوری جائداد اسی میں چلی جائے گی تو اس کے لئے اس رقم کو استعمال کرنے یا حلال کاروبار کی پونجی کے بقدر لینے کی گنجائش ہوگی،چنانچہ علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں:" **فطریق التخلص منه وتمام التوبة: بالصدقة به،فإن کان محتاجا فله أن یأخذ قدر حاجته،ویتصدق بالباقی** ..... **فهذا حکم کل خبیث لخبث عوضه،عینا کان أو منفعة**،، (زادالمعاد:۵/۶۹۱) (پس اس (حرام مال) سے چھٹکارے اور مکمل توبہ کا راستہ یہ ہے کہ اس کو صدقہ کردے،البتہ اگر وہ محتاج اور ضرورت مند ہو تو اپنی ضرورت کے بقدر لے لے اور باقی صدقہ کردے،اور یہی حکم ہر خبیث وحرام مال کا ہوگا عوض کے حرام ہونے کی وجہ سے،خواہ وہ عین ہو یا منفعت)،نیز امام نووی نے بھی یہی لکھا ہے،عبارت سوال نمبر/ ۳ کے ضمن میں آرہی ہے۔

اگر گھر کا سربراہ حرام کماتا ہو تو کیا بیوی بچے اس کو استعمال کرسکتے ہیں؟

مال حرام سے لیا گیا سامان یا کھانے پینے کی اشیاء بھی حرام ہیں،حرام کمانے والوں کے اہل خانہ کے لئے یہ حکم ہے کہ حرام کمانے والوں سے حرام ذریعہ آمدنی چھڑانے کی کوشش کریں،پوری کوشش کے باوجود اگر وہ نہ چھوڑیں تو ان کی بیویوں کے لئے اگر جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لئے اپنے شوہر کے مال

سے کھانا پینا، کپڑے وغیرہ ضرورت کی چیزیں خریدنا جائز نہیں ہوگا، اور اگر اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہوتو اس صورت میں اپنے شوہر کے مال سے کھانا وغیرہ جائز ہوگا، حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ شوہر پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کا بھی یہی حکم ہوگا، البتہ گھر کے بالغ افراد پر لازم ہوگا کہ وہ خود کما کر کھائیں اور اپنی ضروریات خود پوری کریں، حرام کمانے والے کے مال میں سے کچھ نہ لیں۔

چنانچہ موسوعہ فقہیہ میں ہے: ''**المال الحرام كالمأخوذ غصبا أو سرقة أورشوة أو ربا أو نحو ذلك ليس مملوكا لمن هو بيده**'' (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۲۳/۲۴۸) (مال حرام مثلاً غصب، یا چوری، یا رشوت، یا سود وغیرہ میں لی گئی رقم اس شخص کی ملکیت نہیں ہے (فی الحال) جس کے قبضہ میں ہے)۔

نیز شامی میں ہے: ''**وفي جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج**'' (حاشیہ ابن عابدین ۶/۱۹۱) (اور جامع الجوامع میں ہے: اگر شوہر نے مال حرام سے کھانا یا کپڑا خریدا تو عورت کے لئے اس کا کھانا اور پہننا جائز ہوگا، البتہ گناہ شوہر پر ہوگا)۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''امام غزالیؒ اس شخص کے بارے میں -جس کے پاس حرام مال ہو- فرماتے ہیں: اس کو چاہئے کہ مسلمانوں کے مصالح عامہ میں صرف کردے، اور اس کے لئے اس کی بھی گنجائش ہوگی کہ اپنے اور اپنے اہل وعیال پر صدقہ کرے، بشرطیکہ وہ فقیر ومحتاج ہو، کیونکہ اگر اس کے اہل وعیال فقراء ومحتاج ہیں تو وصف خود ان میں بھی پایا جارہا ہے، بلکہ ان کو صدقہ دینا زیادہ افضل ہوگا، نیز اس کے لئے بقدر ضروت خود بھی لینے کی گنجائش ہے، کیونکہ وہ خود بھی فقیر ہے'' (المجموع ۹/۳۵۱، إحیاء علوم الدین ۲/۱۳۲)۔

فقہ حنفی کی کتابوں لکھا ہے: ''**الملك الخبيث سبيله التصدق به، ولو صرفه في حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله، وإن كان فقيرا لا يتصدق**'' (الاختیار لتعلیل المختار ۳/۶۱) (ملک خبیث (حرام مال وملکیت سے چھٹکارے) کا راستہ صدقہ کرنا ہے، اور وہ اپنی ضرورت میں بھی خرچ کرلے تو بھی جائز ہے (بشرطیکہ وہ فقیر ہو) پھر جب وہ مالدار ہوجائے تو اسی کے بقدر صدقہ کردے اور اگر فقیر ومحتاج ہی رہا تو صدقہ نہیں کرے گا)۔

حرام مال سے تعلیم حاصل کی تو اس کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

رہی بات حرام مال سے تعلیم حاصل کرکے ملازمت کے جواز وعدم جواز کی، اور تنخواہ کے حلال ہونے کی تو اگر ملازمت جائز کام کی ہو اور وہ متعلقہ امور پوری دیانت داری سے انجام دیتا ہو تو اس کی تنخواہ حلال ہوگی۔

اگر معلوم نہ ہو کہ داعی کی کمائی حلال ہے یا حلال وحرام مخلوط تو اس کی دعوت کا کیا حکم ہے؟

الف: حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو تو ایسے شخص کی دعوت یا کوئی چیز کھانا جائز نہیں ہے، کوئی ایسا عذر بیان کرے جو صریح جھوٹ نہ ہو، لیکن اگر داعی ایسا ہے کہ دعوت قبول نہ کرنے کی صورت میں ضرر اور فتنہ کا اندیشہ ہے تو اس کی دعوت قبول کرنے کی شرعاً گنجائش ہوگی، لیکن یہ صرف ضرر اور فتنہ کے قوی اندیشہ کے وقت ہی کیا جائے گا، عام حالات میں نہیں۔

ہندیہ میں ہے: ''**أكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل، ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا لابأس بقبول هديته والأكل منها كذا في الملتقط**'' (فتاوی ہندیہ ۵/۳۹۷، کتاب الکراھیۃ، ط: زکریا بکڈپو) (سود کھانے والا یا حرام کمائی کرنے والا اگر کسی کو ہدیہ دے یا اس کی ضیافت کرے اور اس کا غالب مال حرام ہو تو دعوت قبول نہ کرے، اور کھانا اس وقت تک نہ کھائے جب تک وہ بتا نہ دے کہ اس مال کی اصل حلال ہے، اسے وراثت میں ملا ہے یا اس نے قرض لیا ہے، اور اگر غالب مال حلال ہے تو اس کا ہدیہ قبول کرنے اور اس کی دعوت کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے،'' ملتقط ،، میں مسئلہ اسی طرح ہے)۔

ب: اگر مشکوک ہو تو احتیاط کرنا بہتر ہے، بوقت ضرورت ومجبوری کھا لینے کی گنجائش ہے۔

ج: اگر حلال وحرام کے اسباب ظاہر نہ ہوں اور آدمی ظاہراً شریعت کا پابند، دین دار ہو اور اس کے ظاہری احوال اس کی آمدنی کے حلال ہونے کی تصدیق کرتے ہوں تو اس کی دعوت قبول کرنا درست ہے، بلا کسی معقول وجہ کے تحقیق کی ضرورت نہیں ہے، دلائل یہ ہیں:

۱- ارشاد باری ہے: ''**يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن إن بعض الظن إثم ولا تجسسوا**'' (حجرات: ۱۲) (اے ایمان والو! بہت زیادہ بدگمانی سے بچو، اس لئے کہ کچھ بدگمانیاں گناہ ہیں اور کسی کی ٹوہ میں نہ پڑو)۔

آیت میں مسلمانوں کے متعلق اچھا گمان رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ کسی بنیاد کے بغیر مسلمان کے بارے میں بدگمانی یا اس کے دائرہ کار سے بھی بڑھ کر تجسس وتفتیش کرنا شرعاً ممنوع ہے۔

۲- البحر الرائق میں ہے: ''**حيث يتحرى في خبر الفاسق كالإخبار بطهارة الماء ونجاسته، وحل الطعام وحرمته، وبخلاف الهدية والوكالة، ومالا إلزام فيه من المعاملات حيث يقبل خبره بدون التحرى للزوم الضرورة، ولا دليل سواه، فوجب قبوله مطلقا**'' (البحر الرائق ۶/۱۶۶) (بایں طور کہ فاسق کی خبر میں تحری کرے گا، جیسے کہ پانی کی طہارت ونجاست اور کھانے کی حلت وحرمت کی خبر دینے وغیرہ میں، برخلاف ہدیہ، وکالت اور معاملات میں سے وہ معاملات جن میں الزام نہیں (تو ان میں تحری نہیں کرے گا)، بلکہ اس کی خبر بغیر تحری کے قبول کرلے گا،

ضرورت کے لزوم کی وجہ سے، نیز اس کے علاوہ کوئی دلیل بھی نہیں ہے، اس لئے اس کا قبول کرنا واجب ہوگا)۔

۳-اصل یہی ہے کہ مسلمان کے قبضہ میں جو مال ہے حلال ہے، محض گمان سے وہ حرام نہیں ہوگا جب تک کہ دلائل سے ثابت نہ ہوجائے، اور جب تک ثابت نہیں ہوتا وہاں تک اس کے ساتھ معاملہ کرنا اور اس کا مال کھانا جائز ہوگا، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''**الأصل فيما بيد المسلم أن يكون ملكا له إن ادعى أنه ملكه،.....فإذا لم أعلم حال ذلك المال الذى بيده بنيت الأمر على الأصل**'' (مجموع الفتاوی) (اصل یہ ہے کہ مسلمان کے قبضہ میں جو کچھ ہے وہ اسی کی ملکیت مانی جائے گی اگر وہ اپنی ملکیت ہونے کا دعوی کرے، پس اگر ہم کو اس مال کا حال معلوم نہ ہو جو اس کے ہاتھ میں ہے تو اصل کا اعتبار کریں گے)۔

تاہم اگر مدعو کے غالب گمان کے مطابق اس کی غالب آمدنی ناجائز اور حرام ہے تو اس کا ایک حل یہ بھی ہے کہ جو کچھ کھانا کھایا ہے اس کا تخمینہ کرکے اس کی قیمت کسی بہانے سے صاحب دعوت (داعی) کو دیدیں (فتاوی دارالعلوم دیوبند)۔

اگر لاعلمی میں حرام کھالیا تو کیا کرے؟

اگر کھانے والے کو معلوم نہیں تھا، لاعلمی میں اس نے حرام مال کھلا دیا تو وہ گنہگار نہیں ہوگا، البتہ معلوم ہونے کے بعد توبہ واستغفار کرے، اور آئندہ کے لئے کھانے پینے میں احتیاط کرے، اور حسب توفیق صدقہ وغیرہ کردے۔

۱-چنانچہ درمختار میں ہے: ''**الحرمة تتعدد مع العلم بها، وفى الشامى فى تحته: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا تتعدى ذمتين سألت عن الشهاب بن الشلبى فقالؒ: هو محمول على ما إذالم يعلم بذلك**'' (الدرالمختار مع ردالمحتار ۶/۴، ۱۴۶، ط: کوئٹہ) (حرمت کا علم ہوجانے سے اس میں تعدد ہوجاتا ہے، اور شامی میں اس کے تحت لکھا ہے: اور جو بعض احناف سے یہ منقول ہے کہ حرام دو ذمہ کی طرف متعدی نہیں ہوتا، تو میں نے شہاب ابن الشلبیؒ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: یہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ اسے اس کا علم نہ ہو)۔

۲-نیز حدیث میں ہے: ''**عن قيس بن أبى غرزةؓ خرج علينا رسول اللهﷺ ونحن نُسمىٰ السماسرة، فقال: يا معشر التجار! "إن الشيطان والإثم يحضران البيع، فشُوبُوا بيعكم بالصدقة**'' (ترمذی، رقم: ۱۲۰۸، کتاب البیوع، وقال ھذا حدیث حسن صحیح)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر مال مشکوک ہو اس کو صدقہ سے ملانا چاہئے، تاکہ اس کے بقدر اللہ کا غضب ٹھنڈا ہو، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مشکوک مال لاعلمی میں کھالیا تو کچھ صدقہ دے دے، تاکہ اس کی تلافی ہوجائے۔

البتہ اگر کھاتے وقت ہی معلوم ہوجائے تو اگر بسہولت قے کرسکے تو قے کرکے نکال دے، جیسا کہ حضرت ابوبکر

صدیقؓ نے کیا تھا، چنانچہ حدیث میں ہے، حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں: ’’ **كان لأبى بكر الصديقؓ غلام يخرج له الخراج، وكان أبو بكر يأكل من خراجه، فجاء يوما بشيء، فأكل منه أبوبكر، فقال له الغلام: تدرى ما هذا؟ فقال أبو بكر: ما هو؟ قال: كنت تكهنت لإنسان فى الجاهلية وما أحسن الكهانة، إلا أنى خدعته، فلقينى، فأعطانى لذلك، هذا الذى أكلتَ منه، فأدخل أبوبكر يده فقاء كل شيء فى بطنه**‘‘ (بخاری رقم: ۳۸۴۲) (حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک غلام تھا، جو انہیں کچھ خراج دیا کرتا تھا، اور آپؓ اس کے خراج کو کھانے کے کام میں لاتے تھے، ایک دن وہ کوئی چیز لایا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے کھالیا، تو غلام نے ان سے کہا: آپ جانتے ہیں یہ کیا چیز تھی؟ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا: کیا چیز تھی؟ اس نے کہا: میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک آدمی کے لئے کہانت کی تھی (آئندہ ہونے والی بات بتائی تھی) حالانکہ میں کہانت اچھی طرح جانتا بھی نہیں تھا، میں نے تو اسے یوں ہی دھوکہ دیا تھا، آج وہ مجھ سے ملا اور اس نے یہ چیز مجھے بدلہ میں دی، اور اسی کو آپ نے کھایا ہے، اس پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنا ہاتھ منہ میں ڈالا اور پیٹ کی تمام چیزیں قے کر کے باہر نکال دیا)۔

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی شکل:

حرام مال کی مختلف صورتیں ہیں:

۱- یا تو وہ مال لذاتہ حرام ہوگا۔

۲- یا ذریعۂ کمائی کی وجہ سے حرام ہوگا، اور اسکی بھی دو صورتیں ہیں:

الف: یا تو مالک کی رضامندی سے حاصل کیا ہوگا۔

ب: یا بغیر رضامندی کے حاصل کیا گیا ہوگا۔

۳- یا تو اس کی حرمت کو جاننے کے باوجود کمایا ہے۔

۴- یا حرمت کا علم نہیں تھا، یا غلط تاویل کر کے حاصل کیا ہے۔

بہر حال ہر صورت کا الگ الگ حکم ہے، ذیل میں ہم تفصیل سے تحریر کرتے ہیں:

۱- حرام لذاتہ مال سے مراد ہر وہ چیز ہے کہ حرمت جس کی ذات سے متعلق ہو، جیسے شراب، سور، بت وغیرہ، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ مال کسی بھی طرح سے کمایا ہو، اس کی خرید وفروخت، ہدیہ تحفہ یا ذخیرہ اندوزی یا کسی بھی ذریعہ اس سے انتفاع نہیں کرے گا، یہی حکم ان اشیاء کا بھی ہوگا جن کی بیع وشراء، ذخیرہ اندوزی یا استعمال کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے۔

غیر شرعی طریقہ پر کمائے ہوئے مال میں تصرف کی کیفیت (طریقہ) میں فقہاء کا اختلاف ہے، اس میں بنیادی طور پر تین اقوال ہیں:

۱- جمہور فقہاء احناف و مالکیہ اور شوافع اور حنابلہ کے یہاں اس مال حرام کو ضائع اور تلف کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کے مالکان کو لوٹانا واجب ہے اگر وہ زندہ ہوں اور معلوم ہوں، اور اگر زندہ نہ ہوں تو ان کے ورثاء کو لوٹانا واجب ہے، اور اگر وہ معلوم نہ ہوں تو شرعی مصارف مثلاً فقراء و مساکین پر صدقہ، یا مسلمانوں کے مصالح عامہ (جیسے پل وغیرہ بنانا یا ایسی چیز جس کا نفع کسی ایک متعین شخص کو نہ ہوتا ہو) میں خرچ کرنا واجب ہے، نیز فقہاء کے نزدیک اس کی بھی اجازت ہے کہ اگر وہ خود فقیر ہو تو اس میں سے کھا سکتا ہے اور اپنے اہل خانہ میں سے ضرورت مندوں اور محتاجوں کو بھی کھلا سکتا ہے، کیونکہ اقرباء دوسروں کی بنسبت زیادہ حق دار ہیں، چنانچہ درمختار میں ہے: ''**علیه دیون و مظالم جهل أربابها و أیس من معرفتهم فعلیه التصدق بقدرها من ماله و إن استغرقت جمیع ماله، هذا مذهب أصحابنا لانعلم بینهم خلافا**'' (الدر المختار، ص: ۳۵۶، ط: دار الکتب العلمیۃ، نیز دیکھئے: الجامع لاحکام القران ۳/ ۳۶۶-۳۶۷، المجموع شرح المهذب ۹/ ۳۵۱، ط: دار الفکر، المبدع شرح المقنع ۵/ ۴۸، ط: دار الکتب العلمیہ) (اگر کسی آدمی کے اوپر قرض اور دوسروں کے حقوق ہوں اور اسے اس کے مالکوں کا پتہ نہ ہو اور وہ ان کی تلاش و پہچان کرنے سے مایوس ہو گیا ہو تو اپنے مال میں سے اسی کے بقدر صدقہ کرے گا، اگرچہ اس میں پورا مال ہی کیوں نہ خرچ ہو جائے، یہی ہمارے اصحاب (احناف) کا مسلک ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ اس مسئلہ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف ہے (یعنی سب کا اتفاق ہے)۔

ان حضرات کا استدلال درج ذیل روایات سے ہے:

الف: عن ابن مسعودؓ أنه اشتری جاریة فلم یظفر بمالکها لیعطیه ثمنها، فطلبه کثیرا فلم یظفر به، فتصدق بثمنها، وقال: اللّٰهم هذا عنه إن رضی، وإلا فالأجر لی'' (البیہقی ۶/ ۱۸۷) (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک باندی خریدی، لیکن مالک سے ملاقات نہیں کر سکے کہ اس کو قیمت ادا کریں، چنانچہ اس کو بہت تلاش کیا، لیکن پھر بھی وہ نہیں ملا، تو آپ نے اس کی قیمت صدقہ کر دیا، اور فرمایا: اے اللہ یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے، اگر وہ راضی ہوا تو، ورنہ اجر میرے لئے ہے (اور میں اس کو اس کی قیمت ادا کر دوں گا)۔

ب: رہان (ہار جیت کی شرط، جو ایک قسم کا جوا اور قمار تھا) کا وہ واقعہ جو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور مشرکین کے درمیان پیش آیا تھا، سورہ روم کی آیت: ''**أ لم غلبت الروم فی أدنی الأض وهم من بعد غلبهم سیغلبون**'' (روم: ۱) کے نزول کے وقت، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ بازی و شرط جیت گئے اور جیتا ہوا مال لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں

حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: صدقہ کردو (تفسیر قرطبی ۴/ ۱۱۲۴، معارف القرآن ۳۱/ ۳۷۰)۔

نوٹ: رہان (ہار جیت کی شرط) کی حرمت آپ ﷺ کے ابوبکرؓ کو اجازت دینے کے بعد نازل ہوئی تھی۔

ج: ''المجهول كالمعدوم'' اس کی دلیل لقطہ کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے: ''فإن وجدت صاحبها فارددها إليه، وإلا فهي مال الله يؤتيه من يشاء'' (التلخیص الحبیر ۳/ ۱۶۱، نصب الرایہ للزیلعی ۴/ ۳۷۱) (اگر اس کا مالک تمہیں مل جائے تو لوٹا دو، ورنہ وہ اللہ کا مال ہے وہ جسے چاہے دے دیتا ہے)۔

وجہ دلالت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس لقطہ کے بارے میں جس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ یہ کسی معصوم کی ملکیت ہے، بغیر اس کی رضا کے نکل گیا ہے، اور اس کا مالک مل نہیں رہا ہے، بیان فرمایا: گویا کہ یہ اللہ نے التقاط شرعی کی بنا پر اسے دے دیا جس کا فی الحال اس پر قبضہ ہے۔

د: مال اللہ کی نعمت ہے، اس کا یوں ضیاع جائز نہیں ہے، اور جب ضیاع جائز نہیں ہے تو لامحالہ اسے مسلمانوں کے مصالح عامہ میں صرف کیا جائے گا (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۴۲۹، فتاوی ابن حجر ۳/ ۹۷)۔

مناقشہ وترجیح:

جو حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ حرام ذریعہ سے کمائے گئے مال کی حفاظت واجب - جب کہ مالک معلوم نہ ہو - ہے اور اس میں کسی طرح کا تصرف جائز نہیں خواہ صدقہ ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح وہ حضرات جو اس کے تلف اور ضائع کرنے کے قائل ہیں، ان کی بات درست معلوم نہیں ہوتی ہے کیونکہ:

۱- یہ کہنا کہ اللہ تعالی صرف طیب مال ہی قبول کرتے ہیں، اس لئے طیب مال ہی صدقہ کرنا چاہئے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم صدقہ سے اپنے لئے اجر وثواب نہیں چاہتے ہیں، بلکہ ہم تو صرف حق سے برء الذمہ ہونا چاہتے ہیں، نیز مال کی تضیع اور تصدق میں ہمیں تردد ہے، اس لئے ہم نے تصدق کے پہلو کو تضییع کے پہلو پر ترجیح دی۔

۲- یہ کہنا کہ جو چیز ہم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے کیوں کر پسند کریں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مال ہمارے لئے حرام اس لئے ہے کہ ہم اس سے مستغنی ہیں، لیکن فقیر کے لئے حلال ہے، کیونکہ شرعی دلیل نے اسے حلال کیا ہے (دیکھئے: إحیاء علوم الدین ۲/ ۱۳۱، ط: دار المعرفۃ)

اگر حرام مال کے علاوہ اس کے پاس دوسرا مال نہ ہو تو کیا وہ اس میں سے بقدر پونجی لے سکتا ہے؟

قصدا وعمدا حرام مال سے تجارت وغیرہ کرنا کسی صورت جائز نہیں ہے، لیکن اگر وہ فقیر ومحتاج اور ضرورت مند ہو

تو اس میں سے بقدر ضرورت لینے کی گنجائش ہوگی، چنانچہ علامہ ابن القیمؒ لکھتے ہیں: ''**فطريق التخلص منه وتمام التوبة: بالصدقة به،فإن كان محتاجا فله أن يأخذقدر حاجته،ويتصدق بالباقي،فهذا حكم كل خبيث لخبث عوضه،عينا كان أو منفعة**'' (زادالمعاد۵/۶۹۱)(پس اس (حرام مال) سے چھٹکارے اور مکمل توبہ کا راستہ یہ ہے کہ اس کو صدقہ کردے، البتہ اگر وہ محتاج اور ضرورت مند ہو تو اپنی ضرورت کے بقدر لے لے اور باقی صدقہ کردے، اور یہی حکم ہر خبیث وحرام مال کا ہوگا عوض کے حرام ہونے کی وجہ سے، خواہ وہ عین ہو یا منفعت)۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ زانیہ اور شراب کا کاروبار کرنے والے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''**فإن تابت هذه البغي وهذا الخمار، وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال قدر حاجتهم،فإن كان يقدر يتجرأو يعمل صنعةكالنسج والغزل،أعطى ما يكون له رأس مال**'' (مجموع الفتاوی۲۹/۳۰۸)(اگر یہ زانیہ اور یہ خمّار توبہ کرلیں اور وہ ضرورتمند بھی ہوں تو اس (حرام) مال میں سے ان کی ضرورت کے بقدر ان پر خرچ کرسکتا ہے، اگر وہ قادر ہوں تو تجارت یا کوئی صنعت جیسے بُنائی یا سوت کاتنا وغیرہ، اختیار کرسکتے ہیں، اور اس کے لئے ان کو اتنا مال دیا جاسکتا ہے جو اس المال (پونجی) بن سکے، چاہے بعد میں لوٹائے یا نہ لوٹائے، البتہ لوٹانا بہتر واولی ہے)۔

نیز اس مسئلہ کی تفصیل ''**الربا في المعاملات المصرفية المعاصرة**،، ۲/۷۷۹-۸۷۴، تالیف: د/عبد اللہ بن محمد سعیدی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**غصب حانوتا واتجر فيه و ربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردي**'' (ہندیہ ۵/۱۴۲، الباب الثامن، کتاب الغصب) (اگر کسی نے کوئی دکان غصب کی اور اس میں تجارت کی اور منافع بھی کمائے تو منافع اس کے لئے حلال ہوں گے، کردی کی ''الوجیز'' میں اسی طرح ہے)۔

حلال وحرام آمدنی والے کے یہاں ملازمت کرنے کا حکم:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی ایسی جگہ ملازمت کرے جہاں حرام کام ہوتا ہو یا منکرات کی بیع وشراء ہوتی ہو، اور یہ اس میں براہ راست شریک عمل ہو، کیونکہ یہ تعاون علی الاثم ہے جس سے قرآن نے روکا ہے، اور جہاں تک بات ہے اس کام کی کمائی اور تنخواہ کی تو وہ سب کا سب حرام نہیں ہوگا، بلکہ اس کی یہ تفصیل ہے:

الف: اگر کام کرنے والا براہ راست حرام کام نہ انجام دیتا ہو اور نا ہی کسی طرح کا تعاون کرتا ہو تو کام بھی مباح اور کمائی بھی حلال ہے۔

ب: اوراگر وہ براہ راست حرام کام میں شریک ہے یا کسی طرح کا تعاون کرتا ہے تو یہ ملازمت حرام ہے، اوراس ملازمت پر باقی رہنا جائز نہیں ہے، اِلا یہ کہ مضطر (مجبور و پریشان) ہو یا اسے کام کی شدید ضرورت ہو، اس کے بغیر چارہ نہ ہو، تو ملازمت پر باقی رہ سکتا ہے، مگر حتی الامکان کوشش کرے کہ حرام کام نہ کرنا پڑے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وقد فصل لكم ما حرم عليكم إلا ما اضطررتم إليه**'' (انعام:۱۱۹)، البتہ اس صورت میں اس پر ضروری ہوگا کہ حرام کام کے مقابل اپنی کمائی کا کچھ حصہ صدقہ کرے، یعنی وقت کا اندازہ لگائے کہ کتنی دیر حرام کام میں ملوث رہا، پھر اسی تناسب سے اتنا مال صدقہ کردے، اللہ فرماتے ہیں: ''**فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه**'' (بقرۃ:۱۷۳)، نیز فقہ کا قاعدہ ہے: **الضرورة تقدر بقدر الضرورة**'' (جو چیز ضرورت کی وجہ سے مباح قرار دی گئی ہو وہ بقدر ضرورت ہی مباح ہوگی)۔

البتہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ کسی دوسری مناسب جگہ ملازمت تلاش کرتا رہے، جب مل جائے تو اسے چھوڑ دے۔

حرام کمائی سے بنائی گئی جائیداد اور خریدی گئی اشیاء کا حکم:

حرام مال سے خریدے گئے گھر یا گاڑی یا جائیداد وغیرہ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں:

۱- بعض کہتے ہیں کہ حرام مال سے بندے نے جو بھی کمایا ہے اسے فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا لازم ہے۔

۲- اور بعضوں کے یہاں یہ تفصیل ہے کہ اگر حرمت جاننے کے باجود کیا تھا تو صدقہ کرنا واجب ہے اور اگر حرمت کا علم نہیں تھا تو صدقہ واجب نہیں ہے، صرف توبہ کرلے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں اگر توبہ کرلیا تو سابقہ سب معاف ہوجائے گا، صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، دلیل یہ دیتے ہیں کہ قرآن میں ہے: ''**فمن جائه موعظة من ربه فانتهى فله ما سلف وأمره إلى الله**'' (بقرہ:۲۷۵) (پھر جس کو پہونچی نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اس کے واسطے ہے جو ہو چکا، اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالہ ہے)۔

وجہ دلالت: یہاں اللہ نے یہ نہیں فرمایا: ''**فمن أسلم**'' جو اسلام لے آئے یا ''**ولا من تبين له التحريم**'' کہ اسے حرمت کا علم نہ ہو۔

مال حرام کی حرمت صرف اس مال متعین سے ہی متعلق ہوتی ہے نہ کہ اس سے جو اشیاء خریدی گئی ہیں ان سے، لہٰذا زمین سے غلہ اگانا، اسے بیچنا یا کرایہ پر دینا یا کسی بھی طرح کا کوئی نفع اٹھانا جائز ہوگا، البتہ اس زمین کی قیمت فقراء و مساکین یا مسلمانوں کے مصالح عامہ میں صدقہ کردے۔

بہر حال موٹر سائیکل یا کار کی قیمت صدقہ کرنا اس پر واجب ہے، ہاں اگر وہ خود ضرورت مند ہے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے تو رکھ سکتا ہے، جائز ہوگا، البتہ جب استطاعت ہوجائے تو اس کی قیمت ضرور صدقہ کردے، اور جب اس کے

لئے جائز ہے تو دوسرا بھی اس پر بیٹھ سکتا ہے، اس (بیٹھنے والے) پر تو یوں بھی کوئی گناہ نہیں ہوگا وہ (صاحب قبضہ) صدقہ کر کے حلال کرتا یا نہ کرتا۔

حرام کمائی سے ادا کی گئی فیس کا حکم:

جن بچوں کے والدین کی کمائی حرام ہو، مثلاً وہ بینک میں کام کرتے ہوں یا سودی کاروبار کرتے ہوں یا رشوت کا لین دین کرتے ہوں اور پوری تحقیق ہو محض شبہ نہ ہو تو ان سے فیس میں وصول کردہ رقم مکروہ ہوگی۔

ہندیہ میں ہے: ''**آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل، ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا لابأس بقبول هديته والأكل منها كذا في الملتقط**'' (فتاوی ہندیہ ۵/۳۹۷، کتاب الکراھیۃ، ط: زکریا بکڈپو)۔

تکملہ فتح الملہم میں ہے: ''**و قوله: وكتابته، لأنه إعانة عليه، ومن هنا أن التوقف في البنوك الربوية لايجوز، فإن كان عمل الموظف في البنك ما يعين على الربا كالكتابة أو الحساب فذاك حرام لوجهين، الأول: إعانة على المعصية، والثاني: أخذ الأجرة من مال الحرام**'' (تکملہ فتح الملہم ۱/۶۱۹) (اور اس کا (سودی معاملات) لکھنا (جائز نہیں ہے)، کیونکہ وہ اس پر تعاون ہے، اور یہیں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سودی بینکوں میں توقف (ملازمت کی خاطر رکنا) جائز نہیں ہے، پھر اگر بینک میں ملازم کا کام سود پر تعاون ہو تو یہ دو وجہوں سے حرام ہوگا، ایک: تعاون علی المعصیہ، دوسرے: مال حرام سے اجرت لینا)۔

رشوت دیکر مدارس یا دیگر عمارتوں کا نقشہ منظور کرانے کا حکم:

رشوت وہ مال ومنفعت ہے جو کوئی شخص حاکم یا اس کے علاوہ موقع کے کسی دوسرے ذمہ دار کو دیتا ہے، تاکہ وہ اس کے حق میں فیصلہ کرے یا وہ رشوت اسے اس کے مقصد کی طرف مائل کرے، چنانچہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں: '' **أن الرشوة هي ما يعطيه الشخص لحاكم أو غيره ليحكم له أو يحمله على ما يريد**'' (حاشیہ ابن عابدین)۔

مجمع بحار الانوار میں علامہ پٹنیؒ نے رشوت کی یہ تعریف کی ہے: رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے،، (مجمع بحار الانوار بحوالہ علامہ سید سلیمان ندوی، دیکھئے: ماہنامہ دار العلوم، شمارہ: ۷-۸، جلد: ۹۷، رمضان وشوال ۱۴۳۴ھ مطابق جولائی، اگست ۲۰۱۳ء)۔

رشوت میں سودی رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ '' سود'' کی رقم یا تو مالک (بینک یا حکومت وغیرہ) کو

لوٹانا ضروری ہے، یا پھر غرباء ومساکین کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے، رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے (یعنی مالک کے قبضہ) میں نہیں جاتی، بلکہ افسران کے جیب میں جاتی ہے (فتاوی دارالعلوم، جواب نمبر: ۵۹۷۵۱)، شامی میں ہے: ''**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه**'' (فتاوی شامی ۵/۹۹، مطلب فیمن ورث مالا حراما، ط: سعید) (خلاصہ یہ کہ اگر مال کے مالکان معلوم ہوں تو مال ان پر لوٹانا واجب ہوگا، ورنہ نہیں، پس اگر عین حرام معلوم ہو تب تو وہ حلال نہیں ہوگا، بلکہ اصل مالک کی نیت سے اس کا صدقہ کرنا واجب ہوگا)، نیز اگر مجبوراً دینا ہی پڑے تو صحیح وحلال رقم ہی دی جائے۔

لیکن راقم کی ناقص رائے یہ ہے کہ مدارس اور اسکول چونکہ رفاہ عامہ کے لئے ہوتے ہیں اور مال حرام مشترک مصالح مسلمین میں صرف کیا جاسکتا ہے، اس لئے اگر وہ ہر ممکن کوشش کرکے ناکام ہو چکا ہے تو بدرجہ مجبوری سود کی رقم دیکر نقشہ منظور کرانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ یہاں تو ذمہ داروں کا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے اور نہ ہی وہ اسکول ومدرسہ اپنے لئے تعمیر کررہے ہیں، بلکہ یہ مفلس اور نادار طلبہ کے لئے ہوتا ہے جو مختلف علاقوں سے آتے ہیں، خیال رہے کہ یہ حکم صرف مدارس ومسلم اسکول وکالجز کے لئے ہوگا، باقی عمارتوں کا وہی حکم ہوگا جو اوپر نقل کیا گیا، واللہ اعلم۔

کیا ہدیہ لیتے وقت ہر بار پوچھنا ضروری ہے کہ مال حلال ہے یا حرام؟

یہ مسئلہ اوپر دعوت کھانے والے مسئلہ کے ضمن میں آچکا ہے کہ اگر کسی شخص کی کل یا اکثر کمائی حرام وناجائز ہو تو اس کی دعوت یا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، البتہ اگر صراحت کرکے جائز آمدنی سے دعوت کرے یا ہدیہ دے تو قبول کرنے کی گنجائش ہے، اسی طرح اگر کسی کی اکثر کمائی جائز ہو اور کچھ ناجائز ہو اس کی بھی دعوت یا ہدیہ قبول کرسکتے ہیں (دیکھئے: فتاوی ہندیہ ۴/۱۸۷، طبع دارالکتب العلمیۃ، بیروت)۔

اور اگر کسی مسلمان کی آمدنی کے مشتبہ ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو، محض وہم یا وسوسہ ہو، تو ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کئے بغیر اس کا ہدیہ قبول کرنا درست ہے، بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اسکے ذریعۂ آمدنی پر شبہ کرنا درج ذیل دلائل کی وجہ سے جائز نہیں ہے:

۱- ''**يأيها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن إن بعض الظن إثم ولا تجسسوا.....**'' (حجرات:۱۲)۔

۲- **عن أبي هريرةؓ عنه أن رسول الله ﷺ قال: "إياكم والظن فإن الظن أكذب الحديث ولا تحسسوا ولا تجسسوا**'' (ابوداود، رقم:۴۹۱۷)۔

۳- **عن عائشةؓ أن قوما قالوا: "يا رسول الله ﷺ إن قوما يأتوننا باللحم، لا ندري أ ذكروا**

اسم اللہ علیہ أم لا،فقال رسول اللہ ﷺ سمّوا اللہ علیہ و کلوہ،، (بخاری،رقم:۲۰۵۷،باب من لم یرالوساوس ونحوھامن الشبھات)(حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول ﷺ کچھ لوگ ہمارے پاس گوشت لیکر آتے ہیں،ہمیں معلوم نہیں ہوتا ہے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا ہے یا نہیں؟تو آپ ﷺ نے فرمایا:اللہ کا نام لواور کھاؤ)۔

۴-حدیث میں ہے:''**إذا دخل أحدکم علی أخیہ المسلم فأطعمہ طعاما، فلیأکل من طعامہ ولا یسألہ عنہ، وإن سقاہ شرابا من شرابہ، فلیشرب من شرابہ ولا یسألہ عنہ**'' (احمد رقم:)

(اگر تم میں سے کوئی اپنے کسی مسلمان بھائی کے پاس جائے اور وہ اس کو کھانا کھلائے تو اسے چاہئے کہ کھالے اور کھانے کے متعلق نہ پوچھے،اور اگر وہ پانی یا کوئی مشروب پلائے تو پی لے اور اس کے متعلق اس سوال نہ کرے،(کہ حلال ہے یا حرام؟)۔

۵-نیز پوچھنا باعث تکلیف ہے اور اسمیں مسلمان کی توہین ہے،رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

۶-ہندیہ میں ہے:''**رجل اشتری من التاجر شیئا،ھل یلزمہ السؤال أنہ حلال أم حرام؟قالوا ینظر إن کان فی بلد وزمان کان الغالب فیہ ھو الحلا ل فی أسواقھم ،لیس علی المشتری أن یسأل أنہ حلال أو حرام ،ویبنی الحکم علی الظاھر، وإن کان الغالب ھو الحرام أو کان البائع یبیع الحلال والحرام، یحتاط ویسأل أنہ حلال أم حرام**'' (فتاوی ہندیہ ۳/۲۱۰،ط:دارالفکر)۔

۷-فقہ البیوع میں ہے:''مال مغصوب اور جو اس کے حکم میں ہو مثلاً جس پر انسان نے رشوت،چوری یا شرعا عقد باطل کے ذریعہ قبضہ کیا ہے،ایسے مال سے انتفاع حلال نہیں ہے،نہ اس کو بیچنا،نہ ہبہ کرنا وغیرہ اور کسی ایسے شخص کے لئے،جو یہ سب جانتا ہو،اس کو خریدنا،یا ہدیہ یا وراثت میں لینا جائز نہیں ہے،بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مالک کو لوٹا دے،اگر لوٹانا دشوار ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہے،اور اگر مال نقد ہو اور عدم جواز کے علی الرغم کوئی چیز خرید لی،تو دیکھا جائے گا کہ عین مال حرام سے خریدا ہے تو خریدی ہوئی چیز سے انتفاع جائز نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا بدل مالک کو لوٹا نہ دے'' (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۲،ط:مکتبہ معارف القرآن)۔

تاہم اگر واضح دلیل سے کسی کی آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو،تو ایسے شخص سے ہدیہ لینا یا اس کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔

حرام کمائی والے کے یہاں کسی تقریب میں دعا کرانے یا پانی پر دم کرنے کا حکم:

ایسے آدمی کی خوشی کی تقریبات میں شرکت کا حکم تقاضائے مصلحت سے متعلق ہوگا، یوں تعلق تو کافر اور مشرک سے بھی رکھا جاسکتا ہے، اگر ایسے آدمی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کی خصلت بد سے متأثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو، بلکہ اس کی اصلاح کی نیت ہو اور آپ اسے نصیحت وفہمائش کے ذریعہ غلط کاموں سے روک سکیں، تو خاندانی یا اخلاقی تعلقات باقی رکھنے یا صلہ رحمی کی بنا پر نام رکھنے کی تقریب یا دوسرے مواقع پر ان کی خوشی میں شریک ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ کوئی اور شرعی مانع نہ ہو، ورنہ اجتناب بہتر ہے، کیونکہ بری صحبت سے نفع کی امید کم اور نقصان کا اندیشہ زیادہ ہے، اور جہاں تک بات ہے دعا کرنے یا پانی پر دم کرنے کی تو بالکل کر سکتے ہیں، رہی دعا کی قبولیت کی بات، تو حدیث میں یہ ہے کہ حرام کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، آپ تو کھا نہیں رہے ہیں صرف دعا کر رہے ہیں، اس کی ہدایت کی بھی مناسب انداز میں دعا کرادیں، نیز انھیں شرعی مسئلہ سے آگاہ بھی کرتے ہیں، البتہ یہ ضرور ذہن نشین رہے کہ وہاں آپ صرف دعا کرائیں کھانا نا کھائیں اور نا ہی ہدیہ وغیرہ قبول کریں۔

☆☆☆

حرام مال سے متعلق بعض احکام

مفتی امانت علی قاسمی☆

اسلام نے غذاء کے حلال ہونے پر بہت زور دیا ہے، مال حرام سے جس جسم کی پرورش ہوتی ہے اس کے بارے میں سخت وعیدیں آئیں ہیں، بعض روایات میں آتا ہے کہ جس جسم کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہو جہنم کے وہ زیادہ لائق ہے، روایات میں آتا ہے کہ جس آدمی کی غذاء حرام ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، علامہ قرطبی نے سہل بن عبداللہ التستری کے حوالے سے لکھا ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے سات شرطیں ہیں: (۱) تضرع (۲) خوف (۳) امید (۴) دوام (۵) خشوع (۶) عموم (۷) حلال غذاء (تفسیر قرطبی: ۲/۳۱۱)، اس لیے شریعت نے حلال کمانے پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور حرام کمائی سے بچنے کی تلقین کی ہے؛ حتی کہ اگر کسی کا مال مکمل طور پر حرام ہو تو اس کی دعوت کھانے یا اس کا ہدیہ قبول کرنے سے منع کیا ہے، بعض مرتبہ منع کرنا یا دعوت سے انکار کرنا سماج میں ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے دشوار ہو جاتا ہے، اسی طرح اگر کسی کا کاروبار ہی حرام کا ہو یا اس کو وراثت میں حرام مال ملا یا حلال وحرام دونوں طرح کا مال ہے اس کو پاک کرنے، اس سے اپنا ذمہ فارغ کرنے اور حلال طریقے پر کاروبار شروع کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ ایسے آدمی کی دعوت قبول کرنا، ہدیہ لینا، اسکول ومدرسہ میں بچوں کی فیس کے طور پر اس کا مال لینا، اس کے ساتھ رہنا سہنا، اس کی گاڑی پر سفر کرنا ایسے آدمی کے یہاں ملازمت کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس طرح کے سوالات کے حوالے سے اس مقالہ میں تفصیلی بحث کی گئی ہے، جو کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ۳۲ ویں فقہی سمینار کے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

وراثت میں ملے حرام مال سے کاروبار کرنے کا حکم:

شریعت میں مال حرام کا حکم یہ ہے کہ مال حرام اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو یا معلوم ہو لیکن لوٹانا ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ وخیرات کر دیا جائے، مال حرام کا آدمی مالک نہیں ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس پر زکوۃ بھی واجب نہیں ہوتی ہے، لیکن اگر حلال مال کے ساتھ حرام مال کو ملا دیا تو ایسی صورت میں تمام مال پر ملکیت ثابت ہو جائے

☆ استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

گی، اب اگر مال حرام کو الگ کرنا ممکن ہوتو الگ کردے اور اگر الگ کرنا ممکن نہ ہوتو تخمینہ سے حرام مال کے بقدر مال بلا نیت ثواب خیرات کردے۔

ایک شخص فی الحال حلال کاروبار کررہا ہے، لیکن اس کے آباء واجداد حرام کاروبار میں ملوث تھے، وہی حرام مال اس کو وراثت میں ملا ہے، اس کو یقین ہے کہ یہ سارا مال حرام کا ہی ہے، اس میں کوئی بھی حلال پیسہ نہیں لگا ہے، لیکن متعین طور پر وہ حرام مال کس کا ہے یہ معلوم نہیں ہے؛ تاکہ اس کو واپس کرسکے تو اس صورت میں وہ مال اس کے لیے شرعا حلال ہے؛ اگر چہ احتیاطا یہی حکم ہے کہ وہ اس کو صدقہ کردے، ہاں اگر یہ معلوم ہو کہ وہ مال حرام کس کا تو اس کے لیے اس حرام مال کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرات فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ مال حرام کی حرمت متعدی ہوتی ہے، یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ حرمت منتقل ہوجاتی ہے، لیکن وراثت میں اگر وارث کو عین حرام کا علم نہ ہوتو حرمت متعدی نہیں ہوتی ہے اور وارث کے لیے وہ مال حلال ہے، اس لیے اگر متعین طور پر حرام مال کے مالک کا علم نہ ہوتو وارث کا اس مال پر قبضہ کرنا درست ہے اور اس سے کمائی حاصل کرنا بھی درست ہے، تاہم احتیاط اس میں ہے کہ جتنا مال مورث نے چھوڑا ہے اس کو صدقہ کردے، علامہ شامی نے اس مسئلے پر باب البیع الفاسد اور کتاب الحظر والاباحۃ میں اور اس کے علاوہ مختلف مقامات پر روشنی ڈالی ہے جس سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں خود ائمہ احناف میں بھی اختلاف ہے، اس لیے بعض علماء نے وارث کے لیے مطلقا حلال ہونے کی بات کہی ہے اور یہ کہا کہ مال حرام اگر چہ متعدی ہوتا ہے، لیکن وارث کی طرف متعدی نہیں ہوتا ہے، جب کہ بعض علماء نے تفصیل سے کام لیا ہے، فتاوی شامی کی وہ تفصیلی عبارت جس سے مسئلہ پر واضح روشنی پڑتی ہے ملاحظہ فرمائیں:

"الحرمة تتعددمع العلم بها إلا فی حق الوارث، وقيده فی الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال--(قوله إلا فی حق الوارث إلخ) أی فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم المالک بعينه فلا شک فی حرمته ووجوب رده عليه، وهذا معنى قوله وقيده فی الظهيرية إلخ، وفی منية المفتی: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لا يحل ولكن لا يعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه .اهـ وكذا لا يحل إذا علم عين الغصب مثلا وإن لم يعلم مالكه، لما فی البزازية أخذه مورثه رشوة أو ظلما، إن علم ذلک بعينه لا يحل له أخذه، وإلا فله أخذه حكما أما فی الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء اهـ والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية

صاحبه، وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما، والأحسن ديانة التنزه عنه" (ردالمحتار، باب البیع الفاسد، مطلب فیمن ورث مالا حراما ۷/ ۳۰۱، مکتبۃ زکریا دیوبند)۔

"**وإذا مات الرجل وكسبه خبيث فالأولى لورثته أن يردوا المال إلى أربابه فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به وإن كان كسبه من حيث لا يحل وابنه يعلم ذلك ومات الأب ولا يعلم الابن ذلك بعينه فهو حلال له في الشرع والورع أن يتصدق به بنية خصماء أبيه كذا في الينابيع**" (الفتاوی الہندیۃ، الباب الخامس عشر فی الکسب ۵/ ۳۴۹)

فتاوی ہندیہ کی عبارت سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ ورثہ کے لیے بہتر یہ ہے کہ اگر صاحب مال کا علم ہو تو ان کو واپس کردیں، اگر علم نہ ہو تو صدقہ کردیں، لیکن اگر صدقہ نہیں کیا اور عین حرام کا علم نہیں تھا تو ورثہ کے لیے وہ مال حلال ہے، اس لیے اس سے جو کمائی ہوئی ہے وہ ورثہ کے لیے حلال ہے۔

ان تفصیلات خاص کر شامی کی الحاصل کے ذیل کی عبارت کی روشنی میں صورت مذکورہ کا حکم یہ ہے:

(۱) اگر مال حرام کا مالک معلوم ہے تو ورثہ کے لیے اس پر قبضہ کرنا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔

(۲) اگر مورث کی آمدنی حلال وحرام دونوں ہے اور مال مخلوط ہے تو وارث کے لیے اس مال پر قبضہ کرنا اور استعمال کرنا درست ہے، اس کا نفع بھی درست ہے جس قدر مال حرام کا غالب گمان ہو اس قدر صدقہ کردے۔

(۳) اگر یہ معلوم ہو کہ مورث کا مال حرام تھا، لیکن حرام کی تعیین نہ ہو اور نہ ہی مال حرام، حلال مال سے الگ ہو تو اس صورت میں بھی وارث کے لیے وہ مال حلال ہے اور اس سے نفع حاصل کرنا حلال ہے، احتیاط یہ ہے کہ اس قدر مال کو صدقہ کردے۔

(۴) اگر یہ معلوم ہو کہ مورث کا مال حرام تھا اور حرام کی بھی تعیین ہو کہ یہ فلاں کا غصب شدہ مال ہے یا سود کا مال ہے تو ایسی صورت میں اس مال پر قبضہ کرنا اور استعمال کرنا درست نہیں ہے، اگر اس پر قبضہ کرکے استعمال کیا ہے تو چوں کہ وراثت کی وجہ سے ملکیت ثابت ہوگئی ہے، اس لیے نفع حلال ہے اور عین مال حرام کو مالک کو واپس کرے یا صدقہ کرے، اگر ایک ساتھ صدقہ نہیں کرسکتا ہے تو تھوڑا تھوڑا صدقہ کردے۔

"**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه، وإن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما، والأحسن ديانة التنزه عنه**" (ردالمحتار، باب البیع الفاسد، مطلب فیمن ورث مالا حراما ۷/ ۳۰۱، مکتبۃ زکریا دیوبند)

"الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم إلا فى حق الوارث فإن مال مورثه حلال له وإن علم بحرمته منه من الخانية و قيده فى الظهيرية بأن لايعلم أرباب الأموال" (الاشباہ والنظائر،ص:۳۲۰)۔

"وَإِذَا غَصَبَ دِرْهَمًا فَأَلْقَاهُ فِي دَرَاهِمَ لَهُ فَعَلَيْهِ؛ لِأَنَّهُ خَلَطَ الْمَغْصُوبَ بِمَالِهِ خَلْطًا يَتَعَذَّرُ عَلَى صَاحِبِهِ الْوُصُولُ إلَى عَيْنِهِ، فَيَكُونُ مُسْتَهْلِكًا ضَامِنًا لِمِثْلِهِ، وَالْمَخْلُوطُ يَصِيرُ مَمْلُوكًا لَهُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ، وَعِنْدَهُمَا لِصَاحِبِهِ الْخِيَارُ بَيْنَ التَّضْمِينِ، وَالشَّرِكَةِ، وَكَذَلِكَ الْخِلَافُ فِي كُلِّ مَا يُخْلَطُ" (المبسوط:۱۴/۵۲)۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہندوستان میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں صورت میں سود کا معاملہ حرام ہی ہے، اس لیے کہ مفتی بہ قول کے مطابق دارالحرب میں بھی سودی معاملہ ناجائز ہے۔

اگر غریب شخص جس کے پاس مال حرام ہو:

اگر غریب شخص کے پاس مال حرام ہے اور اس کو معلوم ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے کہ وہ حرام کاروبار سے حاصل ہوا ہے اس کو جو کرایہ مل رہا ہے وہ بھی حرام جائداد سے مل رہا ہے، ایسی صورت میں اس شخص کے لیے بھی وہی حکم ہے جو ہر مال حرام والے شخص کے لیے تفصیلات ہیں؛ تاہم جن صورتوں میں اس کے لیے تصدق کا حکم ہے اس صورت میں اس کے لیے اس قدر گنجائش ہے کہ اپنی ضرورت کے بقدر مال رکھ کر باقی مال کو صدقہ کردے۔

"صرح الفقهاء بان من اكتسب مالا بغير حق فإما أن يكون كسبه بعقد فاسد كالبيع الفاسده و الاستئجار على المعاصى و الطاعات أو بغير عقد كالسرقة و الغصب و الخيانة و الغلول ففى جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه و لكن إن أخذه من غير عقد لم يملكه و يجب عليه أن يرده على مالكه و إلا ففى جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء" (بذل المجہود کتاب الطہارۃ ۲/۲۹۱)۔

ابن القیم زادالمعاد میں اس پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وتمام التوبة بالصدقة به، فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ قدر حاجته، ويتصدق بالباقى، فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه عينا كان أو منفعة، ولا يلزم من الحكم بخبثه وجوب رده على الدافع، فإن النبى صلى الله عليه وسلم حكم بخبث كسب الحجام، ولا يجب رده على دافعه" (ابن القیم، زادالمعاد:۵/۶۹۱)۔

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"فإن تابت هذه البغى وهذا الخمار وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال مقدار

حاجتهم فإن كان يقدر يتجر أو يعمل صنعة كالنسج والغزل أعطى ما يكون له رأس مال وإن اقترضوا منه شيئا ليكتسبوا به ولم يردوا عوض القرض كان أحسن"(مجموع الفتاوی:۲۹/۳۰۸)۔

شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی سے استفادہ:

اگر شوہر حرام کمائی کرتا ہے یا بیٹا حرام کاروبار میں ملوث ہے تو بیوی اور ماں کی ذمہ داری ہے کہ اس کو سمجھائے او رخوف خدا اور آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس دلائے اور حلال کاروبار کے لیے آمادہ کرے، لیکن اگر ماں کے کہنے کے باوجود بیٹا حرام کام سے باز نہیں آتا یا بیوی کے کہنے کے باوجود شوہر حرام کاروبار سے نہیں رکتا تو ایسی صورت میں اگر بیوی کے پاس شوہر کی کمائی سے بچتے ہوئے حلال گزارے کا نظم ہے یا ماں کے پاس اس بیٹے کی حرام سے بچنے کی صورت موجود ہے یا بیوی از خود کمائی کر کے گزارہ کر سکتی ہے تو ان دونوں کو چاہیے کہ شوہر یا بیٹے کے مال حرام سے احتراز کرے، لیکن اگر ان کے پاس گزارے کی کوئی اور سبیل نہیں ہے تو بیوی شوہر کے مال حرام سے اپنا گزارہ کر سکتی ہے، اسی طرح ماں بیٹے کے مال حرام کے ساتھ گزارہ کر سکتی ہے اور اخروی اعتبار سے ان دونوں سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، بلکہ حرام کمانے اور بیوی بچوں کو حرام کھلانے کا گناہ مرد پر ہوگا۔

"**وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاماً أو کسوةً من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها، والإثم علی الزوج**"(ردالمحتار:۶/۱۹۱)۔

"**وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أکلت من طعامه، ولم یکن عینه غصبا أو اشتری طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذلک والإثم علی الزوج**" (ردالمحتار:۶/۳۸۶)۔

حرام کمائی سے تعلیم پائے ہوئے شخص کی کمائی کا حکم:

اگر بچے کو اس کے باپ نے حرام کمائی سے کما کر تعلیم دلائی، اس تعلیم کے بعد بچے نے اعلی ڈگری حاصل کر کے ملازمت اور نوکری حاصل کی تو اس کی کمائی حلال ہے، اس پر حرام کا حکم نہیں لگے گا، اس لیے کہ اس کی کمائی حلال طریقے سے ہے، اس نے جو حاصل کیا ہے وہ حلال ہے اور اس کی نابالغی کے زمانے میں اس کے والد نے جو مال حرام سے اس پر خرچ کیا وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے، ہاں بالغ ہونے کے بعد اگر اس نے والد کے حرام کمائی کے پیسے سے تعلیم حاصل کی ہے تو گویا اس نے خود مال حرام کا استعمال کیا ہے اس لیے اس پر ضروری ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جس قدر مال حرام اپنی تعلیم پر استعمال کیا ہے اس کے بقدر صدقہ کرے؛ تاہم اس کی کمائی حلال ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ کوئی جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ نوکری حاصل

کرے، نوکری کے بعد اس کی کمائی حلال ہے، اگر چہ جعلی سرٹیفکٹ کے ذریعہ اس کے لیے نوکری حاصل کرنا ناجائز ہے، لیکن وہ اس کام کا اہل ہے اور جائز کام کرکے پیسہ کمارہا ہے تو وہ کمائی اس کے حق میں حلال ہے، اس لیے کہ کمائی کا تعلق اس کے عمل سے ہے اور عمل حلال ہے۔

"قال الغزالی الأسواق التی بناها السلاطین بالأموال الحرام تحرم التجارة فیها وسکناها فإن سکنها بأجرة وکسب شیئا بطریق شرعی کان عاصیا بسکناه ولا یحرم کسبه وللناس أن یشتروا منه ولکن إن وجدوا سوقا أخری فالشراء منها أولی لأن الشراء من الأولی إعانة لسکانها وترغیب فی سکناها وکثرة أجرتها والله سبحانه وتعالی أعلم" (المجموع شرح المہذب، کتاب البیوع، باب ما نہی عنہ من بیع الغرر، دار الکتب العلمیۃ، بیروت: ۱۰/ ۳۸۰)۔

"والأجرة تستحق باستیفاء المعقود علیه۔۔۔فإذا استوفی المعقود علیه استحق الأجرة عملا بالمساواة، وإذا اشترط التعجیل أو عجلها فقد رضی بإسقاط حقه فی التأجیل فیسقط.قال: (وإذا تسلم العین المستأجرة فعلیه الأجرة وإن لم ینتفع بها" (الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الاجارہ، فصل ما تستحق بہ الاجرۃ، ط: مطبعۃ الحلبی - القاہرۃ: ۲/ ۵۵)۔

مال حرام والے کے یہاں دعوت کھانا:

اگر کسی کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ اس کی مکمل آمدنی حرام ہے تو اس کے یہاں دعوت کھانا جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی کی آمدنی مخلوط ہو اور غالب آمدنی حرام ہو تو غلبہ کا اعتبار کرتے ہوئے اس کے یہاں بھی دعوت کھانا یا اس کا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں ہے۔

"سئل أبو جعفر عمن اکتسب ماله من أمر السلطان والغرامات المحرمة، وغیر ذلک هل یحل لمن عرف ذلک أن یأکل من طعامه؟ قال: أحب إلیّ فی دینه أن لا یأکل ویسعه حکما إن لم یکن غصبا أو رشوة اهـ" (ردالمحتار، فصل فی البیع)۔

ہاں اگر صاحب دعوت صراحت کرے کہ میں نے آپ کی دعوت حلال پیسے سے کی ہے تو اس صورت میں اس کی دعوت قبول کرنا درست ہے۔

"أهدی إلی رجل شیئا أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن یعلم بأنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی أن لا یقبل الهدیة ولا یأکل الطعام إلا أن یخبره بأنه حلال ورثته أو

استقرضته من رجل كذا في الينابيع. ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور؛لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به ؛لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب، وكذا أكل طعامهم، كذا في الاختیارشرح المختار ۴/ ۱۸۷، ط دارالکتب العلمیۃ بیروت'' (الفتاوی الھندیۃ، کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات ۵/ ۳۴۲، ط مکتبۃ زکریا دیوبند)۔

''**آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولايأكل وإن كان غالب ماله حلالاً لابأس بقبول هديته والأكل منها**'' (الھندیۃ: کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات ۵/ ۳۴۲)۔

اسی طرح اگر کسی کا مال مخلوط ہو یا کسی آبادی میں اکثر لوگ حرام کا کاروبار کرتے ہوں اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی کل آمدنی حرام ہے یا نصف حرام یا نصف سے زائد حرام ہے، اس کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے، لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس کی آمدنی میں حرام شامل ہے تو حلال وحرام کے مشتبہ ہونے کی صورت میں بھی اس کی دعوت کا قبول کرنا جائز نہیں ہے، تاہم اگر ظن غالب حلال ہونے کا ہو تو پھر اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے۔

''**إن الحلال بين، وإن الحرام بين، وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه، وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام**'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۵۹۹، ۳/ ۱۲۱۹)۔

حرام مال والے کے یہاں دعوت کھالے تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی:

اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ اس کا مال حرام تھا، اس لیے اس نے اس کی دعوت قبول کر لی، بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا مال حرام تھا تو توبہ استغفار کرے اور ساتھ میں کچھ صدقہ کر دے، بہتر ہے کہ جس قدر مال کھایا ہے اسی قدر صدقہ کر دے تو ان شاء اللہ حرام مال کھانے کے وبال سے بچ جائے گا اور جو حرام اس کے پیٹ میں گیا ہے چوں کہ وہ غلطی سے گیا، اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔

''**عن قيس بن ابي غرزة قال: كنا نسمى في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم "السماسرة"، فمر بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمانا باسم هو أحسن منه، فقال: يا معشر التجار! إن البيع يحضره اللغو والحلف، فشوبوه بالصدقة**'' (سنن ابن ماجۃ، باب فی التوقی فی التجارۃ، حدیث نمبر: ۲۱۴۵، ۳/ ۲۷۶)۔

''**عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ لِأَبِي بَكْرٍ غُلَامٌ يُخْرِجُ لَهُ الخَرَاجَ، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهِ، فَجَاءَ يَوْمًا بِشَيْءٍ فَأَكَلَ مِنْهُ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ لَهُ الغُلاَمُ: أَتَدْرِي مَا هَذَا؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ:**

وَمَا هُوَ؟ قَالَ: كُنْتُ تَكَهَّنْتُ لِإِنْسَانٍ فِي الجَاهِلِيَّةِ، وَمَا أُحْسِنُ الكِهَانَةَ، إِلَّا أَنِّي خَدَعْتُهُ، فَلَقِيَنِي فَأَعْطَانِي بِذَلِكَ، فَهَذَا الَّذِي أَكَلْتَ مِنْهُ، فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَهُ، فَقَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِي بَطْنِهِ" قال ابن حجر رحمه الله:

"قَالَ اِبْن التِّين : إِنَّمَا اسْتَقَاءَ أَبُو بَكْر تَنَزُّهًا ;لِأَنَّ أَمْر الْجَاهِلِيَّة وُضِعَ وَلَوْ كَانَ فِي الْإِسْلَام لَغَرِمَ مِثْل مَا أَكَلَ أَوْ قِيمَته وَلَمْ يَكْفِهِ الْقَيْء , كَذَا قَالَ , وَالَّذِي يَظْهَر أَنَّ أَبَا بَكْر إِنَّمَا قَاءَ لِمَا ثَبَتَ عِنْده مِنْ النَّهْي عَنْ حُلْوَانِ الْكَاهِن , وَحُلْوَانُ الْكَاهِن مَا يَأْخُذهُ عَلَى كِهَانَته" (فتح الباری، باب قولہ فی ایام الجاہلیۃ ۷/ ۱۵۴)۔

مال حرام کو حلال کرنے کا حیلہ

مال حرام کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ بلاعوض کے حاصل کیا گیا ہے جیسے کہ غصب کا پیسہ ہے یا رشوت کا پیسہ ہے تو جس کا مال ہے اس کو واپس کر دیا جائے، اسی طرح سود کا پیسہ جس کا ہے اس کو واپس کر دیا جائے، بینک کا پیسہ اگر سرکار کو کسی دوسرے طریقے سے جس میں بظاہر اپنا کوئی نفع نہ ہو واپس کر دیا جائے تو جائز ہے یا پھر اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، اسی طرح اگر بالعوض حاصل کیا ہے، مثلاً حرام ملازمت کے ذریعہ مال حاصل کیا ہے تو اس کو واپس کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے، چوں کہ مال حرام کا حکم متعین ہے، یا تو مالک کو واپس کیا جائے، یا پھر صدقہ کر دیا جائے، اس لیے کسی حیلہ کے ذریعہ حلال کرنا درست نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا حیلہ ہے جس سے مال حرام حلال ہو جائے، مثلاً کسی نے قرض لے کر حلال مال سے حج کر لیا یا قربانی کر لی تو اگر چہ حلال مال قرض لینے کی وجہ سے اس کی قربانی اور اس کا حج درست ہو جائے گا، لیکن مال حرام کی واپسی کے تصدق کا حکم ساقط نہیں ہوگا، اگر اس نے مال حرام سے قرض ادا کر دیا تو اگر چہ قرض ادا ہو جائے گا، لیکن تصدق یا مالک کو واپسی کا حکم علی حالہ باقی رہے گا۔

"الحرام ينتقل أى تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاک ....والحاصل إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه" (رد المحتار: باب البیع الفاسد ۷/ ۳۰۰، ط: زکریا)۔

"أما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد و لا يمكنه أن يرد إلى مالكه و يريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء" (بذل المجہود ۱/ ۳۷)۔

مال حرام سے توبہ کر کے نئی تجارت کی صورت

اگر کسی کے پاس صرف مال حرام ہو اور اس کے پاس مال حلال بالکل نہ ہو اور اب وہ شخص اپنے اس عمل سے تائب

ہوتا ہے تو پہلے نمبر پر یہ کام ہے کہ وہ اپنے کئے ہوئے عمل سے توبہ کرے اور آئندہ حرام استعمال کرنے سے باز آنے کا پختہ عزم کرے، پھر جس قدر اس کے پاس مال حرام ہے اتنا مال وہ صدقہ وخیرات کردے اور اگر اس کا کل مال ہی حرام کا ہے، اس کا گھر، اس کا کاروبار سب مال حرام سے ہے تو جس وقت وہ اپنے عمل سے توبہ کرتا ہے اس وقت اپنے ساری جائداد کا حساب کرلے اور کچھ حلال مال قرض لے کر حلال کاروبار شروع کرے اور دھیرے دھیرے وہ سارے مال جس کا اس نے تخمینہ کیا ہے بلا نیت ثواب صدقہ کردے، اس طرح اس کا سارا مال حلال اور پاک ہوجائے گا، علامہ ابن تیمیہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مال کو قرض لے کر کاروبار کرنا پھر بعد میں واپس کرنا بھی درست ہے:

"فإن تابت هذه البغي وهذا الخمار وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال مقدار حاجتهم فإن كان يقدر يتجر أو يعمل صنعة كالنسج والغزل أعطى ما يكون له رأس مال وإن اقترضوا منه شيئا ليكتسبوا به ولم يردوا عوض القرض كان أحسن" (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۰۸)۔

کیا ہدیہ قبول کرتے وقت مال کی تحقیق ضروری ہے؟

اگر کوئی ہدیہ دے یا دعوت کرے اور ظاہر حال میں اس کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہ ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنا اور دعوت قبول کرنا جائز ہے، اس کی تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں، بسا اوقات تحقیق کرنے سے سامنے والے کو تکلیف ہوتی ہے، دعوت قبول کرنا یا ہدیہ قبول کرنا مستحب ہے، جب کہ دل آزاری حرام ہے، اس لیے تحقیق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس سلسلے میں علامہ نووی نے امام غزالی کے حوالے سے عمدہ بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں: مالک کی تین قسمیں ہیں: (۱) مالک مجہول ہے جس سے پہلے سے کوئی شناخت وپہنچان نہیں ہے اور اس کے مال کے حلال وحرام ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے تو اس کا مال خریدنا یا اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے اور تحقیق کرنا واجب یا ضروری نہیں ہے، بلکہ جائز ہی نہیں ہے، (۲) دوسری قسم یہ ہے کہ صاحب مال مشکوک ہو، اس طور پر کہ اس کی ہیئت اور لباس سے اس کا مشکوک ہونا معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ وہ حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر یہ مال حرام میں بھی تساہل سے کام لیتا ہوگا، ایسی صورت میں اگر اس کے اکثر مال کے حرام ہونے کی علامت ہو تو اس سے سوال کرنا ضروری ہے اور اگر معمولی مال کے حرام ہونے کا ظن غالب ہے تو سوال کرنا ضروری نہیں ہے، (۳) تیسری قسم: اس کے ساتھ رہنے اور معاملات کرنے کی وجہ سے اس کے مال کے حلال و حرام ہونے کا ظن غالب ہوجائے، اس طور پر کہ آدمی صلاح وتقوی کے ساتھ معروف ہے تو پھر اس سے سوال کرنا جائز نہیں ہے اور یہ معلوم ہے کہ سودی کاروبار کرتا ہے، یا ناجائز کاروبار کرتا ہے تو پھر اس سے سوال کرنا ضروری ہے (دیکھئے: احیاء علوم الدین، کتاب الحلال والحرام ۲/ ۱۱۸، المجموع شرح المہذب ۱۰/ ۳۷۶، کتاب البیوع)۔

صورت مذکورہ میں اگر ساتھ میں رہنے کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ظاہر حال تدین وتقوی کی طرف مائل ہے تو اس کی دعوت اور ہدیہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، ان سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر ظاہر حال میں تدین اور صلاح دکھائی نہ دے تو ان کی دعوت قبول کرتے وقت سوال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر سوال کرنے میں دل شکنی کا اندیشہ ہو اور صورت حال سے ظن غالب عدم حلت کا ہو تو اس طرح کی دعوت میں جانے سے گریز کرنا چاہیے۔

"رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام؟ قالوا ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (الفتاوی الہندیۃ: ۳/ ۲۱۰، ط: دار الفکر)۔

جس شخص کا کاروبار حلال وحرام دونوں ہو اس کے یہاں ملازمت کرنا:

اگر کسی شخص کا بزنس آدھا حلال اور آدھا حرام ہو تو ایسے شخص کے یہاں اگر کوئی ملازمت کرے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صراحت کرے کہ میں صرف حلال کام کروں گا، حرام کام نہیں کروں اور اگر حلال وحرام دونوں کام کرنا پڑے تو گویا کہ وہ حرام کام کر رہا ہے اور حرام کام کی ملازمت جائز نہیں ہے، مثال کے طور پر کسی کا شاپنگ مال ہے جس میں شراب اور دیگر ممنوع اشیاء بھی فروخت ہوتی ہیں تو وہ اپنے لیے حلال کی قید لگا کر وہاں نوکری کرنا درست ہے اور اگر اس کو حلال کے ساتھ حرام کام بھی کرنا پڑتا ہے، مثلاً حرام اشیاء کا بھی حساب وکتاب کرنا پڑتا ہے تو اس کے لیے یہ ملازمت جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ معصیت پر تعاون ہے اور معصیت پر تعاون سے منع کیا گیا ہے: **"تعاونوا على البر و التقوى و لا تعاونوا على الإثم و العدوان"** (سورہ مائدہ: ۲)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"ومن هنا ظهر أن التوظف في البنوك الربوية لا يجوز، فإن كان عمل الموظف في البنك ما يعين على الربا، كالكتابة أو الحساب فلذلك حرام لوجهين: الأول: إعانة على المعصية، والثاني: أخذ الأجرة من المال الحرام، فإن معظم دخل البنوك حرام مستجلب بالربا" (تکملۃ فتح الملہم، ۱/ ۳۸۹)۔

"وإذا استأجر الذمي مسلما ليحمل له ميتة أودما يجوز عندهم جميعا ولو استأجر ذمي من ذمي بيتا يصلي فيه لا يجوز ولو استأجر مسلما ليرعى له الخنازير يجب أن يكون على الخلاف كما في الخمر ولو استأجره ليبيع له ميتة لم يجز هكذا في الذخيرة. مسلم آجر نفسه من مجوسي ليوقد له

النـار لا بأس به۔ كذا في الخلاصة--وسئل إبراهيم بن يوسف – رحمه الله تعالى – عمن آجر نفسه مـن النـصـارى ليضرب لهم الناقوس كل يوم بخمسة ويعطى كل يوم خمسة دراهم في ذلك العمل وفـي عمل آخر درهمان قال لا يؤاجر نفسه منهم ويطلب الرزق من طريق آخر، ويكره أن يؤاجر نفسه منهم لعصر العنب ليتخذوا منه خمرا كذا في الحاوى للفتاوى'' (الفتاوی الہندیۃ:۴/۴۵۰)۔

مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ لکھتے ہیں:

''جو کام ناجائز ہے اس کام کی نوکری بھی ناجائز ہے، دوسرا ذریعہ معاش تلاش کرے اور اس نوکری کو چھوڑ دے'' (فتاوی محمودیہ ۱۷/۱۲۱)۔

عمارت کا نقشہ پاس کرانے کے لیے سودی رقم دینا:

عمارت کا نقشہ پاس کرانے میں متعلقہ محکموں کو خطیرہ رقم رشوت کی دی جاتی ہے، اس میں سود کے پیسے کا استعمال درست نہیں ہے، اس لیے کہ رشوت متعلقہ محکموں کے افسران کو دی جاتی ہے جب کہ سود کی رقم کا مصرف متعین ہے یا تو مالک کو واپس کیا جائے یا بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، ظاہر ہے کہ افسران کو رشوت دینے میں مالک کے پاس واپس کرنا نہیں پایا جاتا ہے۔

ایک دوسری صورت یہ ہے کہ نقشہ پاس کرانے کے لیے متعلقہ محکموں کو رشوت کے علاوہ بھی ایک خطیر رقم دی جاتی ہے جو کہ نقشہ پاس کرانے کا عوض ہوتا ہے جو سرکاری محکموں کی طرف سے طے شدہ ہوتا ہے، آج کل یہ رقم بھی بہت زیادہ ہے، اس میں سودی رقم دینے میں بظاہر وہ رقم حکومت کو پہونچ جاتی ہے، یعنی اصل مالک کو واپس کرنا لازم آتا ہے، لیکن چوں کہ نقشہ پاس کرانا اپنی ضرورت ہے، اس لیے اپنے نفع میں سود کا استعمال کرنا لازم آئے گا جو درست نہیں ہے، نیز میونسپل کارپوریشن وغیرہ کو نقشہ پاس کرانے میں پیسہ دینے میں درحقیقت مال اصل مالک تک نہیں پہونچتا ہے، اس لیے کہ یہ چیزیں صوبائی حکومت کے تحت ہوتی ہیں جب کہ بینک سینٹرل حکومت کے تحت ہوتے ہیں۔

''**ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**'' (فتاوی شامی ۶/۳۸۵)۔

حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا:

اگر کوئی شخص کسی کے یہاں کام کرتا ہے اور کام حلال اور جائز کرتا ہے تو اس کے لیے وہاں سے اجرت لینا درست

ہے اور اس وقت اس تحقیق کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ پیسے جو تم مجھے اجرت میں دے رہے ہو حلال ہے یا حرام، اسی طرح اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کا مختلف قسم کا کاروبار ہے جس میں بعض حلال اور بعض حرام ہے اور اس کے یہاں نوکری کرنے کی صورت میں وہ حرام مال سے تنخواہ دینے کی صراحت نہیں کرتا ہے تو اس کے یہاں بھی نوکری کرنا درست ہوگا، لیکن اگر کسی کا مکمل کاروبار حرام ہو اس کے پاس مال حرام کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو تو اس کے یہاں ملازمت اور نوکری کرنا درست نہیں ہے، جس طرح ایسے شخص کی دعوت کھانا اور ہدیہ قبول کرنا درست نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں پر تنخواہ میں حرام مال کا ملنا متعین ہے۔

"**أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه وإن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات: ۵/۳۹۶)۔

حرام کمائی کرنے والے شخص کی گاڑی میں بیٹھنا:

اگر کسی شخص کا کاروبار حرام ہے تو اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا حرام نہیں ہے اور نہ ہی اس کی گاڑی پر بیٹھنا حرام ہے؛ بلکہ اس نیت سے بیٹھنا کہ شاید اچھے لوگوں کی صحبت کی بنا پر وہ حرام کام سے باز آجائے گا مستحسن بھی ہے، لیکن اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر اس کا مکمل مال حرام ہے تو اس کی گاڑی پر بیٹھنے کی وجہ سے اس کے ساتھ کھانے پینے کی نوبت نہ آئے، اس لیے کہ اگر اس کا تمام مال حرام ہے تو اس کا کھانا درست نہیں ہوگا اور دوسرے کی اصلاح کے چکر میں اپنے پیٹ میں حرام کا لقمہ ڈالنا کسی صورت میں جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر کسی شخص کا کاروبار حلال وحرام کا مخلوط ہے اور عموما ایسا ہی ہوتا ہے کہ کچھ جائز کاروبار بھی ہوتا ہے اور وہ اسکول یا مدرسہ میں بچے کو داخل کرتے وقت فیس ادا کرتا ہے اور مال حرام سے دینے کی صراحت نہیں کرتا ہے تو اس سے فیس کی رقم لینا درست ہے۔

"**إلا لحفظ المسجد أي: إلا إذا كانت الصناعة فيه لأجل حفظ المسجد لا للتكسب فإن الأمور بمقاصدها**" (الاشباہ والنظائر، القول فی احکام المسجد ۴/۵۶)۔

حرام کمائی والے شخص کے یہاں دعا کرنا:

دعا کی قبولیت کے لیے رزق کا حلال ہونا بہت ضروری ہے، بعض روایات میں ہے کہ جس شخص کی غذاء حلال نہ ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، دعا کی قبولیت میں رزق حلال کا بہت اثر ہوتا ہے، حضرت سعد ابن ابی وقاص نے حضور ﷺ

سے درخواست کی کہ میرے لیے دعا کیجئے کہ میں مستجاب الدعوات ہوجاؤں، آپ ﷺ فرمایا: ''سعد اپنی غذا کو حلال بناؤ مستجاب الدعوات ہوجاؤ گے''، یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مال حرام کی وجہ سے انسان فاسق ہوجاتا ہے اور فاسق کے حق میں دعا کی جاسکتی ہے؛ تاکہ اللہ تعالی اس کو حلال کی توفیق عطا فرمادے، اگر کسی شخص کی کمائی حرام کی ہو اور اس کے یہاں کوئی دعائیہ تقریب ہو مثلا بچے کے نام رکھائی کی تقریب ہے یا کسی دوسرے موقع پر دعا کرنے کے لیے وہ بلاتا ہے یا بچوں کو پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے، ظاہر ہے کہ ان کاموں میں کوئی قباحت نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں پر فاسق کے حق میں دعا کی جارہی ہے، یا فاسق کے معصوم بچوں کے حق میں دعا کی جارہی ہے، ظاہر ہے کہ بچے معصوم ہوتے ہیں، ان کے حق میں دعا کرنے میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہے، امام قرطبی نے لکھا ہے کہ جس شخص کی غذا حرام ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص اسی کا اہل ہے کہ اس کی دعا قبول نہ کی جائے، لیکن اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے اس کی دعا قبول کرلیں تو یہ ممکن اور جائز ہے، اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے:

''عن ابن عباس قال: تليت هذه الآية عند رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''يا أيها الناس كلوا مما فى الأرض حلالا طيبا'' (البقرۃ:۱۶۸) **فقام سعد بن أبى وقاص، فقال: يا رسول الله، ادع الله أن يجعلنى مستجاب الدعوة، فقال له النبى صلى الله عليه وسلم: يا سعد أطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة، والذى نفس محمد بيده، إن العبد ليقذف اللقمة الحرام فى جوفه ما يتقبل منه عمل أربعين يوما، وأيما عبد نبت لحمه من السحت والربا فالنار أولى به''** (المعجم الاوسط، حدیث نمبر:۶۴۹۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **''أيها الناس، إن الله طيب لا يقبل إلا طيبا، وإن الله أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين، فقال: ''يا أيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا، إنى بما تعملون عليم''** (المؤمنون:۵۱) **''وقال: يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم''** (البقرۃ:۱۷۲) **ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر، يمد يديه إلى السماء، يا رب، يا رب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذى بالحرام، فأنى يستجاب لذلك؟''** (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۰۱۵)۔

''وقوله عليه السلام (فأنى يستجاب لذلك) على جهة الاستبعاد، أى أنه ليس أهلا لإجابة دعائه لكن يجوز أن يستجيب الله له تفضلا ولطفا وكرما'' (تفسیر قرطبی ۱۲/۱۲۸)۔

☆☆☆

حلال وحرام کمائی سے متعلق بعض اہم مسائل

مفتی محمد جمیل اختر جلیلی ندوی ☆

اسلام میں حلال وحرام کے تعلق سے دوٹوک احکام موجود ہیں، حدیث میں ہے: ''**الحلال بین والحلام بین**'' تاہم بعض شکلیں ایسی معاشرہ میں رائج ہیں، جن کے تعلق سے صریح حکم کتابوں میں موجود نہیں ہے، جن کے تعلق سے غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے اس تعلق سے ایک سوال نامہ مرتب کر کے اہل علم کے خدمت میں ارسال کیا، انھیں سوالوں کا جواب یہاں پر پیش کیا جارہا ہے۔

جواب:(۱)

ایسے شخص کی کمائی حلال ہے؛ کیوں کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کے اندر دو چیزوں کی صلاحیت اور اس کی دو مختلف حیثیتیں ہوں، جیسے: ولایتِ نکاح کا ایک مسئلہ بیان کیا جاتا ہے کہ اگر کسی صغیرہ لڑکی کا ولی اس کا چچازاد بھائی ہو اور وہ چچازاد بھائی اپنی چچازاد بہن سے خود نکاح کرلے تو جائز ہے، یہاں اس کی دو حیثیتیں بتلائی گئی ہیں: ''**فیکون أصیلاً من جانب، ولیا من جانب آخر**'' (اللباب فی شرح الکتاب، کتاب النکاح: ۱/ ۲۵۹) (وہ ایک جانب سے اصیل (بذاتِ خود) ہوتا ہے، جب کہ دوسرے جانب (لڑکی کی جانب) سے وکیل)۔

اس طرح کی واضح مثال حدیث شریف میں وارد ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ''**أُتی النبی ﷺ بلحم، فقیل: تصدق علی بریرة، قال: هو لها صدقة، ولنا هدیة**'' (بخاری، باب قبول الهدیة، حدیث نمبر: ۲۵۷۷، نسائی، باب خیار الأمة، حدیث نمبر: ۳۴۴۷) (آں حضرت ﷺ کے پاس گوشت لایا گیا اور بتلایا گیا کہ یہ بریرہ کو صدقہ کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اس کے لئے صدقہ اور ہمارے لئے ہدیہ ہے)۔

اس حدیث کے ضمن میں علامہ نورالدین سندیؒ لکھتے ہیں: ''**ولنا هدیة) فبین أن العین الواحدة یختلف حکمها باختلاف جهات الملک**'' (حاشیۃ السندی علی النسائی: ۶/ ۱۶۲) ((اور ہمارے لئے ہدیہ ہے) اس میں واضح کیا

☆ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک

کہ عینِ واحد کا حکم جہتِ ملک کے اختلاف سے مختلف ہوتا ہے)۔

آپ ﷺ پر صدقہ حرام تھا، اسی لئے آپ صدقہ قبول نہیں کرتے تھے، حضرت بریرہؓ پر حرام نہیں تھا، اس لئے ان کے پاس صدقہ بھیجا گیا تھا، آں حضرت ﷺ کو گوشت کے اس صدقہ والے تحفہ کو پیش کیا گیا، جو اصل کے اعتبار سے آپ کے لئے درست نہیں تھا؛ لیکن آپ ﷺ نے جہتِ ملک کے بدلنے سے حکم کے بدلنے کی بات بتلائی اور فرمایا کہ یہ ہمارے حق میں (حضرت بریرہؓ کی طرف سے) ہدیہ ہے، علامہ عینیؒ لکھتے ہیں:

"المتصدق علیه زال عنها وصف الصدقة، وحلت لكل واحد ممن كانت الصدقة محرمة علیه (شرح أبی داود، باب فی فقیر یہدی إلی غنی من الصدقۃ، حدیث نمبر:۱۷۷۵):۶/۴۰۸) (متصدق علیہ سے صدقہ کی صفت ختم ہوگئی اور ہر اس شخص کے لئے جائز ہوگیا جس پر صدقہ حرام تھا)۔

مذکورہ مسئلہ کی مزید وضاحت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ایک فتوے سے ہورہی ہے: "**عن ابن مسعود أنه سئل عمن له جار یأكل الرباعلانية، ولایتحرج من مال خبیث یأخذه یدعوه إلی طعام، قال: أجیبوه، فإنما المهنألكم، والوزر علیه**" (جامع العلوم والحکم لابن رجب الحنبلی، ص:۱۷) (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا کہ جس کا پڑوسی علانیہ سود کھاتا ہو اور مال خبیث لینے میں ہچکچاتا نہ ہو، وہ (اگر) کھانے کی دعوت کرے (تو کیا کرنا چاہئے) انھوں نے جواب میں فرمایا: اسے جواب دو کہ تمہارے لئے خوش گوار ہے اور گناہ اُس پر ہے)۔

علامہ شامیؒ "منیۃ المفتی" کے حوالہ سے رقم طراز ہیں: "**مات رجل ویعلم الوارث أن أباه كان یكسب من حیث لا یحل ولكن لایعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الإرث، والأفضل أن یتورع ویتصدق بنیة خصماء أبیه**" (ردالمحتار، مطلب فیمن ورث مالا حراما:۷/۳۰۱) (ایک شخص کا انتقال ہوا، جس کے وارث جانتے ہیں کہ اس کے والد حرام طریقہ سے مال کماتا تھا؛ لیکن بعینہ اس حرام مال کے مالک کا پتہ نہیں کہ اس کو لوٹا سکیں، تو اس کے لئے یہ وراثت حلال ہے؛ تاہم افضل یہ ہے کہ اس مال سے احتیاط برتے اور صدقہ کردے)۔

مذکورہ عبارات سے یہ بات آشکار ہوگئی کہ اس کی کمائی حلال ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہذا ما عندی، واللہ أعلم بالصواب!

جواب:۲

سوال نمبر ایک کے جواب میں یہ بات گزر چکی ہے کہ ملکیت کے بدلنے سے مال کی حیثیت بدل جاتی ہے اور ایک حرام چیز حلال ہوجاتی ہے، اس سوال کا جواب بھی وہی ہے کہ اس کے لئے یہ جائیداد اور کرایہ حلال ہے، ایک تو انہی وجوہات

کی بنا پر، جوسوال نمبرایک کے جواب میں مذکور ہے، دوسرے اس لئے بھی کہ مال حرام کا ایک مصرف ''غرباء'' بھی ہیں؛ چنانچہ سود کے مصرف کے بارے میں استاذ محترم حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ لکھتے ہیں: ''غرباء ونادار حضرات اس رقم کے مستحق ہیں'' (کتاب الفتاوی: ۵/ ۳۲۲) اوراس حرام مال سے استفادہ کرنے والا سوال کی رو سے ''غریب'' ہے، لہٰذا اس کے لئے یہ حلال ہے، واللہ اعلم۔

جواب: ۳

اس سوال میں دو جزء ہیں:

پہلے جزء کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ کی دوصورتیں ہیں:

(الف) ماں یا بیوی کے پاس بقدر کفاف موجود ہو یا بقدر کفاف کا حصول بہ سہولت ہوسکتا ہو، ایسی صورت میں شوہر یا بیٹے کی کمائی کا استعمال درست نہیں، قرآن مجید میں ہے: ''يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ'' (البقرۃ: ۱۷۲)، اسی طرح نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''كل جسد نبت من سحت فالنار أولى به'' (کنزالعمال، حدیث نمبر: ۳۵۶۹۵، صحیح وضعیف الجامع الصغیر للألبانی، حدیث نمبر: ۴۵۱۹)، اس آیت وحدیث سے معلوم ہوا کہ حرام کھانا درست نہیں ہے۔

(ب) بقدر کفاف بھی نہیں ہے اور نہ سہولت کے ساتھ اس کا حصول ہوسکتا ہو، ایسی صورت میں بحالت مجبوری شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلاَّ مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ'' (الأنعام: ۱۱۹)، دوسری جگہ ہے: ''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلاَ عَادٍ فَلا إِثْمَ عَلَيْهِ'' (البقرۃ ۱۷۳)؛ البتہ ایسی صورت میں بھی دل سے ناپسندیدگی کا اظہار ہو اور حلال میسر ہونے کی صورت میں ترک حرام کا عزم ہو۔

جہاں تک دوسری بے جزء کا تعلق ہے تو اگرچہ بچہ کو حرام پیسے سے پڑھایا اور یہ درست نہیں تھا؛ لیکن اب بچہ جو کمائی کررہا ہے، وہ اس کی محنت کا عوض ہے؛ اس لئے اسکا کمایا ہوا پیسہ حلال ہے، فتاوی محمودیہ میں ہے:

سوال: علیم الدین نے بہت رشوت دے کر سرکاری ملازمت حاصل کی، اب اس ملازمت سے جو روپیہ کمایا ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟

جواب: اگر ملازمت کا کام جائز ہے تو اس ملازمت کی آمدنی، تنخواہ بھی جائز ہے، ابتداء اگر ملازمت حاصل کرنے کے لیے رشوت دی تو اس کی وجہ سے اس ملازمت کی آمدنی جو کہ درحقیقت خدمت ومحنت کا معاوضہ ہے، ناجائز نہیں، رشوت کا گناہ اس آمدنی تک نہیں پہنچا، فقط واللہ اعلم (فتاوی محمودیہ: باب الرشوۃ ۲۴/ ۲۲۶، ط: جامعہ فاروقیہ)۔

جواب:۴

ولیمہ کی دعوت قبول کرنا مشروع ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ لَمْ يُجِبِ الدّعْوَةَ، فَقَدْ عَصَى اللّهَ وَرَسُولَهُ'' (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۴۰۱، صحیح بخاری، حدیث نمبر:۵۱۷۷)، اب اس کے وجوب اور عدم وجوب میں اختلاف ہے؛ چنانچہ شوافع اس کو واجب کہتے ہیں، جب کہ احناف اسے سنت قرار دیتے ہیں، پھر اگر اس دعوت میں منکر کا ارتکاب کیا جارہا ہو تو شرکت سے رک جائے؛ کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''نهى رسول الله -صلى الله عليه وسلم- عن مطعمين عن الجلوس على مائدة يشرب عليها الخمر وأن يأكل الرجل وهو منبطح على بطنه'' (سنن أبی داود، حدیث نمبر:۳۷۷۶)، یہ تو دعوت کا عام حکم ہے۔

جہاں تک داعی کی کمائی کا تعلق ہے تو اگر یہ معلوم ہو کہ اس کی کمائی پوری کی پوری حرام ہے، یا کمائی کا غالب حصہ حرام ہے تو ایسی صورت میں نہ تو دعوت قبول کرے اور نہ کھائے، جیسا کہ اوپر ذکر کردہ حدیث سے معلوم ہورہا ہے کہ شراب والے دسترخوان پر بیٹھنے سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے، نیز قرآن مجید میں ہے: ''فلا تقعد بعد الذكرى مع القوم الظالمين'' (الأنعام:۶۸)، اسی طرح حدیث میں ہے: ''كل جسد نبت من سحت فالنار أولى به'' (کنز العمال، حدیث نمبر:۳۵۶۹۵، صحیح وضعیف الجامع الصغیر للألبانی، حدیث نمبر:۴۵۱۹)؛ لیکن اگر غالب مال حلال ہو تو پھر اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے اور وہاں کھایا بھی جاسکتا ہے؛ تاہم علماء وصلحاء کو ایسی دعوت سے بچنا اولیٰ ہے؛ تاکہ دوسروں کے دل میں اس کی شناعت بیٹھ سکے، ہندیہ میں ہے: ''أَهْدَى إلَى رَجُلٍ شَيْئًا أَوْ أَضَافَهُ إنْ كَانَ غَالِبُ مَالِهِ مِنْ الْحَلَالِ فَلَا بَأْسَ إلَّا أَنْ يَعْلَمَ بِأَنَّهُ حَرَامٌ ، فَإِنْ كَانَ الْغَالِبُ هُوَ الْحَرَامَ يَنْبَغِي أَنْ لَا يَقْبَلَ الْهَدِيَّةَ ، وَلَا يَأْكُلَ الطَّعَامَ إلَّا أَنْ يُخْبِرَهُ بِأَنَّهُ حَلَالٌ وَرِثْتُهُ أَوْ اسْتَقْرَضْتُهُ مِنْ رَجُلٍ، كَذَا فِي الْيَنَابِيعِ'' (فتاوی الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات:۵/۳۴۳)۔

جواب:۵

ہر شخص پر حلال کھانا واجب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ'' (المؤمنون:۵۱)، دوسری جگہ ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ'' (البقرۃ:۱۷۲)، حرام کھانے والے کے لئے جہنم کی وعید ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''إنه لا يربو لحم نبت من سحت إلا كانت النار أولى به'' (سنن الترمذی، حدیث نمبر:۵۵۸)، اب

اگر کوئی شخص جان بوجھ کر حرام مال کھاتا ہے تو وہ سخت گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کے لئے جہنم کی وعید ہے؛ لیکن اگر کسی نے عدم واقفیت کی وجہ سے حرام کھالیا تو اس کی تلافی کے لئے ذیل کے طریقے اختیار کرسکتا ہے:

۱) حرام غذا کو قئے کے ذریعہ سے باہر کردے، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا؛ چنانچہ روایت میں ہے: حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

''كانَ لأبی بَكْرٍ الصِّدِّيقِ غُلامٌ يُخرِجُ لَهُ الخَراجَ، وكانَ أَبو بَكْرٍ يَأْكُلُ مِنْ خَرَاجِهِ، فَجَاءَ يَومًا بِشَيءٍ، فَأَكَلَ مِنهُ أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ لَهُ الغُلامُ: تَدْرِی مَا هَذا؟ فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: ومَا هُوَ؟ قَالَ: كُنتُ تَكَهَّنْتُ لِإِنْسَانٍ فی الجاهِلِيَّةِ، ومَا أُحْسِنِ الكَهَانَةَ إِلا أَنِّی خَدَعْتُهُ، فَلَقِينی، فَأَعْطَانی بِذلكَ هَذَا الَّذِی أَكَلْتَ مِنْهُ، فَأَدْخَلَ أَبُو بَكْرٍ يَدَه، فَقَاءَ كُلَّ شَيءٍ فِی بَطْنِه'' (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۳۸۴۲)؛ لیکن اس میں تکلیف مالا یطاق ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلّف نہیں کیا ہے: ''لایکلف الله نفساً إلاوسعها''۔

۲) توبہ واستغفار کرے؛ کیوں کہ ایک گناہ کا سرزد ہوا ہے، گرچہ کہ ناواقفیت ہی میں سہی، اور اللہ تعالیٰ توبہ واستغفار سے گناہ کو دھل دیتے ہیں، قرآن مجید ہے: ''قُلْ يَعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُواْ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُواْ مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ'' (الزمر: ۵۳)۔

۳) جتنا کھانا کھایا ہے، اتنی قیمت اس تک پہنچادینا بہتر ہے، علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ''ولو أطعم المال لضيف لم يعلم بالظلم، ثم علم المالک فهل له مطالبة الضيف؟ على قولين: أحدهما: ليس له مطالبته .ومن قال: إن له مطالبته، لا يقول: إن أكله حرام، بل يقول: لا إثم عليه فی أكله، وإنما عليه أداء ثمنه، بمنزلة ما اشتراه'' (مجموع الفتاوی: ۲۹/۳۲۵)۔

جواب: ٦

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کے لئے کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں، ورنہ دنیا سے حرام وحلال کی تمیز ہی اٹھ جائے گی؛ اس لئے اس خیال سے رک جانا چاہئے؛ لیکن ایک صورت ایسی ہے، جس میں حرام مال دوسرے کے لئے حلال ہوجاتا ہے، وہ شکل یہ ہے کہ حرام مال کو کسی دوسرے شخص کو بغیر بتائے ہوئے دیدیا جائے، پھر وہ شخص اس حرام مال کو خرچ کرکے کوئی تیسرا کام کرلے، مثلاً: تجارت میں لگادے، یا کوئی بلڈنگ خرید لے اور اس کو کرایہ پر لگادے تو حرام مال سے کی ہوئی تجارت کا نفع اور حرام مال سے خرید کی ہوئی بلڈنگ کا کرایہ اس کے لئے حلال ہوگا، اب اگر یہ شخص حرام مال دینے والے کو اپنے منافع میں سے کچھ دیتا ہے تو اس کے لئے بھی حلال ہوگا اور وہ اس سے مستفید ہوسکتا ہے، علامہ مرغینانی لکھتے ہیں:

"**إذا غصب حنطة فزرعها، أو نواة فغرسها غير أن عند أبي يوسفؒ يباح الإنتفاع فيهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاک من كل وجه**" (ہدایہ، کتاب الغصب، فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب اشرفی دیوبند ۴/۷۷ ۳)۔

علامہ شامی رقم طراز ہیں:

"**إمرأة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصباً، أو اشترىٰ طعاماً، أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من ذلک والإثم على الزوج**" (شامی، کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع، زکریا ۹/ ۵۵۳-۵۵۴، کراچی ۶/ ۳۸۶)۔

جواب:۷

حرام کمائی کو صدقہ کر دینا ہی چاہئے؛ لیکن اگر وہ محتاج ہو تو اسے استعمال بھی کر سکتا ہے، جیسا کہ سوال نمبر (۲) کے جواب میں لکھا جا چکا ہے، یہاں مسئلہ یہ ہے کہ حرام کمائی صدقہ کر دینے کی صورت میں تجارت کے لئے قرض لینا ہوگا، یعنی وہ محتاج ہو جائے گا اور قرض حلال طریقہ پر (بلاسودی) ملنے کا امکان نہیں، ایسی صورت میں بدرجہ مجبوری حرام قرض ہی لینا ہوگا اور یہ اس کے لئے درست ہے، علامہ ابن نجیم لکھتے ہیں: "**يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" (الاشباہ والنظائر، القاعدۃ الخامسۃ، ۹۷)، پھر جب اس کے لئے حرام قرض لینے کی گنجائش ہے تو اپنے پاس موجود حرام پیسے کو ہی استعمال کر لینے کی بھی گنجائش ہونی چاہئے، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں: "**فإن كان محتاجاً إليه فله أن يأخذ بقدر حاجته ويتصدق في الباقي، فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه عيناً كان أو منفعة**" (اعلاء السنن، باب النہی عن مہر البغی وحلوان الکاہن: ۱۶/ ۱۹۵)۔

جواب:۸

ایسے شخص کو چاہئے کہ جتنی جلد ممکن ہو، دوسرا کام تلاش کر لے اور "آدھا تیتر، آدھا بٹیر" والے کام کو ترک کر دے؛ اس لئے کہ اسے حرام کام کے ساتھ بھی ملوث ہونا پڑتا ہے اور یہ تعاون علی الاثم ہے، جس سے بچنا ضروری ہے، اب رہا مسئلہ اس کی تنخواہ کا تو اگر حلال کام کے عوض کی ہے تو اس کے لئے بھی وہ حلال ہے اور اگر حرام کام اور حلال کام دونوں کا عوض ہو تو ایسی صورت میں حلال کام کے بقدر تنخواہ کا استعمال تو درست ہے؛ البتہ حرام کام کے عوض ملنے والی تنخواہ کو صدقہ کرنا ضروری ہوگا؛ تاکہ تنخواہ کے اندر جو خبث پیدا ہو گیا ہے، وہ ختم ہو جائے، دار العلوم دیوبند کے ایک فتوی میں ہے:

"اگر اس اسٹور میں فروخت کی جانے والی اکثر چیزیں از قبیل حلال ہیں، ضمناً کچھ حرام چیزیں بھی فروخت ہوتی

ہیں تو ایسی جگہ ملازمت کرنے کی گنجائش ہے، البتہ حرام چیزوں کا حساب کرنے کی وجہ سے ملنے والی تنخواہ میں جو خبث پیدا ہوا اس کے بقدر صدقہ کر دیا جائے'' (https://darulifta-deoband.com/home/ur/ halal- haram/ 53425)

جواب:۹

اس سوال کے اندر چار شقیں ہیں:

جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے تو اس میں کام کرنا درست ہے؛ البتہ بہتر ہے کہ کسی دوسری زمین پر کام کرے؛ کیوں کہ فی نفسہ زمین میں کوئی برائی نہیں ہے؛ بل کہ طریقۂ خرید میں ہے، جس کا ارتکاب زمین کے مالک نے کیا ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں گناہ بھی اسے ہی ملے گا، اس زمین پر کام کرنے والے کو نہیں، قرآن مجید میں ہے: ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى'' (الأنعام:۱۶۴)۔

رہی بات دوسری شق کی تو اگر حرام کمائی سے اجرت دے تو لینے کی گنجائش تو ہے؛ لیکن کراہت سے خالی نہیں؛ کیوں کہ اجرت تو محنت کی ہے اور یہ محنت جائز کام میں ہے، جو اس کے لئے جائز ہے؛ لیکن چوں کہ یہ اجرت اس پیسے سے دی جارہی ہے، جو حرام مال ہے؛ اس لئے کراہت ضرور آئے گی، عالم عرب کے مشہور عالم دین شیخ عثیمین لکھتے ہیں: ''**ما كان محرما لكسبه، فإنما إثمه على الكاسب لاعلى من أخذه بطريق مباح من الكاسب**'' (القول المفید علی کتاب التوحید، باب لا یرد من سأل اللہ: ۳/ ۱۱۲)۔

جہاں تک تیسری شق کی بات ہے تو اس میں بھی اصل گنجائش ہے؛ البتہ زجر وتوبیخ کے لئے نہ بیٹھنا ہی بہتر ہے اور اگر علاقہ کا صاحب علم مقتدا آدمی ہو، تو اسے بدرجۂ اولیٰ نہ بیٹھنا چاہئے، بنیادی وجہ وہی ہے، جو اوپر ذکر کیا گیا، یعنی گناہ اس کے مالک پر ہوگا، اس کے استعمال کرنے والے پر نہیں؛ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے ایک فتوی میں ہے:

سوال: ایک آدمی نے حرام مال سے گاڑی خریدی ہے، اب اس گاڑی پر مزدوری کر کے کمانا حلال ہے کہ حرام؟

اس گاڑی پر مزدوری کر کے جو کمائی کی جائے گی وہ حلال رہے گی، کوئی وہم نہ کریں، البتہ حرام مال سے گاڑی کا خریدنا یہ فعل ناجائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم، دارالافتاء، دارالعلوم دیوبند (دیکھئے: https://darulifta-deoband.com/home/ur/halal-haram/35480)

اس فتوی سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حرام کمائی سے خریدی ہوئی گاڑی پر مزدوری کر کے جو کمائی کی جائے گی، وہ حلال رہے گی تو پھر اس پر بیٹھ کر سفر کرنا کیسے نادرست ہوگا؟

اب رہی بات چوتھی شق، یعنی حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچہ کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا کیسا ہے؟ اس کا جواب بھی بالکل سیدھا ہے کہ اگر وہ بغیر کسی حلال وحرام کی صراحت کے فیس ادا کرے

تو اِدھر سے بھی بغیر کسی تحقیق کے لے لینی چاہئے؛ اس لئے کہ کھود کرید کرنا شرعی تعلیم کے مخالف ہے، جس کا اشارہ حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے ایک موقع سے فرمایا: ''**هلک المتنطعون**'' (صحیح مسلم، باب هلک المتنطعون، حدیث نمبر: ۲۶۷۰، متنطع کسے کہتے ہیں؟ امام خطابی لکھتے ہیں: ''**المتنطع: المتعمق فی الشیء المتکلف البحث عنه علی مذاهب أهل الکلام الداخلین فیما لا یعنیهم الخائضین فیما لا تبلغه عقولهم**'' (عون المعبود: ۱۲/ ۲۳۵)؛ اس لئے مذکورہ صورت میں تحقیق کی ضرورت نہیں؛ البتہ اگر یہ صراحت کر کے دے کہ یہ فیس حرام کمائی سے ہے تو پھر لینے سے احتراز کرنا چاہئے، ہذا ما عندی، واللہ اعلم بالصواب!

جواب: ۱۰

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ رشوت کسے کہا جاتا ہے؟ رشوت اس شئی کو کہا جاتا ہے، جو ابطالِ حق یا احقاقِ باطل کے لئے دیا جائے، یہ باجماع امت حرام ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''**لعن رسول الله ﷺ الراشی والمرتشی**'' (ابوداود، باب فی کراہیۃ الرشوۃ، حدیث نمبر: ۳۵۸۲، ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۳۶)، (اللہ کے رسول نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت بھیجی ہے)۔

لیکن اس حرمت سے اس شخص کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، جو اپنے حق کے حصول کے لئے رشوت دے، علامہ بغویؒ لکھتے ہیں: ''**فأما إذا أعطی المعطی لیتوصل به إلی حق، أو یدفع عن نفسه ظلماً، فلابأس**'' (شرح السنۃ، باب الرشوۃ والہدیۃ للقضاۃ والعمال، حدیث نمبر: ۲۴۹۳) (جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ معطی اپنے حق تک پہنچنے یا ظلم سے اپنے کو بچانے کے لئے رشوت دے تو اس میں کوئی حرج نہیں)۔

علامہ ابن ہمامؒ رشوت کی قسمیں تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**الرابع: مایدفع لدفع الخوف من المدفوع إلیه علی نفسه وماله حلال للدافع حرام علی الآخذ؛ لأن دفع الضرر عن المسلم واجب، ولایجوز أخذالمال لیفعل الواجب**'' (شرح فتح القدیر، کتاب أدب القاضی: ۷/ ۲۳۶، ردالمحتار، کتاب القضاء، مطلب فی الکلام علی الرشوۃ والہدیۃ: ۸/ ۳۴) (چوتھی قسم: جو مدفوع الیہ سے جان و مال پر خوف کو دور کرنے کے لئے دے، یہ دینے والے کے لئے جائز ہے، لینے والے کے لئے جائز نہیں؛ کیوں کہ مسلمان سے ضرر کو دور کرنا واجب ہے، اور واجب کی ادائے گی کے لئے مال لینا جائز نہیں (اس لئے رشوت لینا درست نہیں)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**إذادفع الرشوة لدفع الجورعن نفسه، أو أحد من أهل بیته، لم یأثم**''

(الفتاوی الہندیۃ، کتاب الہبۃ، الباب الحادی عشر فی المتفرقات: ۴/ ۴۰۳) (جب رشوت اپنے آپ یا اپنے گھر والوں سے ظلم کو دفع کرنے کے لئے دے تو وہ (دینے والا) گنہ گار نہیں ہوگا)۔

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ دفع ظلم اور حق کی وصولی کے لئے رشوت دینا جائز ہے، اب مذکورہ سوال کی دو صورتیں ہیں:

۱) نقشہ کی منظوری کے لئے جو رقم دی جاتی ہے، وہ حکومت کے اکاؤنٹ میں جاتی ہے۔

۲) وہ رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں نہیں جاتی؛ بل کہ متعلقہ افراد کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے۔

پہلی صورت میں سود کی رقم سے رشوت دے سکتے ہیں؛ کیوں کہ سود مال حرام ہے اور مال حرام کا حکم یہ ہے کہ اسے اس کے مالک تک پہنچا دیا جائے، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''**وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إِنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إِذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ**'' (شامی: ۹/ ۳۸۵) اور یہاں یہی کیا جا رہا ہے۔

دوسری صورت میں بھی سود کی رقم سے رشوت دینا درست ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں مال حرام کو اپنے اوپر استعمال کرنا نہیں پایا جا رہا ہے؛ بل کہ ایک رفاہی کام کی منظوری لی جا رہی ہے، اس کا استعمال نادرست اس وقت ہوتا، جب کہ انسان اپنی ذات کے لئے کرتا، یہاں اپنی ذات کے لئے سود کا استعمال نہیں پایا جا رہا ہے؛ اس لئے درست ہونا چاہئے، ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب!

جواب: ۱۱

امکان پر حکم نہیں لگایا جاتا ہے، حکم ہمیشہ یقین پر لگتا ہے؛ اسی تعلق سے حدیث ہے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص کو نماز میں کچھ (خروج ریح) محسوس ہو تو وہ کیا کرے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''**لا ينصرف حتى يسمع صوتا، أو يجد ريحا**'' (صحیح مسلم، باب الدلیل علی أن من تیقن الطہارۃ ثم شک فی الحدث فلہ أن یصلی بطہارتہ تلک، حدیث نمبر: ۸۰۴)۔

اس حدیث کی شرح میں امام نوویؒ لکھتے ہیں: ''**معناه يعلم وجود أحدهما، ولا يشترط السماع والشم بإجماع المسلمين، وهذا الحديث أصل من أصول الإسلام، وقاعدة عظيمة من قواعد الفقه، وهي أن الأشياء يحكم ببقائها على أصولها حتى يتيقن خلاف ذلك، ولا يضر الشك الطارء عليها**'' (شرح النووی علی صحیح مسلم: ۴/ ۴۹)۔

اس سے معلوم ہوا کہ امکان پر حکم نہیں لگایا جائے گا، اسی طرح یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ کسی چیز کے بارے میں بہت زیادہ کھود کرید نہیں کرنی چاہئے، آپ ﷺ ایسے یہودیوں سے قرض لیتے تھے، جن کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ سودی

کاروبار کرتے ہیں، اسی طرح بہت سارے غیر مسلموں سے ہدایا بھی لیتے تھے؛ لیکن کرید نہیں تھے؛ اس لئے ہمیں بھی کریدنے کی ضرورت نہیں اور یہ ہدایا ہمارے لئے درست بھی ہیں، یہ تو بات تھی فتوی کی؛ البتہ تقوی اس بات پر ہے کہ ایسوں سے ہدایا لینے میں پرہیز کیا جائے، واللہ اعلم بالصواب!

جواب: ۱۲

ایسے شخص کے بال بچوں کے لئے دعائے خیر وہدایت کی گنجائش ہے؛ چنانچہ روایتوں میں آتا ہے آپ ﷺ نے کفار کے حق میں دعا فرمائی ہے، بخاری میں ہے، حضرت مسروق فرماتے ہیں: ''**قال عبد الله: إن الله بعث محمدًا صلى الله عليه وسلم وقال: قل ما أسألكم عليه من أجر وما أنا من المتكلفين. فإن رسول الله صلى الله عليه وسلم لما رأى قريشًا استعصوا عليه قال: (اللهم أعنى عليهم بسبع كسبع يوسف) .فأخذتهم السنة حتى حصت كل شيء، حتى أكلوا العظام والجلود، فقال أحدهم: حتى أكلوا الجلود والميتة، وجعل يخرج من الأرض كهيئة الدخان، فأتاه أبو سفيان، فقال: أى محمد، إن قومك قد هلكوا، فادع الله أن يكشف عنهم، فدعا، ثم قال: (تعودون بعد هذا) .فى حديث منصور: ثم قرأ:} فارتقب يوم تأتى السماء بدخان مبين – إلى – عائدون .{أيكشف عذاب الآخرة؟ فقد مضى: الدخان، والبطشة، واللزام .وقال أحدهم: القمر .وقال الآخر: الروم**'' (صحیح البخاری، باب ثم تولوا عنہ وقالوا معلم مجنون، حدیث نمبر: ۴۸۲۴، ط: المکتبۃ السلفیۃ)۔

اسی طرح حضرت انسؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: ''**اسْتَسْقَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَقَاهُ يَهُودِيٌّ، فَقَال لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: جَمَّلَكَ اللَّهُ فَمَا رَأَى الشَّيْبَ حَتَّى مَاتَ**''(عمل الیوم واللیلۃ لابن السنی، ص: ۱۴۳)۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ کافروں کے حق میں خیر وہدایت کی دعا کی جاسکتی ہے، اسی طرح فاسق اور اس کی آل واولاد کے حق میں بھی دعا کی جاسکتی ہے، پھر یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی دعا کی بدولت اسے راہ راست پر لے آئے تو یہ ''**خیر من حمر النعم**'' ہوگا۔

☆☆☆

فقہ اسلامی میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مولانا محمد صابر حسین ندوی ☆

قرآن مجید کا بیان:

اسلام پاک، صاف ستھرا دین ہے، اس میں کسی بھی طرح کی مکروہ، ناپاک اور غلیظ شئی پسند نہیں کی جاتی، چنانچہ ایک مسلمان سے بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ پاک روزی روٹی کا اہتمام کرے، اسے وہ اتنا ہی اہم جانے جتنا ایک اللہ کی عبادت کرنا، روزہ رکھنا، حج کرنا اور جہاد کرنا ہے، حرام خوری کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید کا صاف اعلان ہے: ''**يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُواْ مِمَّا فِي الأَرْضِ حَلاَلاً طَيِّباً وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ، إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاء وَأَن تَقُولُواْ عَلَى اللهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ**'' (بقرۃ:۱۶۸-۱۶۹)(اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقین جانو کہ وہ تمہارے لیے ایک کھلا دشمن ہے، وہ تو تم کو یہ حکم دے گا کہ تم بدی اور بے حیائی کے کام کرو اور اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تمہیں علم نہیں ہے)۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نور اللہ مرقدہ پہلی آیت مبارکہ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''..... جو کچھ زمین میں پیدا ہوتا ہے، اس میں سے کھاؤ؛ بشرطیکہ وہ شرعاً حلال اور طیب ہو، نہ تو فی نفسہ حرام ہو، جیسے مردار اور خنزیر اور ما اھل بہ لغیر اللہ (جن جانوروں پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور اس کی قربت مقصود ان جانوروں کے ذبح سے ہو) اور نہ کسی امر عارضی سے اس میں حرمت آ گئی ہو، جیسے غصب، چوری، رشوت، سود کا مال کہ ان سب سے اجتناب ضروری ہے، اور شیطان کی پیروی ہرگز نہ کرو کہ جس کو چاہا حرام کر لیا؛ جیسے بتوں کے نام کے سانڈ وغیرہ اور جس کو چاہا حلال کر لیا؛ جیسے **ما اھل بہ لغیر اللہ وغیرہ**'' (تفسیر عثمانی: ص ۱۳)۔

فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی مدظلہ سورہ بقرہ: ۲۶۷ کی تشریح میں رقمطراز ہیں: ''طیب کے معنی عمدہ کے ہیں، ظاہری عمدگی یہ ہے کہ چیز اچھی ہو، خراب نہ ہو، معنوی عمدگی یہ ہے کہ حلال ہو اور مشتبہ نہ ہو، مفسرین نے

☆ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک

یہاں ''طیب'' سے حلال مراد لیا ہے کہ ایسا ہی مال صدقہ کیا جائے جو حلال ہو؛ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مالِ حلال ہی قبول فرماتے ہیں (سنن ترمذی، باب لاتقبل صلوٰۃ بغیر طہور، حدیث نمبر: ۱)؛ اسی لئے علماء کی رائے ہے کہ اگر کسی کے پاس کسی طرح حرام مال آ گیا تو اس کے مالک کو واپس کر دینا چاہئے، مالک کا پتہ نہ چلے تو غرباء پر بلا نیت ثواب خرچ کر دے، رشوت، بینک انٹرسٹ وغیرہ کی رقوم کا یہی حکم ہے، دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مادی اعتبار سے ''اچھا مال'' مراد ہے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہم جماعتِ انصار کے بارے میں نازل ہوئی، انصار کا معمول تھا کہ جب ان کے باغ میں کھجور کا پھل آتا تو ایک دو خوشے ''صُفہ'' (وہ سائبان جو مسجد نبوی سے متصل طالبانِ علم اور مہمانوں وغیرہ کے لئے بنایا گیا تھا) میں چھپر سے لٹکا دیتے؛ تاکہ اہل ضرورت کھائیں، بعض لوگ جن کو خیرات کی رغبت نہ ہوتی وہ خراب کھجوریں یہاں لٹکا دیتے، اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی (ترمذی، باب ومن سورۃ البقرۃ، حدیث نمبر: ۲۹۸۷)، اس روایت سے اس دوسرے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے، قرآن کا لفظ ''طیب'' دونوں معنوں کو شامل ہے'' (آسان تفسیر قرآن مجید)۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا: ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ'' (نساء:۲۹) (اے ایمان والو! آپس میں ناحق طریقہ پر ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ، سوائے اس کے کہ آپسی رضامندی سے تجارت ہو، (تو مضائقہ نہیں))، فقیہ العصر لکھتے ہیں: ناحق طریقہ ایک جامع لفظ ہے، جس میں کسبِ معاش اور حصولِ زر کی وہ تمام صورتیں آ گئیں، جن کو قرآن وحدیث میں منع کیا گیا ہے اور فقہاء اُمت نے جن کو تفصیل سے مرتب فرما دیا ہے۔

تجارت کے علاوہ لین دین کی اور بھی جائز صورتیں ہیں، جیسے: عاریت، ہبہ، صدقہ، میراث وغیرہ؛ لیکن چوں کہ تبادلۂ مال کی سب سے بنیادی اور ہر وقت پیش آنے والی صورت تجارت اور خرید وفروخت کی ہے؛ اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر فرمایا گیا--- اللہ تعالیٰ کے ارشاد نے واضح کر دیا کہ خرید وفروخت میں دونوں فریق کی رضامندی ضروری ہے، کسی فریق کو مجبور کر کے معاملہ طے کرنا درست نہیں؛ چنانچہ فقہاء نے خرید وفروخت اور تمام مالی معاملات کے لئے ایجاب وقبول کو ضروری قرار دیا ہے، جس سے فریقین کی رضامندی کا اظہار ہوتا ہے اور جبر واکراہ کے ساتھ ہونے والی خرید وفروخت کو نامعتبر قرار دیا ہے'' (الفقہ الاسلامی وأدلتہ: ۴/۳۶۰، دیکھئے: آسان تفسیر قرآن مجید)۔

رزق حلال کی فضیلت:

حضور ﷺ سے متعدد روایات ثابت ہیں جن میں حلال مال کی اہمیت وفضیلت بتلائی گئی ہیں، مثلاً حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت اُم عبداللہ رضی اللہ عنہا نے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں افطاری کے وقت

دودھ کا ایک پیالہ بھیجا، اس دن آپ ﷺ روزے سے تھے، سخت گرمی کا موسم اور طویل دن تھا، آپ ﷺ نے دودھ قاصد کو دیکر واپس بھیج دیا کہ یہ پوچھ کر آؤ کہ یہ دودھ تمہیں کہاں سے آیا ہے؟ حضرت ام عبداللہ رضی اللہ عنھا نے بتایا کہ یہ دودھ میری بکری سے حاصل ہوا ہے، قاصد نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر بتایا، تو آپ ﷺ نے قاصد کو دوبارہ واپس بھیجا کہ یہ معلوم کرو کہ وہ بکری تجھے کہاں سے ملی ہے؟

حضرت ام عبداللہ رضی اللہ عنھا نے بتایا کہ وہ بکری میں نے خریدی ہے، تب آپ ﷺ نے وہ دودھ پی لیا، دوسرے دن حضرت اُم عبداللہ رضی اللہ عنھا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے سخت گرمی اور لمبے دن کی وجہ سے آپ کی خدمت میں دودھ بھیجا تھا، مگر آپ ﷺ نے واپس کر دیا؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رسولوں (علیھم السلام) کو یہی حکم ہے کہ سوائے پاکیزہ چیز کے کچھ نہ کھاؤ اور سوائے نیک عمل کے کچھ نہ کرو (مستدرک، ۴/ ۴۰۔ معجم کبیر طبرانی ۲۵/ ۱۷۴)۔

حرام مال کی لعنت:

اسی طرح حرام کمائی لعنت بھی خوب وارد ہوئی ہیں، ان نصوص کو بغور پڑھیں:

(۱) رشوت سے کی گئی کمائی حرام مال ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے، دینے اور ثالث بننے والوں پر لعنت فرمائی ہے: "**لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي والرائش**" (مسند احمد: ۵/ ۲۷۹، مسند بزار: ۱۳۵۳، طبرانی کبیر: ۱۴۱۵، مستدرک حاکم: ۴/ ۱۱۵)، غور کرنے کی بات ہے کہ جس ذات اقدس ﷺ نے دشمنوں کے حق میں بھی دعائے خیر ہی کی ہو، اس ذات مکرم ﷺ کا کسی شخص پر لعنت بھیجنا معمولی بات نہیں۔

(۲) حرام کھانے والے مؤمن کی عبادت قبول نہیں ہوتی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو حرام کا لقمہ کھائے گا، اس کی چالیس راتوں کی نماز قبول نہ ہوگی: "**من أكل لقمة من حرام لم يقبل منه صلاة أربعين ليلة**" (مسند الفردوس: ۳/ ۱۹۵، حدیث نمبر: ۳۵۸۵)۔

واضح رہے کہ حدیث میں قبول نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اعمال کے قبول ہونے پر جو اجر وثواب ملتا وہ نہیں ملے گا؛ البتہ ذمہ سے فرض ساقط ہوجائے گا، مثلاً نماز اِس حالت میں پڑھ لی تو اس پر ادائیگی کا حکم ہوگا، اس کا لوٹانا واجب نہ ہوگا، "**عن ابن عباس قال: تليت هذه الآية عند رسول الله صلى الله عليه وسلم: {يا أيها الناس كلوا مما في الأرض حلالا طيبا} فقام سعد بن أبي وقاص، فقال: يا رسول الله، ادع الله أن يجعلني مستجاب الدعوة، فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: يا سعد أطب مطعمك تكن مستجاب الدعوة، والذي**

نفس محمد بيده، إن العبد ليقذف اللقمة الحرام في جوفه ما يتقبل منه عمل أربعين يوما، وأيما عبد نبت لحمه من السحت والربا فالنار أولى به'' (المعجم الاوسط، رقم:۶۴۹۵)۔

(۳) ایسے مؤمن کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا کھانا، پینا اور پہننا حرام ہو اس کی دعا بھلا کیوں کر قبول ہونے لگی:''**ومطعمه حرام، ومشربه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فأنی یستجاب لذلک**'' (صحیح مسلم:۱۰۵۱)۔

مشتبہ مال سے بھی پرہیز:

جس طرح حرام سے بچنا ضروری ہے، اسی طرح شک وشبہ کی کمائی اور مشکوک مال سے بھی بچنا ضروری ہے، چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا'' حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور اس حلال وحرام کے بیچ میں بعض شبہ والی چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ آیا وہ حلال ہے یا حرام ہے، جو بعض شک وشبہ والی چیزوں سے بچا، اس نے اپنے دین (عزت کو) بچالیا، اور جو ان شبہ والی چیزوں میں پڑ گیا تو اسکی مثال اس چرواہے جیسی ہے جو شاہی چراگاہ کے پاس اپنے جانوروں کو چرائے، قریب ہے کہ کوئی جانور اس میں گھس جائے، خبردار، ہر ایک بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہے، جس میں دوسرے کے جانوروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، سُن لو! اللہ تعالی کی چراگاہ میں یعنی اس کی زمین، اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں، خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہا تو سارا جسم درست رہا، اور جب وہ خراب ہو گیا تو سارا جسم خراب ہو گیا، سُن لو وہ دل ہے'' (صحیح بخاری:۲۰۵۱)۔

حرام مال کا مصرف:

اگر کسی کے پاس حرام مال ہو تو اس کا مصرف کیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں کچھ بنیادی باتیں سامنے رہنی چاہئیں!

۱۔ شریعت مطہرہ کی رو سے انسان کسی کے مال کا مالک تبھی بن سکتا ہے جب اسے جائز طریقے پر حاصل کیا گیا ہو، اگر ناجائز طریقے پر مال کمایا گیا ہے تو وہ اس کا مالک نہیں بن سکتا، قرآن مجید موجود: ''**اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ**'' (نساء:۲۹) سے یہی مراد ہے۔

۲۔ اب جب کسی مال پر ملکیت حلال ہونا شرط ہے تو ایسے میں حرام مال کو اصل مالک کی طرف لوٹانا ضروری ہے، اس کے بغیر معافی نہیں ہوگی اور اگر صاحب حق انتقال کر چکا ہو تو اس کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے؛ لیکن اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو پھر اس مال کو بلا نیت ثواب فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنا ضروری ہے:''**ويتصدق بلا نية ثواب إنما ينو**

به برائة الذمة" (الموسوعۃ الفقھیۃ:۲۲/۱۱۵)،فتاوی ہندیہ میں ہے:"**والسبیل فی المعاصی ردها وذلک هاهنا برد المأخوذ إن تمکن من رده بأن عرف صاحبه وبالتصدق به إن لم یعرفه لیصل إلیه نفع ماله إن کان لا یصل إلیه عین ماله**" (الفتاوی الہندیۃ۵/۳۴۹)۔

۳۔فقہاء کرام نے یہ بات بھی بتائی ہے کہ صاحب مال تک مال لوٹانے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ اسے بیت المال میں جمع کروادے، جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ابن اللتبیۃ کو جبکہ انہوں نے غلط طریقے سے مال حاصل کیا تھا،تو بیت المال میں جمع کرنے کا حکم دیا تھا،انہیں مالک تک پہونچانے کا مکلّف نہیں بنایا:"**ویحتمل أن یجعلها فی بیت المال لأن النبی ﷺ لم یأمر ابن اللتبیة بردها إلی أربابها**" (مغنی مع الشرح الکبیر:۱۴/۵۹)،یعنی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس حرام مال کو بیت المال میں جمع کرادے،یہی اس کے توبہ کرنے کی صورت مانی جائے گی۔

غرض یہ کہ حرام مال کو بالترتیب خرچ کیا جائے گا، پہلے مرحلہ میں اس مال کو مالک تک پہونچانے کی کوشش کی جائے گی، دوسرے مرحلہ میں اگر کسی بنا پر مالک کی خبر نہ ہونے پائے ،تو ایسے میں اس مال کو بیت المال میں جمع کرادے، تیسرے مرحلہ میں اس مال کو بغیر نیت ثواب صدقہ کردے، فقہ حنفی کے ممتاز فقیہ علامہ ابن عابدین شامی نے یہی لکھا ہے: "**لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه قوله وهو حرام مطلقا علی الوارثة أی سواء علموا أربابا أو لا، فإن علم أربابه ردوه علیهم و إلا تصدقوه**" (ردالمحتار:۵/۲۷۳)،فصل فی البیع)۔

بیت المال اور زمانہ حاضر:

یہاں یہ ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال خلافت اسلامی کا ایک اہم جزو ہے، یہ اجتماعیت کو برقرار رکھنے اور عوام کی معاونت کا اہم ذریعہ ہے،اس کا ایک خاص نظام ہوتا ہے، جو امیر المؤمنین کی نگرانی میں چلتا ہے؛ لیکن موجودہ دور میں بالخصوص بھارت جیسے مسلم اقلیت ممالک میں بیت المال کا وجود نہیں،اگرچہ صوبائی یا ضلعی اور علاقائی سطح پر منفرد کوششیں ہوتی ہیں،مگر وہ شرعی بیت المال کی حیثیت نہیں رکھتے ،بہتر ہے کہ مسلمانوں کا ایک متحدہ بیت المال ہو، اور اجتماعیت کی دیکھ ریکھ کا فریضہ انجام دیا جائے ؛ تاہم راقم الحروف کا خیال ہے کہ اگر کوئی کسی رفاہی فاؤنڈیشن، مدارس یا محلے کے منتظمہ اداروں پر اعتماد کرتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ اس کی جانب سے دی گئی رقم مستحقین تک پہونچادی جائے گی،تو انہیں ان اداروں کو متعینہ رقوم دینے کی اجازت ہوگی، بدیگر صورت ضروری ہے کہ وہ خود بغیر نیت ثواب حاجت مندوں تک پہنچادے۔

۴۔اگر کسی شخص نے حرام مال کی طرف اشارہ کرکے کوئی چیز خریدی ہو اور ادائیگی بھی اس مشارالیہ حرام مال سے کی

ہوتو ایسی صورت میں اصل مال حرام کی طرح اس کی آمدنی بھی حرام ہے اور دونوں کا بغیر نیت ثواب کے فقرا پر صدقہ کرنا واجب ہوگا، لیکن اگر مال حرام کی طرف اشارہ کیے بغیر اس مال سے کچھ خریدا تو اس صورت میں کمائے ہوئے نفع کو استعمال کرنے کی گنجائش ہے، تاہم اصل مال حرام کا صدقہ کرنا پھر بھی لازم ہے۔

۵۔ اگر حرام رقم سے گھر وغیرہ کی تعمیر کی ہوتو توبہ کر کے جتنا حرام پیسہ اس میں استعمال کیا ہے حساب لگا کر اتنی ہی رقم اصل مالک کو لوٹا دے، لیکن اگر اصل مالک معلوم نہ ہوتو حرام مال کے بقدر رقم بلا نیت ثواب فقرا اور مساکین پر صدقہ کرے۔

"(لو تصرف فی المغصوب والوديعة) بأن باعه (وربح) فيه (إذا كان) ذلک (متعينا بالإشارة أو بالشراء بدراهم الوديعة أو الغصب ونقدها) يعنی يتصدق بربح حصل فيهما إذا كانا مما يتعين بالإشارة وإن كانا مما لا يتعين فعلى أربعة أوجه فإن أشار إليها ونقدها فكذلک يتصدق (وإن أشار إليها ونقد غيرها أو) أشار (إلى غيرها) ونقدها (أو أطلق) ولم يشر (ونقدها لا) يتصدق فی الصور الثلاث عند الكرخی قيل (وبه يفتی)" (الدر المختار، کتاب الغصب ۶/۱۸۹)۔

لاعلمی میں حرام مال کھالے:

لاعلمی میں حرام مال کھالے یا اپنے اسلاف کی کمائی کے تعلق سے شکوک وشبہ ہوتو صدقہ وخیرات کرے؛ لیکن بلا وجہ وساوس میں پڑ کر اپنی زندگی حرام نہ کرے، ایک حد تک تحقیق کرے؛ لیکن اگر کچھ وضاحت نہ ہوتی ہو جن کا کہ اعتبار کیا جا سکے تو اسے ترک کر دے، زیادہ سے زیادہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ سچے دل سے توبہ واستغفار کرے اور کچھ صدقہ بھی نکال دے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے، روایت میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے تاجروں کی جماعت! بے شک خرید وفروخت کے وقت غلط بیانی، یا غیر واقعی قسمیں شامل ہوجاتی ہیں (جن کی وجہ سے کمائی مکمل حلال نہیں ہوتی، آمدنی مشکوک ہوجاتی ہے)، لہٰذا اسے صدقہ سے ملا لیا کرو، (یعنی صدقہ نکالا کرو؛ تاکہ جتنا حصہ آمدنی کا مشکوک ہو صدقے سے اس کا اثر اور اللہ تعالیٰ کا غضب ٹھنڈا ہوجائے)"۔

عن قيس بن أبی غرزة قال: كنا نسمی فی عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم "السماسرة"، فمر بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمانا باسم هو أحسن منه، فقال: يا معشر التجار! ان البيع يحضره اللغو والحلف، فشوبوه بالصدقة" (سنن ابی داود: کتاب البیوع فی التجارۃ یخالطھا الحلف واللغو: ۳۳۲۶، سنن الترمذی: ۱۲۵۰)۔

کل جائیداد حرام ہو؟:

اگر کمائی مکمل طور پر حرام تھی، یا اس کا اکثر حصہ حرام تھا، تو اس مکان سے حاصل ہونے والا کرایہ بھی حرام ہے، اور اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ خواہ ورثاء ہی کیوں نہ ہوں، انہیں چاہئے کہ اس مال کو مستحق تک لوٹائیں، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**إن اللـه إذا حـرم شيـئـا حرم ثمنـه**'' (سنن ابی داود' البیوع' باب فی ثمن الخمر والمیتۃ' ح ۳۴۸۸ ومسند احمد: ۱/ ۲۴۷، ودار قطنی: ۳/ ۷ ح: ۲۷۹۱ واللفظ لہ) (بیشک اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی قیمت کو بھی حرام قرار دے دیتا ہے)، علامہ شامی لکھتے ہیں: ''**كما لو غصب عبدا و آجره، فنقص في هذه الإجارة بالاستعمال و هذا ساقط من نسخ الشرح لدخوله تحت قوله، و إن استغله فنقصه الاستغلال، أو آجر المستعار و نقص، ضمن النقصان، و تصدق بنا بقي من الغلة و الأجرة**'' (ردالمحتار: ۶/ ۱۸۸)۔

مگر کوئی شخص غریب ہو تو اس کیلئے جائز ہوگا کہ وہ بقدر ضرورت اس مال کو استعمال کرے، اس لئے کہ کسی کو غربت میں چھوڑنا اور اپنے کو غربت سے آزمانا مناسب نہیں، بالخصوص اس دور میں جب بیت المال کا کوئی وجود نہیں اور ایمان پر گھنے بادل منڈلا رہے ہوں، یہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی صریح مخالفت ہوگی: ''**كاد الفقر أن يكون كفرا و كاد الحسد أن يغلب القدر**'' (شعب الایمان للبیہقی: ۶۶۱۲)۔

چنانچہ بنوری ٹاون نے ایک اہم استفتا کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے: ''واضح رہے کہ اگر کسی کے پاس کسی بھی طریقے سے حرام مال آ گیا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو اور وہ بلا عوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے: سود، چوری، رشوت وغیرہ تو اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی وہ جہاں سے آیا ہے وہیں اسے واپس دے دیا جائے، مالک وفات پا چکا ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹا دیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے مستحقِ زکاۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ بالعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے حرام ملازمت وغیرہ کے ذریعے تو اسے مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کا یہی ایک مصرف ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دیا جائے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں کسی غریب شخص نے جوا وغیرہ کھیل کر یا اپنے کسی ناجائز کسب سے حرام مال حاصل کیا ہو، تو اس پر ضروری ہے کہ مستحق لوگوں میں ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دے، خود استعمال نہ کرے، ہاں جو حرام مال اس کے کسب کے بغیر حاصل ہوا سے اس کے مالکان کی طرف لوٹانے کی کوشش کرے، اگر مالکان کو لوٹانا ممکن نہ ہو اور خود مستحق ہو تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے''۔

حرام مال کوحلال کرنے کی صورت:

حرام وحلال واضح ہیں، حرام کوحلال نہیں کیا جاسکتا، یہ شریعت کے ساتھ کھلواڑ ہے، سورہ تحریم کی یہ آیت بڑی جامع ہے: ''يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ'' (تحریم:۱)، مال حرام کے تعلق سے اسے مالک تک لوٹانا، صدقہ کرنا اور توبہ کرنا ضروری ہے، جو حضرات اس سلسلہ میں حیلہ کی گنجائش سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی نادار وفقیر کو دے کر واپس لے لیا جائے یہ مناسب نہیں لگتا، یہ ظلم کے مترادف ہے، غرباء وفقراء کا حق مارنا ہے جو ظلم ہے، واللہ اعلم۔

اپنے حرام مال سے قرض:

موجودہ صورتحال کو سامنے رکھا جائے تو یہ صورت واقعی قابل توجہ ہے کہ کسی کے پاس حرام مال ہو اور حلال مال نہ ملتا ہو؛ خواہ وہ قرض کی شکل میں ہو تو خود اسے قرض لے کر تجارت کرے اور پھر منافع پانے کے بعد اس قرض کو فقراء میں تقسیم کردے؟ اس مسئلہ کو تین صورتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

پہلی صورت: اگر کوئی شخص غریب ہے، مستحق زکات ہے تو پھر جو کچھ اس کے پاس حرام مال ہے وہ خود اس کا مستحق ہوجائے گا، پھر وہ چاہے تو اسے اپنے اوپر خرچ کرے اور تجارت کرے۔

دوسری صورت: ایک آدمی غریب تو نہیں ہے؛ لیکن وہ اتنا متمول بھی نہیں ہے کہ انویسٹ کرے، تجارت اور کاروبار میں پیسے لگائے، حلال روزی روٹی کا بندوبست کرے؛ نیز سرکاری لون سود پر ملتا ہو، دوست واحباب سے قرض لینا مشکل ہو تو اپنی معاشی حالت اور موجودہ صورتحال کو دیکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس حرام مال کو بطور قرض استعمال کرلے، مگر دو باتیں ضروری ہیں: پہلی بات یہ کہ وہ بقدر ضرورت مال استعمال کرے، دوسری بات یہ کہ اس قرض کو اپنی وصیت میں لکھ جائے؛ تاکہ اگر کہیں اس کا انتقال ہوجائے تو پھر ورثاء اس مال کو مستحقین تک لوٹا دیں۔

تیسری صورت: ایک شخص متمول ہے، تجارت کو محض منافع کی شرح بڑھانا ہو تو حرام مال کو استعمال کرنا جائز نہیں، یہ جرأت کی بات ہوگی، احکام الٰہی پر اپنی من مانی کرنے اور اپنی خواہشات کی اتباع کرنے کا جرم ہوگا، یہ دنیاوی واخروی اعتبار سے خسارے کا باعث ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم

حرام مال میں اغلب کا اعتبار ہے:

حرام اور حلال جب مخلوط ہوجائیں اور ان میں امتیاز مشکل ہوجائے تو اس سلسلہ میں اصولی بات یہی ہے کہ اغلب

پر حکم لگایا جائے گا، اگر کسی شخص کی آمدنی کا اکثر حصہ حلال ہے تو پھر حرام آمدنی کو برداشت کرتے ہوئے اس کے ساتھ معاملات کئے جاسکتے ہیں، مگر ضروری ہے کہ یہ معاملات حرام ذرائع سے تعلق نہ رکھتی ہو، مثلاً ایک آدمی شراب بھی بیچتا ہے اور دودھ بھی، اگر دونوں معاملے الگ الگ ہیں تو اس کے ساتھ تجارت کرنے والے کو احتیاط لازم ہے، اگر مخلوط ہو تب بھی تقوی کا تقاضہ یہی ہے کہ احتیاط کرے؛ لیکن اگر اغلب کے حسن ظن پر معاملہ کرلے تو گنجائش ہے۔

نیز اگر کوئی شخص دعوت دے جس کی کمائی کا اکثر و بیشتر حصہ حرام پر موقوف ہو، تو ایسے میں ان کی دعوت قبول نہ کی جائے گی، ان کا کوئی تحفہ بھی قبول نہ کیا جائے گا؛ البتہ حرام وحلال دونوں قسم کے مال جمع ہوجائیں اور غالب گمان ہو کہ دعوت حلال مال سے ہوگی، تو دعوت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**آكل الربا و كاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذالک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه و إن كان غالب ماله حلال لا بأس بقبول هديته والأكل منها**'' (فتاوی ہندیہ: ۸/ ۳۴۳، کتاب الکراھیۃ)، (سود یا کسی حرام ذریعے سے کمائے ہوئے مال کی دعوت اور ہدیہ کو قبول کرنا جائز نہیں، جبکہ اس مال کا اکثر حصہ حرام پر موقوف ہو، چنانچہ جب تک معلوم نہ ہوجائے کہ دعوت میں خرچ کئے گئے مال کی اصل حلال ہے، خواہ وہ وراثت یا قرضہ کے طریق سے ہو تو پھر اس کی دعوت وہدیہ کو قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

''**وفی الاشباه والنظائر لابن نجيم : إذا كان غالب مال المهدى حلالا، فلا باس بقبول هديته، وأكل ماله مالم يتبين أنه من حرام، وإن كان غالب ماله الحرام لايقبلها، ولايأكل اھ**'' (ج۱/ ۱۱۲)۔

شافعیہ میں سے علامہ قلیوبی نے بھی یہی نقل کیا ہے: ''**لا يحرم الأكل ،والمعاملة ولا أخذ الصدقة والهدية، ممن أكثر ماله حلال، إلا مما علم حرمته ولا يخفى الورع**'' (حاشیتا قلیوبی وعمیرۃ: ۴/ ۲۶۳)۔

شیخ ابن باز کا بھی یہی فتوی ہے اور انہوں نے یہاں تک نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے یہودی سے معاملہ کیا تھا، جو اپنے اعتقاد پر تھے، لیکن ان کا مال مخلوط تھا، چنانچہ جن کا مال مخلوط ہو ان سے معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (مجموع فتاوی ابن باز: ۱۹/ ۱۹۶)، واللہ اعلم بالصواب۔

منافع حلال ہیں:

اسی طرح جائیداد میں حرام مال پانے والے کے یہاں کھیتی کرنا، نوکری کرنا، اس کے بائک پر بیٹھنا، نیز حرام مال کمانے والے کے بچے سے مدرسہ کی فیس لینا وغیرہ جائز ہے، اس لئے کہ اگرچہ اس کا مال حرام ہے؛ لیکن اس کی اجرت حلال عمل پر مبنی ہے، اسی پس منظر میں فقہاء نے لکھا ہے: ''**والأجر يطيب و إن كان السبب حراماً**'' (ردالمحتار: ۹/ ۶۲۔ کتاب

الاجارۃ، باب اجارۃ الفاسد)، منافع حلال کے تعلق سے فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**غصب حانوتا واتجر فيه وربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردري**'' (الفتاوی الھندیۃ: کتاب الغصب، الباب الثامن، ۵/ ۱۴۲)۔

رشوت میں سود کی رقم دینا:

رشوت لینا، دینا اور اس میں معاون بننا سب حرام ہے، امام ابوداؤد سجستانیؒ نے حضور ﷺ کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے: ''**عن أبي سلمة، عن عبد الله بن عمرو، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي**'' (۳/ ۳۰۰، کتاب الأقضیۃ، باب فی کراھیۃ الرشوۃ، رقم الحدیث: ۳۵۸۰، ط: المکتبۃ العصریۃ) مگر جب انسان مجبور، اپنا حق حاصل کرنا ہو تو رشوت دینے کی گنجائش ہے، اس لئے کہ وہ مجبور اور مضطر ہے، فتاوی شامی میں ہے: ''**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع**'' (۶/ ۴۲۳، کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع، ط: سعید)۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی جائز کام تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے اور حق ثابت ہونے کے باوجود صرف رشوت نہ دینے کی وجہ سے نہ ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں حق دار شخص کو چاہیے کہ اولاً وہ اپنی پوری کوشش کرے کہ رشوت دیے بغیر کسی طرح اس کا کام ہو جائے، لیکن اگر شدید ضرورت ہو اور کوئی دوسرا متبادل راستہ نہ ہو تو اپنے جائز ثابت شدہ حق کے حصول کے لیے مجبوراً رشوت دینے کی صورت میں دینے والا گناہ گار نہ ہوگا، البتہ رشوت لینے والے شخص کے حق میں رشوت کی وہ رقم ناجائز ہی رہے گی اور اسے اس رشوت لینے کا سخت گناہ ملے گا۔

مرقاۃ المفاتیح میں ہے: ''**وعن عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما): بالواو (قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشي والمرتشي): أي: معطي الرشوة وآخذها، وهي الوصلة إلى الحاجة بالمصانعة، وأصله من الرشاء الذي يتوصل به إلى الماء، قيل: الرشوة ما يعطى لإبطال حق، أو لإحقاق باطل، أما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق، أو ليدفع به عن نفسه ظلماً فلا بأس به، وكذا الآخذ إذا أخذ ليسعى في إصابة صاحب الحق فلا بأس به، لكن هذا ينبغي أن يكون في غير القضاة والولاة؛ لأن السعي في إصابة الحق إلى مستحقه، ودفع الظالم عن المظلوم واجب عليهم، فلايجوز لهم الأخذ عليه**'' (کتاب الأمارۃ والقضاء، باب رزق الولاۃ وھدایاھم، الفصل الثانی، ج: ۷/ ۲۹۵، ط: دار الکتب العلمیۃ) فقط واللہ اعلم

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سود کا مال بطور رشوت دے سکتے کہ نہیں؟ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سود حرام ہے، قرآن نے صاف اعلان کیا ''**احل الله البيع احرم الربا**'' (بقرۃ: ۲۷۵)، چنانچہ سود کے کسی بھی معاملہ میں معاون بننا حرام ہے،

اسی طرح سود کی رقم کا حکم یہ ہے کہ جہاں سے ملی ہے وہیں واپس کردی جائے ، اگر یہ ممکن نہ ہوتو غریب مسلمان کو بلا نیت ثواب دینا ضروری ہے، اب ایسے میں اسے رشوت کے طور پر کسی سرکاری افسر وغیرہ کو نہیں دے سکتے ؛ کیونکہ سود کی رقم بینک یا سرکاری ادارے سے حاصل ہوئی ہے، اگر وہیں یہ مال پہنچے تو الگ بات ہے ؛ لیکن یہاں پر دی جانے والی رقم ایک عام سرکاری کام کاج کرنے والے کی جیب میں جارہی ہے۔

علامہ شامی سے منقول یہ مختلف عبارتیں مطالعہ کیجئے ،جن میں گویا شرعی اصول بتلادئے گئے ہیں: ''**ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه** (ردالمحتار:۶/ ۳۸۵،کراچی)، ''**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع**'' (ردالمحتار:۶/ ۴۲۳،بیروت)،''**الثالث: أخذ المال ليسوى أمره عند السلطان دفعًا للضرر أو جلبًا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط**''(ردالمحتار:۸/ ۳۴،زکریا)۔

اسی طرح دارالعلوم دیوبند نے اپنے فتوی میں لکھا ہے: ''رشوت میں سود کی رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ سود کی رقم یا تو مالک (بینک یا حکومت وغیرہ) کو لوٹانا ضروری ہے یا پھر غریبوں مسکینوں کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے، رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضہ میں نہیں جاتی؛ بلکہ افسران کے جیب میں جاتی ہے''۔

ان فتاوی کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدارس یا دوسری عمارتوں کا نقشہ پاس کروانے کیلئے افسران کو سود کی رقم بطور رشوت نہ دی جائے ،خصوصاً اہل مدارس اور اصحاب علم دین کو اس سے مزید بچنا چاہئے تاکہ عوام میں سود اور رشوت دونوں کی شناعت بیٹھ جائے؛ نیز ان فرمان الٰہی کو سامنے رکھنا چاہے: ''**وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجعَل لَهُ مَخرَجًا ، وَيَرزُقهُ مِن حَيثُ لا يَحتَسِبُ وَمَن يَتَوَكَّل عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسبُهُ إِنَّ اللَّهَ بـٰلِغُ أَمرِهِ قَد جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيءٍ قَدرًا.....**'' (سورۃ الطلاق)، (اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ اس کے لیے (رنج ومحن سے) نجات کی صورت پیدا کردے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کردیتا ہے 'اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کررکھا ہے)، اور فرمایا: ''**وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجعَل لَهُ مِن أَمرِهِ يُسرا ...**'' (سورۃ الطلاق)،(اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے کام میں سہولت پیدا کرے گا)،ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

حرام کمائی کرنے والے کے گھر دعا کرنا:

شریعت میں اس کی اجازت ہے کہ کسی سے ترغیب وترہیب کے طور پر قطع تعلق کرلیا جائے ،مگر یہ کوئی قطعی بات

نہیں ہے، اصل اور اصولی طور پر یہ دیکھنا چاہئے کہ دعوتی نقطہ نظر سے کیا بہتر ہے؟ اب موجودہ دور میں لوگ عمومی حلال وحرام کی پرواہ نہیں کرتے، جنہیں دیکھ کر مسلمان کہنا مشکل ہوجاتا ہے؛ لیکن بعض رسمی طور طریقوں کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں، کسی نیک شخص سے دعا کروانا، دعوت وغیرہ کے موقع پر متقی اشخاص سے شروعات کروانا وغیرہ، چنانچہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ مبتلی فیہ شخص اپنے صواب دید پر فیصلہ کرے اور وقت و ماحول کا جائزہ لیکر کوئی عمل کرے، اگر اس کے عمل کا اچھا اثر ہوتا ہو تو انجام دے ورنہ پرہیز کرے۔

المحیط البرھانی میں ہے:

"وفی عیون المسائل: رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لا ينبغي أن يقبل ويأكل من طعامه ما لم يخبر أن ذلك المال حلال استقرضه أو ورثه، وإن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل ما لم يتبين له أن ذلك من الحرام؛ وهذا لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام وتخلو عن كثيره، فيعتبر الغالب ويبنى الحكم عليه (۵/۳۶۷، الفصل السابع عشر فی الھدایا والضیافات، ط: دار الکتب العلمیہ)۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد سلیم الدین قاسمی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين و على آله و صحبه أجمعين – أما بعد!

اللہ تعالیٰ نے حلال کمائی کی تلاش وترغیب اور حرام کمائی کی ممانعت اور اس سے بچنے کا حکم فرمایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"**يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم واشكروا لله إن كنتم إياه تعبدون**" (البقرہ:۱۷۲)۔

(اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں انہیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو! اگر تم خاص طور پر اسی کی عبادت کرتے ہو)۔

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"**ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل**" (البقرہ/۱۸۸)۔

(تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل (یعنی حرام) طریقہ سے نہ کھاؤ)۔

حرام طریقۂ کسب میں سودی معاملہ بھی ہے جس کے ذریعہ حاصل ہونے والا مال حرام ہے، جس سے مکمل اجتناب کا حکم ہے اور خلاف ورزی کی صورت میں قرآن کریم میں سخت وعید آئی ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے:

"**يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقي من الربوا إن كنتم مؤمنين– فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله و رسوله**" (البقرہ:۲۷۸-۲۷۹)۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی سود کو بھی چھوڑ دو اگر تم واقعی ایمان والے ہو، اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ)۔

اس عمومی حکم کی وجہ سے سود یا دیگر حرام مال کے ذریعہ تجارت کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

☆ شیخ الحدیث جامعہ فاطمۃ الزہراء ململ، مدھوبنی، بہار

اس ضروری تمہید کے بعد ''حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل'' کے سوالنامہ میں مذکور پہلے سوال کا جواب مندرجہ ذیل ہے:

جواب:ا

حرام مال جب وراثت میں آتا ہے، اس سے ملک بدل جانے کے باوجود بھی مال کی حرمت زائل نہیں ہوتی، وہ مال بعینہ حرام ہی رہتا ہے۔

''**لکن فی المجتبی: مات وکسبه حرام فالمیراث حلال – ثم رمز و قال: لا نأخذ بهذه الروایة وهو حرام مطلقا علی الورثة**'' (ردالمحتار ۹/ ۵۵۳، زکریا)۔

(اگر کوئی شخص مرجائے جبکہ اس کی کمائی حرام تھی تو میراث حلال ہوجائے گا، پھر اس کے بعد اشارہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ہم اس روایت کو اختیار نہیں کرتے، وہ حرام کمائی میراث میں بھی وارثین کے لئے مطلقاً حرام ہی ہے)۔

پھر عام حالات میں حکم یہ ہے کہ مال حرام وراثت میں ملنے کے بعد بھی اس کو اصل مالک کا علم ہونے کی صورت میں مالک ہی کو لوٹایا جائے، اور مالک کا پتہ نہ ہونے کی صورت میں بلا نیت ثواب صدقہ کردیا جائے۔

''**قال شیخنا: و یستفاد من کتب فقهائنا کالهدایة وغیرها أن من ملک بملک خبیث ولم یمکنه الرد إلی المالک فسبیله التصدق علی الفقراء**'' (معارف السنن ۱/ ۳۴، مکتبہ اشرفیہ)۔

(ہمارے فقہاء کی کتابیں ہدایہ وغیرہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس نے حرام طریقہ سے کسی حرام چیز کا مالک ہوا ہو اور اس کو مالک کی طرف لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کا راستہ یہ ہے کہ اس کو صدقہ کردیا جائے)۔

سوال میں مذکورہ صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام مال کو اس کے مالک اول کی طرف لوٹانا ممکن نہیں، اور اس حرام مال کے ذریعہ ایک زمانہ سے حلال کاروبار کرکے مکان دوکان وغیرہ حاصل کررکھا ہے تو اب شرعی حکم یہ ہے کہ حرام مال کے بقدر مال کو صدقہ کردے، اس کے بعد جو بھی نفع کا مال ہے وہ حلال ہوگا، چاہے وہ مکان دوکان کی شکل میں ہو یا کاروبار کی صورت میں ہو، چنانچہ امام کرخیؒ نے حرام مال سے خرید وفروخت کرنے اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کے جائز وناجائز ہونے کی تفصیل اس طرح سے بیان کی ہے:

''**رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة أوجه: أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولاً ثم اشتری منه بها، أو اشتری قبل الدفع بها و دفعها أو اشتری قبل الدفع بها و دفع غیرها أو اشتری مطلقاً و دفع تلک الدراهم، أو اشتری بدراهم اٰخر و دفع تلک الدراهم ..... قال**

الكرخي في الوجه الأول والثاني لايطيب. و في الثلاثة الأخيرة: يطيب. قال أبوبكر: لايطيب في الكل، لكن الفتوى على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس" (ردالمحتار ۴/ ۲۴۴)۔

(اگر کسی نے کوئی مال حرام طریقہ سے کمایا، پھر اس مال سے کوئی سامان خریدا تو اس کی پانچ صورتیں ہوسکتی ہیں: (پہلی صورت) یا تو وہی حرام دراہم پہلے بائع کو دیا اور اسی حرام دراہم کے عوض سامان خریدا، (دوسری صورت) ان دراہم کو دینے سے پہلے اسی سے سامان خریدا اور وہی دراہم بائع کو دیا، (تیسری صورت) ان دراہم کو دینے سے پہلے اس سے سامان خریدا لیکن ان کے علاوہ دوسرے دراہم دئے، (چوتھی صورت) یا مطلقاً دراہم سے سامان خریدا اور وہی حرام دراہم دئے، (پانچویں صورت) دوسرے دراہم کے عوض سامان خریدا اور حرام دراہم ادا کئے، تو امام کرخیؒ فرماتے ہیں ان میں پہلی اور دوسری صورت میں اس سامان سے یا اس کے نفع سے فائدہ اٹھانا تو جائز نہیں ہے، اور باقی تینوں صوتوں میں نفع حلال ہے، امام ابوبکر فرماتے ہیں کہ تمام صورتوں میں نفع حلال نہیں ہے، لیکن لوگوں سے حرج کو دفع کرنے کے لئے فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے)۔

فتاوی ہندیہ میں بھی ناجائز قبضہ والی دوکان میں حلال کمائی سے نفع کو حلال کہا گیا ہے:

"**غصب حانوتا واتجر فيه و ربح يطيب الربح كذا في الوجيز الكردري**" (ہندیہ، کتاب الغصب ۵/ ۱۴۲)۔

نیز صورت مذکورہ میں حرام مال کے ساتھ حلال مال کا اختلاط بھی ہے اور پھر اس مخلوط مال سے تجارت کر رہا ہے، اس لئے نفع حلال ہوگا، علامہ شامی لکھتے ہیں:

"**و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام و لايعلم أربابه ولا شيئاً منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه**" (ردالمحتار ۵/ ۲۳۵)۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ جو لوگ حرام مال سے حلال کاروبار کر رہے ہیں تو اولاً حرام مال کی مقدار ظن غالب کے ذریعہ طے کر کے اسے بلا نیت ثواب صدقہ کر دے تو پھر باقی سارا مال حلال اور طیب ہوگا، اور اگر اللہ تعالیٰ نے دیگر ذرائع سے حلال مال سے حلال کاروبار کا انتظام کر دیا ہے تو پھر دیانۃ اس حرام مال اور اس سے حاصل ہونے والے نفع سب کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دے۔

جواب: ۲

جس غریب شخص کے پاس مکان جائداد وغیرہ حرام مال ہی سے حاصل ہوا ہے اور اسی کے کرایہ وغیرہ سے وہ اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، اس کے علاوہ گزارے کے لئے اس کے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے، تو فی الحال اس کے لئے اسی جائیداد سے حلال کاروبار کرنا یا کرایہ کا معاملہ کرنا درست ہوگا، ساتھ ہی اس کو یہ عزم بھی کرنا ہوگا کہ ضرورت پوری ہونے

کے بعد رفتہ رفتہ وہ حرام مال سے حاصل کئے ہوئے مکان ودوکان وغیرہ کو اپنی ملکیت سے نکالے گا اور مالک کو واپس کرے گا یا صدقہ کرے گا، نیز حرام مال سے نفع اٹھانے پر جو گناہ ہوا ہے اس سے توبہ واستغفار کرتے رہنا ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص غریب ہے، ضرورت مند ہے اور حرام مال کے علاوہ کوئی دوسرا حلال مال نہیں ہے تو بقدر ضرورت اس کو حرام جائیداد سے نفع اٹھانے کی شرعاً اجازت ہوگی۔

"**الضرورات تبيح المحظورات، والحاجة تنزل منزلة الضرورة**" (موسوعہ فقہیہ الکویتیہ ۲۲/۲۹۱)۔

نیز عام طور پر جو خرید وفروخت لوگوں میں رائج ہے اس میں مطلق روپے کے عوض آدمی جائیداد یا کوئی سامان خریدتا ہے، اس لئے معروف طریقہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ مذکورہ غریب آدمی کے پاس جائداد مکان ودوکان ہے وہ مطلق روپے کے عوض خریدا ہوگا، پھر ادائیگی میں سود وغیرہ کی رقم دیا ہوگا، اس اعتبار سے مذکورہ عقد اور نقد ثمن دونوں حرام مال پر جمع نہیں ہے؛ اس لئے امام کرخیؒ کے قول پر فتوی دیتے ہوئے کہا جائے گا کہ مذکورہ شخص کے پاس جو جائداد ہے وہ بعینہ مال حرام سے کلیۃً حاصل نہیں کیا ہے، اس لئے وہ شخص اس مکان وجائداد کا مالک ہے اور اس سے جو کرایہ وغیرہ حاصل ہوتا ہے، وہ حلال ہے، یہ الگ بات ہے کہ ثمن کی ادائیگی میں جو حرام مال سود وغیرہ لگایا ہے وہ حرام ہی ہے، اس کے بقدر مال اس شخص کو ہر حال میں صدقہ کرنا ہی ہوگا اور اس کے ساتھ توبہ واستغفار لازم ہی رہے گا۔

فتاوی شامی میں ہے:

"**إذ لو اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لايحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله**" (رد المحتار ۵/۹۹، سعید)۔

(کیونکہ اگر حرام مال حلال مال کے ساتھ مل جائے تو آدمی ناجائز طریقہ سے اس کا مالک ہوجاتا ہے، لیکن اس میں تصرف کرنا اسی وقت حلال ہوگا جب اس کا بدل مالک کو ادا کردے)۔

بہر حال صورت مذکورہ میں وہ غریب شخص اس جائداد کا مالک ہے، اور مقدار حرام صدقہ کرنا اس پر واجب ہے، البتہ صدقہ کرنے کے لئے یک بارگی ساری جائداد کے بقدر صدقہ لازم نہیں ہے، بلکہ قسط وار حرام جائداد کے بقدر مال کو صدقہ کرنے کی گنجائش ہے۔

جواب: ۳

شوہر کے ذمہ بیوی کا نفقہ اور بیٹے کے ذمہ ضعیف والدین کا نفقہ واجب ہے اور مسلمان ہونے کی وجہ سے شوہر اور بیٹے پر حلال مال کے ذریعہ ماں اور بیوی کا نفقہ ادا کرنا واجب ہے، کیونکہ حرام مال سے اجتناب کرنا جیسے خود کے لئے ضروری

ہے اپنے ماتحتوں کو بھی حرام مال سے بچانا ضروری ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے:

"یا أیها الناس کلوا مما فی الأرض حلالا طیبا ولا تتبعوا خطوات الشیطن إنه لکم عدو مبین" (البقرہ:۱۶۸)۔

(اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور پاکیزہ ہے اسے کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے)۔

اس لئے شوہر کا حرام مال بیوی کے لئے اور باپ کا حرام مال اولاد اور ماتحتوں کے لئے حرام ہی ہے، اگر غریب ماں باپ یا بیوی کے پاس حلال رزق موجود ہو یا حلال رزق کا ذریعہ موجود ہو تو انہیں اپنے شوہر یا باپ کے حرام مال سے اجتناب کرنا ہوگا؛ کیونکہ عام ملکیت بدلنے سے حرام کا حکم نہیں بدلتا ہے۔

"قوله: (الحرام ینتقل) أی تنتقل حرمته و إن تداولته الأیدی و تبدلت الأملاک الخ" (ردالمحتار ۴/۱۴۵)۔

(قبضہ اور ملکیت بدلنے کے باوجود بھی مال کی حرمت دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہے)۔

اور اگر بیوی یا ضعیف والدین اور اولاد کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کوئی دوسرا حلال ذریعہ نہ ہو تو مجبوراً شوہر کے حرام مال سے بقدر ضرورت نفقہ لینے کی اجازت ہوگی، کیونکہ یہاں ایسی ضرورت لاحق ہو چکی ہے کہ حرام مال استعمال کیے بغیر اس کو کوئی چارہ نہیں ہے، اس لئے فقہ کے مشہور قاعدے **"الضرورات تبیح المحظورات"** کی وجہ سے مذکورہ حرام مال سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھانے کی اجازت ہوگی، ساتھ ہی بیوی اور ضعیف والدین کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر یا بیٹے کو جو حرام طریقہ سے مال حاصل کر رہا ہے انہیں اس حرام کمائی سے بچنے کی تلقین کرتا رہے، اور حرام سے اجتناب کرنے کا حکم کرتا رہے، اور ساتھ ہی توبہ واستغفار بھی کرتا رہے، ردالمحتار میں ہے:

"وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاماً أو کسوة من مال خبیث جاز للمرأة أکله و لبسها والإثم علی الزوج" (ردالمحتار ۶/۴۹۰)۔

(اگر شوہر نے حرام مال سے کھانا یا کپڑا خریدا تو عورت کے لئے وہ کھانا کھانا اور کپڑا پہننا جائز ہے، اور گناہ شوہر پر ہوگا)۔

اسی طرح اگر کسی نے اپنے بچے کو حرام مال کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دلایا، اس کے بعد وہ بچہ بڑا ہو کر حلال نوکری کر کے پیسہ کماتا ہے تو سابق میں اس پر جو حرام مال خرچ کیا گیا وہ تو حرام ہی تھا وہ گناہ تھا، اس سے توبہ واستغفار واجب ہے، لیکن یہ بچہ جو حلال نوکری کر کے مال کماتا ہے، وہ مال وہ کمائی حلال ہے؛ کیونکہ حرام مال کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا اگرچہ ناجائز ہے مگر یہ عمل حلال آمدنی والی نوکری اور اس کے ذریعہ کمائی کے لئے حرمت کا ذریعہ نہیں بنے گا، جیسے اگر کوئی شخص دھوکہ دے کر

سرکاری نوکری حاصل کرتا ہے تو یہ عمل ناجائز ہے "من غش فليس منا" (ترمذی حدیث نمبر:۱۳۱۵)، لیکن نوکری کے ذریعہ جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ جائز عمل کا عوض ہے، اس لئے آمدنی حلال ہوگی (فتاوی دارالعلوم دیوبند ۱۷/ ۳۵۴)، نیز اس مقام پر حرام مال سے تعلیم دلانا اس کے موافق نوکری کے لئے ایک سبب ہے اور نوکری آمدنی حاصل کرنے کے لئے مباشر کی طرح ہے، اور قاعدہ ہے: "إذا اجتمع المباشر والمتسبب أضيف الحكم إلى المباشر" (دررالحکام فی شرح مجلۃ الأحکام، م ادہ ۹۰)، اس لئے مذکورہ نوکری کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہوگی، جس کا استعمال خود نوکری کرنے والے کے لئے اور اس کے ماتحت بیوی بچے اور ضعیف والدین کے لئے حلال ہوگا۔

جواب: ۴

ایسی جگہ دعوت دینے والے کے بارے میں غور وفکر کرکے ظن غالب کو حکم کا معیار بنانا ہوگا، چنانچہ اگر ظن غالب ہوجائے کہ دعوت دینے والے کی اکثر آمدنی حرام ہے تو اس کی دعوت کا کھانا کھانا جائز نہیں ہوگا، الا یہ کہ جو کھانا بنایا گیا ہے اس کے بارے میں خاص طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ کھانا حلال مال سے تیار کیا گیا ہے تو اس کو کھانے کی اجازت ہوگی۔

اور اگر ظن غالب یہ ہوجائے کہ دعوت دینے والے کا اکثر مال حلال ہے تو اس دعوت کے کھانے کی اجازت ہوگی، الا یہ کہ یہ یقینی طور پر معلوم ہوجائے کہ جو کھانا تیار کیا گیا ہے وہ حرام مال سے تیار کیا گیا ہے تو پھر اس دعوت کا کھانا کھانا جائز نہیں ہوگا، ہندیہ میں اس کی صراحت ہے:

"أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۲)۔

اور اگر کسی دعوت دینے والے کی آمدنی میں حلال وحرام سے متعلق ظن غالب نہ ہوسکے تو ایسی صورت میں دعوت دینے والے کے مسلمان ہونے کی وجہ سے حسن ظن کو معیار بنایا جائے، یہ بھی درست ہے کہ مسلمان ہونا ایمان والا ہونا ہی حلال مال سے دعوت کرنے کے رجحان کو ثابت کرتا ہے، اس لئے اس دعوت کا کھانا مباح ہوگا، فتاوی شامی میں ہے:

"و أما الشك بين كونه فاسقا أو صالحاً فلا اعتبار له بل يظن بالمسلمين خيرا" (ردالمحتار علی الدر المختار ۶/ ۴۱۲)۔

(اور اگر کسی کے بارے میں نیک اور برے ہونے میں شک ہوجائے تو اس شک کا اعتبار نہیں ہے؛ بلکہ مسلمان کے بارے میں خیر کا ہی گمان کیا جائے گا)۔

اوراس کی اصل یہ حدیث ہے:

"**عن أبی هریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: إیاکم والظن فإن الظن أکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا .....**" (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۶۰۶۴، مسلم ۲۵۶۳)۔

(اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: بدگمانی سے بچتے رہو؛ کیونکہ بدظنی سب سے جھوٹی بات ہوتی ہے، کسی کے عیب ڈھونڈنے کے پیچھے نہ پڑو اور کسی کی برائی کے جستجو میں نہ رہو.....)۔

جواب: ۵

ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ کھانے پینے اور دیگر استعمال کرنے کی چیزوں میں حلال اختیار کرنے اور حرام سے اجتناب کرنے کا اپنی طاقت کے بقدر اہتمام کرے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: "**فاتقوا الله ماستطعتم**" (التغابن/ ۱۶)، (اپنی طاقت کے بقدر اللہ سے ڈرتے رہو)۔

اس کے باوجود بھی اگر بھول یا غلطی سے کھانے پینے میں حرام چیزوں کا استعمال ہوجاتا ہے تو عنداللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہے، اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث ہے: "**عن ابن عباس رضی الله عنهما أن رسول الله ﷺ قال: إن الله تجاوز لی عن أمتی الخطأ والنسیان وما استکرهوا علیه**" (ابن ماجہ/ ۲۰۵۴، الاربعین النوویہ/ ۱۰۷) (بیشک اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے میری امت سے غلطی، بھول چوک اور اکراہ پر مؤاخذہ کرنے سے درگزر کیا ہے)۔

اس لئے اگر کسی کے یہاں دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری آمدنی حرام تھی تو غالب یہی ہے کہ وہ حرام مال سے ہی کھلایا ہوگا تو اس پر شرعاً کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، البتہ اگر کھانے کے فوراً بعد حرام ہونے کا علم ہو تو گنجائش کے بقدر اس کھانے کو قئے کے ذریعہ باہر نکالنا مستحب ہے، جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے:

"..... **فأدخل أبو بکر یده فقاء کل شئ فی بطنه**" (صحیح البخاری/ ۳۸۴۲)۔

(حضرت ابوبکرؓ نے سنتے ہی اپنا ہاتھ اپنے حلق میں ڈالا اور تمام کھانا قئے کرکے نکال دیا)۔

اور اگر حرام دعوت کھائے ہوئے زیادہ وقت گزر چکا ہو تو پھر اب اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرے، بقدر حیثیت صدقہ کرے اور آئندہ کھانے پینے میں خوب احتیاط کرے، جیسے اللہ کے رسول ﷺ نے تاجر لوگوں کو یہ ارشاد فرمایا تھا:

"**یا معشر التجار أن البیع یحضره اللغو والحلف فشوبوه بالصدقة**" (مشکوۃ المصابیح/ ۲۴۳)۔

(اے تاجروں کی جماعت! خرید وفروخت میں لغویات اور قسم کھانے کا عمل ہوتا ہی رہتا ہے (جو شرعاً منع ہے) اس لئے اس کے ساتھ صدقہ کرتے رہو (کیونکہ صدقہ اور نیک عمل کے ذریعہ گناہوں کا ازالہ ہوتا رہتا ہے)۔

جواب:٦

شریعت اسلامیہ میں جائز حیلہ یہی ہے کہ آدمی حرام کے ارتکاب سے بچنے کے لئے ایسی تدبیر اختیار کرے جس کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے، المحیط البرہانی میں ہے:

"و کل حیلة یحتال بهاالرجل لتخلص بها عن الحرام أو لیتوصل بها إلی الحلال فهی حسنة" (المحیط البرہانی:۲۱/۶۷)۔

ضرورت کے وقت حیلہ کرنا شرعاً جائز ہے، جیسے حضرت ایوب علیہ السلام کو ایک معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے حیلہ کی اجازت عطا کی اور فرمایا: **"و خذ بیدک ضغثا فاضرب به و لا تحنث"** (ص/۴۴)، (اور (اے ایوب علیہ السلام) آپ اپنے ہاتھ میں تنکوں کی ایک جھاڑو لیجئے پھر اس سے ماریئے اور اپنی قسم نہ توڑیئے)۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی بیوی کو کسی وجہ سے سو کوڑے مارنے کی قسم کھائی تھی، اور ظاہر ہے کہ اس کو پورا کرنا انتہائی خطرناک تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ حیلہ بتلایا۔

لیکن بلاضرورت صرف حرام کو استعمال کرنے کے لئے حیلہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں۔

اس وضاحت کے بعد وہ شخص جس کے پاس مال حرام ہے اس کو حکم شریعت کے مطابق مالک کو لوٹائے یا پھر بعض صورتوں میں بلا نیت ثواب صدقہ کردے، اور بلاضرورت حیلہ کرکے اس حرام مال کو کھانے سے گریز کرے۔

اور اگر وہ شخص محتاج اور ضرورت مند ہو، اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ ہو تو پھر اس حرام مال کو جائز حیلہ کرکے اپنا سکتا ہے، مثلاً:

(۱) حرام مال کا کسی مستحق زکوۃ کو مالک بنا کر قبضہ بھی دلا دے، اس کے بعد اس سے ہدیہ کی صورت میں اپنے استعمال میں لائے۔ جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ میں ہے: اللہ کے رسول ﷺ کے لئے صدقہ حرام تھا، لیکن حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے اس صدقہ کے مال کو بصورت ہدیہ آپ کو دیدیا تو وہ آپ ﷺ کے لئے حلال ہوگیا:

"عن عائشه رضی الله عنها و أتی النبی ﷺ بلحم بقر فقیل، هذا ما تصدق به علی بریرة، فقال هو لها صدقة ولنا هدیة" (صحیح مسلم/۱۷۸۵)۔

(۲) ضرورت مند شخص حرام مال کو تجارت میں لگائے، اس تجارت سے جو آمدنی ہو اس سے رفتہ رفتہ حرام مال کی مقدار کو صدقہ کرتا رہے، یہاں تک کہ حرام کی پوری مقدار صدقہ میں ادا ہوجائے تو اب مابقیہ سارا مال اس کے لئے حلال ہوجائے گا۔

"و إذا لو اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا، لكن لايحل التصرف فيه مالم يؤد بدله" (ردالمحتار ۵/۹۹)۔

(اور جب حرام مال حلال کے ساتھ اس طرح گھل مل جائے کہ حرام مال متعینہ طور پر ممتاز نہ رہے تو اس حرام کا بھی ناجائز طریقہ سے مالک ہوجاتا ہے، لیکن اس میں اس وقت تک تصرف کرنا حلال نہیں جب تک حرام مال کا بدل نہ ادا کردے)۔

جواب:۷

حرام مال کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا شریعت کا حکم ہے، لیکن اگر خود وہ شخص اس حرام مال کا محتاج ہو اور کہیں سے جائز قرض ملنے کا امکان بھی نہ ہو تو پھر یہ شخص اپنے ہی حرام مال کو قرض کی نیت سے لے کر اپنی تجارت میں لگا سکتا ہے؛ کیونکہ اس کی حاجت اس وقت اس کے لئے ضرورت کے درجے میں ہے، اور ضرورت کے وقت حرام مال سے نفع اٹھانے کی شرعاً اجازت ہے:

"**الضرورت تبيح المحظورات** ..... **و الحاجة تنزل منزلة الضرورة**" (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۲۲/۲۹۱)۔

پھر جب تجارت کے ذریعہ نفع حاصل ہونے لگے تو اگر ممکن ہو سکے تو پہلے حرام مال کی پوری مقدار کو صدقہ کردے، ورنہ رفتہ رفتہ آمدنی سے حرام مال کے بقدر صدقہ کرتا رہے، یہاں تک کہ حرام مال کی پوری مقدار اپنی ملکیت سے نکل جائے، اس کے بعد بھی صدقہ اور استغفار کا اہتمام کرنا چاہئے، تاکہ حرام مال کی جو نحوست کاروبار اور آمدنی میں آئی ہے اس کا کفارہ ہوجائے۔

اسی طرح مال حرام رکھنے والے کا معاملہ ہے کہ اگر یہ خود ضرورت مند ہے تو قرض کی صورت میں اس مال کو اپنے کاروبار میں لگا سکتا ہے اور پھر بعد میں حرام مال کی مقدار کو صدقہ کرکے باقی نفع استعمال کرسکتا ہے۔

جواب:۸

کمپنی میں ملازم کے لئے حلال کام کے مقابلے کی تنخواہ حلال ہوگی اور حرام کام کے مقابلے کی تنخواہ حرام ہوگی، مفتی تقی عثمانی مدظلہ العالی نے فقہ البیوع میں اس صورت کو یوں لکھا ہے:

"**أما قبول الوظائف فی مثل هذه الفنادق و المطاعم فإن كانت الوظيفة متمحضة لخدمة المباحة فهی جائزة و تجری علی راتبها حكم المال الحلال، و إن كانت متمحضة للحرام مثل بيع الخمر فهی حرام و راتبها حرام**" (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۶، مکتبہ معارف القرآن کراچی)۔

اور اگر کوئی شخص اس طرح ملازم ہے کہ حلال وحرام دونوں کام کرنے پر مامور ہے، اور اس کی تنخواہ حلال کے

مقابلے میں متعین نہیں ہے تو پھر اس کی تنخواہ حلال نہیں ہوگی، فقہ البیوع میں ہے:

"و أما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة و الخدمات المحظورة فلا يجوز قبولها لاشتمالها على عمل المحرم" (فقہ البیوع ۱۰۵۶/۲)۔

(بہر حال وہ نوکری جس میں مباح اور ممنوع دونوں طرح کی خدمات انجام دینا پڑے تو ایسی نوکری کرنا جائز نہیں، کیونکہ وہ حرام کام پر مشتمل نوکری ہے)۔

پھر یہاں بھی اگر اس ملازم کو کوئی حلال آمدنی کی نوکری یا ذریعہ موجود ہے تو کسی صورت میں اس کو ایسے حلال وحرام والی کمپنی میں ملازمت کرنا درست نہیں ہوگا، اور اگر اس کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو بینک ملازم کی طرح ان کو بھی ملازمت میں رہنے کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ وہ حلال ذریعہ آمدنی تلاش کرتا رہے اور جب بھی حلال ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس حرام وحلال والی مخلوط کمپنی سے علیحدگی اختیار کرے، اور جتنی مقدار میں حرام کام کرنے کی تنخواہ ملی ہے اس کو جتنی جلدی ہو سکے صدقہ کر کے اپنے آپ کو حرام کی نحوست سے آزاد کر لے۔

جواب:۹

جس شخص نے مال حرام سے زمین و جائداد خریدا ہے اس کے لئے اس زمین و جائداد سے نفع اٹھانا حرام ہے، یہاں تک کہ اس کا عوض ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دے۔

(ا) رہی یہ بات کہ کوئی دوسرا شخص اس زمین و جائداد میں کھیتی باڑی کر کے یا کاروبار کر کے کمائی کر سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس کام کرنے والے کو معلوم ہے کہ یہ زمین حرام مال سے خریدی گئی ہے تو اس میں کام کر کے مزدوری حاصل کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس صورت میں جان بوجھ کر حرام مال سے زمین خریدنے والے کی مدد کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"و تعاونوا على البر و التقوى ولا تعاونوا على الإثم و العدوان" (المائدہ:۲)۔

(ب) حرام کمائی کرنے والے کے گھر نوکری کرنے میں دیکھا جائے گا کہ جائز کام کی نوکری ہے یا ناجائز کام کی نوکری؟ اگر ناجائز کام کی نوکری ہے تو ظاہر ہے کہ یہ نوکری جائز نہیں ہوگی، اور اگر جائز کام کی نوکری ہے تو جائز ہے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی جائز ہوگی؛ کیونکہ وہ آمدنی جائز کام کا عوض ہے، اور چونکہ عام طور پر نوکری کرنے والے کو جب تنخواہ دی جائے گی تو یہ طے نہیں کیا جائے گا کہ یہ حرام مال ہے، اسی سے میں تمہیں تمہاری تنخواہ ادا کرتا ہوں، بلکہ اس کام کا مالک اپنے نوکر کو اس کے جائز کام کی اجرت مطلق روپے سے ادا کرتا ہے، اس لئے امام کرخیؒ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے

یہی فتوی ہوگا کہ یہ نوکری بھی جائز ہے اور اس کی تنخواہ بھی جائز ہے، البتہ یہاں غالب گمان یہی ہے کہ حرام مال سے ہی اس کو تنخواہ دی گئی ہوگی؛ اس لئے اس نوکری کی آمدنی میں کچھ کراہت آئے گی، جس کی توبہ واستغفار اور صدقہ کے ذریعہ تلافی کی کی جاسکتی ہے۔

(ج) حرام کمائی والے کے ساز وسامان کو یا اس کی گاڑی کو استعمال کرنے کا بھی وہی حکم ہے کہ جب غالب گمان ہوجائے کہ یہ سامان حرام مال سے خریدا ہے تو اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

"**والحرام ينتقل أن تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى و تبدلت الأملاک**" (ردالمحتار ۷/۳۰۰)۔

(د) حرام کمائی کرنے والا اگر اپنے بچے کو اسکول یا مدرسہ میں پڑھائی وغیرہ کی فیس حرام مال سے متعین کر کے دے تو مدرسے اور اسکول والے کو چاہئے کہ وہ اس سے حلال مال کے ذریعہ فیس ادا کرنے کا مطالبہ کرے، اس کے لئے وہ متعینہ حارم مال سے فیس لینا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ "**الحرام ينتقل أى تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاک**" جیسی صراحت موجود ہے، اگر فیس کی ادائیگی کے وقت حرام مال متعینہ طور پر نہ دے کر مطلقاً مال سے فیس ادا کرتا ہے تو امام کرخیؒ کے قول کے مطابق اس مال سے فیس وصول کرنا جائز ہوگا۔

جواب:۱۰

سودی رقم کا مصرف یا تو وہ مال مالک کو واپس کرنا ہے، اور اگر ایسا متعذر ہوجائے تو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ہے، جیسا کہ اس سے قبل لکھا جاچکا ہے:

"**ويردونها على أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**" (شامی ۹/۳۸۵)۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ سودی رقم سے کسی طرح کا فائدہ سود لینے والے شخص کے لئے جائز نہیں ہے، اس لئے سود کی رقم مدارس کی عمارتوں کا نقشہ پاس کرانے یا کسی طرح کے سرکاری کام میں رشوت کے طور پر دینا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ ان صورتوں میں ایک گونہ سود کے ذریعہ رشوت دینے والا فائدہ اٹھانے والا ہوجاتا ہے اور حرام مال سے فائدہ اٹھانا ہلاکت کا ذریعہ ہے۔

جواب:۱۱

سودی کاروبار کرنے والے سے ہدیہ لینے میں اسی اصول کو ملحوظ رکھنا چاہئے جو اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے کہ اگر اس

کا اکثر مال حرام ہے تو ہدیہ لینے سے بچنا چاہئے، الا یہ کہ اس ہدیہ کا حلال ہونا معلوم ہو جائے۔

"أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية و لا يأكل الطعام إلاأن يخبر بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل" (ہندیہ:۵/۳۴۲)۔

اور اگر ہدیہ والی چیز یا کھانے پینے کی اشیاء کے بارے میں حلال ہونے کا سوال کرنے کی صورت میں بے جا رنجش یا نقصان کا اندیشہ ہو تو پہلے یہ کوشش کرنا چاہئے کہ اس ہدیہ یا کھانے پینے کی چیز کو حسن تدبیر سے ٹال دے، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو پھر اس ہدیہ اور کھانے پینے والی چیز کو لے کر بعد میں وہ مال کسی غریب مسکین کو صدقہ کر دے جو مال حرام کا مصرف ہے۔

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه" (ردالمحتار ۵/۹۹)۔

اور اگر ہدیہ دینے والے یا دعوت کرنے والے اسی طرح معمولی چیز مثلاً: دیا سلائی، سوئی اور بچوں کو ٹافی دینے والے کے بارے میں جب اس کی کمائی میں حرام کا ظن غالب نہ ہو تو پھر بارہا ایسے لوگوں کو اس کی آمدنی کے بارے میں پوچھنا یقیناً اختلاف اور رنجش کا سبب ہو سکتا ہے، اس لئے مسلمانوں سے اختلاف اور انتشار اور رنجش سے بچنے کے لئے ایسے لوگوں سے آمدنی کی صورت پوچھے بغیر مذکورہ چیزوں کو قبول کرنا شرعاً درست ہوگا؛ کیونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اس بات کا غالب امکان ہے کہ وہ حرام سے بچتا ہوگا اور حرام سے لوگوں کی ضیافت وغیرہ نہیں کرتا ہوگا، جیسے اس حدیث سے یہ مسئلہ مستفاد ہوتا ہے:

"عن عائشة رضي الله عنها أن قوما قالوا: يا رسول الله! إن قوما يأتونا باللحم لاندري أذكروا اسم الله عليه أم لا، فقال رسول الله ﷺ سموا الله عليه و كلوه" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۰۵۷)۔

جواب: ۱۲

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حرام مال کھانے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے:

"عن أبي هريرةؓ قال قال رسول الله ﷺ ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أير، يمديده إلى السماء يا رب يارب و مطعمه حرام ومشربه حرام و ملبسه حرام و غذي بالحرام فأنى يستجاب لذلك" (صحیح مسلم ۱/۳۲۶، حدیث نمبر: ۱۰۱۵)۔

اورحرام مال کھانے والے کی دعا ودیگر عبادات قبول نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو دعا ہی نہیں کرنا چاہئے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ حرام مال کھانے سے اجتناب کرے اور جو کھالیا اس سے توبہ واستغفار کرے۔

نیز ایسے حرام کمائی والے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے ان کی تقریبات میں اہل علم کا جانا اور دعا کرنا ان کو حرام کمائی سے روکنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

امام نووی فرماتے ہیں:"**اعلم أنه لايجوز أن يدعى له (أى الذمى) بالمغفرة وما اشتبهها مما لايقال للكفار، و لكن يجوز أن يدعى له بالهداية وصحة البدن والعافية و شبه ذٰلک**" (کتاب الأذکار ر ۴۹۶)۔

اس عمومی دعا میں حرام کھانے والا مسلمان بھی داخل ہے، اس لئے ان کے لئے ان کے بچوں کے لئے خیر کی دعا کرنا بالکل جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد ذکاء اللہ شبلی مفتاحی☆

مجمع فقہ اسلامی ہند کے زیر اہتمام ۳۲ ؍واں فقہی سمینار کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا ہے، یہ اکیڈمی کی سابقہ کارکردگی اور ملی مسائل پر نباضی اور منجانب اللہ مقبولیت کی علامت ہے، دعاء ہے کہ رب تعالیٰ اس ادارہ کو ملت مسلمہ کے اہم ترین شرعی مسائل اور تنقیح طلب امور میں اسی طرح کی راہ نمائی کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

زیر بحث مسئلہ حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل کے سوالنامہ میں تمہیدی سطور میں ''وطن عزیز'' کے سابقہ فتوی کے ''دارالحرب'' ہونے کی بنیاد پر تجارتی امور اور بیع وشراء نیز بینک کے سود کے بارے میں جائز و درست ہونے کی اجازت پر لوگوں میں اسی عادت کے پختہ ہوجانے اور مبتلا ہونے پر اس سے باز رہنے اور ''سود و بیاز'' سے اپنی آمدنی کو پاک کرنے کے ارادہ سے اس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے، اسی ذیل میں احقر یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ ہمارے اکابرین نے ''بھارت کے دارالحرب'' ہونے کا فتویٰ جو دیا تھا اور دارالحرب کے تحت اجازت دی تھی اس پر ہمیں پھر سے سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ ملک میں اس وقت جو حالات اور ماحول ہے، اس میں صحیح فیصلہ لینا ضروری ہے۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح خالص فقہی اصطلاح ہے، کتاب اللہ اور احادیث شریفہ میں ان کی اصطلاح کا ذکر نہیں۔

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مجتہدین کے یہاں بھی عام طور پر حدود و قیود کے ساتھ ان اصطلاحات پر بحث نہیں کی گئی، معاملہ یہ ہے کہ جن ممالک پر مسلمانوں کو سیاسی بالادستی حاصل تھی ان کو فقہاء نے دارالاسلام اور جن پر اہل کفر کا اقتدار تھا ان کو دارالکفر یا دارالحرب کہہ دیا ہے۔

دارالکفر اور دارالحرب کے متعلق حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ احکام کفر کا غلبہ اور تسلط ہو (بدائع)۔

☆ قاضی شریعت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اندور

حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اس سلسلہ میں نظریہ یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کی نسبت کا مقصود بعینہٖ اسلام اور کفر نہیں، بلکہ ''امن وخوف ہے''، پس جہاں مسلمان مامون اور محفوظ نہ ہوں وہ دارالکفر ودارالحرب ہے'' **و معناه أن الأمان إن كان للمسلمين فيها على الإطلاق والخوف للفكر على الاطلاق فهي دار الإسلام و إن كان دار الأمان فيها لكفره على الاطلاق فهي دار الكفر**'' (بدائع)(بحوالہ جدید فقہی مسائل ۲/ ۲۵۲)۔

ظالم انگریزوں کے تسلط اور جبری اقتدار اور مذہبی آزادی کے سلب اور غیر مامون وغیر محفوظ ہونے کو دیکھتے ہوئے ہمارے اکابر نے اس کے دارالحرب ہوجانے کا فتویٰ دیا، اور پھر انگریزوں سے جہاد اور دیش نکالو کی جدوجہد کی، اللہ تعالیٰ نے اس میں کامیابی عطا فرمائی، اس کوشش میں بلاتفریق مذہب وعقیدہ عام بھارتی نے حصہ لیا اور جب عام بھارتیوں کے ظلم کے تحت اس کے دارالحرب کا فتویٰ دیا گیا۔

اور اب جبکہ خاص مسلمانوں اور اقلیت کو تہہ تیغ کیا جاتا ہو، جان کے ساتھ مال اور عبادت خانوں کو نذر آتش کیا جاتا ہو، مذہبی حق اور دستوری حق کو سلب کیا جارہا ہو، عام لوگوں میں کھلے عام نفرت وعداوت کے شعلے بھڑکائے جارہے ہوں، جھوٹے معاملات میں الجھا کر جیل کی سلاخوں میں ڈالا جارہا ہو، دھرم پریورتن اور گھر واپسی کے نشتر سے دلوں کو چھلنی کیا جارہا ہو، مظلوم کو ظالم اور مجروح کو ملزم بنا کر مقدمہ لاد دیا جاتا ہو، کیا یہ سب حالات اور خوف وہراس اور دہشت کا ماحول آزادی سے قبل کے ماحول سے کم ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے آزادی وطن پر دارالکفر اور دارالحرب کے بجائے اسے دارالامن فرمایا، اس لیے کہ یقیناً امن کا ماحول تھا، مذہبی آزادی ہی نہیں مسلمانوں کے غیر شرعی رسوم کو بھی سرکاری طور پر کھلے عام انجام دلایا جاتا تھا، اس لیے کہ وطن باسیوں کی آنکھوں میں حیاوشرم تھی، وہ یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے ہی ظالم انگریزوں سے وطن کو آزاد کرایا۔

اور دارالامن کی تعریف میں یہ کہا گیا:

جہاں کلید اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہو، لیکن مسلمان مامون ہوں، مسلمان دعوت دین کا فریضہ انجام دے سکتے ہوں اور ان اسلامی احکام پر جن کے نفاذ کے لیے اقتدار ضروری نہ ہو عمل کرسکتے ہوں۔

مزید یہ کہ اگر ملک کا کوئی غیر مسلم کسی مسلمان پر شخصی طور پر تعدی کرے تو یہ اس کے دارالامن کے منافی نہیں، دارالامن کے مسلمان اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ تعلقات میں انھیں اصول وضوابط کے پابند ہوں گے، جن کے پابند ایک مسلمان ملک کے شہری دوسری معاہد قوم کے افراد کے ساتھ سلوک وبرتاؤ میں ہیں (جدید فقہی مسائل ۲/ ۶۱-۲۶۰)۔

اور بقول مفتی زماں محدث وفقیہ حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب قاسمی مدظلہ جب آزادی سے قبل ہندوستان کو

دارالامن قرار دیا گیا ہے تو آزادی کے بعد بطریق اولی ہندوستان کو دارالامن اور دارالجمہوریہ کہا جاسکتا ہے، دارالحرب کہنا درست نہ ہوگا، کیونکہ آزادی کے بعد پارلیمانی قانون کی دفعات اور قراردادوں میں سیکولرزم کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہوئے مسلم و غیر مسلم سب کو مشترکہ طور پر نظام حکومت میں دخل دینے اور الیکشن میں کھڑے ہوکر کلیدی عہدہ حاصل کرنے کا بلاتفریق حق حاصل ہے'' (انوار رحمت ص ۱۷۱)۔

لیکن ان سطور بالا کے ساتھ حضرت مفتی صاحب نے بحث کے اخیر میں حرف آخر کے عنوان کے تحت آخری سطور میں یہ تحریر فرمایا ہے:

''ہاں البتہ اگر کسی وقت خدانخواستہ دستور و آئین میں پاس کردہ حقوق وقوانین کو ختم کرکے آزادانہ حقوق شہریت اور مسلم پرسنل لاء کے سارے حقوق سلب کردئے جائیں تو دارالحرب کہا جاسکتا ہے'' (انوار رحمت ص ۱۷۳)۔

اور فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم العالیہ تحریر فرماتے ہیں:

''فطری بات یہ ہے کہ فقہاء نے عام طور پر (دارالاسلام ودارالکفر وحرب کے) ان اصطلاحات میں دارالاسلام و دارالکفر کے خارجہ تعلقات کو مدنظر رکھا ہے، جبکہ موجودہ حالات میں ہمیں داخلی صورت حال اور مسلمانوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کو سامنے رکھ کر غور کرنا ہوگا'' (جدید فقہی مسائل ۲/۲۵۵)۔

نیز فرمایا'' دارالامن میں مسلمان اور کافر کے درمیان تعلقات مساویانہ سطح کے ہوتے ہیں اور دونوں اسی ملک کے شہری قرار پاتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی جان و مال کے احترام، حفاظت وسلامتی اور اپنے مذہب پر قائم رہنے کے اعتبار سے ان کے حقوق یکساں حیثیت کے حامل ہیں'' (جدید فقہی مسائل ۲/۲۶۱)۔

موجودہ بھارت میں سود کے معاملہ میں علماء کی رائے:

آزادی کے بعد ملک میں امن وامان اور مسلمانوں و دیگر اقوام کے درمیان ہمدردانہ رویہ اور یکجہتی کی تصویر اور تصور کے تحت اہل حق علماء واکابرین ملت نے ملک کی تیسری قسم دارالامن یعنی دارالعہد و دارالجمہوریہ فرمایا، لیکن جب ملک کی معیشت وتجارت اور قرض وغیرہ کا مکمل نظام سود پر رکھا گیا، جب سودی طریقۂ تجارت ومعیشت نے اپنی جڑ مضبوط کرلی اور دستور و آئین کے جمہوری نظام کے باوجود معیشت میں مغربی نظام کو ہی اختیار کیا گیا، بینک سے روپیہ لینے اور وہاں رقم رکھنے میں سود کی وہی شکل سامنے آئی جو کسی نہ کسی طرح عہد جاہلیت میں مکہ میں رائج تھی، جس کے سلسلہ میں قرآن نے صریح الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا''**أحل الله البيع و رحرم الربا**'' کہ تمہارے رب نے تجارت کو جائز وحلال اور سودی رقم کو حرام قرار دیا ہے تو علماء ومفتیان کرام کو بڑی فکر لاحق ہوئی، رقوم کی حفاظت کے لیے بینک میں رکھنے کی تو اجازت دی، لیکن اس پر ملنے والی

سودی رقم کو حرام فرماتے ہوئے اپنے استعمال میں نہ لینے کا حکم فرمایا۔

ذاتی منفعت میں سودی رقم لینا:

وہ حضرات جو سود کی رقوم کو ناجائز اور حرام کہتے ہیں ان حضرات نے بھی اس سے حکومت کی جانب سے ناجائز ٹیکسوں یہاں تک ہاؤس ٹیکس ادا کرنے کی اجازت دی ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اس سے گاڑی انشورنس کی رقم بھی ادا کر سکتے ہیں، ضرورت ہو تو گھر کا بیت الخلاء بھی بنا سکتے ہیں اور ادارہ کے پاس سودی رقوم بہت ہے اصل رقم نہیں ہے تو ملازمین کے تنخواہ کے بقدر رقم ادارہ کسی سے قرض لے اور تنخواہ ادا کر دے پھر ادارہ اس قرض کو سود سے ادا کر دے، اسی طرح سود کی رقم سے سود ادا کر سکتے ہیں (فتاویٰ رحیمیہ، کتاب الفتاویٰ)۔

ہمارے اکابر کا احتیاط کا یہ عمل یقیناً قابل تحسین ہے، تاکہ کھلے عام سود کے استعمال کی عادت نہ ہو، لیکن یہ سب احتیاط صرف وطن عزیز کو دارالامن تسلیم کرنے کی بنا ہے، جبکہ علماء و اکابرین میں بعض نے اسے دارالحرب تسلیم کیا ہے، جیسا کہ حضرت تھانوی، حضرت گنگوہی اور حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی رحمہم اللہ کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ ان اکابرین نے اس کے باوجود سود کے استعمال کی اجازت نہیں دی، لیکن یہ امر قابل غور ہے، اس لیے اس مسئلہ میں خود ہمارے علماء میں اختلاف ہے اور اس رقم کو صدقہ کرنے کو افضل فرمایا، یہ صدقہ بہر صورت واجب اور ضروری ہے اس کا اظہار نہیں فرمایا، اسی لیے حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ بعض کے قول پر اس رقم کا اپنے کام میں لانے کی گنجائش ہے۔

حرام شئ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت

فقیہ النفس قاضی القضاۃ مجاہد ملت حضرت قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ممبئی کے قریشی حضرات نے اپنی ایک سخت مشکل اور جانوروں کے ممبئی مذبح خانہ یا بازار تک پہنچنے تک لاکھوں لاکھ ناجائز جبری وصولی کی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوال کیا کہ ہمارے مذبح خانہ میں ذبح ہونے والے جانوروں کا خون سرکاری طور پر نگر نگم اٹھاتی ہے اور وہ اسے فروخت کرتی ہے، کیا ہم قریشی اس خون کا سودا کر کے اس سے جبری وصولی کی رقم نکال سکتے ہیں۔

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ملک سے مشہور صاحب افتاء حضرات سے اس سلسلہ میں استفسار فرمایا اور پھر آپ نے اپنے دستخط سے یہ فتوی دیا کہ دم مسفوح یقیناً حرام شئ ہے اور مردار کے حکم میں ہے، لیکن جبری وصولی، ناجائز و ظالمانہ رقوم کے مطالبہ میں مذبح خانہ کا خون فروخت کر کے ادا کریں (فتاویٰ قاضی مجاہد الاسلام قاسمی)۔

چوری کے مال کے نفع سے چوری کا مال ادا کرنا:

اسی فتاویٰ قاضی میں ایک فتوی حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ کا یہ بھی مذکور ہے کہ ایک صاحب عرب ملک سے آپ کی خدمت میں اپنا ندامت بھرا سوالنامہ ارسال کیا کہ میں ایک شیخ کے یہاں ملازم تھا، شیخ کا کاروبار بہت بڑا اور بڑی مالیت کا تھا، وہ اس نے ملازمت کے دوران چوری کے ذریعہ دھیرے دھیرے بڑی رقم جمع کرلی اور اس رقم سے ایک بڑا کاروبار شروع کیا جو کہ اچھا چل رہا ہے، لیکن اب اس کاروبار کو دیکھ کر اس کے دل میں بے چینی ہے اور یہ خیال ستائے جارہا ہے کہ ان کی رقم کس طرح ادا کروں، سامنے آنے اور جرم کا اقرار کرنے میں شرم کے ساتھ بڑے مقدمہ کا خطرہ ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ نے اسے تسلی دیتے ہوئے اس کے مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ جس قدر رقم چوری کی ہے وہ دھیرے دھیرے ان کے کھاتہ میں جمع کرتا رہے، جب پوری رقم ادا ہوجائے گی اس کی تجارت کا کل نفع صحیح ہوجائے گا (فتاویٰ قاضی)۔

جیسا کہ فتاویٰ ہندیہ میں ہے: ''**فیردونہ علی أربا بها إن علموا و إلا تصدقوا علی الفقراء**'' (فتاویٰ عالمگیری ۵/۳۸۵)۔

اس تفصیلی تمہید کا مقصد:

مراسلہ سولنامہ کے دریافت طلب سوالوں کے جواب سے قبل اس تفصیلی تمہید کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمل نادو کے علماء ربانیین نے اس سمینار کے موقع پر علاقہ کا جو معاملہ ہندوستان کو دارالحرب سمجھ کر وطنی بھائیوں یا حکومتی اداروں سے مالی لین دین میں سود کو صحیح و درست سمجھتے ہوئے اختیار کرلیئے جانے کی بات اکیڈمی کے ذمہ داروں کے سامنے رکھی ہے، اس فکرمندی کا جذبہ اور مسئلہ کے حل میں صحیح صورت اختیار کرنے کی فکرمندی قابل مبارکباد ہے، ہر علاقہ اور خطہ کے مذہبی لوگوں کی یہی فکر ہونی چاہیے، لیکن دارالحرب کی بات سامنے آنے پر ہمیں اس پر از سر نو غور کرنی کی دعوت دیتا ہے کہ کم از کم تجارتی امور، بینک سے لین دین وقرض میں ملک کی موجودہ نوعیت کو دیکھتے ہوئے پوچھے گئے امور میں جہاں تک ممکن ہو اجازت ہونی چاہیے۔

جیسا کہ فقیہ العصر حضرت خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم العالیہ اپنی مقبول ومعروف کتاب جدید فقہی مسائل جلد دوم میں دارالاسلام اور دارالحرب کے احکام کے ذیل میں نویں پوائنٹ میں تحریر فرماتے ہیں:

''مسلمان تجار دارالحرب کے باشندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اسلام کے مالی قوانین کے پابند نہ ہوں گے، ہاں یہ ضروری ہوگا کہ ان کے ساتھ دھوکہ دہی نہ کریں، چنانچہ اگر مسلمان تجار حربیوں سے شراب یا خنزیر یا مردار خرید کر کے اس کی قیمت حاصل کرلیں یا قمار یا جوئے کے ذریعہ مال حاصل کریں تو یہ اس کے لیے حلال ہوگا'' **المسلم الذی دخل**

دار الحرب بأمان إذا با ع درهم .....'' (تبین الحقائق بحوالہ فقہی مسائل ۲/ ۲۶۵)۔

اورفرمایااصول کی بنیاد پر دارالحرب میں حربیوں سے سود لینے کی بھی اجازت دی گئی ہے، البتہ یہ رائے امام ابوحنیفہ اورامام محمدؒ کی ہے(۲/ ۲۶۵)۔

مسئولہ سوالات کے جوابات:

۱- وارثین کے پاس والدین کے ذریعہ جو کاروبار آیا، جس کے بارے میں اتنا علم ہے کہ اس میں مال حرام بھی ہے یا اس سے ترقی ہوئی ہے، لیکن یہ مال کتنا اور کس کا ہے اس کا علم نہیں ہے تو موجودہ وارثین اپنے غالب گمان پر اس میں سے اس قدر مال صدقہ کردیں تو بہتر ہے اور اگر خود ہی محتاج ہوں تو ان کے حق میں اس کا استعمال درست ہے۔

امام کرخی رحمہ اللہ کے فتوی کے مطابق حلال ہے، اسی طرح حلال اور حرام دونوں ذرائع آمد ہوں تو پوری تجارت کو حرام نہیں کہا جاسکتا ہے:''**فإن علم عين الحرام لايحل له و يتصدق به بنية صاحبه و إن كان مالا مختلفا مجتمعا من الحرام و لا يعلم أربابه و لا شيئا منه يعلم بعينه حل له حكما** ''(ردالمحتار مع الدرالمختار ۷/ ۳۰۱)۔

۲- اس کے حق میں حلال اور جائز و درست ہے۔

۳- اس صورت میں اولاً بیوی پر ضروری ہے کہ شوہر یا بیٹے کو حرام ذریعہ سے روکے، لیکن کوشش کے باوجود اگر اس کاروبار سے باز نہ آئے اور وہ خود محنت کرسکتی ہو تو محنت کرے، اگر یہ مشکل ہو اور عزت وعصمت کا خطرہ ہو یا گھر سے باہر جانے پر چھوٹے بچوں کی نگہداشت اور حفاظت کا مسئلہ ہو تو شوہر یا بیٹے کی حرام آمدنی سے ہی ضرورت پوری کرے، اس صورت میں شوہر پر گناہ ہوگا اور بیوی عنداللہ ماخوذ نہ ہوگی، جیسا کہ شامی میں ہے:''**اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة**'' (۶/ ۱۹)، البتہ حرام آمدنی سے جس بیٹے کو باپ نے اعلیٰ تعلیم دلائی اور وہ برسرروزگار ہوگیا تو اسے چاہیے کہ اپنی تنخواہ سے اسی قدر رقم خرچ کرکے کسی غریب ومستحق بچے کو تعلیم دلائے یا اس کی ذات پر خرچ کردے، یہ اخلاقاً لازم ہوگا۔

۴- ایسی تقریب میں جس کے داعی کے سلسلہ میں'' حرام آمدنی'' مشہور ہو، مذہبی حضرات کو شریک نہیں ہونی چاہیے اور عدم شرکت کی وجہ حکیمانہ انداز میں داعی کو خود دیں، بجائے دوسروں کے ذریعہ، البتہ اگر ناجائز کے ساتھ جائز کاروبار کا علم بھی عام لوگوں کو ہو تو شرکت کی گنجائش ہے۔

۵- ایسی دعوت سے آنے کے بعد اپنے ہم مجلس کے سامنے دل سے تائب ہو اور نادم اور لاعلمی پر شریک ہوجانے

پر اس میں شریک احباب کے سامنے افسوس کا اظہار کرے، تاکہ ندامت دل سے ہو، اگر ہمت ہو تو سنت صدیقی پر عمل کرتے ہوئے حلق میں انگلی ڈال کر الٹی اور قے کر دے۔

۶- اگر مال حرام سے مراد اس جگہ بینک کا سود یا غیر مسلم سے لین دین میں اضافی رقم لینے سے متعلق ہے تو وہ میرے نزدیک حرام ہی نہیں، وہ مباح اور جائز و درست ہے، جیسا کہ دار الحرب کے سلسلہ میں علماء وفقہا نے تحریر فرمایا ہے۔

اور اگر یہ عام حالات اور پوری ملت مسلمہ سے متعلق ہے تو مال حرام کو حلال بنانے کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جس کا مال لیا ہے وہ بخوشی اس مال سے دست بردار ہو جائے اور اسے چھوڑ دے، یا جس قدر مال چوری کیا تھا یا دھوکہ دے کر حاصل کیا ہے کم سے کم اتنی رقم اس صاحب مال کو کسی بھی طریقہ سے واپس کر دے، جب اتنی رقم واپس کر دی جائے گی تو بقیہ مال کو حلال اور جائز سمجھا جا سکتا ہے۔

ورنہ حق تو یہ ہے کہ جس قدر جس کی رقم تھی اسے نفع کے ساتھ واپس کیا جائے، اگر چہ وہ اس کی پوری دولت ہو، اللہ رازق ہے، اس کے مقدر میں اگر اس قدر روزی کی ملکیت مقدر ہے تو اللہ پھر سے کسی جائز راستے سے عطا فرما دے گا۔

جیسا کہ ارشاد نبوی ہے جو بندہ مال حرام سے خود کو بچاتا ہے اور اس کے ذہن میں فاقہ تک کرتا ہے تو اللہ اسے سال بھر کی روزی عطا فرما دیتا ہے، دوسرے کا مال نفع سمیت واپس کر دینے پر رب تعالیٰ اس کو زندگی کی سخت ترین مصیبت سے نجات عطا فرمائے گا؛ جیسا کہ احادیث میں تین دوستوں کے غار میں پھنس جانے اور اس سے باہر نکلنے میں اپنے اپنے نیک اعمال کے طفیل دعا پر نجات حاصل ہونے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

۷- مال حرام کا صدقہ بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں مردود ہے، ارشاد نبوی علیہ السلام ہے: ''**عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یکتسب عبد مال حرام فیتصدق منہ فیقبل منہ ولاینفق منہ فیبارک لہ فیہ ولا یترکہ خلف ظھرہ إلا کان زادہ إلی النار۔ إن اللہ لا یمحوا السئ ولکن یمحوا السئ بالحسن إن الخبیث لا یمحوا لخبیث**'' (مشکوٰۃ)۔

یہ حدیث مبارکہ تمام ہی سوال کے سلسلہ میں راہ نما ہے۔

مال حرام کا صدقہ نا مقبول ہے، البتہ اس سے وہ وبا اور وبال سے بچ جائے یہ ممکن ہے، فقہاء نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ اگر مال حرام کو ثواب کی نیت سے صدقہ کرے گا، تو وہ کافر ہو جائے گا، اس لیے کہ رب تعالیٰ کے ساتھ ایسا گھناؤنا مذاق کر رہا ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آج کل بہت سے لوگ حرام طریقہ سے مال کماتے ہیں اور پھر گناہ دھونے اور اس کو پاک کرنے کے لیے خوب

صدقہ کرتے ہیں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب بالکل پاک وصاف ہوگئے۔

دوسرا وبال مال حرام کا یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی زندگی سے خیر وبرکت کو ختم کر دیتا ہے، وہ خیر وبرکت سے محروم ہوتا ہے، اس مال سے جو کچھ بھی خریدتا ہے کھاتا ہے پیتا ہے، نہ برکت وعافیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی عبادت ودعاء قبول ہوتی ہے۔

اور تیسرا وبال ان سب سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ یہ مال اس کے جہنم میں جانے کا ذریعہ ہوگا اور اس کی اولادیں اس مال حرام کو استعمال کر کے گنہگار ہوں گے، اس کا ذریعہ بھی یہی ہوگا، اور جب تک یہ میراث باقی اور جاری رہے گی اس کا مال استعمال ہوگا، اس کا گناہ برابر مرنے والے کی روح کو پہنچے گا (العیاذ باللہ تعالیٰ)

اور حلال وحرام نیکی وبرائی کے سلسلہ میں ایک ضابطہ کلیہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''**إن الله لا يمحو السيئ ولكن يمحو السيئ بالحسن إن الخبيث لا يمحوا الخبيث**'' (شرح السنہ)۔

جس طرح برائی سے برائی نہیں مٹتی، بلکہ اچھائی سے برائی مٹتی ہے، اسی طرح مال حرام کو راہ خدا میں خرچ کرنے سے گناہ نہیں مٹیں گے اور نہ ہی اجر وثواب ملے گا، ہاں اگر کوئی شخص حلال کمائی میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو یقیناً ایک کے بدلہ میں سات سو گنا اجر وثواب اس کو عطا کیا جائے گا اور اس میں مزید اضافہ بھی ہوتا جائے گا ''**والله يضعف لمن يشاء والله واسع عليم**''۔

اگر یہ مال حرام بینک کا سود یا بیمہ کی اضافی رقم یا فکس ڈپازٹ والی رقم یا جوئے سٹہ وغیرہ کے ذریعہ یا غیر مسلم کے ذریعہ حاصل شدہ اضافی رقم وغیرہ ہے تو وہ اس کے لیے جائز اور درست ہے، کسی حیلہ وغیرہ کی ضرورت نہیں، لیکن اگر غصب یا چوری کی رقم ہو تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے، البتہ جس کی رقم ہے اس کے کھاتے میں واپس کی ترکیب بنائے۔

۸- ایسی جگہ پر ملازمت درست نہیں، اگر اچانک اور فوری چھوڑنے میں سخت الجھن اور گھر کے ضروری انتظام میں دشواری کا اندیشہ ہو تو اس طرح کی ملازمت پر رہتے ہوئے حلال وجائز نوکری کی تلاش ضروری ہے، جب تک حلال ذریعہ معیشت نہ ہو وہ معذور تصور کیا جائے گا۔

البتہ اگر وہ ایسی ملازمت کی جگہ پر صرف دربان یا جاروب کش ہو یا اسٹاف کی خدمت پر مامور، ہو مالی لین دین یا گواہی یا منشی ومحرر نہ ہو تو نوکری کر سکتا ہے، ورنہ نہیں (امداد الفتاویٰ ۴/ ۱۴۰، فتاویٰ محمودیہ ۱۷/ ۱۱۹)

''**ولا تجوز إلا ..... على حمل الخمر لمن يشربها ولا على الخنزير**'' (الموسوعہ)۔

۹- اگر یہ شخص حرام پیشہ میں عوام کے بیچ مشہور ہو، لوگ سود خور، رشوت خور یا شراب خانہ چلانے، شراب بنانے یا

شراب کا شہری یا علاقائی طور پر ٹینڈر یافتہ ہوتو اس کے یہاں ملازمت کرنے، اس کی گاڑی میں بیٹھنے یا اس کی ضیافت قبول کرنے سے بچنا چاہیے، خاص طور پر ان حضرات کو جو امت کی نگاہ میں مذہبی قائد ہوں۔

البتہ ایسے شخص سے کوئی چیز خریدنا یا اس کو بیچنا اور مجبوری میں اس کے یہاں نوکری کرنا جائز و درست ہوگا، ایسے ملازم کی اجرت اور تنخواہ جائز ہوگی، البتہ وہ ٹیکسی مالک جو اپنی ٹیکسی فائنانس پر اٹھاتے ہیں یا وہ کمپنی اولا وغیرہ جس نے اس طرح کی ٹیکس چلا رکھی اسے بک کرنا، اس پر سوار ہونا، آنا و جانا ہر طرح سے درست ہے۔

۱۰- محتاط علماء و مفتیان کرام نے وہ کام جو کہ جائز اور درست اور قانوناً حق ہے اس کے انجام دہی یا وصول یابی میں سرکاری ملازم بغیر رشوت کے نہ کرتے یا ٹال مٹول کرتے ہوں تو اس میں جائز و حلال ہی رقم دینے کا حکم دیا، لیکن موجودہ ملکی داخلی حالات کے تحت سودی رقم دینا میرے نزدیک جائز اور درست ہے۔

دار الحرب میں جب حربی کا مال حلال ہے اور اپنے ذاتی کام میں لانا مجبوری کے وقت جائز ہے تو ملی رفاہی اور دینی اداروں کے لیے تو بدرجہ اولی درست ہوگا، جیسا کہ احقر نے اس تعلق سے تفصیلی تحریر تمہید میں درجہ کی ہے: ''**ان أبا يوسف جاز مع اختلاف الملة مع الكراهة و عده الزيلعي هناك بأن الكافر لا يهتدى إلى جائز من المعقود**'' (شامی ۷/۴۹۰)۔

۱۱- سوال کی یہ شق بھی سابقہ تمام سوالوں کے مثل ہے، لیکن بستی کی اکثریت سود خوروں یا حرام ذرائع معاش کی ہے، یہ مفروضہ میری سمجھ میں صحیح نہیں ہے، البتہ خدانخواستہ مسلمانوں کی کوئی بستی ایسی ہو جس کے اکثر رؤسا اور مالدار یا عام مسلمان حرام خوری میں ملوث ہوں تو ایسی صورت میں اس بستی سے ملحق مسلم آبادی اور اس علاقہ کے علماء و ائمہ کی ذمہ داری ہوگی کہ اپنی تمام مشغولیوں اور دینی ذمہ داریوں پر اس کو ترجیح دے کر اس بستی والوں کی اصلاح کریں۔

سوال کا یہ جز کہ ''اس شخص کی کمائی کیسی ہے؟ معلوم نہیں'' کے سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ بلا وجہ کسی مسلمان اور صاحب ایمان کے متعلق بدگمانی درست نہیں، اگر وہ بظاہر شریف اور دینی شعور و عمل کا نظر آ رہا ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے سے زیادہ دیندار کسی عالم کو حرام رقم سے نہ ہدیہ دے گا اور کھانا کھلائے گا اور اگر عوام میں سے ہو تو بلا وجہ بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔

نیز اگر یقینی طور پر مال حرام سے بھی ہو تو ضرورت کے تحت مجبوری میں دلجوئی کے طور پر کھانے کی چیزوں کے علاوہ استعمال کی اشیاء کی اگر ضرورت استعمال کی پڑ جائے تو کر سکتے ہیں، مثلاً اس کی گاڑی میں بیٹھ جانا، اس کی کرسی ٹیبل کا استعمال کر لینا، ضرورت پر دیا سلائی پھاوڑے کدال، رسی، بالٹی اس کا بیت الخلاء وغیرہ استعمال کر لینا۔

۱۲- دعاء کا تعلق اگر اس سے ہو جو کہ ناجائز وحرام آمدنی والا ہو تو ایسی صورت میں حرام غذا کی بناء پر اس کی دعاء کا رد ہونا تو صریح حدیث میں وارد ہے، لیکن مومنانہ حق کے تحت اگر وہ سلام کا جواب دے، چھینکنے والے کے الحمدللہ کے جواب میں یرحمک اللہ کہے یا کسی رنج وغم اور مصیبت کے موقع پر تعزیت یا عیادت پر دعاء دے تو یہ اس کے اور خدا کے درمیان کا معاملہ ہے، البتہ اگر کسی نیک وصالح شخص سے وہ دعاء یا دم کا کہے تو اس کے حق میں دعاء کرنا تو اس نیک شخص اور عام مسلمانوں پر ضروری ہے کہ اللہ سے اس کی اصلاح اس کے عادات واطوار کے بدلنے، اس کے دل میں حیاء وتقویٰ کے داخل ہونے کی دل سے دعاء کرے، ایسے اشخاص وافراد کی مدد کی اجتماعی طور پر کوشش کریں یا وہ شخص کسی غیر مسلم سے قرض لے کر کام شروع کرے اور وہ قرض اپنے پاس موجود مال سے ادا کردے۔

☆☆☆

مجبوری میں مالِ حرام سے انتفاع کا حکم

مولانا محمد قمر الزماں ندوی ☆

تمہید وتعارف موضوع:

دنیا میں جس مذہب نے حلال وحرام (روزی) کے درمیان سب سے زیادہ فرق کو واضح کیا اور حلال کو اختیار کرنے اور حرام سے رکنے کا حکم دیا، وہ مذہب اسلام ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی معرفت اور عبادت فرض کی ہے، اسی طرح اس نے اس پر حلال روزی کمانا بھی فرض قرار دیا ہے، چنانچہ جگہ جگہ قرآن وحدیث میں اس کی ترغیب موجود ہے، سورہ جمعہ میں ہے:

''پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہوجائے''۔

رزق حاصل کرنے کے لئے ہر انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے اور کرنی چاہئے، اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کو بھی حلال روزی کمانے کا حکم دیا تھا۔

اسلام نے حرام اور مشتبہ کھانا کھانے سے منع کیا ہے اور باطل طریقہ سے ایک دوسرے کے مال کو کھانے سے روکا ہے: **''ولا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل''** (البقرہ:۱۸۸)۔

باطل طریقہ سے مال کھانے کا مطلب ناجائز اور حرام آمدنی ہے، مثلاً چوری، ڈاکہ زنی کے ذریعہ مال کمانا، سود، دھوکہ، رشوت اور غبن کے ذریعہ اور خیانت اور بدعہدی کے ذریعہ مال کمانا وغیرہ۔

حرام وحلال کا تعلق انسانی معاشرہ سے ہو یا اس کی عائلی زندگی سے، پھر ماکولات ومشروبات ہو یا زندگی کے دوسرے شعبے کسب معاش اور حصول معاش کے طریقوں سے، کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، قرآن وحدیث میں حلال وحرام دونوں مسائل بیان کردیئے گئے ہیں، لیکن زندگی کی تیز رفتاری، جدید تمدن اور صنعتی انقلاب نے دیگر

☆ استاذ مدرسہ نور الاسلام، پرتاپ گڈھ، یوپی

فقہی مسائل کے ساتھ حلال وحرام کے اندر بھی نت نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں، جن کا حل کرنا علماء ارباب افتاء اور ماہرین فقہ کی ذمہ داری ہے۔ ''مال حرام سے منفعت مجبوری میں'' بھی ایک اہم اور حساس موضوع ہے، راقم نے اکیڈمی سے موصول اس موضوع کے سوالات کے جوابات قدیم وجدید مراجع ومصادر سے دینے کی کوشش کی ہے۔

جواب نمبر ۱:

وارثین کو جو مال اپنے مورث سے وراثت میں حاصل ہوا ہے اگر یہ تحقیق ہوجائے کہ وہ مال حرام سے حاصل ہوا ہے، یا غصب اور ناجائز قبضہ کر کے حاصل ہوا ہے، تو ایسی صورت میں جو مال چوری اور غصب شدہ ہے، ان صورتوں میں اس مال کا حرام ہونا یقینی ہے، اور وارثین کو یہ معلوم ہو تو ان کے لیے لینا اور اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اس سلسلہ میں علماء فقہ کے یہاں صریح عبارتیں یعنی دلائل موجود ہیں:

علامہ ابن رشد مالکیؒ لکھتے ہیں:

''**أماالميراث فلا يطيب المال الحرام هذا هو الصحيح**'' (المقدمات الممہدات ۲/ ۶۱۷)۔

علامہ شامیؒ نے فقہاء احناف کے نقطہ نظر کو یوں بیان کیا ہے:

''**مات وكسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز الناقل وقال لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقا على الورثة فتنبه**'' (ردالمحتار ۵/ ۱۰۴)۔

البتہ جو سودی رقم آزادی سے قبل غیر مسلموں سے حاصل ہوئی تھی، وہ جواز کے دائرے میں آجائے گی، اگر تحقیق ہو تو اس کا استعمال جائز ہوگا، کیونکہ آزادی سے قبل ہمارا ملک دارالحرب کے حکم میں تھا، فقہاء نے یہی فتوی دیا تھا۔

لیکن اگر محقق نہ ہو تو ''**الأصل في الأشياء الإباحة**''، ''**إضافة الحادث إلى أقرب أوقاته**'' اور ''**إذا تعارض المانع والمقتضى يقدم المانع**'' اور ''**إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**''، ان جیسے قواعد کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کیا جائے گا۔

میری نظر میں صورت مسئلہ میں حلت وحرمت دونوں پہلو جمع ہو گئے ہیں، اس لئے حرمت کے غلبہ کے تحت حرام ہونے کا حکم دیا جائے گا۔

جواب نمبر ۲:

جس مال وجائیداد کے بارے میں انسان کو قطعی اور حتمی طور پر معلوم ہو کہ وہ مال وجائیداد اسے حرام طور پر حاصل

ہوا ہے، خواہ اس کو اس نے خود اس طریقہ سے حاصل کیا ہو یا وراثت میں اس طرح کا مال حاصل ہوا ہو، وہ مال وجائیداد اس کے لئے ناجائز اور حرام ہوگا۔

علامہ ابن نجیم مصری نے الاشباہ والنظائر میں لکھا ہے کہ حرمت کا علم ہونے سے حرمت متعدی ہوجاتی ہے۔

"**الحرمة يتعدى مع العلم بها**" (الاشباہ والنظائر: ۲۳۵۰)۔

الموسوعۃ الفقہیۃ میں اس بارے میں مذکور ہے:

"**المال الحرام كالماخوذ غصباً أو سرقة او رشوة أو نحو ذلک ليس مملوكا لمن هو بيده**" (الموسوعۃ الفقہیۃ: ۲۳)۔

امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ اگر حرام (مال و دولت اور جائیداد) کئی لوگوں تک پہنچ جائے، اس کے باوجود اس کی حرمت باقی رہتی ہے، اور اصل مالک کو لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

البتہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ قابض شخص کے لئے وہ مال وجائیداد حلال ہیں، کیونکہ یہ جائیداد "اُثمان یعنی غیر اُعیان" کے ذریعہ حاصل ہوئے ہیں اور اگر اعیان ہی مغصوب ہیں تو انہیں صدقہ کرنا ضروری ہے۔

قوله: (فعليه التصدق بقدرها من ماله) أى الخالص به من الظلم، و هذا إن كان له مال و فى الفصول العلامية: لو لم يقدر على الأداء لفقره أو نسيانه أو لعدم قدرته، قال الشداد و الناطفىؒ لايؤاخذ فى الآخرة إذا كان الدين ثمن متاع أو قرضا، و إن كان غصباً يواخذ به فى الآخرة و إن نسى غصبه، و إن علم الوارث دين مورثه والدين غصب أو غيره فعليه أن يقضيه من التركة، و إن لم يقض فهو مواخذ به فى الآخرة، و إن لم يجد المديون ولا وارثه صاحب الدين ولا وارثه فتصدق المديون أو وارثه عن صاحب الدين برئ فى الآخرة" (ردالمحتار مع الدرالمختار کتاب اللقطۃ ۶/ ۴۴۳)۔

"**قوله (يجب عليه أن يتصدق بمثله) المختار أن لايلزمه ذلک فى القهستانى عن الظهيرية، و كذا فى البحر النهر عن الولوالجية**" (ردالمحتار مع الدرالمختار ۶/ ۴۴۳)۔

ان عبارتوں کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ صورت مسئلہ میں نقود غیر متعینہ سے حاصل کردہ موجودہ مال و دولت، جائیداد اور دیگر آمدنی و اشیاء حلال ہیں، اور اس شخص کا کرایہ لینا بھی جائز اور درست ہے، لیکن پوری جائیداد کے انتظام وانصرام میں جتنا ناجائز روپیہ صرف ہوا ہے، اندازہ کرکے اتنا روپیہ ضرور صدقہ کردے، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر ۳: اگر سرپرستوں کا کاروبار حرام ہو تو ماتحت کیا کرے؟

صورت مسئلہ میں عورت مجبور ہے، اس لئے ایسے شوہر یا اولاد کی آمدنی میں سے وہ کھا سکتی ہے، جبکہ اس کے پاس حلال روزی کھانے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہو، جہاں تک حرام کمائی سے تعلیم وتعلم کا حکم ہے، تو اس تعلیم سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے، البتہ تعلیم یا دیگر ضروریات میں جو رقم خرچ کی گئی ہے، اور اس رقم کی مقدار کا علم ہے تو اتنی مقدار میں صدقہ کردے، تاکہ دیانۃ باپ اور سرپرست کا گناہ ساقط ہوجائے۔

"لأن الطعام والكسوة ليس عين المال الحرام، فإنه إذااشترى به شيئاً۔ يحل أكله على تفصيل تقدم فى كتاب الغصب، بخلاف ما تركه ميراثاً، فإنه عين المال الحرام، و إن ملكه بالقبض۔ و الخلط عند الإمام فإنه لايحل له التصرف فيه قبل أداء ضمانه، و كذا الورثه ۔ ثم الظاهر أن حرمته على الورثة لا الحكم فلايجوز لوصى القاصر التصدق به و يضمنه القاصر إذا بلغ" (الردمع الدرالمختار کتاب الحظر والإباحۃ ۵/ ۵۵۴، زکریا)۔

اوپر جو بات آئی یہ فتوی ہے، تقوی یہ ہے کہ وہ عورت اپنے شوہر اور اولاد کو حرام کمائی سے منع کرے اور ہو سکے تو حلال کمائی کی نشاندہی کرے، اور اس میں لگانے کی ہر ممکنہ تدبیر اور کوشش کرے۔

لیکن اس کے باوجود وہ باز نہیں آتا، تو عورت کے لئے اگر حلال روزی کے اسباب ہوں تو اس کو اختیار کرے، لیکن اگر کوئی صورت نہ ہو تو مجبوراً اس کے لئے اس مال سے کھانا درست ہوگا، نیز دیگر ضروریات کی تکمیل بھی جائز ہوگی؛ البتہ دل میں اس کو برا تصور کرتی رہے، اس حرام کمائی کا سارا گناہ کمانے والے شوہر یا بیٹے پر ہوگا۔

علامہ شامیؒ جامع الفصولین کے حوالے سے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **"فى جامع الفصولين اشترى الزوج ..... طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله و لبسها والإثم على الزوج"** (ردالمحتار علی درمختار: ۶/ ۱۹۱)۔

ایک دوسری جگہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: **"امراء ة زوجها فى أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصباً أواشترى طعاماً أو كسوة من مال ليس أصله بطيب فهى فى سعة من ذلك والإثم على الزوج"** (ردالمحتار علی درمختار: ۶/ ۲۸۶)۔

پس مذکورہ تفصیلات اور وضاحت سے یہ نتیجہ نکلا کہ مجبوری کی صورت میں عورت کے لئے شوہر یا اولاد کی اس کمائی سے فائدہ اٹھانا جائز اور درست ہے، البتہ عام حالت میں اس کی اجازت نہیں ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر: ۴ حرام وحلال مخلوط آمدنی والے کی دعوت قبول کرنے کا حکم:

شریعت کا اصول یہ ہے کہ اگر آدمی کی اکثر آمدنی ناجائز اور حرام ہے، اور مدعو کو علم ہے کہ اس کی آمدنی حرام ہے تو ایسی دعوت قبول کرنا یا ایسے شخص کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، جب تک داعی کی طرف سے یہ وضاحت نہ ہوجائے کہ یہ دعوت حلال آمدنی سے کی جارہی ہے، اور اگر کسی شخص کی زیادہ تر آمدنی حلال ہے اور کچھ حرام کاروبار بھی ہے تو ایسی صورت میں اس شخص کی دعوت قبول کرنا جائز اور درست ہے، ہاں اگر داعی یہ واضح کردے کہ اس دعوت میں مال حرام سے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے تو پھر دعوت قبول کرنا درست نہیں ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس به، إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام، فينبغي أن لايقبل الهدية، ولا يأكل الطعام، إلاأن يخبر بأنه حلال ورثه أو استقرضه من رجل**'' (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۴۲)۔

اب یہاں صورت حال یہ ہے کہ داعی یا واہب حرام میں ملوث ہے، اور اس کے یہاں حرام رقم آتی ہے، لیکن یہ متعین نہیں ہے کہ کتنی آتی ہے؟ پورا مال یا مکمل یا کچھ حرام ہے؟ تو اس سلسلہ میں بعض نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی صورت میں کھود کرید کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی تحقیق وتفتیش کی زحمت کرنی کرنی چاہئے، مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذرہ ایک یہودی کے یہاں رہن رکھ کر جو ادھار لیا تھا، حالانکہ یہودیوں کی سودخوری محتاج بیان نہیں''۔

مسند احمد کے الفاظ اس طرح ہیں:

''**عن أنس ابن مالک رضی الله عنه أنه مشى إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم بخبز شعير و إهالة سخنة و لقد رهن ذرعه عند يهودى فأخذ شعيرا لأهله**'' (مسند احمد:۱۳۱۶۹)۔

اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے ملا علی قاریؒ نے مرقاۃ المفاتیح میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے جو (غلہ) لے لیا، حالانکہ یہودی اپنے معاملات میں سودی کاروبار کرتے تھے اور شراب کی قیمت کو بھی جائز خیال کرتے تھے (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح:۶/ ۱۱)۔

اسی طرح امام بغویؒ نے شرح السنہ میں لکھا ہے کہ جب حلال وحرام دونوں ہوں (اور غالب غیر غالب کا علم و پتہ نہ ہو) تو اسے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب تک کہ داعی خود وضاحت نہ کردے کہ یہ کھانا مال حرام سے بنایا گیا ہے۔

''**قالوا إذا كان المال فيه الحلال والحرام فلا بأس أن يوكل منه إلا أن يعلم أن الذى يطعمه أو يهديه إليه حرام بعينه فلا يحل**'' (شرح السنۃ:۸/ ۱۴)۔

لہٰذا اب وضاحتوں کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر حلال وحرام دونوں مال کی آمیزش ہوتو اس کے یہاں از روئے فتوی عوام الناس کو ان کے یہاں دعوت کھانے کی گنجائش ہے، جب تک کہ وہ خود مال حرام سے کھلانے کی وضاحت نہ کردے، لیکن میری نظر میں اہل تقوی اور متدین لوگوں کو نیز علماء اور ارباب فتوی کو ایسی دعوت قبول کرنے سے بچنا چاہئے، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر: ۵ مال حرام سے دعوت کھانے کی تلافی:

اگر وہ شخص یعنی دعوت کھانے والا غریب اور محتاج ہے، وہ خود نان شبینہ کا محتاج ہے اور وہ صدقہ کرکے اس کی تلافی نہیں کرسکتا ہے، تو اس کو چاہئے کہ وہ توبہ کرے، اللہ سے استغفار کرے، اور اس بھول پر ندامت کے آنسو بہائے، کیونکہ قرآن مجید اس کی طرف اشارہ کرتا ہے:

"إنما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئک يتوب الله عليهم و كان الله عليما حليما" (سورہ نساء:۱۷)۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: **"التائب من الذنب كمن لا ذنب له"** (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو)۔

اگر وہ شخص مالدار ہے تو توبہ واستغفار کے ساتھ ساتھ آدمی کو چاہئے کہ ایک اندازہ کرکے بلکہ کچھ بڑھا کر جتنا کھایا ہے، اس کی قیمت صدقہ کردے، کیونکہ مال حرام سے اگر کوئی شخص فائدہ اٹھالے، یا استعمال کرلے تو اصل حکم یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، اس کو بعینہ واپس کردے، حتی کہ حدیث میں ہے کہ اگر لقمہ منھ میں موجود ہو تو اسے بھی اگل دینا ضروری ہے، چنانچہ مال زکوۃ کے سلسلہ میں ایک روایت ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ منھ میں رکھ لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ سے نکلوایا۔

"عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: أخذ الحسن بن علي رضي الله عنه تمرة من تمر الصدقة، فجعلها فيه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم كخ كخ، ارم بها، أما علمت أنا لانأكل الصدقة" (بخاری شریف، حدیث نمبر ۱۴۹۱)۔

لیکن چونکہ صورت مسئولہ میں کھانا کھالیا ہے اور بعد میں علم ہوا ہے، اس لئے اس کھانا کو نکالنا تو ممکن نہیں ہے، اس لئے اس کا حل یہ ہے کہ اس کا بدل یعنی اس کی قیمت صدقہ کردے اور فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ جب اصل فوت ہوجائے تو بدل کو اختیار کیا جاتا ہے۔

"إذا بطل الأصل يصار إلى البدل" (مجلۃ الأحکام العدلیۃ)۔

البتہ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے اور اس جزئیہ کو لکھا ہے کہ اگر کھانے والا خود فقیر و محتاج ہے، یعنی صاحب نصاب نہیں ہے، تو اس کے لئے صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے، اس کے لئے اس کھانے کی گنجائش ہے، کیونکہ بوقت ضرورت ملک حرام سے غرباء اور فقراء کو فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

چنانچہ علامہ موصلیؒ الاختیار لتعلیل المختار میں لکھتے ہیں:

"الملک الخبیث سبیله التصدق، و لو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنیا تصدق بمثله و إن کان فقیرا لا یتصدق" (الإختیار لتعلیل المختار: ۳/ ۷۰)۔

خلاصہ یہ کہ اگر فقیر نے ایسی دعوت کھائی ہے تو اس کے لئے اس کی گنجائش ہے، اور اگر امیر نے مال حرام دعوت میں استعمال کیا ہے تو وہ توبہ واستغفار کرے اور ساتھ ہی اتنی قیمت کا اندازہ کر کے صدقہ کر دے، واللہ اعلم بالصواب، وعلمہ اتم۔

جواب نمبر: ٦ ماضی کے کمائے ہوئے مال حرام کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر:

ماضی میں کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کے لئے بعض علماء اور اصحاب افتاء نے یہ بات لکھی ہے کہ اگر اس شخص نے کوئی سامان ادھار خریدا اور پھر اس ناجائز مال سے اس کی قیمت ادا کر دی، تو وہ سامان اس کے لئے حلال ہو جائے گا، اس طرح بالواسطہ اس کی رقم پاک اور استعمال درست ہو جائے گا۔

اس سلسلہ میں فتاوی ہندیہ کی درجہ ذیل عبارت سے استفادہ کی راہ نکلتی ہے:

"والحیلة فی هذه المسائل أن یشتری نسیئة، ثم ینقد ثمنه من أی مال شاء" (الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۴۲، کتاب الکراہیۃ)۔

لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ مسئلہ اور حیلہ مطلقا درست نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ مال حرام کو ملکیت میں لانے اور اس کو جان بوجھ کر اپنے نفع میں خرچ کرنے کا گناہ کیسے ختم ہو سکتا ہے؟

اس لئے مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس پر گرفت کرتے ہوئے اس کا محمل بھی متعین کر دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس حیلہ سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا، وہ حلال ہو جائے گا۔ لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا" (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۲۵)۔

اس سے پتہ چلا کہ اوپر جو طریقہ مال حرام کو پاک کرنے کا لکھا گیا ہے، وہ مکمل طور پر صحیح نہیں ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ اس بابت فرماتے ہیں:

"مال حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مال حرام نہیں، بلکہ صرف وہ مال حرام ہے، جس کے

مالک نامعلوم یا لاپتہ ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جاسکتا، نیز یہ صورت بحکم لقطہ ہوجاتا ہے اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے، اس لئے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لیے حرام نہیں، اور اس بناء پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں، باپ اولاد اور بیوی پر کرسکتا ہے، کیونکہ اس کا صدقہ نہیں، بلکہ اصل مالک کا ہے'' (کمافی عبارۃ الہندیۃ)۔

و فی البزازیة "فیرده علی أربابها، إن علموا، وإلا تصدق علی الفقراء" (علی هامش الهندیة ۶/۳)، أو فی کراهة الهندیة: إن تصدق به علی أبیه یکفیه ولایشترط التصدق علی الأجنبی" (فتاوی عالمگیریہ ۵/۱۳۸۵)۔

اس تفصیل اور وضاحت کے مطابق اگر باپ یا مالک خانہ کی آمدنی حرام ہو، اور اس کی بالغ اولاد مسکین ہو تو ان اولاد کو بھی کھانا جائز نہیں ہے، البتہ ان اموال کو بطور صدقہ گھر میں اپنی بیوی یا بالغ اولاد کو مالک بنادے، پھر وہ بالغ اولاد یا بیوی والدین گھر کے تمام مصارف پر خرچ کرسکتے ہیں، اس طرح پورا گھرانہ حرام خوری کی لعنت سے محفوظ ہوجائے گا۔

ہاں پہلی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جو حرام مال جمع ہے اس کو اصل مستحق تک واپس کردیا جائے، یا صدقہ کردیا جائے۔

لیکن اگر اصل حرام مال کو تجارت وغیرہ میں مشغول کردیا اور اب اصل رقم باقی نہیں بچی تو اب جاری تجارت اور کاروبار کی آمدنی حلال ہوگی۔

البتہ جتنی مقدار میں حرام مال تجارت میں کھایا ہے اتنی مقدار میں مال کو صدقہ کرنا اس کے لئے ضروری ہے ہوگا۔

اس کی ایک شکل حیلہ وتملیک کی ہے، اس کے ذریعہ بھی مال حرام کو حلال کے دائرہ میں لایا جاسکتا ہے، یعنی جیسے زکوۃ اور صدقات واجبہ کی تملیک کے ذریعہ پاکی کرکے دے کر مصارف میں استعمال کرنے کی گنجائش نکل جاتی ہے، وہ طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اصل مالک کا پتہ نہ چل سکا ہو اور اس کے ورثہ کا بھی علم نہ ہو اور آخری صورت واجب التصدق کی بچی ہو تو تملیک کرا کر یعنی کسی محتاج فقیر کو صدقہ کردے، پھر وہ فقیر محتاج اسے ہدیہ یا ہبہ کے طور پر واپس کردے، تو اب یہ رقم اس کے لئے جائز اور حلال ہوگی، لیکن اصل مالک اور ورثہ معلوم ہو تو لوٹانا ضروری ہوگا۔

بذل المجہود میں ہے: **"من اکتسب مالا بغیر حق یجب رده علی مالکه"** (بذل المجہود: ۲۵۹۱، کتاب الطہارۃ)۔

بعض لوگوں نے اس جزئیہ کو بھی تائید میں پیش کیا ہے: **"عن انس رضی الله عنه أن النبی صلی الله علیه وسلم أتی بلحم تصدق علی بریرةؓ هو علیها صدقة وهو لنا هدیة"** (بخاری: ۱۴۹۵، کتاب الزکوۃ)۔

جواب نمبر: ۷ حرام مال بطور قرض لینا کیسا ہے؟

مذکورہ سوال کا جواب یہ ہے کہ حرام کمائی کا اولین مصرف تو یہی ہے کہ جس سے وہ مال حاصل ہوا ہے اور ہو رہا ہے،

اس کو واپس کیا جائے، اور گر یہ صورت مشکل ہو تو اسے صدقہ کیا جائے۔

لیکن بعض فقہاء نے ضرورت منداور اہل حاجت کے لئے اس کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت دی ہے اور اپنے استعمال میں لانے کی ایک صورت وقتی اور عارضی طور پر قرض لینے اور بعدہ واپس کر دینا بھی ہے۔

چنانچہ علامہ موصلی نے ایک جگہ اس کی جانب صراحت کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"الملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنیاتصدق بمثله و إن کان فقیرا لایتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار: ۳/۷۰، دار الکتب)۔

علماء احناف کے یہاں حرام مال کو بطور قرض لینا جائز ہے یا ناجائز اس کی تفصیلات تو نہیں مل سکی، لیکن دیگر فقہی مسالک میں اس کی تفصیلات موجود ہیں:

علامہ ابن تیمیہؒ اپنے فتاوی (مجموع فتاوی ابن تیمیہ: ۲۹/۳۰۹) میں لکھتے ہیں:

"فإن کان یقدر یتجر أو یعمل صنعة کالنسج والغزل، أعطی مایکون به رأس، و إن اقترضوا منه شیئاً لیکتسبوا به، ولم یردوا عوض القرض کان أحسن" (مجموع فتاوی ابن تیمیہ)۔

ان فقہی جزئیات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس طرح کے مال سے وقتی طور پر قرض لے سکتا ہے اور جب سہولت ہو تو راس المال کے بقدر صدقہ کر دے۔

لیکن اس سے بہتر شکل یہ ہے کہ وہ شخص پہلے ان روپیوں کو کسی غریب کو صدقہ کر دے اور پھر اسی غریب سے قرض لے لے، بعدہ اس کو واپس کر دے، اسی طرح بیوی، بالغ فقیر اولاد، محتاج والدین پر صدقہ کر دے، پھر ان سے قرض یا ہدیہ لے لے، یہ صورت زیادہ بہتر ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر ۸: حرام وحلال مخلوط کاروبار میں ملازمت کا حکم:

اس سلسلہ میں کام کی مقدار دیکھی جائے گی، اگر حرام کام کی مقدار زیادہ ہے تو اس کی آمدنی حلال ہوگی، اور حرام کی مقدار زیادہ ہے تو اس حرام کام کی نوعیت پر غور کیا جائے گا، یعنی وہ ملازم حرام کام کا سبب بن رہا ہے یا مباشر؟

اگر مباشر نہیں بن رہا ہے تو جائز ہوگا، اور اگر مباشر بن رہا ہے تو ناجائز ہوگا۔

اسی طرح اگر اصلا حلال کام کے لئے معاہدہ ہوا تھا، لیکن اسی کے ساتھ کچھ شریعت کے خلاف کام کرنا پڑتا ہے تو آمدنی تو حلال ہوگی، لیکن اس میں کام کرنے والے کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی ملازمت کو جلد چھوڑنے کی کوشش کرے اور دوسری ملازمت اختیار کرے؛ کیونکہ حکم شریعت ہے: **"ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان"** (المائدہ: ۲)، اس لئے ہر ایسا

عمل جس میں تعاون علی الاثم اور گناہوں کوانجام دینا پڑتا ہواس کام کوکرنا، اس کی اجرت لینا اوراس میں معاونت کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگرآدمی کا بزنس حرام کاموں کا ہو،اوراس میں آدمی کا عملا تعاون پایا جاتا ہوتو پھر وہ نوکری اوراس کی اجرت لینا جائز نہیں ہے،لیکن اگر سامنے والے کوصرف جائز کام کرنا پڑتا ہو، ناجائز نہیں تو پھر کوئی حرج نہیں ہوگا، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر ۹: حرام کمائی سے حاصل جائیداد سے استفادہ کا حکم شرعی:

اگر کسی شخص کی متعین ومخصوص حرام وناجائز (کام) ملازمت پر ڈیوٹی نہیں ہے، ہاں اس شعبہ میں غلط اور ناجائز کام ہوتے ہیں تو ایسے مقامات پر اس ملازم کی ملازمت کی اجرت حلال وجائز ہے، "**غیر متعین و غیر مشار إلیها حرام نقود**" سے خریدی گئی گاڑی میں خبث وناپاکی کا اثر نہیں جاتا، اس لئے ایسی گاڑیوں میں سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہی حکم فیس تعلیم کا ہے، ایسے لوگوں کے بچوں کی فیس تعلیم اس رقم سے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ جب کہ وہ رقم غیر متعین وغیر مشار ایسا حرام نقود فیس میں ادا کرتا ہے، لیکن متعین ومشار الیہا حرام نقود سے فیس دیتا ہے تو لینا جائز نہیں ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ حرام سے حاصل شدہ جائیداد اگر بعینہ حرام ہے مثلاً وہ غصب کردہ ہے، رشوت کا مال ہے، تو وہ زمین بالکلیہ حرام ہوگی، اس میں کاشت کرنا بھی ناجائز ہوگا، اس کو اصل مالک کی طرف لوٹانا ضروری ہوگا، اس لئے اس پر ملکیت ثابت ہی نہیں ہوا۔

"**المال الحرام کالماخوذ غصباً أو سرقة أو رشوة أو رباً أو نحو ذلک لیس مملوکا لمن هو بیده**" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۳/۲۴۸)۔

اور اگر نفس جائیداد حرام نہ ہو، بلکہ حرام سے خریدی گئی ہوتو پھر اس میں تفصیل ہے، طوالت کی وجہ سے اس تفصیل کو حذف کررہے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس سوال میں جو سوالات پوچھے گئے ہیں بعض صورت میں وہ جائز ہیں اور بعض صورت میں ناجائز، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر ۱۰: بوقت مجبوری رشوت میں سود کی رقم کا استعمال کیسا ہے؟

اس سلسلہ میں علماء اور ارباب افتاء کی دوطرح کی رائیں ہیں، بلکہ دوطرح کے فتوے ہیں، پہلے دونوں کو ہم ذکر کرتے ہیں۔

عدم جواز کے قائلین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سود کا اولین مصرف یہ ہے کہ جس سے وہ رقم حاصل ہوئی ہے، اس کو واپس

کردی جائے، اگر اس کے اصل مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہوتو پھر بلا نیت ثواب اسے صدقہ کرنا ضروری ہے۔

اس کو اپنے نفع میں استعمال کرنا درست نہیں ہے، ان کی دلیل ہے:

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له، و يتصدق به بنية صاحبه" (فتاوی شامی: ۹۹/۵، مطلب فی من ورث مالاً حراماً)۔

موسوعہ میں ہے:

"المال الحرام كالماخوذ غصباً أو سرقة أو رشوة أو رباً أو نحو ذلک ليس مملوكا له بيده" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۴۸/۲۳)۔

مذکورہ عبارت سے معلوم ہوا کہ سود وغیرہ سے ناجائز مال پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی، جب ملکیت ثابت نہیں ہوتی تو اپنے مصرف میں استعمال بھی درست نہیں ہوگا، اور جب یہ درست نہیں ہوا تو عمارت وغیرہ کی منظوری کے لئے متعلقہ اداروں اور کارپوریشن والوں کو سود کے پیسے روپئے دینا درست نہیں ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس طرح کی رقم سرکار کے خزانے میں بھی نہیں جاتی کہ سرکاری بینک سے ملی رقم کو "ردعلی ارباب المال" کی صورت مان لی جائے اور جواز کی شکل نکل آئے؛ بلکہ یہ پوری رقم ملازمین اور کلرک لوگوں کے جیبوں میں پہنچ جاتی ہے، خلاصہ یہ کہ عدم جواز کے قائلین اس قسم کی رقم کو کارپوریشن کے ملازمین کو بطور رشوت دینا جائز کسی حال میں نہیں سمجھتے اور اس کو درست نہیں قرار دیتے، جو لوگ جواز کے قائل ہیں، ان کے نزدیک بوقت مجبوری رشوت میں سود کی رقم استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ سودی رقم کا حکم یہ ہے کہ اس کو اپنے مصرف میں استعمال کرنا ناجائز ہے، اس رقم کو تصدق علی الفقراء ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن اس پر کوئی نص (قرآن وحدیث سے دلیل) نہیں ہے، یہ اجتہادی مسئلہ ہے، علماء نے مالک کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے تصدق علی الفقراء کا حکم لگایا ہے، تاکہ مالک کو اس کا ثواب ملتا رہے، ثواب پہونچنے کے لئے تصدق علی الفقراء ہی ضروری نہیں، بلکہ ہر وہ کام جو باعث ثواب ہے اس میں ایسے مال کے استعمال کی گنجائش ہے، ملی اداروں اور ان کی تعمیرات بھی ثواب اور صدقہ جاریہ کا باعث ہیں۔

راقم الحروف کی نظر میں موجودہ حالات میں جہاں مسلمان اس ملک میں اضطراری حالت میں زندگی گزار رہے ہیں، ہر طرف سے ان پر ناطقہ بند ہے، مجبوری کی حالت میں مجبور افراد اور جماعت وادارہ کے لئے اس کی گنجائش ملنی چاہئے، اور بوقت مجبوری سود کی رقم کو ملی کاموں میں استعمال کی اجازت دینی چاہئے، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر:۱۱ اکثر آمدنی حرام والے کا ہدیہ قبول کرنا کیسا ہے؟

صورت مسئلہ میں جو تفصیلات مال مشکوک کے استعمال اور اس کو بطور ہدیہ قبول کرنا صحیح ہے یا صحیح نہیں ہے کے بارے میں ہیں، ان کو کتاب وسنت کی روشنی میں لکھا جارہا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے بارے میں متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ سودخور ہے تو صرف امکان کی وجہ سے اس کی رقم اور کمائی نیز دیگر سامان کے ناپاک اور حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، کیونکہ ضابطہ ہے کہ لوگوں کے مال میں اصل حلت واباحت ہے اور اس میں حرمت وناپاکی کا ہونا محض شک اور گمان ہے اور فقہی ضابطہ ہے "**الیقین لایزول بالشک**"۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کے بارے میں سوال کرنے اور تفتیش کرنے سے منع فرمایا ہے۔

"**عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا دخل أحدکم علی أخیه المسلم فأطعمه طاعاما فلیأکل من طعامه ولا یسأله عنه۔ فإن سقاه شرابا یشربه فلیشرب من شرابه و لم یسأله عنه**" (مسند احمد:۲/۲۹۹، راقم الحروف، ۹۱۷۳)۔

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۴ کے ضمن میں بہت حد تک آچکا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی کی اکثر آمدنی حلال ہے اور کچھ حرام کاروبار بھی ہے تو ایسی صورت میں اس شخص کا ہدیہ قبول کرنا درست ہوگا، دیگر چیزوں کا لینا بھی جائز ہوگا، جس شخص کے بارے میں آپ کو یقینی طور پر معلوم نہ ہو یا معلوم ہو مگر عین شئ کا حرام ہونا معلوم نہ ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب نمبر ۱۲: حرام کمائی والے کی دعا کا شرعی حکم:

صورت مسئلہ میں کسی عالم دین یا بزرگ شخصیت کا حرام کھانے والے کے لئے دعا کردینا، پانی پر دم کرنا، ان کے بچے کا نام رکھنا درست ہے، کیونکہ وہ شخص جو دعا کررہا ہے، وہ خود اس حرام میں ملوث نہیں ہے، دوسرے کی حرام کمائی میں شامل ہونے سے اس عالم یا بزرگ کی دعا پر اثر نہیں پڑے گا۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ جس کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، صحیح مسلم کی حدیث ہے:

"**الرجل یطیل السفر أشعث أبر یمد یدیه إلی السماء، یارب، یارب، و مطعمه حرام و مشربه حرام، و غذی بالحرام فأنی یستجاب**" (صحیح مسلم ۱۰۱۵، کتاب الزکوۃ باب قبول الصدقۃ)۔

مذکورہ روایت سے ظاہر ایہی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مال حرام کھاتا ہے اور کار حرام میں ملوث رہتا ہے، اس کی دعا

بارگاہ ایزدی میں قبول نہیں ہوتی، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دراصل قبول دعا کے استبعاد کو ظاہر کرنے کے لئے بطور تمثیل ہے، علامہ رجب حنبلیؒ نے بھی اس حدیث کا یہی مفہوم بتایا ہے۔

"**وما ذكره بعد ذلک من الدعاء أنه كيف تقبل مع الحرام فهو مثال لإسبعاد قبول الأعمال مع التغذية بالحرام**" (جامع العلوم والحکم: ۳۴)۔

خلاصہ یہ کہ اگر کسی شخص کی روزی حلال اور پاکیزہ نہ ہو تو اس کو دعا کرنے سے روکا نہیں گیا ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کی دعا قبول نہیں ہوگی، اس لئے مذکورہ شخص اپنے یا اپنے بچوں کے لئے کسی نیک اور صالح شخص سے دعا کی درخواست کرے، تو اس کے لئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی شکیل منصور القاسمی ☆

الحمد لله العلي المنان، والصلاة والسلام على النبي العدنان، وعلى آله وصحبه المنتخبين الأخيار، أما بعد!

مال انسانی زندگی کا لازمی عنصر ہے، اور فرد ومعاشرہ، ہر دو کے لئے ناگزیر دینی ودنیوی ضرورت ہے، خوراک، لباس، رہائش، اور نقل وحمل کی جملہ ضرورتوں کی تکمیل؛ حتی کہ زکاۃ وحج جیسے ارکان اور بر، صدقہ، احسان، وقف، دعوت وتبلیغ، جہاد اور دفاع اسلام جیسے اہم ترین اعمال وارکان، مال پر موقوف ہیں، مال شریعت اسلامیہ کے ان مقاصد (دین، نفس، عقل، نسل، مال) میں داخل ہے جن کے تحفظ کے لئے شریعت کا نزول ہوا ہے، اسلام کی نظر میں ہر طرح کا مال طیب وپاکیزہ ہے، نہ ہر مال قابل احترام وانتفاع ہے، بلکہ متقوم وغیر متقوم اور کسب طیب اور کسب خبیث کی تقسیم موجود ہے، کسب طیب کی ترغیب وتحریض اور کسب خبیث پر وعید قرآن وسنت میں حد وحساب سے باہر ہے، یہاں ان کی تفصیلات کا موقع نہیں۔

مال خدا کی طرف سے بندوں کے لیے ایک نعمت ہے، خدا کی تمام نعمتیں ہماری تکریم وتوقیر، دیکھ بھال اور حسن تدبیر ورعایت کے مستحق ہیں، علماء نے متفقہ طور پر فرمایا ہے کہ ''تحفظ مال'' پانچ اہم ضروریات میں سے ایک ہے، جن پر شریعت کا مدار ہے اور اس کا مقصد نزول بھی ہے؛ اس لئے نعمت مال کی حفاظت کرنا من جملہ واجبات کے ایک واجب شرعی ہے، مال کی اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر شریعت مطہرہ نے اس بابت اہم ترین اصول وضع کر دیئے ہیں، ان اصول کی رعایت ولحاظ کے ساتھ اگر مالی تصرفات (معاوضات ہوں یا تبرعات واباحات) سرانجام دیئے گئے تو سارے تصرفات مباح ہونگے، جبکہ ان شرعی اصول تصرف سے انحراف کے ساتھ انجام دیا جانے والا معاملہ اور اس سے حاصل شدہ منفعت ''مال حرام'' کہلائے گا، جس سے خلاصی وچھٹکارا کے متعدد طرق بھی شریعت نے بتا دیئے ہیں، شرعی اصول تصرف سے کم آگاہی یا عدم واقفیت کے باعث آج کے زمانے میں غیر شرعی مال کے تبادلے وانتفاع کا ابتلاء عام ہو رہا ہے، ہر زمانے میں حالات

☆ بیگوسرائے

وزمانے کے تقاضے اور چیلنجز کے مطابق پیش آمدہ مسائل کا قرآن وسنت سے حل پیش کرنا علماء دین کی ذمہ داری رہی ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے مال حرام ودیگر موضوعات سے متعلق آج بحث وتحقیق اور غور وخوض کے لئے جن پہلوؤں کو چنا ہے وہ واقعی اہم وحساس اور بروقت انجام دیا جانے والا مستحسن اقدام ہے۔

حرام مال میراث سے حلال کاروبار کرنا؟

جواب:ا

وراثت میں حاصل شدہ مال میراث کے ذرائع کسب وحصول کی جہتِ حلت وحرمت کا علم اگر وارثین کو نہ ہو کہ آیا مورث (میت) نے یہ مال حلال ذرائع سے حاصل کئے تھے یا حرام ذرائع سے؟ اور نہ ہی اس بابت کوئی علامت ونشانی موجود ہو ہو تو باجماع علماء یہ مال وارثین کے لئے حلال ہے؛ کیونکہ اموال مسلمین میں اصل حلت ہے جب تک کہ اس کی حرمت کی کوئی وجہ ظاہر نہ ہو جائے، ورثہ کے لئے ایسی صورت میں مال کی حلت وحرمت کی وجہ جاننے کے لئے کھود کرید کرنا بھی ضروری نہیں ہے

اگر وراثت میں ملے مال کے بارے میں معین طور پر معلوم ہو کہ یہ مال (مثلاً یہ گاڑی یعنی اگر مال غیر مخلوط اور متمیز ہو) غصب یا چوری کا ہے اور اس کا مالک فلاں شخص ہے تو ورثہ پر فرض ہے کہ اس مال غیر مخلوط اور متمیز کو اس کے مالک اصلی تک پہونچائیں، اگر مالک اصلی وفات پا گیا ہو تو اس کے ورثہ کو پہونچائیں، اگر مالک مال یا اس کے ورثہ تک مال مغصوب ومسروق وغیرہ پہونچانا کسی وجہ سے متعذر ہو جائے اور مال غیر مخلوط اور متمیز ہو تو اب اس مال کو مالک غیر معلوم کی طرف سے فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہے، اگر مال حرام حلال کے ساتھ مخلوط ہو اور غیر متمیز ہو تو مال حرام کے بقدر صدقہ کر دینے کے بعد بقیہ مال ورثاء کے لئے استعمال کرنا جائز ہو جائے گا۔

جس مال میراث کے بارے میں اجمالاً صرف اتنا پتہ ہو کہ میراث میں مال حرام بھی شامل ہے، البتہ ورثہ کو یہ پتہ نہ ہو کہ کتنا یا کون سا مال حرام کمائی سے ہے؟ تو ورثہ کے لئے ایسا مال لینا جائز ہے؛ البتہ اس سے بچنا اور صدقہ کر دینا افضل وبہتر ہے:

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

"مَنْ وَرِثَ مَالًا وَلَمْ يَعْلَمْ مِنْ أَيْنَ كَسَبَهُ مُوَرِّثُهُ , أَمِنْ حَلَالٍ أَمْ مِنْ حَرَامٍ ؟ وَلَمْ تَكُنْ عَلَامَةً , فَهُوَ حَلَالٌ بِإِجْمَاعِ الْعُلَمَاءِ , فَإِنْ عَلِمَ أَنَّ فِيهِ حَرَامًا وَشَكَّ فِي قَدْرِهِ أَخْرَجَ قَدْرَ الْحَرَامِ بِالِاجْتِهَادِ" (المجموع ۹/ ۴۲۸)۔

علامہ نووی امام غزالی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"إذا كان معه مال حرام وأراد التوبة والبرائة منه:

١ – فإن كان له مالک معين: وجب صرفه إليه أو إلى وكيله, فإن كان ميتا وجب دفعه إلى وارثه.

٢ – وإن كان لمالک لا يعرفه، ويئس من معرفته، فينبغي أن يصرفه في مصالح المسلمين العامة، كالقناطر والربط والمساجد ومصالح طريق مكة، ونحو ذلک مما يشترک المسلمون فيه، وإلا فيتصدق به على فقير أو فقراء ...وإذا دفعه إلى الفقير لا يكون حراما على الفقير، بل يكون حلالا طيبا، وله أن يتصدق به على نفسه وعياله إذا كان فقيرا؛ لأن عياله إذا كانوا فقراء فالوصف موجود فيهم، بل هم أولى من يتصدق عليه، وله هو أن يأخذ منه قدر حاجته لأنه أيضا فقير".

"هذا الذي قاله الغزالي في هذا الفرع ذكره آخرون من الأصحاب، وهو كما قالوه، نقله الغزالي أيضا عن معاوية بن أبي سفيان وغيره من السلف، عن أحمد بن حنبل والحارث المحاسبي وغيرهما من أهل الورع؛ لأنه لا يجوز إتلاف هذا المال ورميه في البحر، فلم يبق إلا صرفه في مصالح المسلمين" انتهى (المجموع ٩/ ٤٢٨-٤٢٩)۔

طحطاوی علی الدر میں ہے:

"وَفِي الْبَزّازِيّةِ: إنْ عَلِمَ الْمَالَ الْحَرَامَ بِعَيْنِهِ لاَ يَحِل لَهُ (لِلْوَارِثِ) أَخْذُهُ، وَإِنْ لَمْ يَعْلَمْهُ بِعَيْنِهِ أَخَذَهُ حُكْمًا، وَأَمّا فِي الدِّيَانَةِ فَإِنّهُ يَتَصَدّقُ بِهِ بِنِيّةِ الْخُصَمَاءِ" (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ٤/ ١٩٣)۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"وَإِذَا مَاتَ الرّجُلُ وَكَسْبُهُ خَبِيثٌ فَالْأَوْلَى لِوَرَثَتِهِ أَنْ يَرُدُّوا الْمَالَ إلَى أَرْبَابِهِ فَإِنْ لَمْ يَعْرِفُوا أَرْبَابَهُ تَصَدّقُوا بِهِ وَإِنْ كَانَ كَسْبُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحِلُّ وَابْنُهُ يَعْلَمُ ذَلِكَ وَمَاتَ الْأَبُ وَلَا يَعْلَمُ الِابْنُ ذَلِكَ بِعَيْنِهِ فَهُوَ حَلَالٌ لَهُ فِي الشّرْعِ وَالْوَرَعُ أَنْ يَتَصَدّقَ بِهِ بِنِيّةِ خُصَمَاءِ أَبِيهِ كَذَا فِي الْيَنَابِيعِ" (الفتاوی الہندیۃ ٥/ ٣٤٩)۔

حاشیۃ ابن عابدین :(5/92-99)مطلبٌ فیمن ورث مالا حرامًا میں ہے:

"مَطْلَبٌ فِيمَنْ وَرِثَ مَالًا حَرَامًا

(قَوْلُهُ إلّا فِي حَقِّ الْوَارِثِ إلَخْ) أَيْ فَإِنّهُ إذَا عَلِمَ أَنّ كَسْبَ مُوَرّثِهِ حَرَامٌ يَحِلُّ لَهُ، لَكِنْ إذَا عَلِمَ الْمَالِكَ بِعَيْنِهِ فَلَا شَكّ فِي حُرْمَتِهِ وَوُجُوبِ رَدّهِ عَلَيْهِ، وَهَذَا مَعْنَى قَوْلِهِ وَقَيّدَهُ فِي الظّهِيرِيّةِ إلَخْ (ردالمحتار ٥/ ٩٩، شاملہ)۔

مالکیہ کی کتاب ''شرح مختصر خلیل للخرشی'' (۷/ ۱۹۳) میں ہے:

''وأما من جل ماله حرامٌ فممنوعٌ، وقيل مكروهٌ وأما من جميع ماله حرامٌ فقال الشيخ سليمان فى شرح الإرشاد يحرم الأكل منه، وقبول هبته ومعاملته أى إن علم أن ما أطعمه أو وهبه قد اشتراه أى بعين الحرام، وأما إن اشتراه بثمنٍ فى ذمته ثم دفع فيه عين الحرام فإنه لا يحرم أكله، وأما إن كان قد ورثه أو وهب ذلک جاز أى ما لم يكن عين الحرام''۔

التاج والإکلیل (6/586-594) میں ہے:

''وقد سئل الشيخ أبو محمد بن أبى زيد عمن هلک وترک مالًا حرامًا فقال ما نصه: أجاز وراثته ابن شهاب والحسن البصرى وأبوه القاسم وغيره، وفرق مالک بين أن يكون يعرف أهله فيرد إليهم وإن لم يعرف أهله فلا يقضى على الورثة بأن يتصدقوا به لكن ينبغى لهم ذلک۔ انتهى''۔

حنابلہ کی کتاب الإنصاف (۸/ ۳۲۲-۳۲۳) میں ہے:

''نقل الأثرم وغير واحد عن الإمام أحمد رحمه الله فيمن ورث مالا فيه حرام: إن عرف شيئًا بعينه رده۔ وإن كان الغالب على ماله الفساد تنزه عنه، أو نحو هذا .ونقل حرب فى الرجل يخلف مالا إن كان غالبه نهبا أو ربا ينبغى لوارثه أن يتنزه عنه، إلا أن يكون يسيرًا لا يعرف .ونقل عنه أيضا: هل للرجل أن يطلب من ورثة إنسان مالًا مضاربة ينفعهما وينتفع؟ قال: إن كان غالبه الحرام فلا''۔

علامہ ابن تیمیہ اس نوع کے ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

'' الْقَدْرُ الَّذِى يَعْلَمُ الْوَلَدُ أَنَّهُ رِبًا : يُخْرِجُهُ , إمَّا أَنْ يَرُدَّهُ إلَى أَصْحَابِهِ إنْ أَمْكَنَ , وَإِلَّا تَصَدَّقَ بِهِ۔ وقد بَيَّنَ النَّبِىُّ صلى الله عليه وسلم أَنَّ الظُّلَامَةَ إذَا كَانَتْ فِى الْمَالِ طَالَبَ الْمَظْلُومُ بِهَا ظَالِمَهُ وَلَمْ يَجْعَلْ الْمُطَالَبَةَ لِوَرَثَتِهِ , وَذَلِکَ أَنَّ الْوَرَثَةَ يَخْلُفُونَهُ فِى الدُّنْيَا , فَمَا أَمْكَنَ اسْتِيفَاؤُهُ فِى الدُّنْيَا كَانَ لِلْوَرَثَةِ , وَمَا لَمْ يُمْكِنْ اسْتِيفَاؤُهُ فِى الدُّنْيَا فَالطَّلَبُ بِهِ فِى الْآخِرَةِ لِلْمَظْلُومِ نَفْسِهِ'' انتهى مختصرا (الفتاوى الكبرى ۱/ ۴۷۸)۔

بنابریں صورت مسئولہ میں ورثاء کے لئے وراثت میں حاصل مال قضاءحلال ہے:

''ثُمّ الظّاهِرُ أَنّ حُرْمَتَهُ عَلَى الْوَرَثَةِ فِى الدِّيَانَةِ لَا الْحُكْمِ'' (ردالمحتار ۶/ ۳۸۶)۔

مال حرام سے منافع کمانا؟

جواب: ۲

غیر شرعی طریقے سے حاصل کردہ مال میں اصل مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے، حاصل کنندہ اس کا مالک بنتا ہے، نہ اس میں مالی تصرفات کا حق رکھتا ہے؛ لہٰذا اگر حرام مال کا مالک معلوم ہو اور وہ بلا عوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے: سود، چوری، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ تو اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی وہ جہاں سے آیا ہے وہیں اسے واپس دے دیا جائے، مالک وفات پاچکا ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹا دیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے مستحقِ زکاۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ بالعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے حرام کام زناء اور دیگر امور معاصی وغیرہ کے ذریعے حاصل کردہ اجرت وکمائی وغیرہ تو ایسے مال کا حکم یہ ہے کہ وہ مالِ خبیث ہے، جس کو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کرنا ضروری ہے، اسے مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ اس کا یہی ایک مصرف ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردیا جائے:

"وَلا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" (سورۃ البقرۃ/الآیۃ ۱۸۸)۔

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ" (سورۃ النساء: الآیۃ ۲۹)۔

"إن دمائكم وأموالكم حرام عليكم كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا" (صحیح البخاری مع الفتح کتاب الحج (۳/ ۵۷۳) الحدیث ۱۷۳۹، ومسلم کتاب الحج (۲/ ۸۸۶-۸۸۹) الحدیث ۱۲۱۸)۔

زاد المعاد فی ہدی خیر العباد میں ہے:

"فإن قيل: فما تقولون في كسب الزانية إذا قبضته، ثم تابت هل يجب عليها رد ما قبضته إلى أربابه، أم يطيب لها، أم تصدق به؟ قيل: هذا ينبني على قاعدة عظيمة من قواعد الإسلام، وهي أن من قبض ما ليس له قبضه شرعا، ثم أراد التخلص منه، فإن كان المقبوض قد أخذ بغير رضى صاحبه، ولا استوفى عوضه رده عليه. فإن تعذر رده عليه، قضى به دينا يعلمه عليه، فإن تعذر ذلك، رده إلى ورثته، فإن تعذر ذلك، تصدق به عنه، فإن اختار صاحب الحق ثوابه يوم القيامة، كان له. وإن أبى إلا أن يأخذ من حسنات القابض، استوفى منه نظير ماله، وكان ثواب الصدقة للمتصدق بها، كما ثبت عن الصحابة – رضى الله عنهم.

وإن كان المقبوض برضى الدافع وقد استوفى عوضه المحرم، كمن عاوض على خمر أو خنزير، أو على زنى أو فاحشة، فهذا لا يجب رد العوض على الدافع؛ لأنه أخرجه باختياره، واستوفى عوضه المحرم، فلا يجوز أن يجمع له بين العوض والمعوض، فإن فى ذلك إعانة له على الإثم والعدوان(۵:۶۹۰،مکتبۃ المنار الاسلامیۃ)۔

الفقہ الاسلامی وأدلتہ میں ہے:

"(أ) حائز المال الحرام لخلل فى طريقة اكتسابه لا يملكه مهما طال الزمن، ويجب عليه رده إلى مالكه أو وارثه إن عرفه، فإن يئس من معرفته وجب عليه صرفه فى وجوه الخير للتخلص منه وبقصد الصدقة عن صاحبه.

(ب) إذا أخذ المال أجرة عن عمل محرم فإن الآخذ يصرفه فى وجوه الخير ولا يرده إلى من أخذه منه.

(ج) لا يرد المال الحرام إلى من أخذ منه إن كان مصراً على التعامل غير المشروع الذى أدى إلى حرمة المال كالفوائد الربوية بل يصرف فى وجوه الخير أيضاً.

(د) إذا تعذر رد المال الحرام بعينه وجب على حائزه رد مثله أو قيمته إلى صاحبه إن عرفه وإلا صرف المثل أو القيمة فى وجوه الخير وبقصد الصدقة عن صاحبه" (الفقہ الإسلامی وأدلتہ ۱۰/۵ ۹۴)۔

اگر حرام جائیداد و مال کے بارے میں معین طور پر معلوم ہو کہ اس کا مالک فلاں شخص ہے (اگر مال غیر مخلوط اور متمیز ہو) تو اس پر فرض ہے کہ اس مال غیر مخلوط اور متمیز کو اس کے مالک اصلی تک پہونچائے، اگر مال اصلی شکل پر قائم ہو تو! تغیر وتبدل کی صورت میں ضمان و بدل ادا کرے، اگر مالک اصلی وفات پا گیا ہو تو اس کے ورثہ کو پہونچائے، اگر مالک مال یا اس کے ورثہ تک مال حرام پہونچانا کسی وجہ سے متعذر رہو جائے اور مال غیر مخلوط اور متمیز ہو تو اب اس مال کو مالک غیر معلوم کی طرف سے فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہے، اگر مال حرام حلال کے ساتھ مخلوط ہو اور غیر متمیز ہو تو مال حرام کے بقدر صدقہ کر دینے کے بعد بقیہ مال اس کے لئے استعمال کرنا جائز ہو جائے گا۔

علامہ نووی امام غزالی کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"إذا كان معه مال حرام وأراد التوبة والبرائة منه:

ا – فإن كان له مالك معين: وجب صرفه إليه أو إلى وكيله, فإن كان ميتا وجب دفعه إلى وارثه.

۲- وإن كان لمالك لا يعرفه، ويئس من معرفته، فينبغي أن يصرفه في مصالح المسلمين العامة، كالقناطر والربط والمساجد ومصالح طريق مكة، ونحو ذلك مما يشترك المسلمون فيه، وإلا فيتصدق به على فقير أو فقراء ...وإذا دفعه إلى الفقير لا يكون حراما على الفقير، بل يكون حلالا طيبا، وله أن يتصدق به على نفسه وعياله إذا كان فقيرا؛ لأن عياله إذا كانوا فقراء فالوصف موجود فيهم، بل هم أولى من يتصدق عليه، وله هو أن يأخذ منه قدر حاجته لأنه أيضا فقير".

"هذا الذي قاله الغزالي في هذا الفرع ذكره آخرون من الأصحاب، وهو كما قالوه، نقله الغزالي أيضا عن معاوية بن أبي سفيان وغيره من السلف، عن أحمد بن حنبل والحارث المحاسبي وغيرهما من أهل الورع؛ لأنه لا يجوز إتلاف هذا المال ورميه في البحر، فلم يبق إلا صرفه في مصالح المسلمين" انتهى (المجموع ۹/۴۲۸-۴۲۹)۔

طحطاوی علی الدر میں ہے:

"وَفِي الْبَزّازِيّةِ: إنْ عَلِمَ الْمَال الْحَرَامَ بِعَيْنِهِ لاَ يَحِل لَهُ (لِلْوَارِثِ) أَخْذُهُ، وَإِنْ لَمْ يَعْلَمْهُ بِعَيْنِهِ أَخَذَهُ حُكْمًا، وَأَمّا فِي الدِّيَانَةِ فَإِنّهُ يَتَصَدّقُ بِهِ بِنِيّةِ الْخُصَمَاءِ" (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ۴/ ۱۹۳، نیز دیکھئے حاشیہ ابن عابدین ۵/ ۹۲-۹۹، شاملہ)۔

غیر شرعی طریقہ سے حاصل مال حرام، اس کا بدل، یا اس کے بقدر مالک کو لوٹانے یا صدقہ کر دینے سے پہلے اس سے نفع یعنی کرایہ وغیرہ حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس بابت احناف کے دو نقطہائے نظر ہیں:

۱- طرفین کے یہاں اصل مالک کو ضمان ادا کرنے سے قبل اس حرام جائیداد کے منافع سے فائدہ حاصل کرنا جائز نہیں ہے

ابو بکر اسکاف نے اس کو راجح کہا ہے، ہمارے یہاں فتویٰ بھی اسی پر ہے، بدائع وہدایہ اور ہندیہ وغیرہ میں اسی کو راجح کہا گیا ہے

شرنبلالی لکھتے ہیں:

"قالوا والضابط فيه أنه متى تغيّرت العين المغصوبة بفعل الغاصب حتى زال اسمها ومعظم منافعها أو اختلطت بملك الغاصب بحيث لا يمكن تمييزها أصلًا أو زال ملك المغصوب منه عنها وملكها الغاصب وضمنها ولا يحل له الانتفاع بها حتى يؤدِيَ بدلها كي لا يلزم منه فتح باب الغصوب

وفی منعه حسم مادّته" (حفظ الاصغرین ص٦)۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

"وَقَالَ مَشَايِخُنَا: – رَحِمَهُمُ اللّٰهُ – لَا يَطِيبُ بِكُلِّ حَالٍ أَنْ يَتَنَاوَلَ مِنْهُ قَبْلَ أَنْ يَضْمَنَ وَبَعْدَ الضَّمَانِ لَا يَطِيبُ الرِّبْحُ بِكُلِّ حَالٍ، وَهُوَ الْمُخْتَارُ، وَإِطْلَاقُ الْجَوَابِ فِي الْجَامِعَيْنِ وَالْمُضَارَبَةِ يَدُلُّ عَلَى ذَلِكَ وَوَجْهُهُ أَنَّهُ بِالنَّقْدِ مِنْهُ اسْتَفَادَ سَلَامَةَ الْمُشْتَرِي وَبِالْإِشَارَةِ اسْتَفَادَ جَوَازَ الْعَقْدِ لِتَعَلُّقِ الْعَقْدِ بِهِ فِي حَقِّ الْقَدْرِ وَالْوَصْفِ فَتَثْبُتُ فِيهِ شُبْهَةُ الْحُرْمَةِ لِمِلْكِهِ بِسَبَبٍ خَبِيثٍ وَاخْتَارَ بَعْضُهُمْ الْفَتْوَى عَلَى قَوْلِ الْكَرْخِيِّ فِي زَمَانِنَا لِكَثْرَةِ الْحَرَامِ، وَهَذَا كُلُّهُ عَلَى قَوْلِهِمَا، وَعِنْدَ أَبِي يُوسُفَ – رَحِمَهُ اللّٰهُ – لَا يَتَصَدَّقُ بِشَيْءٍ مِنْهُ، وَالْوَجْهُ مَا بَيَّنَّا" (تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق وحاشیۃ الشلبی للزیلعی، فخر الدین ۵/۲۲۶، شاملہ)۔

مبسوط سرخسی میں ہے:

"وَفِي مَسْأَلَةِ الشِّرَاءِ بِالدَّرَاهِمِ الْمَغْصُوبَةِ لَا تَتَعَيَّنُ تِلْكَ الدَّرَاهِمُ حَتَّى لَوْ أَخَذَهَا الْمَغْصُوبُ مِنْهُ كَانَ عَلَى الْغَاصِبِ مِثْلُهَا دَيْنًا، وَلَكِنَّهُ اسْتَعَانَ فِي الْعَقْدِ وَالنَّقْدِ بِمَا هُوَ حَرَامٌ فَيَتَمَكَّنُ فِيهِ الْخُبْثُ فَلِهَذَا لَا يَحِلُّ لَهُ تَنَاوُلُهُ" (مبسوط السرخسی ۱۷/۱۴)۔

ملک العلماء علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"وَلَوْ اشْتَرَى بِالدَّرَاهِمِ الْمَغْصُوبَةِ شَيْئًا هَلْ يَحِلُّ لَهُ الِانْتِفَاعُ بِهِ أَوْ يَلْزَمُهُ التَّصَدُّقُ؟

ذَكَرَ الْكَرْخِيُّ – رَحِمَهُ اللّٰهُ – وَجَعَلَ ذَلِكَ عَلَى أَرْبَعَةِ أَوْجُهٍ: إمَّا أَنْ يُشِيرَ إلَيْهَا وَيَنْقُدَ مِنْهَا، وَإِمَّا أَنْ يُشِيرَ إلَيْهَا وَيَنْقُدَ مِنْ غَيْرِهَا، وَإِمَّا أَنْ يُشِيرَ إلَى غَيْرِهَا وَيَنْقُدَ مِنْهَا، وَإِمَّا أَنْ يُطْلِقَ إطْلَاقًا وَيَنْقُدَ مِنْهَا، وَإِذَا ثَبَتَ الطِّيبُ فِي الْوُجُوهِ كُلِّهَا، إلَّا فِي وَجْهٍ وَاحِدٍ وَهُوَ أَنْ يَجْمَعَ بَيْنَ الْإِشَارَةِ إلَيْهَا وَالنَّقْدِ مِنْهَا، وَذَكَرَ أَبُو نَصْرٍ الصَّفَّارُ وَالْفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ أَنَّهُ يَطِيبُ فِي الْوُجُوهِ كُلِّهَا، وَذَكَرَ أَبُو بَكْرٍ الْإِسْكَافُ – رَحِمَهُ اللّٰهُ – أَنَّهُ لَا يَطِيبُ فِي الْوُجُوهِ كُلِّهَا وَهُوَ الصَّحِيحُ۔

(وَجْهُ) قَوْلِ أَبِي نَصْرٍ وَأَبِي اللَّيْثِ رَحِمَهُمَا اللّٰهُ تَعَالَى أَنَّ الْوَاجِبَ فِي ذِمَّةِ الْمُشْتَرِي دَرَاهِمُ مُطْلَقَةٌ، وَالْمَنْقُودَةُ بَدَلٌ عَمَّا فِي الذِّمَّةِ، أَمَّا عِنْدَ عَدَمِ الْإِشَارَةِ فَظَاهِرٌ، وَكَذَا عِنْدَ الْإِشَارَةِ؛ لِأَنَّ الْإِشَارَةَ إلَى الدَّرَاهِمِ لَا تُفِيدُ التَّعْيِينَ، فَالْتَحَقَتْ الْإِشَارَةُ إلَيْهَا بِالْعَدَمِ، فَكَانَ الْوَاجِبُ فِي ذِمَّتِهِ دَرَاهِمَ مُطْلَقَةً، وَالدَّرَاهِمُ الْمَنْقُودَةُ بَدَلًا عَنْهَا، فَلَا يَخْبُثُ الْمُشْتَرَى، وَالْكَرْخِيُّ كَذَلِكَ يَقُولُ: إذَا لَمْ تَتَأَكَّدْ الْإِشَارَةُ بِمُؤَكِّدٍ وَهُوَ

النّقْدُ مِنهَا فَإِذَا تَأَكّدَتْ بِالنّقْدِ مِنهَا تَعَيّنَ الْمُشَارُ إلَيْهِ، فَكَانَ الْمَنْقُودُ بَدَلَ الْمُشْتَرَى، فَكَانَ خَبِيثًا۔

(وَجْهُ) قَوْلِ أَبِي بَكْرٍ أَنّهُ اسْتَفَادَ بِالْحَرَامِ مِلْكًا مِنْ طَرِيقِ الْحَقِيقَةِ، أَوْ الشُّبْهَةِ، فَيَثْبُتُ الْخَبَثُ، وَهَذَا لِأَنّهُ إنْ أَشَارَ إلَى الدّرَاهِمِ الْمَغْصُوبَةِ فَالْمُشَارُ إلَيْهِ إنْ كَانَ لَا يَتَعَيّنُ فِي حَقّ الِاسْتِحْقَاقِ يَتَعَيّنُ فِي حَقّ جَوَازِ الْعَقْدِ بِمَعْرِفَةِ جِنْسِ النّقْدِ وَقَدْرِهِ، فَكَانَ الْمَنْقُودُ بَدَلَ الْمُشْتَرَى مِنْ وَجْهٍ نُقِدَ مِنْهَا، أَوْ مِنْ غَيْرِهَا۔

وَإِنْ لَمْ يُشِرْ إلَيْهَا وَنَقَدَ مِنْهَا، فَقَدْ اسْتَفَادَ بِذَلِكَ سَلَامَةَ الْمُشْتَرَى فَتَمَكّنَتْ الشُّبْهَةُ فَيَخْبُثُ الرّبْحُ، وَإِطْلَاقُ الْجَوَابِ فِي الْجَامِعَيْنِ وَالْمُضَارَبَةُ دَلِيلُ صِحّةِ هَذَا الْقَوْلِ، وَمِنْ مَشَايِخِنَا مَنْ اخْتَارَ الْفَتْوَى فِي زَمَانِنَا بِقَوْلِ الْكَرْخِيّ تَيْسِيرًا لِلْأَمْرِ عَلَى النّاسِ لِازْدِحَامِ الْحَرَامِ، وَجَوَابُ الْكُتُبِ أَقْرَبُ إلَى التّنَزّهِ وَالِاحْتِيَاطِ، وَاَللّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ ، وَلِأَنّ دَرَاهِمَ الْغَصْبِ مُسْتَحَقّةُ الرّدّ عَلَى صَاحِبِهَا، وَعِنْدَ الِاسْتِحْقَاقِ يَنْفَسِخُ الْعَقْدُ مِنْ الْأَصْلِ، فَتُبَيّنَ أَنّ الْمُشْتَرَى كَانَ مَقْبُوضًا بِعَقْدٍ فَاسِدٍ، فَلَمْ يَحِلّ الِانْتِفَاعُ بِهِ" (بدائع الصنائع ۷/ ۱۵۵)۔

۲: جبکہ امام ابو یوسف اور امام کرخی، ابونصر اور فقیہ ابواللیث وغیرھم کا خیال ہے کہ ضمان کی ادائیگی کے بعد قابض کے لیے ماقبل میں حاصل کردہ اس نفع سے مستفید ہونے کی گنجائش ہے اور وہ حاصل شدہ منافع کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے؛ کیونکہ خریداری ذمہ میں ہوئی ہے، حرمت ذمہ سے متعلق ہوتی ہے نفس مال سے نہیں؛ اس لئے اس سے انتفاع درست ہے، مال حرام کا ضمان تو بہرحال واجب ہے، اصل مالک کو لوٹانے یا اس کے بدل کی ادائی سے قبل اس سے نفع اندوزی باتفاق حنفیہ جائز نہیں ہے۔

ہاں اگر حرام مال وجائیداد کا بدل ادا کردے تو اس کی ملکیت میں شروع سے ہی متصور ہوتی ہے، اور اس کے لئے اصل مالک کو واپس کرنا ضروری نہیں ہوتا؛ لہٰذا ادائی ضمان کے بعد مال حرام سے حاصل شدہ منافع سے استفادہ بھی جائز ہوگا۔

ادائی ضمان سے قبل جن کے ہاں (امام ابو یوسف اور امام کرخی، ابونصر ابواللیث وغیرھم) استعمال کرنا جائز ہے، تو پھر ان کے یہاں اس سے نفع کمانا بھی جائز ہوگا، اس لئے کہ نفع عمل سے وابستہ ہوتا ہے، قابض مال حرام کو اصل مالک کو لوٹانے کا مکلّف ہے نفع کا نہیں، نفع اس کے لئے مباح ہے، یعنی نفع کما کے پھر ضمان ادا کرے تو ادائی ضمان سے قبل کمایا ہوا نفع ادائی ضمان کے بعد مباح ہوجائے گا۔

جبکہ طرفین کے یہاں ادائی ضمان سے قبل کمایا ہوا نفع واجب التصدق ہے، غاصب وقابض کے لئے حلال ہے نہ اصل مالک کے لئے۔

البتہ علامہ زیلعی نے تصریح کی ہے کہ قابض کے لیے ان منافع کو جس طرح صدقہ کرنے کا اختیار ہے، اسی طرح وہ ان منافع کو اصل مالک کو بھی لوٹا سکتا ہے، کیونکہ اس میں خباثت ناقص ملکیت کی وجہ سے آئی تھی جو مالک کی ملک میں نہیں ہے، لوٹا دینے کے بعد خبث دور ہو جائے گا۔

تبیین الحقائق میں ہے:

"وَلَكِنَّهُ يُخَيَّرُ بَيْنَ أَنْ يَأْخُذَهُ، وَلَا شَيْءَ لَهُ وَبَيْنَ أَنْ يَتْرُكَهُ عَلَى الْغَاصِبِ وَيُضَمِّنَهُ مِثْلَهُ مِنْ جِنْسِهِ أَوْ قِيمَتِهِ مِنْ خِلَافِ جِنْسِهِ، وَاسْتِغْلَالُ الْعَبْدِ الْمُسْتَعَارِ بِالْإِيجَارِ كَاسْتِغْلَالِ الْمَغْصُوبِ حَتّى يَجِبَ عَلَيْهِ ضَمَانُ النُّقْصَانِ وَيَتَصَدَّقُ بِالْغَلَّةِ عِنْدَهُمَا خِلَافًا لِأَبِي يُوسُفَ – رَحِمَهُ اللّٰهُ – .وَالْوَجْهُ قَدْ بَيَّنَّاهُ، وَلَوْ هَلَكَ فِي يَدِهِ بَعْدَمَا اسْتَغَلَّهُ فَضَمَّنَهُ الْمَالِكُ كَانَ لَهُ أَنْ يَسْتَعِينَ بِالْغَلَّةِ فِي أَدَاءِ الضَّمَانِ؛ لِأَنَّ الْخُبْثَ كَانَ لِأَجْلِ الْمَالِكِ فَإِذَا أَخَذَهُ الْمَالِكُ لَا يَظْهَرُ الْخُبْثُ فِي حَقِّهِ وَلِهَذَا لَوْ سَلَّمَ الْغَلَّةَ إلَيْهِ مَعَ الْعَبْدِ يُبَاحُ لَهُ التَّنَاوُلُ فَيَزُولُ الْخُبْثُ بِالتَّسْلِيمِ وَتَبْرَأُ ذِمَّتُهُ عَنْ الْقِيمَةِ بِقَدْرِهِ" (تبیین الحقائق ۵/۲۲۵)۔

"(وَإِنْ اسْتَغَلَّهُ تَصَدَّقَ بِالْغَلَّةِ كَمَا لَوْ تَصَرَّفَ فِي الْمَغْصُوبِ الْوَدِيعَةِ وَرَبِحَ) أَيْ اسْتَغَلَّ الْمَغْصُوبَ بِأَنْ كَانَ عَبْدًا مَثَلًا فَأَجَّرَهُ فَنَقَصَهُ الِاسْتِعْمَالُ وَضَمِنَ النُّقْصَانَ تَصَدَّقَ الْغَاصِبُ بِالْغَلَّةِ كَمَا يَتَصَدَّقُ بِالرِّبْحِ فِيمَا إذَا تَصَرَّفَ فِي الْمَغْصُوبِ أَوْ الْوَدِيعَةِ بِأَنْ بَاعَهُ وَرَبِحَ فِيهِ؛ لِأَنَّ الْمَنَافِعَ لَا تَقُومُ إلَّا بِالْعَقْدِ وَالْعَاقِدُ هُوَ الْغَاصِبُ فَتَكُونُ الْأُجْرَةُ لَهُ ..... .لِأَنَّ الْخُبْثَ لِأَجْلِ الْمَالِكِ.

فَإِذَا أَخَذَهُ الْمَالِكُ لَا يَظْهَرُ الْخُبْثُ فِي حَقِّهِ وَلِهَذَا لَوْ أَسْلَمَ الْغَلَّةَ إلَيْهِ مَعَ الْعَبْدِ يُبَاحُ لَهُ التَّنَاوُلُ فَيَزُولُ الْخُبْثُ بِالتَّسْلِيمِ وَتَبْرَأُ ذِمَّتُهُ عَنْ الْقِيمَةِ بِقَدْرِهِ" (البحر الرائق ۸/۱۲۹)۔

مال حرام میں تصرف اصلاً جائز نہیں ہے، اصل مالک تک رسائی ممکن ہو تو اسے لوٹانا ضروری ہے، "مجلۃ الاحکام العدلیۃ "میں ہے:

''لا يجوز لأحد أن يتصرف في ملك الغير بلا إذنه'' (المقالۃ الثانیۃ فی بیان القواعد الکلیۃ الفقہیۃ، ص ۲۷، ط؛ دار الجیل)۔

پوچھی گئی صورت میں باطل طریقے سے حاصل شدہ مال وجائیداد سے کرایہ حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، تاہم اگر کوئی شخص لاعلمی میں حرام مال حاصل کر کے اس سے کاروبار کر کے نفع کمائے تو اگرچہ اس کا یہ عمل ناجائز ہے؛ لیکن یہ نفع اس کے لیے حلال ہوگا، البتہ حرام سرمایہ وجائیداد کے بقدر مال اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہوگا، اگر مالک معلوم نہ ہو تو کسی فقیر

کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے، لیکن واضح رہے کہ یہ حکم حرام مال سے خلاصی کے طور پر ہے، چنانچہ قصداً وعمداً کسی کا مال باطل طریقے سے حاصل کر کے اس سے تجارت ونفع اندوزی وغیرہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں:

"**غصب حانوتا واتجر فيه وربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردري**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الغصب، الباب الثامن، ۵/ ۱۴۲)۔

اگر گھر کا سربراہ حرام کمائے تو اہلِ خانہ کے لیے کیا حکم ہے؟

جواب: ۳

محتاج وضرورت مند والدین اور بیوی کا نفقہ اور خرچ برداشت کرنا اولاد پر اور شوہر پر حق واجب ہے:

"**لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِنْ سَعَتِهِ**" (الطلاق:۷)۔

(کشادگی والے کو اپنی کشادگی سے خرچ کرنا چاہیے)۔

"**وَلَهُنّ مِثْلُ الّذِي عَلَيْهِنّ بِالْمَعْرُوفِ**" (البقرہ:۲۲۸) (اور دستور کے مطابق عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں)۔

"**(و) تجب (على موسر) ولو صغيرا (يسار الفطرة) على الأرجح)...النفقة لأصوله)...(الفقراء) ولو قادرين على الكسب.**

(قوله ولو قادرين على الكسب) جزم به في الهداية، فالمعتبر في إيجاب نفقة الوالدين مجرد الفقر" (الدر المختار مع رد المحتار کتاب الطلاق، باب النفقۃ، ۳/ ۶۲۱، ط: سعید)۔

اگر بیوی اپنے شوہر سے اور والدین اپنی اولاد سے اس کی حرام کمائی سے اپنے واجبی حقوق وصولتے ہیں تو حرام کھلانے کی حرمت کا سب تک محدود رہے گی، اس کا وبال اسی کے سر رہے گا، حرمت ان کے حقوق واجبہ تک اثر انداز نہیں ہوگی، یہ لوگ گزرانِ حیات کے لئے اپنے نفقات وصولنے میں بمنزلہ مضطر ہیں، قدر ضرورت اپنے حقوق وصولنے کی انہیں گنجائش ہوگی۔

البتہ اگر بیوی یا والدین کے لیے جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو ایسی صورت میں ان کے لیے اپنے شوہر واولاد کے مال حرام سے کھانا جائز نہیں، لیکن اگر انہیں اپنے اخراجات جائز طریقے سے برداشت کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس کے لیے اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز ہے اور اسکا گناہ شوہر پر ہوگا؛ لیکن حرام کمانے والوں کے

گھر والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ حرام کمانے والوں سے حرام ذریعۂ آمدن چھڑانے کی پوری کوشش کرتے رہیں!

فتاوی شامی میں ہے:

"وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاماً أو کسوةً من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها، والإثم علی الزوج" (الدرالمختار وحاشیۃ ابن عابدین (ردالمحتار ۶/۱۹۱)۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ (۱/۳۴۷) میں رقم فرماتے ہیں:

"یجب علی الزوجات فی مثل هذه الحال أن یبذلوا أقصی ما فی وسعهم فی تحذیر أزواجهن عن العمل فی بیع الخمور والخنازیر ولکنهم إن أبوا إلا العمل فیه، فإن تیسر لهن تحمل نفقات أنفسهن بطرق مباحة، فلا یجوز لهن الأکل من أموال أزواجهن، وإن لم یتیسر لهن ذلک، فیسع لهن الأکل، والإثم علی الأزواج والآباء، للأطفال الصغار حکم الزوجات، أما الأولاد الکبار فعلیهم أن یکتسبوا لأنفسهم، ولا یأکلوا من هذا المال.

وجواز الأکل للزوجة فی مثل هذه الحالة قد صرح به بعض الفقهاء.

قال ابن عابدین رحمه الله:" امرأة زوجها فی أرض الجور، إذا أکلت من طعامه ولم یکن عینه غصبا أو اشتری طعاما أو کسوة مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذلک، والإثم علی الزوج" (ردالمحتار، کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع: ۵/۲۴۷، وکتاب البیوع، باب البیع الفاسد)۔

حرام کمائی سے بچے کو تعلیم دینا والد کا عمل ذاتی تھا جس کا جواب دہ وہ خود ہے، بچہ جب تک خود کفیل نہ ہو جائے والد کے زیر کفالت تعلیم حاصل کرتا رہے، تعلیم حاصل کرنا اس کے لئے درست ہے، جب وہ کمانے کے قابل ہو جائے تو والد کی حرام کمائی استعمال کرنے کے بجائے بیٹے کے لیے خود کما کر حلال ذرائع سے اپنے لیے انتظام کرنا لازم ہوگا۔

لیکن تنخواہ چونکہ اجرتِ عمل ہوتی ہے؛ اس لئے اگر یہ شخص فی نفسہ مفوضہ کام کی اہلیت رکھتا ہے اور وہ امانت داری کے ساتھ فرض منصبی ادا کرتا ہے تو تنخواہ اس کے لئے حلال ہوگی۔

فقہاء متاخرین حنفیہ نے ہر مالی لین دین میں مال حرام پر عقد و نقد جمع نہ ہونے کی صورت میں (جس کی تین مشہور شکلیں ہیں) ہر متعاقد کے لئے اسے لینے اور اس سے انتفاع کی گنجائش دی ہے۔

علامہ سمرقندی نے عیون المسائل میں تصریح فرمائی ہے کہ حرام مال والے کے یہاں سے کوئی بھی صاحب حق اپنا مالی حق وصول کر سکتا ہے۔

بلکہ اگر وہ وجہ حرمت کے باعث لینے میں متردد ہوتو اسے زبردستی دیا جائے گا:

"هشام قَالَ: سمعت محمداً يقول فی كسب المغنية والنائحة أكرهه، وإن كانت مغنية فأتته تقضيه يعنی ديناً لإنسان عليها من كسب الغناء لم يسعه أن أخذه لأنه بمنزلة الغصب، وهذا فيما بينه وبين الله، وأما فی القضاء فإنه يجبر الغريم علی أخذه" (کتاب عیون المسائل/أبوالليث السمرقندی ص۳۸۱،رقم المسألۃ:۱۸۷۶)۔

ہدیہ اور دعوت کھانے جیسے مسائل میں تو غالب مال کی حلت وحرمت مدار حکم بنتی ہے؛ لیکن مالی معاملات (بشمول ثمن مبیع وکرایہ داری) میں غلبے کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ جمہور ائمہ متاخرین نے امام کرخی کے قول پر فتوی دیا ہے جس کا ماحصل یہی ہے کہ مالی معاملات میں ملنے والے زر وثمن پر جب تک عقد ونقد دونوں جمع نہ ہوجائے تو وہ اکل حلال ہوگا اور قابل انتفاع ہوگا، لہٰذا ناجائز کمانے والا اگر بچوں کی ٹیوشن فیس یا ڈاکٹر فیس ادا کرے تو یہ بھی جائز ہے اور اس سے فیس وصولنے کی بھی اجازت ہے:

"قَالَ مُحَمَّدٌ – رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى – وَبِهِ نَأْخُذُ مَا لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ – رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعَالَى – وَأَصْحَابِهِ، كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّةِ" (الفتاوی الہندیۃ، البَابُ الثَّانِي عَشَرَ فِي الْهَدَايَا وَالضِّيَافَاتِ ۵/۳۴۲)۔

"لَكِنْ الْفَتْوَى الْآنَ عَلَى قَوْلِ الْكَرْخِيِّ دَفْعًا لِلْحَرَجِ عَنْ النَّاسِ اهـ" (ردالمحتار ۵/۲۳۵،شاملۃ)۔

حلال وحرام مخلوط آمدنی والے کی دعوت قبول کرلینے کی گنجائش ہے:

جواب: ۴

اگر کسی کے پاس حلال وحرام دونوں طرح کے اموال جمع ہوجائیں تو اس کی دوصورتیں ہوں گی:

(الف) حلال وحرام دونوں ایک دوسرے سے ممتاز وجدا ہوں، مثلاً کسی کی بائیک چراکر یا غصب کرا پنی ذاتی بائیکوں میں رکھ دے، تو چونکہ اس صورت میں حلال وحرام بائیکوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز کرنا سہل وممکن ہے؛ اس لئے ایسے خلط کا حکم یہ ہے کہ حلال پر حلال اور حرام پر حرام کا حکم لگے گا، یعنی جس شخص کو حلال ومملوک بائیک شرعی طریقے سے دے اس کے لئے حلال ہے اور جس کو چوری اور غصب کی بائیک دے اس کے لئے وہ بائیک دو شرطوں کے ساتھ حرام ہوگی؛ خواہ جائز وشرعی طریقے سے ہی لینا دینا کیوں نہ عمل میں آیا ہو!

پہلی شرط یہ ہے کہ اسے یقین یا ظن غالب سے معلوم ہو کہ یہ بائیک اس قابض کے پاس چوری یا غصب کی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بائیک قابض کے پاس اسی حالت میں باقی ہو جس حالت میں مغصوب منہ کے پاس تھی،

یعنی اس میں تغیر وتبدل نہ ہوا ہو، ان دوشرطوں کے تحقق کے ساتھ مال حرام کا تعدیہ ذمہ ثانی بائیک خریدار تک بھی ہوگا، شرطوں کے فقدان کی صورت میں حرمت کا تعدیہ نہ ہوگا، بلکہ صرف غاصب تک حرمت محدود رہے گی۔

اگر اس بائیک کے قابض کے ساتھ معاملہ کرنے والے شخص کو یہ تو پتہ ہو کہ اس کے پاس مال حرام ہے؛ لیکن یہ پتہ نہ ہو کہ آیا قابض اسے حلال بائیک دے رہا ہے یا حرام؟ تو اب فقہاء حنفیہ کے یہاں غلبہ کا اعتبار ہوگا، اگر قابض وحائز کا اکثر مال حلال ہو تو اس کے ساتھ معاملہ کرنا حلال، اور اگر اکثر مال حرام ہو تو اس کے ساتھ بیع وشراء وہدایا وغیرہ کا معاملہ کرنا بھی حرام ہوگا، دعوت دینے والے کے ذرائع آمدنی یقینی طور پر معلوم ہونے کی صورت میں کہ ان کی اکثر آمدنی حرام ہے ان کے یہاں کھانا کھانا، یا ان سے تحفہ لینا جائز نہیں ہے۔ اور اگر کوئی حلال ذریعہ آمدنی بھی ان کا ہے یا آمدنی کی اکثریت حرام ہونے کا یقین نہیں ہے تو مخلوط آمدنی والے کی دعوت قبول کر لینے کی گنجائش ہے، یعنی بوقت ضرورت ان کے یہاں کھانا کھایا جاسکتا ہے، پھر بھی احتیاط کر لینا تقوی کی بات ہے۔

علامہ عینی لکھتے ہیں:

"**إن كان أكثر ماله حلالاً؛ بأن كان صاحب تجارة، أو زرع حّل قبول هدية، وأكل طعامه وإلا حرم؛ لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام، ويخلو عن كثير، فكانت العبرة للغالب، والأحوط ألا يقبل؛ لأن شبهة الحرام ربما توقعه في أخذ الحرام**" (عینی، محمود بن أحمد الغیتابی، منحۃ السلوک شرح تحفۃ الفقہاء، تحقیق: أ. د. أحمد عبد الرزاق الکبیسی ص ۴۷۷)۔

علامہ حموی لکھتے ہیں:

"**معاملة من أكثر ماله حرام ولم يتحقق المأخوذ من ماله عين الحرام فلا تحرم مبايعته؛ لإمكان الحلال وعدم التحريم، ولكن يكره خوفًا من الوقوع في الحرام، كذا في فتح القدير**" (غمز عیون البصائر، ۱/ ۱۹۲، ط: دار الکتب العلمیۃ)۔

علامہ دسوقی مالکی (متوفی، 1230ھ) لکھتے ہیں:

"**اعْلَمْ أَنَّ مَنْ أَكْثَرُ مَالِهِ حَلَالٌ وَأَقَلُّهُ حَرَامٌ الْمُعْتَمَدُ جَوَازُ مُعَامَلَتِهِ وَمُدَايَنَتِهِ وَالْأَكْلِ مِنْ مَالِهِ كَمَا قَالَ ابْنُ الْقَاسِمِ خِلَافًا لِأَصْبَغَ الْقَائِلِ بِحُرْمَةِ ذَلِكَ، وَأَمَّا مَنْ أَكْثَرُ مَالِهِ حَرَامٌ وَالْقَلِيلُ مِنْهُ حَلَالٌ فَمَذْهَبُ ابْنِ الْقَاسِمِ كَرَاهَةُ مُعَامَلَتِهِ وَمُدَايَنَتِهِ وَالْأَكْلِ مِنْ مَالِهِ وَهُوَ الْمُعْتَمَدُ خِلَافًا لِأَصْبَغَ الْمُحَرِّمِ لِذَلِكَ**" (الشرح الکبیر للشیخ الدردیر وحاشیۃ الدسوقی ۳/ ۲۷۷)۔

امام قاضی خان ۵۹۲ھ) لکھتے ہیں:

"لیس زماننا زمانَ الشبهات؛ فعلى المسلم أن يتقىَ الحرامَ المُعايَن" (فتاوی قاضیخان، ۳/ ۴۰۲، مطبوعہ حاشیہ الفتاوی الہندیۃ، ط: الامیریۃ ۱۳۱۰ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"إذَا دَخلْت عَلَى مُسْلِمٍ لَا يُتّهَمُ فَكُلْ مِنْ طَعَامِهِ، وَاشْرَبْ مِنْ شَرَابِهِ" (صحیح البخاری: ۵۴۶۱)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

"إذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ عَلَى أَخِيهِ الْمُسْلِمِ فَأَطْعَمَهُ طَعَامًا فَلْيَأْكُلْ مِنْ طَعَامِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ" (مسند احمد: ۹۱۸۴)۔

علامہ ابن قدامہ لکھتے ہیں:

"وَمِمّنْ كَانَ يَقْبَلُ جَوَائِزَهُمْ ابْنُ عُمَرَ، وَابْنُ عَبّاسٍ، وَعَائِشَةُ وَغَيْرُهُمْ مِنْ الصّحَابَةِ، مِثْلُ الْحَسَنِ، وَالْحُسَيْنِ وَعَبْدِ اللّهِ بْنِ جَعْفَرٍ .وَرَخّصَ فِيهِ الْحَسَنُ الْبَصْرِيُّ وَمَكْحُولٌ، وَالزُّهْرِيُّ وَالشّافِعِيُّ. وَاحْتَجّ بَعْضُهُمْ بِأَنّ النّبِيّ – صَلّى اللّهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ – اشْتَرَى مِنْ يَهُودِيٍّ طَعَامًا، وَمَاتَ وَدِرْعُهُ مَرْهُونَةٌ عِنْدَهُ .وَأَجَابَ يَهُودِيًّا دَعَاهُ، وَأَكَلَ مِنْ طَعَامِهِ. وَقَدْ أَخْبَرَ اللّهُ تَعَالَى أَنّهُمْ أَكّالُونَ لِلسُّحْتِ وَرُوِيَ عَنْ عَلِيٍّ – رَضِيَ اللّهُ عَنْهُ –، أَنّهُ قَالَ: لَا بَأْسَ بِجَوَائِزِ السُّلْطَانِ، فَإِنّ مَا يُعْطِيكُمْ مِنْ الْحَلَالِ أَكْثَرُ مِمّا يُعْطِيكُمْ مِنْ الْحَرَامِ .وَقَالَ: لَا تَسْأَلُ السُّلْطَانَ شَيْئًا، وَإِنْ أَعْطَى فَخُذْ، فَإِنّ مَا فِي بَيْتِ الْمَالِ مِنْ الْحَلَالِ أَكْثَرُ مِمّا فِيهِ مِنْ الْحَرَامِ" (المغنی لابن قدامۃ ۴/ ۲۰۲، ط مکتبۃ القاہرۃ)۔

ہمارے یہاں حلال وحرام کی مقدار (غلبہ وقلت) کی معرفت کے تئیں عام حالات میں قابض ومعطی کی بات ہی مانی جائے گی، ادھر ادھر تاک جھانک اور تجسس وکھود کرید کی ضرورت نہیں، الا یہ کہ موضع تہمت ہو یا کسی مضبوط بنیادوں پر مقدار حلت کے تئیں معطی کی بات شکوک وشبہات کے دائرے میں آتی ہو تو اب قرائن وعلامات وسوالات وغیرہ کا سہارا لیا جاسکتا ہے؛ جیسا کہ شوافع میں امام غزالی وغیرہ کا خیال ہے: "على ظنه ذلك يجب السؤال عن مصدر المال الذى يأخذ منه، يقول أبو حامد الغزالى:" المختلط فى ملك شخص واحد إما أن يكون الحرام ، أو أقله، وكل واحد إما أن يعلم بيقين، أو بظن عن علامة أو توهم فالسؤال يجب فى موضعين، وهو: أن يكون الحرام أكثر يقيناً أو ظناً" (احیاء العلوم ۳/ ۱۲۳)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"آكل الرباو كاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل، ولا يأكل ما لم

يخبره أن ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هديته والأكل منها (الفتاوی الہندیۃ ۵/ ۳۴۳)۔

ہندیہ کی عبارت "**ما لم يخبره**" اس مسئلے میں صریح ہے کہ مخلوط مال کی مقدار یا وجہ حلت کے بابت معیار قابض مال کی خبر ہی ہوگی نہ کہ خارجی تحقیقات۔

(ب) اگر حلال وحرام سے مخلوط مال اس طور پر ہو کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہ ہو یعنی خلط غیر متمیز ہو تو اس اس کی بھی دو صورتیں ہیں:

(الف) حلال مثلی کا حرام مثلی سے خلط غیر متمیز ہو جائے تو یہ خلط گو کہ امر گناہ ہے؛ لیکن یہ اتلاف کے حکم میں ہے، ایسی صورت میں مقدار حرام کا مقدار حلال سے اخراج کے بعد بقیہ مال حلال سمجھا جائے گا۔

چونکہ شئ مثلی ایک دوسرے کے قائم مقام ہو جاتی ہے، اس لیے حرام کی مقدار کو مباح سے الگ کرنے کے بعد اختلاط نقصان نہیں پہنچاتا؛ کیونکہ یہاں حرمت عین شئ میں نہیں، طریق کسب یعنی حق غیر کی وجہ سے آئی تھی؛ مثلیات میں افراد کے مابین فرق نہیں ہوتا؛ اس لیے اگر مثلی حرام کے بقدر مال اصل مالک کو دے دیا جائے تو یوں سمجھا جائے گا کہ مالک کو اس کا اپنا مال مل گیا، لہٰذا قدر حرام اخراج کے بعد اب قابض کے پاس موجود بقیہ مال میں حرمت کا کوئی اثر نہ بچے گا اور بقیہ مال حلال شمار ہوگا۔

اعلاء السنن میں ہے:

"**لأنه لما تعذر رد العين وجب رد ما يقوم مقامها فی المالية، فإن كان مِما تتماثل أجزاؤه ولا تتفاوت صفاته وجب مثله؛ لأن المثل أقرب إليه من القيمة، وهو مماثل له من طريق الصورة والمشاهدة**" (العثمانی، ظفر أحمد، إعلاء السنن (بیروت، دار الفکر، ط۱، ۱۴۲۲ھ) ۱۵/ ۶۷۴ و ۶۶۱)۔

لیکن اگر قابض مالِ حرام، حرام مقدار کو حلال مال سے علیحدہ نہ کرے تو اس کے ساتھ لین دین کرنا شرعاً کیسا ہے؟ اس بابت ائمہ مذاہب کے نقطہائے نظر مختلف ہیں:

فقہاء حنفیہ کا اس بابت صحیح مذہب یہ ہے کہ اس صورت (خلط غیر متمیز) میں غلبے کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ مال حلال کی مقدار کی حد تک ہی لوگوں کا اس کے ساتھ معاملہ کرنا جائز ہے، حلال مقدار سے زیادہ معاملات کرنا جائز نہیں ہے۔

جواز تعامل کے لئے مال حلال کے غلبے کا اعتبار صرف خلط متمیز میں ہے، علامہ سمرقندی، ابن نجیم اور دیگر فقہاء کی مذکورہ ذیل جیسی عبارات کا محمل یہی ہے:

"ولو أن رجلاً أهدى إلى إنسان يكتسب من ربا أو رجل ظالم يأخذ أموال الناس أو أضافه فإن كان غالب ماله من حرام فلا ينبغي له أن يقبل ولا يأكل من طعامه ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه أو نحو ذلك .فإن كان غالب ماله حلال فلا بأس بأن يقبل هديته ويأكل منه ما لم يتبين عنده أنه من حرام" (السمرقندی،عیون المسائل،ص۴۷۸)۔

دونوں مسئلوں میں وجہ تفریق؟

ایک مسئلے میں غلبے کے اور دوسرے میں قدر حلال کے ساتھ معاملہ کرنے یعنی ان دونوں مسائل کے درمیان فرق کی وجہ یہ ہے کہ خلط متمیز میں حرام زیادہ سخت ہے، بسا ممکن ہے کہ کوئی شخص عین مال حرام کے ساتھ معاملہ کر بیٹھے، اس لیے وہاں حرام سے حتی الامکان احتراز کے مقصد سے زیادہ احتیاط برتی گئی ہے اور جواز تعامل کے لئے مال حلال کے غلبے کا اعتبار کیا گیا ہے، جبکہ خلط غیر متمیز میں حرمت عین مال سے نہیں؛ بلکہ ذمہ سے متعلق ہوئی ہے کہ مثلیات میں خلط بحکم اتلاف ہے، خلط غیر متمیز کی وجہ سے غاصب کے لئے ملک خبیث ثابت ہوجاتا ہے، ادائی بدل وضمان کے بعد ملک طیب ہوجاتا ہے؛ لہٰذا یہاں مال میں کوئی خرابی نہیں ہے، مال مباح کی کثرت کو یہاں ضروری نہ سمجھا گیا، قدر حلال کی حد تک معاملہ کو جائز قرار دیا گیا ہے، چاہے مال حلال قلیل سے قلیل مقدار میں ہی کیوں نہ ہو؛ تاکہ لوگوں کو مالی معاملات میں آسانیاں فراہم ہوں اور حرج دور ہو۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"وَلَوْ خَلَطَ الْغَاصِبُ دَرَاهِمَ الْغَصْبِ بِدَرَاهِمِ نَفْسِهِ خَلْطًا لَا يَتَمَيَّزُ ضَمِنَ مِثْلَهَا وَمَلَكَ الْمَخْلُوطَ؛ لِأَنَّهُ أَتْلَفَهَا بِالْخَلْطِ.

وَإِنْ مَاتَ كَانَ ذَلِكَ لِجَمِيعِ الْغُرَمَاءِ وَالْمَغْصُوبُ مِنْهُ أُسْوَةُ الْغُرَمَاءِ؛ لِأَنَّهُ زَالَ مِلْكُهُ عَنْهَا وَصَارَ مِلْكًا لِلْغَاصِبِ" (کتاب بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع ۷/۱۶۶[الکاسانی]

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہٗ فرماتے ہیں:

"ما يتحقق بعد سبر كلام الفقهاء الحنفية في هذا الموضوع أن اعتبار الغلبة إنما هو فيما إذا كان الحلال متميزاً عن الحرام عند صاحبه، ولا يعلم المتعامل معه أن ما يعطيه من الحلال أو من الحرام، فحينئذ تعبر الغلبة .....أما إذا كان الحلال مخلوطاً بالحرام دون تمييز أحدهما بالآخر، فإنّه لا عبرة بالغلبة في هذه الحالة في مذهب الحنفية، بل يحل الانتفاع من المخلوط بقدر الحلال،

سواء أكان الحلال قليلاً أم كثيراً'' (فقہ البیوع، ۲/ ۱۰۳۲)۔

(ب) خلط کی صورت میں متمیز یا غیر متمیز کسی کا بھی علم نہ ہو یا متمیز ہونے کی صورت میں قابض کو مال حلال وحرام کی مقدار کا علم نہ ہو تو یقینی شکل یا تحری پر عمل کرتے ہوئے مقدار حرام نکال دے۔

جہاں تک اس کے ساتھ لین دین کے جواز کی بات ہے تو اس کے ساتھ معاملات کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ معاملہ کرنے والے کو بعینہ مال حرام دیئے جانے کا علم نہ ہو، البتہ اجتناب بہتر ہے۔

پوچھی گئی صورت میں بوقت ضرورت دعوت کھانے کی گنجائش ہے؛ البتہ اجتناب بہتر ہے۔

جب دعوت کھانے کے بعد مال کی حرمت کا پتہ چلے؟

جواب: ۵

کیا اموال میں حرمت متعدی ہوتی ہے یا نہیں؟

یہ انتہائی اہم عنوان ہے، ہمارے فقہاء کی عبارتیں بادی النظر میں اس بابت قدرے متعارض نظر آتی ہیں، اس لئے اس کی تنقیح وتشریح ازبس ضروری ہے، مال حرام سے متعلق پوچھے گئے اکثر سوالات اور ویسے بھی مال حرام کے بیشتر احکام اسی ضابطے کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں، اس لئے اس کے مفہوم کی اجمالی تشریح، اس کی اصلیت اور مذاہب اربعہ میں اس کے اعتبار کی وضاحت کو ہم مفید وضروری سمجھتے ہیں، یہ بات کہ حرمت دو شخصوں کی جانب متعدی نہیں ہوتی الفاظ وصیغے کے قدرے تفاوت کے ساتھ مختلف مصادر میں کچھ اس طرح منقول ہوئی ہے:

''**الْحَرَامُ لَا يَتَعَدّى ذِمّتَيْن**'' (غمز عیون البصائر فی شرح الأشباہ والنظائر الحموی، أحمد بن محمد مکی ۳/ ۲۳۴، ورد المحتار ۵/ ۹۸، وشرح الزرقانی علی مختصر خلیل)۔

''**الحرامُ لَا يَتَعَلّقُ بِذِمّتَين**'' (کتاب حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر= بلغۃ السالک لأقرب المسالک، أحمد الصاوی ۳/ ۵۸۶، شاملۃ)۔

''**الحرام لا يتعدى لذمتين**'' (حفظ الأصغرین عن اعتقاد من زعم أن الحرام لا یتعدی لذمتین- حسن بن عمار الشرنبلالی المصری الحنفی، ص ۲)۔

حرمت کے عدم تعدیہ کا مفہوم:

کتابوں میں مختلف صیغوں سے مذکور اس قاعدے کی اجمالی تشریح یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کی ملکیت میں غیر شرعی طریقہ اکتساب مثلاً غصب وچوری ورشوت وغیرہ کے ذریعے کوئی مال آیا، پھر یہ مال حرام کسی مباح تصرف ولین دین کے ذریعے دوسرے شخص کی ملکیت میں چلا گیا، اور دوسرے شخص کو یقین یا غلبہ ظن سے یہ نہ معلوم ہو کہ اس نے جو مال لیا ہے وہ

مال حرام یعنی مسروق یا مغصوب ہے تو کسب حرام کا گناہ اس دوسرے شخص کی طرف منتقل نہیں ہوگا؛ بلکہ حرمت پہلے کاسب کے ذمہ کے ساتھ ہی خاص رہے گی؛ کیونکہ عدم علم عذر ہے اور اس صورت میں یہ معذور سمجھا جائے گا۔

لیکن جب دوسرے یا تیسرے بندے کو مال کے ذریعۂ حصول کی حرمت کا علم ہو، پھر اس نے غاصب وسارق سے مال لیا تو اب حرمت کاسبِ اوّل سے تمام ذموں کی طرف متعدی ہوگی، بیع وشراء، وراثت، شرکت ووقف اور ہبہ وغیرہ تمام احکام میں حرمت متعدی ہوگی۔

اس قاعدے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کسی حرام کام میں ایک سے زائد افراد شریک ہوں تو حرمت صرف شخص واحد سے متعلق ہوگی اور بقیہ لوگ بری الذمہ ہونگے؛ بلکہ امر حرام کے ارتکاب میں جتنے افراد شریک ہونگے سب کی طرف حرمت متعدی ہوگی اور سب حسب واردات گناہ میں شریک رہیں گے۔

عدم تعدیہ کی شرط

اموال حرام میں ایک سے زائد ذموں کی طرف حرمت کا عدم تعدیہ (الحرامُ لایتعدی إلی ذمتین) مطلق نہیں ہے؛ بلکہ ذمہ ثانی کے عدم علم اور شئ مغصوب کے عدم تغیر وتبدل (جس طرح اصل مالک کے پاس تھی) کے ساتھ مشروط ہے، مال کی اصلیت وحرمت کا پتہ ہوتے ہوئے خریدار کے لئے مال حلال نہیں ہوگا، بلکہ حرمت مال اس کے ذمہ میں بھی منتقل ہوگی۔

"عَنِ الْأَشْعَثِ بْنِ قَيْسٍ: أَنّ رَجُلًا مِنْ كِنْدَةَ وَرَجُلًا مِنْ حَضْرَمَوْتَ اخْتَصَمَا إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ فِي أَرْضٍ بِالْيَمَنِ، فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَرْضِي اغْتَصَبَهَا هَذَا وَأَبُوهُ فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: يَا رَسُولَ اللهِ، أَرْضِي وَرِثْتُهَا مِنْ أَبِي فَقَالَ الْحَضْرَمِيُّ: يَا رَسُولَ اللهِ، اسْتَحْلِفُهُ أَنّهُ مَا يَعْلَمُ أَنّهَا أَرْضِي وَأَرْضُ وَالِدِي، وَالّذِي اغْتَصَبَهَا أَبُوهُ .فَتَهَيّأَ الْكِنْدِيُّ لِلْيَمِينِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلّمَ: "إِنّهُ لَا يَقْتَطِعُ، عَبْدٌ أَوْ رَجُلٌ، بِيَمِينِهِ مَالًا إِلّا لَقِيَ اللهَ يَوْمَ يَلْقَاهُ وَهُوَ أَجْذَمُ "فَقَالَ الْكِنْدِيُّ: هِيَ أَرْضُهُ، وَأَرْضُ وَالِدِهِ" (مسند أحمد ۱۸۴۹، وأخرجہ أبوداود (۳۲۴۴) و(۳۶۲۲)، والنسائی فی الکبری ۶۰۰۲)۔

علامہ داؤدی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے:

"إن الأموال إذا أخذت بغير وجهها فهي على ملك مالكها، حيث ماوقعت ، إذ لا خلاف بين العلماء أن من أثبت عين شيئه كان له أخذه حيثما وجده، لا ينظر إلى ما صار به، إلى من صار بيده" (الداودی، أبوجعفر أحمد نصر، الأموال، تحقیق: رضا محمد سالم شحادہ، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، ط۱، ۱۴۲۹ھ/ ۲۰۰۸م) ص ۱۶۰)۔

علامہ حموی لکھتے ہیں:

"قَوْلُهُ: الْحُرْمَةُ تَتَعَدّى فِي الْأَمْوَالِ مَعَ الْعِلْمِ بِهَا۔

قَالَ الشَّيْخُ عَبْدُ الْوَهّابِ الشّعْرَانِيُّ – رَحِمَهُ اللّٰهُ – فِي كِتَابِ الْمِنَنِ: وَمَا نُقِلَ عَنْ بَعْضِ الْحَنَفِيّةِ مِنْ أَنّ الْحَرَامَ لَا يَتَعَدّى ذِمّتَيْنِ سَأَلْتُ عَنْهُ الشِّهَابَ ابْنُ الشِّبْلِيّ فَقَالَ: هَذَا مَحْمُولٌ عَلَى مَا إذَا لَمْ يَعْلَمْ بِذَلِكَ أَمّا مَنْ رَأَى الْمُكّاسَ مَثَلًا يَأْخُذُ مِنْ أَحَدٍ شَيْئًا مِنْ الْمَكْسِ ثُمّ يُعْطِيهِ آخَرَ ثُمّ يَأْخُذُهُ مِنْ ذَلِكَ الْآخَرِ فَهُوَ حَرَامٌ" (انتہی (غمز عیون البصائر فی شرح الأشباہ والنظائر [الحموی، أحمد بن محمد ۳/ ۲۳۴ شاملۃ] ۔

مشہور حنفی فقیہہ صاحب نور الایضاح علامہ شرنبلالی مصری رحمہ اللہ المتوفی سنۃ ۱۰۶۹ھ، جنہوں نے اس موضوع پہ ایک مستقل رسالہ حفظ الأصغرین عن اعتقاد من زعم أن الحرام لا یتعدی لذمتین تحریر فرمایا ہے کی تحقیق یہ ہے کہ اس قاعدے کی نسبت فقہ حنفی کی طرف درست نہیں ہے، یہ صرف لوگوں؛ بلکہ جہلاء کا زبان زد جملہ ہے (دیکھئے کتاب مذکور ص:۶)۔

بظاہر اس تردید کا مقصد بھی یہی ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا عدم تعدیہ والی بات مطلق نہیں ہے؛ بلکہ جہل اصل جیسی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔

علامہ شرنبلالی وغیرہ کی تردید مطلق تعدیہ کی نفی پر محمول ہے، ورنہ جب اصل مال کی حرمت کا پتہ ہو تو حرمت کا سبب ثانی کے ذمہ کی طرف باتفاق فقہاء منتقل ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں نہ تعدیہ حرمت مطلق ہے نہ عدم تعدیہ، دونوں حکم مشروط حالات اور مخصوص شرطوں کے ساتھ مشروط ومخصوص ہیں۔

مذاہب فقہیہ میں عدم تعدیہ حرمت کی مثالیں

پھر مختلف ذموں کی طرف عدم تعدیہ حرمت فقہ حنفی کا تفرد نہیں ہے، دیگر فقہی مذاہب میں بھی کسی نہ کسی درجے میں مشروط طور پر الحرامُ لا یتعدی إلی ذمتین کا ثبوت ملتا ہے۔

علامہ صاوی مالکی المدونہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وَنَصّ ابْنُ الْقَاسِمِ وَفِي الْمُدَوّنَةِ: أَنّ مَنْ غَصَبَ قَمْحًا فَطَحَنَهُ فَهُوَ مُفَوّتٌ وَعَلَيْهِ مِثْلُ الْقَمْحِ، وَمَنْ أَكَلَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدَ فَوْتِهِ فَلَا غُرْمَ عَلَيْهِ، وَهَلْ يَجُوزُ بَعْدَ الْفَوَاتِ الْأَكْلُ مِنْهُ؟ الرّاجِحُ فِي الْمَذْهَبِ الْجَوَازُ؛ وَلِذَا أَفْتَى بَعْضُ الْمُحَقِّقِينَ بِجَوَازِ الشِّرَاءِ مِنْ لَحْمِ الْأَغْنَامِ الْمَغْصُوبَةِ إذَا بَاعَهَا الْغَاصِبُ لِلْجَزّارِينَ فَذَبَحُوهَا لِأَنّهُ بِذَبْحِهَا تَرَتّبَتْ الْقِيمَةُ فِي ذِمّةِ الْغَاصِبِ، [فَلَا غُرْمَ عَلَيْهِ] : أَيْ لِكَوْنِ الْحَرَامِ لَا

يَتَعَلّقُ بِذِمّتَين .....قَوْلُهُ: [الرّاجِحُ فِي الْمَذْهَبِ الْجَوَازُ] : أَيْ كَمَا رَجّحَهُ ابْنُ نَاجِي تَبَعًا لِصَاحِبِ الْمِعْيَارِ، وَلَوْ عَلِمَ الْآكِلُ أَنّ الْغَاصِبَ لَا يَدْفَعُ الْقِيمَةَ؛ لِأَنّه دَفْعَ الْعِوَضِ ---وَاَللّهُ أَعْلَمُ" (حاشیۃ الصاوی علی الشرح الصغیر= بلغۃ السالک لأقرب المسالک، أحمد الصاوی ۳/ ۵۸۶ شاملۃ]۔

شافعیہ کی کتاب کفایۃ النبیہ فی شرح التنبیہ لابن الرفعۃ میں ہے:

"وإن غصب فرساً فقاتل عليه أسهم [له] أى: سهم للفرس فى أظهر القولين، ولصاحب الفرس فى [القول] الآخر.

وقال ابن الصباغ: عندى أنه يكون السهم للغاصب قولاً واحداً .ويكون عليه أجرة مثل الفرس لصاحبه، ويخالف مسألة البضاعة؛ لأن جعل الربح فيها على القديم للمالك؛ خشية من أن يكثر الغصب والخيانات فى الأمانات، وهذا مفقود هنا؛ [و] لأن أجرة الفرس تجب عليه، وربما كانت أكبر من سهمه؛ فلا يؤدى إلى ذلك" (کفایۃ النبیہ فی شرح التنبیہ، ابن الرفعۃ ۱۶/ ۵۰۰)۔

حنابلہ کی کتاب شرح کبیر میں ہے:

"(وإن اشترى [أى غاصب الدراهم] فى ذمته ثم نقدها احتمل أن يكون الربح للغاصب وكذلك ذكره أبو الخطاب، وهو قول أبى حنيفة وأحد قولى الشافعى؛ لأنه اشترى لنفسه فى ذمته، فكان الشراء له والربح له، وعليه بدل المغصوب، وهذا قياس قول الخرقى، وذكر ذلك عن أحمد، واحتمل أن يكون للمالك؛ لأنه نماء ملكه، أشبه ما لو اشترى بعين المال، وهذا المشهور فى المذهب" (ابن قدامۃ، أبوالفرج عبدالرحمٰن بن محمد بن أحمد، الشرح الکبیر علی متن المقنع (د. م، دار الکتاب العربی، د. ط، د. ت) ۵/ ۴۴۱، وحسین محمد نعیم قاعدۃ الحرام لا یتعدی إلی ذمتین ص ۴۱)۔

ان فقہی جزئیات سے واضح ہے کہ دیگر فقہی مذاہب میں بھی مال حرام کے بعض مخصوص حالات میں حرمت متعدی نہیں ہوتی، لہٰذا قاعدہ "الحرام لا يتعدى لذمتين" کسی نہ کسی درجے میں سب کے یہاں معمول بہ ہے، جس طرح تعدیہ حرمت بھی مخصوص حالات میں سب کے یہاں معمول بہ ہے۔

اسی قاعدے پر سوال ہذا کا جواب متفرع ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے حرام مال کھانا خواہ دوسرے کا کمایا ہوا ہو یا خود کمایا ہوا حرام ہے۔

اگر لاعلمی اور انجانے میں حرام مال سے کی گئی دعوت کسی نے کھالی ہے تو اللہ کے یہاں کوئی مواخذہ نہ ہوگا؛ کیونکہ جب تک وہ اس رقم کی حقیقت سے ناواقف رہتے ہوئے اسے کھاتا یا پہنتا رہا، اس کی کوئی شرعی پکڑ نہیں، محض گمان سے کچھ

فائدہ نہیں ہوتا، اصول یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس موجود مال کو حلت پر محمول کیا جائے گا؛ تا آنکہ اس کے خلاف کوئی وجہ حرمت ظاہر وثابت نہ ہوجائے۔

ہدیہ دینے اور ضیافت کرنے والے کسی مسلمان کے ذریعہ آمدن کی بحث وتفتیش اور اس بابت اندرون خانہ تاک جھانک کی اجازت شریعت اسلامیہ نے نہیں دی ہے، دعوت وہدایا کے تئیں مسلمانوں کا معاملہ سداد پر محمول کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقع سے پوچھ گچھ اور کھود کرید کرنے سے منع فرمایا ہے کہ یہ توہین اور ایذاء مسلم کو مستلزم ہے۔

الّا یہ کہ وہ صراحت کردے کہ آمدنی مثلاً قرض حسنہ یا میراث میں حاصل شدہ مال حلال ہی سے ہدیہ دے رہا ہوں تو ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، ارشاد نبوی ہے:

"إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ عَلَى أَخِيهِ الْمُسْلِمِ فَأَطْعَمَهُ طَعَامًا، فَلْيَأْكُلْ مِنْ طَعَامِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ، وَإِنْ سَقَاهُ شَرَابًا مِنْ شَرَابِهِ، فَلْيَشْرَبْ مِنْ شَرَابِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ" (مسند أحمد، شعیب الأرناؤوط ۹۱۸۴)۔

جہاں تک اجرت یا ثمنِ مبیع یعنی معاوضات ومالی معاملات کا معاملہ ہے تو اس کا حکم ہدیہ وضیافت سے قدرے مختلف ہے، اور حالات، عرف وضرورت کے پیش نظر رفع حرج کے مقصد سے بر بنائے روایت کرخی اس میں گنجائش ہے۔

پوچھی گئی صورت میں جبکہ لاعلمی اور انجانے میں حرام مال سے کی گئی دعوت کسی نے کھالی ہے تو اللہ کے یہاں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

غیر شرعی طریقے سے حاصل کردہ مال کی تطہیر کا طریقہ

جواب:٦

غیر شرعی طریقے سے حاصل کردہ مال میں اصل مالک کی ملکیت باقی رہتی ہے، حاصل کنندہ اس کا مالک بنتا ہے، نہ اس میں مالی تصرفات کا حق رکھتا ہے؛ لہٰذا اگر حرام مال کا مالک معلوم ہو اور وہ بلاعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے: سود، چوری، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ تو اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی وہ جہاں سے آیا ہے وہیں اسے واپس دے دیا جائے، مالک وفات پاچکا ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹا دیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے مستحقِ زکاۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ بالعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے حرام کام: زناء اور دیگر امور معاصی وغیرہ کے ذریعے حاصل کردہ اجرت وکمائی وغیرہ تو ایسے مال کا حکم یہ ہے کہ وہ مالِ خبیث ہے جس کو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کرنا ضروری ہے، اسے مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کا یہی ایک مصرف ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردیا جائے۔

جس مال حرام کو اصل مالک تک لوٹانا ممکن نہ ہو تو ایسا مال بحکم لقطہ ہے اور لقطہ کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالک، غیر معلوم کی طرف سے صدقہ نافلہ ہے (نافلہ کی قید سے زکات والی تملیک فقراء نکل گئی کہ مال خبیث میں صدقات واجبہ کی طرح تملیک فقراء ضروری نہیں) لیکن نفس تصدق واجب ہے۔

سنن ابی داؤد میں ہے:

"حدَّثنا محمدُ بن العلاء، أخبرنا ابنُ إدريسَ، أخبرنا عاصمُ بن كُلَيب، عن أبيه عن رجل من الأنصار، قال: خرجْنا مع رسولِ الله –صلَّى الله عليه وسلم– في جَنَازةٍ، فرأيتُ رسولَ الله –صلَّى الله عليه وسلم– وهو على القبر يُوصي الحافرَ: "أوْسِعْ من قِبَلِ رجلَيه، أوسِعْ من قِبَل رأسِه"، فلما رجع استقبلَه داعي امرأةٍ، فجاء، وجيء بالطَّعام فوضَع يدَه، ثم وضع القومُ فأكلُوا، ففطِنَ آباؤنا ورسولُ الله –صلَّى الله عليه وسلم– يلوكُ لقمةً في فمه، ثم قال: "أجِدُ لحمَ شاةٍ أُخِذَت بغير إذن أهلها" فأرسلتِ المرأةُ: يا رسولَ الله، إني أرسلتُ إلى النقيع تُشتَرى لي شاةٌ، فلم أجِدْ، فارسلتُ إلى جارٍ لي قد اشترى شاةً: أن أرسِلْ بها إليّ بثمنِها فلم يوجَدْ، فأرسلتُ إلى امرأتِه، فأرسلتْ إليّ بها، فقال رسولُ الله –صلَّى الله عليه وسلم–: "أطْعِمِيهِ الأُسارَى" (سنن أبي داود-ت الأرنؤوط ۳۳۳۲، وأخرجہ محمد بن الحسن الشیبانی فی "الآثار" کمافی "نصب الرایۃ" ۴/ ۱۶۸، وأحمد (۲۲۵۰۹) و(۲۳۴۶۵)۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا حرام قرار دیا، حالانکہ انہیں اس کی ضرورت تھی، اگر انتفاع حلال ہوتا تو ان کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا جائز قرار دیتے، قیدیوں کو کھلانا صاحب مال کی طرف سے صدقہ کے حکم میں ہے۔

مال حرام غیر معلوم المالک کو بحکم لقطہ ماننے کی صورت میں جس طرح غریب ملتقط کے لئے یہ جائز ہے کہ تنگ دست ہونے کی صورت میں تعریف وتشہیر کے بعد لقطہ سے خود منتفع ہو، اسی طرح حرام مال میں جب مالک غیر معلوم ہونے کے باعث تصدق علی الفقراء متعین ہو گیا، تو تنگ دست کا سب حرام خود کو فقراء کی جگہ پر رکھ کر اسے خود استعمال بھی کر سکتا ہے، جب وہ محتاج ہے تو وہ باقی غریبوں کی طرح ہو گیا اور اس کی ضرورت ایسے مال میں جو غریبوں پر ویسے بھی خرچ ہونے ہی والا ہے تمام غریبوں کے حقوق پر مقدم ہے۔ لہٰذا وہ بھی دیگر غریبوں کی طرح غریب ہو گیا۔

لیکن واضح رہے کہ یہ انتفاع مطلق نہیں ہے؛ بلکہ تنگ دستی کے ساتھ مشروط ہے، غنی کا سب وقابض امام وقت کی اجازت سے عارضی طور پر بطور قرض استفادہ کر سکتا ہے؛ لیکن اس کا بدل ومثل فقراء پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح تعریف وتشہیر کے بعد لقطہ کو جس طرح رفاہ عام میں استعمال کرنا جائز ہے اسی طرح مالک غیر معلوم پر واپسی ناممکن ہونے کی صورت میں مال حرام کو مالک اصلی کی نیت سے وجوہ خیر اور مصالح مسلمین میں بھی صرف کرنا جائز ہوگا، صدقہ واجبہ یعنی زکات کی طرح تملیک فقراء لازم نہیں ہے؛ کیونکہ بتصریح فقہاء لقطہ فقراء کے ساتھ خاص نہیں ہے، اسے مصالح مسلمین میں صرف کرنا جائز ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی، مفتی محمد تقی صاحب عثمانی، مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی، حضرت تھانوی قدس سرہ، علامہ ظفر احمد عثمانی وغیرھم کا رجحان یہی ہے کہ عند تعذر الرد مال حرام بحکم لقطہ ہے، لقطہ پر تفریع کے بعد اس سے استفادے کے بارے میں لقطہ جیسی گنجائش یہاں بھی نکلے گی، اور مصرف میں بھی وسعت وگنجائش نکلے گی (دیکھئے امداد المفتیین صفحہ ۴۵۴، امداد الاحکام ۳/ ۴۷، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۳۱، فقہ البیوع المبحث العاشر ۲/ ۱۰۴۵)۔

واجب التصدق مال حرام کو صدقہ کرنے کی بجائے بطور قرض اپنی تجارت میں لگانا کیسا ہے؟

جواب: ۷

اگر غلطی سے کسی کی ملکیت میں حرام مال آ گیا ہو تو اس سے توبہ کرے، آئندہ ایسا نہ کرنے کا پکا عہد کرے اور گلو خلاصی کے لئے اسے فوری مالک معلوم تک پہنچائے (اگر مالک معلوم ہو اور بلاعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے: سود، چوری، رشوت وغیرہ)، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے مستحقِ زکاۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔ اگر مال حرام بالعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے حرام ملازمت وغیرہ کے ذریعے تو اسے مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کا یہی ایک مصرف ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دیا جائے۔

جب مال حرام کو مالک یا اس کے وارث تک پہونچانا ممکن ہو تو اسے فوری مالک یا ورثاء تک پہونچانا ضروری ہے، قابض خواہ غریب ومحتاج ہی کیوں نہ اسے ایسے مال حرام سے ادائی بدل سے قبل تجارت وبزنس کرنا جائز نہیں ہے، ایسے مال حرام کو صدقہ کر دینے کی نیت سے بزنس وغیرہ میں لگا کر مستقل حرام کماتے رہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس نے مالک اصلی سے اپنے پاس رکھے رہنے اور کاروبار میں لگا کر بعد میں واپس کرنے کے بابت اجازت نہیں لی ہے، دوسرے کا حق باطل طریقے سے اس کے پاس پہونچا ہے جسے جلد از جلد مالک اصلی تک پہونچائے، ہاں! جب مسروق ومغصوب ورشوت وغیرہ کا مالک غیر معلوم ہو اور ان تک مال حرام لوٹانا ممکن نہ رہے، اور ان کی طرف سے بس تصدق ہی متعین ہو جائے، یا بالعوض مال حرام حاصل کیا گیا ہو جیسے حرام ملازمت اور معصیت کی اجرت وغیرہ، تو چونکہ یہاں بھی تصدق متعین ہو جاتا ہے، تو جن صورتوں

میں مالک کولوٹانے کی بجائے تصدق متعین ہوجائے ان تمام صورتوں میں، اگر یہ شخص تنگ دست ہوتو قدر ضرورت مال حرام سے اپنے اور غریب اہل وعیال پر خرچ کر لینے یا بزنس کر لینے کی گنجائش ہے، اور اگر غنی ہے اور امام وقت (یا موجودہ زمانے میں معتبر ومتورع عالم دین ومفتی وغیرہ) کی اجازت اور عندالوسعت والسہولہ مال حرام کے تصدق کی واپسی کی یقین دہانیاں کرادے تو مال حرام صدقہ کرنے کی بجائے عارضی طور پر بطور قرض لے لے اور اسے جائز تجارت وغیرہ میں لگا کر نفع کمانے اور پھر بعد میں حسب سہولت مالک غیر معلوم کی طرف سے یا حرام ملازمت کی آمدن مطلق صدقہ کردے، یعنی جہاں ردالی المالک کے تعذر کی صورت میں تصدق متعین ہوجائے یا بالعوض حاصل کردہ مال حرام کہ اس میں بھی تصدق متعین ہوجاتا ہے، ان صورتوں میں محتاج وتنگ دست قابض وکاسب حرام کے لئے مال حرام کو تجارت ونفع اندوزی میں لگانا فقیر ہونے کی حیثیت سے جائز ہے، غنی ہونے کی صورت میں حالات وضروریات سے واقف معتبر ومتورع عالم ومفتی کی اجازت وہدایت اور واپسی کی یقین دہانی دینے کے بعد بطور قرض لیکر مال حرام سے جائز تجارت کی جاسکتی ہے۔

غیر شرعی طرق کسب کے آج کے بہتات کے زمانے میں جہاں حرام وحلال کی کوئی تمیز رہی، نہ رشوت اور دجل وفریب سے کاروبار محفوظ ومامون بچا! رشوت، جھوٹ، فریب اور بہتان سے شاید ہی کوئی اپنی تجارت کو محفوظ رکھ پاتا ہو، ایسے زمانے میں جب انسان کے پاس موجود اموال کی تطہیر کی جائے تو سارا مال ہی مال حرام کے زمرے میں آجائے گا! اب اس کے پاس مال حلال وطیب شاید ہی بچے۔

اگر ایسے سارے اموال کو صدقہ کردینے کا حکم دیدیا جائے تو اس بندے کو حلال تجارت کے لئے کون رقم دے گا؟ اس اعتبار سے یہ خود بھی تنگ دست ومحتاج کے زمرے میں آگیا، اور گزشتہ جوابات کے ذیل میں تفصیلی بحث مع دلائل گزر چکی ہے کہ تنگ دست کاسب حرام کو مال حرام سے انتفاع وانفاق کی گنجائش ہے، لہٰذا اس تقدیر پر سوال میں پوچھے گئے شخص کے لئے قرض کی بجائے تصدق علی الفقراء تصور کرتے ہوئے انفاق علی نفسہ کی حیثیت سے بھی اس مال حرام کو تجارت میں لگانے کی اجازت ہوگی؛ جب تک کہ وہ حلال تجارت سے صاحب نصاب نہ ہوجائے، پاکیزہ مال سے صاحب نصاب ہوجانے کے بعد فقیر کی حیثیت سے لگائے گئے مال حرام کو لوٹانا ضروری تو نہیں؛ البتہ اولیٰ وافضل ضرور ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرض کی حیثیت سے بھی اور مال حرام کی مقدار نکال دینے کے بعد فقیر کے زمرے میں خود کو رکھ کر محتاج کی حیثیت سے بھی مال حرام سے انتفاع واستثمار کی گنجائش ہوگی، قرض کی حیثیت سے لینے میں پھر عندالوسعت تصدق واجب ہوگا خواہ مرحلہ وار وقسطوار ہی کیوں نہ ہو، جبکہ فقیر کی حیثیت سے لینے میں اعادہ تصدق واجب نہیں ہے، حالت بہتر ومستحکم ہوجانے کے بعد پھر بطور قرض لیکر کاروبار کرے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ کی رائے بھی یہی ہے۔

فقہ البیوع میں لکھتے ہیں:

"وكثيراً ما يقع في زماننا أن ما كسبه المرأ مدى سنين طويلة كله حرام عن طريق الربا أو الرشوة وغيرها من التعاملات المحظورة، ولا سبيل إلى ردّ تلك الأموال إلى أصحابها، فوجب عليه التصدق بها، ثمّ يوفّقه الله سبحانه وتعالى أن يتوب عن الكسب الحرام، ولكن ليس عنده مال سواه ليسد به حاجته وحاجة عياله .فيحتمل أن يُعتبر ذلك المرأ فقيراً من حيث إنه لا يملك من المال الحلال شيئاً، وما في يده ليس مملوكاً له شرعاً، فتجرى عليه أحكام الفقراء في هذه المسئلة) فيجوز له أن يصرف ذلك المال في حاجة نفسه إلى أن يملك نصاب الزكوة من مال حلال. ومقتضى ذلك أن ما يصرفه قبل أن يملك النصاب من المال الحلال لا يجب عليه التصدق به بعد ما صار غنياء ولكن يُستحب له ذلك، لأن الحكم بفقره إنما جاء من قبل وقوعه في معصية كسب الحرام، فينبغي أن يحتاط في الأمر، كما يُستحسن له أن يود ع هذا الكسب الحرام عند عالم مأمون، ويأخذ منه بقدر حاجته، لئلا يتعدى في صرفه مواضع الحاجة الحقيقية .فإذا ملك النصاب وصار غنيّاً شرعاً، ولا يكفي النصاب لحاجته وحاجة عياله، فحينئذ يجوز له الاقتراض مما عنده من المال المكتسب بطريق الحرام بشرط أن يلتزم أداء مثله إلى الفقراء(فقہ البیوع ۲/۱۰۴۶-۱۰۵۰)۔

علامہ ابن تیمیہ اس نوع کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"فإن الرجل قد يعيش مدة طويلة لا يصلي ولا يزكي، وقد لا يصوم أيضا، ولا يبالي من أين كسب المال أمن حلال أم من حرام، ولا يضبط حدود النكاح والطلاق، وغير ذلك ، فهو في جاهلية إلا أنه منتسب إلى الإسلام، فإذا هداه الله وتاب عليه فإن أُوجب عليه قضاء جميع ما تركه من الواجبات، وأُمر برد جميع ما اكتسبه من الأموال، والخروج عما يحبه من الأبضاع إلى غير ذلك صارت التوبة في حقه عذابا، وكان الكفر حينئذ أحب إليه من ذلك الإسلام الذى كان عليه، فإن توبته من الكفر رحمة، وتوبته وهو مسلم عذاب. وأعرف طائفة من الصالحين من يتمنى أن يكون كافرا ليُسلم فيغفر له ما قد سلف؛ لأن التوبة عنده متعذرة عليه أو متعسرة على ما قد قيل له، واعتقده من التوبة، ثم هذا منفّر لأكثر أهل الفسوق عن التوبة، وهو شبيه بالمؤيِّس للناس من رحمة الله، ووضع الآصار الثقيلة والأغلال

العظيمة على التائبين الذين هم أحباب الله، فإن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين، والله أفرح بتوبة عبده من الواجد لماله الذى به قوامه بعد اليأس منه" (مجموع الفتاوی ۲۱/ ۲۲)۔

" فإن تابت هذه البغى وهذا الخَمَّار ، وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال قدر حاجتهم ، فإن كان يقدر يتجر أو يعمل صنعة كالنسج والغزل ، أعطى ما يكون له رأس مال. وإن اقترضوا منه شيئا ليكتسبوا به ... كان أحسن" (مجموع الفتاوی ۲۹/ ۳۰۸)۔

حلال وحرام سے نصفاً نصفا مخلوط بزنس والے شخص کے یہاں ملازمت کرنا؟

جواب:۸

اجرت اجیر کی جانب سے پیش کردہ خدمت ومنفعت کے بدلے میں دی جانے والی چیز (نقد وغیرہ) کو کہتے ہیں، لہٰذا اگر کام حرام وناجائز ہوا تو اس کا عوض یعنی اجرت بھی حرام ہوگی، اور کام حلال ہوا تو اس کے عوض ملنے والی اجرت بھی حلال ہوگی۔

حلال وحرام سے نصفاً نصفا مخلوط بزنس والے شخص کے یہاں ملازمت حصۂ حلال اور قدرِ حلال میں حلال ہوگی، اگر اجیر کی ملازمت حلال کاروبار کے شعبہ میں ہے تو فی نفسہ اس ملازمت میں قباحت نہیں ہے؛ تاہم ایسی جگہ ملازمت کرنا جہاں دونوں طرح کے کاروبار (حلال وحرام) ہوتے ہوں مناسب نہیں، جہاں تک ایسی ملازمت سے حاصل شدہ تنخواہ کا حکم ہے تو چونکہ تنخواہ کام کی اجرت ہوتی ہے، اگر اس شخص سے متعلقہ کام جائز ہے، نہ راست حرام کام کرنا پڑتا ہو نہ اعانت علی المعصیت کی کوئی شکل بنتی ہو تو اس سے حاصل شدہ آمدنی بھی حلال ہوگی، مزدوری دینے والا مزدور کو جب تک ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کرے کہ یہ پیسے میں تم کو خالص حرام کمائی کے دے رہا ہوں اس وقت تک وہ حرام نہ ہوگا، مزدور کو مزدوری کے پیسے کی کھود کرید کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے؛ کیونکہ اموال میں باجماع فقہاء اصل حلت ہے جب تک کہ خاص اس مال کی حرمت ظاہر نہ ہوجائے:

"قَالَ الْفَقِيهُ أَبُو اللَّيْثِ – رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى – اخْتَلَفَ النَّاسُ فِي أَخْذِ الْجَائِزَةِ مِنْ السُّلْطَانِ قَالَ بَعْضُهُمْ يَجُوزُ مَا لَمْ يَعْلَمْ أَنَّهُ يُعْطِيهِ مِنْ حَرَامٍ قَالَ مُحَمَّدٌ – رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى – وَبِهِ نَأْخُذُ مَا لَمْ نَعْرِفْ شَيْئًا حَرَامًا بِعَيْنِهِ، وَهُوَ قَوْلُ أَبِي حَنِيفَةَ – رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى – وَأَصْحَابِهِ، كَذَا فِي الظَّهِيرِيَّةِ" (الفتاوی الہندیۃ، الْبَابُ الثَّانِي عَشَرَ فِي الْهَدَايَا وَالضِّيَافَاتِ ۵/ ۳۴۲)۔

"هذا ونقل البيضاوى أن من يقول الأصل فى الأشياء الإباحة يعنى فى المنافع، وأما فى

المضار فالأصل فيها التحريم، وقال الأسنوى: "هذا بعد ورود الشرع بمقتضى أدلته، وأما قبله فالمختار الوقف، وفى أصول البزدوى بعد ورود الشرع الأموال على الإباحة بالإجماع ما لم يظهر دليل الحرمة؛ لأن الله تعالى أباحها بقوله: خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (البقرہ:)، (تیسیر التحریر ۲/۱۷۲)۔

ہدیہ اور دعوت کھانے جیسے مسائل میں تو غالب مال کی حلت وحرمت مدار حکم بنتی ہے؛ لیکن مالی معاملات (بشمول کرایہ داری) میں غلبے کا اعتبار نہیں ہے، بلکہ جمہور ائمہ متاخرین نے امام کرخی کے قول پر فتوی دیا ہے جس کا ماحصل یہی ہے کہ مالی معاملات میں ملنے والے زر وثمن کے بعینہ حرام ہونے کا جب تک علم نہ ہوجائے، (اور علم ہونے کی صورت میں بھی جب تک عقد ونقد دونوں اس مال حرام پر جمع نہ ہوجائے) تو وہ اکل حلال ہوگا اور قابل انتفاع ہوگا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ فرماتے ہیں:

"أما قبول الوظائف فى مثل هذه الفنادق والمطاعم فإن كانت الوظيفة متمحضة لخدمة مباحة فهى جائزة، وتجرى على راتبها حكم المال الحلال وإن كانت متمحضة للحرام، مثل بيع الخمر، فهى حرام، وراتبها حرام.

وأما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة، فلا يجوز قبولها لاشتمالها على عمل محرم .ولكن إن قبل أحد مثل هذه الوظيفة، فما حكم الراتب الذى أخذه عليها؟ لم أجد فيها نقلاً فى كلام الفقهاء، إلا ما ذكره ابن قدامة رحمه الله تعالى:

"قال (أى للأجير: استأجرتك) لتَحْمِل لى هذه الصبرة والتى فى البيت بعشرة ...فإن كانا يعلمان التى فى البيت لكنها مغصوبة، أو امتنع تصحيح العقد فيها لمانع اختص بها، بطل العقد فيها، وفى صحة الأخرى وجهان بناءً على تفريق الصفقة، إلا أنهما إن كانت قفزانهما ،معلومة، أو قدر أحدهما معلوم من الأخرى، فالأولى صحته، لأنّ قسط الأجر فيها معلوم .وإن لم يكن كذلك، فالأولى بطلانه لجهالة العوض فيها" (المغنی لابن قدامۃ، کتاب الإجارات ۶:۹۰) (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۶)۔

حرام مال سے تعلیمی فیس دینا؟ یا حرام مال سے خرید کردہ گاڑی میں سفر کرنا؟

جواب:۹

ملک خبیث یعنی غیر مشروع طریقہ اور ناجائز ذرائع سے جو مال حاصل کیا جاتا ہے اس مال کی عین وذات میں حرمت

نہیں ہوتی ہے؛ بلکہ حرمت حرام مال کے کاسب وحامل کے ذمہ سے متعلق ہوتی ہے، مال حرام کی تطہیر اور اس سے گلوخلاصی کے مشروع ومتعین طریقوں سے انحراف کرتے ہوئے اگر کوئی شخص اس مال حرام میں بیع وشراء جیسا تصرف کرلے اور اس سے کوئی چیز خرید لے تو یہ اس کا ناجائز عمل اسی کے سر رہے گا، اس کا جواب دہ ومسئول وہ خود ہوگا، حرمت فعل اسی کے ذمہ سے متعلق ہوگی، دوسرے لوگوں کے ذموں تک یا مال حرام سے خریدی گئی چیزوں کی عین وذات تک اس کی حرمت اثر انداز نہ ہوگی:

"كُلُّ امْرِءٍ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ" (الطور:۲۱)، ویقول: وَلاَ تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى (الأنعام:۱۶۴)۔

فقہاء متاخرین نے ہر مالی لین دین میں مال حرام پر عقد ونقد جمع نہ ہونے کی صورت میں ہر متعاقد کے لئے اسے لینے اور اس سے انتفاع کی گنجائش دی ہے، اور مزدوری دینے والا ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کردے کہ یہ پیسے میں تم کو خالص حرام کمائی کے دے رہا ہوں، اس وقت تک وہ بائع واجیر کے لئے حرام نہ ہوگا؛ ہاں وہ لیکر صدقہ کردے تو بہتر بات ہے، یعنی قضاء جائز ہے دیانۃً جائز نہیں!

قضاء مزدور وبائع کو مزدوری یا ثمن کے پیسے کی کھود کرید کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

لہٰذا مال حرام سے خریدی گئی زمین میں کھیتی باڑے سمیت محنت مزدوری کا عمل کرنا، یا کاسب حرام کے گھر میں کام کرنا، مال حرام سے خرید کردہ گاڑی میں سفر کرنا، کاسب حرام سے تعلیمی یا طبی فیس یا دیگر واجبی حقوق واجرت وصولنا مال حرام پہ عقد ونقد جمع نہ ہونے کی شرط کے ساتھ بر بنائے روایت کرخی جائز ہے، اور اجیر کے لئے بھی قابل انتفاع اور مباح الاول ہے۔

سود کا مال رشوت میں دینا؟

جواب:۱۰

اپنے جائز ثابت شدہ حقوق کے حصول کے لئے جبکہ اس کے حصول کا کوئی اور متبادل آپشن نہ بچے، رشوت دینے سے گناہ نہیں ہوتا ہے:

"أما إذا أعطى ليتوصل به إلى حق، أو ليدفع به عن نفسه ظلماً فلا بأس به، وكذا الآخذ إذا أخذ ليسعى فى إصابة صاحب الحق فلا بأس به، لكن هذا ينبغى أن يكون فى غير القضاة والولاة؛ لأن السعى فى إصابة الحق إلى مستحقه، ودفع الظالم عن المظلوم واجب عليهم، فلايجوز لهم الأخذ عليه" (مرقاۃ المفاتیح، کتاب الأمارۃ والقضاء، باب رزق الولاۃ وہدایاہم، الفصل الثانی، ج:۷/ ۲۹۵، ط: دار الکتب العلمیۃ)۔

"دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعنى

فی حق الدافع اھـ" (فتاویٰ شامی ۶/ ۴۲۳، کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع، ط: سعید)۔

بینک کی سودی رقوم کا مالک بینک ہے، اس میں ردالی المالک ہوگا یا بلانیت ثواب تصدق علی الفقراء ہوگا:

"وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إِنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إِذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ اھـ" (حاشیۃ ابن عابدین ردالمحتار ط الحلبی ۶/ ۳۸۵)۔

بینک کو لوٹانے کی بجائے واجبی ٹیکس میں سودی رقم دینے سے سمجھا جاتا ہے کہ سرکاری سود دوسرے عنوان سے سرکار کو پہونچا دیا گیا، لیکن مدرسہ کے نقشہ کی منظوری کے لئے متعلقہ ادارے کے عملہ کو جو رشوت دی جاتی ہے وہ حکومت کے قبضے میں نہیں جاتی؛ بلکہ افسران کے ذاتی جیب میں چلی جاتی ہے، تو ردالی المالک نہیں ہوا اور نہ ہی یہ لوگ مصارف زکات ہیں کہ تصدق علی الفقراء تصور کرلیا جائے؛ اس لئے رشوت میں سودی رقم دینے کی گنجائش نہیں ہے، اپنے حقوق کی وصولیابی کے لئے اگر آخری چاہ کار کے بطور رشوت دینا ہی پڑے تو حلال مال سے رشوت دے۔

مسلمان کے ذریعۂ آمدنی کی بحث وتفتیش کرنا درست نہیں!

جواب: ۱۱

اموال مسلمین میں اصل حلت ہے؛ جب تک کہ اس کے خلاف کوئی وجہ حرمت ظاہر نہ ہوجائے، مسلمانوں کے زیر ملکیت جتنے اموال ہوتے ہیں وہ اصل حلت پر محمول ہوں گے؛ تا آنکہ شواہد وقرائن سے قطعی طور پر حرام ہونا معلوم نہ ہوجائے، جس کے بارے ہمیں کچھ پتہ نہیں تو اس کی حالت مجہول ہوئی اور مجہول کا کوئی اعتبار نہیں ہے، مسلمان کے ذریعۂ آمدنی کی بحث وتفتیش اور اس بابت اندرون خانہ تاک جھانک کی اجازت شریعت اسلامیہ نے نہیں دی ہے، اس سے سماج میں مختلف رنجشوں، عداوتوں، بدگمانیوں، غلط فہمیوں اور اضطرابات وبے چینیوں کا زنجیری سلسلہ قائم ہوسکتا ہے جس سے ملت کا اتحاد اور اخوت ویگانگت پاش پاش ہوتا اور محبتوں کی جگہ نفرتیں پروان چڑھتی ہیں، دعوت وہدایا کے تئیں مسلمانوں کا معاملہ سداد وحسن ظن پر محمول کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے موقع سے پوچھ گچھ اور کھود کرید کرنے سے منع فرمایا ہے کہ یہ توہین اور ایذاء مسلم کو مستلزم ہے، جب پتہ نہیں ہے کہ داعی نے حرام پیسے سے ہدیہ دیا یا دعوت کی ہے یا حلال پیسے سے؟ تو بلاوجہ حرام کا شبہ نہیں کرنا چاہئے، حسن ظن رکھ کر ہدیہ قبول کرنا چاہئے؛ ہاں اگر یقینی ذریعہ سے معلوم ہوجائے کہ دعوت کرنے والے شخص کی کل یا اکثر آمدنی حرام پر مشتمل ہے اور وہ اسی حرام پیسے سے دعوت کررہا ہے تو پھر دعوت کھانا اور ہدایا لینا درست نہیں ہے، الّا یہ کہ وہ صراحت کردے کہ آمدنی مثلاً قرض حسنہ یا میراث میں حاصل شدہ مال حلال ہی سے ہدیہ دے رہا

ہوں تو ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے۔قرآنِ مجید میں ویسے بھی ہمیں تجسس سے منع کیا گیا ہے،ارشادِ نبوی ہے:

"إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمْ عَلَى أَخِيهِ الْمُسْلِمِ فَأَطْعَمَهُ طَعَامًا، فَلْيَأْكُلْ مِنْ طَعَامِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ، وَإِنْ سَقَاهُ شَرَابًا مِنْ شَرَابِهِ، فَلْيَشْرَبْ مِنْ شَرَابِهِ وَلَا يَسْأَلْهُ عَنْهُ" (مسند أحمد،شعیب الأرناؤوط ۹۱۸۴)۔

حرام کمائی والے کے بچوں کے لئے دعاء کرنا؟

جواب:۱۲

حلال غذاء ولباس قبولیت دعاء کے؛ جبکہ غذاء ولباس میں حرمت کی آمیزش دعاؤں کے مسترد کردیئے جانے کے من جملہ اسباب میں سے ایک سبب ہے۔

اس کے علی الرغم حرام کمائی یا غذاء والے بندے کی دعاء کا مردود ہوجانا حتمی ویقینی نہیں ہے،دوسرے اعمال صالحہ کے طفیل یا فضل ربانی سے حرام کمائی والے کی دعاء بھی قبول ہوسکتی ہے،صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أَيُّها النَّاسُ، إنَّ اللَّهَ طَيِّبٌ لا يَقْبَلُ إلّا طَيِّبًا، وإنَّ اللَّهَ أمَرَ المُؤْمِنِينَ بما أمَرَ به المُرْسَلِينَ، فقالَ: يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ" (المؤمنون:۵۱)، وقالَ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (البقرة:۱۷۲)، ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أشْعَثَ أغْبَرَ، يَمُدُّ يَدَيْهِ إلى السَّماءِ، يا رَبِّ، يا رَبِّ، ومَطْعَمُهُ حَرامٌ، ومَشْرَبُهُ حَرامٌ، ومَلْبَسُهُ حَرامٌ، وغُذِيَ بالحَرامِ، فأنَّى يُسْتَجابُ لذلكَ؟ (صحیح مسلم:۱۰۱۵)۔

(بے شک اللہ تعالی پاک ہے اور پاکیزہ چیز ہی قبول کرتا ہے اور یقیناً اللہ اپنے مومن بندوں کو بھی اسی چیز کا حکم دیا ہے جس کا حکم اپنے رسولوں کو دیا ہے،چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا﴾ (اے پیغمبرو! حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو)(المؤمنون:۵۱) اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ﴾ (اے ایمان والو! کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں بطور رزق دیا ہے)(البقرۃ:۱۷۲)،پھر آپ ﷺ نے ایک آدمی کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، لمبے سفر کی وجہ سے اس کے بال پراگندہ اور غبار آلودہ ہوتے ہیں، وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے میرے رب! اے میرے رب! (دعا قبول فرمالے) جب کہ اس کا کھانا حرام،اس کا پینا حرام،اس کا پہناوا حرام اور اس کی پرورش بھی حرام مال کے ذریعہ ہوئی ہو تو بھلا اس کی دعا

کیسے قبول کی جائے؟)۔

حدیث مذکور میں "**فأنی یستجاب لذلک؟**" جیسی استفہامی واستعجابی تعبیر کا استعمال بتاتا ہے کہ آکلِ حرام کی ہر ہر دعاء کا مستر د ہوجانا یقینی ولازمی نہیں ہے، فضل الٰہی شامل نصیب ہو، دیگر اعمال صالحہ کی معاونت ہم رکاب ہو یا دعاؤں میں الحاح وزاری واستحضار کارفرما ہو تو آکلِ حرام کی دعاء بھی قبول ہوسکتی ہے، علامہ ابن دقیق العید اربعین نوویہ کی شرح میں رقم فرماتے ہیں:

"**یعنی من أین یستجاب لمن هذه صفته، فإنه لیس أهلاً للإجابة، لکن یجوز أن یستجیب الله تعالی له تفضلا و لطفاً و کرماً**" (شرح الأربعین النوویۃ لابن دقیق العید ص ۶۰)۔

دیگر اعمال صالحہ کی تاثیر سے معصیت وگناہ کے جراثیم میں یقیناً خفت آتی ہے، جس کے باعث آکل حرام کی دعاء بھی مقبول بارگاہ ہوسکتی ہے جب خود آکل حرام کی اپنی دعاء قبول ہوجانا ممکن ہے تو شخص غیر کا اس کے یا اس کے بچوں کے حق میں مواقع مسرت میں دعاء کرنا یقیناً مقبول بارگاہ ہوگا، علاوہ ازیں آکل حرام کی دعاء کی اجابت ومقبولیت کا رد ہونا (نہ کہ نفس دعاء کا ممنوع ہونا) حرام غذاء کی تاثیر کے باعث تھا، یہ وجہ آکل حرام میں تو موجود ہے؛ لیکن اس کے غیر میں موجود نہیں ہے، لہٰذا کوئی دوسرا بندہ اس کے لئے یا اس کے بچوں کے لئے دعاء کرائے تو اس میں کوئی محظور شرعی نہیں ہے، دعاء کرنا کرانا جائز ہوگا۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واکمل بالصواب

☆☆☆

مال حرام-مسائل واحکام

مفتی محمد مغفور باندوی☆

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله ﷺ و على آله و صحبه أجمعين، أمابعد:

مال انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے، جس پر انسانی زندگی کا بڑا انحصار ہے، انسان اپنی اکثر دنیاوی ضرورتیں مال کے ذریعہ پوری کرتا ہے، اس کی اہمیت وافادیت کا کوئی منکر نہیں، اسلام کے ماسوا دیگر مذاہب کے ماننے والے مال کمانے اور خرچ کرنے میں مکمل آزاد ہوتے ہیں؛ ان کے یہاں کسی چیز کا کوئی پاس ولحاظ نہیں ہوتا؛ مگر اسلام اپنے تمام امتیازات کے ساتھ اس مسئلہ میں بھی خصوصی امتیازی شان رکھتا ہے، چنانچہ وہ اپنے ماننے والوں کو مال کے حصول میں حلال کا پابند بناتا ہے اور خرچ میں بھی حلال کا پابند کرتا ہے، ارشاد نبی ﷺ ہے: "**نعم المال الصالح للرجل الصالح**" (نیک آدمی کیلئے پاکیزہ مال کیا ہی عمدہ ہے) اور دین اسلام کے ماننے والے ہمیشہ سے حلال کمانے اور حرام سے بچنے کی فکر میں رہتے ہیں، یہ اس کے ماننے والوں کیلئے-اس مادی دور میں-طرہ امتیاز ہے اور یہ محض فضل الٰہی ہے۔

مال حرام اور مال حرام:

مال: وہ تمام اشیاء جو انسان کی ملکیت ہوتی ہیں؛ مال کہلاتی ہیں:

"**المال: ما ملكتَه من جميع الأشياء**" (لسان العرب ۴۳۰۰)۔

جس کی طرف انسانی طبائع کا میلان ہوتا ہو اور ضرورت کیلئے اس کی ذخیرہ اندوزی کی جاسکتی ہو وہ مال ہے۔

اصلطاحاً: "ما يميل إليه الطبع و يمكن إدخاره لوقت الحاجة"۔

حرام کی لغوی تعریف:

حرام حلال کی ضد ہے، یا شئ ممنوعہ کو حرام کہتے ہیں۔

☆ استاذ فقہ وحدیث جامعۃ المومنات باندہ، یوپی

"الحرام ضد الحلال قال الراغب: الحرام: الممنوع منه" (قواعد الفقہ ۲۶۲)۔

حرام اور مال حرام کی اصطلاحی تعریف:

الحرام: هو الأمر الذی نهی الشارع عنه نهیاً جارماً (الحلال والحرام فی الإسلام للغزالی ۵۵۸)۔

المال الحرام: ماطلب الشارع کف عنه طلباً جارماً (منہاج الأصول إلی علم الأصول ۱/۵۸، ط دار الکتب العلمیۃ بیروت)۔

ان دونوں عبارتوں کا ماحصل ایک ہے۔

مال حرام کی قسمیں:

حرام مال کی دو قسمیں ہیں اور دونوں کے احکامات مختلف ہیں، لہٰذا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو قسموں کا تذکرہ مع احکامات تحریر کیا جائے تو پوری وضاحت کے سات سوالات کے جوابات سامنے آسکیں گے۔

مال حرام کی قسمیں:

مال حرام کی دو قسمیں کی گئی ہیں: (۱) حرام لذاتہ (۲) حرام لغیرہ

حرام لذاتہ:

وہ مال جس میں حرمت اس مال کا ذاتی جزء ہو اور کسی بھی صورت میں اس کو اس مال سے الگ نہ کیا جا سکتا ہو۔

"**والحرام المحض: هو ما فیه صفة محرمة لایشک فیها کالشدة المطربة فی الخمر والنجاسة فی البول**" (الحلال والحرام فی الإسلام ۲۸)۔

حرام لغیرہ:

وہ مال جو بذات خود تو حلال ہو مگر جس طریقہ سے اس مال کو کمایا گیا ہو وہ طریقہ (کمائی) حرام ہو؛ جیسے غصباً کسی کا مال لے لینا یا سود کے ذریعہ مال کمانا وغیرہ؛ ان دونوں صورتوں میں حرمت خارجی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس مال کو "مال حرام لغیرہ" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔

"**أو حصل بسبب منهی عنه قطعاً کالمحصل بالظلم والرباء ونظائره**" (الحلال والحرام فی الإسلام ۲۸)۔

ان دونوں کے احکامات اصل سوال کے ذیل میں ان شاء اللہ تفصیل سے آئیں گے۔

دارالحرب میں سود کا حکم:

جس دور میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اس دور میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا، ساتھ ہی یہاں غیر مسلموں کے ساتھ سودی کاروبار کے جواز کا فتوی دیا گیا اور اسی پس منظر میں یہ سوال نامہ مرتب کیا گیا، چنانچہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ دارالحرب میں ''سودی کاروبار'' کا کیا حکم ہے، ذکر کیا جائے؛ تاکہ اصل سوالات میں حکم بیان کرنے میں آسانی ہو۔

حکم:

دارالحرب میں غیر مسلموں کے ساتھ سودی کاروبار کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ اسکے متعلق کتب فقہ میں دو آراء مذکور ہیں: ایک رائے تو مطلقاً عدم جواز کی ہے جبکہ دوسری رائے چند شرطوں کے ساتھ جواز کی ہے۔

عدم جواز:

جن حضرات نے دارالحرب میں سودی کاروبار کو مطلقاً ناجائز کہا ہے ان کے نزدیک سودی کاروبار دارالاسلام اور دارالحرب دونوں میں حرام ہے؛ چاہے مسلمان کے ساتھ کیا جائے یا غیر مسلم کے ساتھ، یہ رائے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو یوسف اور جمہور فقہاء کی ہے۔

''**جمهور الفقهاء على أن دار الإسلام ودار الحرب سواءٌ فی حرمة الرباء ولا يجوز لمسلم أن يرابى كافراً حربياً كما لايجوز له أن يرابى مسلماً وهو قول مالک والشافعی وأحمدؤأبی يوسف وجماهير فقهاء الأمة**'' (فقہ البیوع للشیخ تقی العثمانی، ۲/۷۷۰)۔

جواز:

دارالحرب میں غیر مسلموں کے ساتھ سودی کاروبار کے ''جواز'' کی نسبت امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی طرف کی جاتی ہے، جبکہ امام صاحبؒ اور امام محمدؒ نے دارالحرب میں غیر مسلموں کے ساتھ سودی کاروبار کی اجازت مطلق نہیں دی ہے؛ بلکہ یہ اجازت شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

شرائط:

(۱) مسلمان دارالاسلام کا رہنے والا ہو اور امن لے کر دارالحرب گیا ہو۔

(۲) کسی نے دارالحرب میں اسلام قبول کیا اور دارالحرب سے ہجرت نہیں کی۔

ان دونوں صورتوں میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک غیر مسلم سے سودی کاروبار کی اجازت ہے اور اگر یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں، بلکہ وہ اصلی مسلمان ہے اور دارالحرب میں داخلہ سے پہلے بھی مسلمان تھا اور امن لے کر داخل نہیں ہوا ہے یا وہ دارالحرب میں اسلام قبول کرتا ہے پھر ہجرت کر کے دارالاسلام آجاتا ہے اور پھر دارالحرب جاتا ہے تو ان دونوں صورتوں میں اس کیلئے غیر مسلم کے ساتھ سودی کاروبار کی اجازت نہیں ہے۔

"و قال أبوحنيفة ومحمد رحمهما الله لا ربا بين المسلم والحربى فإن دخل مسلم دار الحرب يجوز له أن يعقد الربا مع حربى وذالک لأن أموال أهل الحرب مباح لمسلم برضاهم مالم يكن فيه عذرٌ وقد استدل على قولهم بما أخرجه البيهقى عن مكحول مرسلاً: "أن رسول الله ﷺ قال: لا ربابين أهل الحرب: و أظنه قال: و أهل الإسلام "لكن هذا الجواب عندهما مشروط بأن يكون المسلم من دار الإسلام ودخل دارهم بأمان أو مسلم أسلم فى دار الحرب ولم يهاجر فيجوز له أخذ الربا من كافر أو من مسلم أسلم فى دارالحرب ولم يهاجر إلى دار الإسلام، أما المسلم الأصلى الذى كان مسلماً قبل أن يأتى إلى دار الحرب أو مَن أسلم هناک ثم هاجر إلينا ثم أعاد إليهم فإنه لايجوز لمسلم أن يأخذ الربا منه" (فقہ البیوع للشیخ تقی العثمانی ۲/:۷۷۰)۔

تجزیہ:

جس وقت انگریزوں نے اس ملک پر قبضہ کیا اس وقت اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت تھی، اس اعتبار سے یہ دارالاسلام تھا، یہاں رہنے والے وہ تمام لوگ دارالحرب کے فتوی سے پہلے بحالت اسلام رہتے آرہے تھے، کسی نے انگریزوں کے استعمار کے بعد اس ملک سے ہجرت بھی نہیں کی، لہٰذا امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ نے جواز کی جو شرطیں ذکر کیں ہیں وہ ہندوستانی مسلمانوں پر منطبق نہیں ہوتیں، لہٰذا اس دور میں جن لوگوں نے غیر مسلموں کے ساتھ سودی کاروبار کیا اور اس سے جو مال حاصل ہوا وہ سود کے زمرہ میں آئے گا اور آزادی سے قبل اور بعد دونوں حالتوں میں وہ مال حرام ہوگا۔

"وقد وقع اليوم شبه الاتفاق بين العلماء الحنفية على الافتاء بمذهب أبى يوسف والجمهور على أنه يحرم الرباء فى كل حال" (فقہ البیوع ۱/۷۷)۔

وراثت میں ملنے والے مال حرام کا حکم:

جس شخص کو وراثت میں مال حرام ملا ہے کیا وہ ملکیت کی تبدیلی کی وجہ سے حلال ہوگا یا حسب سابق اس پر مال حرام کا ہی حکم لے گا؟

قواعد فقہ کا ایک قاعدہ ہے: "**الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم**" جس کا حاصل یہ ہے کہ مال میں حرمت متعدی ہوتی ہے اور ملکیت کی تبدیلی مال حرام کو حلال نہیں کرسکتی، چنانچہ صاحب موسوعۃ القواعد الفقہیہ اس قاعدہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"**الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم معنى هذه القاعدة ومدلولها: أنَّ اكتساب المال من حرام لاتقف حرمته عند مكتسبه بل لكل متعامل معه إذا علم أن هذا المال حرام**" (موسوعۃ القواعد الفقہیۃ ۵/ ۱۱۵، ط دار الرسالۃ العلمیۃ)۔

امام غزالی فرماتے ہیں: "**وكيف يكون موت الرجل مبيحاً للحرام المتيقن المختلط ومن أين يوخذ هذا**" (إحیاء علوم الدین ۲/ ۱۳۰) جبکہ علامہ شامیؒ نے منیۃ المفتی کے حوالہ سے نقل کیا ہے:

"**و فى منية المفتى مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من لايحل ولكن لايعلم الطالب ليرد عليه حل له الإرث فالأفضل أن يتورع ويتصدق بنية حضماء أبيه**" (ردالمحتار علی ھامش الدر المختار ۷/ ۱۳۰، زکریا)۔

(منیۃ المفتی میں ہے کہ اگر کسی کے باپ کا انتقال ہوجائے اور وہ جانتا ہے کہ اس کے باپ نے مال، حرام طریقہ سے کمایا ہے، لیکن وہ آدمی کو نہیں جانتا جس سے مال حرام کمایا ہے تو وارث کیلئے وہ مال جائز ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ اپنے والد کو آخرت کی جواب دہی سے بچانے کیلئے صدقہ کردے)۔

علامہ شامیؒ کی اس عبارت سے اصل مالک کے نامعلوم ہونے کی صورت میں اجازت معلوم ہوتی ہے، لیکن امام حصکفیؒ نے اس عبارت کا رد کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"**قال الإمام الحصكفى: لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقاً على الورثة فتنبه**" (ردالمحتار علی ھامش الدر المختار ۷/ ۳۰۱)۔

موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"**وصرح الحنفية بأنه إذا مات الرجل وكسبه خبيث كأن كان من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ**

الرشوة فالأولى أن يرد المال إلى صاحبه تصدقوا به لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۷/۲۴۶)۔

رائے:

(۱) راقم الحروف کے نزدیک ہندوستان میں (آزادی سے پہلے اور بعد میں) سودی کاروبار کے ذریعہ کمایا گیا مال حرام ہے۔

(۲) مال وراثت میں ملنے والا مال حرام وارث کیلئے بھی حرام ہے۔

(۳) ورثاء کی ذمہ داری ہے کہ اصل مالک تک اس مال کو پہنچائے اور اگر واپسی ممکن نہ ہو تو اس مال کو صدقہ کردیں اور غریب ہے تو بقدر ضرورت استعمال کرسکتا ہے۔

حرام سرمایہ کا حکم:

بحث کے شروع میں حرام مال کی دو قسموں کا بیان ہے (۱) حرام لذاتہ (۲) حرام لغیرہٖ۔

حرام لذاتہ کا حکم:

حرام لذاتہ کے تعلق سے اللہ رب العزت کا فرمانا ہے: **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَ الدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِيْرِ مَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ** (المائدۃ)۔

حضرت ابوطلحہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ میری پرورش میں چند یتیم ہیں جن کیلئے میں نے شراب خریدی تھی، آپ ﷺ نے فرمایا شراب کو بہادو اور مٹکے کو توڑ دو۔

"**عن أبي طلحة أنه قال: يا نبي الله ! إنِّي اشتريت خمراً لأيتامٍ في حجري قال أهرق الخمر وأكسر الدنان**" (سنن ترمذی ۲/۵۵۶، رقم ۱۲۹۳، کتاب البیوع باب بیع الخمر والنھی عن ذالک)۔

اس آیت اور ترمذی کی اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حرام مال (لذاتہ) مسلمان کے حق میں مال نہیں اور کسی بھی صورت میں اس مال سے استفادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

مال حرام لغیرہ کا حکم:

مال حرام لغیرہٖ کی مختلف شکلیں ہیں: (۱) کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا، (۲) چوری کے ذریعہ حاصل شدہ

مال، (۳) غصب کے ذریعہ حاصل شدہ مال، (۴) سود کے ذریعہ کمایا ہوا مال، (۵) وراثت میں ملنے والا مال (جس کا حکم سابق میں گذر چکا ہے، (۶) حرام کام کے معاوضہ میں حاصل شدہ مال وغیرہ۔

مال حرام لغیرہ کے تعلق سے تمام فقہی کتابیں اور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ مال حرام یا تو اس کے اصل مالک کو لوٹا دیا جائے اور یا تو صدقہ کر دیا جائے یا مصالح عامہ میں صرف کر دیا جائے، ذیل میں فقہاء کی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں۔

''إذا كان المال الذى فى يد المسلم حراماً فإنه لايجوز له إمساكه ويجب عليه التخلص منه''

(الموسوعۃ الفقھیۃ ۳۶/ ۳۹۲)۔

(جبکہ مسلمان کے قبضہ میں مال حرام ہو تو مسلمان کیلئے اسے روکنا جائز نہیں ہے اور اس مال سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے)۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

(۱)''**حدثنا أبو بكر قال حدثنا عبد الأعلى عن معمر عن الزهرى عن رجل يصيب المال الحرام قال إنْ سرّه أن يتبرأ منه فليخرج منه**'' (المصنف أبی شیبہ ۴/ ۵۶۰)۔

(امام زہریؒ سے ایک آدمی کے بارے میں نقل کیا گیا جس کے پاس مال حرام تھا انہوں نے فرمایا: اگر اسے بری الذمہ ہونا پسند ہے تو اسے اپنے پاس سے الگ کر دے)۔

(۲)''**عن مالك ابن دينار قال: قال: رجل لعطاء ابن أبى رباح رجل أصاب مالاً من حرام قال: ليرده على أهله فإن لمْ يعرف أهله فليتصدق ولا أدرى ينجيه ذلك من إثمه**'' (المصنف أبی شیبہ ۴/ ۵۶۰)۔

(مالک بن دینار سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عطاء ابن ابی رباح سے سوال کیا کہ ایک آدمی ہے جس کے پاس مال حرام ہے (وہ کیا کرے؟) انہوں نے فرمایا: اسے چاہئے کہ وہ مال صاحب مال کو واپس کر دے اور اگر جس کا مال ہے اسے نہیں پہچانتا تو صدقہ کر دے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ ایسا کرنے کے بعد بھی وہ گناہ سے بری ہوگا یا نہیں)۔

ان تمام عبارات (اور اس کے علاوہ دیگر عبارات) سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مال حرام کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس مال کا مصرف واپسی اور صدقہ ہے۔

البتہ بعض حضرات نے فقیر ہونے کی صورت میں بقدر ضرورت استعمال کی اجازت دی ہے اور ضرورت سے زائد کو صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رقم طراز ہیں:

''کمایا ہوا مال (خواہ عین یا نفع) فی نفسہ مباح ہو مگر حرام کا سبب ہو، جیسے ایسے شخص کو انگور فروخت کرنا جو اس انگور کی شراب بنائے یا شراب بنانے کیلئے انگور کشید نے کی اجرت یا شراب بار برداری کی اجرت وغیرہ ان تمام صورتوں میں جو عوض (مال) حاصل ہوا ہے اس کا استعمال اچھا نہیں ہے اور اگر عوض (خواہ عین ہو یا نفع) فی نفسہ حرام ہے؛ جیسے فاحشہ کی کمائی یا شراب فروخت کرنے والے کا مال تو یہ مال حلال نہیں ہے اور اس مال کو عام مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کیا جائے گا، البتہ حرام کاروبار کرنے والے اور اس کے نتیجہ میں حرام کمانے والے غریب ہوں تو وہ ضرورت کے بقدر اپنی ضرورتوں میں مال خرچ کر سکتے ہیں'' (مجموعۃ فتاوی شیخ الإسلام ابن تیمیۃ ۲۹/۳۰۸-۳۰۹)۔

خلاصہ:

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس فتویٰ میں حرام لغیرہ کی تمام قسموں کے ذریعہ کمائے ہوئے مال کو بقدر ضرورت استعمال کی اجازت دی ہے۔

امام غزالیؒ الحلال والحرام فی الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں:

''**إنّ لـه أن يتـصدق على نفسه وعياله إذا كان فقيراً أما عياله وأهله فلايخفى لأن الفقر لاتنفى عنهم من عياله وأهله بل هم أولى من يتصدق عليهم**'' (الحلال والحرام فی الإسلام ۱۱۱)۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فقیر کی صورت میں اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اہل وعیال پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اور دلیل کے طور فرماتے ہیں کہ صدقہ کرنا یہ اس مال کا حکم ہے اور ان سے بہتر صدقہ کے مستحق اور کوئی نہیں۔

رائے:

صورت مسئولہ میں راقم الحروف کی رائے درج ذیل ہے:

(۱) مال حرام کا مصرف صاحب مال کو مال واپس کرنا اور اگر وہ زندہ نہ ہو تو اس مال کو ورثاء کے حوالہ کرنا۔

(۲) صاحب مال اگر معلوم نہ ہو تو اس مال کو صدقہ کرنا۔

(۳) وہ شخص جس کے پاس مال حرام کے علاوہ کوئی دوسرا مال (حلال) موجود نہیں ہے اور صدقہ کرنے کی صورت میں وہ فقیر اور محتاج ہو جائے گا تو ایسی صورت میں وہ اس مال حرام سے بقدر ضرورت استعمال کرے، ساتھ ہی مال حلال کے حصول کیلئے کوشاں رہے اور جب اس کے پاس ضرورت کے بقدر مال حلال آجائے تو مابقیہ مال حرام کو صدقہ کر دے۔

(۴) حرام کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد کے کرایہ سے بقدر ضرورت استفادہ کرے اور مابقیہ کو صدقہ کردے۔

بیوی جو اپنی تمام ضروریات میں اپنے شوہر کی کمائی پر منحصر ہوتی ہے اور اکثر اس کی اپنی ذاتی کوئی کمائی اور اثاثہ نہیں ہوتا، شوہر اگر حرام مال کماتا ہے تو بیوی کو ملنے والا نفقہ اور اس کی پوری ہونے والی تمام ضرورتیں اسی مال حرام سے ہی پوری ہوتی ہے، اب اگر یہ کہا جائے کہ بیوی اپنے شوہر کے حرام مال سے اجتناب کرے تو ایسی صورت میں بیوی ناقابل بیان مشکلات کا شکار ہوجائے گی، اسی وجہ سے فقہاء نے اسے اس مال حرام کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔

چنانچہ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وفی الخانیة: امرة زوجها فی أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلک الطعام غصباً فهی فی سعة من أكله وكذا لو اشترى طعاماً أو كسوة من مال أصله ليس يطيب فهی فی سعة من تناوله والإثم على الزوج" (ردالمحتار علی ھامش الدرالمختار ۷/ ۳۰۲)۔

امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں فقیر کو اپنے مال حرام کے استعمال کی جو گنجائش ذکر کی ہے اس میں انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ اپنے اہل وعیال پر بھی مال حرام خرچ کرنے کی اجازت دی ہے، تو جب مال حرام کمانے والے کو اپنے اہل وعیال پر مخصوص حالتوں میں اجازت ہے تو بیوی کو بھی اجازت ہوگی کہ اپنے شوہر کے مال حرام سے اپنا نفقہ اور حوائج ضروریہ اس سے پوری کرے۔

"نقول: إنَّ له أن يتصدق على نفسه وعياله إذا كان فقيراً و أما عياله وأهله فلايخفى لأن الفقر لاينتفی عنهم بكونهم من عياله وأهله بل هم أولى من يتصدق عليهم، وأما هو فله أن يأخذ منه قدر حاجته لأنه أيضاً فقيرا" (إحیاء علوم الدین ۲/ ۱۳۱)۔

مال حرام سے بچوں کی تعلیم کا خرچ:

امام غزالی علیہ الرحمۃ نے ان اشیاء کی وضاحت کی ہے جن اشیاء سے مال حرام کمانے والا (فقیر ہونے کی صورت میں) خرچ کرسکتا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"كأجرة الحجام والصباغ والقصار والحمال واطلاع النورة والدهن وعمارة المنزل وتعهد الدابة وتسجير التنور وثمن الحطب و دهن السراج فليلخص بالحلال قوته ولباسه فإن كان مايتعلق ببدنه ولابه عنه هو أن يكون طيباً وإذا دار الأمربين القوت واللباس فيحتمل أن يقال أن يختص القوت بالحلال لأنه ممتزج بلحمه ودمه وكل لحلم نبت من حرام فالنار أولى به" (الحلال والحرام ص ۱۱۴)۔

خلاصہ:

الحلال والحرام فی الاسلام کی اس عبارت سے ضروریات زندگی کے متعلق ان تمام اشیاء میں مال حرام کے استعمال (فقیر ہونے کی صورت میں) اجازت مذکور ہے جو انسانی زندگی کا حصہ ہیں اور تعلیم بھی انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے، لہٰذا جس طرح دیگر ضروریات زندگی میں استعمال کی اجازت ہے حصول تعلیم پر آنے والے اخراجات پر بھی اس مال کے استعمال کی اجازت ہوگی۔

رائے:

(۱) بیوی کے منع کرنے کے باوجود شوہر یا بیٹا حرام کمائی سے باز نہیں آرہا ہے اور ماں، یا بیوی کے پاس ان کے مال کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے تو اس ماں یا بیوی کیلئے اس مال حرام سے بقدر ضرورت استعمال کی اجازت ہوگی اور گناہ شوہر یا بیٹے پر ہوگا۔

(۲) شوہر غریب ہے اور اس کے پاس حرام مال کے علاوہ کوئی مال نہیں ہے، اس نے اسی حرام مال سے بچوں کی تعلیم مکمل کرائی اور حصول تعلیم کے بعد اس کے بچے جائز اور حلال کمائی سے منسلک ہوگئے تو ان کی حاصل شدہ کمائی حلال ہوگی اور اس کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہوگی۔

البتہ افضل یہ ہے کہ جو پیسہ ان بچوں کی تعلیم پر خرچ ہوا ہے جب یہ بچے حلال کمانے لگے تو اتنی رقم (جو تعلیم پر خرچ ہوئی ہے) صدقہ کردیں۔

(۳) اور اگر شوہر مالدار تھا اور حرام مال کے علاوہ اسکے پاس حلال مال بھی تھا جو وہ اس بچے کی تعلیم پر خرچ کرسکتا تھا مگر اس نے حلال مال خرچ نہ کرکے حرام کمائی ان کی تعلیم پر صرف کی، تو ان بچوں کی آمدنی حلال ہوگی اور حرام مال خرچ کرنے کا گناہ باپ پر ہوگا۔

مال مشتبہ، مال مخلوط، مال مجہول:

مال مشتبہ: وہ مال جس کے حلال یا حرام ہونے کی کوئی جہت واضح نہ ہو۔

مال مخلوط: وہ مال جس میں حلال وحرام دونوں طرح کا مال شامل ہو خواہ مال حرام زیادہ یا مال حلال۔

مال مجہول: جس کے بارے میں پتہ ہی نہ ہو کہ یہ مال کیسا ہے؟

مادیت کے اس دور میں ہر شخص زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی تگ ودو میں ہے، حلال وحرام کا فرق مٹتا جارہا ہے، اکثر مال میں حرام کی آمیزش ہوتی ہے، اس دور میں تقویٰ کا تقاضا تو یہی ہے کہ عمومی دعوتوں سے اجتناب کیا جائے اور جب تک یقین کامل نہ ہو کہ اس شخص کا کاروبار بالکل حلال ہے دعوت میں شرکت نہ کی جائے۔

فتویٰ:

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں فرماتے ہیں (۲/۱۳۰): فقہاء مال مخلوط میں اکثر کا اعتبار کرتے ہیں، لہٰذا اگر حرام غالب ہے تو دعوت میں شرکت حرام اور اگر حلال غالب ہے تو دعوت میں شرکت جائز۔

حکم:

دعوت میں استعمال ہونے والا مال مشتبہ ہو یا مخلوط ہو یا مجہول بہر صورت دعوت میں شرکت کی اجازت ہوگی، مخلوط میں خواہ غلبہ حلال کا ہو یا حرام کا، اس لئے کہ یہ معلوم کرنا کہ ہم جس دعوت میں مدعو ہیں اس میں کس قسم کا مال استعمال کیا گیا ہے عمومی حالات میں انتہائی مشکل ہے، محض اس گمان سے کہ بستی والے حرام کاروبار کرتے ہیں دعوت میں شرکت کے حرام ہونے کا حکم لگا دیا جائے درست نہیں ہوگا، جبکہ آثار صحابہ سے اس قسم کی دعوتوں میں شرکت کی اجازت منقول ہے۔

دلائل:

(۱) "**عن ابن مسعود قال: جاء رجل فقال: إنّ لی جاراً یأکل الرباء وأنه لایزال یدعونی فقال: مهناه لک وإثمه علیه**" (المصنف لعبدالرزاق ۸/۱۱۷، رقم:۱۴۸۵)۔

(۲) "**عن سلمان الفارسی قال: إذا کان لک صدیق عامل أو جار عامل أو ذوقرابة عامل فأهدی لک هدیة أو دعاک إلی طعام قابله فإن مهناه لک وإثمه علیه**" (المصنف ۸/۱۱۷، رقم ۱۴۷۵۷)۔

اپنی رائے:

(۱) مال مخلوط، مال مجہول اور مال مشتبہ کی دعوت میں شرکت کرنے سے بچنا اولیٰ ہے۔

(۲) جب تک کسی مال کے مکمل حرام ہونے کا قطعی یقین نہ ہو اس وقت تک دعوت میں شرکت کرنا جائز ہے؛ خواہ مال مخلوط ہو یا مشتبہ یا مجہول۔

حرام مال کی دعوت کھانے کے بعد اس کی تلافی:

(۱) مال حرام کی دعوت کے بارے میں اگر پہلے سے معلوم ہے کہ یہ دعوت یقینی طور پر مال حرام سے کی جارہی ہے تو ایسی صورت میں شرکت کرنا ناجائز ہے۔

(۲) اگر دعوت کے دوران یہ بات علم میں آئی کہ یہ دعوت کا کھانا مال حرام کا ہے تو حتی الامکان کم سے کم کھائے اور اگر ممکن ہو تو بغیر کھائے ہوئے واپس آجائے، چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ احیاء علوم الدین میں فرماتے ہیں کہ اگر والدین کے پاس مال حرام ہو تو اس کھانے سے اجتناب کرے اور وہ ناراض ہوجائے یا ان کے ناراض ہونے کا خطرہ ہو تو کم سے کم کھائے۔

"إذا كان الحرام أو الشبه فی يد أبويه فليمتنع عن مواكلهما...فإن لم يقدر فليوافق وليقل اللقمة" (إحیاء علوم الدین/ ۱۳۲)۔

(۳) اور اگر دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کھانا حرام مال سے تیار کیا گیا تھا تو ایسی صورت میں اس کی تلافی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے یہ سوال کیا کہ میرا ایک پڑوسی ہے جو سود کھاتا ہے اور وہ برابر میری دعوت کرتا ہے تو آپؓ نے فرمایا کہ کھانے کا مزہ تمہیں ملے گا اور گناہ اس پر ہوگا۔

"عن ابن مسعود قال: جاء رجل فقال: إن لی جاراً يأكل الرباء وأنه لايزال يدعونی فقال: مهناه لک وإثمه عليه" (المصنف لعبدالرزاق/ ۸/ ۱۱۷)۔

مال حرام کو حلال کرنے کا حیلہ:

مال حرام کا مصرف صدقہ کرنا ہے، لیکن صدقہ کرنے کی صورت میں وہ بالکل غریب اور مفلس ہوجائے گا اور ذریعہ معاش کا کوئی دوسرا راستہ اس کے پاس نہیں ہے، اب وہ چاہتا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ ہو جو اس کے اس مال کو حلال کردے اور مال حرام سے بھی اس کو نجات مل جائے تو اس کی ایک صورت جسے امام ابو یوسف علیہ الرحمۃ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کی طرف بھی اس کی نسبت ہے:

"والحيلة فی هذه المسألة أن يشتری نسئة ثم ينقد ثمه من أی مال شاء، قال أبويوسف: سألت أبا حنيفة عن الحيلة فی مثل هذا فأجابنی بما ذكرنا كذا فی الخلاصة" (ھندیۃ/ ۵/ ۳۴۲، باب عشرفی

الھدایاوالضیافات)۔

(اس مسئلہ میں حیلہ یہ ہے کہ وہ کوئی سامان ادھار خریدے اور پھر اس کی ادائیگی کسی بھی مال (خواہ مال حرام) سے کردے، امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے اسی قسم کا سوال کیا تو ان کا بھی وہی جواب تھا جو ہم نے ذکر کیا)۔

علامہ شامی نے اس کی پانچ صورتیں ذکر کی ہیں:

(۱) بائع کو حرام رقم پہلے سے پیش کردی جائے پھر اس کے ذریعہ کوئی چیز خریدی جائے۔

(۲) مال حرام کا مالک حرام مال کی طرف اشارہ کردے اور کوئی چیز خرید لے پھر مال حرام (مشارالیہ) بائع کے سپرد کردے۔

(۳) دوسری صورت کی طرح مال حرام کو بطور ثمن کے بذریعہ اشارہ متعین کردے اور سامان خرید لے مگر ادائیگی دوسری رقم سے کرے۔

(۴) عقد کے وقت بطور ثمن کے جو مال دینا ہے وہ متعین نہ کرے مطلق سامان خریدے اور ادائیگی مال حرام سے کرے۔

(۵) خریداری کسی دوسرے حلال مال سے کرے اور ادائیگی مال حرام سے کرے۔

"(اکتسب مالاحراماً) توضیح المسألة مافی التاتارخانیة حیث قال رجل: اکتسبت مالاً من حرام ثم اشتری فهذه علی خمسة أوجهٍ، أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولاً ثم اشتری منه بها، أو اشتری مطلقاً ودفع تلک الدراهم أو اشتری بدراهم أخری ودفع تلک الدراهم" (ردالمحتار علی ھامش الدرالمختار ۷/۴۹۰)۔

ان پانچ صورتوں میں تین قول ہیں:

(۱) ابونصر رحمہ اللہ کے نزدیک صرف پہلی صورت میں حیلہ درست نہیں ہے اور صدقہ کرنا واجب ہے، بقیہ چار صورتوں میں حیلہ درست ہے۔

(۲) فقیہ ابواللیث سمرقندی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، لیکن علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ قول ظاہر روایت کے خلاف ہے۔

(۳) علامہ کرخیؒ پہلی اور دوسری صورت میں حیلہ کو درست قرار نہیں دیتے، مابقیہ کے حیلہ کو درست قرار دیتے ہیں، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ فتویٰ علامہ کرخی کے قول پر ہے، تاکہ لوگ تنگی کا شکار نہ ہوں (ردالمحتار علی ھامش الدرالمختار ۷/۴۹۰)۔

اور ہندیہ میں ہے:

"وکل حیلة یحتال بها الرجل یتخلص بها عن حرام أو لیتوصل بها إلی حلال فهی حسنة،

والأصل فی جواز هذا النوع عن الحیل قول الله تعالیٰ "وَ خُذْ بِیَدِکَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهٖ وَ لَا تَحْنَثْ" (ھندیۃ باب جواز الحیل وعدم جوازھا ۶/ ۳۹۰)۔

سب سے آسان اور قابل عمل شکل حیلہ کی یہ ہے کہ کوئی سامان ادھار خریدے اور ادائیگی مال حرام سے کردے، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ کی رائے ہے، راقم الحروف کے نزدیک یہ سب سے آسان شکل ہے۔

اپنے مال حرام کو بطور قرض لینا:

اس سے قبل کی بحث میں مال حرام کو حلال کرنے کے طریقہ کے تعلق سے جو بحث گذری ہے اسی کو اختیار کرے کہ وہ جو بھی کاروبار کرنا چاہتا ہے اس کاروبار کے مال وغیرہ کی خریداری ادھار کرے اور پھر مال حرام سے اس کی ادائیگی کردے یا جو پانچ شکلیں علامہ شامیؒ نے ذکر کی ہیں اور ان میں سے جن آخر کی تین شکلوں کو مفتی بہ قرار دیا ہے اسی کو اختیار کرے۔

مخلوط کاروبار کرنے والے کی ملازمت:

فقہاء کے یہاں یہ ضابطہ مسلم ہے کہ عمل حلال کی اجرت حلال اور عمل حرام کی اجرت حرام ہے، جس آدمی کا کاروبار مخلوط ہے اور وہ حلال وحرام دونوں طرح کا کاروبار کرتا ہے تو جو جائز کاروبار ہے اس کی ملازمت اور اجرت حلال ہے اور جو کاروبار حرام ہے اس کی ملازمت حرام اور اجرت حرام ہے۔

"ولا یجوز الاستیجار علی الغناء والنوح وکذا سائر الملاحی لأنه استیجار علی المعصیة والمعصیة لا تستحق بالعقد" (ھدایۃ ۳/ ۲۸۷)، **أی من شرائط صحة الإجارة۔**

ومنها أن یکون مقدور الاستیفاء حقیقة أو شرعاً فلایجوز استیجار الآبق و لا الاستیجار علی المعاصی لأنه استیجار علی منفعة غیر مقدور الاستیفاء شرعاً" (ھندیۃ ۴/ ۴۴۱، ط الاتحاد)۔

حرام کمائی سے کمائی ہوئی جائیداد (کھیتی) کا حکم:

حرام کمائی سے بنائی ہوئی زمین کا حکم ارض مغصوبہ کا ہوگا اور ارض مغصوبہ کے تعلق سے علامہ شامیؒ نے حلوانی کا ایک قول نقل کیا ہے جو اقرب إلی الصواب ہے اور جسے مفتی بہ قول قرار دیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ غاصب ارض مغصوبہ پر کوئی تعمیر یا کھیتی وغیرہ کرتا ہے تو غاصب کو اس کی صرف کی ہوئی قیمت واپس کی جائے گی اور نفع مالک زمین کو ملے گا، چنانچہ مال حرام سے کمائی ہوئی جائیداد پر جو کھیتی ہوگی اس کی لاگت اس مال حرام کمانے والے کو ملے گی، بقیہ پیداوار صدقہ کردی

جائیگی یا اصل مالک کو (جس سے یہ حرام جائیداد کمائی ہے) دیدی جائیگی اگر وہ موجود ہو۔

"وقال الحلوانی: وهو الأقرب إلى الصواب وبه يفتى كما فى الكبرىٰ لأن العبرة لقيمة العين لا المنفعة ثم يأخذ الغاصب رأس ماله وهو البذر وما غرم فى النقصان وما أنفق على الزرع ويتصدق بالفضل عند الإمام ومحمد" (ردالمحتار علی هامش الدرالمختار باب کتاب الغصب ۶/ ۱۸۷، ط سعید کراچی)۔

اعلاء السنن میں ہے:

"عن رافع بن خديج أن النبى ﷺ قال من زرع أرض قوم بغير إذنهم فليس له من الزرع شيءٌ نفقته رواه الخمس إلا النسائى (إعلاء السنن ۱۶/ ۳۲۹)۔

خلاصہ:

(۱) حرام جائیداد کا مالک اگر فقیر ہے اور وہ جائیداد مکان کی شکل میں ہے جس کا ہر مہینہ کرایہ آتا ہے تو اس شخص کو بقدر ضرورت اس کرایہ سے استفادہ کرنا جائز ہے اور اس کا حکم اس شخص کا ہوگا جس کے پاس مال حرام ہے اور وہ فقیر ہے تو وہ اس مال حرام سے بقدر ضرورت خرچ کرنے کا مجاز ہوگا (حوالہ کیلئے سوال نمبر ۲ ملاحظہ ہو) اور اگر وہ جائیداد کھیت کی شکل میں ہے تو کھیتی کی پیداوار سے خرچ نکالنے کے بعد بقدر ضرورت اس پیداوار کو استعمال کرے گا اور مابقیہ صدقہ کردے گا۔

(۲) حرام جائیداد کا مالک اگر مالدار ہے یعنی حرام جائیداد کے علاوہ بھی اس کے پاس مال حلال موجود ہے تو اس حرام جائیداد سے استفادہ کا مجاز نہیں ہوگا، پیداوار کے اخراجات نکالنے کے بعد مابقیہ صدقہ کردے گا۔

حرام کاروبار کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا:

جو عمل حرام ہے اس کی اجرت بھی حرام ہے۔

"و على هذا يخرج الاستيجار على المعاصى أنه لا يصح" (بدائع الصنائع ۴/ ۳۹)۔

اور جو کام حلال ہے اس کی اجرت بھی حلال ہے، قطع نظر اس کے کہ مستاجر نے اجرت کی ادائیگی کس مال سے کی ہے۔

ایک مزدور نے کسی حلال اور جائز کام کرنے کیلئے نوکری کی اور اجارہ کی تمام شرطیں اس میں موجود ہیں، کوئی شرط فاسد نہیں تو اجارہ درست ہے اور اجیر اجرت کا مستحق ہوگا، نوکری پر رکھنے والا حرام مال سے ادائیگی کرتا ہے تو اس کا گناہ اسی پر ہوگا۔

"ولو استأجر ذمى مسلماً ليخدمه، ذكر فى الأصل أنه يجوز وأكره للمسلم خدمة الذمى"

(بدائع الصنائع ۴/ ۴۰)۔

(۱) اکثر اردو فتاویٰ میں اس مسئلہ کو اور عمل حرام پر اجرت کو ایک شمار کیا ہے جب کہ یہ بالکل درست نہیں ہے، اس لئے کہ عمل حرام کی صورت میں اجارہ کے ناجائز ہونے کی وجہ سے اس کی اجرت حرام ہونا ہے جس پر عقد اجارہ ہوا ہے اور اس مسئلہ میں عقد اجارہ عمل جائز پر ہے، اگر اجرت کی ادائیگی مال حرام سے ہو رہی ہے تو اس کا گناہ ادائیگی کرنے والے پر ہوگا نوکری کرنے والے پر نہیں ہوگا۔

(۲) اجارہ اور بیع ایک ہی طرح کے معاملات ہیں، منافع کی بیع کا نام اجارہ ہے اور اگر مشتری ثمن کی ادائیگی مال حرام سے کرتا ہے تو کیا بائع کو آپ گنہگار کہیں گے؟ اور کیا اس بیع پر فساد کا حکم لگائیں گے؟ فتدبر!!

"**لأن الإجارة بيع المنفعة**" (بدائع الصنائع ۴/ ۱۴)۔

رائے:

حرام کاروبار کرنے والے کے یہاں کسی جائز کام کی نوکری کرنا جائز ہے۔

حرام کاروبار کرنے والے کی بائیک پر بیٹھنا:

حرام کاروبار کرنے والے کی بائیک پر بیٹھنا، اس مسئلہ کو ہدیہ والے مسئلہ پر قیاس کیا جائے گا، چنانچہ فتاویٰ خانیہ میں ہے:

"**و إن كان غالب مال المهدى عن الحلال لابأس بأن يقبل الهدية**" (فتاوی خانیہ علی ھامش ھندیۃ کتاب الحظر والإباحۃ ۳/ ۴۰۰)۔

لہٰذا اگر وہ صاحب جن کی بائیک ہے ان کے پاس زیادہ مال حرام کا ہے تو اس کی بائیک میں بیٹھنا حرام ہے، چونکہ یہ بھی مال حرام سے انتفاع کی شکل ہے اور اگر بائیک والے کا زیادہ مال حلال ہے تو اس کی بائیک میں بیٹھنا حلال ہے۔

حرام کمائی کرنے والے کے بچوں کی تعلیمی فیس کا حکم:

حرام کمائی کرنے والے شخص کے بچوں کی تعلیمی فیس وصول کرنا جائز ہے اور اس فیس کا پیسہ حلال اور جائز ہے، حوالہ کیلئے حرام کمائی کرنے والے شخص کے یہاں نوکری کا حکم کے تعلق سے جو جواب گذرا ہے وہی یہاں پر بھی ہوگا، اس لئے کہ یہ دونوں مسئلے ایک ہی ہیں۔

مال حرام کو رشوت کے طور پر دینا:

مال حرام کے دو ہی مصرف ہیں: (۱) جس شخص سے وہ مال حرام طریقوں سے کمایا ہے اسی کو مال واپس کرنا، (۲) اس مال کو صدقہ کرنا:

"فالأولى أن يرد المال إلى أربابه أو تصدقوا به لأن كسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۴/۱۴۶)۔

اس کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا کہ مال حرام کو بطور رشوت دینا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ مال کا مالک ہی نہیں ہے۔

جواز کی یہ دلیل دینا کہ عمل حرام سے بچنے کیلئے مال حرام کا استعمال جائز ہے بالکل غلط ہے۔

مال مشتبہ یا مال حرام سے ہدیہ (یا کوئی معمولی چیز) قبول کرنا:

اس مسئلہ میں بھی اصول یہ ہے کہ اگر ہدیہ کرنے والے کا اکثر مال حرام ہے تو ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے اور اگر اکثر مال حلال ہے تو ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔

"وإن كان غالب مال المهدى من الحلال لابأس بأن يقبل الهدية ويأكل مالم يتبين عنه أنه حرام لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فيعتبر الغالب وإذا مات عامل من عمال السلطان و أوصى أن يعطى الحنطة قالوا إن كان ما أخذه من الناس مختلطاً بماله لابأس به وإن كان غير مختلط لايجوز للفقراء أن يأخذوا إذا علموا أنه مال الغير ...وإن لم يعلم الاٰخذ أنه من ماله أو من مال غيره فهو حلال حتى يتبين أنه حرام" (فتاوی خانیۃ علی الھندیۃ کتاب الحظر والإباحۃ ۳/۴۰۰-۴۰۱)۔

خانیہ کی جو عبارت نقل کی گئی ہے اس میں صراحت کے ساتھ یہ بات موجود ہے کہ جب تک حرام ہونے کا یقین نہ ہو تب تک ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، محض شبہ اور گمان کی وجہ سے ہدیہ قبول نہ کرنا درست نہیں ہوگا، لہٰذا راقم کے نزدیک مذکورہ صورت میں ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، گمان اور شبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں:

"القسم الثانی: أن يعرف الحل ويشک فی المحرم فالأصل الحل وله الحكم" (إحیاء علوم الدین ۲/۱۰۰)۔

حرام مال کمانے والے کیلئے دعا یا اس کے بچے کا نام رکھنا یا اس کے مولود بچے کے کان میں اذان دینا:

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت طفیل بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم ﷺ

کے پاس آئے اور عرض کیا کہ قبیلہ دوس ہلاک ہوگئے، انہوں نے نافرمانی کی اور انکار کیا، آپؐ ان پر بد دعاء کر دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اے اللہ آپ قبیلہ دوس کو ہدایت دیدیجئے اور انہیں لے آیئے۔

"**عن أبی هريرة جاء الطفيل بن عمرإلى النبی ﷺ فقال: إن دوساً قد هلكت عصت وأبت فادع الله عليهم فقال: اللهم اهد دوساً وآت بهم**" (صحیح بخاری، الرقم: ۴۳۹۲، کتاب المغازی باب قصۃ دوس)۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمیں ثقیف کے تیروں نے خوف زدہ کر دیا، آپ ﷺ ان کیلئے بد دعاء کر دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا اے اللہ ثقیف کو ہدایت دیدیجئے۔

"**عن جابر ابن عبد الله قالوا يا رسول الله ﷺ أخرقتنا نبال ثقيف فادع الله عليهم فقال: اللهم اهد ثقيفاً**" (سنن ترمذی، أبواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ باب فی ثقیف وبنی حنیفۃ ۳۹۴۲)۔

ان احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے کافر قوم کیلئے ہدایت کی دعاء کی ہے؛ باوجود کے وہ حالت کفر میں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کافر کیلئے دعا کرنا جائز ہے، لہٰذا جب کافر کیلئے دعاء کرنا جائز ہے تو گناہ کبیرہ کے مرتکب کیلئے بھی خیر کی دعاء کرنا جائز ہے، لہٰذا:

(۱) مال حرام کمانے والے کیلئے امر مباح کی دعا کرنا جائز ہے۔

(۲) اس کے بچے کا نام رکھنا یا اس کے کان میں اذان دینا جائز ہے۔

(۳) اس کیلئے پانی میں دم کرنا یا اس پر دم کرنا جائز ہے۔

☆☆☆

حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل

مولانا عبدالاحد قاسمی جہان آبادی☆

جواب:ا

موضوع سے متعلق سوال کو حل کرنے کے لیے پہلے چند باتوں کو سمجھ لینا چاہیے: (الف) کیا دارالحرب میں سود جائز ہے؟، (ب) کیا وارث کے لیے مورث کا حرام مال جائز ہے؟، (ج) حرام مال سے انتفاع کب جائز ہے؟

(الف) دارالحرب میں سود:

دارالحرب میں غیر مسلم سے سودی معاملہ کرنے کے بارے میں معتبر علماء کی دو رائیں ہیں، البتہ ہندوستان میں آزادی سے قبل سود لینے کے بارے میں جمہور علماء کا فتوی عدم جواز کا ہی ہے۔

بطور دلیل درج ذیل عبارتیں پیش ہیں، چنان چہ ابن نجیم مصریؒ فرماتے ہیں:

"قوله: (ولا بين الحربي والمسلم (ثمة أي لا ربا بينهما في دار الحرب عندهما خلافاً لأبي يوسف، وفي البناية: وكذا إذا باع خمراً أو خنزيراً أو ميتة أو قامرهم وأخذ المال كل ذلك يحل له، ولهما الحديث لا ربا بين المسلم والحربي في دار الحرب، ولأن مالهم مباح وبعقد الأمان منهم لم يصر معصوماً إلا أنه التزم أن لا يتعرض لهم بغدر ولا لما في أيديهم إلا برضاهم فإذا أخذ برضاهم أخذ مالاً مباحاً بلا غدر فيملكه بحكم الإباحة السابقة إلا أنه لا يخفى أنه إنها اقتضى حل مباشرة العقد إذا كان الزيادة ينالها المسلم والربا أعم من ذلك إذ يشمل ما إذا كان الدرهمان من جهة المسلم أو من جهة الكافر وجواب المسألة بالحل عام في الوجهين؛ كذا في فتح القدير۔ وحكم من أسلم في دار الحرب ولم يهاجر كالحرب عند أب حنيفة لأن ماله غير معصوم عنده فيجوز للمسلم الربا منه، وأما إذا هاجر

☆ ناظم تعلیمات جامعہ مدنیہ سبل پور، پٹنہ

إلينا ثم عاد إليهم لم يجز الربا معه لكونه أحرز ماله بدارنا فكان من أهل دار الإسلام، كذا في الجوهرة وفي المجتبى معزياً إلى الكفاية : مستأمن منا باشر مع رجل مسلماً كان أو ذمياً في دارهم أو من أسلم هناك شيئاً من العقود التي لا تجوز فيما بيننا كالربويات وبيع الميتة جاز عندهما خلافاً لأبي يوسف اهـ والله تعالى أعلم" (البحرالرائق:۶/۲۲۶،زکریا)۔

علامہ ابن نجیم مصری فرمارہے ہیں کہ طرفین کے برخلاف امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لینا جائز نہیں ہے،طرفین کی دلیل بیان کرنے کے بعد علامہ فرمارہے ہیں کہ ربا کی حرمت کے دلائل مطلق ہیں،لہٰذا طرفین کا مقید کرنا صحیح نہیں ہے،اور پھر انہوں نے فتح القدیر کا حوالہ دیا ہے،چنان چہ فتح القدیر کی عبارت درج ذیل ہے:

(قوله ولا بين المسلم والحربي في دار الحرب خلافا لأبي يوسف والشافعي) ومالك وأحمد، وعلى هذا الخلاف الربا بين المسلم الأصلي والمسلم الذي أسلم في دار الحرب ولم يهاجر إلينا ؛ فلو باع مسلم دخل إليهم مستأمنا درهما بدرهمين حل ، وكذا إذا باع منهم ميتة أو خنزيرا أو قامرهم وأخذ المال يحل ، كل ذلك عند أبي حنيفة ومحمد خلافا لأبي يوسف ومن ذكرنا (لهم) إطلاق النصوص فإنها لم تقيد المنع بمكان دون مكان ، والقياس على المستأمن منهم في دارنا ، فإن الربا يجري بين المسلم وبينه فكذا الداخل منا إليهم بأمان .ولأبي حنيفة ومحمد ما روى أنه صلى الله عليه وسلم قال: "لاربا بين المسلم والحربي في دار الحرب" (وهذا الحديث غريب، ونقل ما روى مكحول عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال ------- الخ" (فتح القدیر:۷/۳۷،ط مکۃ المکرمۃ)۔

شیخ ابن ہمام فرمارہے ہیں کہ امام ابو یوسف ہی نہیں؛ بلکہ امام شافعی امام مالک امام احمد رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے،اور انہوں نے طرفین کی طرف سے بطور دلیل پیش کی جانے والی مکحول کی روایت کی استدلالی حیثیت کو بھی خوب واضح کرتے ہوئے بتایا کہ یہ حدیث حرمت ربا کے بارے میں کتاب وسنت کی مطلق دلیلوں کو مقید کرنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح شیخ وھبہ الزحیلی دارالحرب ودارالاسلام میں سود کے مطلقاً عدم جواز کو بیان کرنے کے بعد دارالحرب میں سود کے جواز کے فتوے کا عوام کس طرح غلط استعمال کرتی ہے،اس کی بھی نشان دہی فرماتے ہیں:

"**ويحرم الربا في أي مكان من العالم في دار الإسلام ودار الحرب على السواء؛ لأن حرمة الربا عامة مطلقة، لا تخصيص فيها ولا تقييد .ولكن نقل عن أبي حنيفة ومحمد: أنه يجوز أخذ مال الحربي بأي طريق لا خيانة فيه ولا غدر، ولو بالعقود الفاسدة كالربا ؛ لأن ماله مباح مهدر كنفسه، أي**

غیر معصوم، بل هو مباح فی نفسه، وقد بذله الحربی عقود الربا باختیاره ورضاه، فزال المنع لزوال موجبه" (شرح السیر الکبیر ۳/ ۲۲۳، ۴/ ۱۸۸، المبسوط: ۱۰/ ۹۵)۔

وقد انزلق بعض المسلمین فأودعوا أموالهم فی دیار غیر المسلمین واستباحوا أخذ الفوائد عنها، عملاً بهذا الرأی فیما زعموا، وهو فهم خطأ، وعمل باطل غیر مشروع، وحرام؛ لأن الربا الذی قصد فی هذا الرأی هو ربا العقود لا ربا البنوک والفوائد، ولأن المال فی أصله مال الحربی، أما الأموال المودعة فهی أموال المسلمین، یتقوی بها غیر المسلمین فی تشغیل المصانع والمعامل، ولأن القول مخصوص بمال الحربی، والحربی: هو الذی بیننا وبین بلاده عداوة وحرب فعلیة أوحکمیة، ولا ینطبق هذا علی غیر الیهود وأمثالهم من غاصبی الأراضی الإسلامیة لوجود معاهدات سلمیة بیننا وبین مختلف الدول المنظمة لمیثاق الأمم المتحدة۔

وإیداع المسلمین أموالهم فی بلاد غیر المسلمین غیر جائز شرعاً، لأنهم یتقوون بتلک الأموال علینا ویعطوننا جزئاً من الفوائد، بل إن أکثر تلک الأموال أصبحت مجمدة لا یفرج عنها ولا ترد لأصحابها الأصلیین، مما یؤکد تحریم التعامل المصارف الأجنبیة إلا لضرورة قصوی أو لأجل الاستیراد والتصدیر۔

وعلی هذا تکون فوائد هذه الأموال حراماً لا یجوز لأصحابها تملکها وضمها لأموالهم، لکن لا یصح إبقاؤها لهم حتی لا یتقووا بها علینا، ونعین الظالم علی ظلمه، وإنما یجب أخذها وصرفها فی المصالح العامة فی البلاد الإسلامیة کتعبید الطرق وبناء المشافی والمدارس وغیر ذلک من المرافق العامة، کما أفتی بذلک لجنة الفتوی بالأزهر فی أواخر الستینات" (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵/ ۳۷۳۹-۳۷۴۰)۔

خصوصی طور پر ہندوستان کے پس منظر میں چند اردو فتاوی بھی ملاحظہ فرمائیں:

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ ربودر ہندوستان کے عنوان کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"بہرحال نفس مسئلہ میں جو کچھ میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے: **لایباح العقد لکونه ربوا نهی عنه نصا قطعیا، و یباح المال المأخوذ لأن مال الحربی مباح برضاه بلا غدر به، و لم أر أحدا من أصحاب الفتاوی حکم بحل العقد مقصودا، و الله تعالی أعلم و علمه أتم۔ ۱۶ شعبان ۱۳۲۲ھ** (امداد الفتاوی: ۳/ ۱۵۳)۔

ہندوستان میں کفار سے سود لینا کے عنوان سے فتاوی دارالعلوم دیوبند میں مذکور ہے:

''سود کے بارے میں بھی برابر یہاں سے فتوی عدم جواز کا لکھا جاتا ہے، کفار سے بھی سود لینے کی اجازت نہیں ہے اور ہمارے اکابر کا یہی مسلک رہا ہے، حضرت شیخ الہندؒ کا بھی ہر دو امر میں یہی عمل رہا ہے'' (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۳۴۶/۱۵-۳۴۷)۔

اور جب امارت شرعیہ بہار کے ایک فتوی میں حربی سے سود کے جواز کی بات کہی گئی تو حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے اس پر حاشیہ لگاتے ہوئے وضاحت فرمائی، فتوی اور اس پر حاشیہ ملاحظہ فرمائیں:

فتوی امارت شرعیہ بہار:

ہندوستان میں سود لینا یا دینا خواہ ہندو کے درمیان ہو یا مسلم کے درمیان درست ہے یا نہیں؟ ہندوستان میں سودی روپیہ دینا اور لینا خواہ ہندو یا مسلم سے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب وباللہ التوفیق اسلام میں سود کا لینا دینا دونوں قطعاً حرام ہیں، ہندوستان جیسے دارالحرب میں جہاں اسلامی حکومت نہیں ہے غیر مسلموں سے معاملات فاسدہ جائز ہیں، اس لئے ان سے جو رقم زائد لی جائے گی وہ بمنزلہ فئ ہے، اس کو سود نہیں کہہ سکتے، اگر چہ عرف عام میں سود کہتے ہیں، مگر غیر مسلموں کو کسی حال میں سود نہیں دینا چاہئے، جس طرح کسی مسلمان کو نہیں دینا چاہئے۔ ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ۔

حاشیہ:

واضح رہے کہ یہ جواب اس وقت کا ہے جب کہ ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل تسلط تھا، مسلمانوں کے لئے شعائر اسلام کی حفاظت مشکل تھی، جس کی بنیاد پر اس زمانہ کے علماء کرام نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، نیز اس مسئلہ میں امام ابو یوسف اور ائمہ ثلاثہ عدم جواز کے قائل ہیں، ہندوستان میں بعض علماء نے امام ابوحنیفہ اور امام محمد کی رائے کے مطابق جواز کا فتویٰ دیا ہے، لیکن دوسرے علماء عدم جواز کے قائل ہیں اور یہی احوط ہے کہ دارالحرب کی تعریف اور ہندوستان پر اس کی موجودہ حالت میں تطبیق، پھر احکام حلت وحرمت پر مشتمل نصوص کا عام ہونا وغیرہ قابل بحث اور معرکۃ الآراء مسائل ہیں، جن کی روشنی میں امام ابو یوسف کے قول کو اختیار کرنا ہی اسلم واحوط معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔''**وكذلك إذا تبايعا بيعاً فاسداً في دار الحرب فهو جائز وهذا عند أبي حنيفة ومحمد وقال أبو يوسف والشافعي لا يجوز**'' (زیلعی علی الکنز ۹۷/۴) (فتاوی امارت شرعیہ: ۲۴۸/۱، ۲۴۹، باب الربا)۔

سوال مذکور میں آزادی سے قبل اور بعد والی شق سے شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان دارالحرب تھا، اس لیے سود کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دارالحرب میں سود کے بارے میں جمہور علماء کا فتوی عدم جواز کا ہے، لہٰذا سود کا پیسہ آزادی سے قبل کمایا گیا ہو یا آزادی کے بعد وہ ہر حال میں حرام ہے۔

(ب) وراثت میں ملنے والا حرام مال:

نیز یہ بات بھی واضح طور پر جان لینی چاہیے کہ حرام کاروبار سے حاصل کیا ہوا مال صاحب مال کے وارث کے لیے بھی حرام ہی رہے گا، چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں: ''**علی هذا لو مات مسلم و ترک ثمن خمر باعه مسلم لایحل لورثته کما بسطه الزیلعی**'' (الدرالمختار مع الرد: ۹/ ۵۵۳)۔

مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ فرماتے ہیں:

سوال : (۱۷۹۹) ایک شخص سود لیتا تھا، اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کے لیے وہ مال حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب: ''حرام مال وارث کے لیے حلال نہیں'' (بحوالہ شامی (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ۱۷/ ۱۷۳ کتاب الحظر والاباحۃ: متفرق مسائل)۔

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''مورث کا مال حرام جس کے متعلق وارث کو حرام ہونے کا علم ہو وارث کے لیے بھی حرام ہے اور اس کے ذمہ لازم ہے کہ وہ اصل مالکوں کو واپس کرے'' (کفایت المفتی: ۷/ ۳۹۳، کتاب المعاش)۔

شیخ وھبہ الزحیلی فرماتے ہیں:

''**وکذلک لا یجوز استیفاء الدین من کسب حرام کالمرابی والمرتشی والغصب والسارق والمغنیة، ولا یحل للورثة أیضاً أخذ المیراث من کسب حرام، وعلیهم رد ما أخذوه علی أربابه إن عرفوهم، وإلا تصدقوا به ؛ لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق به إذا تعذر الرد علی صاحبه**'' (الدرالمختار وردالمحتار: ۵/ ۲۷۲، ومابعدہا، الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۴/ ۲۶۸۷)۔

ایک وہم کا ازالہ:

''**تبدل الملک کتبدل العین**'' والے قاعدے سے جو وہم پیدا ہوسکتا ہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس وہم کو دور کرتے ہوئے اس قاعدے کی تفصیل اس طرح فرماتے ہیں: ''لوگوں نے جو مطلقا سمجھ رکھا ہے کہ گو کیسی ہی حرام چیز ہو، مگر دوسرے کے پاس پہنچ کر حلال ہوجاتی ہے، یہ محض غلط ہے۔۔۔۔ جو شئ اول کے لیے باصلہ حلال ہوگی، بوصفہ کسی

عارض سے اس میں کراہت پیدا ہوجاوے وہ دوسرے کے لیے حلال ہوگی، اور چوں کہ دوسری جگہ وہ عارض نہیں ہے، اس لیے وہ خبث عارضی بھی نہ ہوگا اور بیوع فاسدہ میں یہی قصہ ہے، اور جو اول کے لیے باصلہ حرام ہو وہ حرمت برابر متعدی رہے گی، جیسے بیوع باطلہ اور ربا اور رشوت قبل الخلط یا بعد الخلط بشرط الاکثریہ۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم'' (امداد الفتاوی: ۳/ ۲۴)۔

حاصل یہ کہ مورث کا حرام مال وارث کے لیے بھی حرام ہی رہے گا۔

(ج) حرام مال سے کاروبار:

درج بالا حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ وراثت میں حاصل ہونے والا حرام مال وارث کے لیے بھی حرام ہی ہوتا ہے، اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ مالِ حرام سے استفادہ کرنا اور اس سے کاروبار کرنا کیسا ہے؟ مالِ حرام کو استعمال کرنے سے متعلق فقہاء احناف کے فتاوی درج کیے جارہے ہیں:

(۱) چنان چہ فتاوی ھندیہ کی یہ قدرے مجمل عبارت دیکھیں:

''و إذا مات الرجل و كسبه خبيث فالأولى لورثته أن يردوا المال إلى أربابه، فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به، و إن كان كسبه من حيث لايحل ، و ابنه يعلم ذلك ومات الأب و لايعلم الابن ذلك بعينه، فهو حلال له فى الشرع، و الورع أن يتصدق به بنية خصماء أبيه، كذا فى الينا بيع''

(فتاوی ھندیۃ: ۵/ ۳۴۹۔ کتاب الکراھیۃ: الباب الخامس عشر فی الکسب، بزازیۃ علی الھندیۃ: ۵/ ۳۶۰)۔

(۲) اسی طرح علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

''الحرمة تتعدد مع العلم بها إلا فى حق الوارث و قيده فى الظهيرية بأن لايعلم أرباب الأموال'' (الدر المختار علی الرد)۔

(۳) علامہ شامیؒ مختلف حوالوں سے اس کی تشریح فرماتے ہوئے خلاصہ لکھتے ہیں:

إلا فى حق الوارث الخ أى فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له؛ لكن إذا علم المالك بعينه فلا شك فى حرمته و وجوب رده عليه، و هذا معنى قوله : و قيده فى الظهيريةالخ، و فى منية المفتى: مات رجل و يعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لايحل و لكن لايعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث، و الأفضل أن يتورع و يتصدق بنية خصماء أبيه، اهـ و كذا لايحل إذا علم عين الغصب مثلا و إن لم يعلم مالكه لما فى البزازية: أخذ مورثه رشوة أو ظلما، إن علم ذلك بعينه لايحل له أخذه، و إلا فله أخذه حكما، أما فى الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء۔ اهـ و الحاصل

أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له و يتصدق بنية صاحبه، و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام و لا يعلم أربابه و لا شيئا منه بعينه حل له حكما، والأحسن ديانة التنزه عنه" (ردالمحتار:۷/۳۰۱)۔

الأحسن دیانۃ التنزہ عنہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حرام مال میراث کو قضاءً استعمال کرنا جائز ہے اور دیانۃً صدقہ کردینا مستحب ہے، لیکن درج ذیل عبارتوں پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دیانۃً صدقہ کرنا مستحب اور بہتر ہی نہیں بلکہ واجب ہے، ملاحظہ فرمائیں:

(۱) .....**"لكن في المجتبى: مات و كسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز وقال : لانأخذ بهذه الرواية، و هو حرام مطلقاعلى الورثة، فتنبه۔ اه ح۔ و مفاده الحرمةو إن لم يعلم أربابه، و ينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام، ليوافق مانقلناه، إذ لو اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا، لكن لايحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله كما حققناه قبيل باب زكاة المال، فتأمل**" (ردالمحتار:۷/۳۰۲)۔

(۲) "**قوله: إلا إذا علم ربه أى رب المال فيجب على الوارث رده على صاحبه، قوله: وهو حرام مطلقا على الورثة أى سواء علموا أربابه أو لا، فإن علموا أربابه ردوه عليهم، و إلا تصدقوا به، كما قدمناه آنفا عن الزيلعي۔ أقول: و لايشكل ذلك بما قدمناه آنفا عن الذخيرة و الخانيه، لأن الطعام أو الكسوة ليس عين المال الحرام، فإنه إذا اشترى به شيئا يحل له أكله على تفصيل تقدم فى كتاب الغصب، بخلاف ماتركه ميراثا فإنه عين المال الحرام، و إن ملكه بالقبض و الخلط عند الإمام فإنه لايحل له التصرف فيه قبل اداء ضمانه، و كذا لوارثه، ثم الظاهر أن حرمته على الورثة فى الديانة لا الحكم**" (ردالمحتار:۹/۵۵۴)۔

(۳) "**قوله: (لايكفر) اقتصر على نفى الكفر، لأن التصرف به قبل أداء بدله لايحل و إن ملكه بالخلط كما علمته**" (ردالمحتار:۳/۲۱۹)۔

تینوں عبارت سے یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ بغیر اداء ضمان مخلوط مال کا استعمال قضاءً تو جائز ہے، لیکن دیانۃً جائز نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

ناجائز آمدنی سے خریدے ہوئے مال کا حکم:

الجواب: حامداومصلیا۔ محض توبہ کرلینے سے مال پاک نہیں ہوا، بلکہ وہ کل مال یا اس کی مقدار صدقہ کرنا واجب

ہے، البتہ اگر اسی مال سے زمین خریدی گئی ہے یا اس سے کوئی جائز تجارت کی جارہی ہے تو اس زمین وتجارت کی آمدنی حلال ہوگی اور ان کے یہاں خورد ونوش، آمد درفت بھی جائز ہوگی، لیکن اس پر ضروری ہوگا کہ جتنے ناجائز روپے اس نے زمین یا تجارت میں لگائے ہیں اس مقدار کو صدقہ کردے؛ اگرچہ اس کی آمدنی سے ہی ہو: ''**فی القنیة لو کان الخبیث نصاباً لایلزمه الزکوة لأن الکل واجب التصدق علیه**'' (شامی (فتاوی محمودیہ: ۱۳/ ۳۵۲-۳۵۳، البیوع)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''اگر سودی پیسے سے سرمایہ کاری کرکے کسی شخص نے نفع حاصل کیا یا کوئی چیز خریدی تو یہ کن صورتوں میں حلال ہوگا اور کن صورتوں میں حرام؟ اس بارے میں علامہ شامی لکھتے ہیں: ''**رجل اکتسب مالاً .....**''۔

گویا امام کرخی کے اصول پر اگر مطلق روپے پر خرید وفروخت کا معاملہ طے کیا گیا اور غیر شرعی طریقہ پر کمایا گیا روپیہ اس کی قیمت میں ادا کردیا گیا تو خریدی ہوئی شئی حلال ہوگی اور شامی کے بقول اسی پر فتویٰ ہے؛ تاہم احتیاط یہی ہے کہ نہ صرف سود کے ذریعہ حاصل ہونے والا نفع بلکہ اس نفع کی مقدار سرمایہ پر حاصل ہونے والا نفع بھی بلا نیت ثواب صدقہ کردیا جائے'' (جدید فقہی مسائل: ۴/ ۱۷۴)۔

لیکن مفتی رشید احمد صاحبؒ فرماتے ہیں:

''اگر مغصوب چیز عین ہے تو اس کے عوض خریدی ہوئی اشیاء کا استعمال بالاتفاق حرام ہے، اگر نقد ہے تو اس میں امام کرخی رحمہ اللہ تعالی کا قول یہ ہے کہ اگر بوقت شراء رقم مغصوب کی طرف اشارہ کیا ہو اور پھر اداء بھی اسی سے کیا ہو تو خرید کردہ اشیاء حرام ہوں، اگر بوقت شراء رقم مغصوب کی طرف اشارہ نہ کیا یا اشارہ کیا، مگر ثمن اس سے ادا نہیں کیا بلکہ دوسری رقم سے ادا کیا تو ان حالات میں خریدی ہوئی اشیاء میں کوئی کراہت نہیں، راجح یہی ہے کہ بہر حال حرام مال سے حاصل کردہ اشیاء حرام ہیں، خواہ اشارہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اور احتیاط بھی اسی میں ہے، علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں: ''**نقل عن الحموی عن صدر الإسلام : أن الصحیح لا یحل له الأکل ولا الوطء لأن فی السبب نوع خبث فلیتأمل**'' (ردالمحتار)، قول کرخی رحمہ اللہ تعالی قرآن وحدیث اور قیاس وعقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے، بندہ نے اس کا صحیح محمل تلاش کرنے کی کوشش کی اور بعض دوسرے علماء محققین سے بھی دریافت کیا، مگر یہ عقدہ حل نہ ہوسکا، **واللہ سبحانه و تعالی اعلم**''

(احسن الفتاوی: ۸/ ۱۰۴، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

مذکورہ بالا فتاوی کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اگر مالِ حرام متعین ہے اور اس میں تصرف کرلیا گیا تو ضمان ادا کرنا ہوگا اور حرام مال سے خریدی ہوئی زمین اور تجارت سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا، اور اگر مال مخلوط ہے تو خواہ

مالک معلوم ہو یا نہ ہو، استعمال جائز ہے، لیکن مالک کو لوٹانا اور نا معلوم ہونے کی صورت میں صدقہ کرنا افضل ہے۔

اور سب سے صاف ستھری اور جامع عبارت فقہ البیوع کی ہے، جس میں مذکورہ مسئلے کے تمام گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

مال حرام متعین اور ممتاز ہو تو اس سے نفع اٹھانا یا تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا، مالک یا اس کے وارث کو لوٹا دے، ورنہ صدقہ کر دے، ضمان ادا کیے بغیر اس مال کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے، اگر وہ مال حرام سامان کی شکل میں ہو تو بیع موقوف رہے گی، اور اگر وہ مال روپے کی شکل میں ہو تو اس سے خریدی ہوئی چیز کا استعمال اور اس سے کاروبار وغیرہ جائز نہیں ہوگا؛ نیز وہ مال حرام اگر بعینہ موجود ہے تو حرمت متعدی ہوگی یعنی وارث کے لیے بھی حرام ہی رہے گا، البتہ اداء ضمان کے بعد جو نفع حاصل ہوگا وہ بالاتفاق جائز ہوگا، مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ظاہر الروایۃ کا تقاضا بھی یہی ہے، ابوبکر اسکاف نے اسی کو اختیار کیا ہے، مرغینانی، کاسانی اور ھندیہ نے اسی کو ترجیح دیا ہے، لہٰذا یہی رائے ترجیح کے زیادہ لائق ہے اور اسی میں احتیاط ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: فقہ البیوع ۲/ ۱۰۰۵-۱۰۱۶)۔

یہ تو بات تھی مال حرام متعین کے بارے میں، مال مخلوط کے بارے میں مفتی صاحب فرماتے ہیں:

"و الخلاصة أن الغاصب إن خلط المغصوب بماله، ملكه و حل له الانتفاع بقدر حصته على أصل أبي حنيفة، و عند محمد رحمه الله تعالى حل له الانتفاع بقدر حصته و إن لم يملكه، فإن باعه أو وهبه بقدر حصته جاز للآخذ الانتفاع به، أما إذا باع أو وهب بعد استنفاد حصته من الحلال فيدخل في الصورة الثانية التي كل المخلوط فيها مغصوب، و لايحل له الانتفاع به، و لا للذي يشترى أو يتهب منه حتى يؤدي إلى المغصوب منه" (فقہ البیوع: ۲/ ۱۰۳۷، ۱۰۳۸)۔

یعنی اگر مال حرام مخلوط ہو، تو حلال حصے کے بقدر انتفاع جائز ہے، اور حلال کا اندازہ لگانا مشکل ہے، اس لیے تقوی کا تقاضا ہے کہ پرہیز کرے۔

اب صورت مسئولہ میں (۱) اگر مورث کے حساب کے کاغذات وغیرہ سے ان حضرات یا ان کے وارثین کا پتہ چل جاتا ہے جن سے سود حاصل کیا گیا تھا تو انہیں لوٹانا ضروری ہوگا، (۲) اور اگر اصل مالکان کو معلوم کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو حرام مال کا صدقہ کرنا واجب ہوگا۔ ان دونوں صورتوں میں اس مالِ حرام سے کاروبار کرنا جائز نہ ہوگا۔

اور اگر حاصل ہونے والا مال مخلوط ہو (صورت مسئولہ میں اس بات کا قوی احتمال ہے کہ وراثت میں حاصل ہونے والا مال صرف حرام نہیں ہوگا؛ بلکہ اس میں مورث کا حلال مال بھی شامل ہوگا، اس طرح وارث کو حاصل ہونے والا مال مخلوط

ہوگا، نیز مرورِ زمانہ کی وجہ سے مالکان اوران کے حسابات بھی نسیامنسیا ہو چکے ہوں گے تو ایسی صورت میں موجودہ وارث کے لیے اس مال کو استعمال کرنا اور اس سے حلال کاروبار کرنا قضاءً جائز ہوگا، اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی جائداد جائز ہوگی، البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ایسے مال سے جان چھڑائی جائے۔

جواب: ۲

اس مسئلے کی صورت حال بھی وہی ہے جو اوپر مذکور ہے، البتہ غربت کی بنا پر فقہاء کرام یہ گنجائش بیان فرماتے ہیں کہ غریب شخص بقدرِ ضرورت حرام مال میں سے استعمال کرسکتا ہے، تفصیل درج ذیل ہے:

مفتی شاد محمد شاد لکھتے ہیں:

''اگر کسی شخص کے پاس اتنا حلال مال موجود ہے جس سے اس کا اور اس کے اہل وعیال کا گزارا چل سکے تو حرام مال سارا کا سارا اصل مالک کو یا اس کے ورثہ کو دینا ضروری ہے، ورنہ صدقہ کرنا ضروری ہے؛ لیکن اگر کسی شخص کے پاس صرف حرام مال ہے اور حلال مال بالکل نہیں ہے، یا اتنا ہے کہ جس سے وہ اپنی ضرورت پوری نہیں کرسکتا، اور حرام مال کو ایک ساتھ صدقہ کرنا بھی مشکل ہے تو ایسا شخص بقدرِ ضرورت حرام مال اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرسکتا ہے، اگر حرام رقم کے استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ تھا اور اس مال کا اصل مالک بھی معلوم نہیں ہے تو بعد میں اس پر یہ لازم اور واجب نہیں ہے کہ اس نے جتنا حرام مال استعمال کیا ہے اتنا مال صدقہ کرے، تاہم یہ بہتر ہے کہ استطاعت کے بعد اتنا مال صدقہ کردے؛ لیکن اگر حرام رقم کے استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ نہیں تھا تو جتنا حرام مال اس نے استعمال کیا ہے وہ اس کے ذمہ قرض سمجھا جائے گا، لہذا اس کو چاہیے کہ حرام رقم کی مقدار لکھ لے، پھر حسب ضرورت حرام اس نیت سے استعمال کرے کہ جیسا ہے حلال رقم آجائے تو فوراً اتنی رقم صدقہ کردے گا جتنی حرام رقم استعمال کی ہے، ایسی صورت میں اس شخص کو چاہیے کہ توبہ استغفار بھی کرتا رہے اور حلال کمانے کی بھرپور کوشش بھی کرتا رہے'' (مالی معاملات: ۲/ ۵۴۳، چوتھا باب: مال خبیث صورتیں اور احکام۔ بحوالہ فقہ البیوع مفتی تقی عثمانی صاحب)۔

جواب: ۳(۱)

صورت مسئولہ میں ایسے حالات میں مبتلاء عورتوں کے لیے اپنے خرچ کے ذمہ دار مرد سے چند باتوں کا خیال رکھتے ہوئے حرام مال لینا جائز ہے: (۱) مرد کو حلال رزق کے حصول کی تلقین کرے، (۲) خود عورت بھی ایسی حالت میں حلال ذریعہ رزق تلاش کرے، (۳) بعینہ حرام مال سے نہ لے بلکہ اس کا عوض لے، (۴) بقدرِ ضرورت لے، (۵) استغفار پڑھتی رہے اور اللہ سے خلاصی کی دعا کرتی رہے۔

درج ذیل عبارتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

فتاوی ھندیہ میں ہے:

"وكذا لو اشترى لها طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناول ذلك الطعام و الثياب و يكون الإثم على الزوج" (ھندیہ:۵/۳۷۵، کتاب الکراھیۃ: الباب الثلاثون فی المتفرقات)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

"و في الخانية: امرأة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه و لم يكن عينه غصباأو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناوله و الإثم على الزوج اھ" (رد المحتار:۷/۳۰۲)۔

بعینہ یہی عبارت ردالمحتار کتاب الحظر والاباحۃ میں حموی کے حوالے سے موجود ہے، (ردالمحتار:۹/۵۵۴، ۵۵۳)۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

''اگر وہ رشوت اور غصب نہ ہو تو گنجائش ہے، یعنی بعینہ حرام مال کا لینا ناجائز ہے، البتہ اس کے عوض کی چیزوں میں وسعت ہے اور گنہ شوہر پر ہے'' (فتاوی محمودیہ:۵/۲۲۵، ہاپوڑ، میرٹھ)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمے واجب ہے، اور جب تک انتظام نہ ہو، توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش جاری رکھے'' (فتاوی عثمانی:۳/۱۲۶، کتاب البیوع)۔

جواب:۳(۲)

حرام کمائی سے اعلی تعلیم دلانا جائز نہیں، بچے کو چاہیے کہ اپنے والدین کو حرام سے بچنے کی تلقین کرے، اور کہے کہ حلال مال سے ہی تعلیم حاصل کروں گا ورنہ نہیں کروں گا، یا جہاں تک ہوسکے اپنی تعلیم کا خرچ خود اٹھائے، یا قرض لے کر تعلیم حاصل کرے، اور اگر حرام مال سے تعلیم حاصل کرلے تو جب صلاحیت ہو اس کو واپس کردے، تاہم اس تعلیم اور ہنر سے حاصل کردہ کمائی جائز اور حلال ہوگی۔

البتہ بالغ لڑکا جو مستحق زکوۃ ہو، اور باپ کو مال حرام کا مالک معلوم نہ ہو تو وہ حرام مال بیٹے کو صدقہ کرسکتا ہے، اور اس کے لیے اس سے تعلیم حاصل کرنا جائز ہے۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

سوال: ان لوگوں کے بچے زید کے یہاں زیر تعلیم ہیں تو کیا زید کا تعلیم کے لئے یہ پیسہ لینا جائز ہوگا جو کہ اس مال میں سے ہیں؟

الجواب: اگر بعینہ پیشہ ناجائز آمدنی کا ہو تو زید کے لئے اس میں سے اخراجات لینا درست نہیں ہے، لیکن اگر ناجائز پیشہ کی آمدنی سے زمین خریدی گئی یا اس کو کسی جائز تجارت میں لگا دیا گیا تو اس میں سے لینا درست ہے، **و جاز أخذ دين على كا فرمن ثمن خمر لصحة بيعه بخلاف دين على المسلم لبطلانه الخ**'' (درمختار فتاوی محمودیہ: ۱۳/ ۳۵۲-۳۵۳، البیوع)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

''نابالغ چھوٹے بچوں کے لیے بھی یہی حکم ہے (جو بیویوں کے بارے میں مذکور ہوا)، اور حرام کھانے کا گناہ باپ پر ہوگا، البتہ بالغ اور بڑی اولاد خود کما کر کھائیں، باپ کے مال سے نہ کھائیں'' (تعلیم کے بارے میں بھی یہی حکم سمجھ میں آتا ہے)، (اسلام اور جدید معاشی مسائل: ۴/ ۵۲)۔

یعنی حرام کمائی سے علم و ہنر حاصل کرنے والا اپنی اہلیت اور صلاحیت کے ذریعے کماتا ہے تو اس کی کمائی جائز ہوگی۔

جواب: ۴

جب تک یہ نہ معلوم ہو جائے کہ جو کھانا کھلایا گیا تھا وہ حرام مال سے تھا تب تک اس کو حرام سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ ہی تلافی کی ضرورت ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**قال الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالى اختلف الناس فى أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من حرام ، قال محمد رحمه الله تعالى وبه نأخذ مالم نعرف شيئا حراما بعينه وهو قول أبى حنيفةرحمه الله تعالى و أصحابه، كذا فى الظهيرية**'' (ھندیہ: ۵/ ۳۴۲، کتاب الکراھیۃ: الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)۔

مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتوی سے اس عبارت کی وضاحت ہو جاتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''جب تک یہ محقق نہ ہو جائے کہ اس کا یہ کھانا رشوت ہی کے مال سے ہے، تب تک کھانا جائز ہے'' (فتاوی دار العلوم دیوبند: ۱۶/ ۹۹)۔

جواب:۵

مذکورہ صورت میں کھانے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے، البتہ بے احتیاطی کی وجہ کر توبہ استغفار کرے اور کھانا کے بقدر صدقہ کردے۔

چنان چہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

"أما بدونه (أی بدون العلم)ففی التاترخانیة: اشتری جاریة أو ثوبا و هو لغیر البائع فوطء أو لبس ثم علم: روی عن محمد أن الجماع و اللبس حرام إلا أنه وضع عنه إلاثم، و قال أبویوسفؒ: الوطء حلال مأجور علیه" (ردالمحتار:۹/۵۵۴)۔

یعنی انجانے میں حرام عمل کا ارتکاب ہوجائے، اسی طرح حرام مال کھالے تو گناہ نہیں ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

"اگر کبھی غلطی سے کوئی ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی رقم استعمال میں آجائے تو توبہ اور استغفار کرنا چاہیے، اور تلافی کے لیے اتنی رقم صدقہ کردینا چاہیے" (فتاوی عثمانی:۳/۱۲۶)۔

جواب:۶

اگر ایسی حرام چیز ہے جس کی حقیقت تبدیل ہوکر حلال میں بدل جاتی ہو تو بدلا جاسکتا ہے، مثلاً شراب۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"و عن أبی یوسف رحمه الله تعالی فی قوم ورثوا خمرا وهم مسلمون لایقسم الخمر بینهم ولک یخلل ثم یقسم، کذا فی الخلاصة" (ھندیہ:۵/۳۴۹، کتاب الکراھیۃ: الباب الخامس عشر فی الکسب، بزازیہ:۵/۳۶۰)۔

بعض علماء یہ حیلہ بھی بیان کرتے ہیں کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے کر اپنی ضروریات پوری کرلی جائے، اور قرض کی ادائیگی کے طور پر حرام مال دے دیا جائے، چنان چہ فتاوی ہندیہ اور بزازیہ میں یہ حیلہ مذکور ہے، ملاحظہ فرمائیں:

"و فی شرح حیل الخصاف لشمس الأئمة رحمه الله تعالی أن الشیخ أبا القاسم الحکیم کان یأخذ جائزة السلطان و کان یستقرض لجمیع حوائجه و ما یأخذ من الجائزة یقضی بها دیونه۔ و الحیلة فی هذه المسائل أن یشتری نسیئة ثم ینقد ثمنه من أی مال شاء، و قال أبو یوسف رحمه الله

تعالی سألت أباحنيفة رحمه الله تعالى عن الحيلة فی مثل هذا فأجابنی بما ذكرنا، كذا فی الخلاصة'' (ھندیہ:۵/ ۳۴۲، کتاب الکراھیۃ: الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات۔ بزازیہ علی ھامش ھندیہ:۶۳۶۰)۔

لیکن واضح رہے کہ اس حیلہ سے حرام مال حلال نہیں ہوجائے گا، بلکہ اب بھی حرام مال کے استعمال کا مرتکب ہورہا ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''حرام رقم تو پاک نہیں ہوتی یعنی حلال نہیں ہوجاتی، وہ حیلہ یہ ہے کہ کسی نیک کام میں خرچ کرنے کے لیے کسی غیر مسلم سے قرض کے طور پر رقم حاصل کرکے خرچ کردی جائے، یہ قرض لی ہوئی رقم نیک کام میں لگانا جائز ہے، پھر اس غیر مسلم کو قرضہ ادا کرنے کے لیے حرام رقم دے دی جائے تو اس کا اثر اس نیک کام میں خرچ کی ہوئی رقم پر نہ پڑے گا۔

مگر یہ واضح رہے کہ حرام رقم کا یہ استعمال جو اس نے اپنا قرضہ ادا کرنے میں کیا ہے اس شخص کو استعمال حرام کے مواخذہ سے نہیں بچا سکے گا'' (کفایت المفتی:۹/ ۲۱۳، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

البتہ بہتر صورت یہ ہے کہ نادانی میں حاصل ہونے والے حرام مال (جو کہ واجب التصدق ہو) اس کو اپنے باپ یا بیٹے پر صدقہ کردیا جائے، اس طرح مال اپنے ہی گھر میں رہ جائے گا۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**لـه مـال فيـه شبهة، إذا تصدق به على أبيه يكفيه ذلك ولايشترط التصدق على الأجنبی، و كـذا إذا كان معه ابنه حين كان يبيع و يشترى وفيها بيوع فاسدة فوهب جميع ماله لابنه هذا خرج من العهدة، كذا فی القنية**'' (ھندیہ:۵/ ۳۴۹،۳۵۰، کتاب الکراھیۃ: الباب الخامس عشر فی الکسب)۔

واضح رہے کہ مال حرام کو اپنے رشتہ داروں اور اصول وفروع پر صدقہ کرنا جائز ہے، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جو ملک خبیث واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے من کل الوجوہ زکوۃ کی طرح نہیں ہے، بلکہ متعدد جہات سے زکوۃ اور واجب التصدق کے مصرف میں فرق ہے، مثلاً یہ بات تقریباً تمام فقہائے حنفیہ نے بیان فرمائی ہے کہ یہ مال متصدق اپنی بیوی اور اولاد کو بھی دے سکتا ہے، چنانچہ علامہ حمویؒ لکھتے ہیں: ''**لـو كان غنيا لم يحل له ذلك بل يتصدق على الفقير اجنبيا ولو زوجة أو قريبا ولو اصلا أو فـرعا كما فی التنوير اهـ**'' (حاشیۃ الاشباہ للحموی کتاب الصید والذبائح ۲/ ۱۰۲، طبع ادارۃ القرآن) ومثلہ فی الدر المختار ۲/ ۲۷۸ تا ۲۸۰ طبع سعید) **وإلا تصدق بها على فقير ولو على أصله وفرعه وعرسه .....الخ .**

اس پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحبؒ حاشیہ لگاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کی وجہ ناچیز کی سمجھ میں یہ آتی ہے کہ مال واجب التصدق کا صدقہ اصل مالک کی طرف سے ہوتا ہے اور مصدق کی بیوی اور اولاد اس کے حق میں اجنبی ہیں'' (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۳۳، کتاب البیوع)۔

جواب: ۷

سوال سے یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ ایک شخص کے پاس حرام مال متعین وممتاز صورت میں موجود ہے، سوال نمبر ۱ کے جواب سے یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ اگر مال حرام متعین صورت میں موجود ہے تو اس کو مالک تک پہنچانا ضروری ہے، ورنہ صدقہ کردے۔

البتہ اگر وہ شخص غریب ہے تو اس کے بارے میں گنجائش ہے، تفصیل درج ذیل ہے، مفتی شاد محمد شاد لکھتے ہیں:

''اگر کسی شخص کے پاس اتنا حلال مال موجود ہے جس سے اس کا اور اس کے اہل وعیال کا گزارا چل سکے تو حرام مال سارا کا سارا اصل مالک کو یا اس کے ورثہ کو دینا ضروری ہے، ورنہ صدقہ کرنا ضروری ہے؛ لیکن اگر کسی شخص کے پاس صرف حرام مال ہے اور حلال مال بالکل نہیں ہے، یا اتنا ہے کہ جس سے وہ اپنی ضرورت پوری نہیں کرسکتا، اور حرام مال کو ایک ساتھ صدقہ کرنا بھی مشکل ہے تو ایسا شخص بقدر ضرورت حرام مال اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرسکتا ہے، اگر حرام رقم کے استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ تھا اور اس مال کا اصل مالک بھی معلوم نہیں ہے تو بعد میں اس پر یہ لازم اور واجب نہیں ہے کہ اس نے جتنا حرام مال استعمال کیا ہے اتنا مال صدقہ کرے، تاہم یہ بہتر ہے کہ استطاعت کے بعد اتنا مال صدقہ کردے؛ لیکن اگر حرام رقم کے استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ نہیں تھا تو جتنا حرام مال اس نے استعمال کیا ہے وہ اس کے ذمہ قرض سمجھا جائے گا، لہذا اس کو چاہیے کہ حرام رقم کی مقدار لکھ لے، پھر حسب ضرورت حرام اس نیت سے استعمال کرے کہ جیسا ہے حلال رقم آجائے تو فوراً اتنی رقم صدقہ کردے گا، جتنی حرام رقم استعمال کی ہے، ایسی صورت میں اس شخص کو چاہیے کہ توبہ استغفار بھی کرتا رہے اور حلال کمانے کی بھرپور کوشش بھی کرتا رہے'' (مالی معاملات: ۲/ ۵۴۳، چوتھا باب۔ مال خبیث صورتیں اور احکام۔ بحوالہ فقہ البیوع مفتی تقی عثمانی صاحب)۔

جواب: ۸

حرام بزنس سے متعلق کام کرنا جائز نہیں ہے، ایسی نوکری چھوڑ دینی چاہیے۔

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''جب اصل کام شراب کے اعلان واشتہار کا نہیں ہے، بلکہ جائز کام کا ہے تو ملازمت جائز ہے، شراب سے متعلق

جہاں تک ہو سکے بچنا چاہیے'' (فتاوی محمودیہ:۵/۱۰۵)۔

جواب:۹(۱)

جائز ہے، کیوں کہ کھیتی باڑی کرنا فی نفسہ ایک جائز عمل ہے۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

''ومن استأجر حمالا يحمل له الخمر فله الأجر فی قول أبی حنيفة، و عند أبی يوسف و محمد لا أجر له، كذا ذكر فی الأصل ؛ و ذكر فی الجامع الصغير أنه يطيب له الأجر فی قول أبی حنيفة، و عندهما يكره، لهما أن هذه إجارة على المعصية لأن حمل الخمر معصية لكونه إعانة على المعصية؛ و قد قال الله عز و جل: ولا تعاونوا على الإثم و العدوان۔ و لهذا لعن الله تعالى عشرة، منهم: حاملها و المحمول إليه۔ و لأبی حنيفة أن نفس الحمل ليس بمعصية، بدليل أن حملها للاراقة و التخليل مباح؛ و كذا ليس بسبب للمعصية و هو الشرب؛ لأن ذلک يحصل بفعل فاعل مختار، وليس الحمل من ضرورات الشرب، فكانت سببا محضا فلاحكم له، كعصر العنب و قطفه؛ و الحديث محمول على الحمل بنية الشرب'' (بدائع الصنائع:۴/۴۱، کتاب الاجارۃ-باب الاستئجار علی العمل)۔

یعنی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شراب کی حمالی کی اجرت جائز ہے، کیوں شراب کا اٹھانا صرف شراب پینے کے لیے نہیں ہوتا، اس لیے اس کا اٹھانا معصیت یا سبب معصیت نہیں ہے۔

''زاد فی النهاية: و هذا قياس و قولهما استحسان، ثم قال الزيلعی: و على هذا الخلاف لو آجره دابة لينقل عليها الخمر أو آجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده، و عندهما يكره'' (ردالمحتار:۹/۵۶۲)۔

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ شراب کی حمالی استحسانا مکروہ، اس لیے ایسی زمین میں کھیتی باری کرنا جائز ہے، البتہ نہ کرنا بہتر ہے۔

جواب:۹ (۲)

مفتی رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

سوال: بیاج ورشوت خور کی نوکری کرنا درست ہے یا نہیں؟ فقط

جواب: جس کے گھر کا مال حرام ہو اس کے یہاں نوکری ودعوت وغیرھما سب حرام ہیں (فتاوی رشیدہ کامل:۵۱۵ ۔ مکتبہ تھانوی)۔

''اگر کوئی مسلمان سودخوار ہو تو اگر ملازم کو یہ معلوم ہے کہ مجھ کو تنخواہ سود سے دیتا ہے تب تو احتراز بہتر ہے، ورنہ کچھ حرج ملازمت میں نہیں ہے'' (فتاوی دارالعلوم دیوبند:۱۵/۳۱۷-۳۲۹-۳۳۷)۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر اس گھر کی آمدنی حرام ہی حرام ہو تو ملازمت جائز نہیں ہے، اور اگر مخلوط ہے اور حرام مال سے تنخواہ دیتا ہے تو تنخواہ لینا جائز نہیں ہے، اور اگر کچھ نہیں پتہ تو جائز ہے۔

جواب:۹(۳)

اگر بائک یا کار حرام مال سے خریدا گیا تو اس میں بیٹھنا مکروہ ہے، احتیاط کرنا چاہیے، لیکن جب تک یہ یقین نہ ہوجائے کہ یہ چیز بھی حرام مال سے خریدی گئی ہے اس پر کوئی حکم لگانا صحیح نہیں ہے۔

چنانچہ تکملہ البحر الرائق میں ہے:

''و لو اشترى بالدراهم المغصوبة جارية حل له وطؤها، لأن البيع لايتعين بتلك الدراهم''

(تکملۃ البحر الرائق:۹/۲۰۷، کتاب الغصب)

جواب:۹(۴)

مفتی محمود حسن گنگوہیؒ فرماتے ہیں:

سوال: جن کی کمائی ناجائز ہے جیسے طوائف، اس سے خرید وفروخت کرنا، یا ڈاکٹر کو طوائف سے فیس لینا کیسا ہے الخ؟

الجواب: اگر وہ حرام کی کمائی کا روپیہ دے تو ڈاکٹر یا دکاندار کو فیس یا قیمت لینا درست نہیں، الخ (فتاوی محمودیہ: ۱۹/۳۸۵، باب الحظر والاباحۃ۔ فتاوی دارالعلوم دیوبند:۱۵/۳۱۶)۔

جواب:۱۰

سود کی رقم اپنے کسی کام کے لیے بطور رشوت دینا جائز نہیں ہے۔

مولا یوسف لدھیانویؒ فرماتے ہیں:

سوال: سود حرام ہے اور رشوت بھی حرام ہے، حرام چیز کو حرام میں خرچ کرنا کیسا ہے؟ مطلب یہ کہ سود کی رقم رشوت میں دی جاسکتی ہے نہیں؟

جواب: دوہرا گناہ ہوگا، سود لینے کا اور رشوت دینے کا۔ (آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۶/ ۶۸۱)

مفتی رضاء الحق صاحب محمود الفتاوی (۳/ ۲۷، باب الربوا) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

الجواب: این اے کی کارروائی میں جتنی رقم قانونی طور پر حکومت وصول کرتی ہے اس میں حکومتی بینک سے ملی ہوئی سود کی رقم ادا کر سکتے ہیں، لیکن افسران کو دی جانے والی رشوت میں نہیں دی جاسکتی، اس لیے کہ اس صورت میں وہ رقم حکومت کے پاس نہیں جاتی (فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۳۵)۔

البتہ مدارس یا دیگر رفاہ عام کے لیے بنائی جانے والی عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لیے سود کی رقم کو بطور رشوت دینا مختلف فیہ ہے۔

مسئلہ دراصل یہ ہے کہ سود کی رقم کو صدقہ کر دیا جائے تو کیا صدقہ کرنے میں تملیک واجب ہے یا نہیں، اگر تملیک کو واجب قرار دیا جائے تو پھر اس رقم کو عمارتوں کے لیے استعمال نہیں کر سکتے، اور اگر تملیک واجب نہ ہو تو سود کی رقم کو رفاہی عمارتوں میں استعمال کر سکتے ہیں۔

دوسری رائے مفتی تقی عثمانی صاحب کی ہے، اور انہوں نے فتاوی عثمانی میں اکابر کے حوالے سے یہ بات محقق کر دی ہے کہ مال حرام کے تصدق میں تملیک واجب نہیں ہے، کیوں کہ مال حرام کا تصدق دراصل صاحب مال کی جانب سے صدقہ نافلہ ہوتا ہے اور صدقہ نافلہ مین تملیک ضروری نہیں ہے، خلاصہ کے طور پر مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے فتوی پر مفتی رفیع عثمانی صاحبؒ کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

رائے گرامی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ

''ناچیز کا رجحان عرصہ دراز سے اس طرف ہوتا تھا کہ کسب خبیث (اموال واجبۃ التصدق) کے تصدق میں تملیک واجب نہ ہونی چاہئے، کیونکہ یہ صدقہ اصل مالک کی طرف سے بہ طور صدقہ نافلہ کے ہوتا ہے، اور صدقات نافلہ میں صدقات جاریہ بھی داخل ہیں، جن میں تملیک نہیں ہوتی، تحریر ھذا کو دیکھنے سے اس رجحان میں اور اضافہ ہوا، البتہ جن بزرگوں نے تملیک کو شرط یا واجب قرار دیا ہے، تحریر ھذا میں ان کی دلیل صرف یہ مذکور ہے کہ فقہائے کرام نے اسے صدقہ قرار دیا ہے، لہذا اس سے استنباط کیا گیا کہ اس میں بھی صدقات واجبہ کی طرح تملیک واجب ہوگی، اگر یہی دلیل ہے تو احقر کے مذکورہ بالا رجحان میں اس سے کمی واقع نہیں ہوئی، کوئی اور دلیل بھی اگر ہو تو اُسے دیکھ کر ہی کچھ عرض کر سکتا ہوں۔ واللہ اعلم محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ'' (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۴۰)۔

اور مفتی رضاء الحق صاحب فرماتے ہیں:

''بہر حال دونوں طرف اکابر علماء ہیں، لہٰذا جس پر چاہے عمل کرنے کی گنجائش ہے، تاہم عمل بر احتیاط اولی ہے، اور

بحیلہ وتدبیر رفاہِ عام میں خرچ کرنا مبنی بر احتیاط ہے'' (فتاوی دارالعلوم زکریا:۵/ ۴۱۴-۴۱۷)۔

لہٰذا احتیاط والاعمل یہ ہوگا کہ سود کی رقم مدارس کے طلبہ یا ان کے وکیل (مہتمم وغیرہ) کے حوالے کردی جائے اور وہ ان کے مفاد میں لگادیں، خواہ کھانا پانی اور کپڑا وغیرہ کی شکل میں ان کے ہاتھوں میں پہنچادی جائے، یا ان کے لیے مدرسے کی عمارت کے جائز نقشہ کی منظوری کے لیے رشوت خوروں کے ہاتھ میں پہنچادی جائے، تو یہ جائز اور متفق علیہ صورت ہوجائے گی۔ واللہ اعلم

جواب:۱۱(۱)

جائز ہے۔

اگر حرام وحلال میں شبہ ہو تو اس کے دفعیہ کے لیے دریافت کرنا درست ہے، اور بلا وجہ دریافت کرنا کہ اس کو اذیت ہو، نہیں چاہیے (فتاوی محمودیہ:۵/ ۳۲۲)۔

جواب:۱۱(۲)

شبہ کی بنیاد پر کسی کی چیز کو حرام نہیں کہا جاسکتا، جب تک یقین نہ ہوجائے حکم لگانا غلط ہے۔

فتاوی بزازیہ میں ہے:

"ولا يتخلف عن دعوة العامة كدعوة الختان والعروس فإذا جاء قعد، فان شائأ كل والأفضل الأكل إن لم يعلم بالحرمة'' (بزازیۃ علی الھندیۃ:۶/ ۳۶۴، کتاب الکراھیۃ)۔

یعنی اگر حرمت کا یقین نہ ہو تو عام لوگوں کا کھانا کھالینا بہتر ہے، اور فتاوی ہندیہ میں ہے:

"وفي فتاوى سمرقند رجل دخل على السلطان فقدم عليه بنى ما كول فإن اشتراه بالثمن أولم يشتر ذلك ولكن هذا الرجل لا يفهم المغصوب بعينه حل له أكله هكذا ذكر، والصحيح أنه ينظر إلى مال السلطان ويبنى الحكم عليه، هكذا في الذخيرة'' (ھندیہ:۵/ ۳۴۲)۔

جواب(۱۲)

حرام مال اور حرام کمائی والے کے لیے اس کے حال کے مناسب دعا کرنا جائز ہے، جس طرح کافر ومشرک وغیرہ کے لیے مغفرت کے علاوہ ہدایت وعافیت کی دعا کرنا جائز ہے، اسی طرح حرام مال اور حرام کمائی والے کے لیے بھی دعا کی جاسکتی ہے، درج ذیل عبارتیں ملاحظہ فرمائیں:

چنانچہ علامہ طوری کافر کی عیادت اور اس کے لیے دعا کا حکم بیان کرنے کے بعد فاسق کے بارے میں حکم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"و عیادته: یعنی تجوز عیادة الذمی المریض لما روی ..... و لأن العیادة نوع من البر و هی من محاسن الإسلام فلابأس بها ..... و لایدعو له بالمغفرة و یدعو له بالهدی، و لودعا له بطول العمر قیل یجوز لأن فیه نفعا للمسلمین بالجزیة، و قیل لایجوز، و علی هذا الدعاء بالعافیة .... و اختلفوا فی عیادة الفاسق و الأصح أنه لابأس به لأنه مسلم و العیادة فی حق المسلمین" (تکملۃ البحر الرائق:۹/ ۳۷۴، کتاب الکراھیۃ)۔

علامہ نووی الاذکار میں فرماتے ہیں:

"اعلم أنه لایجوز أن یدعی له (أی الذمی) بالمغفرة و ما أشبهها مما لایقال للکفار، لکن یجوز أن یدعی له بالهدایة و صحة البدن و العافیة و شبه ذلک، لما روی عن أنس رضی الله عنه قال: استسقی النبی صلی الله علیه وسلم فسقاه یهودی، فقال له النبی صلی الله علیه وسلم جملک الله فمارأی الشیب حتی مات" (الموسوعۃ الفقہیۃ:۲۰/ ۲۶۷، دعاء)۔

جب کفر وشرک کے ساتھ عام دعائیں کی جاسکتی ہیں تو فسق واثم کے ساتھ بدرجہ اولی کی جاسکتی ہیں۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض اہم مسائل

مولانا محمد نثار عالم ندوی ☆

تمہید:

انسان اشرف المخلوقات ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مہد سے لحد تک کی ہر چیز کو معزز ومحترم بنایا، اس کے کام آنے والی ہر چھوٹی بڑی چیز کو پاک صاف اور اشرف بنایا، قرآن مجید میں ہے:

"وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (بنی اسرائیل:۷۰)۔

اس شرافت کا لحاظ، تکریم واعزاز کی پاس داری ضروری ہے، چنانچہ اگر کہیں غیر اخلاقی اور غیر معیاری چیز کا سامنا ہوجائے یا شر وخیر مخلوط ہوجائیں، مادیت تلے روحانیت دب جائے، ہوی نفس غالب آجائے تو اس پر لازم ہے کہ طیبات کو اختیار کرے، صرف خارجی ہی نہیں بلکہ باطنی دنیا کو بھی انہیں صفات سے مزین کرے، یعنی اپنی روزی، روٹی اور کمائی کے لئے حلال ذرائع اختیار کرے؛ تاکہ اس میں کسی بھی طرح کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے۔

حلال مال کی برکت:

قرآن مجید نے بھی پاک مال کو اللہ کی جانب سے فضل قرار دیا ہے، اور متعدد آیتوں میں حلال رزق کی ترغیب دی ہے اور حرام کمائی سے سختی سے منع کیا ہے اور اس کی نحوستوں اور خرابیوں کو جگہ جگہ بیان کیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حلال کمانے کی بڑی فضیلت بیان کی ہے، اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے، اسی طرح ناجائز مال اور حرام کمائی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

☆ استاذ حدیث وتفسیر: دار العلوم الاسلامیہ اوچرہ، کیرلا

مشکوک مال سے بچنا

جس طرح حرام سے بچنا ضروری ہے، اسی طرح شک وشبہ کی کمائی اور مشکوک مال سے بھی بچنا ضروری ہے، چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور اس حلال وحرام کے بیچ میں بعض شبہ والی چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ آیا وہ حلال ہے یا حرام ہے، جو بعض شک وشبہ والی چیزوں سے بچا، اس نے اپنے دین (عزت کو) بچا لیا اور جو ان شبہ والی چیزوں میں پڑ گیا تو اسکی مثال اس چرواہے جیسی ہے جو شاہی چراگاہ کے پاس اپنے جانوروں کو چرائے، قریب ہے کہ کوئی جانور اس میں گھس جائے، خبردار، ہر ایک بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہے جس میں دوسرے کے جانوروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے، سُن لو! اللہ تعالی کی چراگاہ یعنی اس کی زمین میں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں، خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست رہا تو سارا جسم درست رہا، اور جب وہ خراب ہو گیا تو سارا جسم خراب ہو گیا، سُن لو وہ دل ہے۔۔۔'' (بخاری شریف، ۲۰۵۱)۔

رزق حرام میں مقدار میں زیادہ ہونے کے باوجود بھی برکت نہیں ہوتی، بعض دفعہ اس مالِ حرام کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایسی بیماریوں، پریشانیوں یا ایسی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی (ظلم وزیادتی) سے کمایا ہوا مال تباہی وبربادی کا سبب بن جاتا ہے۔

حرام کی دو قسمیں:

حرام چیزیں دو طرح کی ہیں:

۱- ایک وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے، لیکن کسی مصلحت سے پیدا کرنے والے نے اس کا کھانا حرام کر دیا ہے، جیسے مردار، بہتا ہوا خون یا خنزیر (سؤر) اور جو چیز غیر اللہ کے نام پر ہو۔

۲- دوسری وہ چیز ہے جو اصل میں حلال تھی مگر انسان نے خود (اس کو ناجائز طریقہ سے حاصل کر کے) اپنے لئے حرام بنا لیا، جیسے چوری کا مال یا جھوٹ بول کر، دھوکہ دیکر کمایا ہوا مال، جو اصل میں تو حلال تھا، لیکن انسان نے اسے ناجائز طریقہ سے حاصل کیا اور اسے اپنے لئے حرام کر لیا، قرآن کریم نے ان دو طریقوں سے حرام ہونے والی چیزوں کو انسان کیلئے حرام قرار دیا ہے۔

رزق حرام کی سزا:

رزق حرام کی آخرت میں سزا جہنم ہے، روایت میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''جو جسم حرام سے پرورش پایا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا اور اس جسم کیلئے دوزخ زیادہ لائق ہے'' (مسند احمد ۱۴۴۸)۔

سود کی حرمت:

سود یعنی وزن کی جانے والی یا کسی پیمانے سے ناپے جانے والی ایک جنس کی چیزیں اور روپے وغیرہ میں دو آدمیوں کا اس طرح معاملہ کرنا کہ ایک کو عوض کچھ زائد دینا پڑتا ہو ربا اور سود کہلاتا ہے جس کو انگریزی میں Interest یا Usury کہتے ہیں۔

سود کی حرمت قرآن وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

'' **وَاَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا**'' (سورہ البقرہ ۲۷۵)۔

(اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے)۔

''**يَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا وَيُرْبِى الصَّدَقَاتِ**'' (سورہ البقرہ ۲۷۶)۔

(اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)۔

سود کو قرآنِ کریم میں اتنا بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے کہ شراب نوشی، خنزیر کھانے اور زنا کاری کے لیے قرآن کریم میں وہ الفاظ استعمال نہیں کیے گئے جو سود کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے استعمال کیے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

'' **يَا اَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوْا مَا بَقِىَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُومِنِيْنَ۔ فَاِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَاْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ**'' (سورہ البقرہ ۲۷۸-۲۷۹)۔

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو، اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو، اور اگر ایسا نہیں کرتے تو تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاو!)۔

سود کھانے والوں کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے اور یہ ایسی سخت وعید ہے جو کسی اور بڑے گناہ، مثلاً زنا کرنے، شراب پینے کے ارتکاب پر نہیں دی گئی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سود کھانے والوں کے لیے کل قیامت کے دن جو رسوائی وذلت رکھی ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے

اپنے پاک کلام میں کچھ اس طرح فرمایا:

"اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطَانُ مِنَ الْمَسِّ" (سورہ البقرہ ۲۷۵)۔

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو)۔

سوالات کے جوابات:

حلال وحرام کی بحث اور ان میں سود پر خصوصی بیان سامنے رکھتے ہوئے حرام کمائی کے متعلق بعض مسائل کا جواب دیا جاتا ہے۔

جواب:۱

اگر کسی مال کے بارے میں یہ پتہ نہ ہو کہ وہ حلال ذرائع آمدنی کا ماحاصل ہے یا پھر حرام؟ ایسے میں اس پر واجب ہے کہ وہ حتی المقدور کوشش کرے کہ ذرائع آمدنی کے متعلق معلومات جمع کر لیں، اگر کوئی شائبہ ہو تو اس پر مناسب کاروائی کرے، بہت زیادہ خود کو کوفت میں ڈالنا اور اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنا ضروری نہیں، عام طور سے اپنے آباواجداد کی جانب سے جو وراثت ملتی ہے وہ حلال ہوتی ہے؛ لیکن اگر واضح ہو جائے کہ وہ حرام مال ہے تو انہیں مستحق تک پہنچانا لازم ہے۔

فتاوی بنوری ٹاؤن میں ہے:

''اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور ترکہ میں کوئی حرام مال موجود ہو، مثلاً کسی سے سود وصول کیا ہو اور اس کا اصل مالک بھی معلوم ہو تو ورثاء پر لازم ہے کہ وہ مالِ حرام اصل مالک کو واپس کر دیں، یہ مالِ حرام (سود کے ذریعہ حاصل کی گئی رقم) ورثاء کے لیے حلال نہیں''۔

فتاوی شامی میں ہے:

"مطلب فیمن ورث مالا حراما ...لکن إذا علم المالک بعینه فلا شک فی حرمته ووجوب رده علیه" (کتاب البیوع، مطلب فیمن ورث مالا حراما، ۵/۹۹، طبع: سعید)۔

جواب:۲

حرام مال جس صورت میں ہو اس سے استفادہ جائز نہیں، اس کا اصل مصرف یہ ہے کہ اس کے مالک تک اس کو پہنچا

دیا جائے، لیکن اگر کوئی شخص غریب ہے اور اس کا کوئی اور مالک نہیں ہے، تو اس کے لیے اجازت ہے کہ بقدر ضرورت اس سے استفادہ کرے اور باقی اعمال صدقہ کرے۔

فتاوی شامی میں ہے:

"اكتسب حرامًا و اشترى به أو بالدراهم المغصوبة شيئًا، قال الكرخي: إن نقد قبل البيع تصدق بالربح وإلا لا، و هذا قياس، و قال أبو بكر: كلاهما سواء و لايطيب له، و كذا لو اشترى و لم يقل بهذه الدراهم و أعطى من الدراهم دفع ماله مضاربة لرجل جاهل جاز أخذ ربحه ما لم يعلم أنه اكتسب الحرام.

(قوله: اكتسب حرامًا إلخ) توضيح المسألة ما في التتارخانية حيث قال: رجل اكتسب مالًا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: قال أبو نصر: يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا في الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبو الليث، لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص في الجامع الصغير: إذا غصب ألفا فاشترى بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح .وقال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاثة الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب في الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس اهـ .وفي الولوالجية: وقال بعضهم: لا يطيب في الوجوه كلها وهو المختار، ولكن الفتوى اليوم على قول الكرخي دفعا للحرج لكثرة الحرام اه (کتاب البیوع باب المتفرقات ۵/ ۲۳۵، ایچ ایم سعید)۔

جواب: ۳

شوہر یا بیٹا اگر پوری طرح سے حرام کمائی کر رہا ہے اور وہ کسی بھی طرح اس سے باز نہ آتے ہیں تو ایسی خاتون کو چاہیے کہ وہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کریں، مثلا: گھر کے بڑوں سے مشورہ کرے اور مناسب حل نکالیں، فتاوی بنوری ٹاون میں ہے:

"حرام کمانے والوں کے گھر والوں کے لیے یہ حکم ہے کہ حرام کمانے والوں سے حرام ذریعۂ آمدنی چھڑانے کی پوری کوشش کرتے رہیں، پوری کوشش کے باوجود اگر وہ نہ چھوڑیں تو اگر ان کی بیوی کے لیے جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لیے اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز نہیں اور اگر اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز ہے، حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ شوہر پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لیے بھی یہی حکم ہے، البتہ گھر کے بالغ افراد پر لازم ہے کہ خود کما کر کھائیں، حرام کمانے والے کے مال

سے نہ کھائیں''۔

فتاوی شامی میں ہے:

''**وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاماً أو کسوةً من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها، والإثم علی الزوج**'' (۱۹۱/۶)۔

اگر کوئی حل نہ نکلے تو بقدر ضرورت ہی مال کو تصرف میں لائے، یہ بات کہنے کی دو وجہ ہے:

پہلی وجہ: ہم کسی مملکت یا حکومت کے ماتحتی میں نہیں جہاں بیت المال کا نظم ہو اور حکومتی سطح پر تعاون کیا جاتا ہو اور اس کے ذریعہ تعاونی رقم یا وظیفہ دیا جاتا ہو؛ لیکن ہم اس کے برعکس ایک جمہوری نظام کے باشندہ ہیں، جہاں پر ایسی ضرورت مندوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔

دوسری وجہ: ہمارا معاشرہ اتنا باشعور نہیں اور اتنا غیرت مند بھی نہیں ہے کہ وہ کسی خاتون کی اس طرح سے آزادانہ کفالت کرے؛ تاکہ شادی بیاہ کے بعد اسے دشواری نہ اٹھانا پڑے۔

جہاں تک بات اس کے بچہ کی اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کمائی کرنے کی ہے تو یقیناً اس کی تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم نامناسب ہوگی، تاہم آمدنی حلال ہوگی، کیونکہ کسب مال میں کوئی حرام ذریعہ شامل نہیں۔

جواب: ۴

جن کے گھروں میں حرام کمائی کی آمدنی ہو تو وہاں جانا آنا مناسب نہیں ہے، یہ گویا وہ ''**تعاونوا علی الاثم والعدوان**'' کے مانند ہے، تو ایسے گھروں کی دعوت قبول نہیں کرنا چاہیے، مگر یہ حکم اس وقت ہوگا جب یہ یقین ہو کہ اس کا کل مال حرام کا ہے؛ لیکن اگر اس کے مال میں اختلاط ہو اور یہ واضح نہ ہو پاتا ہو کہ کتنا حلال ہے اور کتنا حلام ہے تب بھی اس کے گھر جانے کی اجازت تو ہوگی مگر احتیاط افضل ہے، بالخصوص وہ لوگ جو معاشرہ میں محترم اور بااثر سمجھے جاتے ہیں، انہیں چاہیے کہ ایسی جگہوں سے دور رہیں، تاکہ عوام میں مقام و رتبہ باقی رہے۔

''**أهدی إلی رجل شیئا أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن یعلم بأنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی أن لا یقبل الهدیة ولا یأکل الطعام إلا أن یخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل کذا فی الینابیع. ولا یجوز قبول هدیة أمراء الجور؛ لأن الغالب فی مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أکثر ماله حلال بأن کان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به؛ لأن أموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فالمعتبر الغالب، وکذا أکل طعامهم کذا فی الاختیار شرح المختار**'' (۱۸۷:۴، ط دار الکتب

العلمیۃ بیروت)(الفتاوی الھندیۃ، کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات ۵/ ۳۴۲، ط مکتبۃ زکریا دیوبند)۔

جواب:۵

ایک مومن پر لازم ہے کہ وہ کھانے پینے بلکہ کام کاج میں بھی حلال وحرام کے درمیان فرق کرے، اللہ سے ڈرے اور اس کے تعمیل میں کسی بھی طرح کی کوتاہی نہ کرے، اگر اسے کہیں مشکوک جگہ پر کھانے یا پینے کی ضرورت پیش آئے تو اس سے پہلے اپنی بساط کے مطابق تحقیق وتفتیش کرے، اگر اسکے بعد بھی معلوم ہو کہ اس کی آمدنی حرام ہے اور اس کے لیے کافی ہے کہ وہ دعا واستغفار کرلے اور ایسی جگہوں سے پرہیز کرے؛ لیکن اگر بغیر سمجھے سوچے دعوت کھائے تو انہیں اپنی دعا اور استغفار میں مزید جہد کرنی چاہیے اور مناسب صدقہ بھی۔

جواب:۶

پہلے سے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال دائرے میں لانا اس اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس مال کو مستحق تک پہنچادے، غرباء وفقراء کی مدد کرے، ان کے لیے مناسب بندوبست کرے اور اگر خود مستحق ہو تو اپنے اوپر خرچ کرے، یہی اصل بات ہے؛ لیکن فقہ کی بعض جزئیات سے یوں استفادہ کیا جاسکتا ہے؛ جیسے اگر کسی شخص نے کسی کا مال غصب کیا تو اس شخص کے لیے حرام ہوتا ہے اور اس کو تجارت میں لگادے تو اس کا منافع اس کے لیے حلال ہوتا ہے، البتہ غصب کیا ہوا مال لوٹانا ضروری ہے۔

اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر کسی شخص کی کمائی حرام ہے اور وہ اس حرام مال کو تجارت میں لگادے اور اس تجارت سے جو منافع حاصل ہوں گے وہ اس شخص کے لیے حلال ہوں گے، البتہ جو مالِ حرام تجارت کے لیے لگایا ہے اسی کے بقدر لوٹادے گا، امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إِذَا اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ، فَقَوْلَانِ .الْجَدِيدُ: أَنَّهُ إِنْ بَاعَهُ أَوِ اشْتَرَى بِعَيْنِهِ، فَالتَّصَرُّفُ بَاطِلٌ .وَإِنْ بَاعَ سَلَمًا أَوِ اشْتَرَى فِي الذِّمَّةِ وَسَلَّمَ الْمَغْصُوبَ فِيهِ، فَالْعَقْدُ صَحِيحٌ، وَالتَّسْلِيمُ فَاسِدٌ، فَلَا تَبْرَأُ ذِمَّتُهُ مِمَّا الْتَزَمَ، وَيَمْلِكُ الْغَاصِبُ مَا أَخَذَ، وَأَرْبَاحُهُ لَهُ" (روضۃ الطالبین:۵/۵۹)۔

جواب:۷

اس کی اجازت ہے کہ وہ شخص حرام مال کو صدقہ کرنے کے بجائے اسے خود کو قرض دے اور اس سے کاروبار کرکے اس حرام مال کو فقراء تک پہنچادے، یہ صورت درست ہونے کی دو وجوہ ہیں:

پہلی وجہ: وہ شخص خود محتاج ہے، محتاج کو بقدر ضرورت مال استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

دوسری وجہ: قرض کی فراہمی بہت مشکل ہے، پھر یہ ہے کہ حرام کمائی میں رقم خرچ کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا اور ان کے قرضوں کو ادا کرنا بہت مشکل ہے تو ایسے میں مناسب ہے کہ وہ اس مال سے خود استفادہ کرے، البتہ توبہ استغفار کرے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قَالَ الْغَزَالِيُّ إِذَا كَانَ مَعَهُ مَالٌ حَرَامٌ وَأَرَادَ التَّوْبَةَ وَالْبَرَائَةَ مِنْهُ .....وَلَهُ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِهِ عَلَى نَفْسِهِ وَعِيَالِهِ إِذَا كَانَ فَقِيرًا لِأَنَّ عِيَالَهُ إِذَا كَانُوا فُقَرَاءَ فَالْوَصْفُ مَوْجُودٌ فِيهِمْ بَلْ هُمْ أَوْلَى مَنْ يُتَصَدَّق عَلَيْهِ وَلَهُ هُوَ أَنْ يَأْخُذَ مِنْهُ قَدْرَ حَاجَتِهِ لِأَنَّهُ أَيْضًا فَقِيرٌ" (المجموع ۱۰/۳۸۱۔ دیکھئے: الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۴/۲۸۴)۔

جواب:۸

جب ایک شخص کسی کے پاس نوکری کرے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا کاروبار حرام ہے یا حلال ہے، اگر اس کو بعد میں معلوم ہو کہ اس کی کمائی حرام ہے تو اسے احتیاط کرنا چاہیے، اگر ایسا ہو کہ نصف حلال اور نصف حرام ہے اور دونوں چیزیں بالکل واضح ہوں، تب بھی ایسی جگہ کو جلد از جلد ترک کرنا چاہیے، چنانچہ جب تک کوئی دوسرا بندوبست نہ ہو جاتا ہو تو وہیں پر رہے اور تنخواہ صدقہ وخیرات کر دے۔

"قال الإمام الخطيب الشربيني رحمه الله تعالى : لَوْ اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ فَالرِّبْحُ لَهُ فِي الْأَظْهَرِ" (مغنی المحتاج: ۳/۳۶۳)۔

"قال الإمام النووي رحمه الله: إِذَا اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ، فَقَوْلَانِ .الْجَدِيدُ: أَنَّهُ إِنْ بَاعَهُ أَوِ اشْتَرَى بِعَيْنِهِ، فَالتَّصَرُّفُ بَاطِلٌ .وَإِنْ بَاعَ سَلَمًا أَوِ اشْتَرَى فِي الذِّمَّةِ وَسَلَّمَ الْمَغْصُوبَ فِيهِ، فَالْعَقْدُ صَحِيحٌ، وَالتَّسْلِيمُ فَاسِدٌ، فَلَا تَبْرَأُ ذِمَّتُهُ مِمَّا الْتَزَمَ، وَيَمْلِكُ الْغَاصِبُ مَا أَخَذَ، وَأَرْبَاحُهُ لَهُ" (روضۃ الطالبین: ۵/۵۹)۔

جواب۹

حرام کمائی خواہ خود کرے یا کوئی دوسرا کرتا ہے تو اس سے دوستی یا تعاون سے بچنا ایمانی غیرت ہے؛ لیکن جائیداد جیسے کھیتی باڑی ہو، اسے یوں ہی چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے، چنانچہ ایسی زمین پر کاشت کاری کرائے اور حاصل ہونے والے غلہ کو صدقہ وخیرات کرے یا پھر اس زمین پر ایسا اسکول قائم کیا جائے جس میں غریب ونادار بچوں کے تعلیم کا نظم ہو، البتہ اس

سے حاصل شدہ آمدنی انتظامیہ کے لیے درست ہوگی، کیونکہ وہ ان کے محنت کا پھل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلا تَعَاوَنُوا عَلَى الإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (القرآن الکریم: المائدۃ:۲)۔

"عن أنس بن مالک قال: " لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم فی الخمر عشرة: عاصرها، ومعتصرها، وشاربها، وحاملها، والمحمولة إليه، وساقيها، وبائعها، وآكل ثمنها، والمشترى لها، والمشتراة له" (سنن الترمذی، أبواب البیوع باب النہی أن یتخذ الخمر خلا، حدیث رقم:۱۲۹۵)۔

"قال الإمام الرملی رحمه الله تعالى: وَدَلِيلُ ذَلِكَ لَعْنُةُ ﷺ فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً: عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا الْحَدِيثُ الدَّالُّ عَلَى حُرْمَةِ كُلِّ تَسَبُّبٍ فِي مَعْصِيَةٍ وَإِعَانَةٍ عَلَيْهَا" (نہایۃ المحتاج:۳/۴۸۱)۔

جواب:۱۰

حرام کمائی کے مصرف کے متعلق فقہاء یہی بیان کرتے ہیں کہ انہیں ان کے مالک تک پہنچا دینا چاہیے، چنانچہ سود پر کوئی رقم ملی ہوئی ہے، یعنی جس شخص سے وہ رقم ملی ہے، اسے لوٹا دینا چاہیے، ایسے میں مدارس کی عمارت کی تعمیر میں بطور رشوت رقم دی جارہی ہو تو یہ مناسب نہیں کہ حکومت کے کسی کارندے کو سودی رقم بطور رشوت دی جائے، کیونکہ حکومت ایک الگ ادارہ ہے، اور کسی شخص کی ذمے داری الگ بات ہے، اگر کوئی ایسی صورت ہو جس میں رقم حکومت کے حصے میں ہی جاتی ہو جو انہیں بطور سود ملی ہے تو پھر اسے ازراہ رشوت بھی دے سکتے ہیں، یہ گویا اس کے مالک تک رقم پہنچانا ہوگا۔

معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں بطور رشوت ڈاکٹر اور ایجنٹ کو سودی رقم دینا جائز نہیں ہے، اگر مجبوراً رشوت دینا ہی پڑے تو حلال رقم سے دی جائے گی۔

"وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إِنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إِذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ" (شامی:۹/۳۸۵)، فقط واللہ تعالیٰ اعلم

فتاوی اللجنۃ میں بھی ہے:

"الفوائد الربوية من الأموال محرمة قال تعالى (و أحل الله البيع و حرم الربا)فمن وقع تحت يده شئ منها التخلص منها بانفاقهما فی ما ينفع المسلمين ومن ذلک إنشاء الطرق و بناء المدارس وإعطاؤها الفقراء" (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۱۳/۳۵۴)۔

جواب:۱۱

بلاشبہ کسی کی دل آزاری کرنا اچھی بات نہیں ہے، مگر یہ بھی درست نہیں ہے کہ جان بوجھ کر ایک کام میں اپنے آپ کو منہمک کرے، مگر یہ کہ معاشرے میں لے بھی جائے تو مناسب ہے کہ اسے اس کے مستحقین تک پہنچادیا جائے، لیکن اگر وہ خود مستحق ہو تو اس کا استعمال کریں، جیسے کوئی بیوہ ہے، یا غریب ہے، یا سلائی کی مشین اسے دی گئی ہے، اسے خود استعمال کریں، لیکن اگر وہ خود مستحق نہیں ہے تو اس سے بچوں کو روکے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات حسنین کے ساتھ بھی یہی کیا۔

جواب ۱۲

روایت میں بھی یہ بات آئی ہے کہ حرام کمائی کرنے والوں کی دعا قبول نہیں ہوتی، مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے بارے میں دعا کر رہا ہے تو اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی ہے، اس کی دعا اس کے بارے میں قبول ہوسکتی، ایسے آدمی کے لیے دعا کرنا چاہئے، تاکہ وہ اسلام کے قریب ہو اور اسکے روحانی اثرات خدائے قدوس سے قریب کرے۔

"عن أبی موسی قال: ولد لی غلام فأتیت به النبی صلی الله علیه وسلم، فسماه إبراهیم، فحنکه بتمرة ودعا له بالبرکة ودفعه إلی، وکان أکبر ولد أبی موسی" (صحیح البخاری ۶۱۹۸)۔

والله اعلم بالصواب

☆☆☆

معیشت وتجارت میں حرام مال کے اثرات سے متعلق مسائل

مفتی محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی ☆

جواب:۱

اس صورت میں مذکورہ شخص کے آباء واجداد جس حرام کاروبار سے مال کمارہے تھے اس کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں: ایک وہ حرام مال بلا معاوضہ حاصل کررہے تھے، جیسے سود حاصل کرنا یا وہ مال حرام کسی عوض کے بدلے (مثلاً: کسی ناجائز کام کی اجرت میں) حاصل ہورہا تھا، اگر پہلی صورت ہے جیسا کہ سوال سے یہی متبادر ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے اصل مالک کو لوٹانا لازم ہے، کیوں کہ سودی رقم پر قبضہ کے بعد بھی ملکیت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ وہ اصل مالک ہی کی ملکیت میں رہتی ہے، اصل مالک یا اس کے ورثاء موجود نہ ہوں یا ان کا علم نہ ہو تو اصل مالک کی طرف سے غریبوں میں صدقہ کرنا لازم ہے، اور اگر دوسری صورت مراد ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کمائی کو غریبوں میں صدقہ کردیا جائے، دونوں صورتوں میں اس طرح کرنے کے بعد اس رقم سے جو نفع حاصل ہوا ہوا سے استعمال کرنا جائز ہوگا، چونکہ وہی مال ورثاء کو وراثت میں ملا ہے، اس لیے ورثاء کو چاہیے کہ ایک اندازہ لگا کر سودی رقم مذکور بالا تفصیل کے مطابق اصل مالک تک پہنچادیں بصورتِ دیگر غرباء میں صدقہ کردیں، اور اگر وہ لوگ خود ہی غریب اور محتاج ہیں تو خود ہی استعمال کرسکتے ہیں، بلکہ اس صورت میں علامہ سرخسیؒ نے اس شخص کو فقراء سے مقدم قرار دیا ہے (المبسوط: ۱۱/۷۷، دارالمعرفہ بیروت)۔

رہ گیا یہ مسئلہ کہ وہ رقم ملک کی آزادی سے پہلے حاصل کی گئی تھی یا اس کے بعد تو اس سے اصل مسئلہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا؛ کیوں کہ انگریزوں کے دور میں ملک ہندوستان کا دارالحرب ہونا اور اس میں ربا کا جائز ہونا مختلف فیہ مسئلہ رہا ہے، اکثر اہلِ علم (بشمول حضرت تھانویؒ) اسے اس وقت بھی دارالحرب نہیں مانتے تھے، نیز جن بزرگوں نے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا تھا وہ سداًللباب اور انگریزوں کی مخالفت میں تھا، علاوہ ازیں دارالحرب میں کافر حربی سے سود کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے، احناف میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ دارالحرب میں کافر حربی سے سودی معاملے

☆ استاذ دارالعلوم حیدرآباد

کومطلقاً ناجائز کہتے ہیں، ان کا مستدل وہ نصوص ہیں جن میں سود کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے، البتہ حنفیہ میں سے امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ دارالحرب میں کافر حربی سے سود کو ایک غریب حدیث "لا ربا بین المسلم والحربی" کی بنیاد پر چند قیود کے ساتھ جائز کہتے ہیں؛ لیکن چوں کہ معاملہ سود کا ہے جس کی حرمت قرآنی آیات میں بغیر کسی قید کے منصوص ہے؛ اس لیے حنفیہ کے یہاں جمہور کے مسلک (یعنی حرمت والے قول کو) ترجیح حاصل ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، طرفین کے مسلک (یعنی جواز کے قول) کو مرجوح قرار دیا گیا ہے۔

الفروق للقرافی میں ہے:

"فإن اختلف العلماء فی فعل هل هو مباح أو حرام فالورع الترک" (الفرق السادس والعشرون والمئتان من الفروق، ۴/۲۷۲، ط: عالم الکتب)۔

الأشباہ والنظائر میں ہے:

"إذا تعارض الدلیلان أحدهما یقتضی التحریم والآخر الإباحة قدم التحریم" (القاعدة الثانیة من الفن الثانی، ۱۰۹، ط: قدیمی)۔

"غصب حانوتا واتجر فیه وربح یطیب الربح کذا فی الوجیز للکردری" (الفتاوی الهندیة، کتاب الغصب، الباب الثامن، ۵/۱۴۲)۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند آن لائن میں ہے:

"حرام اور ناجائز مال سے کسی بھی قسم کی تجارت کرنا درست نہیں، لیکن اگر کسی شخص نے اس طرح کے مال سے تجارت کرلی تو اس سے حاصل شدہ آمدنی اور نفع کو حرام نہیں کہا جائے گا، البتہ اگر حرام مال (غصب، رشوت) وغیرہ اسے حاصل ہے تو اصل مالک کی طرف اس اصل رقم کا لوٹانا ضروری ہوگا، اور اگر سودی رقم ہے یا مالک کا پتہ ہی نہیں تو ایسی صورت میں اصل رقم کو غرباء ومساکین وغیرہ پر صدقہ کردیا جائے" (جواب نمبر: 42979)۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی رائے:

مذکورہ صورت میں اگر ورثاء مالدار ہیں، اور ساری رقم صدقہ کرنے میں فی الحال کوئی دقت پیش آرہی ہو تو بطور قرض بھی اس رقم کو استعمال کرسکتے ہیں، جسے حسبِ سہولت تھوڑا تھوڑا مالِ حلال سے صدقہ کرتے رہیں؛ کیوں کہ لقطہ کے بارے میں یہ بھی منقول ہے کہ امام کی اجازت سے بطور قرض لقطہ کے اموال کو غنی بھی استعمال کرسکتا ہے، عصر حاضر میں غنی کے لیے اس طرح کے اموال کی اجازت کے سلسلے میں مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ لکھتے ہیں: "چونکہ اس طرح کے مسائل آج کل

حکمرانوں کے سامنے پیش نہیں کیے جاتے ،اس لیے اس طرح کے مسائل میں اگر کوئی راسخ فی العلم متقی مفتی کسی کو اس طرح کے اموال کو بطور قرض استعمال کی اجازت دے تو اس کی بھی گنجائش ہونی چاہیے'' (فقہ البیوع ۲/۱۰۲۱، دار المعارف دیوبند)۔

علامہ ابن تیمیہ کی رائے:

علامہ ابن تیمیہؒ کی رائے اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حرام ذریعہ سے مالِ حرام سامنے والے کی رضامندی سے حاصل کرے، تو اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں: مثلاً ایسا اس وجہ سے ہوا کہ وہ اس معاملہ کی حرمت سے ناواقف تھا، یا اس نے ایسا اس وجہ سے کیا کہ اہلِ علم نے اس کے جواز کا فتوی دیا تھا، یا اس کے پاس اس معاملہ کے جواز کی کوئی تاویل موجود تھی، پھر اس شخص کو اس معاملہ کی حرمت کا علم ہوا یا یہ معلوم اور یقین ہوگیا کہ وہ فتوی اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھا تو ان تمام صورتوں میں اس پر حرام کمائی کو واپس کرنا یا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے، ضروری بس یہ ہے کہ اب وہ اس حرام کام سے مکمل طور پر پرہیز کرے اور آئندہ اس حرام کام سے سچے دل سے توبہ کرلے، علامہ ابن تیمیہ کی یہ رائے آئندہ کے سوالات حل کرنے میں بھی معاون بن سکتی ہے، علامہ ابن تیمیہ کا یہ استدلال: ''**فَمَنْ جَائَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ**'' (سورۃ البقرۃ/۲۷۵) پر موقوف ہے، نیز ابن تیمیہ کا یہ ماننا ہے کہ ایسی صورت میں حرام کمائی کرنے والے توبہ پر بہت جلد آمادہ ہوجائیں گے، عرب کے متعدد دار الافتاء نے ابن تیمیہ کے اس استدلال کو قبول کیا ہے اور اس کے مطابق فتاوی صادر کیے گئے ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: فتاوی ابن تیمیہ، اسلام آن لائن وغیرہ)۔

علامہ ابن قیم کی رائے:

مذکورہ مسئلہ میں علامہ ابن قیمؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر ایسا شخص فقیر ہے تو بقدرِ ضرورت خود رکھ لے اور زاید از ضرورت کو صدقہ کردے: ''**فطريق التخلص منه وتمام التوبة : بالصدقة به ، فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ قدر حاجته ، ويتصدق بالباقي ، فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه ، عيناً كان أو منفعة**'' (زاد المعاد ۵/۶۹۱)۔

خلاصہ بحث:

(۱) مذکورہ تفصیل کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اگر ورثہ غنی ہیں اور آسانی سے اس مال حرام سے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں تو جمہور کی رائے کے مطابق حرام آمدنی کا پائی پائی صدقہ کردیں، یہی أبرأ للذمۃ وأحوط للدین ہے۔

(۲) اور اگر ورثہ اس پر آمادہ نہیں ہیں، یا صدقہ کرنے کی صورت میں خود محتاج ہوجائیں گے، یا محتاج تو نہیں ہوں

گے،لیکن معاشی دقت ودشواری میں مبتلا ہوجائیں گے یا کل مال وجائیداد کا تصدق توبہ سے مانع بن رہا ہوتو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب یا (علماء کے اتفاقِ رائے سے)ابن تیمیہؒ کے قول پر عمل کی گنجائش ہونی چاہیے، کیوں کہ آزادی سے پہلے سودی کاروبار کے جواز پر بعض اہلِ علم نے جواز کا فتوی دیا تھا۔

جواب:۲

جس کی پوری جائیداد اور مکمل مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہوتو اس جائیداد سے حاصل ہونے والا کرایہ بھی حرام ہے، کیونکہ جیسے حرام کمائی مسلمان کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ویسے ہی اس کمائی سے حاصل ہونے والا نفع بھی اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتا، کیوں کہ ایسا نفع سود کی حیثیت رکھتا ہے،لہٰذا جب تک جائیداد میں لگی ہوئی ساری رقم صدقہ نہ کردی جائے،اس کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، مذکورہ شخص کو چاہیے کہ کسی ماہر مفتی یا اہلِ علم سے یہ فتوی حاصل کرلے کہ وہ یہ جائداد بطور قرض اپنے پاس رکھ رہا ہے، پھر حرام مال کا حساب کرکے تھوڑا تھوڑا صدقہ کرتا رہے، جب مکمل رقم صدقہ کردے گا تو اس جائیداد سے انتفاع حلال ہوجائے گا۔

مفتی تقی عثمانی صاحب زید مجدہ لکھتے ہیں:

"وإن كان غنيا،ولم يكن المال الحلال كافيا لسد حاجته،يسوغ للمفتي بعد النظر في أحواله أن يفتيه بجواز الاقتراض مما عنده من المال الحرام،بشرط أن يلزم نفسه تسديد هذا القرض إلى الفقراء من المال الحلال كلما تيسر له ذلك،فيجب عليه أن يتصدق بمثله" (فقہ البیوع ۲/۱۰۲۱،دارالمعارف دیوبند)۔

آن لائن فتاوی دارالعلوم دیوبند میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

"فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ خالص حرام مال سے نفع اٹھانا جائز نہیں، اسی طرح اگر مال حرام وحلال دونوں مخلوط ہوں، حرام کو حلال سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہو اور اکثر حصہ مال حرام ہوتو اس کا بھی یہی حکم ہے؛ البتہ اگر حلال حصہ زیادہ اور حرام کم ہے تو اس سے نفع اٹھانے کی اجازت دی ہے، یہاں جب کہ مکان بقول آپ کے حرام کمائی سے بنا ہوا ہے تو اس کو کرایہ پر دے کر اس سے کرایہ حاصل کرنا، پھر اسے اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں، جب تک کہ مکان میں لگی ہوئی ساری رقم صدقہ نہ کردی جائے، بیوہ کو اپنی گذر بسر کا اور کوئی انتظام کرنا چاہئے" (جواب نمبر:173232)۔

جواب:۳(الف)

شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کررہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے

باز نہیں آ رہا ہے، تو ماں و بیوی کو چاہئے کہ حکمت اور دانائی کے ساتھ اپنے شوہر و بیٹے کی حرام کمائی چھڑانے کی کوشش کرے، اس کے لیے کسی اللہ والے سے اس کی ملاقات کرائے، اور دعا کی درخواست کرے، اور اگر بیوی و ماں کی اپنی استطاعت نہ ہو، اور وہ شوہر و بیٹے کے مالِ خبیث سے ہی اپنا گزر بسر کرتی ہے، تو ایسی صورت میں مال حرام کھلانے کا گناہ شوہر کو ہوگا۔

"**اشتری الزوج طعاماً أو کسوةً من مال خبیث، جاز للمرأة أکله ولبسها، والإثم علی الزوج**" (ردالمحتار: ۶/۱۹۱، ط: ایچ ایم سعید)۔

(ب)

اگر کسی نے حرام کمائی سے اپنے بچے کو پڑھایا، لکھایا اور اعلیٰ تعلیم دی، اور ڈگری حاصل کرنے کے بعد بچہ کمانے لگا تو اگر وہ بچہ دورانِ تعلیم خود مستحقِ زکات تھا یا اس کے والدین اس وقت مستحقِ زکات تھے تو چوں کہ حرام کمائی اپنے مصرف میں ہی استعمال ہوگئی، اس لیے بچے کی کمائی کی حلت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اگر والدین یا بچہ مستحق زکات نہیں تھا تو اگرچہ ماں باپ کا یہ عمل گناہ کے دائرہ میں آئے گا، کیونکہ ماں باپ کی شرعی ذمہ داری ہے کہ وہ رقم جہاں سے حاصل ہوئی ہے وہاں واپس کریں یا صدقہ کریں، تاہم اس صورت میں بھی بچے کی کمائی حلال ہوگی بشرطیکہ وہ کوئی حلال کاروبار کرتا ہو۔

جواب: ۴

یقینی طور پر معلوم ہونے کی صورت میں کہ ان کی سو فیصد آمدنی حرام ہے ان کے یہاں کھانا کھانا جائز نہیں ہے، اور اگر کوئی حلال ذریعہ آمدنی بھی ان کا ہے یا آمدنی کے سو فیصد حرام ہونے کا یقین نہیں ہے تو مخلوط آمدنی والے کی دعوت قبول کر لینے کی گنجائش ہے، یعنی بوقت ضرورت ان کے یہاں کھانا کھا سکتا ہے، پھر بھی احتیاط کر لینا تقوی کی بات ہے جو آدمی کی ہمت اور ایمان کی قوت پر مبنی ہے۔

"**غالب مال المهدی إن کان حلالاً، لا بأس بقبول هدیته وأکل ماله، ما لم یتعین أنه من حرام، وإن غالب ماله الحرام لا یقبلها ولا یأکل، إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه**" (البزازیۃ علی ہامش الفتاویٰ الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ/ الفصل الرابع فی الہدیۃ والمیراث ۶/۳۶۰، زکریا)۔

"**آکل الربا وکاسب الحرام أهدیٰ إلیه، أو أضافه وغالب ماله حرام، لایقبل ولا یأکل ما لم یخبره أن ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن کان غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هدیته والأکل منها**" (الفتاویٰ الہندیۃ ۵/۳۴۳)۔

جواب:۵

تقویٰ کی بات یہ ہے کہ قے کے ذریعہ اسکو واپس باہر نکالا جائے، تاکہ حرام لقمہ جزء بدن نہ بن سکے، اور یہ ممکن نہ ہوتو توبہ استغفار کیا جائے اور آئندہ احتیاط کی جائے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بخاری شریف (حدیث نمبر: ۳۸۴۲) میں آتا ہے کہ ان کے ایک غلام نے کھانے کی کوئی چیز ان کی خدمت میں پیش کی، آپ نے اس چیز میں سے کچھ کھالیا، اس کے بعد غلام نے بتایا کہ مجھے یہ چیز اس طرح حاصل ہوئی تھی کہ اسلام سے پہلے جاہلیت کے دور میں ایک آدمی کو میں نے اپنے آپ کو کاہن ظاہر کرکے کچھ بتلایا تھا، اس کہانت کے بدلہ میں اس شخص نے مجھے یہ چیز دی تھی جو میں نے آپ کو کھانے کے لیے دی، بخاری شریف میں ہے: ''فَأَدْخَلَ أَبُوْبَكْرٍ يَدَهُ فَقَاءَ كُلَّ شَيْءٍ فِيْ بَطْنِهِ'' (صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فوراً حلق میں انگلی ڈال کر قے کردی)۔

جواب: ۶

بلاضرورت حیلوں کی تلاش ممنوع ہے، البتہ ضرورت کے وقت کوئی حیلہ اختیار کرنا مشروع ہے، قرآن وحدیث میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں: حیلہ کبھی مقصودِ شرع کے ابطال کے لیے ہوتا ہے، وہ حرام ہے، اور کبھی مقصود شرع کی تحصیل وتعمیل کے لیے ہوتا ہے، وہ جائز ہے اور جو حیلہ ایسا ہو کہ اس سے عوام کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو وہ بھی حرام ہے، جیسے سود سے بچنے کے لیے ایسے حیلے جن سے لوگ سود ہی کو حلال سمجھنے لگیں، حرام ہیں'' (فقہ حنفی کے اصول وضوابط ص: ۱۶۴)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حیلہ کا باب عوام اور بالخصوص علماء کے لئے بڑا نازک اور پرخطر ہے اور بغیر ضرورت شدیدہ کے کبھی اس دروازہ پر دستک نہیں دینی چاہیے، اس لیے راقم الحروف کے نزدیک دور حاضر میں حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ بتانا درست نہیں ہے، ہر چند کہ حیلہ کا مقصد سلف صالحین کے نزدیک حرام سے بچنا ہے نہ کہ اس کو حلال وطیب بنانا؛ لیکن آج کے پرفتن اور ایمان سوز ماحول میں اس سلسلے میں کوئی حیلہ بتانا نہ صرف یہ کہ اہلِ علم کی بدنامی کا سبب ہوگا بلکہ حرام کام اور حرام آمدنی کو بڑھاوا دینے کے مترادف ہوگا۔

جواب: ۷

عصر حاضر کے نامور محقق، مفتی محمد تقی صاحب نے لکھا ہے کہ اس کی گنجائش ہے، بلکہ یہ بہتر صورت ہے، جیسا کہ فقہ

البیوع کے حوالہ سے سوال نمبر (۲) کے ذیل میں گذرا؛ لیکن واضح رہے کہ یہ حکم حرام مال سے خلاصی کے طور پر ہے، چنانچہ قصداً وعمداً کسی کا مال باطل طریقے سے حاصل کر کے اس سے تجارت وغیرہ کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔

"**غصب حانوتا واتجر فيه وربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردري**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الغصب، الباب الثامن، ۵/ ۱۴۲)۔

جواب: ۸

مذکورہ شخص کو حلال وحرام ملازمت میں جو کام کرنا پڑتا ہے ان کی مجموعی مقدار کے مقابلہ میں حرام کام کی مقدار بہت کم ہو تب تو اسے ایسے ادارہ میں ملازمت برقرار رکھنا اور اس پر اجرت لینا اور اسے اپنے استعمال میں لانا درست ہوگا، ورنہ اعانت علی المعصیت کی بنا پر ایسی ملازمت سے احتراز ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ**" (المائدہ:۲)۔

جواب: ۹(الف):

حرام کمائی سے حاصل کردہ زمین میں کھیتی باڑی کرنا درست نہیں ہے، کیوں کہ حرام کمائی قبضہ کے بعد بھی غیر مملوک ہوتی ہے، لہٰذا وہ زمین یا زمین کی قیمت اصل مالک کو حوالہ کرنا ضروری ہے، مالک معلوم نہ ہو سکے تو مالک کی طرف سے تصدق لازم ہے، اور اگر وہ خود محتاج ہے تو کسی ماہر مفتی سے مسئلہ پوچھ کر ابن تیمیہ کے قول پر عمل کر سکتا ہے؛ لیکن اگر کسی نے ایسی زمین میں کھیتی باڑی کی یا درخت لگایا تو وہ غلہ یا درخت کھیتی باڑی کرنے والے کی ملکیت شمار ہوں گے، بہتر ہے کہ کھیتی باڑی کرنے والا زمین کا کرایہ ادا کر دے اور آئندہ کھیتی باڑی سے پرہیز کرے۔

"**لو غصب أرضا فبنى فيها، أو غرس، فإن كانت قيمة الأرض أكثر قلعها وردت و إلا ضمن له قيمتها**" (الأشباہ والنظائر ص:۲۵۸، زکریا دیوبند)۔

(ب) حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنے سے پرہیز کرنا زیادہ مناسب اور تقوی کی بات ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسے شخص کے یہاں نوکری کرے تو اگر مذکورہ شخص متعینہ طور پر اپنی حرام کی کمائی سے ہی اس کو مزدوری دے گا تو حرام مال سے اجرت وصول کرنے میں کراہت آئے گی، لیکن خرید وفروخت اور کرایہ داری وغیرہ، یعنی: مالی معاملات میں امام کرخی کے قول پر عمل کی گنجائش ہے؛ بہ شرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اُسے متعین کر کے نہ دے، لہٰذا اجرت دینے والا جب تک ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کرے کہ یہ پیسے میں تم کو خالص حرام کمائی کے دے رہا ہوں اس وقت

تک وہ حرام نہ ہوگا، بلکہ وہ پیسے جائز ہی سمجھے جائیں گے۔

"**رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهمَ...وقال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب**" (ردالمحتار علی الدرالمختار، کتاب البیوع، باب المتفرقات، مطلب إذا اکتسب حراما ثم اشتری فہو علی خمسۃ أوجہ، ۷/ ۴۹۰)۔

(ج) حرام کمائی استعمال کرنا شرعاً ناجائز ہے، لہٰذا اس رقم سے کار یا بائک لینا جائز نہیں، ہاں اگر گاڑی کی قیمت کے برابر رقم ثواب کی نیت کے بغیر مستحقینِ زکاۃ کو صدقہ کردی جائے تو اس کے بعد اس گاڑی کو استعمال کرنے کی گنجائش ہوگی ورنہ نہیں، اگر حرام کمائی سے خریدی گئی کار یا بائک پر کرایہ ادا کرکے بیٹھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر مفت کی سواری کی جائے تو احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ سواری کرنے سے بچا جائے۔

(د) حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے اور اپنی اسی کمائی سے فیس ادا کرے تو کراہت کے ساتھ فیس وصول کرنا جائز ہے۔

دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کے مفتیان کرام لکھتے ہیں:

''جن بچوں کے والد کا ذریعہ معاش حلال نہ ہو، ان سے وصول کردہ فیس کی رقم میں کراہت ہوگی، فقط واللہ اعلم''

(فتوی نمبر:200002)

جواب: ۱۰

رشوت میں سودی رقم دینا گویا اس کا ذاتی استعمال کرنا ہے، اس لیے ایسا کرنا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ اس میں سودی رقم اس کے رب المال کی طرف نہیں لوٹ رہی ہے، بلکہ سرکاری یا غیر سرکاری افسروں یا انتظامیہ کی جیب میں جاتی ہے، تاہم اگر کسی نے رشوت میں سودی رقم ادا کردی تو اس پر اتنی رقم مذکورہ بالا سودی رقم کے مصارف میں خرچ کرنا واجب ہوگا، اگر مجبوراً رشوت دینا ہی پڑے تو حلال رقم سے دی جائے گی۔

"**وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إِنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إِذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ**" (شامی:۹/ ۳۸۵)۔

آن لائن فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

''رشوت میں سود کی رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ سود کی رقم یا تو مالک (بینک یا حکومت وغیرہ) کو لوٹانا ضروری ہے یا پھر غریبوں مسکینوں کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے، رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضہ میں نہیں جاتی؛ بلکہ افسران کے جیب میں جاتی ہے''۔

جواب: ۱۱

اگر کسی مسلمان کی آمدنی کے مشتبہ ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو، محض وہم یا وسوسہ ہو، تو ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کیے بغیر اس کا ہدیہ قبول کرنا یا مدد لینا درست ہے، بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اس کے ذریعہ آمدنی پر شبہ کرنا درست نہیں ہے، تاہم اگر واضح دلیل سے کسی کی آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو، تو ایسے شخص سے ہدیہ لینا یا کسی طرح کی امداد لینا یا اس کی دعوت قبول کرنا ناجائز ہے، ہاں اگر تحقیق میں تعلقات میں بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ہدیہ قبول کرلیا جائے، لیکن اسے خود استعمال کرنے کے بجائے غریبوں میں صدقہ کردیا جائے ''**وإن أهدى هدية، فإنها تصرف في وجوه البر**'' (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۲۳)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام**'' (الفتاوی الہندیۃ: ۳/ ۲۱۰، ط: دارالفکر)۔

تاہم بعض اہلِ علم نے درجِ ذیل تفصیل بھی کی ہے، اسے پیشِ نظر رکھنا بھی درست ہے:

جس شخص کی آمدنی ناجائز ہو، اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ وہ مدنی اس نے غصب یا عقد باطل کے ذریعہ حاصل کی ہو، جیسے ربا القرض، رشوت وغیرہ، اور دوسرے یہ کہ عقد فاسد کے ذریعہ حاصل کی، جیسے بیع قبل القبض، یا بیع غرر وغیرہ۔

پھر اس شخص سے اس کی آمدنی حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ اپنی آمدنی میں سے کسی کو کچھ ہدیہ کرے یا ہبہ کرے اور شئ موہوب بعینہ وہ ہو جو ناجائز ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے، چاہے عروض ہوں یا نقود، تو ایسا ہدیہ قبول کرنا دونوں صورتوں میں ناجائز ہے، چاہے آمدنی بیع باطل کی ہو یا بیع فاسد کی ہو، البتہ اگر ناجائز آمدنی نقود کی شکل میں ہو اور کاسب حرام نے اس سے کوئی چیز خرید لی ہو تو اس میں فقہاء کا کلام ہے اور امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق صرف اس صورت میں خریدی ہوئی چیز کا لینا ہدیۃً ناجائز ہے جب اس نے ناجائز نقود کی طرف اشارہ کرکے وہی نقود ; قیمت کے طور پر ادا کیے ہوں

(جو عام طور پر نہیں ہوتا)، باقی تمام صورتیں جائز ہیں (تفصیل کے لیے فقہ البیوع المبحث العاشر: أحکام المال الحرام ملاحظہ ہو)۔

جواب: ۱۲

ایسے شخص سے دعا کروانا جس کی دعا قبول ہونے کا امکان نیکی اور تقوی کی وجہ سے یا کسی ایسی جگہ جا کر دعا کرنے کی وجہ سے زیادہ ہو جہاں دعا کی قبولیت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، مثلاً سفر، حج، عمرہ، وغیرہ، تو اصل یہی ہے کہ یہ کام جائز ہے، ابوداود (۱۴۹۸) اور ترمذی (۳۵۵۷) میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''میرے بھائی! ہمیں اپنی نیک دعاؤں میں مت بھولنا''، لہٰذا حرام کمائی میں مبتلا شخص اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر کسی نیک آدمی سے دعا کرائے، اسی طرح پانی پر دم کرائے تو یہ جائز ہے، تاہم ایسے شخص کو حرام کام سے فوراً توبہ کرنا ضروری ہے، اور اگر اس وقت وہ شخص اسی حرام کمائی سے کچھ ہدیہ وغیرہ پیش کرے تو احتیاط برتنا ضروری ہے، تاکہ اسے اپنے عمل بد پر ندامت ہو اور وہ تائب ہو جائے۔

☆☆☆

مالِ حرام سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد شفیق بڑودوی غفرلہٗ☆

الحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِين، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الأَنْبِيَاءِ وَالمُرسَلين، وَعَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْن، أَمَّا بَعْد.

مالِ حرام سے متعلق چند مسائل:

اللہ ربّ العزت نے ہمیں عبادات کی طرح معاملات میں بھی احکامِ شرعیہ کا پابند بنایا ہے؛ بلکہ حکم یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں شرعی احکام پر عمل کرو۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ [البقرۃ:۲۰۸]

کسی بھی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ عبادات میں تو شرعی احکام کی پابندی کرے اور معاملات میں من مانی کرے، ایمان میں کمال اسی وقت پیدا ہوگا جب کہ شریعت کے تمام احکام پر عمل کیا جائے، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے تمام شعبوں میں ہماری رہنمائی کی ہے، چنانچہ مال کے شرعی احکام بھی فقہ اسلامی کا ایک موضوع ہیں، موجودہ وقت میں چوں کہ باطل اور فاسد قسم کے معاملات معاشرے میں بہ کثرت رائج ہو چکے ہیں، اس لیے بھی اس موضوع کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے، غالباً اسی وجہ سے ''مجمع الفقہ الإسلامی الھند'' نے اپنے (۲۳) ویں فقہی اجتماع کے لیے اسے موضوعِ بحث بنا کر مالِ حرام سے متعلّق چند قابل غور امور و مسائل پر مشتمل سوال نامہ جاری کیا۔

جوابات سے قبل اس سلسلے کی کچھ بنیادی و اصولی باتیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، وباللہ التوفیق۔

مالِ حرام کا مفہوم:

اللہ ربّ العزت نے قرآنِ کریم میں مالِ حرام یعنی باطل و ناجائز طریقے سے مال کمانے، کھانے اور استعمال

☆ دارالارشاد، بزمِ صدیقی، بڑودہ

کرنے کی حُرمت وممانعت بیان فرمادی، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ [النساء: ۲۹]۔

حضور پاک ﷺ نے بھی فرمایا:

"الحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللهُ فِیْ كِتَابِهٖ، وَالحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللهُ فِیْ كِتَابِهٖ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ" (ابن ماجہ، مشکوٰۃ: ۳۶۷ / کتاب الأطعمۃ)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جسے حلال قرار دیا وہ حلال اور جسے حرام ٹھہرادیا وہ حرام ہے، اور جن امور سے سکوت اختیار فرمایا وہ معاف (مباح) ہیں، اس حدیث پاک سے فقہاء کرام نے یہ ضابطہ نکالا: "الأَصْلُ فِیْ الأَشْیَاءِ الإِبَاحَة" (الأشباہ للسیوطی: ۱۳۳)، اشیاء میں اصل اباحت ہے، حُرمت وحلت کا حکم ثانوی امر ہے۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت میں حلال کا دائرہ وسیع اور حُرمت کا دائرہ تنگ ہے، حرام صرف وہ ہے جس کی حُرمت کے بارے میں صحیح اور صریح نص وارد ہوئی ہو، اس پس منظر میں مالِ حرام کے متعلّق ہمارے علماء محققین نے فرمایا کہ حرام وہ مال ہے جو لوگوں سے باطل، ناجائز اور غیر شرعی طریقے سے حاصل کیا جائے، جس سے بچنا لازم اور ضروری ہے۔

الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) میں آیت کریمہ کے تحت فرمایا:

"لَا یأكُل بعضُكم مَالَ بعضٍ بغیرِ حقٍ .فیدخلُ فی هٰذا: القِمارُ والخِدَاعُ وَالغُصوبُ وَجَحدُ الحُقوقِ، وما لا تَطِیبُ به نفسُ مَالِكِه، أو حَرَّمته الشریعةُ؛ وإن طَابت به نفسُ مالِكِه، كمهرِ البَغِیِ، وحُلوانِ الكاهنِ، وأثمانِ الخمورِ، والخنازیرِ وغیرِ ذٰلكَ" (الجامع لأحکام القرآن: ۲ / ۳۳۸، دار الکتب المصریۃ، القاھرۃ)۔

مالِ حرام کی اقسام:

بنیادی طور پر مالِ حرام کی دو قسمیں ہیں: (۱) حرام لذاتہ، (۲) حرام لغیرہ، حرام لذاتہ وہ مال ہے جو اپنی ذات اور وصف دونوں اعتبار سے حرام ہو، جیسے: مردار، شراب اور خون وغیرہ، اور حرام لغیرہ وہ مال ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے تو حلال اور جائز ہو، لیکن کسی خارجی وصف کی وجہ سے اس میں حُرمت پیدا ہوگئی ہو، جیسے کسی کا مال اس کی اجازت کے بغیر لینا، خواہ زبردستی ہو، جیسے غصب میں ہوتا ہے، یا غیر محسوس طریقے سے ہو، جیسے دھوکہ دہی اور چوری میں ہوتا ہے، یا رضامندی سے لیا، لیکن شرعاً اس کی اجازت نہیں، جیسے جُوا، سود، رِشوت اور امر معصیت (گناہ) کی اُجرت میں ہوتا ہے، علّامہ ڈاکٹر وہبہ زُحیلی فرماتے ہیں:

"سَوَاءٌ كَانَ لِحُرْمَتِهٖ لِذَاتِهٖ بِمَا فِیْهِ مِنْ ضَرَرٍ، أَوْ خُبْثٍ، كَالمَیْتَةِ، وَالخَمْرِ، أَمْ لِحُرْمَتِهٖ لِغَیْرِهٖ،

لِوُقُوْعِ خَلَلٍ فِیْ طَرِیْقِ اکْتِسَابِہٖ، لِأَخْذِہٖ مِنْ مَالِکِہٖ بِأُسْلُوْبٍ لَا یُقِرُّہُ الشَّرْعُ، وَلَوْ بِالرَّضَاءِ، کَالرِّبَا، وَالرِّشْوَۃِ'' (الفقہ الإسلامی وأدلتہ: ۱۰/ ۷۹۴۵، دار الفکر، الشام، دمشق، ط: ۴، قاموس الفقہ: ۳/ ۲۴۸، بحوالہ: التوضیح: ۲/ ۱۱۵)۔

مالِ حرام سے خلاصی کے احکام:

مالِ حرام خواہ لذاتہ ہو یا لغیرہ، اس کا اصل حکم یہی ہے کہ اپنے کسی بھی مصرف میں اس کا استعمال شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اس سے خلاصی کے احکام مختلف ہیں:

(۱) مالِ حرام اگر مالک کی اجازت کے بغیر زبردستی حاصل کیا جائے، جیسے غصب میں ہوتا ہے، یا اس طرح حاصل کیا کہ مالک کو پتا نہ چلے، جیسے چوری اور دھوکہ دہی میں ہوتا ہے، یا مالک کی رضامندی سے بلاعوض حاصل کیا؛ مگر شرعاً اس کی اجازت نہیں، جیسے جُوا، سود اور رِشوت میں ہوتا ہے، ان تمام صورتوں میں حکم یہ ہے کہ وہ مال اصل مالک کو لوٹا دے، کیوں کہ یہ مال مالک ہی کا ہے، جو اس کی رضامندی یا غیر شرعی طریقے سے لیا ہے، اس لیے اصل مالک ہی اس کا حقدار ہے۔

(۲) اگر مال کے اصل مالک کو لوٹانا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو مالکِ مال کی جانب سے اس کا کسی بھی قسم کا بقایا وقرض ادا کردے، اگر اس کا علم ہو۔

(۳) اور اگر نہ مالکِ مال کا پتا ہو، نہ اس کے کسی قسم کے قرض کا علم ہو، تب یہ مال مالک کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔

(۴) لیکن اگر مال کے مالکان اور وارثان تک یہ مال پہنچانا کسی طرح ممکن نہ ہو تو پھر اس مالِ حرام سے خلاصی (چھٹکارے) کی صورت یہ ہے کہ مالک کی طرف سے فقراء ومساکین کو بلانیت ثواب صدقہ کردے، بعد میں مالک یا اس کا وارث مل جائے تو اس کو مطلع کردے، وہ راضی ہوجائے تو فبہا، ورنہ مال لوٹا دے، صدقہ اس کی جانب سے ہوجائے گا۔

(۵) یہی حکم اس وقت بھی ہے جب کہ مالِ حرام امر معصیت کی صورت میں ہو، خواہ مالک موجود ومعلوم ہو، اسے بلانیت ثواب فقراء میں صدقہ کیا جائے گا۔

(۶) البتہ اگر وہ خود ہی محتاج ہو تو اپنے اور اہل خانہ کے مصارف میں بقدرِ ضرورت استعمال کی گنجائش ہے، بقیہ مال کو صدقہ کردے۔

ہندیہ میں ہے: ''وَالسَّبِیلُ فِی الْمَعَاصِی رَدُّهَا، وَذٰلِکَ هَاهُنَا بِرَدِّ الْمَأْخُوذِ إِنْ تَمَکَّنَ مِنْ رَدِّہٖ، بِأَنْ عَرَفَ صَاحِبَهٗ، وَبِالتَّصَدُّقِ بِہٖ، إِنْ لَمْ یَعْرِفْهُ، لِیَصِلَ إِلَیْہِ نَفْعُ مَالِہٖ إِنْ کَانَ لَا یَصِلُ إِلَیْہِ عَیْنُ مَالِہٖ'' (الفتاوی الھندیۃ: ۵/ ۳۴۹)۔

بہر حال اس پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ مالِ حرام اوّلاً اس کے مالک کو لوٹا دے، اگر مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب اس کی طرف سے صدقہ کرنا لازم ہے۔

مالِ حرام سے خریدی ہوئی اشیاء کے احکام:

مندرجۂ بالا صورتیں تو وہ تھیں جن میں کسی کی ملکیت میں مالِ حرام تھا جس سے وہ خلاصی چاہتا تھا؛ لیکن اگر کسی نے اس مالِ حرام سے کوئی چیز خرید لی تو اس کا کیا حکم ہے؟ مطلب یہ ہے کہ مالِ حرام سے خریدی ہوئی چیزوں میں حُرمت سرایت کرتی ہے یا نہیں؟

احناف کے نزدیک مالِ حرام سے کوئی چیز خریدنے کی پانچ صورتیں مشہور ہیں:

(الف) بائع کو حرام رقم پہلے پیش کر دی جائے، پھر اس کے ذریعے خریداری کی جائے، (ب) حرام رقم کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور اس کے ذریعے خریداری کر لی جائے، پھر وہی رقم بائع کو دی جائے، (ج) حرام رقم کی طرف اشارہ کر دیا جائے اور اسی رقم سے خریداری کا عقد بھی کیا جائے؛ لیکن بعد میں ثمن دوسری رقم سے ادا کیا جائے، (د) عقد کے وقت رقم کا کوئی تذکرہ ہی نہ کیا جائے؛ بلکہ مطلق خریداری کا معاملہ کیا جائے، پھر حرام رقم سے ثمن ادا کیا جائے، (ھ) بائع کو جائز رقم دِکھا دی جائے اور اسی کے ذریعے خریداری ہو؛ لیکن ثمن کی ادائیگی حرام رقم سے کی جائے۔

ان تمام صورتوں میں فقہاء احناف کے مابین اختلاف ہے، امام کرخیؒ کے نزدیک آخری تین صورتوں میں گنجائش ہے، اور علّامہ شامی کی تصریح کے مطابق متاخرین نے فسادِ زمانہ کی وجہ سے امام کرخی کے قول کو مفتیٰ بہ قرار دیا ہے۔

امام کرخی کی تصریح کا حاصل یہ ہے کہ مالِ حرام سے خریدی ہوئی اشیاء میں حُرمت اس وقت سرایت کرتی ہے جب خرید و فروخت میں مالِ حرام پر عقد و نقد جمع ہو جائیں، جیسا کہ پہلی دو صورتوں میں ہوا کہ مالِ حرام پیش کر کے یا دِکھا کر اس کے عوض ایک چیز خریدی گئی، پھر وہی مالِ حرام بطورِ قیمت ادا کیا، تو اس طرح عقد و نقد میں مالِ حرام جمع ہونے کے سبب خریدی ہوئی چیز میں بھی حُرمت سرایت کر جائے گی اور وہ چیز حرام ٹھہرے گی، لیکن اگر خرید و فروخت میں مالِ حرام پر عقد و نقد جمع نہ ہوں تو خریدی ہوئی اشیاء میں حُرمت سرایت نہیں کرے گی، یعنی وہ چیز حلال کہلائے گی (تفصیل اور عربی عبارت کے لئے دیکھئے: الدر المختار علی رد المحتار، کتاب البیوع ۷/۴۹۰)۔

مالِ حرام سے حاصل شدہ منافع کے احکام:

رہی بات مالِ حرام سے کیے ہوئے حلال کاروبار اور اس سے قرض کی ادائیگی یا حاصل شدہ منافع کی، تو اس بارے

میں حضرات فقہاء کرام کی تین مختلف آراء ہمارے سامنے آئیں:

(۱) حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہا اللہ کی ایک ایک روایت یہ ہے کہ مال اور اس سے حاصل شدہ منافع اصل مالک یا اس کے وارث کو لوٹا دیا جائے، کیوں کہ یہ ایسے مال کے منافع ہیں جو شرعاً ناجائز تھے، اس لیے غاصب کے لیے حلال نہیں، اصل مالک ہی اس کا حقدار ہے۔

علاّمہ ابوالحسن علی بن سلیمان المرداوی الشافعی تحریر فرماتے ہیں:

"وَإن اتَّجَرَ بالدَّرَاهِمِ، فَالرِّبْحُ لمالِكِها .يعْنِي: إذَا اتَّجَرَ بعَينِ المالِ، أو بثَمَنِ الأَعْيانِ المَغْصُوبَةِ، فالمالُ ورِبْحُه لمالِكِها .وهٰذا الصَّحيحُ مِنَ المذهَبِ، وَنَصَّ عليه، وَنقَلَهُ الجماعَةُ، وَعَليه الأَصحَابُ" (الإنصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف:۶/ ۲۰۸، ط:۲، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان)

علاّمہ منصور بن یونس بن ادریس البہوتی الحنبلی فرماتے ہیں:

"لكِنَّ نُصوصَ أحمد متفقةٌ على أَن الربحَ لِلمَالكِ" (کشاف القناع:۴/ ۱۱۳، دار الکتب العلمیۃ)۔

لہٰذا اس کو اپنے کسی استعمال میں لانا جیسے: قرض کی ادائیگی یا منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔

(۲) علاّمہ ابن تیمیہ مالِ حرام سے حاصل شدہ منافع کے متعلّق فرماتے ہیں کہ اس مال کے منافع کو غاصب اور مغصوب کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا جائے گا، کیوں کہ یہ منافع اصل مالک کے مال اور غاصب کی محنت سے حاصل ہوئے، آپ نے بطورِ دلیل عہد فاروقی کا ایک واقعہ ذکر فرمایا کہ حضرت فاروقِ اعظم کے بیٹوں کو حضرت ابوموسیٰ اشعری نے مالِ فیٔ سے دو لاکھ درہم مدینہ طیبہ پہنچانے کے لیے دیے اور فرمایا کہ اگر وہ چاہیں تو ان سے کچھ سامان خرید کر وہاں بیچ دیں اور نفع خود رکھ لیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، اس میں ان کو بہت سارا نفع ہوا، مال کی مقدار آٹھ لاکھ درہم تک پہنچ گئی، حضرت عمرؓ نے انھیں حکم فرمایا کہ اصل مال کو منافع سمیت بیت المال میں جمع کر دیں، اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے عرض کیا کہ یہ مال بیت المال کے لیے بھی جائز نہیں ہوگا، کیوں کہ اگر یہ مال ضائع ہو جاتا تو ہم ہی ضامن ہوتے، تو اگر ضمان ہمارے ذمّے ہے تو نفع بھی ہمارا ہونا چاہیے، یہ سن کر حضرت عمر نے توقف فرمایا۔

"فَقَالَ لَهُ بَعْضُ الصَّحَابَةِ:" نَجْعَلُهُ مُضَارَبَةً بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ المُسلِمِينَ، لَهُمَا نِصْفُ الرِّبْحِ، وَلِلمُسلِمين نصفُ الرِّبْحِ، فَعَمِلَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنهُ بِذٰلِكَ .وَهٰذَا مِمَّا اعتَمَدَ عَلَيْهِ الفُقَهَاءُ فِيْ المُضَارَبَةِ" (مجموع الفتاوی:۳۰/ ۳۲۲-۳۳۰)۔

حضرت عمر کو بعض صحابۂ کرام نے مشورہ دیا کہ اس کو مضاربت کی صورت بنا دیجیے اور آدھا حصّہ بیت المال کے لیے

بطورِ ربّ المال مختص ہوجائے، حضرت عمرؓ نے اس پر عمل کیا، یہ واقعہ مؤطا امام مالک میں بھی منقول ہے (مؤطا امام مالک/ باب ما جاء فی القراض، حدیث نمبر: ۱۱۹۵)۔

(۳) مالِ حرام سے حاصل شدہ منافع سے متعلّق حضرات مالکیہ، بعض شوافع اور احناف میں سے حضرت امام ابو یوسف رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ مالِ حرام سے حاصل شدہ منافع کا مالک غاصب ہوگا، کیوں کہ ایک معاملے میں حضور ﷺ نے فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: " الخِرَاجُ بِالضَّمَانِ" (شرح السنۃ، مشکوٰۃ: ۲۴۹)۔

اربابِ علم وفضل جانتے ہیں کہ حضور پاک ﷺ کا یہ فیصلہ فقہ اسلامی کا مشہور قاعدہ بن گیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی کسی کاروبار وغیرہ میں نقصان کا ضامن ہو منافع بھی اسی کو حاصل ہوں گے، اور اس صورت میں غاصب ہی اپنے کاروبار میں نقصان کا ذمّہ دار ہے، نہ کہ مغصوب منہ، اس لیے ضمان کی ادائیگی کے بعد یعنی مالِ حرام کی اصل مقدار مالک کو ادا کرنے کے بعد اور بحالت تعذر صدقہ کرنے کے بعد غاصب کے لیے اس نفع سے مستفید ہونے کی اجازت ہے۔

"غَصَبَ حَانُوتًا، وَاتَّجَرَ فِيهِ، وَرَبِحَ، يَطِيبُ الرِّبْحُ. كَذَا فِي الوَجِيزِ لِلْكَرْدَرِي" (الفتاوی الھندیۃ: ۵/ ۱۴۲، کتاب الغصب/ الباب الثامن)

ان اقوال وآراء کے پیشِ نظر عاجز کا خیالِ ناقص یہ ہے کہ شرعاً مالِ حرام سے کسی بھی قسم کی تجارت وغیرہ کرنا درست نہیں، لیکن اگر کسی نے مالِ حرام سے تجارت کی اور اس سے مختلف منافع حاصل ہوئے تو مالِ حرام کی اصل رقم (غصب، چوری اور رِشوت وغیرہ کی صورت میں) مال کے مالک یا اس کے وارث کو لوٹانے اور بحالت عذر اس کی جانب سے بلا نیت ثواب صدقہ کرنے کے بعد حاصل شدہ منافع کو حرام نہیں کہا جائے گا، لہٰذا اپنے کسی بھی قرض یا مصرف ومقصد میں استعمال کرنے کی اجازت ہوگی، واللہُ أعلم بالصّواب۔

وراثت میں ملنے والے مالِ حرام کے احکام:

اب سوال یہ ہے کہ وراثت میں اگر مالِ حرام ملے تو ورثاء کے لیے تمام مالِ حرام جائز ہے یا بقدرِ حرام صدقہ واجب ہے؟ نیز ورثاء کے غریب یا غنی ہونے کی صورت میں حکم شرعی پر کوئی اثر ہوگا؟ یعنی اگر ورثاء غریب ہوں تو کیا مالِ حرام ان کے لیے استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ورثاء کو یقینی طور پر علم ہی نہیں کہ ہمارے مورث کے مال میں مالِ حرام بھی شامل ہے، تو اس صورت میں ہمارے فقہاء احناف کے یہاں ورثاء کے لیے یہ کل مال حلال ہے، ایسے مال کے استعمال سے وہ گنہگار نہ ہوں گے؛ بلکہ اصل کمانے والا مرحوم گنہگار ہوگا۔

"وَفِیْ الْأَشْبَاہِ: "الْحُرْمَةُ تَنْتَقِلُ مَعَ الْعِلْمِ، إِلَّا لِلْوَارِثِ، إِلَّا إِذَا عَلِمَ بِہٖ" (الشام:۹/ ۵۵۲،ط: زکریا)

لیکن اگر ورثاء کو اس بات کا علم ہے کہ ہمارے مورث (مرحوم) کا کل مال حرام ہے یا اس کے اموال میں مالِ حرام بھی داخل ہے، تو اس صورت میں ورثاء کے لیے اس مال کے حلال وحرام یا استعمال کے جائز وناجائز ہونے کے بارے میں فقہاء احناف کے چار اقوال سامنے آتے ہیں:

(۱) بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی ورثاء کے لیے ترکہ کا مال لینا حلال اور اس کا استعمال جائز ہے۔

(۲) بعض علماء نے فرمایا کہ ورثاء کے لیے ایسا مال بطورِ میراث لینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً حرام ہے، خواہ اس حرام مال کا مالک معلوم ہو یا نہ ہو۔

علاّمہ حصکفی فرماتے ہیں:

"فِی الْمُجتَبیٰ: "مَاتَ وَکَسْبُہٗ حَرَامٌ، فَالْمِیْرَاثُ حَلَالٌ، ثُمَّ رَمَزَ، وَقَالَ: لَا نَأْخُذُ بِھٰذِہِ الرِّوَایَةِ، وَھُوَ حَرَامٌ مُطْلَقًا عَلَی الْوَرَثَةِ، فَتَنَبَّہْ" (الدرالمختار:۹/ ۵۵۳،ط:زکریا)۔

(۳) علاّمہ ابن نجیم مصری فرماتے ہیں کہ وراثت میں ملنے والے مالِ حرام کا اصل مالک معلوم ہو تو ورثاء کے لیے وہ مال حلال اور جائز نہیں، اصل مالک کو واپس لوٹانا لازم ہے؛ لیکن اگر مالِ حرام کا اصل مالک ہی معلوم نہیں تو ورثاء کے لیے وہ مال حلال اور جائز ہے، آپ لکھتے ہیں:

"الْحُرْمَةُ تَتَعَدّیٰ فِی الْأَمْوَالِ مَعَ الْعِلْمِ بِھَا، إِلَّا فِی حَقِّ الْوَارِثِ؛ فَإِنَّ مَالَ مُورَثِہٖ حَلَالٌ لَہٗ، وَإِنْ عَلِمَ بِحُرْمَتِہٖ مِنْہُ، مِنَ الْخَانِیَّةِ، وَقَیَّدَہٗ فِی الظَّھِیرِیَّةِ بِأَنْ لَا یَعْلَمَ أَرْبَابُ الْأَمْوَالِ" (الأشباہ والنظائر:۳۲۰)۔

(۴) چوتھا قول علاّمہ شامی کا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وراثت میں ملنے والے مالِ حرام کی تین صورتیں ہیں:

الف: مالِ حرام کا مالک معلوم ہو تب تو ورثاء کے لیے ایسا مال حلال نہیں، اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے۔

ب: مالِ حرام کا مالک تو معلوم نہیں؛ لیکن متعین طور پر یہ معلوم ہے کہ فلاں فلاں حرام مال ہے، مطلب یہ ہے کہ مالِ حرام مرحوم کے دیگر حلال اموال کے ساتھ مخلوط نہیں؛ بلکہ الگ موجود ہے، تو یہ مال بھی ورثاء کے لیے حلال نہیں، بلکہ اسے اصل مالک کی طرف سے بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے۔

ج: نہ مالِ حرام کا مالک معلوم ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ کونسا مال حرام ہے؟ کیوں کہ مرحوم کے دیگر اموالِ حلال کے ساتھ مالِ حرام ملا ہوا ہے، تو اس صورت میں ورثاء کے لیے یہ مال اگرچہ قضاءً حلال ہے؛ لیکن دیانۃً ترکہ سے اتنے مال کے بقدر صدقہ کرنا لازم ہے، قضاءً حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور شخص مثلاً وصی یا نگران ایسے مال کو صدقہ نہیں کرسکتا اور

نہ ہی ورثاء پر ایسے مال کے سلسلے میں کوئی دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

"وَالْحَاصِلُ أَنَّهُ إِنْ عَلِمَ أَرْبَابَ الْأَمْوَالِ وَجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الْحَرَامِ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صَاحِبِهِ، وَإِنْ كَانَ مَالًا مُخْتَلِطًا مُجْتَمِعًا مِنَ الْحَرَامِ، وَلَا يَعْلَمُ أَرْبَابَهُ، وَلَا شَيْئًا مِنْهُ بِعَيْنِهِ، حَلَّ لَهُ حُكْمًا" (ردّالمحتار:۵/۹۹، باب البیع الفاسد/مطلب ردّالمشتری فاسداً إلی بائعہ فلم یقبلہ)۔

دوسرے مقام پر علّامہ شامی فرماتے ہیں کہ اگرچہ امام صاحب کے نزدیک مرحوم شخص قبضہ کرنے یا خلط کرنے کی وجہ سے مالِ حرام کا مالک تو بن گیا؛ لیکن اس کے ضمان ادا کرنے سے قبل تصرف کرنا جائز نہیں تھا، یہی حکم ورثاء کا بھی ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"وَإِنْ مَلَكَهُ بِالْقَبْضِ وَالْخَلْطِ عِنْدَ الْإِمَامِ؛ فَإِنَّهُ لَا يَحِلُّ لَهُ التَّصَرُّفُ فِيهِ قبل أَدَاءِ ضَمَانِهِ، وَكَذَا لِوَارِثِهِ" (ردالمحتار:۶/۳۸۶، کتاب الحظر والإباحۃ/فصل فی البیع)۔

علّامہ شامی کا یہ قول ہی مناسب ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وراثت میں ملنے والے مالِ حرام کا مالک بھی معلوم نہ ہو، نہ مالِ حرام الگ سے موجود ہو، پھر بھی مالِ میراث سے مالِ حرام کے بقدر صدقہ کردینا اصل مالک کی طرف سے بلا نیت ثواب لازم ہے؛ لیکن اگر ورثاء خود ہی غرباء ہوں تو اس صورت میں اپنے احتیاج کے بقدر فی الحال استعمال کی اجازت ہوگی، البتہ بعد میں جب بھی اللہ تعالیٰ وسعت پیدا فرمادیں تو مالِ حرام کے بقدر غرباء میں صدقہ کردے۔

علّامہ سرخسی نے ایسے شخص کو فقراء سے مقدّم قرار دیا ہے اور اس کا حکم لقطہ کی طرح قرار دیا ہے کہ جیسے وہاں (لقطہ میں) غنی پر اس کا تصدق لازم ہے اور غریب کے لیے اس کے استعمال کی گنجائش ہے، اسی طرح اس مسئلے میں غریب کے لیے اس کی گنجائش ہے، آپ فرماتے ہیں:

"وَحَاجَتُهُ تُقَدَّمُ عَلَىٰ حَقِّ الْفُقَرَاءِ، وَإِنَّمَا قُلْنَا ذٰلِكَ؛ لِأَنَّ حَقَّ الْفُقَرَاءِ فِيْ هٰذَا الْمَالِ بِمَنْزِلَةِ حَقِّهِمْ فِيْ اللُّقْطَةِ" (المبسوط:۱۱/۷۷)۔

حرام آمدنی والے سے معاملات کے احکام:

رہی بات حرام آمدنی والے سے معاملات وغیرہ کی، مثلاً کسی کی آمدنی حرام ہو، اسے کوئی چیز یا سامان بیچ کر مالِ حرام سے قیمت وصول کرنا، یا حرام آمدنی والے کے یہاں کسی قسم کی جائز ملازمت ومزدوری کرکے اس کے مالِ حرام سے اپنی جائز اُجرت وصول کرنا، یا حرام آمدنی والے سے بچّوں کی اسکول، مدرسہ اور علاج وغیرہ کی فیس لینا، یا اس سے چندہ،

ہدیہ اور دعوت وغیرہ قبول کرنا کیسا ہے؟ کیا یہاں بھی امام کرخیؒ کے قول کو بنیاد بنایا جائے گا؟

تو اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے مالِ حرام کی طرح اس کی بھی ممانعت فرمادی کہ حلال، طیب اور پاکیزہ اموال واشیاء کو حرام، خبیث اور ناپاک اموال واشیاء سے نہ بدلا جائے، ارشادِ عالی ہے:

﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾ [النساء:۲]۔

اس کے پیشِ نظر اصل حکم یہ ہے کہ

(۱) جس کی آمدنی کل یا اکثر خالص حرام ہو، یہ بات جانتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ کوئی چیز یا سامان فروخت کرنا، یا اس کے یہاں کسی قسم کی جائز ملازمت ومزدوری کرنا، یا ٹیوشن، اسکول، مدرسہ، ڈاکٹری فیس، یا ہدیہ اور چندہ وغیرہ اس مالِ حرام سے وصول کرنا جائز نہیں۔

(۲) جس کی آمدنی مشتبہ ہو، یا حلال وحرام سے اس طرح ملی ہوئی ہو کہ حلال آمدنی کو حرام آمدنی سے ممتاز اور الگ کرنا مشکل ہو؛ لیکن اکثر غالب آمدنی حلال ہو، اور وہ اسی حلال سے اشیاء وسامان کی قیمت، جائز ملازمت ومزدوری کی اجرت، فیس، ہدیہ، چندہ اور دعوت وغیرہ کرتا ہو تو اس کی اجازت ہے، البتہ کوئی بندہ ذاتی طور پر ایسے لوگوں کے ہاتھ کوئی چیز یا سامان وغیرہ بیچنے اور ان کے یہاں ملازمت ومزدوری کرنے اور ان سے قرض، ہدیہ اور چندہ وصول کرنے اور ان کی دعوت قبول کرنے سے احتیاط کرتا ہو تو اس کے افضل وبہتر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

(۳) جس کی آمدنی کا کل یا غالب حصّہ اگرچہ حرام ہو؛ لیکن اس کے پاس غیر مخلوط مالِ حلال بھی موجود ہے، اور وہ اسی سے سامان وغیرہ کی قیمت یا جائز ملازمت ومزدوری کی اُجرت، قرض، ہدیہ اور چندہ وغیرہ دیتا ہو، یا وہ شخص کسی سے مالِ حلال قرض لے کر سامان وغیرہ کی قیمت، یا ملازمت ومزدوری کی اُجرت ادا کرتا ہو، یا قرض، ہدیہ اور چندہ وغیرہ دیتا ہو تو اس صورت میں اس کی بھی اجازت ہے۔

(۴) جس کی آمدنی کا کل یا اکثر حصّہ حرام ہو، اس کے متعلّق پہلے سے اس کا کوئی علم بھی نہ ہو، اور لاعلمی میں اس سے کوئی سامان بیچ کر قیمت یا جائز ملازمت ومزدوری کی اُجرت اور فیس، قرض، ہدیہ یا چندہ وصول کیا، یا دعوت قبول کی تب بھی شرعاً اس کی اجازت ہے، خواہ بعد میں اس کی آمدنی کے حرام ہونے کا علم ہو جائے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''أَهْدَى إلىٰ رَجُلٍ شَيْئًا، أَوْ أَضَافَهُ، إنْ كَانَ غَالِبُ مَالِهِ مِنَ الْحَلَالِ، فَلَا بَأْسَ، إلَّا أَنْ يَعْلَمَ بِأَنَّهُ حَرَامٌ، فَإِنْ كَانَ الْغَالِبُ هُوَ الْحَرَامَ، يَنْبَغِي أَنْ لَا يَقْبَلَ الْهَدِيَّةَ، وَلَا يَأْكُلَ الطَّعَامَ، إلَّا أَنْ يُخْبِرَهُ بِأَنَّهُ حَلَالٌ وَرِثْتُهُ، أَوْ اسْتَقْرَضْتُهُ مِنْ رَجُلٍ ". كَذَا فِي الْيَنَابِيعِ'' (الفتاوی الھندیۃ:۵/۳۴۲، کتاب الکراھیۃ/

الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)۔

(۵) جس کی آمدنی کا کل یا اکثر حصّہ حرام ہو، اس سے کسی قسم کا ہدیہ، چندہ اور دعوت وغیرہ قبول کرنا تو جائز نہیں؛ البتہ اس سے مالی معاملات کرنے کی امام کرخی کے قول پر عمل کرتے ہوئے دفعًا للحرج گنجائش معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم۔

کسی سے معاملہ کرتے وقت اس کی آمدنی کے حلال یا حرام ہونے کی تحقیق ضروری ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن وسنّت میں عام لوگوں بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی ترغیب وتاکید ہے اور بدگمانی سے بچنے کا حکم ہے، فرمانِ باری ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ [الحجرات:۱۲]

اسی طرح فرمانِ نبوی ہے:

"إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَ أَكْذَبُ الحَدِيْثِ" (مشکوۃ:۴۲۷، بحوالہ: بخاری)۔

اس لیے جب تک کسی کی آمدنی کے بارے میں خالص حرام یا مشتبہ ہونے کا یقینی علم، یا کوئی واضح دلیل یقینی طور پر معلوم نہ ہو اس کے متعلّق حسن ظن رکھنے کا حکم ہے، محض وہم وگمان اور وسوسے کی بنیاد پر بندہ ایسے شخص کی آمدنی کے متعلّق تحقیق وجستجو کا مکلّف نہیں ہے۔

(۲) نیز ایک شخص ایسا کوئی کاروبار، تجارت یا ملازمت کرتا ہے جس کے حلال ہونے میں کوئی شک نہیں، یا کسی ایسی جگہ تجارت وملازمت کرتا ہے جہاں لوگ عموماً حلال ہی کاروبار کرتے ہیں، اس وقت بھی بندہ ایسے شخص کی آمدنی کے متعلّق حلال وحرام کی تحقیق وجستجو کا مکلّف نہیں ہے۔

(۳) البتہ اگر کوئی شخص واقعی مشتبہ تجارت وملازمت کرتا ہے، یا کسی ایسی جگہ تجارت وملازمت کرتا ہے جہاں لوگ عموماً حرام ہی کا معاملہ، تجارت وملازمت کرتے ہیں، تو اس صورت میں بندہ اس بات کا مکلّف ہے کہ صاحب معاملہ سے آمدنی کے حلال وحرام کی تحقیق کرلے، فتاویٰ عالم گیری میں ہے:

"رَجُلٌ اشْتَرَىٰ مِنَ التَّاجِرِ شَيْئًا، هَلْ يَلْزَمُهُ السُّؤَالُ أَنَّهُ حَلَالٌ أَمْ حَرَامٌ؟ قَالُوا:" يُنْظَرُ إِنْ كَانَ فِي بَلَدٍ وَزَمَانٍ كَانَ الْغَالِبُ فِيهِ هُوَ الْحَلَالَ فِي أَسْوَاقِهِمْ، لَيْسَ عَلَى الْمُشْتَرِي أَنْ يَسْأَلَ أَنَّهُ حَلَالٌ أَمْ حَرَامٌ؟ وَيُبْنَىٰ الْحُكْمُ عَلَى الظَّاهِرِ، وَإِنْ كَانَ الْغَالِبُ هُوَ الْحَرَامَ، أَوْ كَانَ الْبَائِعُ رَجُلًا يَبِيعُ الْحَلَالَ وَالْحَرَامَ، يُحْتَاطُ وَيَسْأَلُ أَنَّهُ حَلَالٌ أَمْ حَرَامٌ؟" (الفتاوی الھندیۃ:۳/۲۱۰)۔

حرام آمدنی والے کے ماتحت افراد کے احکام:

شرعی ضابطہ تو سبھی کے لیے برابر ہے کہ حرام کمانا، کھانا اور اپنے کسی بھی طرح کے استعمال میں لانا ناجائز اور گناہ ہے۔

(۱) اس لیے جس گھرانے میں کفیل اور سربراہ کی آمدنی مالِ حرام سے ہو، اس کے ماتحت افراد اور اہل وعیال (جن کی کفالت شرعاً سربراہ کے ذمّہ ہے) کے ذمّہ لازم اور ضروری ہے کہ ادب واحترام اور حکمت ومصلحت کے ساتھ اپنے کفیل اور سربراہ کو مالِ حرام سے مکمّل طور پر اجتناب کی تاکید اور مالِ حلال سے اپنے نان ونفقہ اور اخراجات وضروریات کا مطالبہ کریں، ساتھ ہی توبہ واستغفار اور دعا بھی کریں، نیز سربراہ کے لیے بھی ضروری ہے کہ حلال آمدنی کے ذرائع میسّر آتے ہی حرام کو ترک کردے اور مالِ حلال ہی سے اپنے ماتحت افراد کے مصارف کا انتظام کرے۔

(۲) ماتحت افراد اور اہل وعیال کی مکمّل کوشش کے باوجود ان کا کفیل وسربراہ مالِ حرام سے باز نہیں آتا، تو اگر ماتحت افراد اور اہل وعیال کے لیے شرعی حدود میں رہتے ہوئے کمانا اور مالِ حلال سے اپنے ذاتی اور ضروری مصارف کو برداشت کرنا ممکن ہو تو ان کے لیے اپنے کفیل وسربراہ کے مالِ حرام کو استعمال میں لانا جائز نہ ہوگا۔

(۳) لیکن اگر ماتحت افراد اور اہل وعیال کے لیے اپنے ذاتی اور ضروری اخراجات وضروریات کو برداشت کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ ہو، تو پھر ان کے لیے اپنے کفیل وسربراہ کے مالِ حرام سے بقدرِ ضرورت لینے کی گنجائش ہے، یہی حکم نابالغ اولاد وافراد اور معذور وبوڑھے والدین کے لیے بھی ہے، اس صورت میں مالِ حرام کا گناہ کفیل اور سربراہ پر ہوگا، ماتحت افراد اور اہل وعیال پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

(۴) البتہ ماتحت افراد اور اہل خانہ میں جو بالغ اور خود کفیل ہوں، جو حلال کمانے کی استطاعت وصلاحیت رکھتے ہوں ان کے لیے اپنے کفیل وسربراہ کے مالِ حرام کو استعمال کرنا جائز نہیں، ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے مصارف کا انتظام مالِ حلال سے کریں، ورنہ وہ بھی گنہگار رہوں گے، علّامہ شامی فرماتے ہیں:

"وَفِي جَامِعِ الْجَوَامِعِ: " اشْتَرَى الزَّوْجُ طَعَامًا، أَوْ كِسْوَةً مِنْ مَالٍ خَبِيثٍ، جَازَ لِلْمَرْأَةِ أَكْلُهُ وَلُبْسُهَا، وَالْإِثْمُ عَلَى الزَّوْجِ" (ردّالمحتار علی الدرالمختار: ۶/۱۹۱)۔

والله أعلم، وعلمه أحكم وأتم.

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی اکرم رشید رحمانی ☆

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے بتیسویں فقہی سمینار کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں ایک اہم موضوع ''حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل'' ہے، چنانچہ اس کے ذیل میں کئے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات حسب ذیل ہیں:

جواب (۱):

مذکورہ سوال سے بنیادی طور پر تین باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) آزادی سے پہلے اس علاقہ کے اہل علم کا سود کے تعلق سے حلت کا فتوی۔

(۲) وراثت میں آئے ہوئے مال کے بارے میں حتمی طور پر معلوم نہ ہونا کہ وہ آزادی سے پہلے کمایا ہوا ہے، جب کہ سود کی حلت کا فتوی تھا یا آزادی کے بعد جب کہ سود حرام تھا۔

(۳) اسی وراثت کے مال سے کاروبار کیا اور اسی سے گھر جائداد وغیرہ حاصل ہوئی۔

فقہاء کی عبارات اور اکابر کے فتاوی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ایسا مال جس کے بارے میں حتمی طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے اور نہ ہی اس کی حرمت کا ظن غالب ہو حلال مانا جائے اور اسی کے مطابق احکام متفرع کئے جائیں، چنانچہ ایک جگہ حضرت مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''جب کہ یہ بات یقینی نہیں ہے کہ یہ سامان ہندہ کے خالو نے حرام مال سے حاصل کیا ہے تو اس کا صدقہ کرنا واجب نہیں'' (فتاوی محمودیہ: ۱۸/۱۷۱)۔

اسی طرح ایک جگہ اور تحریر فرماتے ہیں:

''جس کے متعلق یقین یا قرائن سے ظن غالب ہو کہ اس کا تمام مال یا اکثر مال حرام ہے اس سے دعوت کرتا ہے

☆ دار العلوم لوناواڑہ، ضلع: مہی ساگر، گجرات

۔۔۔۔۔تو اس کا قبول کرنا جائز نہیں‘‘ (فتاوی محمودیہ:۱۸/۱۰۵)۔

لہٰذا صورت مسؤولہ میں اگر وارث کو حتمی طور پر معلوم نہ ہو کہ مورث کا مال آزادی سے پہلے کا یا آزادی کے بعد کا اور نہ ہی آزادی کے بعد کے ہونے کے بارے میں ظن غالب ہو تو پھر اس صورت میں وارث کے لئے وہ مال حلال مانا جائے، گا اسی طرح اس مال سے کاروبار کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا نفع اور اس سے خریدی ہوئی جائداد سب حلال ہوں گی۔

حتمی علم یا غالب گمان ہونا:

البتہ اگر وارث کو حتمی یا ظن غالب کے طورر پر معلوم ہو کہ مورث کا یہ مال آزادی کے بعد کا ہے یا اس بارے میں غالب گمان ہو تو اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی عبارات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وارث کو جو مال حرام وراثت میں ملا ہے اس کی کل تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱): وارث کو جتنا مال وراثت میں ملا ہے وہ تمام کا تمام مال حرام ہے۔

(۲): وارث کو جو مال وراثت میں ملا ہے اس میں حلال اور حرام دونوں مخلوط ہوں اور حرام مال بعینہ موجود ہو۔

(۳): وارث کو جو مال وراثت میں ملا ہے اس میں حلال اور حرام دونوں مخلوط ہوں اور نہ حرام مال بعینہ معلوم ہو اور نہ ہی اس کے مالک کا علم ہو۔

پہلی دونوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اگر وارث کو اس مال کے اصل مالک کا علم ہو تو اس کو لوٹا دے، ورنہ حرام مال صدقہ کردے اور یہ حکم اس کے لئے وجوبی ہوگا اور تیسری شکل کا حکم یہ ہے حرام مال کی بقدر رقم (اگر مقدار معلوم نہ ہو تو تخمینہ کرکے) فتوی کے اعتبار سے صدقہ کرنا ضروری نہیں؛ البتہ تقوی کا تقاضہ یہ ہے کہ صدقہ کردے، چنانچہ علامہ شامی رقم فرماتے ہیں:

’’الْحَاصِلُ أَنَّهُ إنْ عَلِمَ أَرْبَابَ الْأَمْوَالِ وَجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الْحَرَامِ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صَاحِبِهِ، وَإِنْ كَانَ مَالًا مُخْتَلِطًا مُجْتَمِعًا مِنْ الْحَرَامِ وَلَا يَعْلَمُ أَرْبَابَهُ وَلَا شَيْئًا مِنْهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، وَالْأَحْسَنُ دِيَانَةً التَّنَزُّهُ عَنْهُ‘‘ (شامی:۵/۹۹،ط:دارالفکر،بیروت)۔

’’لَوْ مَاتَ رَجُلٌ، وَكَسْبُهُ مِنْ بَيْعِ الْبَاذِقِ أَوْ الظُّلْمِ أَوْ أَخْذِ الرِّشْوَةِ يَتَوَرَّعُ الْوَرَثَةُ، وَلَا يَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا، وَهُوَ أَوْلَى لَهُمْ، وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا؛ لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ‘‘ (تبیین الحقائق:۶/۲۷،ط:المطبعۃ الکبری،قاہرہ)۔

اسی طرح اس سلسلہ میں ہمارے اکابر میں سے علامہ تھانویؒ کے چشم کشا فتاوی ملاحظہ ہو:

''ردالمحتار میں اس پر بہت بسط سے بحث کی ہے، حاصل مجموعہ کا یہ ہے کہ اگر کوئی مال حرام علیحدہ رکھا ہے تو وہ بالکل حرام ہے، یعنی اس میں تصرف بھی نافذ نہ ہوگا، پس اگر اس کا مالک معلوم ہے تو اس کو واپس کرنا واجب ہے، اور اگر معلوم نہیں تو لقطہ کی طرح مساکین پر تصدق کردے، اور اگر وہ مال باہم مخلوط ہوگیا تو اگر مالک مستحق معلوم ہے تو اس کا بدل واپس کردے اور اگر مالک بھی معلوم نہیں تو قضاءً اس میں تصرف نافذ ہوسکتا ہے؛ لیکن دیانۃً اس کو حلال نہیں'' (امدادالفتاوی:۹/۱۱۰)۔

دوسری ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''اس روایت سے معلوم ہوا کہ جن سے رشوت لی ہے اگر معلوم ہوں یا کوئی چیز خاص رشوت میں لی ہوئی بعینہ موجود ہو تب تو زید کو انتفاع حلال نہیں، ورنہ فتوی کی رو سے حالال ہے، گو تقوی کے خلاف ہے'' (۹/۱۲۲)۔

دوسری ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''ہر چند کہ بعض فقہاء نے مطلقاً مال حرام کو وارث کے لئے حلال کہا ہے؛ لیکن یہ روایت صحیح نہیں، مفتی بہ اور معتمد یہ ہے کہ ان کے لئے بھی حرام ہے، پس اگر ارباب حقوق ورثہ کو معلوم ہیں تو اگر بعینہ ان کی چیز محفوظ ہو تو اس کو ورنہ اس کی قیمت واپس کردیں، اور اگر معلوم نہیں تو اگر مال حرام معین و متمیز ہے تو اس کو مالک کی نیت سے تصدق کردیں، اور اگر مخلوط غیر متمیز ہے تو اگر اس کی مقدار قیمت معلوم ہے اس کو تصدق کردیں ورنہ تخمینہ کرکے تصدق کردے، انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں مواخذہ نہیں ہوگا'' (۹/۶۰۰)۔

لہٰذا تصدق کے وجوب والی صورتوں میں وارث کے لئے وہ مال حلال نہیں ہوگا اور نہ ہی اس سے کاروبار کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا نفع اور خریدی گئی جائداد حلال ہوں گی، جب تک کہ حرام مال مالک کو نہ لوٹایا جائے یا مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں مال حرام کی کی بقدر رقم تصدق نہ کردے۔

جواب (۲) اور (۷):

سوال نمبر ۲ اور سوال نمبر ۷ میں نتیجہ کے اعتبار سے حکم میں یکسانیت معلوم ہوتی ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوال نمبر ۷ کا جواب بھی سوال نمبر ۲ کے ضمن میں ذکر کردیا جائے۔

مال حرام کا حکم:

جیسا کہ معلوم ہے کہ مال حرام کا حکم یہ ہے کہ مالک معلوم ہونے کی صورت میں اس کو اصل مالک کی طرف لوٹا دیا

جائے اور مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں اس کو یا اس کی قیمت فقراء کو صدقہ کردی جائے، تبیین الحقائق میں ہے:

"وَيَرُدُّونَهَا عَلَى أَرْبَابِهَا إنْ عَرَفُوهُمْ، وَإِلَّا تَصَدَّقُوا بِهَا؛ لِأَنَّ سَبِيلَ الْكَسْبِ الْخَبِيثِ التَّصَدُّقُ إذَا تَعَذَّرَ الرَّدُّ عَلَى صَاحِبِهِ" (تبیین الحقائق:۶/۲۷)۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا فقہاء نے اس حکم کے تعلق سے غنی اور فقیر کے مابین فرق کیا ہے کہ جس کی بنیاد پر فقیر کے لئے الگ حکم بیان کیا جائے؟ تو اس سلسلہ میں فقہاء کے ذکر کردہ احکام کی روشنی میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس مال حرام کا مالک معلوم ہو تو اس کو بہر حال مالک کو لوٹانا ضروری ہے؛ چاہے لوٹانے والا غنی ہو یا فقیر؛ البتہ جب مال حرام کا مالک معلوم نہ ہو، اس صورت میں فقیر کے لئے اس سے اپنی حاجت کے بقدر استفادہ کی گنجائش ہوگی، اسی طرح اس صورت میں اس آدمی کے لئے بھی استفادہ کی گنجائش ہوگی جو حکماً فقیر ہو (یعنی جس کے پاس مال تو بہت زیادہ ہے؛ البتہ وہ تمام مال حرام کا ہے، اور اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی دوسرا مال نہیں ہے تو چونکہ وہ شرعاً کسی چیز کا مالک نہیں ہے، اس لئے اس کو فقیر ہی سمجھا جائے گا)، اسی طرح اگر کسی آدمی کے پاس سب مال حرام ہے اور وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن تجارت کرنے کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں تو اس مال میں سے حلال کمائی کی غرض سے بطور قرض لے سکتا ہے ؛ کیوں کہ جب وہ آدمی اپنی حاجت کے بقدر مال مال حرام میں سے لے سکتا ہے تو روزگار یہ بھی اس کی بنیادی ضرورت و حاجت میں شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے ایسے آدمی کے لئے سودی قرض لینے کی گنجائش رکھی ہے جس کے پاس بنیادی روزگار نہ ہو اور نہ ہی روزگار کے لئے جائز قرض ملنے کی امید ہو، البتہ شرعاً مالک نصاب ہونے کے بعد جو قرض لیا گیا ہے بعد میں اس کا تصدق ضروری ہوگا، مالک نصاب ہونے سے پہلے جو قرض لیا گیا ہے اس کا تصدق ضروری نہیں، چنانچہ اس مسئلہ کی مکمل وضاحت کے لئے شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب کی مندرجۂ ذیل چشم کشا عبارت ملاحظہ ہو:

"و كثيرا ما يقع في زماننا أن ما كسبه المرء مدى سنين طويلة كله حرام عن طريق الربا أو الرشوة و غيرها من التعاملات المحظورة و لا سبيل إلى رد تلك الأموال إلى أصحابها فوجب عليه التصدق بها ثم يوفقه الله سبحانه و تعالى أن يتوب عن الكسب الحرام ولكن ليس عنده مال سواه ليسد به حاجته و حاجة عياله فيحتمل أن يعتبر ذلك المرء فقيرا من حيث أنه لا يملك من المال الحلال شيئا و ما في يده ليس مملوكا له شرعا فتجرى عليه أحكام الفقراء في هذه المسئلة فيجوز له أن يصرف ذلك المال في حاجة نفسه إلى أن يملك نصاب الزكوة من مال حلال و مقتضى ذلك أن ما يصرفه قبل أن يملك النصاب من المال الحلال لايجب عليه التصدق به بعد ما صار غنيا و لكن

يستحب له ذلک ....فإذا ملک النصاب و صار غنيا شرعاً و لا يكفى النصاب لحاجته و حاجة عياله فحينئذ يجوز له الاقتراض مما عنده من المال المكتسب بطريق الحرام بشرط أن يلتزم أداء مثله إلى الفقراء ثم إن هذ الحكم من حل الانتفاع للفقير لحاجته و جواز اقتراضه للغنى بإذن الإمام مختص بالملک الخبيث الذى وجب التصدق به أما المغصوب الذى وجب رده أو رد بدله إلى المالک الأصلى فلا يجوز له أن يصرفه فى حاجة نفسه قبل أداء بدله و لوكان بنية أداء بدله إلى المالک فيما بعد" (فقہ البیوع:۲/۱۰۴۸)۔

حرام جائداد کا کرایہ:

اس سلسلہ میں فقہ حنفی کے مفتی بہ قول اور اکابر کے فتاوی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اگر حرام کاروبار سے بنی ہوئی جائداد کا بدل ادا کر دیا گیا ہو یا اتنی مقدار کا تصدق کر دیا گیا ہو تو اس کا کرایہ اور اس سے حاصل ہونے والا نفع استعمال کرنا درست ہے، ورنہ نہیں، چنانچہ فقہ البیوع میں ہے:

"**الغلة و الربح الذى حصل للغاصب أو كاسب الحرام قبل أدا ء بدله إلى المالک أو قبل التصدق لا يطيب له الانتفاع به حتى يؤدى بدله**" (فقہ البیوع:۲/۱۰۵۳)۔

لہٰذا ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سوال نمبر ۲ اور سوام نمبر ۷ کا جواب اس طرح ہوگا کہ حرام مال کے اصل مالک معلوم ہونے کی صورت میں بہر حال اس کا تصدق ضروری ہوگا، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو غریب کے لئے اس سے استفادہ کی گنجائش ہوگی، یہاں تک کہ شرعاً وہ مالک نصاب ہو جائے، اور اگر نصاب کے مالک ہونے میں بھی واقعۃً اس کو ضرورت درپیش ہو تو ضرورت کے بقدر مال حرام سے قرض لینے کی گنجائش ہے، البتہ بعد میں قرض کی مقدار صدقہ کر دے، نیز حرام جائداد کا بدل یا اس کے بقدر رقم صدقہ کرنے کے بعد اس کا کرایہ طیب ہوگا، اس سے قبل نہیں، اسی طرح ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے، وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے؛ لیکن تجارت کرنے کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں تو اپنے اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرض کو صدقہ کر دے تو اس کی گنجائش ہوگی۔

جواب (۳)

فقہاء عظام کی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سوال میں ذکر کی گئی صورت میں عورت کے لئے شوہر یا بیٹے کی کمائی

استعمال کرنا درست ہے، علامہ شامی رقم فرماتے ہیں:

''اشْتَرَى الزَّوْجُ طَعَامًا أَوْ كِسْوَةً مِنْ مَالٍ خَبِيثٍ جَازَ لِلْمَرْأَةِ أَكْلُهُ وَلُبْسُهَا وَالْإِثْمُ عَلَى الزَّوْجِ'' (شامی:۶/۱۹۱)۔

اسی طرح فتاوی ہندیہ میں ہے:

''وَكَذَا لَوْ اشْتَرَى لَهَا طَعَامًا أَوْ كِسْوَةً مِنْ مَالٍ أَصْلُهُ لَيْسَ بِطِيبٍ فَهِيَ فِي سَعَةٍ مِنْ تَنَاوُلِ ذَلِكَ الطَّعَامِ وَالثِّيَابِ وَيَكُونُ الْإِثْمُ عَلَى الزَّوْجِ'' (فتاوی ہندیہ:۵/۳۷۵)۔

اسی طرح مفتی تقی صاحب ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

جواب: حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اسے کسی حلال ذریعہ سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ واجب ہے، اور جب تک انتظام نہ ہو تو بہ واستغفار کرتی رہے، اور حلال کی فکر و کوشش جاری رکھے'' (فتاوی عثمانی:۳/۶۲۱)۔

حرام کمائی سے تعلیم حاصل کر کے کمانا:

اس سلسلہ میں ایک اصول ''حُرْمَةُ الْفِعْلِ لَا تَنَافِي تَرَتُّبَ الْأَحْكَامِ كَطَلَاقِ الْحَائِضِ وَالْوُضُوءِ بِالْمِيَاهِ الْمَغْصُوبَةِ والإصطياد بقوس مَغْصُوبَة وَالذَّبْحِ بِسِكِّينٍ مَغْصُوبَةٍ والصلوة فِي الْأَرْضِ الْمَغْصُوبَةِ وَالْبَيْعِ فِي وَقْتِ النِّدَاءِ''، اسی طرح جعلی سرٹیفکیٹ کے ذریعہ حاصل ہونے والی نوکری کے نتیجہ میں ملنے والی آمدنی کے بارے میں اکابر کے فتاوی کو سامنے رکھتے ہوئے صورت مسؤولہ میں بچہ کی کمائی کو حلال سمجھا جائے گا۔

جواب (۴)

مذکورہ سوال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسؤولہ میں داعی کی کمائی میں حرام مال تو بہر حال ہے، البتہ مدعو کو اس بات کا علم نہیں کہ داعی کی پوری کمائی حرام ہے یا آدھی حلال ہے اور آدھی حرام؟ تو اس صورت میں فقہاء کی عبارات کی روشنی میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ایسے شخص کی دعوت قبول نہیں کرنی چاہئے؛ کیوں کہ داعی کی کمائی میں کم از کم یہ بات تو ضرور ہے کہ اس کا نصف حرام ہے جیسا کہ سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اور فقہاء نے یہ بات تحریر کی ہے کہ اگر داعی کی کل یا اکثر آمدنی حرام ہو تو اس کی دعوت قبول کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ محیط برہانی میں ہے:

''رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لا ينبغي أن يقبل ويأكل من

طعامه ما لم يخبر أن ذلک المال حلال استقرضه أو ورثه، وإن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل'' (محیط برہانی ۵/ ۶۳۷)۔

اورنصف اگر چہ اکثر نہیں ہے؛ لیکن اس معاملہ میں احتیاطا اس کو اکثر کے ساتھ ملحق کرنا درست معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ فتاوی محمودیہ میں ذکر کردہ مندرجہ ذیل فتوی سے معلوم ہوتا ہے:

''**سوال**: اگر کسی آدمی کے پاس آدھا مال حلال ہے اور آدھا حرام ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا جائز ہے یا نہیں:

جواب: ایسی دعوت سے اجتناب کرنا چاہئے (فتاوی محمودیہ: ۱۸/ ۱۳۳)۔

خلط غیر متمیز کا حکم:

یہاں پر خصوصیت کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مال مخلوط سے دعوت وہدیہ قبول کرنے کے سلسلہ میں جو اصول ذکر کیا ہے کہ اگر حلال مال کی مقدار زیادہ ہو تو اس کی دعوت وہدیہ کو قبول کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں، یہ اس صورت میں ہے جب کہ مال حرام متمیز وجدا ہو، ورنہ اگر مال حرام متمیز نہ ہو تو اس صورت میں غلبہ کے اعتبار سے حکم لاگو نہ ہوگا؛ بلکہ حلال مال کے بقدر رقم سے دعوت وہدیہ قبول کرنا درست ہوگا گو کہ مال حرام کی مقدار زیادہ ہو، چنانچہ اس سلسلہ میں شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب رقم فرماتے ہیں:

''**أما إذا كان الحلال مخلوطا بالحرام دون تمييز أحدهما بالآخر فإنه لاعبرة بالغلبة فی هذه الحالة فی مذهب الحنفية بل يحل الانتفاع من المخلوط بقدر الحلال سواء أكان الحلال قليلا أم كثيرا** ''(فقہ البیوع: ۲/ ۹۹۷)۔

جواب(۵)

جب اس کو دعوت کھانے سے پہلے اس کا علم نہ تھا تو شرعاً وہ گنہگار نہیں ہوگا؛ البتہ اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ اتنی رقم صدقہ کردے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کا اسی قسم کا ایک فتوی نیٹ پر موجود ہے، جس میں صورت مذکورہ کے تعلق سے لکھا ہوا ہے:

''اور اگر غلطی سے کچھ حرام کھالیا ہو تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ سچے دل سے اس سے توبہ کرلے، اور کچھ صدقہ بھی نکال دے''۔

جواب(۶)

سوال نمبر ۲ کے ضمن میں ذکر کردہ بات کی روشنی میں اس کی تدبیر یہ ہوسکتی ہے کہ اگر کسی کے پاس تمام مال حرام ہے

اور بنیادی روزگار کے لئے بھی حلال کا نظم نہیں ہے، تو وہ آدمی اپنے پاس موجود مال حرام سے قرض لیکر اس سے کاروبار کرے ،اور پھر مال حرام کے بقدر رقم صدقہ کرتا رہے؛ البتہ اس کو حرام مال کے نتیجہ میں جو نفع حاصل ہوا ہے اس کا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے تو آہستہ آہستہ اس کا تمام مال حرام صدقہ ہو جائے گا اور اس نفع میں حاصل ہونے والا موجودہ تمام مال حلال مانا جائے گا، اسی طرح فقہاء نے مال حرام کی جن صورتوں میں اداء بدل کو لازم قرار دیا ہے ان میں بدل ادا کرنے کے بعد وہ مال حلال مانا جائے گا۔

جواب (۸)

شریعت کا ایک بنیادی اصول ہے کہ جیسے گناہ کرنا حرام ہے، اسی طرح گناہ میں تعاون کرنا بھی ممنوع ہے، اس لئے جیسے حرام کاروبار ممنوع ہے، اسی طرح حرام کاروبار میں تعاون بھی ممنوع ہے، لہٰذا اگر کام کرنے والے کو حرام کاروبار کا بھی حساب کتاب وغیرہ لکھنا پڑتا ہو تو ایسی ملازمت شرعاً درست نہیں ہوگی۔

جواب (۹): حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد میں کھیتی باڑی کرنا:

اصولی طور پر جس آدمی نے حرام کمائی سے جائداد خریدی ہے خود اس کے لئے اس میں کھیتی باڑی کرنا اور اس سے استفادہ کرنا گناہ ہے، چنانچہ فتاوی محمودیہ میں ہے:

''جس چیز وزمین کے متعلق معلوم ہو کہ یہ چوری کی ہے، اس کا استعمال کرنا، کھانا، پینا سب ناجائز ہے'' (فتاوی محمودیہ: ۱۸/ ۴۳۷)۔

لہٰذا کھیت میں کام کرنے والے کو اگر معلوم ہو کہ یہ جائداد حرام کمائی سے خریدی ہوئی ہے تو اس کے لئے اعانت علی المعصیت کے پیش نظر اس میں کھیتی باڑی کرنا درست نہ ہوگا۔

حرام کمائی والے کے ساتھ سفر کرنا:

اصولی طور پر حرام آمدنی والے کے ساتھ کار یا بائیک پر سفر کرنا حلال ہوگا اور اگر اس کے ساتھ سفر کرنے میں یہ امید ہو کہ اس کو حرام سے بچانے اور حلال کی تلقین وتبلیغ کا موقع ملے گا تو پھر یہ مستحسن ہوگا اور اگر ترک سفر کی وجہ سے اصلاح کی توقع ہو تو پھر اس کے ساتھ سفر نہ کیا جائے، غرض حالات، ماحول اور تعلق کو دیکھتے ہوئے مبتلی بہ اصلاح حال کا جو طریقہ مناسب سمجھے وہ اختیار کرے، چنانچہ فتاوی محمودیہ کے مندرجۂ ذیل فتوی سے بھی صورت مسؤولہ کے حکم کا استیناس کیا جا سکتا ہے:

''جوشخص مبتلائے فسق ہواوراس کوسلام کرنے یااس کی دعوت قبل کرنے سے اس کی اصلاح کی توقع ہوتواس کوسلام بھی کیا جائے اوردعوت بھی قبول کی جائے۔۔۔اگرترک سلام یاترک دعوت سے اصلاح کی توقع ہوتوترک کردیں'' (فتاوی محمودیہ:۱۸/ ۱۲۴)۔

حرام کمائی والے کے گھر نوکری اوران کے بچوں کی فیس:

کام کرنے والے کواگرناجائز کام نہ کرنا پڑتا ہواوراس کی تنخواہ یافیس مال حرام سے نہ دی جاتی ہوتوایسے گھر میں نوکری کرنے،اسی طرح ان کے بچوں سے فیس لینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛البتہ اگرتنخواہ یافیس حرام کمائی سے دی جاتی ہوتو پھراس سلسلہ میں یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس سوال کوفقہاء کے ایک اصول کہ حرمت متعدی ہوتی ہے یانہیں کو سامنے رکھ کرحل کیا جائے،چنانچہ اس سلسلہ میں ذکرکی گئی فقہاءعظام کی عبارات کوسامنے رکھ کرمعلوم ہوتا ہے کہ جس آدمی کے پاس مال حرام پہونچے،چاہے بطریق عوض ہو یا بطریق ہبہ؛اگراس آدمی کواس مال کے متعلق معلوم ہوکہ یہ حرام ہےتو اس کے لئے نہ ثمن کےطور پراس کوقبول کرنادرست ہوگا،اورنہ ہی اجرت کےطور پر،اس سلسلہ میں،علامہ شامی لکھتے ہیں:

''وَمَا نُقِلَ عَنْ بَعْضِ الْحَنَفِيَّةِ مِنْ أَنَّ الْحَرَامَ لَا يَتَعَدَّى إلَى ذِمَّتَيْنِ سَأَلْت عَنْهُ الشِّهَابَ ابْنَ الشَّلَبِيِّ فَقَالَ: هُوَ مَحْمُولٌ عَلَى مَا إذَا لَمْ يَعْلَمْ بِذَلِكَ، أَمَّا مَنْ رَأَى الْمَكَّاسَ يَأْخُذُ مِنْ أَحَدٍ شَيْئًا مِنْ الْمَكْسِ، ثُمَّ يُعْطِيهِ آخَرَ ثُمَّ يَأْخُذُهُ مِنْ ذَلِكَ الْآخَرِ فَهُوَ حَرَامٌ'' (شامی:۶/ ۳۸۵)۔

البتہ صورت مسؤولہ کے تعلق سے ہمارے اکابر کے دونوں طرح کے فتاوی موجود ہیں،بعض فتاوی سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مال حرام سے اجرت یاثمن کےطور پر دیا جائے تو بائع یااجیر کے لئے اس کوقبول کرنا درست ہے جب کہ زیادہ تر فتاوی اس بات پر دال ہیں کہ مال حرام سے ثمن یااجرت قبول کرنا درست نہیں ہے:

جواز پر مبنی فتاوی:

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ایک جگہ ہے:

''**سوال**: ایک شخص تجارت کرتا ہے،اس کورنڈی یادیگرناجائز آمدنی والوں کوسوداد یکر قیمت لینا جائز ہے یانہیں؟

جواب: فتوی کی روسے ایسے لوگوں کے ہاتھ سودابیچنااور قیمت لیکراپنے صرف میں لانادرست ہے،البتہ مقتضائے تقوی یہ ہے کہ احتیاط کرے'' (فتاوی دارالعلوم دیوبند:۱۴/ ۳۹۸،ط:دارالاشاعت کراچی)۔

اسی طرح دارالعلوم دیوبند کے سابق مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

'' آمدنی اگرچہ سب ناجائز ہو،لیکن جب تک متعین طور پرمعلوم نہ ہوجائے کہ جو چیز یہ فروخت کررہا ہے یہ حرام و

ناجائز کی ہے، یا جو قیمت یہ دے رہا ہے وہ حرام و ناجائز پیسے کی ہے اس کے ہاتھ خرید وفروخت کا ناجائز ہونا ضروری نہیں اور نہ اس سے حاصل شدہ رقم کا حرام و ناجائز ہونا ضروری ہے'' (منتخبات نظام الفتاوی: ۳/ ۸۵، ط: ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی)۔

عدم جواز پر مبنی فتاوی:

حضرت مفتی رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں:

'' تاجر کو حرام مال والے کے ہاتھ فروخت کرنا حرام، اس کا مال حرام ہوتا ہے'' (باقیات فتاوی رشیدیہ، ص: ۳۷۰، ط: حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی)۔

علامہ تھانویؒ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

'' جن کی آمدنی بالکل خالص حرام ہے، جیسے کسبی یا مئی فروش یا سودخور وغیرہم ان کی نوکری کرنا ناجائز ہے، اور جو تنخواہ اس میں سے ملتی ہے وہ حلال نہیں، اور اسی طرح اپنی چیز اس کے ہاتھ فروخت کر کے اسی مال حرام میں سے قیمت لینا بھی حلال نہیں'' (امداد الفتاوی: ۷/ ۳۸۲، ط: زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

'' اموال مخلوطہ جس میں اکثر حصہ مغصوب یا ربوا یا رشوت ہو بتصریح فقہاء دوسرے کے لئے بھی ویسے ہی حرام ہے جیسے پہلے کے لئے، حالانکہ تبدل ملک یہاں بھی ہے'' (امداد الفتاوی: ۶/ ۱۹۲، ط: زکریا بک ڈپو دیوبند)۔

ترجیح:

اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ کی اصولی تصریحات، نیز بیشتر اکابر کے فتاوی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ فیس لینے والے کو اگر معلوم ہو کہ حرام پیسے سے فیس ادا کر رہا ہے تو فیس لینا درست نہیں ہے، چنانچہ مفتی تقی عثمانی صاحب کی مندرجۂ ذیل عبارت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے:

''المال المغصوب و ما فی حکمه مثل ما قبضه الإنسان رشوة أو سرقة أو بعقد باطل شرعا لا یحل له الانتفاع به ولا بیعه ولا هبته و لا یجوز لأحد یعلم ذلک أن یأخذه منه شراء أو هبة أو إرثا''

(فقہ البیوع: ۲/ ۱۰۵۲)۔

البتہ اس سے غیر مسلم کا حکم مستثنی ہوگا، یعنی کافر اجرت میں حرام پیسے ادا کرے تو اس سے وصول کرنا درست ہوگا، علامہ ظفر احمد عثمانی اپنی مایۂ ناز کتاب اعلاء السنن میں رقم فرماتے ہیں:

''فهذا عمر قد أجاز لأهل الذمة بیع الخنازیر و الخمر و أجاز للمسلمین أخذ أثمانهما فی الجزیة و الخراج و ذلک بمحضر من الصحابة و لم ینکر علیه منکر'' (اعلاء السنن: ۱۴/ ۱۳۵، ط: دار الکتب

العلمیۃ، بیروت، لبنان)۔

جواب (۱۰) سودی رقم رشوت میں دینا:

فقہاء نے مال حرام کا یہ حکم بیان کیا ہے کہ اگر اس کا اصل مالک معلوم ہو تو اس کو لوٹا دیا جائے، ورنہ بغیر ثواب کی نیت کے فقراء کو صدقہ کر دیا جائے اور سودی رقم رشوت میں دینے کی صورت میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں پائی جاتی، لہٰذا صورت مسؤ ولہ میں سود کی رقم دینے کی اجازت نہیں ہوگی، چنانچہ رشوت میں سودی رقم دینے کے عدم جواز کے سلسلہ میں ہمارے اکابر کے فتاوی ملاحظہ ہوں:

کتاب الفتاوی میں ہے:

''تعمیر مکان کے لئے جو قانونی لوازم ہیں ان کو پورا کرنے کے باوجود کوئی افسر محض رشوت کے لئے تعمیر مکان کی اجازت نہیں دیتا تو ایسی صورت میں اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے۔۔۔۔۔۔۔البتہ اس میں سود کی رقم نہیں دی جاسکتی؛ کیوں کہ سود کی رقم حکومت سے حاصل کی جاتی ہے، اور رشوت ایک سرکاری آفیسر شخصی طور پر حاصل کرتا ہے، حکومت حاصل نہیں کرتی'' (کتاب الفتاوی: ۵/ ۳۱۰)۔

محمود الفتاوی میں ہے:

''این اے کی کارروائی میں جتنی رقم قانونی طور پر حکومت وصول کرتی ہے، اس میں حکومتی بینک سے ملی ہوئی سودی رقم ادا کر سکتے ہیں؛ لیکن افسران کو دی جانے رشوت میں نہیں دی جاسکتی، اس لئے کہ اس صورت میں وہ رقم حکومت کے پاس نہیں جاتی'' (محمود الفتاوی: ۳/ ۲۷)۔

جواب (۱۱)

صورت مسؤ ولہ کا حکم یہ ہوگا کہ جس شخص نے کوئی چیز ہبہ کی ہو اگر اس کے متعلق ظن غالب ہو کہ اسکی کل یا اکثر آمدنی حلال ہے تو اس کے ہبہ کو قبول کرنے، نیز ایسے شخص کی ہبہ کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرنا درست ہوگا، اور اگر ظن غالب ہو کہ اس کی اکثر آمدنی حرام ہے تو پھر اس کے ہبہ کو قبول کرنے اور ہبہ کی ہوئی چیزں کو استعمال کرنا درست نہیں:

''رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لا ينبغي أن يقبل ويأكل من طعامه ما لم يخبر أن ذلك المال حلال استقرضه أو ورثه، وإن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل'' (محیط برہانی ۵/ ۳۶۷)۔

الموافقات میں ہے:

"فَإِنَّ الشَّارِعَ قَدْ أَجْرَى الظَّنَّ فِي تَرَتُّبِ الْأَحْكَامِ مَجْرَى الْقطع "(الموافقات:۱/۵۱۹)۔

جواب(۱۲)

جس کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کرنے کے لئے کہتا ہے تو شرعاً اس کی گزارش قبول کرنے کی گنجائش ہے ،ہاں اگر اس کی وجہ سے کوئی اور شرعی محظور لازم آئے تو اور بات ہے، نیز یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حدیث میں اس کی دعا کے قبول نہ ہونے کی بات آئی ہے، نہ یہ کہ اس کے حق میں کسی کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق بعض سوالات کے جوابات

مولانا محمد ممتاز خان ندوی☆

تمہید:

قرآن وحدیث میں حلال کمائی حاصل کرنے اور حلال کمائی کھانے کی بڑی تاکید اور فضیلت بتائی گئی ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ہے:

"یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبَاتِ مَااَحَلَّ اللّٰهُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ وَکُلُوْامِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلَالاًطَیِّباًوَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِیْ کُنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ" (سورۂ مائدہ:۸۷)

(اے ایمان والو! اللہ نے تمہارے لئے جو پاکیزہ چیزیں حلال کی ہیں، ان کو حرام قرار نہ دو، اور حد سے تجاوز نہ کرو، یقین جانو کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور اللہ نے تمہیں جو رزق دیا ہے، اس میں سے حلال یا پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور جو اللہ پر تم ایمان رکھتے ہو، اس سے ڈرتے رہو)۔

سورۂ بقرہ کی آیت ہے:

"فَکُلُوْا مِمَّارَزَقَکُمُ اللّٰهُ حَلَالاًطَیِّباًوَاشْکُرُوْا لله اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ" (سورۂ بقرہ:۱۷۲)۔

(لہٰذا اللہ نے جو حلال یا پاکیزہ چیزیں رزق کے طور دی ہیں انہیں کھاؤ، اور اللہ کا شکر ادا کرو، اگر تم واقعی اسی کی عبادت کرتے ہو)

بخاری شریف کی روایت ہے:

"عَنِ الْمِقْدَامِؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :مَا أَکَلَ أَحَدٌ طَعَاماًقَطُّ خَیْراًمِنْ أَنْ یَأْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِهٖ وَاِنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَیْهِ السَّلَامِ کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِهٖ" (بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ، حدیث نمبر:۲۰۷۲)۔

☆ مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور۔ رائے بریلی۔ یوپی

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی کے لئے بھی اس کے ہاتھ کی کمائی کے کھانے سے بہتر کوئی کھانا نہیں ہے، اور یہ کہ اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے)۔

اس کے برعکس حرام کمائی اور حرام کمائی کے کھانے کی بڑی مذمت آئی ہے۔

سورۂ نساء میں ہے:

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ منکم" (سورۂ نساء:۲۹)۔

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے نہ کھاؤ، اِلا یہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے)

مسند احمد کی روایت ہے:

"قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَاَنْ یَأْخُذَ تُرَاباً فِیْ فِیْہِ خَیْرٌ لَہُ مِنْ أَنْ یَجْعَلَ فِیْ فِیْہِ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ" (مسند احمد، حدیث:۷۴۸۲)۔

(اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں کوئی مٹی لے، اور اپنے منھ میں ڈالے، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسی چیز منھ میں ڈالے، جو اس پر اللہ تعالیٰ نے حرام فرمادی ہے)۔

سنن ترمذی کی روایت ہے:

" قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ..... لَا یَرْبُوْ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ إِلَّا کَانَتِ النَّارُ أَوْلیٰ بِہِ" (سنن ترمذی، کتاب الزکوۃ، باب ما ذکر فی الرخصۃ للجنب فی الأکل والنوم إذا توضأ، حدیث:۶۱۴)۔

(اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں وہ گوشت اور خون داخل نہیں ہوگا، جو حرام سے پلا ہو، اس کے لئے تو دوزخ ہی مناسب ہے)۔

مذکورہ آیتوں اور حدیثوں سے معلو ہوتا ہے کہ حلال کمائی حاصل کرنے اور حلال کمائی کھانے کی کتنی تاکید آئی ہے، اور اس کے برعکس حرام کمائی جمع کرنے اور حرام کمائی کھانے کی کتنی مذمت آئی ہے۔

زیر نظر مقالہ میں حرام کمائی اور حرام کمائی کھانے سے متعلق فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے ارسال کردہ سوالات کے جوابات قرآن وحدیث اور فقہی عبارتوں کی روشنی میں دینے کی اپنی بساط کے مطابق حقیر کوشش کی جائے گی، اللہ تعالیٰ اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے۔ آمین

جواب نمبر ۱:

آباء واجداد سے جو حرام مال وراثت میں ملا، لیکن اس کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ آزادی سے پہلے کمایا ہے یا بعد میں، حدیث اور فقہی اصول سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب حلال وحرام ایک ساتھ جمع ہوجائیں، اور حرمت وحلت کا کوئی پہلو یقین کے ساتھ ثابت نہ ہو، تو ایسی صورت میں حرمت والا پہلو راجح ہوجائے گا، اور ایسی چیز کو حرام ہی قرار دیا جائے گا۔

مسلم شریف کی روایت ہے:

"فَإِنْ وَجَدْتَ مَعَ كَلْبِكَ كَلْبًاغَيْرَهُ وَقَدْ قَتَلَ فَلَا تَأْكُلْ فَإِنَّكَ لَا تَدْرِىْ أَيُّهُمَاقَتَلَ" (مسلم، کتاب الصید والذبائح ومایؤکل من الحیوان حدیث نمبر: ۱۹۲۹)۔

(اگر تم اپنے سدھائے ہوئے کتے کے ساتھ دوسرے کتے کو پاؤ، اور شکار مرگیا ہے، تو تم اس کو نہ کھاؤ، کیونکہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ ان دونوں کتوں میں سے کس نے جانور کو مارا ہے)۔

مشہور فقہی اصول ہے:

"إذ ااجتمع الحلال والحرام رجح بالحرام" (ردالمحتار علی الدر ۱/ ۳۱۹، کتاب الطھارۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت)

(جب حلال وحرام ایک ساتھ جمع ہوجائیں، تو حرام کو ترجیح دی جائے گی)۔

حدیثوں اور فقہی اصول سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ وراثت کے مال میں حلال وحرام دونوں پہلو جمع ہوگئے ہیں، اور کوئی پہلو یقین کے ساتھ ثابت نہیں ہے، لہٰذا وراثت میں جو مال ملا ہے، اس کو حرام ہی قرار دیا جائے گا۔

جو حرام مال وراثت میں ملا ہے، اگر اس کو حلال طریقہ سے تجارت میں لگایا، اور مال کو بڑھایا، تو شرعی حکم یہی ہے کہ وراثت میں جتنا حرام ملا تھا، اس کو فقراء میں صدقہ کردے، اور تجارت کی وجہ سے جو مال بڑھا ہے، وہ اس کے لئے حلال ہوگا۔

فقہ حنفی کی مشہور ومعتمد علیہ کتاب: ردالمحتار میں ہے:

"مات وكسبه حرام فالميراث حلال ثم رمز وقال لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقاًعلى الورثة" (ردالمحتار علی الدر ۷/ ۲۲۳، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد تحت مطلب من ورث مالاً حرام)

البتہ اگر وراثت میں جو حرام مال ملا ہے، اگر حرام مال تھوڑا ہو، اور حلال مال کی مقدار زیادہ رہی ہو، تو ایسی صورت میں جو مال وراثت میں ملا ہے، وہ سب کا سب حلال ہوگا۔

فقہ حنفی کی مشہور ومعتمد علیہ کتاب: ہندیہ کی عبارت سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے:

"أهدى إلى رجل شيئاًأو أضافه إن كا ن غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام

فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية ولا بأس بأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثه أو استقرضه من رجل كذا في الينابيع ،ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع لابأس به لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم كذا في الاختيار شرح المختار " (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۲، کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)۔

(ایک آدمی نے کسی کو کوئی چیز ہدیہ کی، یا اس کی ضیافت کی، اگر اس کا غالب مال حلال ہے، تو اس کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر یہ کہ وہ جان جائے کہ وہ حرام مال سے ہے، اور اگر غالب مال حرام ہے، تو ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہئے، اور کوئی حرج نہیں ہے کھانا کھانے میں، مگر اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ حلال مال ہے، جس مال کا وہ وارث ہوا ہے، یا اس نے کسی سے قرض لیا ہے، اسی طرح ینابیع میں ہے، اور ظالم بادشاہوں کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ زیادہ تر مال حرام ہی ہوتا ہے، مگر یہ کہ وہ جان جائے کہ اس کا اکثر مال حلال ہے، اس طور پر کہ وہ تاجر ہے، یا کسان ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ لوگوں کا مال تھوڑا حرام ہونے سے خالی نہیں ہوتا ہے، تو اعتبار غلبہ کا ہوگا، اور اسی طرح ان کا کھانا کھانا ہے، اسی طرح مختار کی شرح اختیار میں ہے)۔

جواب نمبر ۲:

ایک غریب شخص کی پوری جائداد اور پورا مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اور اسی حرام جائداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، راقم کے نزدیک اگر ایسا شخص غریب ہے اور کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں ہے، تو ایسا شخص اپنی ضرورت کے بقدر جائداد اور حرام مال کا مستحق ہوسکتا ہے، اور اپنی ضرروت سے جو زیادہ ہو، اس کو غریبوں میں تقسیم کردے، اس کی تائید سورۂ بقرہ کی درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے۔

"**فَمَنُ اضُطُرَّ غَيُرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثُمَ عَلَيُهِ**" (سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳)۔

(ہاں اگر کوئی انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو (اور وہ ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) جبکہ اس کا مقصد نہ لذت حاصل کرنا ہو، اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے)۔

معارف السنن میں ہے:

"**من ملك بملك خبث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصرف على الفقراء** " (معارف السنن ۱/ ۲۴)۔

(جو شخص حرام مال کا مالک ہو، اور اس کو مالک تک لوٹانا ممکن نہ ہو، تو اس کا راستہ فقراء میں صرف کرنا ہے)۔

زادالمعاد میں ہے:

"ولكن خبثه لخبث مكثه ،لا لظلم من أخذ منه فطريق التخلص منه وتمام التوبة بالصدقة به، فإن كان محتاجاً فله أن يأخذ قدر حاجته ويتصدق بالباقي فهذا حكم كل كسب خبيث لخبث عوضه" (زادالمعاد ۵/ ۷۷۸)۔

رہا مسئلہ حرام جائداد سے جو کرایہ آرہا ہے، تو چونکہ جائداد حرام مال سے حاصل شدہ ہے، لہذا اس سے جو کرایہ آرہا ہے، وہ بھی حرام ہوگا، اور اس کا استعمال جائز نہیں ہوگا، فقہ حنفی کی مشہور کتاب: ردالمحتار میں ہے:

"كما لو غصب عبداً و آجره فنقص في هذه الإجارة بالاستعمال وهذا ساقط من نسخ الشرح لدخوله تحت قوله وإن استعماله فنقصه الاستعمال أو آجر المستعار ونقص ضمن النقصان وتصدق مما بقي من الغلة والأجرة" (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۱۸۸)۔

اگر ایسے شخص کا کوئی دوسرا ذریعہ معاش نہیں ہے، اس کا گذر بسر اسی کرایہ کی رقم سے ہوتا ہے، تو ایسا شخص اپنی ضرورت کے بقدر کرایہ کی رقم کو حرام اور ناپاک سمجھتے ہوئے استعمال کرسکتا ہے، اور جو بچ جائے، اس کو غریبوں میں بلا نیت ثواب صدقہ کردے، لیکن اسے چاہئے کہ وہ حلال رزق کی جستجو میں رہے، اور جیسے ہی کوئی حلال ذریعہ مل جائے، تو کرایہ کی رقم کا استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا، بلکہ جائداد اور اس سے جو کرایہ آرہا ہے، غریبوں میں صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

اس کی تائید حضرت مولانا یوسف صاحب لدھیانویؒ کی درج ذیل تحریر سے بھی ہوتی ہے:

''جو لوگ بینک میں ملازم ہیں، ان کو چاہئے کہ جب تک بینک میں سودی نظام نافذ ہے، اپنے پیسے کو گناہ اور اپنی تنخواہ کو ناپاک سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں، اور کسی جائز ذریعہ معاش کی تلاش میں رہیں، جیسے ہی جائز ذریعہ معاش مل جائے، تو فوراً بینک کی نوکری چھوڑ کر اس کو اختیار کرلیں'' (آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۲۱۵)۔

جواب نمبر ۳:

شوہر یا بیٹا حرام طریقہ سے کمائی کررہا ہے، ماں یا بیوی اس کی ماتحتی میں ہے، وہ بھی اس کی کمائی کھا رہی ہے، ماں یا بیوی کے منع کرنے کے باوجود وہ باز نہیں آرہا ہے، تو ایسی صورت میں بھی شوہر یا بیٹے کی کمائی ان کے لئے حرام ہے، ماں یا بیوی جہاں تک ہوسکے، اس کی کمائی کھانے سے بچے اور بچنے کا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ماں یا بیوی دوسروں کے گھروں میں کام کاج کرے، یا اپنے گھر ہی میں دوسرا کام جیسے سلائی، کڑھائی یا مٹھائی وغیرہ کے ڈبے بنا کر تیار کرے، یا اگر پڑھی لکھی ہے، تو بچوں کو ٹیوشن پڑھا دیا کرے، اور اس سے جو پیسہ آئے، اس سے اپنا گذر بسر کرے، شریعت میں اس کی نظیر یہ ہے کہ جس

عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہو، اور شوہر نے مال نہیں چھوڑا ہے، اور بیوی کے پاس بھی کچھ نہیں ہے، تو وہ دن اور رات کے کچھ حصہ میں نکل کر کام کاج کرے گی، اور اس سے اپنا گذر بسر کرے گی۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**تخرج نهاراًأو بعض الليل ولا يبيت في غير منزلها**" (ہندیہ ۱/ ۵۳۴)۔

(جس عورت کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہو، وہ دن یا رات کے بعض حصہ میں نکلے گی، اور اپنے گھر کے علاوہ دوسری جگہ رات نہیں گذارے گی)۔

اگر گھر میں یا گھر کے باہر نکل کر کام کاج کی کوئی سبیل نظر نہ آرہی ہو، تو ایسی صورت میں شوہر یا بیٹے کی اتنی کمائی پر گذر بسر کرے گی، جو اس کے لئے ضروری ہو، لیکن دل میں اس کے مال اور اسکی کمائی کو حرام ہی سمجھے، اور استغفار کرتی رہے۔

درمختار میں ہے:

"**وفي الجامع اشترى الزوج طعاماًأو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكلها ولبسها والإثم على الزوج**" (درمختار ۶/ ۱۹۱)۔

(اور جامع صغیر میں ہے، شوہر نے کھانا یا کپڑا حرام مال سے خریدا، تو بیوی کے لئے اس کا کھانا اور پینا جائز ہوگا، اور گناہ شوہر پر ہوگا)۔

حرام مال سے بچوں کو پڑھایا:

رہا مسئلہ یہ کہ اگر حرام مال سے بچوں کو پڑھایا، اب بچہ کمائی کر رہا ہے، اس بابت راقم کی رائے یہ ہے کہ جتنا حرام مال بچہ کی پڑھائی میں لگایا ہے، اس کا اندازہ لگا کر اتنے پیسے بچہ کی کمائی سے صدقہ کر دیئے جائیں، اس کی تائید: البحر الرائق کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے۔

"**لو مات رجل من كسبه من ثمنها الباذق والظلم وأخذ الرشوة تعود الورثة ولا يأخذون منه شيئاً وهو الأولىٰ ويردونه على أربابه إن عرفوهم وإلا تصدقوابه ،لأن سبيل الكسب التصدق إن تعذر الرد**" (البحر الرائق ۸/ ۳۶۹۔ کتاب الکراھیۃ)

جواب نمبر ۴:

ایسی دعوت میں شرکت کرنے اور کھانے سے احتیاط کرنی چاہئے، تاکہ داعی اور جو لوگ حرام کاروبار میں مبتلا ہیں،

ان کے لئے درس عبرت ہو،طبرانی کی روایت ہے:

"عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ :نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ إِجَابَةِ طَعَامَ الْفَاسِقِيْنَ " (المعجم الکبیر للطبرانی ۱۸/ ۱۶۸)۔

(حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے،فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فاسقوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے)۔

البتہ علماء کرام اور داعی عظام کو ایسی دعوت میں خواہ فتنہ کا اندیشہ ہی کیوں نہ ہو،شریک ہونے اور کھانا کھانے سے سے احتیاط کرنی چاہئے ،تاکہ عوام کا علماء کرام اور داعیان عظام پر اعتماد بحال رہے،اس کی تائید ہدایہ کی شرح فتح القدیر کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"فإن كان مقتدى ولم يقدر على منعهم يخرج ولا يقعد" (فتح القدیر ۸/ ۴۴۸)۔

(اگر وہ مقتدی ہے،اور وہ لوگوں کو برائی سے روکنے پر قادر نہیں ہے،تو وہ دعوت کی محفل سے نکل جائے،اور نہ بیٹھے)۔

اس کی تائید سنن ابی داؤد کی روایت سے ہوتی ہے:

"عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَؓ أَنَّ رَجُلاًقَتَلَ نَفْسَهُ بِمُشَاقِصَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَّا أَنَا فَلَا أُصَلِّيْ عليه" (سنن نسائی۔کتاب الجھاد۔باب ترک الصلوۃ علی من قتل نفسہ،حدیث نمبر:۱۹۶۶)۔

(حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے آپ کو چھری سے ہلاک کرلیا،تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا)

جواب نمبر ۵:

اگر ایک شخص نے کسی کے یہاں دعوت کھائی،دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا کاروبار بالکل حرام ہے،تو ایسا شخص توبہ واستغفار کرے،اللہ کے یہاں ایسے شخص کا ان شاء اللہ کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوگا،بہتر یہ ہے کہ جتنا کھانا کھایا ہے،اس کا اندازہ کرکے غریبوں میں اتنے پیسے صدقہ کردے۔

سنن ابن ماجہ کی روایت ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَوَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْاعَلَيْهِ " (سنن ماجہ،کتاب الطلاق باب طلاق المکرہ والناسی،حدیث نمبر:۲۰۴۳)۔

(اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا اور نسیان اور جس پر اس کو مجبور کیا گیا ہو،معاف کردیا ہے)۔

درمختار میں ہے:

"الحرمة تتعدد مع العلم بها و فی الشامیة تحته وما نقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لا تتعدی ذمتین سألت عن بن الشلبی فقال هو محمول علی ماإذا لم یعلم بذلک"(درمختار ۱۴۶/۴)۔

اس بابت دارالعلوم دیوبند کا فتوی بڑا واضح اور بے غبار ہے، استفادہ کی غرض سے استفتاء وفتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

سوال: انجانے میں کسی نے حرام مال کھلا دیا، تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب "اگر کھانے والے کو معلوم نہیں تھا، اس کی لاعلمی میں کسی نے حرام مال کھلا دیا، تو توبہ واستغفار کرے" (فتاوی دارالعلوم دیوبند فتوی نمبر (174659))

جواب نمبر ۶:

اگر ایک شخص کے پاس حرام روپئے ہیں، اور اس سے کوئی مکان یا دوکان یا کوئی سامان خرید رہا ہے، اور اس نے حرام روپئے کی طرف اشارہ کر کے مکان یا دوکان وغیرہ خریدی، اور ثمن میں پھر وہی حرام روپئے ادا کر دیئے، تو ایسی صورت میں ضرور حرام روپیوں کی خباثت خریدی ہوئی چیز تک پہنچے گی، اور اس زمین یا مکان یا سامان سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہوگا، لیکن اگر حرام روپئے دکھائے بغیر مطلقاً روپیوں سے خریداری کی، اور پھر ثمن میں حرام روپئے ادا کر دیئے، تو ایسی صورت میں امام کرخیؒ کے قول کے مطابق جو کہ مفتی بہ قول ہے، حرام روپئے چونکہ ان کی طرف اشارہ کئے بغیر ثمن متعین کیا گیا، تو ایسی صورت میں جب حرام روپئے ثمن میں ادا کئے جائیں، وہ حلال کے درجہ میں ہوں گے، اور جو چیز خریدی گئی ہے، اس کا استعمال جائز ہوگا۔

ردالمحتار میں ہے؛

"قوله اکتسب حراماًواشتری به أو بالدراهم المغصوبة شیئاًقال الکرخی :إن نقد قبل البیع تصدق بالربح وإلا لا هذاوفی الشامیة: قوله اکتسب حراما توضیح المسئلة ما فی التاتارخانیة حیث قال :رجل اکتسب مالاً من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة أوجه :أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولاً ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها ودفع أو اشتری قبل الدفع ودفع غیرها،، أواشتری مطلقاًودفع تلک الدراهم أو اشتری بدارهم آخر ودفع تلک الدراهم، قال أبو النصر: یطیب له ولا یجب علیه أن یتصدق إلا فی الوجه الأول، وإلیه ذهب الفقیه أبو اللیث، لکن هذا خلاف

ظاهر الرواية فإنه نص فی الجامع الصغير: إذا غصب ألفاًفاشتری بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح، وقال الكرخیؒ فی الوجه الأول والثانی لا يطيب، وفی الثلاثة الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لايطيب فی الكل، لكن الفتوی الآن علی قول الكرخیؒ دفعاًللحرج عن الناس" (ردالمحتارعلی الدر ۵/ ۲۳۵)۔

جواب نمبر ۷:

اگر قرض ملنے کا امکان نہیں ہے، تو حرام مال ہی کو قرض سمجھ کر کاروبار کر کے اتنے پیسے کمانے کے بعد جتنے میں اس کا گذر بسر ہو سکے، اور دوسروں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، اصل قرض کو جو کہ حرام ہے، صدقہ کرنا ضروری ہوگا، اس کی تائید سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

"**فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَاعَادٍ فَلَاإِثْمَ عَلَيْه**" (سورۂ بقرہ آیت ۱۷۳)۔

(ہاں اگر کوئی انتہائی مجبوری کی حالت میں ہو (اور وہ ان چیزوں میں سے کچھ کھالے)، جبکہ اس کا مقصد نہ لذت حاصل کرنا ہو، اور نہ وہ (ضرورت کی) حد سے آگے بڑھے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں)۔

اصول فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

"**الضرورات تبيح المحظورات**" (الأشباہ والنظائر ص ۱۴۰ تحت القاعدۃ الخامسۃ)۔

(ضرورتیں ممنوع چیزوں کو جائز قرار دیتی ہیں)۔

اس کی تائید فتاوی ہندیہ کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"**غصب حانوتاًواتجرفيه يطيب الربح كذا فی الوجيزللكردری**" (ہندیہ ۵/ ۱۴۲، کتاب الغصب، الباب الثامن)۔

جواب نمبر ۸:

راقم کے نزدیک حلال وحرام کاروبار کی مالیت کا اندازہ لگایا جائے گا، اگر حلال کاروبار مالیت کے اعتبار سے بڑھا ہوا ہے، اور حرام کاروبار مالیت کے اعتبار سے کم ہے، تو پھر ایک مسلمان کا ایسی جگہ جہاں حلال وحرام دونوں حصہ میں کام کرنا پڑتا ہے، کام کرنے کی گنجائش رہے گی، لیکن پھر بھی ایسی جگہ میں کام کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے، اگر مالیت کے اعتبار سے حرام کاروبار بڑھا ہوا ہے، تو حرام کی مالیت زیادہ ہونے کی وجہ سے ایسی جگہ میں کام کرنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ فقہی اصول ہے:

"**الأكثر حكم الكل**" (ردالمحتار علی الدر ۹/ ۴۶۹) (اکثر کل کے درجہ میں ہے)۔

فقہی حنفی کی مشہور ومعتمد علیہ کتاب: ہندیہ کی عبارت سے بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے:

"أهدى إلى رجل شيئاًأو أضافه إن كا ن غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثه أو استقرضه من رجل كذا في الينابيع، ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لو تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم كذا في الاختيار شرح المختار " (فتاوی ہندیہ ۵/۳۴۲۔ کتاب الکراھیۃ، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)۔

اور حلال کاروبار اور حرام کاروبار کی مالیت برابر ہو، تو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی جگہ میں کام نہ کیا جائے، اس کی نظیر یہ ہے کہ ایک شخص نے وضو کیا، اور دانتوں سے خون نکل آیا، اگر خون زیادہ ہو، اور تھوک کم ہو، تو ایسی صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا، اور اگر خون کم اور تھوک زیادہ ہو، تو ایسی صورت میں وضو نہیں ٹوٹے گا، اور اگر دونوں برابر ہوں، تو احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت میں وضو ٹوٹ جائے گا (دیکھئے: ردالمحتار علی الدر المختار ۱/۲۶۷)۔

جواب نمبر ۹:

حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد میں کام کرنا یعنی کھیتی باڑی وغیرہ اس طور پر جائز ہے کہ اجرت دینے والا یہ کہہ کر اجرت نہ دے کہ اجرت میں حرام مال سے دے رہا ہوں، تو ایسی حرام خرید کردہ جائداد میں کام کرنے کی گنجائش ہے، لیکن افضل اور بہتر یہی ہے کہ حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد میں کام نہ کرے۔

جب خالص حرام کمانے والے کے یہاں مزدوری یا نوکری کرنا، جبکہ مزدوری دینے والا ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کردے کہ یہ حرام پیسے ہیں، تو یہ پیسے جائز ہوں گے، جب حرام کمانے والے کے یہاں مزدوری اور نوکری کرنا جائز ہے، تو جو جائداد حرام مال سے خریدی گئی ہے، اس میں مزدوری کے طور پر کھیتی باڑی کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

اس کی تائید دارالعلوم دیوبند کے ایک اور فتوی سے بھی ہوتی ہے، استفادہ کی غرض سے استفتاء اور فتوی دونوں نقل کئے جاتے ہیں، ملاحظہ فرمائیں:

سوال: ناجائز کاروبار کرنے والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کی اجرت لے سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: جس شخص کی کل کمائی یا اکثر آمدنی حرام ہو، اس کے یہاں کھانا اس کا ہدیہ لینا یا مسجد ومدرسہ وغیرہ میں اس کا چندہ قبول کرنا، تو درست نہیں، البتہ خرید کرنا اور کرایہ داری وغیرہ یعنی معاملات میں امام کرخیؒ کے قول پر گنجائش ہے، بہ شرطیکہ

وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اسے متعین کر کے نہ دے، لہذا کل یا اکثر آمدنی حرام والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر ان سے اجرت لے سکتے ہیں، گنجائش ہے، اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر احتراز کرے، تو اس کے افضل و بہتر ہونے میں کچھ شبہ نہیں'' (فتاوی دارالعلوم دیوبند فتوی نمبر (176692)۔

حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ بائک یا کار میں سفر کرنا، اگر یہ دوستی کے طور پر ہو، جہاں حرام کمائی کرنے والا کمائی کے تعلق سے جا رہا ہے، یہ بھی ساتھ لگ جاتا ہے، تو راقم کے نزدیک یہ تعاون علی الإثم کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ہے:

''وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' (سورۂ مائدہ آیت ۲)۔

(اور تم لوگ برائی اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)

جواب نمبر ۱۰:

اگر کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ ادارے نقشہ کی منظوری کے لئے رشوت لیتے ہیں، اگر وہ سرکار کے پاس پہنچاتے ہیں، تو ایسی صورت میں نقشہ کی منظوری کے لئے کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں کو سود کی رقم دی جا سکتی ہے، اور اگر وہ خود کھاتے ہوں، تو سود کی رقم دینا جائز نہیں ہے۔

درمختار میں ہے:

''**غصب دراهم إنسان من كيسه ثم رده فيه فلا علمه يرى ،وكذا لو سلمه إليه بجهة أخرى كهبة أو إبداع أو شراء وكذالو أطعمه فأكله خلافاًللشافعي**'' (ردالمحتار علی الدر ۹/ ۲۶۷، کتاب الغصب، مطلب فی رد المغصوب وفیما لو أبی المالک قبوله)۔

معارف السنن میں ہے:

''**قال شيخنا :ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها :أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيله التصدق على الفقراء .....قال والظاهر أن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوى به فراغ ذمته ولا يرجو به المثوبة**'' (معارف السنن ۱/ ۳۴، أبواب الطهارة باب لا یقبل صلوۃ بغیر طهور)

جواب نمبر ۱۱:

اگر ایک شخص نے ہدیہ دیا، لیکن اس کی کمائی کے بارے میں یقین نہیں ہے، بلکہ بستی کی اکثریت چونکہ سودی کاروبار

میں ملوث ہے،تو اس کے ہدیہ دینے میں شبہ ہورہا ہے کہ ہدیہ حرام مال سے ہوسکتا ہے،تو اس سلسلہ میں راقم کی رائے یہ ہے کہ اگر دل کا میلان اس طرف ہے کہ اس کا ہدیہ حلال ہے،تو اس کا ہدیہ قبول کرلینا چاہئے چاہئے۔

اگر دل کا میلان اور غالب گمان یہ ہے کہ ہدیہ مال حرام سے دیا جارہا ہے،تو ایسی صورت میں ہدیہ قبول کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے،اگر قبول نہ کرنے کی صورت میں اختلاف اور فتنہ کا اندیشہ ہو،تو ایسی صورت میں ہدیہ قبول کرکے کسی غریب کو دے دینا چاہئے۔

ایسا شخص اگر بچوں کو ٹافی وغیرہ دیتا ہے، بچے چونکہ مکلّف نہیں ہوتے ہیں،اور وہ بھولے بھالے ہوتے ہیں،ان کے اندر خیر وشر کی تمیز نہیں ہوتی ہے،اگر وہ شخص بچوں کو ٹافی دے دیتا ہے، یا چائے وغیرہ پلا دیتا ہے،تو ایسی صورت میں بچوں پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا،البتہ اگر اس نے حرام مال سے بچوں کو ٹافی یا چائے وغیرہ پلائی ہے،تو وہ یقیناً گناہ گار ہوگا،البتہ اگر بچے ٹافی وغیرہ گھر لائیں،اور والدین کو معلوم ہے کہ ایسے شخص نے ٹافی وغیرہ دلائی ہے،جس کی کمائی مشتبہ ہے،اگر والدین کا دلی میلان اس طرف ہے کہ اس کی کمائی حلال ہے، یا حلال وحرام کی طرف کوئی میلان نہیں ہے،تو ایسے شخص کی ٹافی وغیرہ بچوں کو کھانے کے لئے دے سکتے ہیں،اگر والدین کا دلی میلان یا غالب گمان یہ ہے کہ ٹافی وغیرہ حرام مال سے ہے،تو ایسی صورت میں ٹافی وغیرہ لے کسی غریب بچوں کو دے دینا چاہئے،لیکن اگر بچہ کے والدین بہت غریب ہیں،اور دلی میلان اور غالب گمان یہی ہے کہ ٹافی وغیرہ حرام مال سے ہے،تو ایسی صورت میں والدین کے لئے اپنے بچوں کو ٹافی وغیرہ کھلانے کی گنجائش ہے۔

جواب نمبر ۱۲:

اگر ایک شخص کا کل مال یا کل کمائی یا اکثر مال یا اکثر کمائی حرام ہے، یا آدھا مال یا آدھی کمائی حرام ہے،تو ایسا شخص اپنے لئے اور اپنے بیٹے کے لئے دعا کرسکتا ہے۔

سورۂ لقمان کی آیت ہے:

"وَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا" (سورۂ الإسراء آیت ۲۳)

نیز ایسے شخص کے لئے یا اس کے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دعاؤں کی برکت سے اسے ہدایت عطا فرمادے۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مولانا سعید احمد ندوی☆

تمہید:

شریعت مطہرہ نے ہر بندۂ مومن کو کسب حلال کا حکم دیا ہے، اور حلال مال کو اعمال واخلاق کی درستگی سے وابستہ کیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"یَاأَیُّهَاالنَّاسُ کُلُوا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلَالاًطَیِّباً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ اِنَّهُ لَکُمْ عَدُوٌّمُّبِیْنٌ"

(سورہ البقرہ:۱۶۸)

(اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال پاکیزہ چیزیں ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، یقین جانو کہ وہ تمہارے لئے ایک کھلا دشمن ہے)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلَی کُلِّ مُسْلِمٍ" (المعجم الاوسط للطبرانی:۸۶۱۰)

(حلال مال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"طَلَبُ الْکَسْبِ الْحَلَالِ فَرِیْضَةٌ بَعْدَالْفَرِیْضَةِ" (المعجم الکبیر للطبرانی:۹۹۹۳)

(حلال مال کا طلب کرنا (اصل) فرائض کے بعد فرض ہے)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مطلق مال کمانا فرض وواجب عبادت نہیں، بلکہ حلال وجائز طریقہ سے مال کمانا عبادت ہے، حرام یا مشتبہ مال کمانا عبادت کے بجائے سخت گناہ اور اللہ تعالی کی ناراضگی کا موجب ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ اَلنَّارُ أَوْلیٰ بِهِ" (وہ گوشت جو جنت میں نہ جائے گا جس کی پرورش

☆ مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور تکیہ کلاں، رائے بریلی

حرام مال سے ہوئی ہو اور ایسا حرام گوشت دوزخ کا زیادہ مستحق ہے)۔

کسب حرام اور کسب حلال کے مابین ایک تیسرا ذریعہء آمدنی مشتبہ کا ہے، یعنی ایسے طریقہ سے کمانا کہ جس کے حلال وحرام ہونے میں شک وشبہ ہو کہ بعض اعتبار سے اس کا حلال ہونا معلوم ہو رہا ہو اور بعض اعتبار سے اس کا حرام ہونا معلوم ہو رہا ہو تو ایسے مال کا کمانا بھی حرام ہے، چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**إِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَإِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَايَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهِ وَعِرْضِهِ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ**'' (مسلم:۱۵۹۹، بخاری:۲۰۵۱)

(حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے اور ان دونوں کے درمیان شبہ کی چیزیں ہیں، جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے، سو جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین وآبرو کو محفوظ کر لیا اور جو شخص شبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ جائے گا)۔

جواب:۱- جب حلال وحرام کا اشتباہ ہو:

اگر ورثاء کو معلوم ہو کہ انہیں جو مال وراثت میں ملا ہے وہ حرام ہے تو ایسی صورت میں ان کے لئے ایسے مال کو لینا حلال نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً حرام ہے؛ خواہ اس حرام مال کا مالک معلوم ہو یا نہ ہو، درمختار میں ہے:

''**في المجتبى مات وكسبه حرام فالميراث حلال ثم رمز وقال لانأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقاً على الورثة فتنبه**'' (۶/۳۸۶)۔

(مجتبیٰ میں ہے کہ کوئی شخص فوت ہو گیا اور اس کی کمائی حرام ہے تو میراث حلال ہوگی، پھر اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس روایت کو نہیں لیتے، یہ مال ورثاء پر مطلقاً حرام ہے)۔

لیکن اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ جو مال اس کو وراثت میں ملا ہے وہ حلال ہے یا حرام تو فقہ کا ایک عام قاعدہ ہے:

''**إذااجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**'' (الأشباہ والنظائر، القاعدۃ الثانیۃ ص:۹۳)

(جب حلال وحرام جمع ہو جائیں تو غلبہ حرام کو ہوگا۔

جواب :۲-غریب شخص کے لئے حرام مال کا حکم:

اگر کسی کے پاس کسی بھی طریقہ سے حرام مال آ گیا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو اور وہ بلا عوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے سود، چوری، رشوت وغیرہ تو اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی وہ جہاں سے آیا ہے وہیں اسے واپس دے دیا جائے، مالک وفات پا چکا ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹا دیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے

مستحق زکاۃ کوصدقہ کرنا ضروری ہے، فتاوی شامی میں ہے:

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم ،وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه" (کتاب البیوع، باب البیع الفاسد، مطلب فیمن ورث مالاً حراماً، ۵/۹۹)۔

(خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر مالک معلوم ہوں تو ان کو واپس کرنا ضروری ہے، اور اگر حرام مال کا علم تو ہو، لیکن مالک معلوم نہ ہوں تو اس کو لینا جائز نہیں ہے، اسے مالک کی طرف سے صدقہ کردے)۔

اگر کسی شخص نے جوا وغیرہ کھیل کر یا اپنے کسی ناجائز کسب سے حرام مال حاصل کیا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ مستحق لوگوں میں ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردے، خود استعمال نہ کرے، المبسوط میں ہے:

"والسبيل في الكسب الخبيث التصدق" (۱۲/۱۷۲)

(حرام مال کا ایک ہی مصرف ہے کہ اس کو صدقہ کردیا جائے)۔

فتاوی شامی میں ہے:

"لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذاتعذر الرد على صاحبه" (کتاب الحظر والإباحۃ، فصل في البیع، ۶/۳۸۵)۔ (اگر حرام مال مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کا حل صرف یہ ہے کہ اس کو صدقہ کردیا جائے)۔

مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"غصب کئے ہوئے اور اس جیسے مال مثلاً رشوت، چوری، یا شرعاً باطل عقد کے ذریعہ حاصل کئے گئے مال کا حکم یہ ہے کہ اس سے فائدہ اٹھانا، اسے بیچنا، ہبہ کرنا جائز ہے، اور نہ ہی کسی ایسے شخص کے لئے جس کو مال حرام کا علم ہو خریدنا یا ہبہ اور وراثت کے ذریعہ سے اسے حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اس کے لئے ضروری یہی ہے کہ اسے مالک کو لوٹادے اور لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کردے" (فقہ البیوع: ۲/۱۰۵۲، محمد تقي العثماني، مکتبہ معارف القرآن کراتشی پاکستان، ۱۴۳۶ھ ۲۰۱۵م)۔

اگر اصل مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو اور یہ شخص خود مستحق ہو تو محققین علماء نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ اس مال کے منافع سے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے اوپر بقدر ضرورت خرچ کرلے، مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

"ماوجب التصدق به لكاسب الحرام ،واحتاج إليه لنفقته ونفقة عياله ،يجوز صرفه إلى نفسه، فإن كا ن فقيراً لايجب عليه التصدق بمثله،وإن كا ن غنياً ولم يكن المال الحلال كافياًلسد حاجته يسوغ للمفتى بعد النظر في أحواله أن يفتيه بجواز الاقتراض مما عنده من المال الحرام بشرط أن يلزم نفسه تسديد هذاالقرض إلى الفقراء من المال الحلال كلماتيسرله ذلک ،فيجب عليه أن

يتصدق بمثله" (فقہ البیوع:۲/ ۱۰۵۳)

بلکہ علامہ سرخسیؒ نے اس شخص کو فقراء سے مقدم قرار دیا ہے اور اس کا حکم لقطہ کے حکم کی طرح قرار دیا ہے کہ جیسے وہاں پر غنی کے لئے اس کا تصدق لازم ہے اور مستحق کے لئے اس کے استعمال کی گنجائش ہے، اسی طرح اس مسئلہ میں بھی اس کی گنجائش ہے، فرماتے ہیں:

"**وحاجته تقدم على حق الفقراء ،وإنما قلنا ذلك لأن حق الفقراء في هذاالمال بمنزلة حقهم في اللقطة على معنى أن يتصدق وله أن يردها إلى المالك إن شاء**" (المبسوط، شمس الدین السرخسي دارالمعرفۃ بیروت لبنان ۱۱/ ۷۷)

جواب: ۳-شوہر اور بیٹے کی حرام کمائی پر بیوی اور ماں کا حکم:

حرام کمانے والے کے گھر والوں کے لیے یہ حکم ہے کہ حرام کمانے والوں سے حرام ذریعہء آمدنی چھڑانے کی پوری کوشش کرتے رہیں، پوری کوشش کے باوجود اگر وہ نہ چھوڑیں تو اگر ان کی بیوی کے لیے جائز طریقہ سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لیے اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز نہیں اور اگر اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز ہے، حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ شوہر پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لئے بھی یہی حکم ہے، درمختار میں ہے:

"**اشترى الزوج طعاماً أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج**"(۶/۱۹۱)۔

(اگر شوہر کھانا یا لباس حرام مال سے خرید کر لے آئے تو بیوی کے لئے اس کا کھانا اور پہننا دونوں جائز ہے، اور اس فعل کا گناہ شوہر پر ہوگا)۔

بعینہ یہی حکم اس ماں کا ہے جس کے پاس اور کوئی ذریعہء معاش نہ ہو اور بیٹے کی آمدنی حرام ہو، کہ بیٹے کو حرام کمائی سے بچنے کی مسلسل تلقین کرتی رہے۔

جواب: ۴-حرام کاروبار کرنے والے کے یہاں دعوت میں شرکت کرنے کا حکم:

جب متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ جس نے دعوت دی ہے اس کا مال حلال ہے یا حرام تو ایسی صورت میں آدمی کا دل ہی فیصلہ کرے گا اور اگر دل گواہی دے تو شرکت کرے، اگر گواہی نہ دے تو شرکت نہ کرے، آپ ﷺ کا فرمان ہے:

"**دَعْ مَايُرِيْبُكَ إِلىٰ مَالَايُرِيْبُكَ**" (جامع الترمذي الرقم:۲۵۱۸)۔

(شک وشبہ والی بات کو بغیر شک وشبہ والی بات کے لئے ترک کردو)۔

علامہ مناویؒ اس حدیث کی اس طرح تشریح فرماتے ہیں:

"(دع مايريبک)أي : اترک ماتشک في کونه حسناًأوقبيحاً ،أوحلالاًأوحراماً،(إلى مالايريبک) أي :و اعدل إلى مالاشک فيه يعني ماتيقنت حسنه وحله" (فیض القدیر:۳/۵۲۹)

(جس کے بہتر اور قبیح ہونے یا حلال وحرام ہونے میں شک ہوتو اس کو چھوڑ دو اور جس کے بہتر ہونے اور حلت کا یقین ہو اس کو اختیار کرو)۔

ایسے موقع پر جب صحیح اور غلط کا فیصلہ کر پانا مشکل ہوتو شریعت میں اس کا ایک حل اور ملتا ہے اور وہ تحری ہے کہ دل جو فیصلہ کرے اس کو اختیار کرے، جس طرح قبلہ کی تعیین جب محال ہوتو تحری سے کام لیا جائے گا، اسی طرح جب حلال وحرام کی تمیز کر پانا دشوار ہوتو تحری سے کام لیا جائے گا، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"وإن أشبهت عليه القبلة وليس بحضرته من يسأل عنها اجتهد وصلى كذافي الهداية فإن علم أنه أخطأ بعد ماصلى لايعيدها" (۱۲۱/۱)

(اگر قبلہ میں اشتباہ ہوجائے اور کوئی موجود نہ ہو جس سے وہ سمت قبلہ متعین کر سکے تو وہ تحری کر کے نماز پڑھے گا، ہدایہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے اگر نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے غلط سمت کی طرف نماز پڑھ لی ہے تو اعادہ نہیں کرے گا)۔

جواب:۵- دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ آمدنی حرام ہے:

اگر کھانے والے کو معلوم نہیں تھا، اس کی لاعلمی میں کسی نے حرام مال کھلا دیا تو توبہ واستغفار کرے اور آئندہ نہ کھانے کا عزم کرے، امید ہے کہ اللہ تعالی معاف فرمادیں گے، اور حسب توفیق صدقہ کردے تو بہتر ہے، حدیث شریف میں ہے:

"عن قيس بن أبي غرزة قال: كُنَّا نُسَمّٰى فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ "السَّمَاسِرَةَ" فَمَرَّ بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَسَمَّانَا بِاسْمٍ هُوَ أَحْسَنُ مِنْهُ فَقَالَ:يَامَعْشَرَ التُّجَّارِ!إِنَّ الْبَيْعَ يَحْضُرُهُ اللَّغْوُ وَالْحَلَفُ فَشُوْبُوْهُ بِالصَّدَقَةِ" (مشکاۃ المصابیح، باب المساہلۃ في المعاملۃ، الفصل الأول، ص:۲۴۳، ط:قدیمی کراتشی)

(حضرت قیس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہمیں (یعنی تاجروں کو) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں "سماسرہ" کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کا ہم پر (بازار میں) گزر ہوا تو آپ ﷺ نے ہمیں اس سے اچھا نام دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! بے شک خرید وفروخت کے وقت لغو اور قسم حاضر ہوجاتی ہے (غلط بیانی، یا غیر واقعی قسمیں

شامل ہوجاتی ہیں، جن کی وجہ سے کمائی مکمل حلال نہیں ہوتی، آمدنی مشکوک ہوجاتی ہے)، لہٰذا اسے صدقہ سے ملالیا کرو (یعنی صدقہ نکالا کرو؛ تاکہ جتنا حصہ مشکوک ہو اس صدقہ سے اس کا اثر اور اللہ تعالی کا غضب ٹھنڈا ہوجائے)۔

درمختار میں ہے:

"الحرمة تتعددمع العلم بهاوفي الشامي في تحته: ومانقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لاتتعدى ذمتين سألت عن الشهاب بن الشبلي فقال هو محمول على ما إذالم يعلم بذلک" (۴/۱۴۶، کوئٹہ)

(حرمت اس وقت متعدی ہے جب حرام کا علم ہو، اس کے ضمن میں شامی میں مذکور ہے: اور جو بعض احناف سے یہ نقل کیا گیا کہ حرام دو ملکیت تک متعدی نہیں ہوتی تو میں نے اس بارے میں شہاب بن شبلی سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ لاعلمی پر محمول ہے)۔

جواب:۶-حرام مال کو حلال کرنے کا حیلہ:

شریعت مطہرہ کی رو سے حرام مال اصل مالک کی طرف لوٹانا ضروری ہے، لیکن اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو پھر اس مال کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا ضروری ہے، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"والسبيل في المعاصي ردها وذلک هاهنا برد المأخوذ إن تمكن من رده بأن عرف صاحبه وبالتصدق به إن لم يعرفه ليصل إليه نفع ماله إن كا ن لايصل إليه ماله" (۵/۳۴۹) گ

(حرام مال کا راستہ بس ایک ہے کہ اگر ممکن ہو تو اس کو اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے، جبکہ مالک معلوم ہو، اگر مالک معلوم نہ ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے کہ کم از کم اگر اس کو اس کا مال نہ ملے، بہر حال اس کا نفع تو پہنچ جائے)۔

کتب فقہ میں حرام مال کے سلسلہ میں ایک تفصیل اور ملتی ہے اور یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے حرام مال کی طرف اشارہ کر کے کوئی چیز خریدی ہو اور ادائیگی بھی اس مشارالیہ حرام مال سے کی ہو تو ایسی صورت میں اصل مال حرام کی طرح اس کی آمدنی بھی حرام ہے اور دونوں کا بغیر نیت ثواب کے فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہوگا، لیکن اگر مال حرام کی طرف اشارہ کیے بغیر اس مال سے کچھ خریدا تو اس صورت میں کمائے ہوئے نفع کو استعمال کرنے کی گنجائش ہے، تاہم اصل مال حرام کا صدقہ کرنا پھر بھی لازم ہے، درمختار میں ہے:

"اگر مال مغصوب اور ودیعت میں تصرف کیا اس طرح پر کہ اس کو بیچ ڈالا اور اس میں نفع حاصل ہو تو منفعت کو خیرات کرے، جبکہ مال مغصوب اور ودیعت اشارہ کرنے سے متعین ہو یا اس کا تعین مغصوب یا ودیعت کے دراہم کے ذریعہ خرید کر

کرے تو ایسی صورت میں مال مغصوب اور ودیعت میں تصرف کر کے جو منافع حاصل ہوں اس کو صدقہ کر دے؛ جبکہ دونوں اس قبیل سے ہوں کہ اشارہ کرنے سے متعین ہوجاتے ہوں ،اور اگر مغصوب اور ودیعت متعین نہ ہوں تو پھر ان دراہم کی چار صورتیں ہیں: (۱) اگر دراہم کی طرف اشارہ کیا اور انہی کو ثمن میں ادا کیا تو متعین کی مانند اس کو صدقہ کرے، (۲) اگر دراہم غصب کی طرف اشارہ کیا اور دوسرے دراہم سے قیمت ادا کی، (۳) یا اشارہ کیا دوسرے دراہم کی طرف اور قیمت دراہم غصب سے ادا کی، (۴) یا مطلق دراہم ذکر کئے اور اشارہ کسی طرف نہ کیا اور غصب کے دراہم سے قیمت ادا کر دی تو ان تینوں صورتوں میں امام کرخیؒ کے نزدیک منفعت صدقہ نہ کرے گا اور کہا گیا ہے کہ فتوی اسی قول پر ہے'' (کتاب الغصب: ۱۸۹/۶)۔

جواب: ۷ حرام مال سے حاصل شدہ منافع کا حکم:

غیر شرعی طریقہ پر مال کمانا ناجائز وحرام ہے اور یہ مال اصل مالک کو واپس کرنا لازم ہے، لیکن اگر کسی نے اسی حرام مال سے کوئی جائز کاروبار کر لیا تو اگرچہ اس کا یہ طرز عمل شرعاً جائز نہیں؛ تاہم اس جائز کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**غصب حانوتاً واتجر فيه وربح يطيب الربح كذافي الوجيز للكردي**'' (کتاب الغصب، الباب الثامن، ۱۴۲/۵)۔

(کسی نے دوکان غصب کر لی، پھر اس میں اس نے کاروبار کیا تو نفع جائز ہوگا، ایسے ہی علامہ کردی کی الوجیز میں مذکور ہے)۔

درمختار میں ہے:

'' تاتارخانیہ میں ہے کہ ایک شخص حرام مال کمایا پھر اس مال سے خریداری کی اس کی پانچ شکلیں ہیں: (۱) یا تو اس نے بائع کو پہلے ہی وہ حرام دراہم دے دیے پھر خریدا، (۲) یا اس نے پہلے خریدا بعد میں وہ دراہم دیے، (۳) یا پہلے خریدا اور دوسرے دراہم ادا کر دیے، (۴) یا اس نے مطلق خریدا اور وہ دراہم ثمن کے طور پر ادا کر دیے، (۵) یا اس نے دوسرے دراہم کے ذریعہ خریدا اور بطور ثمن وہ حرام دراہم ادا کر دیے، ابونصر کہتے ہیں کہ پہلی شکل کو چھوڑ کر باقی تمام شکلوں میں مال جائز ہے، اس کو صدقہ کرنا واجب نہیں، یہی قول فقیہ ابواللیث کا ہے، حالانکہ یہ ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے، جہاں پر جامع صغیر کے حوالہ سے منقول ہے کہ اگر کسی نے ایک ہزار درہم غصب کر لیے اور پھر اس سے ایک باندی خریدی، پھر اس باندی کو دو ہزار میں فروخت کر دیا تو حاصل شدہ نفع کو صدقہ کر دے، امام کرخی کا کہنا ہے کہ پہلی اور دوسری شکل میں تو جائز نہیں ہے، لیکن اخیر کی تینوں شکلوں میں مال حلال ہے، امام ابوبکر کا قول ہے کہ کسی بھی صورت میں مال جائز نہیں، لیکن دفع حرج کی بنیاد پر آج فتوی

امام کرخی کے قول پر دیا جائے گا'' (الدر المختار: کتاب البیوع، باب المتفرقات: ۷/ ۴۹۰، ط: زکریا، دیوبند)۔

اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فقہ اسلامی کا مشہور قاعدہ ہے:

''**الخراج بالضمان**'' (الأشباہ والنظائر، القاعدۃ العاشرۃ، ص: ۱۲۷)

جس کا معنی یہ ہے کہ جو بھی کسی کاروبار میں نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے تو اس کا منافع بھی اسی کو ملتا ہے اور اس صورت میں غاصب ہی اس کاروبار میں نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، نہ کہ مغصوب منہ، اس لیے منافع کا حق دار بھی غاصب ہی ہونا چاہئے۔

جواب: ۸- ایسی جگہ ملازمت کرنا جہاں حلال کے ساتھ ساتھ حرام کاروبار میں بھی کام کرپڑتا ہو:

ایسی جگہ ملازمت کرنا جہاں حلال وحرام دونوں کام کرنے پڑتے ہوں، تو یہ دیکھا جائے گا کہ اگر اکثر کام جائز وحلال ہیں تو پھر یہ نوکری جائز ہوگی، ہاں اتنا ہوسکتا ہے کہ جائز کام کے حساب سے تنخواہ جائز ہوگی، حرام کام کی تنخواہ درست نہ ہوگی، اگر زیادہ تر ناجائز کام ہوں تو ایسی صورت میں ملازمت جائز نہیں، بحالت مجبوری کیا جاسکتا ہے اور جائز وحلال ملازمت کی تلاش جاری رکھی جائے اور مناسب ملازمت ملتے ہی اس کو ترک کردیا جائے، قرآن کریم میں تعاون علی الاثم سے روکا گیا ہے اور یہ ایک طرح کا تعاون اور حوصلہ افزائی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ**'' (سورہ المائدہ: ۲)۔

(اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم میں تعاون نہ کرو)۔

آسان فقہی مسائل میں ہے:

''اگر ادارے کی طرف سے ملازم کے ذمے کئی کام ہیں جن میں اکثر جائز ہوں تو مجموعی اعتبار سے ایسی ملازمت جائز ہے، البتہ جتنا کام جائز ہوگا اس کے بقدر تنخواہ لینا بھی حلال ہوگا اور جتنا کام ناجائز ہوگا اس کے بقدر تنخواہ بھی حرام ہوگی، لیکن ادارے کی طرف سے ملازم کے ذمے صرف ناجائز کام ہو یا اکثر ناجائز ہو تو ایسی ملازمت ناجائز ہے اور اس کی تنخواہ حرام ہے'' (ص: ۵۶۷)۔

جواب: ۹- حرام کمائی سے خریدے گئے کھیت، بنائے ہوئے گھر میں کام یا اس کی گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنا؟ اور اس سے اسکول یا مدرسہ کی فیس لینا؟

حرام مال سے خریدی گئی کسی بھی جائز چیز میں مزدوری کرکے کمانا جائز ہے، اسی طرح کسی نے حرام مال سے گاڑی

خریدی اس گاڑی میں مزدوری کرنا جائز ہے، اس سے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ حلال ہوگی، دارالعلوم دیوبند کا فتوی ہے:

''سوال: ایک آدمی نے حرام مال سے گاڑی خریدی ہے، اب اس گاڑی پر مزدوری کر کے کمانا حلال ہے کہ حرام؟

جواب: اس گاڑی پر مزدوری کر کے جو کمائی کمائی جائے گی وہ حلال رہے گی، کوئی وہم نہ کریں، البتہ حرام مال سے گاڑی کا خریدنا یہ فعل ناجائز ہے (آن لائن فتوی نمبر: ۳۵۴۸۰)

حرام کمائی والے کے گھر میں نوکری کرنا یا اس کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا:

اگر کسی کی آمدنی حرام ذرائع سے حاصل ہے یا اس کی آمدنی مخلوط ہے اور آمدنی کا غالب حصہ حرام ذرائع سے حاصل ہے اور وہ اس سے عوض دے تو جانتے ہوئے لینا جائز نہ ہوگا، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**الحرمة تتعدى في الأموال مع العلم بها ،إلافي حق الوارث فإن مال مورثه حلال له وإن علم حرمته منه،من الخانية**''(۱/۲۴۷،ط:دارالفکر)

(مال میں حرمت اس وقت متعدی ہے جب اس کا علم ہو، سوائے وارث کے کہ اس کے لیے مورث کا مال حلال ہے، بھلے ہی اس کی حرمت معلوم ہو)۔

اگر اس کے پاس غیر مخلوط حلال مال ہے اور وہ اس سے اجرت دیتا ہے یا کسی سے حلال مال قرض لے کر دیتا ہے تو لینا جائز ہوگا۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلابأس إلاأن يعلم بأنه حرام ،فإن كان الغالب هوالحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولايأكل الطعام إلاأن يخبره بأنه حلال ورثته أواستقرضته من رجل كذافي الينابيع**''(الباب الثاني عشرفي الهدايا والضيافات:۵/۳۴۲)۔

جہاں تک حرام مال سے خریدی گئی کار یا بائک میں سفر کرنے کا تعلق ہے تو اگر وہ گاڑی سودی قرض سے لی گئی ہے تو اس پر بیٹھ کر سفر کر سکتے ہیں، جائز ہے، کیوں کہ انہوں نے گاڑی کے لئے جو سودی قرض لیا ہے یہ بلاشبہ حرام و ناجائز کام کیا، اس لئے کہ اسلام میں سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں اور سودی قرض لینے والا قرض دینے والے کو اصل قرض کی واپسی کے ساتھ جو مزید دیتا ہے وہ شرعاً سود ہوتا ہے، لیکن سودی قرض میں قرض لینے والے کو قرض کے نام پر جو پیسے حاصل ہوتے ہیں قرض لینے والا قبضہ کے بعد ان کا مالک ہو جاتا ہے نیز وہ قرض بعد میں واپس کر کے اس کو عوض لوٹا دیتا ہے، اس لئے یہ پیسے اس کے لئے حرام نہیں اور ان سے خریدی ہوئی کار یا اور کوئی چیز بھی حرام نہیں، پس گاڑی کے مالک کے لئے اسی طرح اس کی

اجازت سے دوسروں کے لئے سودی قرض سے خریدی ہوئی گاڑی میں سوار ہونا اور سفر کرنا جائز ہے، بدائع الصنائع میں ہے:

''جہاں تک قرض کا حکم ہے تو قرض کے اندر فوراً ہی قرض خواہ کے لئے ملکیت ثابت ہوجائے گی اور اسی وقت سے اس کی ادائیگی اس پر لازم ہوجائے گی، یہ ظاہر الروایہ کا جواب ہے، نوادر میں امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ قرض کا مالک اس وقت ہوگا جب اس کا استعمال کرے گا، قبضہ سے ملکیت کا ثبوت نہیں ہوگا'' (کتاب القرض، فصل في حکم القرض: ۱۰/۶۰۰، ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت)۔

اور اگر وہ گاڑی کسی اور حرام ذریعہ سے خریدی گئی ہے تو اگر معلوم ہو کہ یہ مال حرام سے حاصل کی گئی ہے تو ایسی گاڑی میں بیٹھنے سے مکمل اجتناب کرے اور اس میں بھی وہی تفصیل ہے جو ہدیہ اور دعوت وغیرہ کے سلسلہ میں ہے، المحیط البرہانی میں ہے:

''وفي "عيون المسائل "رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لاينبغي أن يقبل ويأكل من طعامه مالم يخبر أن ذلک المال حلال استقرضه أو ورثه وإن كان غالب ماله من حلال فلابأس بأن يقبل مالم يتبين له أن ذلک من الحرام ؛وهذا لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام وتخلو عن كثيره ،فيعتبر الغالب ويبنى الحكم عليه'' (الفصل السابع عشر في الهدایا والضیافات: ۵/۳۶۷، ط: دار الکتب العلمیۃ)

(''عیون المسائل'' میں ہے کہ ایک آدمی نے کسی کو ہدیہ دیا یا اس کی ضیافت کی تو اگر اس کا غالب مال حرام ہے تو اس کا ہدیہ قبول کرنا اور اس کا کھانا کھانا جائز نہیں جب تک یہ نہ بتادے کہ یہ مال حلال اس کو قرض لیا ہے یا وراثت میں ملا ہے اور اگر اس کا غالب مال حلال ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں، الا یہ کہ وہ بتادے کہ یہ مال حرام سے ہے، اس کی وجہ یہ ہے لوگوں کے مال میں تھوڑی بہت تو حرام کی آمیزش ہو ہی جاتی ہے، اکثر مال حلال ہوتا ہے، اس لئے اکثر اور غالب کا اعتبار ہوگا اور اسی کو بنیاد بنا کر حکم لگایا جائے گا)۔

مدرسہ یا اسکول کا حرام کمائی والوں سے فیس وصول کرنا:

اکثر یا تمام حرام آمدنی والے کے یہاں دعوت تو نہیں کھا سکتے اور نہ اس کا ہدیہ قبول کر سکتے، لیکن امام کرخیؒ کا جو قول اوپر گذرا اس کی روشنی میں مالی امور میں معاملہ کرنے کی گنجائش ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ تعین کے ساتھ مال حرام نہ دے۔

جواب:۱۰- مدارس کا عمارت کی منظوری کے لئے سودی رقم رشوت میں دینا:

سودی رقم کا اصول یہ ہے کہ اس کو مالک کو واپس کیا جائے، اگر وہ سرکار کا ہے تو سرکار کو لوٹایا جائے، اسی ذیل میں یہ

تفصیل ہے کہ ظالمانہ ٹیکس میں اس کو ادا کیا جاسکتا ہے اور سرکار جو مالک ہے اس کو واپس کیا جائے، لیکن اگر وہ سودی رقم کسی اور کی ہو تو اس کو واپس کیا جائے وہ سودی رقم ٹیکس میں ادا نہیں کی جائے گی، درمختار مع ردالمحتار میں ہے:

"**غصب دراهم إنسان من كيسه ثم ردهافيه بلاعلمه برئ، وكذالوسلمه إليه بجهة أخرى كهبة، أو إيداع، أوشراء، وكذالوأطعمه فأكله خلافاًللشافعي**" (۹/۲۶۷، کتاب الغصب، مطلب فیر دالمغصوب وفیما لوأبی المالک قبولہ)۔

(کسی شخص نے کسی کے دراہم غصب کر لئے، پھر اس کے علم میں لائے ہوئے اسے واپس کر دئے تو وہ بری الذمہ ہوجائے گا، اسی طرح کسی اور ذریعہ سے مثلاً ہبہ، ودیعت یا خرید کر یا کھانا کھلا کر ادا کر دئے تو ادا ہوجائیں گے، اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

''تعمیر مکان کے لئے جو قانونی لوازم ہیں ان کو پورا کرنے کے باوجود کوئی افسر محض رشوت کے لئے تعمیر مکان کی اجازت نہیں دیتا ہے تو ایسی صورت میں اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے رشوت دینا جائز ہے۔

البتہ اس میں سود کی رقم نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ سود کی رقم حکومت سے حاصل کی جاتی ہے اور رشوت ایک سرکاری افسر شخصی طور پر حاصل کرتا ہے، حکومت حاصل نہیں کرتی، اس لئے بینک کا سود اس مد میں دینا جائز نہیں'' (کتاب الفتاوی، تجارت سے متعلق سوالات: ۵/ ۳۱۰)۔

لیکن اگر اس رشوت کی رقم کی باقاعدہ رسید دی جاتی ہو اور وہ رقم حکومت کے پاس جاتی ہو تو اس طرح سود کی رقم رشوت میں دینے کی اجازت ہے، دارالعلوم دیوبند کا فتوی ہے:

''سوال: میرا مکان بن رہا ہے تو ہر چھت (لینٹر) پر پولس والے پیسے لیتے ہیں تو اس میں سود کا پیسہ دے سکتا ہوں یا نہیں؟

جواب: پولیس والے اگر پیسے لیکر سرکار کے پاس پہنچاتے ہوں تو اس صورت میں سرکاری بینک سے ملنے والی سودی رقم دینا جائز ہے، اور اگر وہ خود کھاتے ہوں تو جائز نہیں (آن لائن فتوی نمبر ۶۵۴۶۵)۔

جواب:۱۱-سودی کاروبار کرنے والے سے بغیر دریافت کئے ان کی دی ہوئی چیز کا استعمال:

ایسی صورت میں جبکہ اکثریت حرام کی ہو تو اور اس علاقہ اور زمانہ میں حرام کا چلن زیادہ ہو اور علم میں ہو کہ بستی کی اکثریت حرام میں مبتلا ہے تو اکثر کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی کے موافق حرمت کا حکم لگے گا، فتاوی ہندیہ میں ہے:

''ایک شخص نے تاجر سے کچھ خریدا تو کیا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس سے دریافت کرے یہ حلال ہے یا حرام، فقہاء کرام کا کہنا ہے کہ اس علاقہ اور زمانہ کا اعتبار ہوگا اگر حلال غالب ہو تو مشتری کے لئے حلال وحرام دریافت کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ ظاہر پر حکم لگے گا اور اگر حرام کا غلبہ ہو یا بائع حلال وحرام دونوں طرح کا کاروبار کرتا ہو تو احتیاط برتا جائے گا اور حلال وحرام کے متعلق دریافت کیا جائے گا'' (۳/۲۱۰، طبع دارالفکر، بیروت)۔

فقہ کا ایک عام قاعدہ ہے کہ نفع حاصل کرنے سے زیادہ نقصان سے بچا جائے گا اور مامورات سے زیادہ منہیات سے گریز کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگر حرام کا احتمال اور امکان ہے تو حرام سے بچنا اولی ہے، الاشباہ والنظائر میں ہے:

''**درء المفاسد أولى من جلب المصالح ،فإذاتعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالباً؛لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتناء ه بالمأمورات**'' (ص:۱۴۷)۔

(مفاسد کو دور کرنا مصالح حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے، لہٰذا جب ان دونوں میں تعارض ہوجائے تو مفاسد کو پہلے دور کیا جائے گا کیوں کہ شریعت نے مامورات سے زیادہ منہیات پر توجہ دی ہے)۔

جواب:۱۲-حرام مال والے کے لئے دعا کرنا کیسا ہے؟

حرام کمائی والے کی دعا کا قبول نہ ہونا وارد ہوا ہے، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کے حق میں دعا کرنا منع ہے، بلکہ زندہ کفار تک کے لئے ہدایت ومغفرت کی دعا کرنے کی شرعاً اجازت ہے، تو پھر وہ تو بہرحال مسلمان ہے، اس کے لئے تو بدرجہ اولی دعا کی جاسکتی ہے، آپ ﷺ نے تو کفار کے حق میں مغفرت اور ہدایت کی دعا فرمائی، صحیحین کی روایت میں آپ ﷺ سے کفار کے حق میں یہ دعا منقول ہے:

''**اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَايَعْلَمُوْنَ**'' (الصحیح للبخاري، الرقم:۳۴۷۷، الصحیح لمسلم، الرقم:۱۷۹۲)

(اے اللہ میری قوم کی مغفرت فرما کہ وہ جانتی نہیں)۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے قبیلہ دوس کے حق میں اس طرح دعا فرمائی:

''**اَللّٰهُمَّ اهْدِدَوْساًوَأْتِ بِهِمْ**'' (الصحیح للبخاري، کتاب الجہاد والسیر، باب الدعاء للمشرکین بالہدی لیتألفہم، الرقم:۲۹۳۷)

(اے اللہ قبیلہ دوس کو ہدایت عطا فرما اور انہیں دائرۂ اسلام میں کھینچ لا)۔

☆☆☆

حرام کاروبار وملازمت سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد اشرف قاسمی☆

نقود غیر متعین وغیر مشارٌ الیھا

مذکورہ مسئلہ پر فقہاء کی تصریحات میں حرام مال سے خرید وفروخت کے بارے میں اولاً دو قسم کے اقوال نقل کئے گئے ہیں:

پہلا قول: یہ اگر حرام مال سے کچھ نفع حاصل کیا گیا تو وہ نفع بھی حرام ہوگا، اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔

دوسرا قول امام کرخیؒ کا ہے کہ اگر مغصوب سِکّے یا شئ کو متعین کرکے کوئی چیز خریدی تو اس میں جو نفع ہوگا وہ حرام ہوگا ''سِکّۂ مغصوبہ متعینہ مشارالیہا'' سے حاصل ہونے والا نفع بھی واجب التصدق ہوگا، لیکن اگر اس سِکّے یا شئ مغصوب کو متعین کئے بغیر کوئی چیز خریدی اور اس میں اس کو نفع حاصل ہوا تو وہ نفع حلال ہوگا، مالِ مغصوب کی مقدار ہی صدقہ کرنا ضروری ہوگا، منافع کا صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ عوام کی بداحتیاطی کی وجہ حرج کو دفع کرنے کے لیے امام کرخیؒ کے قول پر فتوی ہے۔

دیگر علماء کے اقوال کو ترک کرنے میں کسی کی حق تلفی نہیں ہے، کیوں کہ یہاں صرف منافع کو حلال قرار دیا گیا اور مالِ مغصوب وحرام کو بہرحال مستحق شخص کو لوٹانا یا لوٹانا متعذر ہونے کی صورت میں صدقہ کرنا ضروری ہے۔

پھر آگے مضاربت کے باب میں دیگر علماء بھی امام کرخیؒ کے موافق ہوجاتے ہیں، کہ اگر یہی مالِ حرام کسی کو مضاربت کے لیے دیا اور عامل کو اس مال (رأس المال) کے حرام ہونے کا علم نہیں ہے تو عامل کے لیے اس کے منافع حلال ہیں۔

حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ نے انھیں مذکورہ بالا عبارات اور قول کرخیؒ کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا:

''البتہ اسی مال سے زمین خریدی گئی ہے، یا اس سے کوئی تجارت کی جارہی ہے تو اس زمین، تجارت کی آمدنی حلال ہوگی، (۲) اور ان کے یہاں خورد ونوش، آمد ورفت بھی جائز ہوگی، لیکن اس پر ضروری ہوگا کہ جتنے روپے اس نے زمین یا

☆ دارالافتاء: شہر مہد پور، اُجین، ایم پی

تجارت میں لگائے ہیں، اس مقدار کو صدقہ کردے، اگر چہ اس کی آمدنی میں سے ہی ہو" (فتاوی محمودیہ، باب المال الحرام ومصرفہ، ۱۷/ ۴۱۶، دارالمعارف دیوبند)۔

ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ناجائز مال سے تجارت وغیرہ کرکے جو منافع حاصل کئے اور جائیداد بنائی گئی وہ حلال ہیں، البتہ مال حرام جو تجارت میں استعمال کیا ہے اتنی مقدار میں مال کا صدقہ کرنا ضروری ہے۔

تفصیلات بالا کے بعد اصل موضوع پر آتے ہیں:

اگر وراثت میں حرام مال حاصل ہو تو اس سلسلے میں تفصیل ہے کہ اگر ورثاء کو مستحقینِ اموال معلوم ہیں تو انھیں وہ اموال واپس کرنا ورثا پر ضروری ہے، اگر مستحقین نہیں معلوم ہیں، لیکن حرام مال متعین طور پر معلوم ومیّز ہے تو اس مال کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

البتہ اگر مستحقین اموال معلوم نہیں ہیں اور نہ ہی مال حرام متعین ومیّز ہے تو ورثاء کو اسے اپنے استعمال میں لانا درست وجائز ہے۔

درمختار میں ہے:"**(علیه دیون مظالم جهل أربابها وأیس) من علیه ذالک (من معرفتهم فعلیه التصدق بقدرها من ماله و إن استغرقت جمیع ماله) هذا مذهب أصحابنا لا نعلم بینهم خلافاً، کمن فی یده عروض لایعلم مستحقیها،اعتباراً للدیون بالأعیان، (و)متی فعل ذٰلک (سقط عنه المطالبة) من أصحاب الدیون، (فی العقبیٰ) مجتبیٰ۔ وفی العمدة: وجد لقطة وعرفها ولم یربها فانتفع بها لفقره، ثم أیسر یجب علیه أن یتصدق بمثله**"۔

اور ردالمحتار میں ہے:"**(جهل أربابها) تشمل ورثهم، فلو علمهم لزمه الدفع إلیهم، لأن الدین صار حقهم، وفی الفصول العلامیة:من له علی آخر دین فطلبه ولم یعطه فمات رب الدین، لم تبق له الخصومة فی الاٰخرة عند أکثر المشائخ، لأنها بسبب الدین وقد انتقل إلی الورثة، والمختار أن الخصومة فی الظلم بالمنع للمیت، وفی الدین للوارث۔ قال محمد ابن الفضل:من تناول مال غیره بغیر إذنه ثم رد البدل علی وارثه بعد موته برئ عن الدین وبقی حق المیت لظلمه إیاه، ولا یبرأ عنه إلا بالتوبة والا ستغفار والدعا له ، اھ**" (ردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب اللقطہ ۶/ ۴۴۳، طبع زکریا)۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ناجائز طریقے سے جو آمدنی حاصل ہوئی تھی، اس آمدنی کو اس شخص کو واپس کرنا ضروری ہے جس سے غلط وناجائز طریقے سے حاصل کیا ہے، اگر صاحب مال کو بھول گیا اور اب اس کا پتہ نہیں چل رہا ہے

تو اس کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

اگر وراثت میں حرام مال ملا اور وہ متعین و منفصل طور پر محفوظ ہے تو اس کو صاحبِ مال کو لوٹانا ضروری ہے اور صاحبِ مال نہ مل سکے تو اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو ورثاء اس کو استعمال کر سکتے ہیں۔

''حکم مال حرام جو کہ میراث میں مل جائے'' کے تحت حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

''ردالمحتار میں اس پر بہت بسط سے بحث کی ہے، حاصل مجموعہ کا یہ ہے کہ اگر کوئی مالِ حرام علیحدہ رکھا ہے تو وہ بالکل حرام ہے، یعنی اس میں تصرف بھی نافذ نہ ہوگا،، پس اگر اس کا مالک ہے تو اس کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر معلوم نہیں تو لقطہ کی طرح مساکین پر تصدق کر دے، اور اگر وہ مال باہم مخلوط ہو گیا تو اگر مالک مستحق معلوم ہیں تو اس کا بدل واپس کر دے، اور مالک بھی معلوم نہیں تو قضاء اس میں تصرف نافذ ہو سکتا ہے، لیکن دیانۃ اس کو حلال نہیں، ۴/ ۱۰۲/و ۲۰۲/الی شرحہ قولہ سخققہ'' (امداد الفتاویٰ ۴/ ۱۴۵ زکریا)۔

جائیداد میں حرام رأس المال؟

جواب نمبر ا

ربوی کاروبار میں دیئے گئے قرض کے بدلے میں متعین رقم کے ساتھ مزید اضافی رقم لی جاتی ہے، جو مزید اضافی رقم لی گئی وہ سود ہے، جو کہ ناجائز اور حرام ہے، لیکن اصل رأس المال جو قرضہ میں دی گئی تھی وہ تو حلال ہی ہے۔

آیت کریمہ ہے: ''**فان تبتم فلكم رؤوس أموالكم لاتظلمون ولا تظلمون**''۔

اس لیے راس المال کے علاوہ جو اضافی رقم ملتی رہی، حرمت کا حکم اسی اضافی رقم پر دائر ہوگا، ایسی رقوم کو واپس کرنا ضروری ہے، اگر اس کے مالک نہ مل سکیں تو اس کو صدقہ کرنا ضروری ہے، لیکن چونہ اضافی رقومات متعین نہیں ہیں، وہ اضافی حرام رقومات حلال مال کے ساتھ مخلوط رہیں اور ان سے دیگر کاروبار کر کے مزید ایسی جائیدادیں بنالی گئیں جو امام کرخیؒ کے فتوی کے مطابق حلال ہیں، اس طرح پھر حلال اور حرام دونوں ذرائع سے آمدنی ہوتی رہی جس کی بنیاد پر پوری آمدنی اور جائیداد کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔

الدرالمختار میں ہے: ''**(فيأخذ) المشترى (دراهم الثمن بعينها لوقائمة ومثلها لو هالكة) بنائًا على تعيين الدراهم فى البيع الفاسد، وهو الأصح (و) إنما(طاب للبائع ماربح)فى الثمن----(لا) يطيب(للمشترى) ماربح فى بيع يتعين بالتعيين بأن باعه بأزيد لتعلق بعينه فتكمن الخبث فى ماربح**

فیتصدق به(کما طاب ربح مال ادعاه) علی اٰخر فصدقه علی ذالک(فقضی له)"۔

ردالمحتار میں ہے:"**قولہ (بناء علی تعیین الدراھم) المراد بھا مایشمل الدنانیز۔ وفی الأشباہ: النقد لا یتعین فی المعاوضات۔۔۔۔ ولا یتعین فی المھر ۔۔۔، ولا فی النذر والوکالۃ قبل التسلیم۔ وأما بعدہ فالعامۃ کذالک۔ وتتعین فی الامانات والھبۃ والصدقۃ والشرکۃ والمضاربۃ العصب، وتمامہ فی جامع الفصولین اھ**" (ردالمحتار مع الدر، باب البیع الفاسد ۷/۱۰۳، زکریا)۔

یہ اور اس طرح کی دوسری جزئیات سے واضح ہوتا ہے کہ نقود متعین نہیں ہوتے ہیں، غیر متعین نقود اگر ناجائز طریقے سے حاصل ہوں، ان کے ذریعہ جو آمدنی ہو وہ حلال ہے، بیان کردہ مسئلہ میں سودی کاروبار سے حاصل آمدنی کے ذریعہ موجودہ کاروبار کو حلال راستے پر ڈالنے کی صراحت ہے، یعنی جو کاروبار آگے بڑھا، زمین وجائیداد اور اعیان واشیاء جمع کی گئی ہیں وہ اس مال سے کمائی گئی ہیں جو اعیان نہیں تھے، خاص طور پر جب کہ آزادی سے قبل دارالحرب اور دارالاسلام کی بنیاد پر سود کے جواز اور عدمِ جواز کی باتیں بھی کم علم مسلمانوں، بلکہ بعض تعلیم یافتہ افراد کے ذہنوں میں تھیں، آزادی سے قبل اسی فکر وخیال کے مطابق بعض اہل اسلام ایسے کاروبار میں ملوث رہے ہیں، اب وطنی حالات دوسرے ہیں، نیز علمی ترقی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی واضح طور پر سامنے آ گیا کہ دارالحرب کے نام سے سودی کاروبار کو فروغ دینا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، ایسی صورت میں جب کہ آزادی سے قبل کے جو معاملات ہوئے ہیں، وہ کن لوگوں سے ہوئے ہیں، اس کا بھی علم نہیں ہے، نیز سودی روپیوں سے حاصل آمدنی چونکہ حلال ہے، اس لیے باپ دادا سے وارثت میں حاصل ہونے والے روپیوں سے ورثاء نے جو کچھ بھی جائیداد بنائی ہے وہ حلال ہیں۔

حرام مال وجائیداد کی آمدنی؟

جواب نمبر ۲

بھی وہی ہے جو سوال نمبر ا کے تحت بیان ہوا، یعنی قابض شخص کے لیے وہ حلال ہیں، کیوں کہ یہ جائیداد اثمان یعنی غیر اعیان کے ذریعہ حاصل ہوئے ہیں، اور اگر اعیان ہی مغصوب ہیں تو انھیں صدقہ کرنا ضروری ہے۔

"**قولہ: (فعلیہ التصدق بقدرھا من مالہ) أی الخاص بہ أو المتحصل من الظلم اھ ط۔ وھذا إن کان لہ مال۔ وفی الفصول العلامیۃ: لو لم یقدر علی الأداء لفقرہ أو لنسیانہ أو لعدم قدرتہ، قال شداد والناطفی رحمھما اللہ تعالی: لا یؤاخذبہ فی الآخرۃ إذا کان الدین ثمن متاع أو قرضاً، و إن کان غصباً**

يؤاخذ به الآخرة، و إن نسي غصبه، و إن علم الوارث دين مورثه والدين غصب أو غيره فعليه أى يقضيه من التركةِ، و إن لم يقض فهو مؤاخذ به فى الآخرة، و إن لم يجد المديون ولا وارثه صاحبَ الدين ولاوارثَهٗ فتصدق المديون أو وارثُهٗ عن صاحب الدين برئ فى الآخرة۔

قوله (كمن فى يده عروض لايعلم مستحقيها)يشمل ما إذا كانت لقطة علم حكمها، و إن كانت غيرها فالظاهر وجوب التصدق بأعيانها أيضاً۔

قوله (سقط عنه المطالبة) كانهٗ والله تعالى أعلم لأنه منزلة المال الضائع والفقراء مصرفهٗ عند جهل أربابه، وبالتوبة يسقط إثم الإقدام على الظلم ط۔

قوله (يجب عليه أن يتصدق بمثله) المختار أنه لا يلزمه ذالک فى القهستانى عن الظهيرية، وكذا فى البحر النهر عن الولوالجية" (الردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب اللقطۃ ۶/ ۴۴۳، زکریا)۔

سرپرستوں کے حرام کاروبار

جواب نمبر ۳

عورت مجبور ہے، اس لیے اس کے لیے کھانے پینے کی گنجائش ہے، جہاں تک حرام کمائی سے تعلیم وتعلم کا حکم ہے تو اس تعلیم سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی حلال ہے۔

البتہ تعلیم یا دیگر ضرورویات میں خرچ کی گئی رقم کی مقدار کا اگر علم ہے، تو اتنی مقدار میں صدقہ کرنا چاہئے، تاکہ دیانۃً باپ کا گناہ ساقط ہوسکے۔

حلال وحرام مخلوط آمدنی والے کے یہاں دعوت طعام؟

جواب نمبر ۴

اصول یہ ہے کہ اگر داعی کی اکثر آمدنی حرام ہے اور مدعو کو اس کے حرام ہونے کا علم بھی ہے، تو ایسی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے، جب تک کہ داعی وضاحت نہ کردے کہ یہ دعوت حلال آمدنی سے کی جارہی ہے۔

اور اگر کسی کی اکثر آمدنی حلال ہے، اور کچھ حرام کاروبار بھی ہے تو ایسی صورت میں ایسے داعی کی دعوت قبول کرنا درست وجائز ہے، البتہ اگر داعی کی طرف سے وضاحت ہوجائے کہ اس دعوت میں مال حرام سے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے تو

پھر وہ دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہوگا۔

"أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافهُ إن كان غالب ماله من الحلال، فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغى أن لا يقبل الهديةَ، ولا يأكل بالطعام إلا أن يخبرهُ بأنه حلال ورثه او أستقرضه من رجل" (الفتاوی الھندیۃ ۵/ ۲۴۳)۔

کسی بستی کے تمام لوگوں کو حرام کاروبار میں ملوث ماننے کے بجائے شخصی طور پر انسان کو دیکھنا چاہئے کہ داعی کی ذریعہ آمدنی حلال ہے یا حرام؟ اور یا اکثر آمدنی کس نوعیت کی ہے؟ اسی کے مطابق دعوتیں قبول کرنے نہ کرنے کا حکم ہوگا۔

کیونکہ یہ بات مستبعد ہے کہ کسی بستی کے اکثر مسلمان حرام کاروبار میں ملوث ہوں، اس لیے عام حالات میں کسی بستی کی بنیاد پر وہاں کے تمام لوگوں کو حرام کاروبار میں ملوث نہیں تسلیم کرنا چاہئے۔

"عن أبى هريرة رضى الله عنه قال، قال رسول اللهﷺ إذا دخل أحدُكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاماً فليأكل من طعامه ولا يسئلهُ عنهُ، فإن سقاه شراباً من شرابهِ فلِيشرب من شرابه ولايسأل عنه" (مسند احمد برقم الحدیث: ۹۰۹۶)۔

البتہ اگر واقعی کوئی بستی ایسی ہو جہاں حرام کے علاوہ کوئی حلال ذریعہ آمدنی نہ ہو اور وہاں کا کوئی شخص اگر دعوتِ طعام دے تو داعی کی آمدنی اور طعام کے انتظام کے سلسلے میں حلال وحرام کی تحقیق کر لینی چاہئے، اور تحقیق کے بعد ہی دعوت قبول کرنا چاہئے، یہ بہتر ہے۔

"و إن كان الرجل يأ خذ المال من حيث وجده ولا يأمل فى الحلال والحرام فالسوال عنه حسن" (الاشباہ والنظائر، ص ۱۵۸)۔

حرام دعوت کھانے کا کفارہ؟

جواب نمبر ۵

انجانے میں ایسی دعوتیں کھانے پر عنداللہ کوئی مواخذہ نہیں ہے۔

ردالمحتار میں ہے: **"قوله(الحرمة تتعدد) نقل الحموى عن سيدى عبد الوهاب الشعرانى أنه قال فى كتابه المنن: ومانقل عن بعض الحنفية من الحرام لا يتعدى ذمتين، سألتُ عنه الشهاب ابن الشلبى فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذالک، أما لو رائ المكاس مثلاً يأ خذ من أحد شيئا من**

المكس ثم يعطيه آخرَ ثم يأخذ من ذالک الاٰخرِ آخرُ فهو حرام اه" (الدرالمختار مع الدرالمختار، کتاب البیوع، باب البیع الفاسد ۷/ ۳۰۱، زکریا)۔

غیر شعوری طور پر حاصل ہونے والی حرام آمدنی کے کفارہ کے طور پر صدقہ کرنے کا حکم ہے، جیسا کہ حدیث ذیل میں فرمایا گیا:

"**عن قيس بن أبي غرزه، قال: كنا نُسمىٰ في عهد رسول الله ﷺ السماسرةَ، فمربنا رسول اللّٰه ﷺ، فسمانا باسم هو أحسن منه فقال: يامعشر التجار! إن البيع يحضر الحَلِفُ واللغو، فشوبوهُ بالصدقة**" (ابن ماجہ برقم الحدیث ۲۱۴۵)۔

مذکورہ بالا روایت میں لغویات اور فضول قسمیں کھا کر" نامعلوم حاصل حرام کمائی کی" تلافی کے لیے تُجّار کو صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی انجانے میں حرام خوراک کھالے تو اس کا صدقہ کر کے اس کی تلافی کر سکتا ہے۔

توبہ واستغفار ہر معصیت سے پاکی کا ذریعہ ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**إنما التوبة للذين يعملون السوٓء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئک يتوب الله عليهم وكان الله عليما حكيما**" (النساء:۱۷)۔

اس لیے ایسی صورت میں توبہ واستغفار کے ساتھ ہی مقدارِ خوراک صدقہ کر دینا ناجائز کھانے کی تلافی کے لیے کافی ہوگا، ان شاء اللہ۔

پہلے کمائے ہوئے مالِ حرام کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر:

جواب نمبر ۶:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب مختلف فقہی جزئیات کی روشنی میں فرماتے ہیں:

"مال حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مال حرام نہیں؛ بلکہ صرف وہ مال حرام ہے جس کے مالک نامعلوم یا لاپتہ ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جاسکتا، نیز ایسی صورت میں بحکم لقطہ ہوجاتا ہے، اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے، اس لیے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لیے حرام نہیں، اور اسی بنا پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں باپ اور اولاد اور بیوی پر کر سکتا ہے، کیونکہ اُس (شخصِ قابض) کا صدقہ نہیں؛ بلکہ اصل مالک کا ہے، کما فی عبارۃ الھندیۃ" (جواہر الفقہ، ۳/ ۲۸۲، حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مکتبہ تفسیر القرآن، دیوبند، ۱۴۰۷)۔

اورفتاوی ہندیہ میں ہے:

"سئل یوسف بن محمد عن غاصب ندم علی فعل واراد ان یرد المال الی صاحبه ،وقع الیاس عن وجودصاحبه فتصدق بهذا العین بل یجوز للفقیر أن ینتفع بهذا فقال، لایجوز أن یقبله ولا یجوز الا نتفاع و إنما یجب علیه ردهٗ إلی من دفع إلیه، قالؒ: إنما أجاب بهذا الجواب زجراً کیلا یتساهلون فی أموال الناس أما لو سلک الطریق معرفة المالک فحکمه حکم اللقطة کذا فی التاتارخانیة" (فتاوی عالمگیریہ،۵/۱۷۵مصری)۔

اور بزازیہ میں ہے:

"فیرده علی أربابها إن علموا و إلا تصدق علی الفقراء" (علی ھامش الھندیۃ ۶/ ۳)۔

اور ہدیہ کی کتاب الکراہیۃ میں ہے:

"وفی کراهة الهندیة: إن تصدق به علی أبیه یکفیه ولایشترط التصدق علی الأجنبی" (فتاوی عالمگیریہ ۵/ ۳۸۵)۔

اس تفصیل کے مطابق اگر باپ یا مالکِ خانہ کی آمدنی حرام ہو، اوراس کی بالغ اولاد مسکین ہوں تو ان اولاد کو بھی کھانا جائز نہیں ہے، البتہ ان اموال کو بطور صدقہ گھر میں اپنی بیوی یا بالغ اولاد کو مالک بنادے، پھر وہ بالغ اولاد یا بیوی، والدین گھر کے تمام مصارف پر خرچ کرتے رہیں، اس طرح پورا گھرانا حرام خوری سے بچ جائے گا۔

حضرت مفتی محمود الحسن صاحب نے قول کرخیؒ (جسے شروع سطور میں نقل کیا گیا ہے) کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا:

''البتہ اسی مال سے زمین خریدی گئی ہے، یا اس سے کوئی تجارت کی جارہی ہے تو اس زمین، تجارت کی آمدنی حلال ہوگی، (۲) اوران کے یہاں خورد ونوش، آمدورفت بھی جائز ہوگی، لیکن اس پر ضروری ہوگا کہ جتنے روپے اس نے زمین یا تجارت میں لگائے ہیں، اس مقدار کو صدقہ کردے، اگرچہ اس کی آمدنی میں سے ہی ہو'' (بحوالہ: ردالمحتار مع الدر ۲/ ۱۹۲/ کتاب الزکوۃ، سعید، فتاوی محمودیہ، باب المال الحرام ومصرفہ، ۱۷/ ۴۱۶، دارالمعارف دیوبند)۔

اس لیے پہلے مرحلے میں کوشش کی جائے کہ جو حرام مال جمع ہے اس کو مستحقین تک واپس کردیا جائے یا صدقہ کردیا جائے، لیکن اگر اصل حرام اموال کو تجارت وغیرہ میں مشغول کردیا اوراب اصل رقوم باقی نہیں بچی ہیں، تو اب جاری کاروبار کی آمدنی حلال ہے، البتہ جتنی مقدار میں حرام مال کاروبار میں لگایا ہے، اتنی مقدار میں مال کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

"إذا غصب حنطة فزرعها أو نواة فغرسها غیر أن عند أبی یوسف یباح الا نتفاع فیهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاک من کل وجه" (ھدایہ، کتاب الغصب، فصل فیما یتغیر بفعل الغاصب، ۴/ ۳۷۷، اشرفی)۔

حرام مال کو بطور قرض حاصل کرنا:

جواب نمبر ۷

یہ حرام کمائی کس نوعیت کی ہے؟ اس کی وضاحت نہیں ہے؟ خیانت، غصب، چوری، فریب کا مال ہے، تو اسے صاحبِ حق کو واپس کرنا ضروری ہے، جیسا کہ گذشتہ اوراق میں بتایا جاچکا۔

"من اکتسب مالاً بغیر عقد کا لسرقة والغصب والخیانة، والغلول، ففی جمیع الأحوال المال الحاصل له حرام علیه، ولکن إن ا خذه من غیر عقد لم یملک ویجب علیه أن یرده علی مالکه إن وجد المالک و إلا ففی جمیع الصور یجب علیه أن یتصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء" (بذل المجهود، کتاب الطھارۃ، باب فرائض الوضوء، ۱/ ۷ ۳، سہارنپور)

لیکن اگر وراثت وغیرہ میں ربوٰ وغیرہ صورت میں مال حاصل ہوا ہے جیسا کہ سوال نامہ میں مذکور ہے تو ورثاء کے لیے ایسے اموال میں حلت کا حکم بیان ہو چکا ہے، پھر بھی کچھ حیلہ اختیار کر لینا بہتر ہے، تاکہ پورا مال؛ ربوی فساد سے پاس ہو جائے، اسی طرح اگر مالِ حرام کو تجارت وغیرہ میں لگایا اور اس کا نفع بھی (جو کہ حلال ہے، جیسا سوال نمبر ۶ کے جواب میں فتاوی محمودیہ کے حوالہ سے لکھا جاچکا ہے) اس مال حرام میں مخلوط ہو گیا، تو چونکہ پورا مال حرام نہیں ہے، اس لیے اس مال کے ایک حصے میں حلال وجائز ملکیت ثابت ہے، ثبوت ملکیت کی بنا پر جملہ مال کو پاک کرنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو سکے تو پھر مجبوری کے درجے میں کسی محتاج کو (یا اپنی بالغ فقیر اولاد، والدین، بیوی کو) اس مال کو بطور صدقہ دیں اور وہ کاروبار و دیگر ضروریات میں خرچ کرے، یا اس سے قرض لے لیا جائے۔

اور ایسا بھی کیا جاسکتا ہے کہ گھر کے بجائے اجنبی فقیر کو بھی صدقہ دے کر اس سے بطور قرض لیا جاسکتا ہے، ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ (صدقہ دینے سے قبل یا بعد) فقیر سے یہ طے کر لیں کہ مجھے قرض چاہئے، یہ روپیہ میں تم کو دے رہا ہوں، اسی سے تم مجھے قرض دے دو، میں کمائی کر کے تمہیں اتنی مقدار میں روپیہ واپس کر دوں گا، اس طرح قرض بھی حاصل ہو جائے گا اور صدقہ کر کے اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوا جاسکتا ہے۔

حلال وحرام مخلوط کاروبار میں ملازمت

جواب نمبر ۸

حرام کام کی نوعیت کیسی ہے؟ اگر اس طرح ہے کہ ملازم کے عمل سے حرام کام بلاواسطہ قائم ہو رہا ہے تو ملازم کے

لیے یہ عمل ناجائز ہے، جیسے کہ کھانے والے کے سامنے شراب پیش کرنا۔

" **ولایجوز الاستئجار علی حمل الخمر لمن یشربها ولا علی الخنزیر**" (الموسوعۃ الفقہیہ ۱/۲۹۰)۔

اور اگر نقل وحمل کے بعد ملازم اور عاملِ معصیت یعنی مباشر کے درمیان کچھ فصل ہورہا ہوتو ایسی ملازمت کی اجرت جائز ہے۔

"**وجاز حمل خمر ذمی بنفسه أو دابته بأجر، وفی رد المحتار: وعلی هذا الخلاف لو آجر دابة لینقل علیه الخمر یطیب له الأجر عندهٗ**" (الدرالمختار مع ردالمحتار ۹/۵۶۲، زکریا)۔

"تحقیق نوکری بینڈ باجہ" کے عنوان کے تحت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

"ناجائز فعل کی نوکری جائز نہیں ہے، لیکن جو نوکر ہو چکا اور وہ قانون سے (باہمی معاہدہ) مجبور ہے، مجبوری میں اس کی اجازت ہے" (امدادالفتاوی، کسب جائز وناجائز ومکروہ، ۴/۱۴۰، زکریا)۔

چونکہ ناجائز کاموں کی ملازمت میں اعانت علی المعصیۃ کسی درجہ میں پایا جاتا ہے، اس لیے ایسے کاموں سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

حضرت مفتی محمود الحسن صاحبؒ فرماتے ہیں۔

"ایسی ملازمت جس میں سود کا حساب ہی ہو۔۔۔ اگر آپ کو اپنی جائز ملازمت میں کچھ ایسا کام بھی کرنا پڑتا ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں، جائز کام کے مقابلہ میں اگر دوسرا کام کم ہے، تو اپنی ملازمت ترک نہ کریں، اگر جائز کام کم ہو اور دوسرا کام زائد ہو، تب بھی فوراً ملازمت ترک نہ کریں، مبادا کہ پریشانی کا سامنا ہو، جو قابلِ برداشت نہ ہو (۲)، البتہ دوسری جائز کسبِ معاش تلاش کرتے رہیں، جب وہ میسر آجائے تب اس موجودہ ملازمت کو ترک دیں" (فتاوی محمودیہ)۔

"**إذا تعارض مفسدتان، روعی أعظمهما ضراراً بارتكاب أخفهما۔ وقال الزيلعی: ثم الأصل فی جنس هذه المسائل أن من ابتُلی بليتين وهما متساويان يأخذ منهماشاء، وإن اختلفا يختار أهونهما، لأن مباشرة الحرام لاتجوز إلا لضرورة**" (الاشباہ والنظائر، ۱/۲۶۱، رقم القاعدۃ ۵۹۸، کراچی)، (محمود الفتاویٰ، باب الاستنجاء علی المعاصی، ۱۷/۱۱۹ و ۱۲۰، دارالمعارف دیوبند)۔

حرام کمائی سے حاصل جائیداد سے استفادہ:

جواب نمبر ۹

حرام کمائی سِکّے (نقود) کی صورت میں ہیں، اور باقاعدہ طے کرکے انھیں متعینہ حرام کمائی (سِکّوں) سے جائیداد

خریدی گئی تو وہ جائیداد حرام ہوگی، لیکن اگر یہ جائیداد خریدنے میں سِکّوں کی تعیین نہیں تھی، بلکہ مطلقاً قیمت طے ہوئی پھر ان حرام سِکّوں کو ادا کیا تو امام کرخیؒ کے مطابق یہ جائیداد مشتری کے لیے حلال ہوگی، البتہ (جملہ حرام آمدنی کے ساتھ ہی) حرام آمدنی کی جتنی مقدار روپیہ صرف کیا ہے، اتنی مقدار میں مستحق کو واپس کرنا یا صدقہ کرنا ضروری ہوگا، یہی حکم گاڑی وغیرہ خریدنے کا بھی ہے۔

اگر کسی متعین ومخصوص حرام کام پر ملازم کی ڈیوٹی نہیں ہے، تو ایسے مقام پر ملازمت کرنا جائز ہے، اور اُس ملازمت کی اجرت حلال ہے، جیسا کہ جواب نمبر ۸ میں حضرت مفتی محمود الحسن صاحب کی تحریر نقل کی گئی ہے۔

ایسے مال سے خریدی گئی گاڑی وغیرہ کا حکم بھی یہی ہے، اس میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مزید توسُّع ہے کہ حرام آمدنی صدقہ کرنا ضروری ہے، اگر اس سے گاڑی وغیرہ خرید لیا تو گاڑی میں حرمت کا اثر نہیں ہوگا، البتہ جتنا حرام روپیہ گاڑی وغیرہ میں صرف کیا ہے، اتنی مقدار میں صدقہ کرنا ضروری ہوگا، امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال نقل کرنے کے بعد صاحب الدر کہتے ہیں:

"وعند أبی یوسف: لایتصدق بشیء منه کما لو اختلف الجنس، ذکره الزیلعی فلیحفظ"۔

"وفی رد المحتار: اقول(۳) رأیت فی الطوری عن المحیط: ولو اشتری بالدراهم المغصوبة طعاما حل التناول ولو اشتری بها دنانیر لم یجز له أن یتصرف فیها، فوجب علیه ردها لأن البیع فی الطعام لاینتقض باستحقاق الدراهم لأنه یجب علیه رد مثلها لا عینها اه۔۔۔۔ (الدر المختار مع رد المحتار، کتاب الغصب ۹/۲۷۷، زکریا)۔

اس سے معلوم ہوا کہ گاڑی وغیرہ میں خبث کا اثر نہیں ہے، اس لیے ایسے گاڑیوں پر بیٹھنے اور استفادہ کرنے میں کچھ خاص حرج نہیں ہے۔

یہی حال فیس وغیرہ کا ہے اگر غیر متعین وغیر مشارٌ الیہ حرام روپیہ کو فیس میں ادا کرتا ہے تو لینا جائز ہے، لیکن "متعین ومشار الیہ حرام" روپیہ کو فیس دیتا ہے تو اسے لینا جائز نہیں ہے۔

بوقت مجبوری رشوت میں سود کی رقم کا استعمال

جواب نمبر ۱۰

حکومت کے بینک یا حکومت غیر اسلامی سے منظور شدہ مالیاتی اداروں میں روپیہ جمع کرنے کی صورت میں وہاں

سے جو اضافی رقم ملتی ہے، وہ یقیناً سود ہے جو کہ نص قطعی کے ذریعہ حرام ہے، لیکن اس کا مصرف کیا ہو؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے، اکثر علماء اسے تصدق علی الفقراء ضروری قرار دیتے ہیں، لیکن اس پر کوئی نص نہیں ہے، یہ اجتہادی مسئلہ ہے، علماء نے مالک کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے تصدق علی الفقراء کا حکم فرمایا، تاکہ مالک کو اس کا ثواب پہنچتا رہے، ثواب پہونچنے کے لیے تصدق علی الفقراء ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کام جو باعثِ ثواب ہے اس میں ایسے اموال کو استعمال کی گنجائش ہے، ملی اداروں اور ان کی تعمیرات بھی ثواب اور صدقہ جاریہ کا باعث ہیں، حضرت مولانا مفتی عبید اللہ اسعدی صاحب لکھتے ہیں:

''ایک جماعت کے نزدیک رفاہی کاموں میں اس کا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔۔۔۔لقطہ واجب التصدق ہوتا ہے، لیکن واجب التملیک نہیں اور لقطے کے مصارف میں کارِ خیر کو مثلاً حکومت کی ضرورت کے مختلف کام، عامۃ الناس اور عامۃ المسلمین کی ضرورت کے کاموں میں بھی استعمال کیا ہے، لہٰذا یہ رقم رفاہی کاموں میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے، اس لیے کہ اس میں تملیک کا مسئلہ نہیں ہے، زکوۃ کی طرح اور اس کی حیثیت زکوۃ سے مختلف ہے۔ لہذا اس کو ہر طرح کے رفاہی کاموں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، جو عام انسانوں کے لیے مفید ہوں'' (مقالات اسعدی، جدید فقہی مباحث، جلد ہشتم ص ۲۲۶ و ۲۲۷، مفتی عبید اللہ صاحب اسعدی دامت برکاتہم، مکتبہ احسان، لکھنؤ، ۲۰۲۲ء)

اس لیے سودی رقوم اپنے ذاتی کام میں تو صرف کرنا جائز نہیں ہے، لیکن ملی اداروں کی تعمیرات وغیرہ میں کسی بھی عنوان سے صرف کی جاسکتی ہیں، اسی طرح ملی اداروں ں کی تعمیرات وغیرہ میں غلط قسم کے حکام کو بطور رشوت بھی یہ رقم دی جاسکتی ہیں۔

سودی بینک کا پورا انظام عام طور پر دیگر اقوام ہی کے انتظام میں ہوتے ہیں، اور ان کے یہاں حلال آمدنی کے لیے اہتمام نہ ہونے کے باوجود ان سے کاروبار کی اجازت دی گئی ہے۔

"تقدم فی شرکة المفاوضه أن أبا یوسف أجازها مع اختلاف الملة مع الکرا هة، وعلله الزیلعیؒ هناک بأن الکافر لایهتدی إلی جائز من المعقود" (ردالمحتار مع الدرالمختار، کتاب البیوع، باب المتفرقات ۷/ ۴۹۰ و ۴۹۱، زکریا)۔

ایسے اداروں کی طرف سے ملنے والے اضافی رقوم یعنی سود کو ملی کاموں میں استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

کسی بستی میں اکثریت کی آمدنی حرام ہو تو وہاں ہدیہ وغیرہ قبول کرنا:

جواب ۱۱

اس سوال کا جواب سوال نمبر ۴ کی ذیل میں تفصیل سے آچکا ہے، اصول یہ ہے کہ اگر داعی کی اکثر آمدنی حرام ہے

اور مدعو کو اس کے حرام ہونے کا علم بھی ہے، تو ایسی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے، جب تک کہ داعی وضاحت نہ کردے کہ یہ دعوت حلال آمدنی سے کی جارہی ہے۔

اور اگر کسی کی اکثر آمدنی حلال ہے، اور کچھ حرام کاروبار بھی ہے تو ایسی صورت میں ایسے داعی کی دعوت قبول کرنا جائز ہے، البتہ اگر داعی کی طرف سے وضاحت ہوجائے کہ اس دعوت میں مال حرام سے کھانے کا انتظام کیا گیا ہے تو پھر وہ دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہوگا، ٹافی، دیا سلائی، سوئی وغیرہ لینے میں بھی یہی حکم ہے۔

حرام کمائی والے کی دعا

جواب نمبر ۱۲

اکل حلال مستجاب الدعوۃ بننے کا ذریعہ ہے، جب کہ رزق حرام سے دعا کی قبولیت روک دی جاتی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس پر توبہ کے دروازے بند ہیں، ''**إن اللہ لایغفر أن یشرک به یغفر مادون ذالک لمن یشاء**''(النساء:۱۱۶)۔

اس لیے اگر کوئی ایسا شخص اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے کسی صالح شخص سے دعا کی درخواست کرے تو اس کے لیے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆☆☆

حلال وحرام تجارت وملازمت- احکام ومسائل

مفتی محمد زبیر ندوی بہرائچی ☆

تمہید:

اس وقت اور ماضی قریب میں یعنی آزادی سے قبل سودخوری کی جولعنت ہر معاشرہ پر سوار ہوئی، وہ نہایت افسوس ناک اور غریبوں کے خون چوسنے کے مترادف ہے، سودی نظام نے اور مال حرام کے عموم نے ایسے خطرناک اور اہم مسائل پیدا کردیے ہیں، جن کا حل اور شرعی رہنمائی حد درجہ ناگزیر ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی جو ادھر تیس پینتس سالوں سے ایسے جدید مسائل کے حل کے لیے کوشاں ہے، اس کے شکریہ کے ساتھ کہ اس نے ان مسائل پر توجہ دی، اس سے متعلق سوالوں کے جوابات درج کیے جاتے ہیں:

جواب:۱

وارثین کو جو مال وراثت میں حاصل ہوا ہے، اگر یہ محقق ہو کہ وہ مال حرام سے حاصل ہوا ہے، یا کسی کے مکان وزمین پر ناجائز قبضہ کرکے غصب کرلیا ہے، یا ایسی رقم ہے، جو چوری شدہ ہے، تو ان صورتوں میں اس مال کا حرام ہونا یقینی ہے، اور ورثاء کو علم ہو تو ان کے لیے اس کو لینا اور استعمال میں لانا جائز نہیں ہوگا، اس سلسلے میں فقہاء کی صریح عبارات موجود ہیں، مثلاً علامہ ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

"**أما الميراث فلا يطيب المال الحرام، هذا هو الصحيح**" (المقدمات الممهدات:۲/۶۱۷)۔

علامہ ابن عابدین شامی ایک مقام پر فقہاء احناف کا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

" **مات وكسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز الناقل وقال: لا نأخذ بهذه الراوية وهو حرام مطلقاً على الورثة فتنبه**" (ردالمحتار:۵/۱۰۴)۔

☆ دارالافتاء والتحقیق، بہرائچ، یوپی، انڈیا

البتہ چوں کہ آزادی سے قبل فقہاء کرام نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا تھا، اس لیے جو سودی رقم اس وقت غیر مسلموں سے حاصل ہوئی تھی، وہ تو جواز کے دائرہ میں آجائے گی، چنانچہ اگر وہ متحقق ہوتب تو اس کا استعمال درست ہے، لیکن اگر متحقق نہ ہو، اور یہ واضح نہ ہو رہا ہو کہ آزادی سے پہلے کی سودی رقم اور اس کی خریدی ہوئی جائیداد ہے، یا آزادی کے بعد کی؟ تو اس صورت میں اصول وقواعد سے دونوں کی تائید ہوتی ہے، اگر غور کیا جائے، چوں کہ اموال وجائیداد میں اصل حلت ہے؛ جیسا کہ مشہور قاعدہ ہے: ''**الأصل فی الأشیاء الإباحة**'' سے واضح ہے؛ لیکن اس میں حرمت کی ایک عارضی اور حادث صفت پیدا ہوگئی ہے، اور ''**إضافة الحادث إلی أقرب أوقاته**'' (مجلۃ الاحکام العدلیۃ، رقم المادۃ:) کے پیش نظر وہ رقم اور جائیداد آزادی کے بعد کی ہونا معلوم ہوتی ہے، اس قاعدہ کی رو سے اس مال حرام اور جائیداد کو آزادی کے بعد کا ہونا چاہیے، کیوں کہ وہ قریب ترین زمانہ ہے۔

اسی طرح فقہاء کا مشہور قاعدہ ہے: ''**إذا تعارض المانع والمقتضی یقدم المانع**'' (مجلۃ الاحکام العدلیۃ)، اس مسئلہ میں مال کا آزادی سے پہلے کا ہونا حرمت کے لیے مانع ہے، جب کہ آزادی کے بعد کا ہونا حرمت کا تقاضا کرتا ہے، اور چوں کہ مانع اور مقتضی میں تعارض کی صورت میں مانع کو مقدم رکھا جاتا ہے، اس لیے اس مال کو آزادی کے بعد کا ہونا مانا جائے اور اس کے حرام ہونے کا حکم لگایا جائے۔

اسی طرح فقہائے کرام کا ایک نہایت مشہور قاعدہ ہے: ''**إذاااجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**'' (مجلۃ الاحکام العدلیۃ، رقم المادۃ:) اور چوں کہ اس مسئلہ میں حلت وحرمت دونوں پہلو جمع ہوگئے ہیں؛ اس لیے اسے حرمت کے غلبے کے تحت حرام ہونا چاہیے، مذکورہ اصول وضوابط کی روشنی میں ایسی رقوم میں حرام ہونے کا حکم لگانا ظاہر ہوتا ہے۔

اس سوال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سودی رقم کے مکمل سودی ہونے کا یقین نہیں ہے اور یہ عین ممکن ہے کہ اس سودی رقم کے ساتھ دوسری رقم بھی شامل ہو؛ کیوں کہ مورث کے سود میں ملوث ہونے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ اس کی کل کمائی سود ہی سے ہو، اس لیے کہ وہ آدمی تجارت، زراعت، ہدیہ، تحفہ اور دیگر وسائل سے بھی صاحب مال بنتا ہے، پس یہ احتمال قوی موجود ہے کہ کچھ حصہ حرام اور کچھ حصہ حلال کا موجود ہو اور جب یہ نوعیت ہو تو پورے کو یقینی طور پر سود قرار نہیں دیا جاسکتا؛ اس لیے کہ فقہاء نے لکھا ہے، جب مال حلال مال حرام سے مختلط ہوجائے تو وہ مضمون ہوجاتا ہے اور اس کا دین یعنی عوض ادا کردینے سے وہ مال جائز ہوجاتا ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

''**اختلط المغصوب بملک الغاصب بحیث یمنع امتیازه کاختلاط بره ببره أو یمکن بحرج کبره بشعیره ضمنه بلا حل انتفاع قبل أدائه**'' (الدرالمختار مع ردالمحتار:۶/۱۹۱)۔

اسی طرح مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وراثت میں جو پراپرٹی ملی ہے ضروری نہیں کہ وہ مال حرام کی طرف اشارہ کر کے خریدی گئی ہو؛ بلکہ عین ممکن ہے مطلقاً بیع ہوئی ہو اور حرام سے رقم ادا کی ہو، تو پھر اس صورت میں مفتی بہ قول کے مطابق وہ رقم حرام نہیں ہوگی، اس سلسلے میں امام کرخی کے قول پر فتوی کی صراحت کرتے ہوئے علامہ شامی نے لکھا ہے:

"لكن الفتوى اليوم على قول الكرخي دفعا للحرج لكثرة الحرام وعلى هذا مشى المصنف" (ردالمحتار: ۷/ ۴۹۰)۔

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد جواز وعدم جواز کے پہلو پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے مال کو حرام قرار دینے کی صورت زیادہ قوی بھی ہے اور اصول سے قریب تر بھی؛ اس لیے عام حالات میں عدم جواز کا حکم ہوگا، اور وہ مال حرام قرار پائے گا، البتہ کوئی شخص سخت پریشان ہو تو اس کے لیے دوسرے پہلو پر عمل کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ فقط

جواب: ۲

جس مال وجائیداد کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ حرام مال سے حاصل ہوا ہے؛ خواہ آدمی نے خود اسے حرام طریقے پر حاصل کیا ہو یا کسی کے ذریعے حاصل ہوا ہو اور آدمی کو حرام ہونے کا علم ہو تو وہ مال وجائیداد اس کے لیے حرام ہوگا، علامہ ابن نجیم مصری نے لکھا ہے کہ حرمت کا علم ہونے سے حرمت متعدی ہو جاتی ہے "**الحرمة تتعدى مع العلم بها**" (الاشباہ والنظائر لابن نجیم: ۲۳۵)۔

فقہی انسائیکلوپیڈیا الموسوعہ الفقہیہ میں مذکور ہے:

"المال الحرام كالمأخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذلك ليس مملوكا لمن هو بيده" (الموسوعۃ الفقہیہ: ۲۳/ ۲۴۸)۔

اسی طرح امام شافعی نے لکھا ہے کہ اگر مال حرام کئی لوگوں تک پہنچ جائے تو بھی اس کی حرمت باقی رہتی ہے اور اصل مالک کو لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

"قوله (الحرام ينتقل) أي تنتقل حرمته فإن تداولته الأيدي وتبدلت الأملاك، قوله (ولا للمشتري منه) فيكون شرائه منه شيئا لأنه ملكه بكسب حرام وفي شرائه تقرير للخبث" (ردالمحتار: ۴/ ۱۴۵، مطلب البیع الفاسد)۔

البتہ دو صورتیں ایسی ہیں جن میں اس غریب شخص کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے:

۱۔ ایک صورت یہ ہے کہ وہ مکان وجائیداد جو اس کے پاس ہے وہ بعینہ حرام نہیں ہے، یعنی غصب وغیرہ کی نہیں

ہے؛ بلکہ وہ حرام رقم سے خریدی گئی ہے اور حرام رقم سے مطلقا خریدی گئی یعنی ثمن کے طور پر اس رقم کو دینے کا اشارہ نہیں کیا تھا، تو پھر اس صورت میں وہ اس کی ملکیت نہیں ہوگی اور اس کا کرایہ وغیرہ لینا درست ہوگا؛ البتہ حرام رقم دینے کا گناہ ہوگا اور اتنی رقم اس کے اوپر اگر مالک موجود ہو یا اس کے ورثہ ہوں تو دینا لازم ہوگا، ورنہ اتنی رقم واجب التصدق ہوگی، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم أخرى ودفع تلك الدراهم، قال أبو نصر يطيب ولايجب عليه أن يتصدق وهو قول الكرخي والمختار قول أبي بكر إلا أن الفتوى اليوم على قول الكرخي كذا في الفتاوى الكبرى**" (الفتاوی الھندیہ: ۳/ ۲۱۵، فصل فی الاحتکار)۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال حرام ہے، مثلا: رشوت اور سود کے پیسے ہیں یا مکان مغصوب ہے اور اس کا اصل مالک معلوم نہیں ہے، تو پھر ایسے مال حرام کو صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے، چنانچہ وہ واجب التصدق ہوگا، جس کے پاس ہے اگر وہ خود محتاج ہو اور اس کے پاس اس کے سوا مال نہ ہو تو وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور صدقہ کا مستحق ہونے کی بناء پر اپنی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے، پھر آئندہ جب اس کی غربت ختم ہوجائے اور اسے مال داری نصیب ہوجائے تو اتنی ہی رقم صدقہ کردے، اسی طرح سردست اس کو فائدہ اٹھانا جائز ہوگا، علامہ موصلی حنفی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"**والملك الخبيث سبيله التصدق به، ولو صرفه في حاجة نفسه جائز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله، و إن كان فقيرا لا يتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار: ۳/ ۷۰، دار الکتب العلمیہ)۔

پس مندرجہ بالا صورتیں اس غریب شخص کے استفادہ کی ہوسکتی ہیں، باقی صورتوں میں وہ رقم لوٹانا یا صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

جواب: ۳

اگر کسی عورت کا شوہر یا بیٹا حرام ذریعہ معاش میں لگا ہے اور اسی سے نان ونفقہ چلاتا ہے، تو اولا ضروری ہے کہ وہ اس کو حرام کمائی سے منع کرے اور ہوسکے تو حلال کمائی کے اسباب کی نشاندہی کرے اور اس میں لگانے کی ہر ممکنہ کوشش کرے، لیکن اگر اس کے باوجود وہ باز نہیں آتا ہے تو عورت کے لیے اگر جائز کمائی کے اسباب ہوں اور وہ اس پر قادر ہو، مثلاً کڑھائی بنائی، سلائی وغیرہ کے ذریعے وہ اپنے معاش وضروریات کا انتظام کرسکتی ہو، تو اس کا انتظام کرے اور اگر اس کی صورت نہ بن سکتی ہو اور وہ ان کی کمائی کھانے پر مجبور ہو تو مجبورا اس کے لیے کھانا پینا اور ضروریات کی تکمیل جائز ہوگی، البتہ دل میں ہمیشہ اسے برا سمجھتی رہے اور اس حرام کمائی کا سارا گناہ کمانے والے یعنی شوہر یا بیٹے پر ہوگا، جامع الفصولین کے حوالے سے علامہ

شامی نے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فی جامع الفصولین اشتری الزوج طعاما أو کسوة من مال خبیث جاز للمراة أکله ولبسها والإثم علی الزوج" (ردالمحتار علی درالمختار:۶/۱۹۱)۔

علامہ شامی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أکلت من طعامه ولم یکن عینه غصبا أو اشتراى طعاما أو کسوة من مال لیس أصله بطیب فهی فی سعة من ذالک والإثم علی الزوج" (ردالمحتار علی درالمختار:۶/۳۸۶)۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں رقم طراز ہیں:

''حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش جاری رکھے'' (فتاوی عثمانی:۳/۱۲۶، کتاب البیوع)۔

پس مذکورہ بالا وضاحتوں سے ظاہر ہوگیا کہ مجبوری کی صورت میں عورت کے لیے اس کمائی سے منتفع ہونا درست ہے، البتہ عام حالات میں جائز نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر والدین نے بچے کو مال حرام سے پڑھایا ہو اور پڑھنے کے بعد وہ بچہ جائز نوکری کرتا ہے، تو اس کے لیے اور اس کے والدین اور اسکی بیوی کے لیے وہ کمائی بالکل حلال ہوگی، کیوں کہ اس کی نوکری شرعا درست ہے اور آدمی کو چوں کہ اپنی محنت کا معاوضہ ملتا ہے، نا کہ حاصل شدہ ڈگری کا؛ اس لیے اس کی محنت ہونے کی وجہ سے اس کی نوکری اور اس کی کمائی درست ہوجائے گی۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"ثم الأجرة تستحق بأحدی معانی ثلاثة: إما بشرط التعجیل أو بالتأجیل من غیر شرط أو باستیفاء المعقود علیه" (الھدایہ:۳/۲۹۳، کتاب الاجارہ، باب الأجر متی یستحق)۔

اسی طرح شیخ وہبہ زحیلیؒ اجرت کے استحقاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لأنه أجر علی عمل وجهد معقول" (الفقہ الاسلامی وادلتہ:۵/۳۳۳۶، بیع السمسرۃ، دارالکتب العلمیہ، بیروت)۔

جواب:۴

جس شخص کے یہاں دعوت ہے یا اس کی طرف سے ہدیہ مل رہا ہے، اس کے سلسلے میں دو بنیادی اصول ہیں: ایک تو

یہ ہے کہ اگر اس کی کمائی کا غالب حصہ حرام ہے، تو اس کی دعوت کھانا، ہدیہ قبول کرنا اس وقت تک جائز و درست نہیں ہے، جب تک واضح طور پر یہ نا بتادے کہ جو کھانا وہ کھلا رہا ہے یا ہدیہ دے رہا ہے، وہ جائز کمائی سے ہے، اور اس میں حرام رقم شامل نہیں ہے، اگر وہ صراحتا بتادیتا ہے، تو اس کی دعوت و ہدیہ قبول کرنے میں چنداں حرج نہیں، فتاوی ہندیہ میں ہے:

"آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲)۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر متحقق و متعین طور پر معلوم ہو کہ داعی یا واہب کی کمائی کا غالب مال حلال ہے، بس تھوڑا سا وہ حرام کاروبار میں ملوث ہے، تو اس کی دعوت قبول کرنے یا ہدیہ تحفہ لینے میں حرج نہیں ہے؛ جب تک وہ صراحتا یہ نہ کہہ دے کہ یہ مال حرام سے تیار کیا گیا ہے، اگر وہ مال حرام کی وضاحت کر دیتا ہے، تو اس کا ہدیہ و تحفہ اور دعوت طعام قبول کرنا درست نہیں ہے، بصورت دیگر درست ہے؛ یعنی اگر حلال ہونے کی صراحت کر دے یا کچھ نہ بولے مطلقا دعوت کا معاملہ ہو، تو گنجائش موجود ہے، اس کی وضاحت فتاوی تاتارخانیہ میں ان الفاظ میں موجود ہے:

"إن كان غالب ماله من حلال فلاباس بأن يقبل الهدايا، ويأكل مالم يبين له أن ذالك من الحرام" (الفتاوی التاتارخانیہ:۱۸/۱۷۵)۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ یہ تو معلوم ہے کہ داعی یا واہب حرام میں ملوث ہے اور اس کے یہاں حرام رقم آتی ہے؛ لیکن یہ متعین نہیں ہے کہ کتنی آتی ہے، آیا پورا مال حرام ہے، یا کچھ حرام ہے؟ تو اس سلسلے میں بعض نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی تحقیق و تفتیش کی زحمت کرنی چاہیے، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذرہ ایک یہودی کے یہاں رہن رکھ کر جَو ادھار لیا تھا، حالاں کہ یہودیوں کی سودخوری محتاج بیان نہیں، مسند احمد کی روایت ان الفاظ میں ہے:

"عن أنس بن مالك، أنه مشى إلى رسول الله ﷺ بخبز شعير و إهالة سخنة، ولقد رهن درعه عند يهودي فاخذ شعيرا لأهله" (مسند احمد بن حنبل:۱۳۱۶۹)۔

مذکورہ بالا روایت کو ذکر کر کے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ المفاتیح میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودی سے جَو لے لیا؛ حالاں کہ یہودی اپنے معاملات میں سودی کاروبار کرتے ہیں، اور شراب کی قیمت کو بھی جائز سمجھتے تھے۔

"فإن النبي ﷺ رهن درعه من يهودي بشعير أخذه لقوت أهله مع أنهم يربون في معاملاتهم

ویستحلون أثمان الخمور'' (مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح:۶/۱۱)۔

اسی طرح امام بغوی نے شرح السنہ میں لکھا ہے کہ جب حلال وحرام دونوں مال ہوں (اور غالب اور غیر غالب کا علم نہ ہو) تو اسے کھانے میں حرج نہیں ہے، جب تک داعی وضاحت نہ کردے کہ یہ مال حرام سے بنایا گیا ہے۔

''**قالوا إذا كان المال فيه الحلال والحرام فلا بأس أن يُؤكل منه إلا أن يعلم أن الذى يطعمه أو يهديه إليه حرام بعينه فلا يحل**'' (شرح السنہ:۸/۱۴)۔

مذکورہ بالا وضاحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حرام وحلال دونوں طرح کا مال ہو تو اس کے یہاں دعوت وغیرہ کھانے کی گنجائش ہے؛ جب تک حرام مال سے کھلانے کی صراحت خود نہ کردے، نیز عموماً لوگ حرام مال کھلانے سے پرہیز کرتے ہیں؛ اس لیے مزید گنجائش کی راہ نکل سکتی ہے۔

جواب:۵

مال حرام کے سلسلے میں اگر پہلے سے معلوم ہے تو پھر اس کا کھانا پینا درست نہیں ہے، لیکن اگر نادانستہ ایسا مال کھالے یا بالکلیہ حرام کمائی والے کی دعوت کھالے تو اولاً توبہ واستغفار کرے، کیوں کہ نادانستہ بھی اگر گناہ کا کام ہوجائے تو توبہ واستغفار کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے، ارشاد تعالیٰ ہے:

''**إنما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئك يتوب الله عليهم وكان الله عليما حليما**'' (سورۂ نساء:۱۷)۔

توبہ واستغفار کے بعد آدمی کو چاہیے کہ ایک اندازہ کرکے جتنا کھایا ہے، اس کی قیمت بھی صدقہ کردے؛ کیوں کہ مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کو بعینہ واپس کردیا جائے، حتی کہ حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر لقمہ منہ میں موجود ہو تو اسے بھی نکال دینا ضروری ہے، چنانچہ مال زکاۃ کے سلسلے میں روایت میں آیا ہے کہ حضرت حسنؓ نے منہ میں رکھ لیا تو حضور ﷺ نے منہ سے نکلوالیا۔

''**عن أبى هريره قال: أخذ الحسن بن على تمرة من تمر الصدقة فجعلها فى فيه ، فقال رسول الله ﷺ كخ كخ، ارم بها، أما علمت أنا لا نأكل الصدقة**'' (بخاری:۱۴۹۱)۔

لیکن صورت مسئولہ میں چوں کہ اس نے کھانا کھالیا ہے تو اب اسے نکالنا ناممکن ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جب اصل فوت ہوجائے تو بدل کو اختیار کیا جاتا ہے، مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے:

''**إذا بطل الأصل يصار إلى البدل**'' (مجلۃ الاحکام العدلیہ: رقم المادہ:۵۳)۔

اس لیے مذکورہ صورت میں اس کی قیمت صدقہ کرنا ہوگا؛ تاکہ ناجائز وحرام مال کی تلافی ہوجائے۔

اس موقع پر یہ نکتہ بھی واضح رہنا ضروری ہے کہ اگر کھانے والا خود فقیر ہے، یعنی صاحب نصاب نہیں ہے، تو اس کے لیے صدقہ وغیرہ کرنا ضروری نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے اس کھانے کی گنجائش ہوگی، اس صورت میں اتنا کھانا اس کے حق میں صدقہ مان لیا جائے گا، یہ مسئلہ ان جزئیات سے مستفاد ہوتا ہے، جن میں بوقت ضرورت ملک حرام کو استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے؛ چنانچہ علامہ موصلی نے لکھا ہے:

"الملک الخبیث سبیله التصدق به، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کا ن غنیا تصدق بمثله، وإن کان فقیرا لایتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار: ۳/ ۷۰، دارالکتب العلمیہ)۔

پس اس سوال کا خلاصہ یہ ہوا کہ فقیر اگر ایسی دعوت کھائے تو گنجائش ہے اور اگر امیر کھاتا ہے، تو توبہ واستغفار کرے اور اس کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔

جواب:۶

پہلے سے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کے لیے بعض لوگوں نے یہ بات لکھی ہے کہ اگر اس شخص نے کوئی سامان ادھار خریدا اور پھر اس ناجائز مال سے اس کا ثمن ادا کردیا تو وہ سامان اس کے لیے حلال ہوجائے گا، اس طرح بالواسطہ اس کی رقم پاک اور استعمال درست قرار پایا، اس سلسلے میں فتاوی ہندیہ کی درج ذیل عبارت سے استفادہ کیا گیا ہے:

"والحیلة فی هذه المسائل أن یشتری نسیئة ،ثم ینقد ثمنه من أی مال شاء" (الفتاوی الھندیہ: ۵/ ۳۴۲، کتاب الکراہیہ، الباب الثانی عشر)۔

لیکن ظاہر ہے یہ مسئلہ اور حیلہ علی الاطلاق درست نہیں ہوسکتا، کیوں کہ حرام مال کو ملکیت میں لانے اور اس کو جان بوجھ کر اپنے فائدہ میں خرچ کرنے کا گناہ کیوں کر ختم ہوسکتا ہے؟ اس لیے دور حاضر کے مشہور فقیہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس پر گرفت کرتے ہوئے اس کا محمل بھی متعین کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس حیلہ سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا، وہ حلال ہوجائیگا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا" (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۲۵)۔

مذکورہ بالا وضاحت سے معلوم ہوا کہ مال حرام کو پاک کرنے اور استعمال کرنے کے لیے جو عمومی طریقہ لکھا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، لیکن اس کا دوسرا طریقہ تملیک ہے، یعنی جیسے زکاۃ اور صدقات واجبہ کی تملیک کے ذریعے پاک کرکے دیگر مصارف میں استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، وہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ جس

سے وہ حرام رقم ملی ہے، وہ معلوم نہ ہو، اور اس کے ورثہ بھی معلوم نہ ہوں، اور آخری صورت واجب التصدق کی بچی ہو تو تملیک کرا کر یعنی کسی فقیر محتاج کو صدقہ کر دے، پھر وہ فقیر محتاج اسے ہدیہ یا ہبہ کے طور پر واپس کر دے، تو اب وہ رقم اس کے لیے حلال ہو جائیگی، اگر اصل مالک یا اس کے ورثہ معلوم ہوں تو پھر انہیں لوٹانا ضروری ہوگا؛ چنانچہ بذل المجہود میں ہے:

"**من اکتسب مالا بغیر حق، یجب رده علی مالکه**" (بذل المجہود:۲۵۹۱، کتاب الطہارہ)۔

اس ضمن میں علامہ شامی فرماتے ہیں:

"**الحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فلا، فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق بنية صاحبه**" (ردالمحتار:۷/۲۲۳، کتاب البیوع، زکریا)۔

واضح رہے کہ مال حرام کو صدقہ کرنے کے بعد واپس ملنے پر حلال ہونے کی علت ملکیت کی تبدیلی ہے، کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے:

"**تبدل سبب الملک قائم مقام تبدل الذات**" (مجلۃ الاحکام العدلیۃ، رقم المادۃ:۹۸)۔

اور یہ قاعدہ واصول حدیث بریرہ سے ماخوذ ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت بریرہ کو صدقہ کے طور پر ملے گوشت کو بطور ہدیہ قبول فرمالیا تھا، حدیث کے الفاظ ہیں:

"**عن أنس بن مالک أن النبی ﷺ أتی بلحم تصدق علی بریرة ، هو علیها صدقة، وهو لنا هدیة**" (بخاری:۱۴۹۵، کتاب الزکاۃ)۔

نیز اگر وہ خود محتاج ہو تو اپنی ضرورت میں خرچ کر سکتا ہے، صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، جو کہ اختیار کے حوالے سے گذشتہ جواب میں گزرا۔

جواب:۷

حرام کمائی کا اولین مصرف یہ ہے کہ جس سے وہ مال حاصل ہو رہا ہے، اس کو واپس کیا جائے، اور اگر یہ متعذر ہو تو پھر اسے صدقہ کیا جائے، لیکن بعض فقہاء نے ضرورت مند کے لیے اس کو اپنے استعمال میں لانے کی بھی اجازت دی ہے اور اپنے استعمال میں لانے کی ایک صورت وقتی طور پر اسے قرض لینے اور بعد میں واپس کر دینا بھی ہے، چناں چہ علامہ موصلی نے ایک مقام پر اس کی صراحت کی ہے:

"**الملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کا ن غنیا تصدق بمثله، و إن کا فقیرا لا یتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار:۳/۷۰، دار الکتب العلمیہ)۔

فقہاء احناف کے یہاں اس مال سے قرض لینے کی صراحت مجھے نہیں مل سکی، لیکن ائمہ حنابلہ میں سے امام احمد بن تیمیہ نے اپنے فتاوی میں صراحتا قرض لینے اور بعد میں واپسی کی بات لکھی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"فإن كان يقدر يتجر أو يعمل صنعة كالنسج والغزل، أعطى ما يكون له رأس، و إن اقترضوا منه شيئا ليكتسبوا به، ولم يردوا عوض القرض كان أحسن" (مجموع فتاوی ابن تیمیہ:۲۹/۳۰۹)۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ ایسا مجبور شخص اس طرح کے مال سے وقتی قرض لے سکتا ہے اور جب سہولت ہو تو راس المال کے بقدر مال صدقہ کردے۔

جواب:۸

ہر ایسا عمل جس میں تعاون علی الاثم اور گناہ کے کاموں کو انجام دینا پایا جاتا ہو، اس کام کو کرنا، اس کی اجرت لینا اور اس میں تعاون کرنا شرعا درست نہیں ہے، ارشاد ربانی ہے:

"ولا تعاونوا على الإثم والعدوان" (المائدہ:۲)

گناہ کے کاموں میں تعاون کے سلسلے میں روایت میں یہاں تک آیا ہے کہ ایسا شخص جارج از اسلام ہوجاتا ہے:

"من مشى مع ظالم ليعينه وهو يعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام" (المعجم الکبیر:۱/۱۹۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ معصیت اور ظلم کے کاموں میں تعاون کرنا جائز نہیں ہے۔

جواب:۹

حرام سے حاصل شدہ جائیداد اگر بعینہ حرام ہے، مثلاً: وہ غصب کردہ ہے، رشوت کے طور پر لی ہوئی ہے، تو وہ زمین بالکلیہ حرام ہوگی، اس میں کھیتی باڑی کرنا، پیداوار حاصل کرنا سب ناجائز ہے، اس زمین کو فی الفور اس کے اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اس پر ملکیت کا ثبوت ہوا ہی نہیں، موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"المال الحرام كالمأخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذالک ليس مملوكا لمن هو بيده" (الموسوعہ الفقہیہ:۲۳/۲۴۸)۔

اور اگر نفس جائیداد حرام نہ ہو؛ بلکہ حرام مال سے خریدی گئی ہو، تو اس میں تفصیل ہے، اگر اس جائیداد کو مال حرام کی طرف اشارہ کرکے خریدی ہو، اور وہی حرام رقم ادا کی ہو، تو پھر وہ ناجائز ہوگی اور اس کی آمدنی بھی ناجائز ہوگی اور واجب التصدق ہوگی، لیکن اگر مال حرام کی طرف اشارہ کئے بغیر اس مال سے جائیداد خریدی یا مطلقا جائیداد کی خریداری کا معاملہ کرلیا

اور مال حرام ہی سے قیمت ادا کردی، تو بیشتر فقہاء کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہے؛ لیکن امام کرخی کے نزدیک اصل زمین تو حرام ہوگی اور اس کو صدقہ کرنا واجب ہوگا، لیکن اس میں کھیتی باڑی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع جائز ہوگا، امام کرخی کی تفصیل نقل کرتے ہوئے علامہ حصکفی رقم طراز ہیں:

"**رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه .....قال الكرخي في الوجه الأول والثاني لايطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبوبكر : لايطيب في الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس**" (الدرالمختار مع ردالمحتار:۵/۲۳۵،سعید)۔

چناں چہ صورت مسئولہ میں گنجائش ہے کہ حرام مال سے خرید کردہ جائیداد کی قیمت جائز آمدنی سے صدقہ کردے، اور اس میں کھیتی باڑی کرنا درست ہوگا، اور بہتر یہی ہے کہ کھیتی باڑی بھی رقم صدقہ کرنے کے بعد ہی کرے، چنانچہ امام طحطاوی وغیرہ نے لکھا ہے:

"**نعم لايباح الانتفاع به قبل أداء البدل في الصحيح من المذهب**" (حاشیۃ الطحطاوی علی الدرالمختار:۴/۱۹۲)۔

"**قد اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۲۴۹،رشیدیہ)۔

جہاں تک بات ہے حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنے کی تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ حرام کاروباری شخص کے پاس جائز رقم بھی آتی ہے، اور سب کو خلط ملط کرکے رکھتا ہے، تو اس صورت میں اس کے یہاں کام کرنے اور تنخواہ لینے میں حرج نہیں ہے، چنانچہ فتاوی ہندیہ میں اس طرح کے مخلوط مال سے لینے کو درست قرار دیا گیا ہے۔

"**لو أن فقيرا يأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان يأخذها غصبا أيحل ذلك له، قال: إن خلط ذلك بدراهم أخرى فإنه لاباس به**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲،طبع رشیدیہ)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عین مال حرام کو یہ اجرت کے طور پر دے رہا ہے، اور اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی مال نہیں ہے، اور لینے والے کو معلوم بھی ہے کہ یہ حرام ہے تو پھر اس کے لیے اس رقم کا لینا جائز نہیں ہوگا، چناں چہ علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

"**أما من راى المكاس يأخذ من أحد شيئا من المكس ثم يعطيه آخر، ثم يأخذ من ذالك الآخر فهو حرام**" (الدرالمختار مع ردالمحتار:۶/۳۸۵،سعید)

اسی طرح فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**و إن دفع عين المغضوب من غير خلط لم يجز**" (الفتاوی الھندیہ:۶/۳۴۶،رشیدیہ)

اس کی تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ حرام مال والے کے گھر نوکری کرنے والے کو اس کے حرام مال کی تفصیلات معلوم نہیں ہے، اور نہ یہ معین ہے کہ حرام مال سے ہی تنخواہ مل رہی ہے یا حلال سے؟ اور جو وہ کام اس کے یہاں کرتا ہے وہ فی نفسہ حلال ہے تو پھر بنا تفتیش کے اس کے یہاں کام کرنا اور تنخواہ لینا درست ہے، کیوں کہ اس زمانے میں بے غبار معاملات سے بچنا متعذر ہے، فتاوی ہندیہ میں جواہر الفتاوی کے حوالے سے لکھا ہے:

"وفی الجملة أن طلب الحلال من هذه البلاد صعب ، وقد قال بعض مشايخنا :عليک بترک الحرام المحض فی هذا الزمان، فإنک لا تجد شيئا لا شبهة فيه، كذا فی جواهر الفتاوی" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲)۔

حرام کمائی والے کی بائک اور کار میں بیٹھ کر سفر کرنے یا اس کی جمع کردہ فیس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ معلوم و متعین گاڑی ہے، جس پر سوار ہو رہا ہے یا معلوم و متعین رقم سے فیس دے رہا ہے، تو **"الحرمه تتعدی مع العلم بها"** کے تحت اس پر سواری کرنا یا وہ فیس لینا درست نہیں ہے؛ لیکن اگر معلوم نہیں اور اس نے مطلقا بٹھا لیا یا فیس ادا کردی تو اس کا لینا درست ہے، اس سلسلہ میں فتاوی ہندیہ کے مرتبین نے امام محمد کا مختار قول جواز کا لکھا ہے:

"قال الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالى: اختلف الناس فی أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من حرام، قال: محمد رحمه الله: وبه ناخذ مالم يعرف شيئا حراما بعينه، وهو قول أبی حنيفة وأصحابه، كذا فی الظهيرية" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲)۔

جواب:۱۰

اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ سود کا اولین مصرف یہ ہے کہ جس سے وہ رقم حاصل ہوئی ہے، اس کو واپس کردی جائے، اگر اس کے اصل مالک تک پہونچانا ممکن نہ ہو، تو پھر بلا نیت ثواب اسے صدقہ کرنا ضروری ہے، اس کو اپنے نفع میں استعمال کرنا درست نہیں ہے، فتاوی شامی میں ہے:

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، و إلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه" (فتاوی شامی:۵/۹۹، مطلب فی من ورث مالا حراما)

مال حرام یعنی سود وغیرہ کا جو یہ حکم بیان ہوا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس مال پر اس کی ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی ہے، اور جب ملکیت نہیں تو اس سے ذاتی استفادہ درست نہیں ہوگا، موسوعہ فقہیہ میں ہے:

"المال الحرام كالمأخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذلک ليس مملوكا له بيده"

(الموسوعہ الفقہیہ :۳۲/۸۴۲)

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ سود وغیرہ سے ناجائز مال پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے، تو جب ملکیت کا ثبوت نہیں ہوا، تو اپنے مصرف وفائدہ میں استعمال درست نہیں ہے، اور جب یہ استعمال درست نہیں ہوا تو عمارت وغیرہ کی منظوری کے لیے کارپوریشن والوں کو سود سے پیسے دینا درست نہیں ہوگا، اس کی ایک دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح کی رقم سرکاری خزانے میں بھی نہیں جاتی ہے کہ سرکاری بینک سے ملی رقم میں ''ردعلی ارباب المال'' کی صورت پیدا ہوجائے اور جواز کی شکل نکل آئے ؛ بلکہ یہ رقم ان سرکاری محکموں کے ملازمین اور کارکنان کی جیبوں میں جاتی ہے، اور جب ان کو رقم گئی تو کسی بھی اصول کے تحت سودی رقم دینا درست نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی رقوم کو کارپوریشن کے ملازمین کو بطور رشوت دینا جائز نہیں ہے۔

جواب:۱۱

اگر کسی شخص کے بارے میں متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ سودخور ہے تو صرف امکان کی وجہ سے اس کی رقم اور کمائی ودیگر سامان کے ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے، کیوں کہ لوگوں کے مال میں اصل حلت واباحت ہے اور اس میں ناپاکی وحرمت کا آنا محض مشکوک ہے اور قاعدہ ہے: ''**الیقین لایزول بالشک**'' (مجلۃ الاحکام العدلیہ: رقم المادہ:۴)۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں سوال کرنے اور تفتیش کرنے سے منع فرمایا ہے:

''**عن أبی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولايسأله عنه، فإن سقاه شرابا يشربه فليشرب من شرابه، ولم يسأله عنه**'' (مسند احمد بن حنبل:۲/۲۹۹، رقم:۹۱۷۳)۔

بلکہ بعض آثار صحابہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص سودخود ہو اور وہ دعوت دے رہا ہے، تو جب تک یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ سود ہی کی رقم کھلائے گا، اس کے یہاں بغیر پوچھے اور تفتیش کیے کھانا کھا سکتے ہیں، اب اگر وہ ناجائز کرتا ہے، تو اس کا گناہ اس کے سر ہوگا، کھانے والے کے نہیں:

''**عن ابن مسعود قال: جاء إليه رجل فقال: إن لی جارا يأكل الربا، وأنه لايزال يدعونی ، فقال: مهناه لک، و إثمه عليه، قال سفيان: فإن عرفته بعينه فلا تصب**'' (مصنف عبدالرزاق:۸/۱۵۰، رقم:۱۴۶۷۵)۔

اسی طرح فتاوی تاتارخانیہ میں منقول ہے کہ اگر بادشاہ کی ضیافت کے لیے کوئی چیز پیش کرے اور یہ معلوم نہ ہو کہ

یہ عین حرام ہے تو اس کا کھانا درست ہے:

"رجل دخل على السلطان فقدم إليه بشيء ماكول ، فإن اشتراه بالثمن أو لم يشتره ذلك ، لكن هذا الرجل لايعلم أنه مغصوب بعينه ، حل له أكله ، هكذا ذكر ، والصحيح أنه مال السلطان" (الفتاوی التاتارخانیہ:۱۸/۱۷۵)۔

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آپ جس شخص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ ہو یا معلوم ہو؛ مگر عین شئ کا حرام ہونا معلوم نہ ہو، تو اس کا ہدیہ قبول کرنا، بچوں کا ٹافی لینا، پانی اور دیگر ضروریات کی چیزیں لینا درست ہوگا۔

جواب:۱۲

صحیح مسلم کی روایت میں یہ بات آئی ہے کہ اگر آدمی کا مال حرام ہے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، روایت کے الفاظ درج ذیل ہیں:

"الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء، يارب يارب ! ومطمه حرام ، ومشربه حرام، وغذى بالحرام، فأنى يستجاب" (صحیح مسلم:۱۰۱۵، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ)۔

اس روایت سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص حرام مال کھاتا ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، لیکن علامہ ابن رجب حنبلیؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دراصل قبول دعا کے استبعاد کو بتانے کے لیے بطور تمثیل ہے:

"وما ذكره بعد ذلك من الدعاء وأنه كيف تقبل مع الحرام فهو مثال لاستبعاد قبول الأعمال مع التغذية بالحرام" (جامع العلوم والحکم:۳۴)۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات غالباً زجر وتوبیخ اور بیان شناعت کے لیے ہے، نا کہ بالکلیہ کوئی بھی دعا مقبول نہ ہونے کی صراحت ہے۔

پھر دوسری بات جو سوالنامہ کا اصل سوال ہے کہ اگر کسی عالم دین یا بزرگ شخصیت کو حرام کھانے والا مدعو کرے اور وہ دعا کرے یا پانی وغیرہ پر دم کرے تو قبول ہوگی یا نہیں؟ ظاہر ہے اگر وہ عالم یا بزرگ حرام میں ملوث نہیں ہے، تو اس ک دعا قبول ہوگی، کیوں کہ دوسرے کی حرام خوری سے اس کی دعا پر اثر نہیں پڑے گا۔

☆☆☆

حرام مال سے متعلق بعض اہم مسائل

مولانا خان حبیب الرحمٰن ندوی ☆

تمہید:

سود کی لعنت نے اس وقت پورے معاشرے کو اپنی چپیٹ میں لے رکھا ہے، زندگی کے ہر موڑ پر سود اور سودی نظام کا سامنا ہے، ایسے وقت میں انسان کے لیے حلال وحرام کو جاننا اور اس پر عمل نہایت ضروری ہے، حدیث شریف میں کسب حلال کو فرائض میں شمار کیا گیا ہے (شعب الایمان: ۸۷۴۱)، وہیں دوسری جانب حرام سے اجتناب کا حکم بھی دیا گیا ہے (صحیح ابن حبان: ۵۵۶۷)، اسوقت اس مادیت کے دور میں انسان مال کمانے کی دوڑ میں اس قدر مشغول ہے کہ اسے اس بات کی بالکل فکر نہیں کہ وہ مال اسے کہاں سے ملا، آیا وہ حلال ہے یا حرام؟ اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے ذمہ داروں کو جو کئی سالوں سے جدید مسائل میں امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور امسال کے سوال نامہ میں ان اہم سولات کو شامل کیا۔

جواب: نمبر ا

اگر ورثہ کو اس بات کا یقین ہو کہ ہمیں جو مال وراثت میں ملا ہے، وہ حلال ہے، اس میں کسی بھی قسم کی حرام کمائی کی آمیزش نہیں ہے، ناکسی کا حق اس سے متعلق ہے، تو ان کے لیے اس مال کو لینا اور استعمال کرنا جائز ہوگا؛ لیکن اگر ان کو معلوم ہو کہ ان کو ملنے والا مال حلال نہیں ہے، اس کی بعض چیزیں غصب کی ہیں، یا انشورنس وفکس ڈپازٹ یا اس طرح کی اور کوئی سودی رقم شامل ہے، یا کسی صاحب حق کا حق اس کے متعلق ہے تو ورثاء کے لیے اس مال کو لینا اور اس میں تصرف کرنا جائز نہیں ہوگا۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

"مات وكسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز الناقل وقال: لا نأخذ بهذه الراوية وهو حرام

☆ دارالقضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ گوونڈی ممبئی

مطلقاً علی الورثة فتنبه'' (ردالمحتار:۵/ ۱۰۴)۔

نیز مالکی فقیہ علامہ ابن رشد مالکیؒ فرماتے ہیں:

''**أما المیراث فلایطیب المال الحرام، هذا هو الصحیح**'' (المقدمات الممهدات:۲/ ۶۱۷)۔

فقہائے احناف میں طرفین کے نزدیک دارالحرب میں سود لینا جائز ہے، آزادی سے قبل کے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا گیا تھا، اس لیے بعض فقہاء نے طرفین کے قول پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان میں بھی غیر مسلموں سے حاصل ہونے والے سود کے جواز کا فتوی دیا تھا، اگر یہ بات دلائل اور ثبوتوں سے واضح ہو کہ یہ حاصل ہونے والی جائیداد آزادی سے قبل کی گئی ہے، تو اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا، اور اگر یہ واضح نہ ہو رہا ہو، اور کوئی بین دلیل بھی نہ ہو یہ جائیداد آزادی سے قبل خرید کی گئی ہے یا بعد؟ تو اس سلسلے میں اصول وقواعد سے دونوں کی تائید ہوتی ہے:

مشہور قاعدہ ہے: ''**الأصل فی الأشیاء الإباحة**'' (الاشباہ والنظائر:۹۷)، اس قاعدہ کی رو سے ساری جائیداد کا استعمال جائز ہوا۔

لیکن دوسرا قاعدہ: ''**إضافة الحادث إلی أقرب أوقاته**'' (مجلۃ الاحکام العدلیۃ، رقم المادۃ:۱۱) کے پیش نظر وہ جائیداد آزادی کے بعد کی ہونا معلوم ہوتی ہے، اس قاعدہ کی رو سے ان چیزوں کا آزادی کے بعد ہونا سمجھا جائے گا اور اس کے حرام ہونے کا حکم لگے گا۔

نیز فقہاء نے قاعدہ لکھا ہے کہ اگر حلت اور حرمت میں علماء کا اختلاف ہو جائے تو ترجیح حرمت والے قول کو ہوگی، علامہ قرافی نے الفروق میں لکھا ہے:

''**فإن اختلف العلماء فی فعل هل هو مباح أو حرام فالورع الترک**'' (الفرق السادس والعشرون والمئتان من الفروق:ع/ ۲۷)۔

اسی طرح فقہاء کا مشہور قاعدہ ہے: ''**إذا تعارض الدلیلان أحدهما یقتضی التحریم والآخر الإباحة قدم التحریم**'' (الاشباہ والنظائر، القاعدۃ الثانیۃ من الفن الثانی:۱۰۹)، ایک قاعدہ کی رو سے مال کا حلال ہونا ثابت ہوتا اور دوسرے سے اس کا حرام ہونا، اس لیے احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اس مال کو آزادی کے بعد کا ہونا مانا جائے اور اس کے حرام ہونے کا حکم لگایا جائے۔

اسی طرح اس حاصل ہونے والی رقم کے سلسلے میں بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ اس میں سود کی رقم شامل ہے یا نہیں، تو کل رقم کے سودی ہونے کا حکم نہیں دیا جائے گا، کیوں مورث کے سودی کاروبار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کل آمدنی سود

سے ہی ہو، ہوسکتا ہے کچھ رقم دوسرے کاروبار سے یا ہبہ وغیرہ سے حاصل ہوئی ہو اور یہ عین ممکن ہے، کیوں کہ انسان کی زندگی میں اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں؛ جب اس رقم کے کچھ حصہ کا حلال ہونا اور کچھ کے حرام ہونے کا قوی احتمال ہو تو مکمل رقم کو سود قرار نہیں دیا جاسکتا؛ فقہاء نے لکھا ہے، جب مال حلال مال حرام سے مختلط ہوجائے تو وہ مضمون ہوجاتا ہے اور اس کا دین یعنی عوض ادا کردینے سے وہ مال جائز ہوجاتا ہے، علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

"اختلط المغصوب بملک الغاصب بحیث یمنع امتیازه کاختلاط بره ببره أو یمکن بحرج کبره بشعیره ضمنه بلا حل انتفاع قبل أدائه" (الدرالمختار مع ردالمحتار:۶/۱۹۱)۔

اسی طرح اگر کسی پراپرٹی کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ مال حرام سے خرید کی گئی ہے تو اس کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس مسئلہ میں مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وراثت میں جو پراپرٹی ملی ہے ضروری نہیں کہ وہ مال حرام کی طرف اشارہ کرکے خریدی گئی ہو؛ بلکہ عین ممکن ہے مطلقاً بیع ہوئی ہو اور حرام سے رقم ادا کی ہو، تو پھر اس صورت میں مفتی بہ قول کے مطابق وہ رقم حرام نہیں ہوگی، اس سلسلے میں امام کرخی کے قول پر فتوی کی صراحت کرتے ہوئے علامہ شامی نے لکھا ہے:

"لکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعا للحرج لکثرة الحرام وعلی هذا مشی المصنف" (ردالمحتار:۷/۴۹۰)۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حلت وحرمت کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایسے مال کو حرام قرار دینے کی صورت زیادہ قوی بھی ہے اور اصول سے قریب تر بھی؛ اس لیے عام حالات میں عدم جواز کا حکم ہوگا، اور وہ مال حرام قرار پائے گا، البتہ کوئی شخص سخت پریشان ہو تو اس کے لیے دوسرے پہلو پر عمل کرنے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

جواب:۲

اگر کسی مال وجائیداد کے بارے میں یقینی طور پر اس بات کا علم ہو کہ وہ حرام مال سے حاصل شدہ ہے، تو اس مال و جائیداد کا استعمال اس کے لیے حرام ہوگا، خواہ وہ اسے وراثت میں ملا ہو، کسی نے ہبہ کیا ہو، یا کسی اور ذریعے سے حاصل ہوا ہو، حرمت کا علم ہونے کی وجہ سے وہ مال حرام ہوگا، فقہاء نے قاعدہ ذکر کیا ہے کہ حرمت کا علم ہونے سے حرمت متعدی ہوجاتی ہے: **"الحرمة تتعدی مع العلم بها"** (الاشباہ والنظائر لابن نجیم:۲۳۵)۔

الموسوعہ الفقہیہ میں مذکور ہے:

"المال الحرام کالماخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذلک لیس مملوکالمن هو بیده" (الموسوعۃ الفقہیہ:۲۳/۲۴۸)۔

اسی طرح اگر مال حرام پر وہ تصرف بھی کردے اور وہ اس کی ملکیت سے نکل کر کسی دوسرے کی ملکیت میں پہنچ جائے، اسی طرح وہ بھی اس میں تصرف کر کے اسے کسی دوسرے کو فروخت کردے یا ہبہ کردے، تو بھی اس کی حرمت باقی رہتی ہے اور اصل مالک کو لوٹانا واجب ہوتا ہے۔

"قوله (الحرام ينتقل) أى تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاک، قوله (ولا للمشترى منه) فيكون شرائه منه شيئا لأنه ملكه بكسبه حرام وفى شرائه تقرير للخبث" (ردالمحتار: ۴/ ۱۴۵، مطلب البیع الفاسد)۔

اگر صاحب مال غریب ہو تو اس کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ وہ پراپرٹی جو اس کے پاس ہے وہ بعینہ حرام نہیں ہے، یعنی چوری یا غصب وغیرہ کی نہیں ہے، نا ہی اس میں کسی کا ثابت شدہ حق ہے؛ بلکہ وہ حرام رقم سے خریدی گئی ہے، وہ بھی مطلقا یعنی ثمن کے طور پر اس حرام رقم کو دینے کا اشارہ نہیں کیا تھا، تو پھر اس صورت میں وہ اس کی ملکیت نہیں ہوگی اور اس کا کرایہ وغیرہ لینا درست ہوگا؛ البتہ حرام رقم دینے کا گناہ ہوگا اور اگر مالک موجود ہو یا اس کے ورثہ موجود ہوں تو اتنی رقم لوٹانا لازم ہوگا، ورنہ اتنی رقم واجب التصدق ہوگی۔

چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"أو اشترى مطلقا ودفع تلک الدراهم أو اشترى بدراهم أخرى ودفع تلک الدراهم، قال أبو نصر يطيب ولايجب عليه أن يتصدق وهو قول كرخى والمختار قول أبى بكر إلا أن الفتوى اليوم على قول الكرخى كذا فى الفتاوى الكبرى" (الفتاوی الھندیہ: ۳/ ۲۱۵، فصل فی الاحتکار)۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے پاس جو مال حرام ہے، مثلا: رشوت اور سود کے پیسے ہیں یا مکان مغصوب ہے اور اس کا اصل مالک معلوم نہیں ہے، تو پھر ایسے مال حرام کو صدقہ کرنا واجب ہوتا ہے، چنانچہ وہ واجب التصدق ہوگا، کبھی جس کے پاس ہے اگر وہ خود محتاج ہو اور اس کے پاس اس کے سوا مال نہ ہو تو وہ خود بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، اور صدقہ کا مستحق ہونے کی بناء پر اپنی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے، پھر آئندہ جب اس کی غربت ختم ہوجائے اور اسے مال داری نصیب ہوجائے تو اتنی ہی رقم صدقہ کردے، اسی طرح سردست اس کو فائدہ اٹھانا جائز ہوگا۔

علامہ موصلی حنفی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والملک الخبيث سبيله التصدق به، ولو صرفه فى حاجته نفسه جاز، ثم إن كان غنيا

تصدق بمثله، وان كان فقيرا لا يتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار:۳/۷۰، دارالکتب العلمیہ)۔

پس مندرجہ بالا صورتیں اس غریب شخص کے استفادہ کی ہوسکتی ہیں، باقی صورتوں میں وہ رقم لوٹانا یا صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

جواب:۳

اگر کسی عورت کا شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کر رہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے، تو عورت کے لیے اگر جائز کمائی کے اسباب ہوں اور وہ اس پر قادر ہو، مثلاً گھریلو کام یعنی کڑھائی بنائی، سلائی وغیرہ کے ذریعے اپنا انتظام کرسکتی ہو تو کرے، یا اگر اس کے پاس کوئی ایسی حلال جائیداد وغیرہ ہو جس کے کرایہ سے اس کا خرچ چل سکتا ہو تو وہ اس کے ذریعے سے اپنا خرچ پورا کرے، اور اگر اس کی صورت نہ بن سکتی ہو اور وہ ان کی کمائی کھانے پر مجبور ہو تو ایسی صورت میں دل میں برا سمجھتے ہوئے اپنی ضروریات کی تکمیل کرنا اس کے لیے جائز ہوگا، ساتھ ہی حلال ذرائع آمدنی کے لیے کوشاں رہے اور اس حرام کمائی کا سارا گناہ کمانے والے یعنی شوہر یا بیٹے پر ہوگا، جامع الفصولین کے حوالے سے علامہ شامی نے اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"**فی جامع الفصولين اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمراة أكله ولبسها والإثم على الزوج**" (ردالمحتار علی درالمختار:۶/۱۹۱)۔

علامہ شامی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

"**امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصبا أو اشترای طعاما أو كسوة من مال ليس أصله بطيب فهی سعة من ذالک وإلا ثم على الزوج**" (ردالمحتار علی درالمختار:۶/۳۸۶)۔

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ فرماتے ہیں:

"حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہیے کہ اسے کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش جاری رکھے" (فتاوی عثمانی:۳/۱۲۶، کتاب البیوع)۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی کہ مجبوری کی صورت میں عورت کے لیے اس کمائی سے فائدہ اٹھانا جائز ہے، البتہ عام حالات میں جائز نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر والدین نے بچے کو مال حرام سے پڑھایا ہو اور پڑھنے کے بعد وہ بچہ جائز نوکری کرتا ہے، تو اس کے

لیے اور اس کے والدین اور اسکی بیوی کے لیے وہ کمائی بالکل حلال ہوگی، کیوں کہ اس کی نوکری شرعا درست ہے اور آدمی کو چوں کہ اپنی محنت کا معاوضہ ملتا ہے، نا کہ حاصل شدہ ڈگری کا؛ اس لیے اس کی محنت ہونے کی وجہ سے اس کی نوکری اور اس کی کمائی درست ہوجائے گی۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

"ثم الأجرة تستحق بإحدى معانى ثلاثة إما بشرط التعجيل أو بالتاجيل من غير شرط أو باستيفاء المعقود عليه" (الھدایہ: ۳/ ۲۹۳، کتاب الاجارہ، باب الاجر متی یستحق)۔

اسی طرح شیخ وہبہ زحیلی اجرت کے استحقاق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لأنه أجر على عمل وجهد معقول" (الفقہ الاسلامی وادلتہ: ۵/ ۳۳۳۶، بیع السمسرۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

جواب: ۴

اگر واضح طور پر یہ معلوم ہو کہ دعوت دینے والے یا ہدیہ دینے والے کی کمائی کا بیشتر حصہ حرام ہے، تو اس کی دعوت کھانا، ہدیہ قبول کرنا اس وقت تک جائز و درست نہیں ہے، جب تک واضح طور پر یہ نا بتادے کہ وہ یہ دعوت یا ہدیہ دے رہا ہے، وہ اس کی جائز کمائی سے ہے، اور اس میں حرام رقم شامل نہیں ہے، اگر اس کی وضاحت کر دیتا ہے تو اس کی دعوت و ہدیہ قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں:

"آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه" (الفتاوی الھندیہ: ۵/ ۳۴۲)۔

اور اگر یہ معلوم ہو کہ دعوت دینے والے یا ہدیہ دینے والے کی کمائی کا بیشتر حصہ حلال ہے، بس تھوڑا سا وہ حرام کاروبار میں ملوث ہے، تو ایسے شخص کی دعوت قبول کرنے یا ہدیہ تحفہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ جب تک وہ اس کی وضاحت نہ کرے کہ یہ مال حرام سے تیار کیا گیا ہے، اگر وہ مال حرام کی وضاحت کر دیتا ہے، تو اس کا ہدیہ و تحفہ اور دعوت طعام قبول کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر حلال ہونے کی وضاحت نہ کرے یا کچھ نہ بولے مطلقا دعوت دے یا ہدیہ دے، تو گنجائش موجود ہے، اس کی وضاحت فتاوی تاتارخانیہ میں ان الفاظ میں موجود ہے:

"إن كان غالب ماله من حلال فلا بأس بأن يقبل الهدايا، ويأكل مالم يبين له أن ذالك من الحرام" (الفتاوی التاتارخانیہ: ۱۸/ ۱۷۵)۔

دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حرام و حلال دونوں طرح کا مال ہو، تو اس کے یہاں دعوت وغیرہ کھانے کی گنجائش

ہے؛ جب تک حرام مال سے کھلانے کی صراحت خود نہ کردے۔

جواب:۵

اگر کسی کے بارے یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس کی آمدنی کے کل ذرائع حرام کاروبار پر مبنی ہیں، اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے تو ایسے شخص کے گھر کھانا پینا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی نے انجانے میں ایسے شخص کی دعوت میں شرکت کی اور کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا کل مال حرام ہے، تو اولاً اللہ کے حضور میں توبہ واستغفار کرے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اگر انجانے میں کوئی گناہ ہوجائے تو انسان کو سب سے پہلے توبہ واستغفار کرنا چاہیے:

"إنما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فأولئک يتوب الله عليهم و كان الله عليما حليما" (سورۂ نساء: ۱۷)۔

توبہ واستغفار کے بعد آدمی کو چاہیے کہ ایک اندازہ کرکے جتنا کھایا ہے، اس کی قیمت بھی صدقہ کردے؛ کیوں کہ مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کو بعینہ واپس کردیا جائے، حتی کہ حدیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر لقمہ منہ میں موجود ہو تو اسے بھی واپس دینا ضروری ہے۔

لیکن صورت مسئولہ میں چوں کہ اس نے کھانا کھالیا ہے، تو اب اسے نکالنا ناممکن ہے، اس کے لیے اس کے بدل کے طور پر اتنی قیمت دے دے، قواعد فقہ سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے کہ جب اصل فوت ہوجائے تو بدل کو اختیار کیا جاتا ہے، مجلۃ الاحکام العدلیہ میں ہے:

"إذا بطل الأصل يصار إلى البدل" (مجلۃ الاحکام العدلیہ: رقم المادہ: ۳۵)

پس اس سوال کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر امیر شخص ایسے کسی شخص کی دعوت میں کھانا کھاتا ہے، تو توبہ واستغفار کرے اور اس کے بقدر صدقہ کرے اور اگر فقیر کھائے تو اس کے لیے گنجائش ہے۔

جواب:۶

پہلے سے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کے لیے بعض لوگوں نے یہ بات لکھی ہے کہ اگر اس شخص نے کوئی سامان ادھار خریدا اور پھر اس ناجائز مال سے اس کا ثمن ادا کردیا، تو وہ سامان اس کے لیے حلال ہوجائے گا، اس طرح بالواسطہ اس کی رقم پاک اور استعمال درست قرار پایا، اس سلسلے میں فتاوی ہندیہ کی درج ذیل عبارت سے استفادہ کیا گیا ہے:

"والحيلة في هذه المسائل أن يشترى نسيئة ،ثم ينقد ثمنه من أى مال شاء" (الفتاوی الھندیہ:

۵/ ۳۴۲، کتاب الکراہیہ، الباب الثانی عشر)۔

لیکن یہ حیلہ علی الاطلاق درست نہیں ہوسکتا، کیوں کہ حرام مال کو ملکیت میں لانے اور اس کو جان بوجھ کر اپنے فائدہ میں خرچ کرنے کا گناہ کیوں کر ختم ہوسکتا ہے؟ اس پر حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اس پر گرفت کی ہے اور اس کا اصل محمل بھی متعین کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

''اس حیلہ سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا، وہ حلال ہوجائے گا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا'' (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۲۵)۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال حرام کو پاک کرنے اور استعمال کرنے کے لیے جو عمومی طریقہ لکھا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے بجائے اگر تملیک کا راستہ اختیار کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا، یعنی جیسے زکاۃ اور صدقات واجبہ کی تملیک کے ذریعے پاکی کر کے دیگر مصارف میں استعمال کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، اسی طرح اس میں تملیک کرا کر اس کے جواز کا حل نکالا جاسکتا ہے، یعنی کسی فقیر محتاج کو صدقہ کردے، پھر وہ فقیر محتاج اسے ہدیہ یا ہبہ کے طور پر واپس کردے، تو اب وہ رقم اس کے لیے حلال ہوجائیگی؛ لیکن اس کے لیے ایک اہم شرط یہ ہے کہ جس سے وہ حرام رقم ملی ہے، وہ معلوم نہ ہو، اور اس کے ورثہ بھی معلوم نہ ہوں، اگر وہ صاحب حق معلوم ہو یا اس کے ورثہ معلوم ہوں تو ان کو وہ قم لوٹانا واجب ہوگا، تملیک سے بھی وہ مال پاک نہ ہوگا۔

واضح رہے کہ مال حرام کو صدقہ کرنے کے بعد واپس ملنے پر حلال ہونے کی علت ملکیت کی تبدیلی ہے، کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے:

''**تبدل سبب الملک قائم مقام تبدل الذات**'' (مجلۃ الاحکام العدلیۃ)۔

مال حرام کو صدقہ کے ذریعے پاک کرنے کی صورت کو ذکر کرتے ہوئے اپنے زمانہ کے مشہور عالم مولانا احمد رضا خان صاحب نے لکھا ہے:

''اگر وہ اسے پاک کرنا چاہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی محتاج کو اگر چہ اس کا کیسا ہی عزیز وقریب ہو، اپنا وہ کل مال ایک ایک پیسہ ایک ایک تار بہ نیت صدقہ دے دے، اس میں سے کچھ اپنے پاس نہ رکھے اور زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ چند محتاجوں پر اس حساب سے تصدق کرے کہ ہر ایک کو چھپن روپئے سے کم کا مال پہنچے، پھر جن کو اس نے بطور تصدق دیا ہے، وہ اپنی خوشی سے اپنی طرف سے تھوڑا یا جتنا اسے ھبہ کردیں، وہ اس کے لیے حلال طیب ہوجائے گا، اگر چہ کل دیدیں'' (فتاوی رضویہ: ۹/ ۷۷، فتاوی ہندیہ: ۵/ ۳۴۹)۔

نیز اگر وہ خود محتاج ہو تو اپنی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے، صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، جب کہ اختیار کے

حوالے سے گذشتہ جواب میں گزرا۔

جواب:۷

شریعت میں حرام مال کا اولین مصرف یہ بتایا گیا ہے کہ جس سے وہ مال حاصل ہورہا ہے، اس کو واپس کیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہوتو پھر اسے صدقہ کیا جائے، لیکن بعض فقہاء نے ضرورت مند کے لیے اس کو اپنے استعمال میں لانے کی بھی اجازت دی ہے اور اپنے استعمال میں لانے کی ایک صورت وقتی طور پر اسے قرض لینے اور بعد میں واپس کردینا بھی ہے، چناں چہ علامہ موصلی نے ایک مقام پر اس کی صراحت کی ہے:

"الملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کا ن غنیا تصدق بمثله، وإن کا فقیرا لا یتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار: ۳/۷۰، دارالکتب العلمیہ)۔

فقہاء احناف کے یہاں یہ جزئیہ صراحتاً تو نہ مل سکا، لیکن ائمہ حنابلہ میں سے امام احمد بن تیمیہؒ نے اپنے فتاوی میں صراحتاً قرض لینے اور بعد میں واپسی کی بات لکھی، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

"فإن کان یقدر یتجر أو یعمل صنعة کالنسج والغزل، أعطی مایکون له رأس، وإن اقترضوا منه شیئا لیکتسبوا به، ولم یردوا عوض القرض کان أحسن" (مجموع فتاوی ابن تیمیہ: ۹۲/۳۰۹)۔

مذکورہ بالا دونوں عبارتوں سے ظاہر ہے کہ ایسا مجبور شخص اس طرح کے مال سے وقتی قرض لے سکتا ہے اور جب سہولت ہوتو راس المال کے بقدر مال صدقہ کردے۔

جواب:۸

گناہ کا کام کرنا اور اس کی اجرت لینا اور تعاون کرنا شرعاً جائز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (المائدہ:۲)۔

حدیث پاک میں گناہ کے کاموں میں تعاون کرنے والے شخص کو اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے:

"من مشی مع ظالم لیعینه وهو یعلم أنه ظالم فقد خرج من الإسلام" (المعجم الکبیر: ۱/۱۹۷)۔

خلاصہ یہ ہے کہ معصیت اور ظلم کے کاموں میں تعاون کرنا جائز نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارے فقہاء کرام نے لہو لعب کا اجارہ، مغنیہ اور نوحہ کناں خواتین کا اجارہ ناجائز وباطل قرار دیا ہے، علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"وعلی هذا یخرج الاستئجار علی المعاصی أنه لایصلح، لأنه استئجار علی منفعة غیر مقدرة

الاستیفاء شرعا، کاستئجار الإنسان للعب و اللهو، و کاستئجا والمغنیة والنائحة للغناء'' (بدائع الصنائع: ۱۸۹/۴، کتاب الاجارہ)۔

مذکورہ بالا عبارت سے بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص کو ایسی جگہ کام کرنا پڑتا ہے، جس میں ناجائز وحرام بھی شامل ہے، تو اس کے لیے وہ نوکری جائز نہیں ہوگی، جیسا کہ لہو لعب اور گانے بجانے اور میت پر رونے کی نوکری کو منع کیا گیا ہے، اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے، تکملہ فتح الملہم میں سودی کام دھام کی نوکری کو مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ نے ناجائز قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''**وکاتبه، لأن کتابة الربا إعانة علیه، ومن هنا ظهر أن التوظف فی البنوک الربویة لایجوز، فإن کان عمل المؤظف فیما یعین علی الربا کالکتابة أو الحساب فذالک حرام لوجهین: الأول إعانة علی المعصیة والثانی أخذا الأجرة من الحرام**'' (تکملہ فتح الملہم: ۶۱۹/۱)۔

اسی طرح صاحب ہدایہ امام مرغینانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ناجائز کاموں پر اجرت کا معاملہ کرنا اس واسطے بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ اس میں عقد کا استحقاق ہی نہیں ہوتا ہے، گویا اجارہ علی المعصیہ بحیثیت عقد منعقد ہی نہیں ہوتا ہے (حوالہ)۔

استئجار علی المعاصی سے متعلق آیات واحادیث اور عبارات فقہاء سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا بزنس حرام کاموں کا ہو، اگر اس میں آدمی کا عملا تعاون پایا جاتا ہے، تو پھر وہ نوکری اور اس کی اجرت لینا جائز نہیں ہے، ہاں اگر صرف جائز کام ہو، ناجائز کام نہ کرنا پڑتا ہو تو پھر اس میں حرج نہیں ہوگا۔

جواب:۹

حرام سے حاصل شدہ جائیداد اگر بعینہ حرام ہے، وہ زمین بالکلیہ حرام ہوگی، اس میں کھیتی باڑی کرنا، پیداوار حاصل کرنا سب ناجائز ہے، اور ایسے زمین وجائیداد کا حکم یہ ہے کہ کوفی الفور اس کے اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اس پر ملکیت کا ثبوت ہوا ہی نہیں، موسوعہ فقہیہ میں ہے:

''**المال الحرام کالماخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو ربا أو نحو ذالک لیس مملوکا لمن هو بیده**'' (الموسوعہ الفقہیہ: ۲۴۸/۲۳)۔

اور اگر نفس جائیداد حرام نہ ہو؛ بلکہ حرام مال سے خرید کیا گیا ہو، تو فقہاء کے یہاں اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ اگر اس جائیداد کو مال حرام کی طرف اشارہ کر کے خریدی ہو، اور وہی حرام رقم ادا کی ہو، تو پھر وہ ناجائز ہوگی اور اس کی آمدنی بھی ناجائز ہوگی اور واجب التصدق ہوگی، لیکن اگر مال حرام کی طرف اشارہ کئے بغیر اس مال سے جائیداد خرید کیا یا مطلقا جائیداد کی

خریداری کا معاملہ کرلیا اور مال حرام ہی سے قیمت ادا کردی، تو بیشتر فقہاء کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہے۔

لیکن اس سلسلے میں امام کرخیؒ کی رائے جواز کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اصل زمین تو حرام ہوگی اور اس کو صدقہ کرنا واجب ہوگا، لیکن اس میں کھیتی باڑی اور اس سے حاصل ہونے والا نفع جائز ہوگا (تفصیل کے لئے دیکھئے علامہ حصکفی کی الدر المختار مع الرد ۵/ ۲۳۵)۔

چناں چہ صورت مسئولہ میں گنجائش ہے کہ حرام مال سے خرید کردہ جائیداد کی قیمت جائز آمدنی سے صدقہ کردے، اور اس میں کھیتی باڑی کرنا درست ہوگا، اور بہتر یہی ہے کہ کھیتی باڑی بھی رقم صدقہ کرنے کے بعد ہی کرے؛ چناں چہ امام طحطاوی وغیرہ نے لکھا ہے:

"**نعم لایباح الانتفاع به قبل أداء البدل فی الصحیح من الذهب**" (حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار: ۴/ ۱۹۲)۔

سوال کا دوسرا جزو یہ ہے کہ حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنا تو اس کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) ایسے شخص کے یہاں نوکری کرنا جس کا کاروبار حرام ہے، لیکن اس کا حلال کاروبار بھی ہو، اس کے پاس حلال رقم بھی آتی ہے اور وہ دونوں آمدنیوں کو خلط ملط کرکے رکھتا ہے، تو اس صورت میں اس کے یہاں کام کرنے اور تنخواہ لینے میں حرج نہیں ہے۔

چناں چہ فتاوی ہندیہ میں اس طرح کے مخلوط مال سے لینے کو درست قرار دیا گیا ہے۔

"**لو أن فقیرا یأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان یاخذها غصبا أیحل ذلک له، قال: إن خلط ذلک بدراهم أخری فإنه لابأس به**" (الفتاوی الھندیہ: ۵/ ۳۴۲، طبع رشیدیہ)۔

(۲) ایسے شخص کے یہاں نوکری کرنا جس کا کاروبار حرام ہو یا یہ معلوم ہو کہ وہ عین مال حرام کو اجرت کے طور پر دے رہا ہے، اور اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی مال نہیں ہے، اور لینے والے کو معلوم بھی ہے کہ یہ حرام ہے تو پھر اس کے لیے اس رقم کا لینا جائز نہیں ہوگا۔

چناں چہ علامہ حصکفی لکھتے ہیں:

"**أما من رای المکاس یأخذ من أحد شیئا من المکس ثم یعطیه آخر، ثم یأخذ من ذالک الآخر فهو حرام**" (الدر المختار مع رد المحتار: ۶/ ۳۸۵، سعید)۔

(۳) ایسے شخص کے یہاں نوکری کرنا جس کا کاروبار حرام ہو، لیکن نوکری کرنے والے کو اس کے حرام مال کی تفصیلات معلوم نہیں ہے، اور نہ یہ معلوم ہو کہ اس کو جو تنخواہ مل رہی ہے وہ حرام مال سے مل رہی ہے یا حلال سے؟ اور جو وہ کام اس کے یہاں کرتا ہے وہ فی نفسہ حلال ہے، تو پھر بنا تفتیش کے اس کے یہاں کام کرنا اور تنخواہ لینا درست ہے، کیوں کہ اس زمانے میں بے غبار معاملات سے بچنا متعذر ہے۔

فقہاء کی تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے شخص کی بائیک یا کار پر سفر کرنا جس کے بارے میں صراحتا یہ معلوم ہو کہ اس کے پاس کی آمدنی کے کل ذرائع حرام ہیں یا وہ بائیک یا کار غصب کردہ ہے یا یہ بائیک یا کار حرام کمائی سے خرید کی گئی ہے تو سوار ہونا جائز نہیں ہوگا، اسی طرح فیس کا بھی حکم ہے، ایسی صورت میں فیس لینا بھی جائز نہ ہوگا، کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے: "**الحرمة تتعدى مع العلم بها**"، لیکن اگر اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں اور اسے یوں ہی بیٹھا لیا یا وہ فیس ادا کرنے آیا اس کے بارے میں ہمیں کوئی علم نہیں ہے تو اس کی بائیک یا کار پر بیٹھنا اور فیس لینا بھی جائز ہوگا۔

اس سلسلہ میں فتاوی ہندیہ میں امام محمد کا مختار قول جواز کا لکھا ہے:

"**قال الفقيه أبو الليث رحمه الله تعالى: اختلف الناس فى أخذ الجائزة من السلطان ، قال بعضهم: يجوز مالم يعلم أنه يعطيه من حرام ، قال: محمد رحمه الله: وبه نأخذ مالم يعرف شيئا حراما بعينه، وهو قول أبى حنيفة و أصحابه، كذا فى الظهيرية**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۴۲)۔

جواب:۱۰

سود کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، شریعت اسلامیہ میں اس کا اولین مصرف یہ بتایا گیا ہے کہ جس سے وہ رقم حاصل ہوئی ہے، اس کو واپس کردی جائے، اگر اس کے اصل مالک تک پہونچانا ممکن نہ ہو، تو پھر بلا نیت ثواب اسے صدقہ کرنا ضروری ہے، اس کو اپنے نفع میں استعمال کرنا کسی صورت درست نہیں ہے۔

"**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم ، و إلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه**" (فتاوی شامی:۵/۹۹، مطلب فی من ورث مالا حراما)۔

اس کی علت یہ ہے کہ اس مال پر اس کی ملکیت ہی ثابت نہیں ہوتی ہے، اور جب ملکیت نہیں تو اس سے ذاتی استفادہ درست نہیں ہے۔

اور جب یہ استعمال درست نہیں ہوا تو عمارت وغیرہ کی منظوری کے لیے کارپوریشن والوں کو سود سے پیسے دینا درست نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کی رقوم کو کارپوریشن کے ملازمین کو بطور رشوت دینا جائز نہیں ہے۔

جواب:۱۱

قاعدہ ہے "**اليقين لايزول بالشك**" (مجلۃ الاحکام العدلیہ: رقم المادہ:۴)، اگر کسی شخص کے بارے میں یقینی طور پر

معلوم ہو کہ وہ سود خور ہے تو اس کا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی شخص کے بارے میں متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ سود خور ہے تو صرف امکان کی وجہ سے اس کی رقم اور کمائی و دیگر سامان کے ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے، کیوں کہ لوگوں کے مال میں اصل حلت واباحت ہے اور اس میں ناپاکی وحرمت کا آنا محض مشکوک ہے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں سوال کرنے اور تفتیش کرنے سے منع فرمایا ہے:

"**عن أبی هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولايسأله عنه، فإن سقاه شرابا يشربه فليشرب من شرابه، ولا يسأله عنه**" (مسند احمد بن حنبل: ۲/۲۹۹، رقم: ۹۱۷۳)۔

مذکورہ بالا عبارات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کسی شخص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس کے پاس کون سا مال ہے، یا معلوم بھی تو مگر عین شئ کا حرام ہونا معلوم نہ ہو، تو اس کا ہدیہ قبول کرنا، بچوں کا ٹافی لینا، پانی اور دیگر ضروریات کی چیزیں لینا درست ہوگا۔

جواب: ۱۲

اگر آدمی کا مال حرام ہے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ایک روایت ذکر کی ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے:

"**الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء، يارب يارب! ومطمه حرام، ومشربه حرام، وغذی بالحرام، فأنى يستجاب**" (صحیح مسلم: ۱۰۱۵، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ)۔

روایت کا ظاہری مفہوم تو یہی ہے کہ جو شخص حرام مال کھاتا ہے، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، لیکن علامہ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث دراصل قبول دعا کے استبعاد کو بتانے کے لیے بطور تمثیل ہے:

"**وما ذكره بعد ذلک من الدعاء وأنه كيف تقبل مع الحرام فهو مثال لاستبعاد قبول الأعمال مع التغذية بالحرام**" (جامع العلوم والحکم: ۳۴)۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات غالبا زجر وتوبیخ اور بیان شناعت کے لیے ہے، نا کہ بالکلیہ کوئی بھی دعا مقبول نہ ہونے کی صراحت ہے؛ اس لیے اگر کسی عالم دین یا بزرگ شخصیت کو حرام کھانے والا مدعو کرے اور وہ دعا کرے یا پانی وغیرہ پر دم کرے تو؛ اگر وہ عالم یا بزرگ حرام میں ملوث نہیں ہے، تو اس کی دعا قبول ہوگی، کیوں کہ دوسرے کے حرام کھانے سے اس کی دعا پر اثر نہیں پڑے گا۔

حرام کمائی سے متعلق مسائل اوران کا شرعی حل

قاضی محمد مطیع الرحمٰن قاسمی ☆

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم، امابعد!

(۱) وراثت میں ملنے والا حرام مال اوراس سے کمائی کا حکم

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر ورثاء کو یہ علم ہی نہیں ہے کہ وراثت میں ملے مال میں حرام مال بھی موجود ہے، تو اس صورت میں فقہاء حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے، اوراس مال کے استعمال سے ورثاء کو گناہ نہیں ہوگا، بلکہ اصل کمانے والا (مورث) گناہ گار ہوگا۔

لیکن اگر ورثاء کو یہ بات معلوم ہے کہ وراثت میں ملے مال میں حرام مال بھی موجود ہے، تو ایسی صورت میں یہ مال ورثاء کے لیے حلال ہے یا حرام؟ اس سلسلے میں فقہاء حنفیہ کی مختلف آراء ہیں:

بعض علماء نے یہ قول اختیار کیا ہے کہ اس صورت میں بھی ورثاء کے لیے ترکہ کا حرام مال لینا اور استعمال کرنا حلال ہے۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں کہ ورثاء کے لیے ایسا مال حلال نہیں ہے، بلکہ مطلقا حرام ہے، خواہ اس حرام مال کا مالک معلوم ہو یا نہ ہو۔

"فِی الْمُجْتَبَی مَاتَ وَکَسْبُهُ حَرَامٌ فَالْمِیرَاثُ حَلَالٌ ثُمَّ رَمَزَ وَقَالَ لَا نَأْخُذُ بِهَذِهِ الرِّوَایَةِ وَهُوَ حَرَامٌ مُطْلَقًا عَلَی الْوَرَثَةِ فَتَنَبَّهْ" (درمختار:۶/۸۶)۔۔

(مجتبیٰ میں ہے کہ کوئی شخص فوت ہوگیا، اس کی کمائی حرام ہے، تو میراث حلال ہوگی، پھر اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس روایت کو نہیں لیتے، یہ مال ورثاء پر مطلقا حرام ہے)۔

تیسری رائے علامہ ابن نجیمؒ کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ حرام مالِ میراث کا مالک اگر معلوم ہے تو یہ مال اصل مالک کو واپس کردیا جائے گا، ورثاء کے لیے حلال نہیں ہوگا، لیکن اگر اس حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے تو پھر ورثاء کے لیے یہ مال

☆ دارالقضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، بھیونڈی، ممبئی

حلال ہے، آپؒ لکھتے ہیں:

"الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم إلا فى حق الوارث فإن مال مورثه حلال له وإن علم بحرمته منه من الخانية و قيده فى الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال" (الاشباہ والنظائر:۳۲۰)۔

(اگر حرام مال کا علم ہے تو اموال کے اندر حرمت متعدی اور منتقل ہوسکتی ہے، البتہ وارث کے حق میں حرمت منتقل نہیں ہوگی، بلکہ مورث کا مال اس کے لیے حلال ہے، اگرچہ یہ معلوم ہو کہ ترکہ میں حرام مال موجود ہے، فتاوی ظہیریہ میں اس کو ایک قید کے ساتھ مقید کیا ہے کہ شرط یہ ہے کہ اس مال کا مالک معلوم نہ ہو (ورنہ حلال نہیں ہوگا)۔

علامہ شامیؒ کی رائے میں حرام مالِ میراث کی تین صورتیں ہیں:

پہلی صورت: اگر حرام مال کا مالک معلوم ہے تو یہ مال ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ مالک کو لوٹایا جائے گا۔

دوسری صورت: اگر حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے، لیکن حرام مال معلوم، متعین اور الگ موجود ہے، مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو یہ بھی ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ اسے اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے، لیکن وہ مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط ہوگیا ہے، جس میں متعین طور پر پتہ نہ چلے کہ کونسا مال حرام ہے اور کونسا حلال مال ہے تو ایسی صورت میں قضاء یہ مال ورثاء کے لیے حلال ہے، لیکن دیانۃً ترکہ سے اتنے مال کے بقدر مال صدقہ کرنا چاہیے۔

قضاء حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور شخص مثلاً وصی یا نگراں ایسے مال کو صدقہ نہیں کرسکتا، اور نہ ہی ورثاء پر ایسے مال کے سلسلے میں کوئی دعوی کیا جاسکتا ہے، جہاں تک دیانت کے طور پر ایسے مال کے صدقہ کرنے کی بات ہے تو علامہ شامیؒ کی بعض عبارات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مال کو صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، بلکہ محض بہتر ہے، جیسا کہ آپؒ کی درج ذیل عبارت کے آخر میں ہے:

"وَالْحَاصِلُ أَنَّهُ إنْ عَلِمَ أَرْبَابَ الْأَمْوَالِ وَجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الْحَرَامِ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صَاحِبِهِ، وَإِنْ كَانَ مَالًا مُخْتَلِطًا مُجْتَمِعًا مِنْ الْحَرَامِ وَلَا يَعْلَمُ أَرْبَابَهُ وَلَا شَيْئًا مِنْهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، وَالْأَحْسَنُ دِيَانَةً التَّنَزُّهُ عَنْهُ" (ردالمحتار ۶/۹۹)۔

لیکن درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صورت کے اندر ورثاء کے لیے ایسا مال صدقہ کرنا محض مستحب نہیں ہے، بلکہ واجب اور ضروری ہے، کیونکہ ورثاء کو مرحوم (مورث) کا مال منتقل ہوا ہے اور مرحوم نے جب حرام مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کرلیا تھا تو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے کے مطابق مرحوم اس حرام مال کا مالک نہیں بنا تھا، بلکہ اس پر لازم تھا کہ

ایسا مال اصل مالک کو واپس کرتا، ورنہ صدقہ کر دیتا، اب یہی حکم ورثاء کے لیے بھی ہے، کیونکہ صرف مرحوم کی موت یا وراثت کوئی ایسا سبب یا عقد نہیں ہے کہ جس سے حرام مال حلال ہو جائے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق حرام مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کرنے کی وجہ سے مرحوم شخص حرام مال کا مالک بن گیا تھا، لیکن اس کی ملکیت خبیث تھی، لہذا اس پر لازم تھا کہ حرام مال کا بدل اصل مالک کو لوٹاتا، یا اگر اس کا علم نہ تھا تو صدقہ کرتا، اس سے پہلے مرحوم کے لیے حرام مال میں تصرف جائز نہیں تھا، مرحوم کے لیے یہ حکم محض مستحب نہیں، بلکہ واجب تھا، لہٰذا ورثاء کا حکم بھی یہی ہے کہ اصل مالک کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا مال صدقہ کر دے۔

علامہ سرخسیؒ لکھتے ہیں:

"وَإِذَا غَصَبَ دِرْهَمًا فَأَلْقَاهُ فِي دَرَاهِمَ لَهُ فَعَلَيْهِ؛ لِأَنَّهُ خَلَطَ الْمَغْصُوبَ بِمَالِهِ خَلْطًا يَتَعَذَّرُ عَلَى صَاحِبِهِ الْوُصُولُ إلَى عَيْنِهِ، فَيَكُونُ مُسْتَهْلِكًا ضَامِنًا لِمِثْلِهِ، وَالْمَخْلُوطُ يَصِيرُ مَمْلُوكًا لَهُ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ، وَعِنْدَهُمَا لِصَاحِبِهِ الْخِيَارُ بَيْنَ التَّضْمِينِ، وَالشِّرْكَةِ، وَكَذَلِكَ الْخِلَافُ فِي كُلِّ مَا يُخْلَطُ" (المبسوط ۱۴/۵۲)۔

(جب کسی نے درہم غصب کیا اور اسے اپنے دراہم میں ڈال دیا تو اس پر درہم کا بدل لازم ہے، کیونکہ اس نے مغصوبہ درہم کو اپنے مال کے ساتھ اس طرح خلط کر لیا کہ اصل مالک کے لیے بعینہ اپنے دراہم تک پہنچنا مشکل ہو گیا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلط کرنے والے نے درہم کو ہلاک کر دیا، اس لیے وہ درہم کے بدل کا ضامن ہوگا اور مخلوط مال کا مالک بن جائے گا، صاحبین کی رائے یہ ہے کہ دراہم کے مالک کو اختیار ہے، چاہے تو غصب کرنے والے سے ضمان وصول کرے یا اس کے ساتھ شریک ہو جائے، یہی اختلاف ہر اس مال میں ہے جس کو مخلوط کیا جائے)۔

اگرچہ علامہ شامیؒ کی سابقہ عبارت سے ایسے مال کا تصدق محض مستحب معلوم ہوتا ہے، لیکن درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؒ کی رائے بھی دیانت سے یہی ہے کہ ورثاء پر ایسا مال صدقہ کرنا لازم ہے۔

اس تفصیل کے بعد مذکورہ بالا سوال کا جواب یہ ہے کہ حرام مال کے بقدر صدقہ کرنے کے بعد حرام مال سے جو حلال کاروبار کیا ہے، بہر حال وہ حلال شمار ہوگا، کیوں کہ اس کو حلال طریقہ پر حاصل کیا گیا ہے، اس لیے کہ حرام تو وہ مال ہے جس کو اس نے کمانے اور کاروبار کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، اور کاروبار و تجارت کے نتیجہ میں جو مال حاصل ہوا ہے وہ حلال ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

"وفي الأشباه: الحرمة تنتقل مع العلم إلا للوارث إلا إذا علم ربّه ولكن في المجتبى: مات وكسبُه حرام فالميراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية، وهو حرام مطلقًا على الورثة وقال العلامة

ابن عابدين: وفي الخانية: امرأة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينُه غصبًا أو اشترى طعاما أو كسوةً من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من ذلك والإثم على الزوج (وهو حرام مطلقا) أي سواء علموا أربابه أولا؛ فإن علموا أربابه ردوه عليهم وإلا تصدقوا به أقول: ولا يشكل ذلك بما قدمناه آنفا عن الذخيرة والخانية؛ لأن الطعام أو الكسوة ليس عين المال الحرام فإنه إذا اشترى به شيئًا يحل أكله على تفصيل تقدّم في كتاب الغصب: بخلاف ما تركه ميراثًا فإنه عين المال الحرام؛ وإن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام؛ فإنه لا يحل له التصرّف فيه قبل أداء ضمانه وكذا لوارثه ثم الظاهر أن حرمته على الورثة في الديانة لا الحكم إلخ'' (الدرمع الرد:۹/ ۵۵۳،ط:زکریا دیوبند)۔

اسی طرح جب یہ معلوم نہ ہو کہ یہ مال حلال ہے یا حرام اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ سودی لین دین اس زمانہ میں کیا گیا ہے جب علماء نے ہندوستان کو دارالحرب ہونے کا فتوی دیا تھا، یا جب دارالامن ہونے کا فتوی دیا تھا، تو یقین اور ظن غالب نہ ہونے کی وجہ سے ایسے مال کو حلال ہی سمجھا جائے گا، اس لیے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے ''**إن الأصل في الأشياء الإباحة و إن الحرمة بالنهي عنها شرعا**'' (المبسوط للسرخسی، جلد ۷۲/ ۷۷)۔

(۲) حرام کاروبار سے حاصل شدہ جائداد اور مال سے نفع اٹھانے کا حکم

اگر حرام کمائی سے کوئی شخص جائیداد خریدے تو اس سلسلے میں علامہ شامی نے فقہاء کے پانچ اقوال نقل کئے ہیں:

(۱) حرام طریقہ سے کمایا ہوا مال پہلے بائع کو دیا، اور اسی سے سامان خریدا، تو یہ صورت بالاتفاق حرام کی ہے۔

(۲) پہلے سامان خریدا پھر حرام طریقہ سے کمایا ہوا مال بطور ثمن کے ادا کیا۔

(۳) پہلے سامان خریدا اور ثمن کی ادائیگی دوسرے مال سے کیا۔

(۴) مطلقا سامان خریدا اور حرام کمائی کے مال سے ثمن کی ادائیگی کی۔

(۵) دوسرے مال کے ذریعہ سامان خریدا اور پھر بعد میں ادائیگی اسی حرام مال سے کردی۔

ان پانچ صورتوں میں سے آخر الذکر چار صورتوں میں شیخ ابونصر اور فقیہ ابواللیث کے نزدیک حرام مال سے حاصل شدہ شئی کو حلال سمجھا جائے گا، اور صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف پہلی صورت میں ان کا قول ہے، کہ اس حرام کمائی سے حاصل شدہ شئی کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

امام کرخیؒ نے آخر کی تین صورتوں کے ذریعہ حرام مال سے حاصل شدہ سامان وجائید کو حلال مانا ہے، پہلے اور دوسرے طریقہ پر حرام مال سے حاصل شدہ سامان اور جائیداد کو حرام مانا ہے اور صدقہ کرنے کو کہا ہے۔

شیخ ابوبکر نے تمام صورتوں کو ناجائز کہا ہے، البتہ حرام کی کثرت کی وجہ سے اور لوگوں سے حرج کو دور کرنے کی خاطر فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے۔

جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

"(قولہ اکتسب حراما إلخ) توضیح المسألة ما فی التتارخانیة حیث قال: رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة أوجه: أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولا ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها ودفعها، أو اشتری قبل الدفع بها ودفع غیرها، أو اشتری مطلقا ودفع تلک الدراهم، أو اشتری بدراهم أخر ودفع تلک الدراهم .قال أبو نصر: یطیب له ولا یجب علیه أن یتصدق إلا فی الوجه الأول، وإلیه ذهب الفقیه أبو اللیث، لکن هذا خلاف ظاهر الروایة فإنه نص فی الجامع الصغیر: إذا غصب ألفا فاشتری بها جاریة وباعها بألفین تصدق بالربح .وقال الکرخی: فی الوجه الأول والثانی لا یطیب، وفی الثلاث الأخیرة یطیب، وقال أبو بکر: لا یطیب فی الکل، لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس اه .وفی الولوالجیة: وقال بعضهم: لا یطیب فی الوجوه کلها وهو المختار، ولکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعا للحرج لکثرة الحرام اه وعلی هذا مشی المصنف فی کتاب الغصب تبعا للدرر وغیرها" (الدرالمختار وحاشیۃ ابن عابدین (ردالمحتار) ۷/ ۴۹۰، ط: زکریا، دیوبند)۔

مذکورہ بالا تفصیلات کے مطابق اگر غریب آدمی کو حرام مال کا مالک معلوم ہو تو تمام مال مالک کو واپس کردے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو صدقہ کردے، اگر صدقہ کرنے میں حرج عظیم کا اندیشہ ہو تو امام کرخیؒ کے قول کے مطابق حرج کو دور کرنے کی خاطر وہ غور کرے کہ حرام کمائی سے اس نے کس طرح جائیداد اور سامان حاصل کیا ہے، اگر اوپر ذکر کردہ آخری کی تین صورتوں میں سے کسی بھی ایک طریقہ پر حاصل کیا ہو تو وہ مال اس کے لیے حلال اور اس سے آنے والا کرایہ کو بھی حلال شمار سمجھا جائے گا۔

۲-شوہر یا بیٹا کی کمائی حرام ہو تو عورت کیا کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اولا عورت حرام کمانے والے کو حرام کمائی کرنے سے روکنے کی پوری کوشش کرے، پوری کوشش کے باوجود اگر وہ باز نہ آئے، اور اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہ ہو تو اس صورت میں ان کے لیے اس مرد کے مال سے کھانا جائز ہے، حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ مرد پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لیے بھی یہی حکم ہے، البتہ گھر کے بالغ افراد پر لازم ہے کہ خود کما کر کھائیں، حرام کمانے والے کے مال سے نہ کھائیں، جیسا کہ شامی میں ہے:

"وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاماً أو کسوةً من مال خبیث جاز للمرأة أکله

ولبسها، والإثم على الزوج'' (الدرالمختار وحاشیۃ ابن عابدین، ردالمحتار ۶/ ۹۱)۔

خلاصہ یہ کہ چوں کہ اس غریب عورت کے پاس کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اس لیے وہ شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی سے حاصل شدہ پیسہ سے لائی چیزوں کو استعمال کرسکتی ہے، اس لیے کہ وہ چیز بعینہ حرام نہیں؛ بلکہ جس پیسہ سے وہ سامان یا چیز خرید کی گئی ہے وہ حرام ہے، اگر مطلقا خرید کی گئی ہو تو کرخیؒ کے مفتی بہ قول کے مطابق حرمت استعمال اور کھانے کی اشیاء کی طرف منتقل نہیں ہوگی، البتہ حرام کمائی کرنے والے کو اس کا گناہ ضرور ہوگا۔

بیٹا کو حرام مال سے پڑھایا اب اس کی کمائی کا کیا حکم ہے؟

اوپر درج کی گئی تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اپنی اولاد کو حرام کمائی سے پڑھانا درست نہیں ہے، لیکن چوں کہ پڑھانے پر جو فیس خرچ کی گئی وہ ہلاک ہوگئی، اور کسی چیز کے ہلاک ہونے کے بعد اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے، البتہ حرام مال کمانا اور اس سے پڑھانا دونوں گناہ کا کام ہے، لیکن اس تعلیم کے نتیجہ میں بیٹا جو کمائی کرے گا، اور پیسہ کمائے گا، اس کو حرام نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ اس کو اس کے محنت کی اجرت مل رہی ہے اور وہ مال اس کی محنت اور مزدوری کی بنیاد پر ہے، اور حرام ہلاک ہوکر ختم ہو چکا ہے، اس لیے اس کا حکم باقی نہیں رہے گا'' **ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه لأن الخلط استهلاك إذا لم يمكن تمييزه عند أبي حنيفة ففي البزازية قبيل كتاب الزكاة: ما يأخذه من المال ظلماً ويخلطه بماله وبمال مظلوم آخر يصير ملكاً له وينقطع حق الأوّل فلا يكون أخذه عندنا حراماً محضاً**'' (الدرمع الرد، کتاب الزکاۃ، ۲/ ۲۱۷، ۳/ ۲۲۰، زکریا دیوبند)۔

(۴) داعی کی آمدنی حرام ہے یا حلال، اگر معلوم نہ ہو تو دعوت کھانے کا حکم

اگر کسی مسلمان کی آمدنی کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ پوری کمائی حرام ہے، یا آدھا حرام اور آدھا حلال ہے، محض وہم یا وسوسہ ہو، تو ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کئے بغیر اس کا ہدیہ قبول کرنے اور دعوت کھانے کی گنجائش ہے، بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اس کے ذریعہ آمدنی پر شبہ کرنا درست نہیں ہے۔

''(يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا ...''، (الحجرات، آیت: ۱۲)۔

''**عن عائشة رضي الله عنها: أن قوما قالوا: يا رسول الله إن قوما يأتوننا باللحم لا ندري أذكروا اسم الله عليه أم لا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: سموا الله عليه وكلوه**'' (صحیح البخاری: باب من لم یر الوساوس ونحوہا من الشبہات، رقم الحدیث: ۲۰۵۷، ۳/ ۵۴، ط: دار طوق النجاۃ)۔

"رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا: ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (فتاوی ہندیہ:۳/۲۱۰،ط:دارالفکر)۔

تاہم اگر واضح دلائل سے کسی کی آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہوتو ایسے شخص کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو إستقرضهٗ من رجل كذا في الينابيع" (کتاب الکراھیہ،۵/۳۴۲،ط:رشیدیہ)۔

(۵) دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ داعی کی کمائی حرام ہے تو اس کی تلافی کیسے کریں۔

کسی کی دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی کمائی بالکل حرام ہے، تو اب اس کا حل یہ ہے کہ توبہ واستغفار کرے اور جو کچھ کھانا کھایا ہے، تخمینہ کرکے اس کی قیمت کسی بہانے سے صاحب دعوت کو دے دے، اگر یہ ممکن نہ ہو اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو اتنی رقم اس کی طرف سے کسی غریب کو صدقہ کردے۔

الدرالمختار میں ہے: "قال في الدر: لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد علىٰ صاحبه" (الدرمع الرد:۹/۵۵۳)۔

حدیث شریف میں ہے:

"عن قيس بن أبي غرزة قال: كنا نسمى في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم "السماسرة"، فمر بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمانا باسم هو أحسن منه، فقال: يا معشر التجار! إن البيع يحضره اللغو والحلف، فشوبوه بالصدقة .رواه ابوداؤد والترمذي والنسائي وابن ماجه" (مشکاۃ المصابیح، باب المساہلۃ فی المعاملۃ، الفصل الاول، ص:۲۴۳ط:قدیمی کراچی)۔

(حضرت قیس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہمیں (یعنی تاجروں کو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں "سماسرہ" کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کا ہم پر (بازار میں) گزر ہوا تو آپ ﷺ نے ہمیں اس سے اچھا نام دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: اے تاجروں کی جماعت! بے شک خرید وفروخت کے وقت لغو اور قسم حاضر ہوجاتی ہے، (غلط بیانی، یا غیر واقعی

قسمیں شامل ہوجاتی ہیں، جن کی وجہ سے کمائی مکمل حلال نہیں ہوتی، آمدنی مشکوک ہوجاتی ہے) لہٰذا اسے صدقہ سے ملالیا کرو (یعنی صدقہ نکالا کرو؛ تاکہ جتنا حصہ آمدنی کا مشکوک ہو اس صدقے سے اس کا اثر اور اللہ تعالیٰ کا غضب ٹھنڈا ہوجائے)۔

(۲) پہلے کے حرام کمائے ہوئے مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر۔

اگر کسی کے پاس پورا کا پورا مال حرام ہے، اس میں ذرہ برابر بھی حلال مال کی آمیزش نہیں ہے، تو اس کو حلال کے دائرے میں لانے کی کوئی تدبیر نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ حرمت متعدی ہوتی ہے، جیسا کہ شامی میں ہے:

"**(قوله الحرمة تتعدد) نقل الحموی عن سیدی عبد الوهاب الشعرانی أنه قال فی کتابه المنن: وما نقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لا یتعدی ذمتین سألت عنه الشهاب بن الشلبی فقال: هو محمول علی ما إذا لم یعلم بذالک، أما لو رأی المکّاس مثلا یأخذ من أحد شئیا من المکس، ثم یعطیه آخر، ثم یأخذ من ذالک الآخر آخر فهو حرام**" (ردالمحتار، باب البیع الفاسد مطلب الحرمة تتعدد: جلد ۵/ ۹۸)۔

البتہ اگر حرام مال کے ساتھ حلال مال بھی مخلوط ہو، تو آدمی اس حلال وحرام کا مالک ہوجائے گا، لیکن وہ حرام مال اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگا جب تک کہ حرام مقدار کو اس کے مالک کو نہ لوٹادے یا پھر حرام کے بقدر صدقہ نہ کردے۔

حلال کی ایک صورت:

حرام کے حلال ہونے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ جس کے پاس حرام مال ہے، اس کو اس کے مالک کا علم نہ ہو اور وہ خود مستحق زکاۃ ہو تو اس کے لیے بقدر ضرورت لینا حلال ہوگا: "**ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملکه فتجب الزکاة فیه ویورث عنه لأن الخلط استهلاک إذا لم یمکن تمییزه عند أبی حنیفة ففی البزازیة قبیل کتاب الزکاة: ما یأخذه من المال ظلماً ویخلطه بماله وبمال مظلوم آخر یصیر ملکاً له وینقطع حق الأوّل فلا یکون أخذه عندنا حراماً محضا**" (الدرمع الرد، کتاب الزکاۃ، ۳/ ۲۱۷، ۲۲۰، زکریا دیوبند)۔

حلال کے دائرے میں لانے کی دوسری صورت:

حرام کو حلال کے دائرے میں لانے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی چیز مطلقا خرید لے اور اس حرام مال سے قیمت ادا کردے، تو وہ چیز اس کے لیے حلال ہوجائے گی، اس لیے کہ اس صورت میں خریدی ہوئی چیز بعینہ مال حرام نہیں ہے، جیسا کہ حرام پیسہ سے کھانا خریدا تو اب بعینہ حرام مال باقی نہیں رہا، بلکہ وہ ہلاک ہوگیا۔

"وقال العلامة ابن عابدين: وفي الخانية: امرأة زوجها في أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينُه غصبًا، او اشترى طعاما أو كسوةً من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من ذلك والإثم على الزوج (وهو حرام مطلقا) أي سواء علموا أربابه أولا؛ فإن علموا أربابه ردوه عليهم وإلا فصدقوا به أقول: ولا يشكل ذلك بما قدمناه آنفا عن الذخيرة والخانية؛ لأن الطعام أو الكسوة ليس عين المال الحرام فإنه إذا اشترى به شيئًا يحل أكله على تفصيل تقدّم في كتاب الغصب....." (الدرمع الرد:۹/ ۵۵۳،ط: زکریادیوبند)۔

حرام مال کوحلال کے دائرے میں لانے کی تیسری تدبیر۔

اگرحرام کمائی سے کوئی شخص جائیداد خریدے تو شامی میں فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں لکھی ہیں:

(۱) حرام طریقہ سے کمایا ہوامال پہلے بائع کو دیا، پھراسی سے سامان خریدا،تو یہ صورت بالاتفاق حرام کی ہے۔

(۲) پہلے سامان خریدا پھرحرام طریقہ سے کمایا ہوامال بطورثمن کے ادا کیا۔

(۳) پہلے سامان خریدااورثمن کی ادائیگی دوسرے مال سے کیا۔

(۴) مطلقا سامان خریدااورحرام کمائی کے مال سے ثمن کی ادائیگی کی۔

(۵) دوسرے مال کے ذریعہ سامان خریدااور پھر بعد میں ادائیگی اسی حرام مال سے کردی (ردالمحتار۷/ ۴۹۰)۔

ان پانچ صورتوں میں سے آخرالذکر چارصورتوں میں شیخ ابونصراورفقیہ ابواللیث کے نزدیک حرام مال سے حاصل شدہ شئی کوحلال سمجھا جائے گا، اورصدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے،صرف پہلی صورت میں ان کا قول ہے کہ اس حرام کمائی سے حاصل شدہ شئی کوصدقہ کرناواجب ہے۔

امام کرخیؒ نے آخر کی تین صورتوں کے ذریعہ حرام مال سے حاصل شدہ سامان وجائیدکوحلال مانا ہے۔

شیخ ابوبکر نے تمام صورتوں کو ناجائز کہا ہے، البتہ حرام کی کثرت کی وجہ سے اورلوگوں سے حرج کودورکرنے کی خاطر فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے۔

لہٰذا حرام مال سے کسی شخص نے مذکورہ طریق پر کوئی سامان یا جائیداد خریدا تو وہ چیز اس کے لیے قول مرجوح اورقول مفتی بہ پرحلال ہوجائے گی۔

(۷) حرام مال قرض لے کرنفع کمانے کے بعد قرض کوصدقہ کرنے کا حکم

اس سلسلہ میں اصل حکم تو یہی ہے کہ فی الفورحرام مال کواصل مالک کے پاس لوٹانا ضروری ہے، اگر مالک معلوم نہ

ہوتو صدقہ کرنا ضروری ہے، رہی بات قرض لینے کی تو جس شخص کی کل آمدنی یا اکثر آمدنی حرام ذریعہ سے ہے، یقین یا ظن غالب کے درجہ میں یہ بات معلوم ہوتو اس مال سے ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، اور قرض لینا بھی ایک طرح کا تبرع ہے، لہٰذا اس سے بھی احتیاط کرنا چاہئے۔

"**قال فی الهندية: آكل الربوا و كاسب الحرام أهدىٰ إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل، ولايأكل ما لم يخبره أن ذالک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه**" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۳)۔

واضح رہے کہ ناجائز کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع اور ناجائز کمائی کو فقہی اصطلاح میں "ملکِ خبیث " کہتے ہیں، جس کے وبال سے بچنے کے لیے اس کا صدقہ کرنا واجب ہے، اور اسے استعمال کرنا ناجائز ہے، تاہم اگر کسی نے اسے استعمال کرلیا اور قرض کے طور پر لے لیا تو وہ اس عمل کی وجہ سے گناہ گار ہوا، لیکن جس نے مال حرام قرض کے طور پر لیا ہے، وہ اس کا مالک ہوجائے گا، لہذا اس کے عمل کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، نہ ہی اس رقم کے استعمال اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو ناجائز کہا جاسکتا ہے، الدر المختار میں ہے:

"**وينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه، إذ لو اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكًا خبيثًا، لكن لايحلّ له التصرف فيه ما لم يؤد بدله كما حققناه قبيل باب زكاة المال فتأمل**" (الدر المختار وحاشیۃ ابن عابدین (ردالمحتار: ۵/ ۹۹)۔

(۸) آدھا حلال اور آدھا حرام کاروبار والے کے یہاں مزدوری کرنا

اگر کسی کمپنی میں حلال اور حرام دونوں کام ہوتے ہوں تو اس میں جائز کام کرنے کی فی نفسہ گنجائش ہے، حلال کام کے لیے جو محنت کی ہے، اس کی مزدوری وہ بھی حلال ہے، البتہ حرام کام میں جو تعاون کیا تو وہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ تعاون علی الاثم کی ممانعت آئی ہے، اور اس حرام کام میں تعاون کی وجہ سے جو آمدنی آئی ہے، وہ حلال نہیں ہے۔

"**وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ**" (مائدۃ، آیت: ۲)۔

"**أما الفنادق و المطاعم و الخطوط الجوية التى تباع فيها الخمور و الأشياء المحرمة فالأحسن لمسلم متدين أن يجتنب عن التعامل معها مهما وجد لذلک سبيلا و ذلک لئلا يكون منه تشجيع لمن يتعاطون المحرمات و ليظهر نفرته من ذلک ....أما قبول الوظائف فى مثل هذه الفنادق و المطاعم فإن كانت الوظيفة متمحضة لخدمة مباحة و تجرى على راتبها حكم المال الحلال، و إن كانت متمحضة للحرام مثل بيع الخمر فهى حرام و راتبها حرام**" (فقہ البیوع: ۲/ ۱۰۵۶، ط: مکتبہ معارف القرآن)۔

(۹)الف: حرام کمائی سے خریدی گئی جائیداد میں کام کرنے کا حکم

امام خرخیؒ کے قول کے مطابق حرام کمائی سے خریدی جائیداد سے نفع اٹھانا درست ہے، جیسے کھیتی باڑی کرنا وغیرہ، اور حرام کمائی کرنے والے کے یہاں کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ جائیداد کا حرام آمدنی سے خرید کرنا الگ عمل ہے اور مزدور کا اس میں مزدوری کرنا بالکل الگ عمل ہے، جیسا کہ شامی میں ہے: ''**قال فی الخانیة ولو آجر نفسه لیعمل فی الکنیسة ویعمرها لا بأس به لأنه لا معصیة فی عین العمل**'' (شامی:۵۶/۹)۔

(۹)ب: حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا حکم

حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا حرام کمانا یہ الگ عمل ہے، اور کسی کا اس کے یہاں نوکری کرنا الگ عمل ہے، اس لیے کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اگر وہ مزدوری دے تو اس وقت زیادہ تفتیش میں نہ پڑے کہ اس نے کس آمدنی سے مزدوری دی ہے، البتہ اگر یہ کہہ کر دے کہ یہ مزدوری حرام آمدنی سے دے رہا ہوں تو مزدور کو یہ حق ہے کہ وہ حلال آمدنی سے اپنی مزدوری کا مطالبہ کرے، فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ایک سوال کے جواب میں درج ہے: ''مالی معاملات میں امام کرخی کے قول پر گنجائش ہے؛ بہ شرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اُسے متعین کر کے نہ دے؛ لہٰذا کل یا اکثر آمدنی حرام والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اُن سے اجرت لے سکتے ہیں، گنجائش ہے، اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر احتراز کرے تو اِس کے افضل و بہتر ہونے میں کچھ شبہ نہیں'' (مستفاد: درمختار وشامی، امداد الفتاوی، فتاوی محمودیہ جدید، فتاوی رحیمیہ جدید، منتخبات نظام الفتاوی، فتاوی دارالعلوم دیوبند آن لائن، بعنوان حرام کمائی والوں سے ٹیوشن پڑھانے پر اجرت لینے کا حکم، سوال نمبر ۱۷۶۶۹۲)۔

(۹)ج: حرام کمائی کرنے والے کی گاڑی (بائک یا کار) میں سفر کرنے کا حکم

حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر سودی قرض لے کر گاڑی خریدی ہے تو بھی سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ قرض لینے کی وجہ سے آدمی پیسہ کا مالک ہوجاتا ہے۔

سودی قرض میں قرض لینے والے کو قرض کے نام پر جو پیسے حاصل ہوتے ہیں، قرض لینے والا قبضہ کے بعد ان کا مالک ہوجاتا ہے، نیز وہ بعد میں قرض واپس کر کے اس کا عوض لوٹا دیتا ہے؛ اس لیے یہ پیسے اس کے لیے حرام نہیں اور ان سے خریدی ہوئی کار یا کوئی اور چیز بھی حرام نہیں، پس گاڑی کے مالک کے لیے اسی طرح اس کی اجازت سے دوسروں کے لیے سودی قرض سے خریدی ہوئی گاڑی میں سوار ہونا اور سفر کرنا جائز ہے، البتہ گاڑی کے مالک نے گاڑی کے لیے سودی قرض لے کر جو گناہ کا کام کیا، اس سے اس پر سچی پکی توبہ بھی لازم وضروری ہے؛ البتہ جو سود دینا پڑے گا تو سود کی ادائیگی کے بقدر گنہ

گار ہوگا (سوال نمبر ۱۵۴۶، سود کے پیسوں سے خریدی گئی کار میں سفر کرنا؟)، بہر حال ایسے شخص کی گاڑی میں سفر کرنا درست ہے جبکہ وہ عین حرام نہ ہو، البتہ پرہیز کرنا بہتر ہے۔

(۹) د: حرام کمائی کرنے والے کے بچہ کو پڑھا کر فیس وصول کرنے کا حکم

یقینی طور پر اس کی آمدنی حرام ذرائع سے حاصل ہے، یا اس کی آمدنی مخلوط ہے، اور آمدنی کا غالب حصہ حرام ذرائع سے حاصل ہے اور وہ اس سے عوض دے تو جانتے ہوئے لینا جائز نہ ہوگا؛ البتہ اگر اس کے پاس غیر مخلوط حلال مال ہے اور وہ اس سے اجرت دیتا ہے یا کسی سے حلال مال قرض لے کر اجرت دے تو لینا جائز ہوگا، فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع**'' (الفتاوی الہندیۃ ۵/ ۳۴۲)۔

(۱۰) مدارس کی عمارت کے نقشہ کی منظوری کے لیے سودی رقم رشوت میں دینے کا حکم

ایسا جائز کام جس کو پورا کرنے کا انسان کو حق حاصل ہے، اور اس میں دوسرے کی حق تلفی نہ ہو رہی ہو، اور یہ کام سرکاری محکمہ کے لوگ بدون رشوت کے آسانی سے پورا نہ کریں تو ایسے موقع پر ضرورۃً رشوت دے کر اپنا کام پورا کرانے کی گنجائش ہے، البتہ رشوت لینے والے شخص کے حق میں رشوت کی وہ رقم ناجائز ہی رہے گی اور اسے اس رشوت لینے کا سخت گناہ ملے گا۔

فتاوی شامی میں ہے:

''**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع اهـ**'' (ردالمحتار علی الدر المختار ۶/ ۴۲۳، کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع، ط: سعید)۔

رشوت میں سودی رقم دینا:

دوسری بات رشوت میں سودی رقم دینا کیسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سودی رقم کا اصل حکم یہ ہے کہ اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے، چوں ہمارے ملک میں بینک کو سودی رقم لوٹانے سے مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ بینک سے لے کر اس کو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے، لہٰذا مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ پاس کرانے میں سودی رقم بطور رشوت کے دینا شرعاً درست نہیں ہے ''**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال**

وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه" (فتاوی شامی،۵/۹۹،مَطْلَبٌ فِيمَنْ وَرِثَ مَالًا حَرَامًا،ط:سعید)۔

(۱۱)بستی کے اکثر لوگ سودی کاروبار میں ملوث ہوں تو ان سے ہدیہ لینے میں تحقیق کرنے کا حکم

اگر بستی کے لوگوں کا سودی کاروبار کے علاوہ کھیتی ،تجارت اور دوسرا بھی ذریعہ معاش ہو اور یقیناً لوگوں کا سودی کاروبار کے علاوہ دوسرا ذریعہ معاش بھی ہوتا ہے،لہٰذا صرف کمائی کے حرام ہونے کے امکان کی صورت میں جب تک کمائی کے حرام ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو،محض وہم یا وسوسہ ہو،تو ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کیے بغیر ہدیہ قبول کرنا درست ہے،اس لیے کہ بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اس کے ذریعہ آمدنی پر شبہ کرنا درست نہیں ہے، مسلمان کی آمدنی کی تفتیش یا تجسس کا دوسروں کو حکم نہیں ہے، ہاں اگر کسی شخص کی آمدنی کے بارے میں حرام ہونے کا یقینی علم ہو، یا کسی کی آمدنی کے بارے میں شک ہو اور اس پر کوئی دلیل بھی ہو تو تحقیق کرنا ضروری ہوگا،لہٰذا اگر واضح دلیل سے کسی کی آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو،تو ایسے شخص سے بغیر پوچھے ہدیہ لینا یا اس کی دعوت قبول کرنا ناجائز ہے۔

الفتاوی الہندیۃ میں ہے:

"**وإن كان كل واحد منهم صبياً أو كان شريک السبع من يريد اللحم أو كان نصرانياً ونحو ذلک لايجوز للآخرين أيضاً، كذا في السراجية. ولو كان أحد الشركاء ذمياً كتابياً أو غير كتابي وهو يريد اللحم أو يريد القربة في دينه لم يجزئهم عندنا؛ لأن الكافر لايتحقق منه القربة، فكانت نيته ملحقةً بالعدم، فكأنه يريد اللحم، والمسلم لو أراد اللحم لايجوز عندنا**" (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۰۴)۔

اسی طرح جو آدمی بچوں کو ٹافی وغیرہ دیتا ہو،کبھی کسی کو چائے پانی پلاتا ہو،اور کبھی ضروری چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو،اور اس کی کمائی کیسی ہے معلوم نہ ہو تو بلا جھجک استعمال کرنا چاہئے ،جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ حرام کمائی سے کھلا رہا ہے یا دے رہا ہے۔

ٹافی،دیا سلائی،سوئی وغیرہ ایسی معمولی چیزیں ہیں کہ اگر گری پڑی ملیں تو اس کو مالک کی اجازت کے بغیر استعمال کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ آج کے زمانہ میں اس طرح کی چیزوں کو کوئی ڈھونڈتا نہیں ہے، جب یہ چیزیں معمولی ہیں اور شریعت نے ملنے پر اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، حالاں کہ یہ حرام کی بھی ہوسکتی ہیں، پھر بھی صرف اس کے معمولی ہونے کا خیال کیا گیا ہے،لہٰذا ایسی معمولی چیزیں کوئی دے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہوگا اور اس کے تحقیق کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(۱۲) حرام کمائی والے کے لیے دعا کرنے کا حکم

جس کا مال یا کمائی حرام ہو، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت ہے، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کے لیے دعا کرنا اور پانی پر دم کرنا شرعاً درست ہے، اس لیے کہ مؤمن کی دعاء مؤمن کے حق میں قبول کی جاتی ہے، لہٰذا حرام کمائی والے کے حق میں دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ وہ تو اپنی غلطی اور گناہ کی وجہ سے صالح مؤمنین کی دعاؤں کا زیادہ محتاج ہے کہ اللہ اس کو ہدایت دے کہ وہ حرام کمائی اور حرام خوری کو ترک کردے۔

☆☆☆

شریعت میں حرام کمائی سے متعلق احکام

مولانا روح الامین سعادتی ☆

مال انسان کی دنیوی ضرورت ہے، مگر اللہ سے عبدیت کا رشتہ ہونے کی وجہ سے وہ مکلّف ہے کہ حلال مال سے انتفاع کرے اور حرام مال سے اجتناب کرے۔

مال میں حرمت یا خبث در آنے کی دو بنیادیں ہیں:

(ا) عدم ملک، یعنی شرعاً انسان مال کا مالک نہ ہو، خواہ اس وجہ سے کہ مالک کی اجازت کے بغیر حاصل کیا گیا ہے، جیسے: غصب، سرقہ، خیانت، ظلم وغیرہ کے ذریعے حاصل کیا گیا مال، یا مالک کی اجازت ہی سے لیا گیا ہو؛ لیکن شرعاً وہ اجازت معتبر نہ ہو، جیسے: سود، قمار، اس کے علاوہ وہ تمام صورتیں جو عقد باطل کے ذیل میں آتی ہیں۔

اس کے احکام مندرجۂ ذیل ہیں:

(الف) اگر اصل مالک معلوم ہو تو اُس کو لوٹانا ضروری ہے، اگر وہ موجود نہ ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹایا جائے گا، اگر کچھ بھی علم نہ ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے، اور بعض اکابر علماء کی تحقیق کے مطابق کسی خیر کے کام میں لگانے کی بھی گنجائش ہے۔

ملاحظہ: یہ حکم عام ہے، خواہ وہ مال عین کے شکل میں ہو، خواہ نقود کی شکل میں ہو، کیوں کہ غصب وغیرہ میں نقود بھی متعین ہو جاتے ہیں۔

(ب) یہ مالِ مغصوب بعینہٖ موجود ہو تو اس کی حرمت لینے والے کی طرف بھی متعدی ہوگی، لہٰذا جانتے ہوئے اُس کا خریدنا، ہبہ وہدیہ میں قبول کرنا، بطور میراث مالک بننا، کھانا پینا، استعمال میں لانا جائز نہیں ہوگا۔

ابن رشدؒ فرماتے ہیں:

"إذا كان الحرام عند آخذه لم يفت، رُدّ بعينه إلى ربه ومالكه، وسواء كان له مال حلال أو لم

☆ مدرسہ سعادت العلوم، میگہ نگر، جھبوا (ایم پی)

يكن، يعنى للغاصب، ولا يحل لأحد أن يشتريه منه، إن كان عرضًا، ولا يبايعه إن كان عينًا (نقدًا)، ولا يأكله إن كان طعامًا، ولا يقبل شيئًا من ذلك هبةً، ولا يأخذه منه فى حقٍّ كان له عليه، ومن فعل شيئًا من ذلك وهو عالم؛ كان سبيله سبيل الغاصب فى جميع أحواله" (مواہب الجلیل للحطاب، کتاب الغصب: ۳۷۸/۵، بحوالہ: فقہ البیوع: ۱۰۰۶/۲)۔

(ج) اگر نقود مغصوبہ کے بدلے میں کوئی چیز خریدی تو اس کا ضمان ادا کرنے سے پہلے اس سے انتفاع حلال نہیں ہے، اسی طرح خرید کردہ چیز کو بیچ کر نفع کمایا تو ادائے ضمان سے پہلے نفع حلال نہیں ہوگا، لیکن امام کرخیؒ کے نزدیک اگر نقود دے کر پھر کوئی چیز خریدی، یا ان ہی نقود کی طرف اشارہ کیا، اور اسی کے ذریعے ثمن کی ادائیگی کی، تب تو انتفاع حلال نہیں ہے، ورنہ حلال ہے۔

(د) اگر مغصوب میں غاصب کے عمل سے تغیر ہوگیا، حتی کہ وہ چیز نام ومنفعت کے اعتبار سے باقی نہ رہی، جیسے: جانور کو ذبح کر کے گوشت پکالیا، یا غلّے کو پیس لیا، لوہا تھا اُس کا ہتھیار بنالیا، تو اس صورت میں مغصوب منہ کی ملکیت زائل ہوجائے گی، اور اب غاصب مالک بن جائے گا، لہٰذا اُس کی بیع نافذ ہوجائے گی، لیکن یہ ملک خبیث ہوگی، لہٰذا مشتری کے لیے بھی انتفاع حلال نہیں ہوگا، الا یہ کہ اُس کا بدل ادا کردے۔

یہی حکم امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس صورت میں ہے جب کہ حرام مال کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہو، لیکن صاحبین اور ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک اس خلط کی وجہ سے اصل مالکان کی ملکیت زائل نہیں ہوگی، اور غاصب مالک نہیں بنے گا۔

(ھ) کسی کے پاس حلال وحرام دونوں قسم کے مال ہوں، اور مخلوط نہ ہوں، تو ایسے شخص سے حرام مال سے تو معاملہ کرنا جائز نہیں، اگر معلوم نہ ہو کہ یہ حلال سے دے رہا ہے یا حرام سے؟ تو اگر اس کے پاس حلال رقم زیادہ ہو تو لینا جائز ہے، ورنہ نہیں، اور اگر معلوم نہ ہو کہ حلال غالب ہے یا حرام؟ تو غالب گمان پر عمل کرے، تاہم اجتناب بہتر ہے۔

(و) اگر حلال وحرام مال مخلوط ہوں، اور ممتاز نہ ہوں، تو بقدر حلال خود استعمال کرنا یا دوسرے کو بطورِ ثمن وغیرہ دینا جائز ہے، لیکن حلال سے زائد سے انتفاع صاحبین کے نزدیک جائز نہیں، مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خلط کی وجہ سے وہ پورے کا مالک ہے، اگرچہ ملک خبیث ہے، لہٰذا جب تک بقدر حرام صدقہ نہیں کرے گا اُس کے لیے استعمال جائز نہیں ہوگا، لیکن دوسرے شخص کے لیے اس مالِ مخلوط میں معاملہ کرنا جائز ہے، متأخرین نے سہولت کے لیے امام کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

(ز) حرام مال کی آمدنی، جیسے غصب کردہ گاڑی کو اجارہ پر دیا اور اجرت حاصل ہوئی تو ضمان ادا کرنے کے بعد غاصب اس کا مالک ہوجاتا ہے، حاصل شدہ آمدنی لوٹانا ضروری نہیں ہے، اور یہ ملکیت غصب کے وقت ہی سے ثابت ہوگی،

لیکن مالک ہونے کے باوجود کیا اُس کے لیے حلال ہے؟

اس سلسلے میں امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حلال ہے، جب کہ طرفینؒ کے نزدیک حلال نہیں ہے، اس کو چاہیے کہ اُس کو صدقہ کردے، اور خود مالک ہی کو یہ آمدنی یا نفع سپرد کردینا جائز ہے، اور اگر خود محتاج ہو تو اپنی اور اپنے عیال کی ضرورت میں بھی استعمال کرسکتا ہے، مگر محتاج نہ ہو تو بطورِ قرض استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

(۲) مالِ حرام کی دوسری قسم ہے: وہ مال جو عقودِ فاسدہ کے نتیجے میں حاصل ہوا ہو، اس کے احکام مندرجۂ ذیل ہیں:

(الف) بائع ثمن کا اور مشتری مبیع کا مالک بن جائے گا، لیکن یہ ملک خبیث ہوگی، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ عقد کو فسخ کریں، اور ضرورت ہو تو دوبارہ جائز طریقے سے عقد کریں۔

(ب) اگر عقد فسخ نہیں کیا، اور خریدار نے وہ چیز کسی تیسرے کو فروخت کردی، تو یہ معاملہ شرعاً جائز ہوجائے گا، اُس کو ختم نہیں کیا جائے گا، مگر اس صورت میں جو نفع حاصل ہوگا اُس کو صدقہ کرنا ضروری ہے، تاہم چوں کہ نفع اصل رقم کے ساتھ مخلوط ہے، اس لیے وہ اس کا مالک ہے، اس کے ذریعے کوئی چیز خریدنا جائز ہوگا، اور اس نفع کا تصدق اس کے ذمے بہرحال رہے گا۔

(ج) عقد فاسد میں بائع نے جو ثمن حاصل کیا ہے اُس کے ذریعے اگر کوئی چیز خریدتا ہے تو جائز ہے، اور اس کے ذریعے کوئی نفع حاصل ہو تو وہ بھی جائز ہے، کیوں کہ نقود معاوضات میں متعین نہیں ہوتے ہیں (ماخوذ من فقہ البیوع للشیخ محمد تقی عثمانی: ۲/ ۱۰۰۵)۔

ان مذکورہ اصولی احکام کے بعد سوال نامے میں مذکور سوالات کے جوابات بالترتیب پیش کیے جارہے ہیں:

۱-حرام مال میراث:

سود یا مال حرام وارث کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور ورثاء کو اس کا علم نہیں ہے، تب تو ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے، لیکن اگر ورثاء کو علم ہے تو ایسی صورت میں ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے یا حرام؟ اس سلسلے میں فقہ حنفی میں اختلاف ہے:

(الف) ورثاء کے لیے یہ مال حلال ہے، اس کا استعمال کرنا جائز ہے۔

(ب) علامہ حصکفیؒ نے مذکورہ قول کی تردید کرتے ہوئے دوسری رائے اختیار کی کہ ایسا مال ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ مطلقاً حرام ہے، خواہ اصل مالک معلوم ہو یا نہ ہو، درمختار میں ہے:

"فی المجتبی: مات وکسبه حرام، فالمیراث حلال، ثم رمز وقال: لا نأخذه بهذه الروایة، وهو حرام مطلقًا علی الورثة، فتنبه" (الدرالمختار: ۶/ ۳۸۶)۔

(مجتبیٰ میں ہے کہ کوئی شخص فوت ہوگیا، اور اس کی کمائی حرام ہے، تو میراث حلال ہوگی، پھر اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم اس روایت کو نہیں لیتے ہیں، یہ مال ورثاء کے لیے مطلقاً حرام ہے)۔

(ج) تیسری رائے ابن نجیم مصریؒ کی ہے کہ اگر اصل مالک معلوم ہے تو ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے، لیکن اگر مالک کا علم نہ ہو تو پھر ورثاء کے لیے حلال ہے۔

"**الحرمة تتعدى فى الأموال مع العلم إلا فى حق الوارث، فإن مال مورثه حلال له، وإن علم بحرمته منه (من الخانية)، وقيّده فى الظهيرية بأن لا يعلم أرباب الأموال**" (الاشباہ والنظائر/۳۲۰)۔

(اگر مال کے حرام ہونے کا علم ہے تو حرمت منتقل ہوگی، البتہ وارث کے حق میں حرمت منتقل نہیں ہوتی ہے، اگرچہ معلوم ہو کہ یہ مالِ حرام ہے، مگر ظہیریہ میں یہ قید لگائی ہے کہ اس مال کے مالک کا علم نہ ہو)۔

(د) علامہ شامیؒ نے تفصیلی رائے اختیاری کی ہے کہ حرام مالِ میراث کی تین صورتیں ہیں:

۱- مالک معلوم ہو تو وارث کے لیے حلال نہیں ہے۔

۲- مالک معلوم نہ ہو، لیکن حرام ہونے کا علم ہو، اور متعین وممتاز بھی ہو، مخلوط نہ ہو، تو یہ بھی حلال نہیں ہے۔

۳- یہی حال ہو، لیکن وہ ممتاز نہ ہو؛ بلکہ مخلوط ہو، تو قضاءً ورثاء کے لیے حلال ہے، لیکن دیانۃً حرام مال کے بقدر صدقہ کر دینا چاہیے۔

"**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه، وإن كان مالًا مختلطًا مجتمعًا من الحرام، ولا يعلم أربابه ولا شيئًا منه بعينه، حل له حكمًا، والأحسن ديانةً التنزّه عنه**" (ابن عابدین:۵/۹۹)۔

(حاصل یہ ہے کہ اگر حرام اموال کے مالک معلوم ہوں تو وہ مال اُن کو لوٹانا واجب ہے، ورنہ اگر بعینہٖ حرام مال کا علم ہو تو وہ بھی حلال نہیں ہے، بلکہ مالک کی نیت سے اس کو صدقہ کر دیا جائے گا، اور اگر وہ مالِ مخلوط ہو اور اکٹھا ہو، نہ ان کے مالک کا علم ہے اور نہ کوئی متعین مال معلوم ہے، تو حکماً ایسا مال وارث کے لیے حلال ہے، تاہم دیانۃً بہتر یہ ہے کہ اس سے اجتناب کرے)۔

مگر حلال ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورا مال حلال ہے، بلکہ اس کی حلت قدرِ حلال کے ساتھ محدود ہے، کیوں کہ خلط کی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ مالک ہو گیا، لیکن یہ ملکیت بقدر حلال طیب ہے، اور بقدر غصب خبیث ہے، نیز مقدار غصب کا ضمان بھی واجب ہوگا، تتارخانیہ میں امام محمدؒ سے منقول ہے:

"**غصب عشرة دنانير، فألقى فيها دينارًا، ثم أعطى منه رجلًا دينارًا، جاز، ثم دينارًا آخر لا**" (الفتاوی التتارخانیۃ، کتاب الغصب، الفصل التاسع:۱۶/۵۰۹)۔

(دس دینار غصب گئے، پھر اس میں ایک دینار ڈال دیا، اور اس میں سے ایک دینار کسی کو دیا، تو جائز ہے، اس کے

بعد دوسرا دینار دے تو جائز نہیں)۔

معلوم ہوا کہ بقدرِ حلال تصرف جائز ہے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ جب خالص حرام مال وارث کو حاصل ہو تو وہ مالک نہیں ہوگا، اس کے لیے حلال نہیں ہے، لیکن مخلوط و غیر ممتاز ہو تو بقدر حلال ملکیت ثابت ہوگی، اس میں تصرف جائز ہوگا، اور مابقیہ کا تصدق واجب ہے۔

پھر عین مال حرام سے کوئی چیز خریدی تو اس سے بھی انتفاع جائز نہیں ہے، ہاں، اگر مطلق خریداری کی، اور ذمے میں ثمن واجب ہوا، جس کی ادائیگی مال حرام سے کی، تو اس سے انتفاع کی گنجائش ہے، تاہم مالک کو اس کا بدل ادا کرنا واجب ہے، اور اگر ممکن نہ ہو تو تصدق واجب ہے۔

اور مالِ حرام سے آمدنی یا نفع حاصل ہوا تو اگرچہ وہ اس کا مالک ہے، لیکن بدل کی ادائیگی سے پہلے خبیث ہے، اور بدل ادا کر دینے کے بعد امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حلال ہو جائے گا، لیکن طرفین کے نزدیک طیب نہیں ہوگا، اس لیے یا تو یہ نفع بھی صدقہ کر دے یا مالک ہی کو لوٹا دے۔

لیکن اگر خود محتاج ہے تو اپنے اور عیال پر خرچ کر سکتا ہے، کیوں کہ اپنی ضرورت فقراء کی ضرورت پر مقدم ہے، پھر اگر وہ مستحق زکاۃ ہے تو تصدق واجب نہیں ہوگا، اور غنی ہے اور حلال مال ضروریات کے لیے کافی نہیں ہے، تو حرام مال سے قرض لینے کی گنجائش ہے، پھر جب گنجائش ہو تو حلال مال سے اتنی مقدار صدقہ کر دے۔

ہدایہ میں ہے:

"**إلا إذا كان لا يجد غيره، لأنه محتاج إليه، وله أن يصرفه إلى حاجة نفسه، فلو أصاب مالًا تصدق بمثله إن كان غنيًّا وقت الاستعمال، وإن كان فقيرًا فلا شيء عليه**" (الہدایۃ مع فتح القدیر، کتاب الغصب: ۸/ ۲۵۷)۔

علامہ سرخسیؒ نے علت بیان کی ہے:

"**وحاجته تقدم على حق الفقراء**" (المبسوط للسرخسی، کتاب الغصب: ۱۱/ ۷۷)۔

(۲) مذکورہ صورت میں غریب کے لیے کیا حکم ہے؟

اوپر کی تفصیل سے معلوم ہو چکا ہے، حرام مال کی آمدنی بھی حرام ہے، اور تصدق واجب ہے، لیکن خود غریب و مستحق ہے، تو جب تک حلال مال کی وجہ سے غنی نہ ہو جائے؛ اپنی ضرورت اور اپنے عیال کی ضروریات میں اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا، اور بعد میں خرچ کردہ مقدار کا صدقہ کرنا واجب تو نہیں ہے، لیکن مستحب ہے، یہ تو حرام مال کی آمدنی کا حکم ہے، ورنہ اصل مالِ حرام کو اپنی ذات پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے، مالک کو لوٹانا واجب ہے، ہاں! مالک معلوم نہ ہو تو واجب التصدق ہونے کی

صورت میں اس کا حکم وہی ہوجائے گا۔

(۳) بیوی یاماں کے لیے حرام کمائی سے نفقہ لینا؟

بیوی یاماں مستحق زکاۃ نہ ہوتو شوہر یا بیٹے کی ذمے داری ہے کہ حلال مال سے نفقہ ادا کرے، خواہ قرض لے کر ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ اگر ایسا نہ کریں تو بیوی کے لیے خرچ لینا جائز ہوگا، اور حرام کا گناہ اُس کو نہیں ہوگا؛ بلکہ شوہر ہی گنہ گار ہوگا، ہاں! اس کے پاس حلال رقم موجود نہ ہوتو بطورِ قرض حرام مال سے بیوی کا نفقہ ادا کرسکتا ہے، اس صورت میں بعد میں اتنی رقم کا صدقہ کرنا واجب ہوگا، جب کہ وہ مستحق زکاۃ نہ ہو۔

"**وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعامًا أو کسوةً من مال خبیث، جاز للمرأة أکله ولبسها، والإثم علی الزوج**" (ابن عابدین، کتاب الغصب: ۱۹۱/۶)۔

(اگر شوہر نے مالِ خبیث سے کھانا یا کپڑے خرید لیے، تو بیوی کے لیے اس کا کھانا اور پہننا جائز ہے، گناہ شوہر کے ذمے ہوگا)۔

"**له مال فیه شبهة، إذا تصدق به علی أبیه یکفیه ذلک، ولا یشترط التصدق علی الأجنبی**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ، باب الخامس عشر فی الکسب: ۳۴۹/۵)۔

(کسی کے پاس موجود مال میں شبہ ہو، اگر وہ اُسے اپنے والد پر صدقہ کردے تو کافی ہے، اس پر لازم نہیں ہے کہ کسی اجنبی شخص کو صدقہ کرے)۔

(۴) جس کے متعلق معلوم نہ ہو کہ اس کی کتنی کمائی حرام ہے، اس کی دعوت قبول کرنا؟

جس شخص کی کمائی حلال وحرام دونوں قسم کی ہو، اور معلوم نہ ہو کہ حلال کس قدر ہے، ایسی صورت میں اس کی دعوت قبول کرنے سے بچنا چاہیے، یہی بہتر ہے، تاہم قبول کرنے کی گنجائش ہے، جب کہ ظن غالب ہو کہ دعوت کے خرچ کے بقدر تو اُس کی کمائی حلال ہوگی۔

عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ اُن کے پاس ایک شخص آیا کہ میرا پڑوسی سود کھاتا ہے، اور وہ میری دعوت کرتا رہتا ہے، تو فرمایا: تیرے لیے گنجائش ہے، وبال اسی پر ہوگا، سفیان ثوریؒ کہتے ہیں: اگر معلوم ہو کہ حرام ہی ہے تو مت قبول کرو۔

"**عن ابن مسعودؓ قال: جاء إلیه رجل فقال: "إن لی جارًا یأکل الربوا، وإنه لا یزال یدعونی، فقال: مهنأه لک، وإثمه علیه .قال: سفیان: فإن عرفته بعینه فلا تصبه**" (مصنف عبدالرزاق، باب طعام الامراء

وآکل الربا:۵/۱۴۶۷)۔

امام محمدؒ کی کتاب الآثار میں ہے:

"أخبرنا أبو حنيفة، حدثنا محمد بن قيس أن أبا العوجاء العشار كان صديقا لمسروق، فكان يدعوه، فيأكل من طعامه، ويشرب من شرابه، ولا يسأله، قال محمد: وبه نأخذ ولا بأس بذلك، ما لم يعرف خبيثا بعينه، وهو قول أبي حنيفة –رحمه الله تعالى" (کتاب الآثار، باب الدعوۃ/۱۹۹)۔

(۵) حرام مال سے دعوت قبول کرلی تو اس کی تلافی:

لاعلمی میں ایسے شخص کی دعوت قبول کرلی جس کی کمائی حرام تھی، جس کا علم کھانے کے بعد ہوا، تو اس کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ توبہ واستغفار کرے اور دفع وبال کے لیے صدقہ کرے۔

(۶) مال حرام کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر:

مال حرام جو غصب وغیرہ کی جنس سے ہو، تو اس سے حاصل ہونے والا نفع حرام ہے، اس سے انتفاع کے حلال ہونے کی تدبیر یہی ہے کہ اس مال کا ضمان مالک کو ادا کردے، اور مالک کو دینا متعذر ہو تو صدقہ کردے، اس صورت میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ آمدنی حلال ہوجائے گی، لیکن طرفین کے یہاں مالِ حرام کی آمدنی پھر بھی حلال نہیں ہوگی، الا یہ کہ اصل مالک کو راضی کرلے۔

"إن الغاصب بعد أداء الضمان يملك المغصوب ملكا مستندا إلى وقت الغصب، وليس عليه رد الغلة أو الربح على المغصوب منه، ولكن هل يحل له الانتفاع بهذه الغلة أو الربح؟ فيه خلاف بين الفقهاء الحنفية، فقال أبو يوسفؒ: يطيب له الربح والغلة بعد أداء الضمان، وقال أبو حنيفةؒ ومحمدؒ: لا يحل له الانتفاع به حتى يرضى صاحبه، ويتصدق بالفضل" (فقہ البیوع:۲/۱۰۴۲)۔

(غاصب ضمان ادا کرنے کے بعد مغصوب کا مالک ہوجائے گا، یہ ملکیت غصب کے وقت کی طرف منسوب ہوگی، اور اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کا نفع یا آمدنی بھی مغصوب کو لوٹائے، لیکن کیا اس آمدنی سے انتفاع اس کے لیے حلال ہے؟ اس میں فقہائے احناف کا اختلاف ہے، ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ ضمان کی ادائیگی کے بعد یہ نفع وآمدنی حلال ہے، اور ابوحنیفہ ومحمدؒ فرماتے ہیں کہ اس سے انتفاع حلال نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ مالک کو راضی کرلے اور زائد کو صدقہ کردے)۔

(۷) مال حرام کو تجارت کے لیے بطورِ قرض استعمال کرنا:

اپنی اور اپنے عیال کی ضرورت کے لیے تو بطورِ قرض اس رقم کا استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ "الاختیار فی شرح المختار "میں ہے:

"**والملک الخبیث سبیله التصدق، ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنیا تصدق بمثله، وإن کان فقیرًا لا یتصدق**" (الاختیار فی شرح المختار: ۳/۶۱)۔

(ملک خبیث کا راستہ تصدق ہے، اور اگر اپنی ضرورت میں استعمال کرے تو جائز ہے، پھر اگر مال دار ہو تو اتنی مقدار صدقہ کرے، اور اگر مستحق ہو تو صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے)۔

لیکن تجارت میں بطور قرض اس مال کو استعمال کرنے کا حکم نہیں ملا، بظاہر اجازت نہیں ہے، الا یہ کہ تملیک کا حیلہ کرے، یعنی مستحق پر صدقہ کردے، پھر اس سے بطور قرض لے لے، واللہ اعلم۔

(۸) جس تاجر کا بزنس حلال وحرام مشترک ہو، اُس کے یہاں ملازمت کرنا:

جو تاجر حلال وحرام دونوں قسم کا کاروبار کرتا ہو، بہتر تو یہ ہے کہ اس کے یہاں کسی طرح کی کوئی ملازمت نہ کی جائے، تاکہ کسی بھی طرح اس کا تعاون نہ ہو اور نفرت کا اظہار ہو، تاہم اس کی کمائی مشترک ہے، تو مباح کاموں کے لیے اس کے یہاں ملازمت جائز ہوگی، اور اجرت لینا بھی جائز ہوگا، جب تک یہ ظن غالب ہو کہ یہ حلال کمائی کے دائرے سے ہے، کیوں کہ حلال وحرام مخلوط مال سے بقدر حلال تعامل جائز ہے، جیسا کہ امام محمدؒ کی کتاب الآثار سے ماقبل میں گذر چکا ہے۔

لیکن اگر جائز وناجائز دونوں قسم کا کام انجام دینا پڑتا ہے، جیسے: سودی لین دین کرنا پڑے تو ایسے تاجر کے یہاں ملازمت جائز نہیں ہے، تاہم کسی نے ایسے ادارے میں خدمت قبول کرلی، تو اس کی کمائی اور تنخواہ کا کیا حکم ہوگا؟

مفتی تقی عثمانی حفظہ اللہ تعالی نے ابن قدامہؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر حلال وحرام کام دونوں کی علیحدہ علیحدہ اجرت معلوم ہے، تو یہ اجارے کا معاملہ صحیح ہوگا، اور مباح کام کی اجرت جائز ہوگی، لیکن اگر معلوم نہ ہو تو پھر یہ اجارہ فاسد ہے، اور اجارۂ فاسدہ میں اجیر اجرت مثل کا مستحق ہوتا ہے، لہٰذا مباح کام کی اجرت مثل کے بقدر اس کے لیے مال حلال ہوگا، واللہ اعلم (دیکھیے: فقہ البیوع: ۲/۱۰۵۶)

(۹) حرام کاروبار والے کے یہاں کام کرنا یا اُس کی چیزوں کو استعمال کرنا:

حرام مال متعین کرکے کوئی چیز خریدی تو اس سے انتفاع جائز نہیں، اور اگر مطلق خریداری کی اور ثمن کی ادائیگی مالِ

حرام سے کی، تو اس سے انتفاع ظاہر الروایۃ کے مطابق تو جائز نہیں؛ لیکن امام کرخیؒ کے یہاں جائز ہے، اور متأخرین نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، یہ اس صورت میں ہے جب کہ اس کا ضمان ادا نہ کیا ہو، اور ضمان ادا کرنے کے بعد تو اس چیز سے انتفاع بالاتفاق حلال ہے، ہاں! اس سے حاصل ہونے والے نفع اور آمدنی کے سلسلے میں اختلاف ہے۔

پھر یہ سب کچھ خود مشتری کے حق میں ہے، ورنہ تیسرے آدمی کے لیے تو اجرت کے بدلے اس کو استعمال کرنا جائز ہے، لہٰذا ایسے شخص کی جائیداد میں کام کیا جاسکتا ہے، اور اس کی گاڑی کو کرایے پر لیا جاسکتا ہے، اور اس گاڑی پر سفر کیا جاسکتا ہے، اس کے گھر پر مباح امور انجام دینے کے لیے نوکری کی جاسکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ مالِ حرام سے اجرت دیے جانے کا ظن غالب نہ ہو، یہی حکم فیس وصول کرنے کا بھی ہے کہ دونوں قسم کی کمائی ہو، اور حرام سے دینے کا ظن غالب نہ ہو، تو گنجائش ہے، اور اگر اس کی آمدنی خالص حرام ہے تو نوکری کرنا، فیس لینا جائز نہیں ہوگا۔

"اختلف الناس فی جائزة السلطان فی أخذ الجائزة من السلطان، قال بعضهم: یجوز ما لم یعلم أنه یعطیه من حرام، قال محمدؒ: وبه نأخذ ما لم نعرف شیئًا حرامًا بعینه، وهو قول أبی حنیفة وأصحابه" (الفتاوی الہندیۃ: ۵/ ۳۴۳)۔

(۱۰) سودی رقم کا استعمال رشوت کے لیے:

سودی رقم کا اصل حکم یہ ہے کہ مالک کو لوٹا دیا جائے، اور اگر مالک کو لوٹانا متعذر ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، لہٰذا سرکاری بینک سے حاصل ہونے والا سود اگر سرکاری اداروں کو پہنچ جائے، جیسے ناحق عائد کیا جانے والا ٹیکس، تو وہاں سودی رقم دینے کی گنجائش ہوگی، لیکن رشوت کے طور پر دینا جائز نہیں، کیوں کہ وہ رقم ادارے کے فنڈ میں جمع نہیں ہوتی ہے۔

(۱۱) بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو تو ان سے بلا تحقیق ہدیہ وغیرہ قبول کیا جاسکتا ہے؟

جب مال کے حرام ہونے کا امکان ہو تو حتی الامکان اجتناب کرنا چاہیے، نہ ہدیہ قبول کیا جائے؛ نہ کسی اور عنوان سے کوئی چیز اُن سے قبول کی جائے، اور اپنے بچوں کو بھی بچایا جائے، تاہم یقین وظن غالب نہیں ہے کہ جو چیز ہمیں دی جارہی ہے وہ مالِ حرام سے ہے، تو اس کے قبول کرنے کی گنجائش ہے، فقہ البیوع میں ہے:

"الصورة الرابعة أن المال مرکب من الحلال والحرام، ولا یعرف أن الحلال ممیز من الحرام أو مخلوط غیر ممیز، وإن کان مخلوطًا فکم حصة الحلال فیه، والأولی فی هذه الصورة التنزه، ولکن یجوز للآخذ أن یأخذ منه بعض ماله هبةً أو شراءً، لأن الأصل الإباحة، وینبغی أن یقید

ذلک بأن یغلب علی ظن الآخذ أن الحلال فیه بقدر ما یأخذه أو أکثر منه" (فقہ البیوع:۲/۱۰۳۸)۔

(چوتھی صورت یہ ہے کہ مال حلال وحرام کا مجموعہ ہو، اور معلوم نہ ہو کہ حلال حرام سے ممتاز ہے یا مخلوط وغیر ممتاز ہے ؟ اور اگر مخلوط ہے تو اس میں حلال کی کتنی مقدار ہے؟ بہتر اس صورت میں اجتناب ہے، لیکن لینے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کا کچھ مال ہبہ کے طور پر یا خرید کر قبول کرے، کیوں کہ اصل اباحت ہے، اور ضروری ہے کہ یہ حکم اس قید کے ساتھ ہے کہ لینے والے کا غالب گمان یہ ہو کہ جتنی مقدار وہ لے رہا ہے اُتنی یا اُس سے زائد تو حلال اُس کے پاس ہے)۔

اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پہلے گزر چکی ہے کہ ایک شخص نے آپ سے کہا کہ میرا پڑوسی سود خور ہے، اور وہ میری دعوت کرتا رہتا ہے، تو آپ نے فرمایا کہ تیرے لیے وسعت ہے، اور اس کا گناہ اس پر ہوگا، حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں کہ اگر متعین طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ حرام ہی ہے تو قبول نہ کرے (مصنف عبدالرزاق:۱۴۷۶۵)

(۱۲) حرام کمائی والے کے لیے دعا ودم کرنا:

اگر چہ اکل حرام دعا کی قبولیت سے مانع ہے؛ لیکن اس کی درخواست پر اس کے لیے دعائے خیر وہدایت میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح دَم کرنا بھی جائز ہے۔

☆☆☆

حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل اوران کا حل

قاضی محمد ریاض ارمان القاسمی☆

لفظ حرام کے معنی:

حرام کے معنی: (۱) ناجائز، حرام، ممنوع، (۲) مقدس: لائق احترام ''البیت الحرام'' خانہ کعبہ ''المسجد الحرام'' وہ مسجد جس میں خانہ کعبہ ہے، ''البلد الحرام'' مکہ معظّمہ ''شھر الحرام'' ماہ حرام (القاموس الوحید: ۱/ ۳۳۲، ۳۳۱)۔

کمائی کے معنی:

(۱) کمانے کا عمل یا حاصل، آمدنی جو محنت سے حاصل ہو، (۲) کام، محنت مزدوری، (۳) دولت، مال، جمع پونجی، جمع جتھا (۴) (مجازاً) محنت کا پھل، فرزند، بیٹا یا بھائی وغیرہ ہیں (فیروز اللغات، ک م، ص/ ۷۲۰)

(۱) حرام مال کا وراثت میں ملنا اور اس کا حکم

وراثت میں حرام مال کے ملنے کی چند صورتیں ہوں سکتی ہیں: وراثت میں ملا ہوا کل مال حرام ہو یا اکثر حرام ہو، تو اس صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک معلوم ہو تو اس کو لوٹا دے، اگر معلوم نہ ہو تو اندازہ کر کے اتنا مال صدقہ کر دے، وراثت میں ملے مال کا کچھ حصہ حلال اور کچھ حصہ حرام ہو، اگر حرام کی مقدار کم ہو تو یہ مال حلال سمجھا جائے گا، البتہ اس صورت کا بھی یہی حکم ہے کہ حرام کی مقدار مالک کو لوٹا دے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو غریب کو صدقہ کر دے، البتہ حرام مال سے جو حلال کاروبار کیا ہے، بہر حال وہ حلال شمار ہوگا، کیوں کہ اس کو حلال طریقہ پر حاصل کیا گیا ہے، اور وہ میراث میں ملے ہوئے مال کی طرح عین حرام بھی نہیں ہے، یعنی بعینہ حرام نہیں ہے، اس لیے کہ حرام تو وہ مال ہے جس کو اس نے کمانے اور کاروبار کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، اور کاروبار و تجارت کے نتیجہ میں جو مال حاصل ہوا ہے وہ حلال ہے، نیز یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ سودی کاروبار میں سارا کا سارا مال حرام کا نہیں ہوتا ہے، بلکہ اصل مال پر جو سود لیا جائے گا وہ حرام ہوگا، اسی طرح اگر سود پر

☆ نائب قاضی دار القضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ناگپاڑہ ممبئی

قرض حاصل کیا گیا تو قرض حلال ہوگا، اور سود کی رقم دے گا اس کا گناہ ہوگا، اس لیے سودی کاروبار والے کے وارثین کو جو مال وراثت میں ملے گا تو پوری وراثت کو حرام کہنا مناسب نہ ہوگا، کیوں کہ اصل مال کی مقدار زیادہ اور سود کی مقدار کم ہوتی ہے ،لہذا جب اصل مال زیادہ ہوگا، اور حرام مال کم ہوگا، پھر اس سے کاروبار کریں گے تو کاروبار کی شکل میں حاصل شدہ آمدنی حلال شمار ہوگی (الدرمع الرد:۹/ ۵۵۳، ط:زکریا دیوبند)۔

اسی طرح جب یہ معلوم نہ ہو کہ یہ مال حلال ہے یا حرام اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ سودی لین دین اس زمانہ میں کیا گیا ہے جب علماء نے ہندوستان کو دارالحرب ہونے کا فتوی دیا تھا، یا جب دارالامن ہونے کا فتوی دیا تھا، تو یقین اور ظن غالب نہ ہونے کی وجہ سے ایسے مال کو حلال ہی سمجھا جائے گا، اس لیے کہ اشیاء میں اصل اباحہ ہے: ''**إن الأصل في الأشياء الإباحة و إن الحرمة بالنهي عنها شرعا**'' (المبسوط للسرخسی ۲۷/ ۷۷)۔

(۲) ایک غریب کے پاس حرام مال ہے، اسی سے کرایہ آتا ہے اس کا حکم

فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ خالص حرام مال سے نفع اٹھانا جائز نہیں، اسی طرح اگر مال حرام وحلال دونوں مخلوط ہوں، حرام کو حلال سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے، تو اکثر حصہ مال حرام ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے؛ البتہ اگر حلال حصہ زیادہ اور حرام کم ہے تو اس سے نفع اٹھانے کی اجازت دی ہے، یہاں جب کہ حرام جائیداد سے کرایہ آرہا ہے، وہ کرایہ اور جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ حلال نہیں ہوگا، جب تک کہ جائیداد میں لگی ہوئی ساری رقم اصل مالک کو لوٹا نہ دی جائے یا مالک معلوم نہ ہو تو صدقہ نہ کردیا جائے۔

البتہ حرام کمائی سے کوئی شخص کوئی جائیداد خریدے تو فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں لکھیں ہیں:

(۱) حرام طریقہ پر حاصل شدہ مال پہلے بائع کو دیا، اور اسی سے جائیداد یا سامان خریدا، تو یہ صورت بالاتفاق حرام کی ہے۔

(۲) پہلے سامان اور جائیداد خریدا پھر حرام طریقہ پر حاصل شدہ پیسہ بطور ثمن کے ادا کیا۔

(۳) پہلے سامان اور جائیداد خریدا اور ثمن کی ادائیگی دوسرے پیسہ سے کیا۔

(۴) مطلقا سامان خریدا اور حرام کمائی کے پیسہ سے ثمن کی ادائیگی کی۔

(۵) دوسرے پیسہ کے ذریعہ سامان اور جائیداد خریدا اور پھر بعد میں ادائیگی اسی حرام مال سے کردی۔

ان پانچ صورتوں میں سے صرف پہلی صورت میں شیخ ابونصر اور فقیہ ابواللیث کا قول ہے کہ اس حرام کمائی سے حاصل شدہ شئی کو صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ بقیہ چار صورتوں میں حرام مال سے حاصل شدہ شئی کو حلال سمجھا جائے گا، اور صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، امام کرخیؒ نے پہلے اور دوسرے طریقہ پر حرام مال سے حاصل شدہ سامان اور جائیداد کو حرام مانا

ہے اور صدقہ کرنے کو کہا ہے، البتہ آخر کی تین صورتوں کے ذریعہ حرام مال سے حاصل شدہ سامان وجائیداد کو حلال مانا ہے، شیخ ابوبکر نے تمام صورتوں کو ناجائز کہا ہے، البتہ عموم بلوی اور حرام کی کثرت کی وجہ سے فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے (الدرالمختار ورد المحتار ۷/ ۴۹۰، ط: زکریا، دیوبند)۔

درج بالا تفصیل کے مطابق سب سے بہتر بات تو یہ ہے کہ غریب آدمی تمام مال کو یا تو مالک کو واپس کردے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو صدقہ کردے، اگر صدقہ کرنے میں حرج عظیم کا اندیشہ ہو تو، وہ غور کرے کہ حرام کمائی سے اس نے کس طرح جائیداد اور سامان حاصل کیا ہے؛ اگر اوپر ذکر کردہ آخری کی تین صورتوں میں سے کسی بھی ایک طریقہ پر حاصل کیا ہو تو مال اس کے لیے حلال اور اس سے آنے والا کرایہ بھی حلال شمار ہوگا، البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ جواز کی سب روایات قول مرجوح پر مبنی ہے، تفصیل کے لیے دیکھئے (احسن الفتاوی جلد ۸/ ۳۱۵ تا ۳۳۵، رسالہ حلال وحرام سے مخلوط مال کا حکم)۔

(۳) الف: شوہر یا بیٹا کی کمائی حرام ہو تو عورت کیا کرے؟

حرام کمانے والوں کے گھر والوں کے لیے یہ حکم ہے کہ حرام کمانے والوں سے حرام ذریعۂ آمدنی چھڑانے کی پوری کوشش کرتے رہیں، پوری کوشش کے باوجود اگر وہ نہ چھوڑیں تو اگر ان کی بیوی کے لیے جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لیے اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز نہیں اور اگر اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اپنے شوہر کے مال سے کھانا جائز ہے، حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ شوہر پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لیے بھی یہی حکم ہے، البتہ گھر کے بالغ افراد پر لازم ہے کہ خود کما کر کھائیں، حرام کمانے والے کے مال سے نہ کھائیں، جیسا کہ شامی میں ہے:

"وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج بطعاماً أو کسوةً من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها، والإثم علی الزوج" (الدرالمختار ردالمحتار ۶/ ۱۹۱)۔

"وقال العلامة ابن عابدین: وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أکلت من طعامه ولم یکن عینُه غصبًا او اشتری طعاما أو کسوةً من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذلک والإثم علی الزوج" (شامیہ ۵/ ۲۷۳)۔

چونکہ اس غریب عورت کے پاس کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، اس لیے وہ شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی سے حاصل شدہ پیسہ سے لائی چیزوں کو استعمال کرسکتی ہے، اس لیے کہ وہ چیز بعینہ حرام نہیں بلکہ جس پیسہ سے وہ سامان یا چیز خریدی گئی ہے وہ حرام ہے، اگر مطلقا خریدی گئی ہو تو کرخیؒ کے مفتی بہ قول کے مطابق حرمت استعمال اور کھانے کی اشیاء کی طرف منتقل نہیں

ہوگی، البتہ حرام کمائی کرنے والے کو اس کا گناہ ضرور ہوگا۔

(۳)ب: بیٹا کو حرام مال سے پڑھایا اب اس کی کمائی کا کیا حکم ہے:

اوپر درج کی گئی تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اپنی اولاد کو حرام کمائی سے پڑھانا درست نہیں ہے، لیکن چوں کہ پڑھانے پر جو فیس خرچ کی گئی وہ ہلاک ہوگئی، اور کسی چیز کے ہلاک ہونے کے بعد اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا ہے، البتہ حرام مال کمانا اور اس سے پڑھانا گناہ کا کام ہے، لیکن اس تعلیم کے نتیجہ میں بیٹا جو کمائی کرے گا، اور پیسہ کمائے گا، اس کو حرام نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ اس کو اس کے محنت کی اجرت مل رہی ہے اور وہ مال اس کی محنت اور مزدوری کی بنیاد پر ہے، اور حرام ہلاک ہوکر ختم ہو چکا ہے، اس لیے اس کا حکم باقی نہیں رہے گا: ''**ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكاة فيه ويورث عنه لأن الخلط استهلاك إذا لم يمكن تمييزه عند أبي حنيفة ..... ففي البزازية قبيل كتاب الزكاة: ما يأخذه من المال ظلماً ويخلطه بماله وبمال مظلوم آخر يصير ملكاً له وينقطع حق الأوّل فلا يكون أخذه عندنا حراماً محضاً**'' (الدرمع الرد، کتاب الزکاۃ ۲/۲۱۷، ۳/۲۲۰، زکریا دیوبند)۔

(۴) جب معلوم نہ ہو کہ آمدنی حرام ہے کہ حلال تو کھانے کا حکم

بستی والے زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہوں، اور وہ شادی بیاہ میں دعوت کریں، معلوم نہ ہو کہ پوری کمائی حرام ہے، یا آدھی حرام اور آدھی حلال ہے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ جب پتہ نہیں ہے کہ داعی نے حرام پیسے سے دعوت کی ہے، یا حلال پیسے سے تو بلاوجہ حرام کا شبہ نہیں کرنا چاہئے، حسن ظن رکھنا چاہئے اور مسلمان کا معاملہ سداد پر محمول کرتے ہوئے، کھانا کھالینا جائز ہے، کیوں کہ پوری بستی جس میں مسلمان رہتے ہوں، اور سارے کے سارے صرف سودی کاروبار میں ملوث ہوں، یہ ممکن ہی نہیں ہے، ضرور سودی کاروبار کے ساتھ ان کا دوسرا ذریعہ معاش ہوگا، جیسے کھیتی، تجارت، ملازمت میں سے کچھ بھی نہ ہو صرف حرام کمائی ہی ہو، ممکن ہی نہیں ہے، لہٰذا جائز آمدنی کے ذرائع موجود ہونے یا حرام وحلال سے کمائی کے مخلوط ہونے کی صورت میں حکم میں نرمی آئے گی، ہاں اگر یقینی ذریعہ سے معلوم ہوجائے کہ دعوت کرنے والے شخص کی کل یا اکثر آمدنی حرام پر مشتمل ہے اور وہ اسی حرام پیسے سے دعوت کر رہا ہے تو پھر کھانا درست نہیں (فتاوی محمودیہ ۲۴/ ۲۱۳، مشتبہ مال سے بچنا)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو**

إستقرضهٗ من رجل كذا فى الينابيع" (الھندیۃ: کتاب الکراھیۃ، ۵/ ۳۴۲، ط: رشیدیہ)۔

(۵) دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ کمائی حرام ہے تو تلافی کیسے کرے:

شادی کی دعوت میں کھانے کا نظم جس کے پیسے سے ہوا ہے، اگر آپ کے غالب گمان کے مطابق اس کی کل آمدنی یا غالب آمدنی ناجائز اور حرام ہے، تو پھر اس میں آپ کے لئے شرکت کرنا جائز نہ تھا، بہرحال جب آپ نے شرکت کر کے کھانا کھالیا، تو اب اس کا حل یہ ہے کہ توبہ واستغفار کریں اور جو کچھ کھانا کھایا ہے، تخمینہ کر کے اس کی قیمت کسی بہانے سے صاحب دعوت کو دیدیں، اگر یہ ممکن نہ ہو اور فتنہ کا اندیشہ ہو تو اتنی رقم اس کی طرف سے کسی غریب کو صدقہ کر دیں (فتاوی دارالعلوم دیوبند آن لائن، سوال نمبر ۱۴۱۱۴۳ عنوان ناجائز کمائی والے کی دعوت میں شرکت کرلی تو اب کیا کرے)۔

الدرالمختار میں ہے: "**قال فى الدر: لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق به إذا تعذر الرد علىٰ صاحبه**" (الدرمع الرد: ۹/ ۵۵۳)۔

(۶) پہلے کے حرام کمائے ہوئے مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر

قول مختار اور قول راجح:

اگر حرام مال کما کر اکٹھا کیا، اسی طرح وراثت میں یا اس کے علاوہ بھی کسی طرح سے حرام مال ذمہ میں آ گیا اور اس مال کے حرام ہونے کا علم بھی ہے، اور اس کے پاس پورا کا پورا مال حرام ہے، اور بعینہ وہ مال باقی ہے تو اس کو حلال کے دائرے میں لانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے، اس لیے کہ حرمت متعدی ہوتی ہے، جیسا کہ شامی میں ہے:

"**(قوله الحرمة تتعدد) نقل الحموى عن سيدى عبد الوهاب الشعرانى أنه قال فى كتابه المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى ذمتين سألت عنه الشهاب بن الشلبى فقال :هو محمول على ما إذا لم يعلم بذالك، أما لو رأى المكاس مثلا يأخذ من أحد شئيا من المكس، ثم يعطيه آخر، ثم يأخذ من ذالك الآخر آخر فهو حرام**" (ردالمحتار، باب البیع الفاسد مطلب الحرمۃ تتعدد ۵/ ۹۸)۔

البتہ اگر حرام مال کے ساتھ حلال مال مخلوط ہو گیا ہے، تو آدمی اس حلال وحرام کا مالک ہو جائے گا، اور اگر مر گیا تو اس کے ورثہ کے لیے اس مال کو لینا حلال ہوگا، اور ورثہ بھی اس مال کے مالک ہو جائیں گے، لیکن یہ واضح رہے کہ کسی چیز کا ملکیت میں شمار ہو جانا الگ چیز ہے اور اس کا اس کے لیے حلال ہونا الگ چیز ہے، بہرحال وہ حرام مال اس کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوگا جب تک کہ حرام کی مقدار کو مالک کو لوٹا نہ دے یا پھر اس کے بقدر صدقہ نہ کر دے، ہاں مالک معلوم نہ ہو یا

اس تک مال کا پہونچانا ممکن نہ ہواور وہ آدمی خودغریب ہوتو اس کے لیے حلال ہوگا کہ وہ بقدرضرورت اس میں سے رکھ لے تو حرام کے حلال ہونے کی صرف ایک یہ صورت ہوسکتی ہے کہ جس کے پاس حرام مال ہے، اس مالک کا علم نہ ہواور وہ خود مستحق زکاۃ ہوتو اس کے لیے بقدرضرورت لینا حلال ہوگا (الدرمع الرد، کتاب الزکاۃ، ۳/ ۲۱۷، ۲۲۰، زکریا دیوبند)۔

امام کرخیؒ کے قول کے مطابق حرام کو حلال کے دائرے میں لانے کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ حرام مال سے مطلقا کچھ خرید لے اور اس مال سے ادائیگی کردے، تو وہ چیز اس کے لیے حلال ہوجائے گی، اس لیے کہ اس صورت میں خریدی ہوئی چیز بعینہ مال حرام نہیں ہے؛ جیسا کہ حرام پیسہ سے کھانا خریدا تو اب بعینہ حرام مال باقی نہیں رہا، بلکہ وہ ہلاک ہو گیا، برخلاف اس صورت کہ جب کہ حرام مال میراث میں ملے یا رشوت لے، یا سود وصول کرے یا ظلما کسی کا مال لے لے تو ان سب صورتوں میں وہ مال جو اس کے پاس ہے وہ بعینہ حرام ہے۔

حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر

قول غیر مختار اور قول مرجوح:

حرام مال سے کوئی سامان خریدے، تو اس کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں، ان صورتوں میں سے تین صورتیں امام کرخیؒ کے نزدیک مال حرام کو حلال کے دائرے میں لانے کی ہوسکتی ہیں؛ جیسا کہ شامی میں ہے کہ حرام کمائی سے کوئی شخص کوئی جائیداد خریدے تو فقہاء نے اس کی پانچ صورتیں لکھیں ہیں جو جواب دو کے تحت گزریں۔

ان پانچ صورتوں میں سے صرف پہلی صورت میں شیخ ابونصر اور فقیہ ابواللیث کا قول ہے کہ اس حرام کمائی سے حاصل شدہ شئی کو صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ بقیہ چار صورتوں میں حرام مال سے حاصل شدہ شئی کو حلال سمجھا جائے گا، اور صدقہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جبکہ امام کرخیؒ نے پہلے اور دوسرے طریقہ پر حرام مال سے حاصل شدہ سامان اور جائیداد کو حرام مانا ہے اور صدقہ کرنے کو کہا ہے، البتہ اخیر کی تین صورتوں کے ذریعہ حرام مال سے حاصل شدہ سامان وجائیداد کو انہوں نے حلال مانا ہے، شیخ ابوبکر نے تمام صورتوں کو ناجائز کہا ہے، البتہ عموم بلوی اور حرام کی کثرت کی وجہ سے فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے، لہٰذا حرام مال سے کسی شخص نے مذکورہ طریق پر کوئی سامان یا جائیداد خریدا تو وہ چیز اس کے لیے قول مرجوح اور قول مفتی بہ پر حلال ہوجائے گی (الدرالمختار وردالمحتار ۷/ ۴۹۰، ط: زکریا، دیوبند)۔

(۷) حرام مال کو قرض لے کر نفع کمانے کے بعد صدقہ کرنا:

اگر کسی شخص کے پاس کل یا اکثر مال حرام کمائی کا ہو، اور وہ اس کو صدقہ کرکے ختم کرنا چاہتا ہو، اور تجارت کے لیے کسی

کے پاس سے حلال مال ملنے کا امکان نہ ہوتو اپنے حرام مال سے خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے آئندہ کی تجارت اور آئندہ کی روزمرہ کی ضروریات کے بقدر پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرضہ کو صدقہ کرنا چاہتا ہے، تو اس سلسلہ میں اصل حکم تو یہی ہے کہ فی الفور حرام مال کو اصل مالک کے پاس لوٹانا ضروری ہے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو صدقہ کرنا ضروری ہے، رہی بات قرض لینے کی تو جس شخص کی کل آمدنی یا اکثر آمدنی حرام ذریعہ سے ہے، یقین یا ظن غالب کے درجہ میں یہ بات معلوم ہو تو اس مال سے ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، اور قرض لینا بھی ایک طرح کا تبرع ہے، لہٰذا اس سے بھی احتیاط کرنا چاہئے۔

''آكل الربوا و كاسب الحرام أهدىٰ إليه أو أضافه وغالب مال حرام لايقبل، ولا يأكل ما لم يخبره أن ذالك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه الخ'' (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۳)۔

واضح رہے کہ ناجائز کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع اور ناجائز کمائی کو فقہی اصطلاح میں "ملکِ خبیث " کہتے ہیں، جس کے وبال سے بچنے کے لیے اس کا صدقہ کرنا واجب ہے، اور اسے استعمال کرنا ناجائز ہے؛ تاہم اگر کسی نے اسے استعمال کرلیا اور قرض کے طور پر لے لیا تو وہ اس عمل کی وجہ سے گناہ گار ہوا، لیکن جس نے مال حرام قرض کے طور پر لیا ہے، وہ اس کا مالک ہوجائے گا، لہٰذا اس کے عمل کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، نہ ہی اس رقم کے استعمال اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کو ناجائز کہا جاسکتا ہے، الدر المختار میں ہے:

''وينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه، إذ لو اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكًا خبيثًا، لكن لايحلّ له التصرف فيه ما لم يؤد بدله كما حققناه قبيل باب زكاة المال فتأمل'' (الدر المختار ورد المحتار ۵/ ۹۹)۔

اسی طرح فتاوی دار العلوم دیوبند آن لائن میں سوال نمبر ۵۹۶۲۴ کے جواب میں فرماتے ہیں:

''(الف) اگر والد صاحب کی کمائی خالص حرام کی ہے اور آپ کو یقین کے ساتھ معلوم ہے تو آپ کے لیے اس کمائی کا کھانا حرام ہوگا۔

(ب) گھر کے تمام افراد کے لیے وہ حرام رہے گا یا تو گھر والے سب باپ کو مجبور کریں کہ وہ حرام کمائی چھوڑ کر حلال کمائی میں لگ جائیں اور اگر ایسا نہیں کرتے ہیں تو گھر والوں کو چاہیے کہ وہ کوئی حلال کمائی کا ہنر سیکھ لیں، جب تک ہنر نہ سیکھیں مجبوری میں باپ کی کمائی کھا سکتے ہیں۔

(ج) بدرجہ مجبوری والد صاحب کی خرچے میں سے بطور قرض لے کر اپنی ضرورت پوری کرلیں، پھر ٹیوشن کی کمائی سے ادا کردیں۔

(د) اگر والد صاحب کی دی ہوئی خرچے کی رقم علیحدہ ہے اور آپ کی ٹیوشن کی کمائی علیحدہ ہے تو خرچے کی رقم چونکہ مال حرام ہے، اس لیے اس میں زکاۃ نہیں، اور آپ کی ٹیوشن کی رقم نصاب کے بقدر نہیں ہے تو اس میں بھی زکاۃ واجب نہ ہوگی'' (فتاوی دار العلوم دیوبند آن لائن میں سوال نمبر ۵۹۶۲۴ بعنوان حلال وحرام سے متعلق)۔

دار العلوم دیوبند کے فتوی اور درج بالا فقہی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مجبوری کے درجہ میں اپنے پاس موجود حرام مال سے بطور قرض لے لے اور پھر اس سے تجارت کر کے بقدر ضرورت نفع کمانے کے بعد اصل مال کو صدقہ کر دے تو اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔

(۸) آدھا حلال اور آدھا حرام کاروبار والے کے یہاں مزدوری کرنا

جس آدمی کا بزنس آدھا حلال اور آدھا حرام ہو اور اس کے یہاں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصہ کا کام کرنا پڑتا ہو، جیسے کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہو، یا دونوں کے لیے لین دین کرنا پڑتا ہو، یا دونوں کے لیے وصولی کے لیے جانا پڑتا ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ حلال کام کے لیے جو محنت کی ہے، اس کی مزدوری اور محنتانہ میں کوئی شبہ نہیں وہ حلال ہے، اور حرام بزنس میں جو تعاون کیا تو وہ درست نہیں ہے، اس لیے کہ تعاون علی الاثم کی ممانعت آئی ہے، اور اس حرام کام میں تعاون کی وجہ سے جو آمدنی آئی ہے، وہ حلال نہیں ہے (فتاوی دار العلوم دیوبند جلد ۱۶/ ۱۰۲)۔

(۹) الف: حرام کمائی سے خریدی گئی جائیداد میں کام کرنے کا حکم

اگر کسی نے حرام کمائی سے کوئی جائیداد خریدی اور اس میں کھیتی باڑی کے لیے کسی کو بطور مزدور کے رکھا تو اس کے لیے اس میں کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ جائیداد کا حرام آمدنی سے خرید کرنا الگ عمل ہے اور مزدور کا اس میں مزدوری کرنا بالکل الگ عمل ہے، جیسا کہ شامی میں ہے: ''**قال فی الخانیة ولو آجر نفسه لیعمل فی الکنیسة ویعمرها لا بأس به لأنه لا معصیة فی عین العمل**'' (شامی: ۹/ ۵۶۲)، ہاں یہ واضح رہے کہ جائیداد کے مالک کے لیے اس جائیداد سے جو غلہ حاصل ہوگا اس کا استعمال اس وقت تک حلال نہیں ہوگا جب تک کہ اس جائیداد کی قیمت اس کے مالک کو لوٹا نہ دی جائے، بصورت دیگر کسی غریب کو صدقہ نہ کر دیا جائے۔

(۹) ب: حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا حکم:

حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اس کا حرام کمانا یہ الگ عمل

ہے، اور کسی کا اس کے یہاں نوکری کرنا الگ عمل ہے، اس لیے کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اگر وہ مزدوری دے تو اس وقت زیادہ تفتیش میں نہ پڑے کہ اس نے کس آمدنی سے مزدوری دی ہے، البتہ اگر یہ کہہ کر دے کہ یہ مزدوری حرام آمدنی سے دے رہا ہوں تو مزدور کو یہ حق ہے کہ وہ حلال آمدنی سے اپنی مزدوری کا مطالبہ کرے، فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ایک سوال کے جواب میں درج ہے: ''مالی معاملات میں امام کرخی کے قول پر گنجائش ہے؛ بہ شرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اُسے متعین کر کے نہ دے؛ لہٰذا کل یا اکثر آمدنی حرام والوں کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اُن سے اجرت لے سکتے ہیں، گنجائش ہے، اور اگر کوئی شخص ذاتی طور پر احتراز کرے تو اِس کے افضل و بہتر ہونے میں کچھ شبہ نہیں'' (مستفاد: درمختار وشامی ۹/۲۷۶، ۷/۲۷۷، ۴۹۰، ۴۹۱، مطبوعہ: مکتبہ زکریا دیوبند، امداد الفتاوی ۱۰: ۲، ۱۴، ۱۱، ۱۵، ۶۶۸، سوال: ۱۹، ۴/۷۷، ۸۲، مطبوعہ: مکتبہ زکریا دیوبند)

(۹) ج: حرام کمائی کرنے والے کی گاڑی میں سفر کرنے کا حکم:

حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر بعینہ وہی گاڑی رشوت میں لی ہو، یا ظلماً لی ہو، یعنی وہ عین حرام ہو، یا حرام کمائی کی گاڑی وراثت میں ملی ہو تو چوں کہ وہ عین حرام ہے، اس لیے اس میں سفر کرنا درست نہیں ہوگا، جیسا کہ بارہا تفصیل گزر چکی ہے، البتہ اس کی کمائی حرام ہے اور اس نے گاڑی خریدی ہے تو تقوی کی بات تو یہ ہے کہ اس میں سفر سے احتیاط برتے، لیکن بطور فتوی اس گاڑی میں سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر سودی قرض لے کر گاڑی خریدی ہے تو بھی سفر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ قرض لینے کی وجہ سے آدمی پیسہ کا مالک ہو جاتا ہے۔

(۹) د: حرام کمائی کرنے والے کے بچہ کو پڑھا کر فیس وصول کرنے کا حکم:

حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے، اور یقینی طور پر اس کی آمدنی حرام ذرائع سے حاصل ہے، یا اس کی آمدنی مخلوط ہے، اور آمدنی کا غالب حصہ حرام ذرائع سے حاصل ہے اور وہ اس سے عوض دے تو جانتے ہوئے لینا جائز نہ ہوگا؛ البتہ اگر اس کے پاس غیر مخلوط حلال مال ہے اور وہ اس سے اجرت دیتا ہے یا کسی سے حلال مال قرض لے کر اجرت دے تو لینا جائز ہوگا، فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع**'' (الفتاوی الہندیۃ ۵/۳۴۲)۔

(۱۰) مدارس کی عمارت کے نقشہ کی منظوری کے لیے سودی رقم رشوت میں دینے کا حکم

اس سوال میں دو چیزیں ہیں: ایک رشوت دوسرے رشوت میں سود کی رقم کا دینا۔

واضح رہے کہ کوئی جائز کام تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے اور حق ثابت ہونے کے باوجود صرف رشوت نہ دینے کی وجہ سے نہ ہو رہا ہو تو ایسی صورت میں حق دار شخص یا ادارہ کو چاہیے کہ اولاً وہ اپنی پوری کوشش کرے کہ رشوت دیے بغیر کسی طرح (مثلاً حکامِ بالا کے علم میں لاکر یا متعلقہ ادارے میں کوئی واقفیت نکال کر) اس کام کو کرایا جائے، لیکن اگر شدید ضرورت ہو اور کوئی دوسرا متبادل راستہ نہ ہو تو اپنے جائز ثابت شدہ حق کے حصول کے لیے مجبوراً رشوت دینے کی صورت میں دینے والا گناہ گار نہ ہوگا، البتہ رشوت لینے والے شخص کے حق میں رشوت کی وہ رقم ناجائز ہی رہے گی اور اسے اس رشوت لینے کا سخت گناہ ملے گا۔

فتاوی شامی میں ہے:

"دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع اه" (ردالمحتار علی الدرالمختار ۶/ ۴۲۳، کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع، ط: سعید)۔

دوسری بات رشوت میں سودی رقم دینا کیسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ سودی رقم کا اصل حکم یہ ہے کہ اس کے مالک کو لوٹا دیا جائے، چوں ہمارے ملک میں بینک کو سودی رقم لوٹانے سے مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے کا اندیشہ لگا رہتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بینک سے لے کر اس کو بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دیا جائے، اس تفصیل سے واضح ہے کہ سود کی رقم یا تو اصل مالک کو لوٹا یا جائے بصورت دیگر بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کرنا لازم وضروری ہے، لہٰذا مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ پاس کرانے میں سودی رقم بطور رشوت کے دینا شرعاً درست نہیں ہے "**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له، ويتصدق به بنية صاحبه**" (فتاوی شامی، ۵/ ۹۹، مَطْلَبٌ فِيمَنْ وَرِثَ مَالًا حَرَامًا، ط: سعید)۔

(۱۱) الف: بستی کے اکثر لوگ سودی کاروبار میں ملوث ہوں تو ان سے ہدیہ لینے میں تحقیق کرنے کا حکم:

اگر بستی کے لوگوں کا سودی کاروبار کے علاوہ کھیتی، تجارت اور دوسرا بھی ذریعہ معاش ہو اور یقیناً لوگوں کا سودی کاروبار کے علاوہ دوسرا ذریعہ معاش بھی ہوتا ہے، لہٰذا صرف کمائی کے حرام ہونے کے امکان کی صورت میں جب تک کمائی کے حرام ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو، محض وہم یا وسوسہ کی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کیے بغیر ہدیہ قبول کرنا درست ہے، اس لیے کہ بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اس کے ذریعہ آمدنی پر شبہ کرنا درست نہیں ہے، ہاں اگر کسی شخص کی آمدنی کے

بارے میں حرام ہونے کا یقینی علم ہو، یا کسی کی آمدنی کے بارے میں شک ہو اور اس پر کوئی دلیل بھی ہو تو تحقیق کرنا ضروری ہوگا، لہٰذا اگر واضح دلیل سے کسی کی آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو، تو ایسے شخص سے بغیر پوچھے ہدیہ لینا یا اس کی دعوت قبول کرنا ناجائز ہے۔

الفتاوی الہندیۃ میں ہے:

" **وإن كان كل واحد منهم صبياً أو كان شريک السبع من يريد اللحم أو كان نصرانياً ونحو ذلک لايجوز للآخرين أيضاً، كذا في السراجية. ولو كان أحد الشركاء ذمياً كتابياً أو غير كتابي وهو يريد اللحم أو يريد القربة في دينه لم يجزئهم عندنا؛ لأن الكافر لايتحقق منه القربة، فكانت نيته ملحقةً بالعدم، فكأنه يريد اللحم، والمسلم لو أراد اللحم لايجوز عندنا**" (الفتاوی الھندیہ ۵/ ۳۰۴)۔

(۱۱)ب: معمولی مشتبہ چیزوں کے بارے میں تحقیق کرنے کا حکم:

جو آدمی بچوں کو ٹافی وغیرہ دیتا ہو، کبھی کسی کو چائے پانی پلاتا ہوں، اور کبھی ضروری چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو، اور اس کی کمائی کیسی ہے معلوم نہ ہو تو بلا جھجھک استعمال کرنا چاہئے، جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہ حرام کمائی سے کھلا رہا ہے یا دے رہا ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کے معاملہ کو سداد اور درستگی پر محمول کرنا ضروری ہے، بلا وجہ کی تحقیق وجستجو میں پڑ کر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے کا مکلّف نہیں کیا گیا، اس لیے کہ محض شبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے "**لعدم اعتبار الشبهة في زماننا**" (شامی: ۵/ ۲۸۷، ط: زکریا دیوبند)، لہٰذا جب تک حرام مال کا یقینی علم نہ ہو تب تک تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے ان چیزوں کا استعمال درست ہوگا۔

"**رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام**" (الفتاوی الہندیۃ: ۳/ ۲۱۰، ط: دار الفکر)۔

ٹافی، دیا سلائی، سوئی وغیرہ ایسی معمولی چیزیں ہیں کہ اگر گری پڑی ملیں تو اس کو مالک کی اجازت کے بغیر استعمال کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ آج کے زمانہ میں اس طرح کی چیزوں کو کوئی ڈھونڈتا نہیں ہے، جب یہ چیزیں معمولی ہیں اور شریعت نے ملنے پر اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، حالاں کہ یہ حرام کی بھی ہوسکتی ہیں، پھر بھی صرف اس کے معمولی ہونے کا خیال کیا گیا ہے، لہٰذا ایسی معمولی چیزیں کوئی دے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہوگا اور اس کے تحقیق کی ضرورت نہیں

ہوگی (ردالمحتار ۶/۴۳۶،۴۳۸)۔

(۱۲) حرام کمائی والے کے لیے دعا کرنے کا حکم

جس کا مال یا کمائی حرام ہو، اس کی دعا قبول نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں صراحت ہے، اب حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے تو اس کے لیے دعا کرنا اور پانی پر دم کرنا شرعاً درست ہے، اس لیے کہ مؤمن کی دعاء مؤمن کے حق میں قبول کی جاتی ہے، جیسا کہ نماز میں سلام پھیرتے وقت تمام نمازیوں کے لیے دعا کی جاتی ہے، اسی طرح جمعہ اور عیدین کے خطبہ میں تمام امت مسلمہ کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں، لہٰذا حرام کمائی والے کے حق میں دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ وہ تو اپنی غلطی اور گناہ کی وجہ سے صالح مؤمنین کی دعاؤں کا زیادہ محتاج ہے کہ اللہ اس کو ہدایت دے کہ وہ حرام کمائی اور حرام خوری کو ترک کردے۔ رہی بات کہ حدیث شریف میں ایسے شخص کی دعاء قبول نہیں ہوتی ہے، تو واضح رہے کہ دعا کا قبول کرنا اللہ رب العزت کا کام ہے، اور دعا مانگنا بندے گنہ گار کا کام ہے، اور قرآن شریف میں نبی کریم ﷺ کو مؤمنین اور مؤمنات کے حق میں گناہوں کی مغفرت کی دعا کرنے کو کہا گیا ہے ارشاد ربانی ہے: "**واستغفر لذنبک وللمؤمنین والمؤمنات**" (القرآن الکریم) سوال میں درج حدیث شریف میں حرام خور کی خود کی دعاء کی قبولیت کو منع کیا گیا ہے، اس میں یہ صراحت نہیں ہے کہ کوئی دوسرا اس کے حق میں دعا کرے گا تو وہ قبول نہیں ہوگی، بلکہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ مؤمن مؤمن کے حق میں غائبانہ دعا کرتا ہے تو فرشتے آمین کہتے ہیں۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد الیاس قاسمی☆

اگر یہ معلوم نہ ہو کہ سودی کاروبار کی آمدنی آزادی سے قبل کی ہے یا آزادی کے بعد کی:

آزادی سے قبل ہندوستان دارالحرب تھا، طرفین کے نزدیک دارالحرب میں مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سودی کاروبار جائز ہے۔

چنانچہ حضرت مکحولؒ سے روایت ہے:

"عن مكحول أن رسول الله ﷺ قال: "لاربابين أهل الحرب "واظنه قال"وبين أهل الاسلام" أخرجه البيهقي من طريق عن أبي يوسف عن بعض المشيخة عن مكحول، هٰذا حديث مرسل والمرسل حجة عندنا وجهالة بعض المشيخة غير مضرلأن تلك الجهالة بالنسبة إلينا لابالنسبة إلى المجتهد" (اعلاء السنن ۱۴/ ۳۴۵)۔

علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وأما شرائط جريان الربا فمنها أن يكون البدلان معصومين فإن كان أحدها غير معصوم لايتحقق الرباعندنا وعندأبي يوسف هٰذا ليس بشرط ويتحقق الربا وعلى هٰذا الأصل يخرج ما إذا دخل مسلم دارالحرب تاجرا فباع حربيا درهما بدرهمين أو غير ذلك من سائرالبيوع الفاسدة في حكم الإسلام أنه يجوزعندأبي حنيفة ومحمد وعندأبي يوسف لا يجوز وعلى هذا الخلاف المسلم الأسير في دارالحرب أوالحربي الذي أسلم هناك ولم يهاجر إلينا فبايع أحدا من أهل الحرب" (بدائع الصنائع ۴/ ۴۱۶، ط: زکریا)۔

اگر کسی شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کے آباء واجداد سے ملا ہوا روپیہ آزادی سے قبل کمایا ہوا ہے یا آزادی کے بعد تو

☆ دارالافتاء دارارقم، پونہ

اسے تحری کرنا چاہئے اور ظن غالب پر عمل کرنا چاہئے، اگر ظن غالب کے مطابق سود کا روپیہ آزادی سے قبل کمایا ہوا ہے تو یہ حلال ہوگا، اگر ظن غالب کے مطابق سود کا روپیہ آزادی کے بعد کمایا ہوا ہو تو اس کے لئے یہ رقم حلال نہ ہوگی، فقہاء نے دیانات اور معاملات میں ظن غالب پر عمل کرنے کو جائز قرار دیا ہے، چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے:

"یجب أن یعلم بأن العمل بغالب الرأی جائز فی الدیانات وفی باب المعاملات وکذلک العمل بغالب الرأی فی الدماء جائز کذافی المحیط" (فتاویٰ عالمگیری ۳۱۳/۵)

غریب شخص کو ملے ہوئے حرام ترکہ کا حکم:

اگر غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائیداد اور مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اسی حرام جائیداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے تو اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ اس کو ملا ہوا ترکہ عین حرام ہے یا نہیں، اگر یہ ترکہ غصب کردہ ہو اور مالک معلوم ہو تو غریب شخص اس کا مالک نہ ہوگا، بلکہ اسے مالک کو لوٹانا ہوگا، لیکن اگر ترکہ وجائیداد مال مخلوط کی شکل میں ہو اور بعینہ اس کا مالک معلوم نہ ہو تو غریب شخص اس سے استفادہ کرسکتا ہے، اس کے لیے ترکے میں ملے ہوئے مال کو صدقہ کرنا واجب نہ ہوگا، چنانچہ فقہ کی کتاب الاختیار لتعلیل المختار میں ہے:

"والملک الخبیث سبیله التصدق ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز ثم إن کان غنیا تصدق بمثله و إن کان فقیرا لایتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۶۱/۳، ط: القاہرۃ)۔

علامہ شامیؒ رقم طراز ہیں:

"قوله: إلا فی حق الوارث الخ أی فإنّه إذا علم أن کسب مورثه حرام یحل له لکن إذا علم المالک بعینه فلا شک فی حرمته ووجوب ردّه علیه... وفی منیة المفتی :مات رجل ویعلم الوارث أن أباه کان یکسب من حیث لایحل ولکن لایعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الإرث والأفضل أن یتورع و یتصدق بنیة خصماء أبیه أو کذا لایحل إذا علم عین.

الغصب مثلا و إن لم یعلم مالکه لمافی البنرازیة: أخذ مورثه رشوة أو ظلما إن علم ذلک بعینه لا یجل له أخذه و إلا فله أخذه حکما أما فی الدیانة فیتصدق به بنیة إرضاء الخصماء والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم و إلا فإن علم عین الحرام لایحل له ویتصدق به بنیة صاحبه أو إن کان مالا مختلطامن الحرام ولایعلم أربابه ولا شیئا منه بعینه حلّ له حکما والأ حسن دیانة التنزه عنه" (ردّالمحتار ۳۱/۷)۔

سودی رقم سے حاصل شدہ جائیداد کا کرایہ غریب شخص کے لئے حلال ہوگا، علامہ نووی امام غزالیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ اگر غریب شخص اور اس کی اولاد خود محتاج ہوں تو وہ اپنے اوپر اور اپنی اولاد پر حرام مال صدقہ کرسکتا ہے، بلکہ وہ اور اس کے اہل وعیال غریب ومحتاج ہونے کی صورت میں صدقہ کے زیادہ مستحق ہیں، لہٰذا غریب شخص کو ملنے والا ترکہ اگر عین حرام نہ ہوتو حرام ترکہ اور کرایہ غریب انسان اپنے اوپر صرف کرسکتا ہے، چنانچہ الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے:

"ولـه أن يتـصـدق بـه عـلـى نـفسـه وعيـاله إذا كان فقيرا لأن عياله إذا كانوا فقراء فالوصف مـوجـود فيهم بل هم أولى من يتصدق عليه وله هوأن يأخذ منه قدر حاجته لأنه أيضا فقير، قال النووى بـعـد أن نـقـل قـول الغزالى المذكور: وهـذ الـذى قـالـه الـغـزالـى فى هذا الفرع ذكره الآخرون من الأصـحـاب وهوكما قالوه ونقله الغزالى أيضا عن معاوية بن أبى سفيانؓ وغيره من السلف وعن أحمد بن حنبل والحارث المحاسبى وغيرهما من أهل الورع لأنه لايجوز إتلاف هٰذا المال ورميه فى البحرفلم يبق إلا صرفه فى مصالح المسلمين" (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۳۴/۲۴۵)۔

بیوی اور ماں کے لیے مجبوراً شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی استعمال کرنے کا حکم:

شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کررہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے، اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، ایسی صورت میں بیوی اور ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ انہیں کسی حلال ذریعے سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز شوہر اور بیٹے کو حلال کمائی وآمدنی پر آمادہ کرنا ان کے ذمے واجب ہے، جب تک حلال کمائی کا انتظام نہ ہو بیوی اور ماں توبہ واستغفار کرتی رہیں اور حلال کی فکر وکوشش جاری رکھیں، ایسی مجبوری کی حالت میں شوہر اور بیٹے کی حرام کمائی بیوی اور ماں کے لئے حلال ہوگی، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

"وفى جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاما أوكسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها والإثم على الزوج" (ردالمحتار ۹/۲۷۹، ط: زکریا)۔

"امـرأة زوجهـا فـى أرض الـجـور إذا أكـلـت مـن طعامه ولم يكن عينه غصبا أواشترى طعاما أوكسوة من مال أصله ليس بطيب فهى فى سعة من ذلك والإثم على الزوج" (ردالمحتار ۵۴/۵۵۳)۔

أحکام المال الحرم وضوابط الانتفاع والتصرف بہ فی الفقہ الإسلامی میں ہے:

"فإذاكـان الـمـال الـحـرام فـى يدالوالد ينفق منه على نفسه وأبنائه لغير حاجة أوفقر فإن الأب يـكـون آثما بهٰذا الإنفاق إذا وجدالمال الحلال أوكان قادرا على تحصيله.....أمّا الأبناء ففى حكم

إنفاقهم من المال الحرام الذی عند الأب ینبغی التفریق بین حالتین: الأولی: أن یکون الأب غیر قادرعلی تحصیل المال الحلال إما لعجزه أو لصغرسنه وکانت نفقته واجبة علی أبیه أوکان طالب علم لیس له مصدررزق للعیش ودفع نفقات الدراسة إلا هٰذا المال الحرام الذی عندالأب فإن حکمه فی الأخذ من هٰذا المال حکم المضطر إلی دفع الأذی عن نفسه بالمیتة فیجوزله أن یأخذ ما ینفقه علیه والده وأن ینتفع به مع إنکاره فی قلبه لهٰذا الأمر إلی أن یصبح قادرا علی الاعتماد علی نفسه فی تحصیل الکسب الحلال أو أن یأتیه مال من مصدر حلال فیستغنی به عماعند والده من مال حرام لأنه عندحصول المال الحلال تزول ضرورته إلی الإنفاق علی نفسه من المال الحرام ویکون لزاما علیه أن ینفق علی نفسه من هذا المال الحلال ویحرم علیه أن یقبل نفقة والده من المال الحرام" (احکام المال الحرام ص:۲۸۹)۔

حرام کمائی سے بچے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا حکم:

اگر کسی شخص نے حرام کمائی سے اپنے بچے کو خوب پڑھایا لکھایا، اسے اعلیٰ تعلیم دی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بچہ کمائی کررہا ہے تو بچے کی کمائی حلال ہوگی، کیونکہ یہ اس کی اپنی محنت کی اجرت ہے، جس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں، احکام المال الحرام کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ بحالت مجبوری جبکہ لڑکے کے پاس والد کے مال حرام کے سوا کوئی اور مال نہ ہو وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے والد کے مال حرام سے استفادہ کرسکتا ہے، اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد بچہ اپنی سند کا استعمال کرتے ہوئے کمائی کرے تو اس کی یہ کمائی حلال ہے، بشرطیکہ وہ مفوضہ کام کرنے پر قادر ہو، علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں کہ اجرت عمل کے عوض میں ہوتی ہے:

"**الأجرة إنما تکون فی مقابلة العمل**" (ردالمحتار ۴/۳۰۷)۔

شادی میں دعوت دینے والے کی کمائی کا درست علم نہ ہو تو دعوت میں شرکت کا حکم:

اگر شادی میں دعوت دینے والے کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے یا نصف حرام ہے تو ایسے وقت میں تحری کرنا چاہئے اور ظن غالب پر عمل کرنا چاہئے، اگر ظن غالب ہو کہ دعوت دینے والے کی نصف سے زائد کمائی حلال ہے تو دعوت قبول کرلینا چاہئے، اگر ظن غالب کے مطابق دعوت دینے والے کی نصف سے زائد کمائی حرام ہے تو اس کی دعوت میں شرکت سے اجتناب کرنا چاہئے، فتاوی عالمگیری میں ہے۔

"**أهدی إلی رجل شیئا أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلابأس إلا أن یعلم بأنه حرام**

فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولايأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقر ضته من رجل كذافي الينا بيع ولايجوز قبول هدية أمراء الجورلأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أ كثرماله حلال بأن كان صاحب تجارة أوزرع فلا بأس به لأن أموال الناس لاتخلوعن قليل حرام فالمعتبر الغالب و كذا أكل طعامهم، كذافي الاختيار شرح المختار" (عالمگیری۵/۳۴۲)۔

فتاوی قاضیخان میں ہے کہ اگر ھدیہ دینے والے کا غالب مال حلال ہے تو اس کا ہدیہ قبول کرنے اور اس کے یہاں دعوت کھانے میں کوئی حرج نہیں:

"**إن كان غالب مال المهدى من الحلال لابأس بأن يقبل الهدية و يأكل مالم يتبين عنده أنه حرام لأن أموال الناس لاتخلوعن قليل حرام فيعتبر الغالب**" (فتاوی قاضیخان علی ھامش الفتاوی الھندیۃ ۳/۴۰۰)۔

فتاوی بزازیہ میں ہے کہ جس شخص کو بادشاہ یا ظالموں کے یہاں کھانے کی دعوت دی جائے تو اسے تحری کرنا چاہیے، اگر اس کے دل کا میلان اس کھانے کی حلت کی جانب ہو تو کھانا چاہئے، بصورت دیگر اسے کھانے سے اجتناب کرنا چاہئے:

"**وعن الإمام رحمة الله أن المبتلى بطعام السلطان والظلمة يتحرى إن وقع في قلبه حله قبل وأكل و إلّا لا لقوله عليه السلام استفت قلبك**" (فتاوی بزازیہ علی ھامش الھندیہ ۶/۳۶۰)۔

دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ داعی کا کاروبار حرام ہے:

اگر دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ داعی کا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس صورت میں جس قدر کھانا کھایا ہے اس کی قیمت صدقہ کر دینا چاہیے، اور توبہ واستغفار کرنا چاہیے، فقہ کی درج ذیل عبارت سے حرام کھانے کے بقدر روپیہ صدقہ کرنے کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

"**الملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز ثمّ إن كان غنيا تصدق بمثله و إن كان فقيرا لايتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/۶۱)۔

ایک سوال کے جواب میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی تحریر فرماتے ہیں کہ کسی نے مجبوری میں سود کی رقم استعمال کر لی ہو تو بعد میں اتنی ہی رقم حلال کمائی سے الگ کر کے غریبوں پر صدقہ کرنا لازم ہے (مستفاد: کتاب الفتاوی ۵/۳۰۵)۔

لہٰذا دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ داعی کا کام؛ کاروبار بالکل حرام ہے تو اس صورت میں جس قدر کھانا کھایا ہے اس کی قیمت صدقہ کر کے توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کا حیلہ:

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کا ایک حیلہ یہ ہے کہ جس کے پاس حرام مال ہو وہ غیر مسلم سے قرض لے لے، پھر حرام مال کو قرض کی ادائیگی میں دے دے، اس طرح بار بار قرض لے کر اپنے حرام مال کو حلال کر سکتا ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر غیر مسلم شراب کی تجارت سے حاصل شدہ آمدنی کے ذریعے مسلمان کا قرض ادا کرے تو مسلمان کے لیے اس آمدنی سے قرض وصول کرنا جائز ہے، کیونکہ غیر مسلم کے مذہب میں شراب کی خرید وفروخت جائز ہے، فتاوی عالمگیری میں ہے:

"ولو كان لمسلم على نصراني دين فباع النصراني خمرا أو أخذ ثمنها و قضاه المسلم من دينه جازله أخذه لأن بيعه لها مباح" (فتاوی عالمگیری ۵/ ۲۶۷)۔

غیر مسلموں کے نزدیک سودی لین دین بھی حلال ہے، اس لئے سودی رقم یا حرام رقم غیر مسلم کو قرض میں دے سکتے ہیں، جبکہ غیر مسلم کی حرام رقم کو مسلمان قرض کے طور پر لے سکتا ہے، کیونکہ اس کے مذہب کے مطابق حرام رقم اس کے لئے حلال ہے (مستفاد: منتخبات نظام الفتاوی ۳/ ۲۴۴)۔

فتاوی عالمگیری میں بھی قرض کو حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کے حیلہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

"وفي شرح حيل الخصاف لشمس الأئمة رحمة الله تعالىٰ أنّ الشيخ أبا القاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة يقضي بها ديونه والحيلة في هذه المسائل أن يشتري نسيئة ثم ينقد ثمنه من أي مال شاء وقال أبو يوسف رحمه الله تعالىٰ سالت أباحنيفة رحمة الله تعالىٰ عن الحيلة في مثل هذا فأجابني بما ذكرنا في الخلاصة" (فتاوی عالمگیری ۵/ ۳۴۲)۔

حرام مال کے منتقل ہونے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ بعینہ وہی حرام مال دوسرے کی ملکیت میں پہونچنے کے بعد بھی حرام رہتا ہے، لہٰذا اس مال کو دوسرا شخص بھی جان بوجھ کر استعمال کرے گا تو حلال نہ ہوگا، لیکن اگر دوسرا آدمی اس مال کو فروخت کر کے اس کے عوض میں دوسری چیز حاصل کرتا ہے تو حاصل شدہ چیز حرام نہیں ہوئی، بلکہ صرف مکروہ ہوتی ہے، کیونکہ استہلاک کے بعد حکم میں تبدیلی آجاتی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی نے گیہوں غصب کر کے اس کو زراعت میں لگا دیا، گٹھلی غصب کر کے اس کا پودا لگا دیا تو وہ گیہوں کی فصل اور درخت کے پھل کا مالک ہو جائے گا اور ضمان کی ادائیگی سے قبل اس کے لئے ان سے استفادہ کرنا حلال ہوگا، کیونکہ اس صورت میں مکمل طور پر استہلاک پایا گیا ہے، ہدایہ میں ہے:

"إذا غصب حنطة فزرعها أو نواة فغرسها غير أنه عند أبي يوسفؒ يباح الانتفاع فيهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاك من كل وجه" (ہدایہ علی فتح القدیر ۹/ ۳۴۲، ط: زکریا)۔

حرام مال قرض لیکر اس سے تجارت کرنے کا حکم:

اگر کسی شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہو جسے وہ صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہو، لیکن تجارت کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہو تو وہ اپنے اس مال کو خود ہی قرض لیکر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اصل قرض کو صدقہ کر دے تو اس سلسلے میں فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر حرام مال کو متعین کر کے اس کے بدلے میں حلال مال خریدا ہے اور پھر وہی حرام مال متعین قیمت میں ادا کر دیا ہے یا حرام مال کی ادائیگی سے قبل حلال مال خریدا پھر وہی مال حرام اس کے حوالے کر دیا تو ان دو صورتوں میں آمدنی و نفع حرام ہوگا، اگر بغیر تعین مال حرام کوئی حلال مال خریدا اور پھر وہ مال حلال قیمت میں ادا کر دیا یا متعین تو کیا مال حرام کو مگر ادا کیا مال حلال یا متعین تو کیا مال حلال مگر ادا کیا مال حرام تو ان تینوں صورتوں میں کرخیؒ کے نزدیک اس کی آمدنی حلال ہوگی، صرف اصلی مال حرام کا ضمان لازم ہوگا، چنانچہ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"**رجل اكتسب مالامن حرام ثم اشترىٰ فهذا على خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البا ئع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها أو اشترى مطلقا و دفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم ----- وقال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لايطيب وفي الثلاث الأخيرة يطيب وقال أبوبكر: لايطيب في الكل لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعاللحرج عن الناس**" (ردالمحتار ۷/ ۳۷۴)۔

صورت مسئولہ میں امام کرخیؒ کی بیان کردہ پانچ صورتوں میں سے آخری تین صورتوں کے مطابق مال حرام سے تجارت کرے تو اس کی آمدنی حلال ہوگی، اصل مال کو صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

جس شخص کا آدھا بزنس حلال اور آدھا حرام ہو اس کی ملازمت کا حکم:

اللہ کے رسول ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کو لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ سب برابر ہیں۔

"**عن جابر رضی الله عنه لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا و موكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء**" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۳۳۳۳)

مولانا تقی عثمانی صاحب تکملہ فتح الملہم میں لکھتے ہیں کہ سودی بینک جیسے اداروں میں ملازمت جائز نہیں، کیونکہ اس میں سودی لین دین کو لکھنا پڑتا ہے اور سودی حساب و کتاب رکھنا پڑتا ہے، اس طرح تنخواہ بھی حرام آمدنی سے ملتی ہے، کیونکہ

بینک کی زیادہ تر آمدنی سود سے حاصل ہوتی ہے:

"قوله وكاتبه لأن كتابة الربا إعانة عليه ومن هنا ظهر أن التوظف في البنوك الربوية لايجور فإن كان عمل المؤظف في البنک مايعين على الرباكالكتابة أوالحساب فذلک حرام لوجهين الأول: إعانة على المعصية والثاني: أخذ الأجرة من المال الحرام فإن معظم دخل البنوک حرام مستجلب بالربا وأما إذاكان العمل لاعلاقة له بالربا فإنه حرام للوجه الثاني فحسب فإذا وجد بنک معظم دخله حلال جازفيه التوظف للنوع الثاني من الأعمال" (تکملہ فتح الملہم ۱/۶۱۹)۔

صورت مسؤلہ میں ملازم کو حلال اور حرام دونوں کاروبار کا حساب لکھنا پڑتا ہے، اسی طرح دونوں کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہے، دونوں کاروبار کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہے، اس لئے یہ ملازمت جائز نہ ہوگی، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جب حلال اور حرام دونوں جمع ہوتے ہیں تو حرمت کو ترجیح دی جاتی ہے۔

"إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" (الاشباہ والنظائر ص:۱۷۰، ط:المکتبۃ الأشرفیۃ دیوبند)۔

البتہ کوئی شخص مجبور ہو، ملازمت چھوڑنے پر سخت پریشانی کا اندیشہ ہو تو دوسری حلال ملازمت کے حصول تک اس ملازمت کو اختیار کرسکتا ہے، لیکن جیسے ہی دوسری حلال ملازمت حاصل ہو اسے اس ملازمت کو فوراً چھوڑ دینا چاہئے۔

حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کھیتی باڑی کا حکم:

حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کھیتی باڑی سے حاصل شدہ پیداوار خریدنے والے کے لئے حلال ہوگی، حرام رقم سے زمین خریدنے کی وجہ سے زمین کی پیداوار حرام نہیں ہوگی۔

حرام کمائی والے کے گھر میں نوکری کرنا:

اگر کسی شخص کی غالب آمدنی حرام ہو تو اس کے گھر میں نوکری نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اسے حرام کمائی سے اجرت ملے گی؛ جبکہ اجرت میں حرام کمائی لینا جائز نہیں، فقہاء لکھتے ہیں:

"الحرمة تتعددمع العلم بها" (الدر المختار علی رد المحتار ۷/۳۰۱)۔

"قوله الحرمة تتعدد الخ نقل الحموی عن سیدی عبدالوهاب الشعرانی أنه قال فی کتابه المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى ذمتين سالت عنه الشهاب ابن الشلبی فقال: هومحمول على ما إذا لم يعلم بذلک، أما لو رأى المكاس مثلا يأخذ من أحد شيئا من المكس ثمّ

یعطیه آخر ثم من ذلک الآخر آخرفهو حرام '' (ردّالمحتار ۷/۳۰۱)۔

''لو أن فقیرا یأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان یأخذها غصبا أیحل له قال: إن خلط ذلک بدراهم أُخری فإنه لا بأس به و إن دفع عین المغصوب من غیر خلط لم یجز ------ وقال: لایمک تلک الدراهم وهی علی ملک صاحبها فلا یحل له الأخذ'' (فتاوی عالمگیری ۵/۳۴۲)۔

حرام کمائی والے شخص کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا:

جس شخص کے متعلق معلوم ہو کہ اس کی کمائی حرام ہے اس کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا ناجائز ہے، کیونکہ اس کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنے سے اس کے ناجائز کاروبار کی حوصلہ افزائی ہوگی، اللہ تعالیٰ نے حرام اور سودی کاروبار سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، ارشادی باری تعالیٰ ہے:

''یایها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا مابقی من الربوا اِن کنتم مومنین، فإن لم تفعلو فاذنوا بحرب من الله رسوله'' (سورہ البقرہ:۲۷۹-۲۷۸)۔

(اے ایمان والو! اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود ابھی باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اسلام میں سود کس درجہ سخت گناہ ہے وہ اس آیت سے ظاہر ہے کہ کسی اور گناہ کے بارے میں اس درجہ سخت لب ولہجہ اختیار نہیں کیا گیا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی سود لینے پر مصر ہو تو اس پر فوج کشی بھی کی جاسکتی ہے، کیونکہ اگر وہ سود کو حرام ہی نہیں سمجھتا تو مرتد ہے، حرام سمجھ کر عمل سے انکار کرتا ہے تو ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم ہے، جیسا کہ فقہاء نے ان لوگوں سے جہاد کا حکم دیا ہے جو اذان یا جماعت کے ترک کرنے پر اتفاق کرلیں'' (آسان تفسیر قرآن مجید ۱/۲۲۰)۔

سودی کاروبار کرنے والوں کی بائک یا کار میں بیٹھ کر ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہئے، بلکہ ان کا بائیکاٹ کرنا چاہئے، تاکہ وہ اپنے حرام کاروبار سے باز آجائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسّکم النار**'' (ھود:۱۱۳)۔

(اور ظالموں کی طرف نہ جھک جاؤ ورنہ ایسا نہ ہو کہ تم کو بھی دوزخ کی آگ پکڑ لے)۔

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''اس آیت میں تعلیم دی گئی ہے کہ انسان کا ظلم اور گناہ سے خود بچنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا ارتکاب کرنے والوں

سے بے تعلقی برتنا، ان کی صحبت سے بچنا، ان کی حوصلہ افزائی سے باز رہنا اور ان کی ایسی تائید وتوقیر سے اجتناب برتنا بھی ضروری ہے جو ظلم وزیادتی اور گناہ ونافرمانی کے سلسلے میں ان کا حوصلہ بڑھاتی ہو، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی بدعت کرنے والے کی توقیر کی اس نے دین کو منہدم کردیا "**من وقر مبتدعا فقد هدم الدين**" (الجامع الصغیر للسیوطی، حدیث نمبر: ۹۰۸۲)۔

حرام کمائی والے شخص سے اسکول یا مدرسہ کی فیس لینا:

حرام کمائی والے شخص کی اگر غالب آمدنی حرام ہو تو اس کے بچے کی اسکول یا مدرسہ کی فیس لینا جائز نہیں، اگر حلال آمدنی غالب ہو تو اس سے اسکول یا مدرسہ کی فیس لے سکتے ہیں، حرام کمائی والا شخص اگر کسی سے قرض لیکر اسکول یا مدرسہ کی فیس دے تو بھی اسکول اور مدرسہ والے فیس لے سکتے ہیں، فتاوی عالمگیری میں ہیں:

"**آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه و غالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل مالم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه و إن كان غالب ماله حلالا فلا بأس بقبول هديته والأكل منها كذافي الملتقط**" (عالمگیری ۵/ ۳۴۳)۔

اسکول یا مدرسے میں اکثر بچوں کی فیس حلال ذرائع سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے اگر حرام کمائی والے اشخاص کی فیس وصول کرلی جائے اور اس فیس کو دیگر فیس کی رقم میں ملا کر رکھ دی جائے تو یہ مال مخلوط حلال ہوجائے گا اور اسے اسکول یا مدرسہ کے مصارف میں خرچ کرنا درست ہوگا، فقہاء لکھتے ہیں:

"**ولو خلط السلطان المغصوب بماله فتجب الزكاة فيه ويورث عنه لأن الخلط استهلاك إذا لم يمكن تميزه عند أبي حنيفة**" (الدرالمختار علی ردالمحتار ۳/ ۲۱۷)۔

"**قوله لأن الخلط استهلاك أي بمنزلته من حيث أن حق الغير يتعلق بالذمة**" (الدرالمختار علی ردالمحتار ۳/ ۲۱۷)۔

مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم بطور رشوت دینا:

مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے ایک خطیر رقم بطور رشوت دی جاتی ہے، اس رشوت کے بغیر نقشہ کی منظوری میں بہت دشواری ہوتی ہے، اس لئے بدرجۂ مجبوری مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم بطور رشوت دینا جائز ہے (مستفاد: کتاب الفتاوی ۵/ ۳۰۸)۔

حضرت مولانا نظام الدین اعظمی صاحبؒ نے منتخبات نظام الفتاوی میں کسی برحق مقدمہ کے وکلاء وغیرہ کی فیسوں کے واسطے سودی رقم استعمال کرنے کو جائز قرار دیا ہے (مستفاد: منتخبات نظام الفتاویٰ ۳/ ۱۸۵)۔

مولانا نظام الدین صاحبؒ کے فتوی سے بھی مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم بطور رشوت دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔

کسی کے ہدیہ دینے پر مال کے حلال یا حرام ہونے کی تفتیش:

کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام؟ ناگواری اور اختلاف کا باعث بنتا ہے تو بھی پوچھے بغیر ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، کیونکہ بستی کی اکثریت کا کاروبار حرام پر مشتمل ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فاسقوں کی دعوت قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔

"**عن عمران بن حصين قال نهىٰ رسول ﷺ عن إجابة طعام الفاسقين**" (مشکوٰۃ المصابیح علی مرقاۃ المفاتیح حدیث نمبر ۳۲۲۷)۔

اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات معلوم نہ ہو کہ اس کا کوئی کاروبار حرام پر بھی مبنی ہے تو ایسے شخص کے یہاں دعوت میں حلال وحرام کی بابت پوچھنا درست نہیں، کیونکہ اس میں مسلمان کی ایذاء اور توہین ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے:

"**عن أبی هريرة قال قال النبی ﷺ: إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فليأكل من طعامه ولايسأل ويشرب من شرابه ولايسأل روى الأحاديث الثلاثة فی شعب الإيمان وقال هٰذا اِن صح فلأن الظاهر أن المسلم لا يطعمه ولايسقيه إلا بما هو حلال عنده**" (مشکوۃ المصابیح علی مرقاۃ المفاتیح حدیث نمبر ۳۲۲۸)۔

مرقاۃ المفاتیح میں ہے:

السوال: أی من أين هٰذا الطعام ليتبين أنه حلال أم حرام ..... فإنه قد يتأذى بالسوال وذلک إذا لم يعلم فسقه كما ينبئی عنه قوله على أخيه المسلم" (مرقاۃ المفاتیح ۵/۲۱۱۱)۔

کوئی شخص بچوں کو ٹافی اور معمولی اشیاء مدد کے طور پر دے تو ان اشیاء کو استعمال کرنے کا حکم:

سوال میں مذکور ہے کہ اس بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہے، لہٰذا جو شخص بچوں کو ٹافی وغیرہ دیتا ہے، چائے پلاتا ہے یا ضرورت کی معمولی اشیاء مثلاً دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دیکر مدد کرتا ہے تو اس کے متعلق معلوم کر لینا چاہئے کہ اس کی غالب آمدنی حلال ہے یا حرام؟ اگر اس کی غالب آمدنی حلال ہے تو اس کی دی گئی چیزیں قبول کی جاسکتی ہیں، لیکن اگر اس کی غالب آمدنی حرام ہو تو اس کی دی گئی چیزیں قبول کرنا جائز نہیں، فقہاء لکھتے ہیں:

"إن كان غالب مال المهدى من الحلال لابأ س بأن يقبل الهدية ويأكل" (فتاویٰ قاضیخان علی ھامش الہندیۃ ۳/۴۰۰)۔

فتاوی عالمگیری میں ہے:

"لايجيب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راض بفسقه وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال وبالعكس يجيب مالم يتبين عنده أنه حرام كذافى التمر تاشى" (فتاویٰ عالمگیری ۵/۳۴۳)۔

حرام کمائی والے کے لئے دُعا کرنے کا حکم:

اگر کوئی شخص مال حرام فقیر کو دیتے وقت ثواب کی امید کرے تو اس کی تکفیر کی جائے گی، اسی طرح فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال حرام ہے اس کے باوجود وہ مال حرام دینے والے کے لئے دعا کرے اور دینے والا آمین کہے تو دونوں کی تکفیر کی جائے گی، علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

"رجل دفع إلى فقير من المال الحرام شيئا يرجوبه الثواب يكفر ولوعلم الفقير بذلك فدعاله و آمن المعطى كفرا جميعا" (ردّالمحتار ۳/۲۱۹)۔

حرام کمائی والے کے لئے مال حرام میں اضافہ کی دعا کرنا جائز نہیں، لیکن اگر وہ اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کرائے یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہے تو اس کے لئے دُعا کرنا یا پانی پر دم کرنا جائز ہے، البتہ اس موقع پر وہ کوئی چیز بطور ہدیہ دے تو اس کو لینا جائز نہیں، عام حالات میں کافر کی تعظیم کرتے ہوئے اسے سلام کرنا اور دُعا دینا کفر ہے، لیکن بعض حالات میں اس کو دُعائیہ کلمات کہنا جائز ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیم مصری رقم طراز ہیں:

"إذا قال المسلم للذمى أطال اللّٰه بقائك اِن نوى بقلبه أن يطيل الله بقائه لعله أن يسلم أو يؤدى الجزية عن ذل أوصغار لابأس به لأن هٰذا دعاء له اِلى الإسلام أولمنفعة المسلمين" (الاشباہ والنظائر مع شرح حموی ص:۴۵)۔

(اگر مسلمان ذمی سے کہے: "اللہ تعالیٰ تیری عمر دراز فرمائے،" اگر وہ اپنے دل میں نیت کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز فرمائے؛ تاکہ وہ اسلام قبول کرلے یا ذلیل وحقیر بن کر جزیہ ادا کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں؛ اس لئے کہ یہ اس کے مسلمان ہوجانے کی دعا کرنا ہے یا مسلمانوں کے فائدہ کی دعا ہے)۔

جب بعض مواقع پر کافر کے لئے دعا کی جاسکتی ہے تو سود خور مسلمان کے لئے بھی دُعا کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کا ہدیہ قبول نہ کیا جائے یا کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے حرام کاروبار کی حوصلہ افزائی ہو۔

حرام مال سے متعلق بعض مسائل کا مدلل ومفصل جواب

مولانا محمد عمار مزمل القاسمی ☆

سوال نمبر ایک کا جواب:

دارالحرب میں کافر حربی سے سود کے جائز ہونے یا نہ ہونے میں فقہاء کرام کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، احناف میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ دارالحرب میں کافر حربی سے سودی معاملے کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں، ان کا مستدل وہ نصوص ہیں جن میں سود کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے، البتہ حنفیہ میں سے امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ دارالحرب میں کافر حربی سے سود کو ایک غریب حدیث "لا ربا بین المسلم والحربی" کی بنیاد پر چند قیود کے ساتھ جائز کہتے ہیں، لیکن چوں کہ معاملہ سود کا ہے جس کی حرمت قرآنی آیات میں بغیر کسی قید کے منصوص ہے؛ اس لیے حنفیہ کے یہاں جمہور کے مسلک (یعنی حرمت والے قول کو) ترجیح حاصل ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، طرفین کے مسلک (یعنی جواز کے قول) کو مرجوح قرار دیا گیا ہے (تفصیل کے لیے امداد الفتاوی ۳/ ۱۱۷، رسالہ بعنوان: "تحذیر الاخوان عن الربا فی الھندوستان" اور فتاوی بینات ۴/ ۹۵ تا ۱۰۰، کتاب المعاملات دیکھیں)۔

چنانچہ "فتاوی عثمانی" میں شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم دارالحرب میں سودی معاملہ کرنے کے جواز وعدم جواز کے تعلق سے لکھتے ہیں: "سود قرآن وسنت کے صریح ارشادات کے مطابق حرام قطعی ہے، اس کا لینا دینا سب ناجائز ہے، مسلمان اور ذمی سے سود کے لین دین کی حرمت پر تو اجماع ہے، البتہ دارالحرب کے کافروں سے سود کا لین دین بعض فقہاء جائز کہتے ہیں، دوسرے فقہاء اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہیں اور فتوی اسی پر ہے" (۳/ ۲۶۸، نعیمیہ)۔

نیز: "امداد المفتیین" کے اندر حضرت مفتی شفیع صاحبؒ نے بھی اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں بڑی محتاط بات لکھی ہے: "دارالحرب میں کفار سے سود لینا بھی جمہور علماء کے نزدیک حرام ہے، امام مالک وامام شافعی اور امام احمد بن حنبل اور احناف میں سے امام ابو یوسف رح اسی حرمت کے قائل ہیں، البتہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمدؒ سے دارالحرب میں اس کا جواز منقول ہے (۲/ ۷۰۴)۔

☆ اڑیسہ

لہٰذا! وارث کے پاس جو سودی رقم ایسی ہو جس کے بابت اس کا علم نہ ہو کہ یہ مورث کی آزادی سے پہلے کی حاصل کردہ ہے یا آزادی کے بعد کی؟ تو چونکہ اختلاف کی بناء پر مسئلہ میں خفت پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے اس مسئلہ میں سودی رقم کے تعلق سے حکم میں سختی نہ برتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر وارث شرعی نقطہ نظر سے غریب و مستحق زکات ہو تو اس کے مصرف سود ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ذات میں بھی صرف کر سکتا ہے اور اگر وہ صاحب حیثیت و مالدار ہو تو اسے مورث سے حاصل شدہ جملہ سودی رقم فقراء پر صدقہ کر دینا چاہئے، تاکہ مفتی بہ قول پر عمل ہو جائے اور بایں وجہ اختلاف در این مسئلہ شدت بھی باقی نہ رہے، اب چاہے وہ سودی رقم اپنے خالص پیسوں سے صدقہ کرے یا اس مال حرام سے جو نفع ہوا ہے اس سے کرے، بہر دو صورت اگر اتنی مقدار صدقہ کر دے تو اس کے لئے اس سودی رقم سے حاصل شدہ نفع بھی حلال ہو جائے گا۔

سوال نمبر دو کا جواب:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں سے اسے حرام پیسے ملے ہیں اگر ان کا پتہ ہو اور یہ غریب اتنے پیسے اداء کرنے پر قادر بھی ہو تو مالکان تک اگر وہ بقید حیات ہوں ورنہ ان کے ورثہ تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر ان میں سے کسی کا پتہ نہ چلے اور تلاش بسیار کے باجود محرومی ہی ہاتھ لگے تو حرام مال کے بقدر فقراء پر تصدق واجب ہوگا اور اسے مال لقطہ قرار دے کر احکام لقطہ اس پر جاری ہونگے، چنانچہ حضرات فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر ملتقط خود فقیر مستحق زکات ہو تو وہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، بنابریں فقیر کو حرام جائداد سے جو آمدنی حاصل ہو رہی ہے اگر فقیر مال حرام کے تعلق سے مذکورہ بالا طریقہ پر عمل کرے تو یہ آمدنی اس کے لئے حلال رہے گی: "**إن كان الملتقط محتاجا فله أن يصرف اللقطة إلى نفسه بعد التعريف**" (الفتاوی الہندیۃ)۔

سوال نمبر تین کا جواب:

اس سوال کے دو اجزاء ہیں: شوہر یا بیٹا حرام کمائی کرے، بیوی اور ماں کے پاس حلال کمائی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو ایسی صورت میں اس خاتون کے لئے شوہر یا بیٹے کے مال حرام سے ضروریات پورا کرنا کیسا ہے؟

(۲) دوسرا ہے کہ حرام کمائی سے بچے کو اعلیٰ تعلیم دینے کے بعد بچہ اب کمائی کرتا ہے تو اس کی کمائی کو استعمال میں لانا کیسا ہے؟ پہلے جزء کا جواب! شریعت مطہرہ میں چونکہ ماں اور بیوی کا نان ونفقہ بیٹے اور شوہر پر واجب ہے، اس لئے اگر ان خواتین کے پاس رزق حلال کے ذرائع دستیاب نہ ہوں اور بیٹے اور شوہر کی کمائی حرام ہو اور اس حرام آمدنی کے علاوہ کوئی اور حلال ذریعہ معاش نہ ہو تو اس اضطراری حالت میں ماں و بیوی کو اولاً یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کسی غیر مسلم خاتون یا مرد سے

گزارے کے بقدر پیسے لے لیں اور ان کے شوہروں کی طرف سے نفقہ کے بابت جو پیسے ملیں اسے قرض کی ادائیگی میں صرف ادا کردیں، اس طرح کے حیلے سے ماں اور بیوی حرام پیسے کے استعمال سے بچ جائینگی۔

''**إن الشيخ أبا القاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه وما يأخذه من الجائزة يقضي به ديونه**'' (الفتاوی الہندیۃ ۳۹۶/۵، زکریا)۔

اور اگر اس طرح غیر مسلم سے قرض لینا دشوار ہو تو وہ حیلہ اختیار کیا جائے جسے فتاویٰ ہندیہ میں حضرت امام ابو یوسف رح کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایسی خاتون کسی دوکان سے اپنی ضروریات کی چیزیں ادھار خرید لیا کریں، پھر بعد میں بیٹے یا شوہر کی طرف سے جو پیسے ملیں وہ دوکاندار کو دے دیا کریں، یہ بہت آسان طریقہ ہے۔

''**والحيلة في هذه المسائل أن يشتري نسيئة ثم ينقد ثمنه من أي مال شاء، وقال أبو يوسفؒ سألت أبا حنيفة عن الحيلة في مثل هذا فاجابني بما ذكرنا**'' (الفتاوی الہندیۃ ۳۹۶/۵۰، زکریا)۔

اور اگر یہ دوسری صورت ہمیشہ آسان نہ ہو تو پھر بشکل مجبوری بیٹا یا شوہر حرام کمائی سے جو کچھ لاکر دیں تو خواتین ان کے استعمال کی مجاز ہونگی اور اس کا گناہ شوہر و بیٹے کو ملے گا۔

''**امرأة زوج في أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذالک الطعام غصبا فهي في سعة من أكله، وكذا لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناوله والإثم على الزوج**'' (شامی ۳۰۲/۷، زکریا)۔

دوسرے جزء کا جواب یہ ہے کہ بچے کو حرام کمائی سے اعلیٰ تعلیم دینے کے بعد اگر وہ بچہ حلال طریقہ پر کمائی کرے تو حرام کمائی سے تعلیم دلانے کی وجہ سے بچہ کی حلال کمائی یا حلال ملازمت کی آمدنی پر اس کا اثر نہیں پڑے گا اور وہ آمدنی حلال بھی رہے گی اور والدین کے لئے اس کمائی کو اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش بھی ہوگی، ہاں ماں باپ کو حرام کمائی سے تعلیم دلانے کا گناہ ہوگا، اس لئے ان پر توبہ و استغفار ضروری ہے اور اسی طرح کے متعدد فتاوی و جزئیات اردو عربی کتابوں میں ایسے مذکور ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر واسطہ حرام ہو، لیکن آمدنی حلال ذرائع سے موصول ہو تو واسطہ کی حرمت کا اثر آمدنی کی حالت پر ظاہر نہیں ہوگا، جیسا کہ فتاوی حقانیہ'' میں ایک سوال کے جواب میں یوں مذکور ہے: ''رشوت یا دیگر غیر شرعی طریقوں سے حاصل کیا ہوا ٹھیکہ یا کوئی بھی کام فی نفسہ جائز نہیں اور پھر شرعی حدود کی خلاف ورزی کئے بغیر وہ عمل کر کے کچھ کمانا اس عامل کے لئے قابل اعتراض نہیں، اگرچہ رشوت دینا اور لینا حرام ہے''۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''**رجل سرق ماء وأساله إلى أرض كرمه فأجاب أنه يطيب له ما خرج**

بـمنزلة رجل غصب شعيرا أو تبنا وسمن به دابته فإنه يجب عليه مثل ماغصب ومازاد فی الدابة يطيب له" (۲۷۶/۶،زکریا)۔

سوال نمبر چار کا جواب:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تحقیق سے معلوم ہوجائے کہ کسی بستی کے تقریباً سارے لوگوں کی غالب آمدنی حرام ہے یا خاص طور پر جس نے مدعو کیا ہے اس کے تعلق سے غلبہ ظن ہوجائے کہ اس کی غالب آمدنی حرام ہے تو اس کی دعوت قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے، الا یہ کہ داعی خود صراحت کردے کہ یہ دعوت مال حلال سے ہے تو اس وقت داعی کی غالب آمدنی حرام ہونے کے باوجود بھی دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہوگی، مزید تفتیش کی ضرورت نہیں۔

"**الأصل: أن أمـور المسلمين محمولة على السداد والصلاح حتى يظهر غيره**" ان ضابطوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اسی طرح غالب آمدنی کے حلال ہونے کے باجود یہ معلوم ہوجائے کہ داعی نے مال حرام سے دعوت کی ہے تو اس وقت اجابت دعوت کی گنجائش نہیں ہوگی، باقی اگر اس طرح کے علاقے میں جہاں اکثریت حرام کمائی میں ملوث ہو آدمی مدعو ہو تو اپنی بساط کے مطابق تحقیق کرے، اگر غلبہ ظن حرمت کا ہو تو نہ جائے اور غلبہ حلت ہو تو اس شکل میں جانے کی گنجائش ہے، اگر نہ جانے میں کسی طرح کے فتنے برپا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو نہ جائے خاص کر مقتدا حضرات۔

"**ولـا يـجـوز قبـول هـديـة أمراء الجور لأن الغالب فی مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به**" (الفتاوی الی الہندیہ:۳۹۶/۵۰،زکریا)۔

سوال نمبر پانچ کا جواب:

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان ظاہر کا مکلّف ہے، چنانچہ اگر داعی کے تعلق سے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ حرام آمدنی سے دعوت کررہا ہے اور بظاہر وہ دیندار یا حرام سے اجتناب کرنے والا ہو تو اس کی دعوت قبول کرنے میں شرعاً مضائقہ نہیں، چنانچہ متعدد فقہی نظائر اس کے مؤید ہیں:

"**قـال الـفقيه أبو الليث اختلف الناس فی أخذ جائزة السلطان قال: بعضهم: يجوز مالم يعلم أنـه يعطيه من حرام، قال محمدؒ: بـه نـأخذ مالم نعرف شيئا حراما لعينه وهو قول أبی حنيفةؒ وأصحابه كذا فی الظهيرية**" (الفتاوی الہندیۃ ۳۹۶/۵)۔

اس لئے اگر بعد میں یہ پتہ چلے کہ داعی نے مال حرام سے دعوت کی تھی تو اس اکل حرام کا گناہ داعی کو ملے گا، باقی

ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ توبہ واستغفار کرے اور آئندہ اس طرح مبہم ومتہم دعوت قبول کرنے سے احتیاط برتے یا صراحتاً حلت و حرمت کے تعلق سے دوٹوک لفظوں میں پوچھ لے۔

سوال نمبر چھ کا جواب:

اگر کسی انسان نے بطریق حرام کچھ مال کمایا ہو اس کی دو شکلیں ہیں:

(۱) یا تو وہ مال دیگر مال حلال سے علیحدہ موجود ہوگا۔

(۲) یا دوسرے اموال کے ساتھ خلط ہو گیا ہوگا؟ اگر پہلی صورت ہے تو اسے حلال کرنے یا اس سے انتفاع کی کوئی شکل نہیں ہے، بلکہ اگر مالکان یا ان کے ورثہ کا علم ہو جائے تو ان تک پہنچانا ضروری ہے اور بعد بسیار تلاش بصورت عدم معرفت اس کا تصدق علی الفقراء لازم ہے، ہاں! اتنی گنجائش ہوسکتی ہے کہ اگر ایسا شخص بنظر شارع غنی وصاحب حیثیت نہ ہو تو بصورت عدم معرفت ارباب اموال یا ورثہ بر بناء حکم لقطہ خود بھی استعمال کرسکتا ہے:

"**والحاصل فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه**" (شامی:۷/۳۰۱)، "**و إن دفع عين المغصوب من غير خلط لم يجزء**" (الفتاوی الہندیہ ۵/۱۳۹۶)،"**ومفاده الحرمة و إن لم يعلم أربابه وينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق ما نقلناه إذ لو خلط بحيث لا يتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله كما حققناه قبيل زكات الأموال**" (شامی ۷/۳۰۲)،"**فينتفع الرافع به لو فقيرا و إلا تصدق به على فقير ولو على أصله وفرعه وقوله "لوفقيرا" قيد به لأن الغنى لا يحل له الانتفاع بها إلا بطريق القرض**" (الدرالمختار مع الرد:۶/۲۳۸)۔

اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) بصورت خلط الحرام بالحلال، حرام کی تمیز ممکن ہوگی۔

(۲) ممکن نہیں ہوگی، اگر خلط متمیز ہو تو جتنا مال حرام ہے اس کے ساتھ مذکورہ بالا طریقہ اپنایا جائے گا اور اگر خلط غیر متمیز ہو تو فقہی عبارات سے ہی مترشح ہوتا ہے کہ خلط چونکہ استہلاک ہے اور استہلاک موجب ملک ہے، اس لیئے مال حرام کے بقدر اموال اگر مالکان یا ان کے ورثہ تک پہنچا دئے جائیں یا بصورت دیگر تصدق علی الفقراء کی راہ اپنالی جائے تو پورا مال حلال ہو جائے گا اور انتفاع بھی جائز ہوگا۔

"**و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه**" (شامی)،"**إذ لو خلط بحيث لا يتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لا يحل له التصرف**

فیہ مالم یؤد بدلہ کما حققناہ قبیل زکات لأن الخلط استہلاک إذا لم یمکن تمییزہ عند أبی حنیفۃ

(الدرالمختار ۳/ ۲۱۷)۔

نیز حضرت تھانوی رح ایک جگہ اہل رشوت کے ساتھ خلط کر کے کھانا کھانے کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں ''خلط استہلاک ہے اور استہلاک موجب ملک ہے'' (امداد الفتاوی ۴/ ۱۳۳)۔

علاوہ ازیں مسئلہ بالا کو ''امداد الاحکام'' میں کافی شرح وبسط وتفصیل اور بڑی شفافیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، حضرت مفتی علام رقمطراز ہیں'' حرام وحلال مخلوط ہونے سے یہ سب مال اس شخص کی ملک ہو گیا مگر ملک خبیث ہے، اس لئے اگر اہل حقوق کے حقوق کا بدل ادا کر دیا جائے تو یہ سب حلال ہو جائے گا جس کی صورت یہ ہے کہ باپ سے جتنا روپیہ چرایا تھا اس کا تخمینہ سے اندازہ کریں اور تخمینہ سے جو اندازہ ہو اس کو سب ورثہ کا حق سمجھیں۔

اسی طرح اندازہ کریں کہ زکات وصدقات واجبہ کا کتنا مال لیا ہے اور یاد کر کے کن کن لوگوں سے لیا ہے اگر وہ معلوم ہوں تو ان کو یہ مقدار ادا کر دے، اگر معلوم نہ ہوں تو ان کی طرف سے بنیت زکوٰۃ رقم فقراء پر تقسیم کر دے، خواہ دفعتاً اس کی استطاعت ہو یا تدریجاً ادا کرنے میں مشغول ہو جائے۔

اور جتنا ادا کر سکتا ہے ادا کرتا رہے گا تو اس مال مخلوط من الحرام والحلال سے انتفاع اس کو جائز ہوگا'' (۷/ ۳۰۴، زکریا)۔

سوال نمبر سات کا جواب:

جس شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہو تو اس کی دو صورتیں:

۱) یا تو وہ مال حرام الگ تھلگ ہوگا۔

۲) یا دوسرے اموال کے ساتھ گڈ مڈ ہوگا۔

اگر دوسری شکل ہے اور خلط غیر متمیز ہے تو جیسا کہ ماقبل میں تفصیل سے یہ بات آچکی ہے کہ خلط غیر متمیز سے ملکیت ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق نفس مال سے نہیں، بلکہ ذمہء کا سب سے ہو جاتا ہے، اس لئے اس دوسری شکل میں ایسا مجبور شخص جسے تجارت کے لئے کسی اور ادارے یا کسی انسان سے غیر سودی قرض نہ ملے تو اس حرام مال کو بطور قرض تجارت میں لگانے کا مجاز ہوگا، دراین شکل بہتر یہ ہے کہ محض اتنے پیسے بعد میں ادا کرنے کے ارادہ پر اکتفاء نہ کرے، بلکہ عملاً کچھ ادا بھی کرنا شروع کر دے، چنانچہ ارباب اموال یا ان کے ورثہ کا علم ہونے کی شکل میں ان تک پہنچانا، اور بشکل عدم معرفت/غرباء پر صدقہ کرنا شروع کر دے، ان شاء اللہ اس مجبوری میں مال حرام کو اپنے لئے صرف کرنے میں عنداللہ ماخوذ نہیں ہوگا۔

''**نقول: إنہ لما خلطھا ملکہ و صار مثلھا دینا فی ذمتہ لا عینہ**'' (شامی ۳/ ۲۱۸، زکریا)..... ''**لأن**

التصرف به قبل أداء بدله لا يحل و إن ملكه بالخلط كما علمته" (المصدرالسابق۲۱۹)۔

"**قال: أحب إلى أن لا يأكل منه ويسعه حكما أن يأكله إن كان ذالک الطعام لم يكن يد المطعم غصبا أو رشوة أى إن لم يكن عين الغصب أو الرشوة لأنه لم يملكه فهو نفس الحرام فلا يحل له ولا لغيره** (المصدرالسابق) **لأن الخلط استهلاک إذا لم يمكن تمييزه عند أبى حنيفةؒ إذ قلما يخلو مال من غصب**" (الدرالمختار) "**ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه**" (تنویرالابصار)"**وفى الرد: قوله لأن الخلط استهلاک أى بمنزلته من حيث أن حق الغير يتعلق بالذمةلا بالعين**" (۳/۲۱۷)۔

اور اگر پہلی صورت ہے، یعنی مال حرام الگ سے موجود ہے یا خلط متمیز ہے تو ان دونوں شکلوں میں بصورت علم مالکان یا ان کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے، اسے استعمال کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور بوقت عدم علم چونکہ اسے لقطہ قرار دے کر لقطہ کے احکام جاری ہوتے ہیں، اس لئے اگر یہ مستحق زکات ہو تو اس مال حرام متعین یا خلط متمیز کو اپنے اوپر خرچ کرسکتا ہے، لیکن یہ تصرف مالکانہ طور پر ہوگا قرض کے طور پر نہیں، کما مر تفصیلہ اور اگر دراین شکل وہ فقیر نہ ہو، صاحب استطاعت ہو اور حالت اس کی اس طرح ناگفتہ بہ ہوجائے، تو اگر اس مال حرام کو صدقہ کرتا ہے تو لابدی طور پر اسے سودی قرض لینا پڑے گا تو یہ شخص بعینہ اس مال حرام میں تصرف نہ کرے، بلکہ بوجہ مجبوری اس مال حرام کو اپنے پاس موجود یا کسی سے قرض لیکر مال حلال سے خلط غیر متمیز کردے اور مال حرام کے بقدر فقراء پر صدقہ کرنا شروع کردے تو اس کے لئے اپنے پاس موجود مال حرام کو استعمال میں لانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ خلط غیر متمیز منزلہ استہلاک ہے اور استہلاک موجب ملک ہے، گو اس میں خبث باقی ہو، لیکن اتنی مقدار میں صدقہ کرنا شروع کردینے سے رفتہ رفتہ اس خبث کا بھی ازالہ ہوجائے گا (شامی:۷/۳۰۲)۔

سوال نمبر آٹھ کا جواب:

اولا دیکھا جائے گا کہ مالک مسلم ہے یا غیر مسلم، اگر غیر مسلم ہو اور کارکن کو جائز کاموں کے ساتھ بسا اوقات ناجائز کام کرنا بھی پڑتا ہو تو اصل ضابطہ شرعیہ کے مطابق تنخواہ میں سے جو اجرت ناجائز کام کے مقابلے میں ملے گی وہ ناجائز ہوگی، لیکن چونکہ مالک غیر مسلم ہے، اس لئے ایک دوسرے ضابطہ "**إباحة مال غير المسلم والذمى برضاه فى غير دار الإسلام**" کی بناء پر اس ناجائز کام کی بھی اجرت لینے کی گنجائش ہوگی۔

اور اگر ناجائز کام بہت کم مقدار میں کبھی کبھار کرنا پڑتا ہو تو اب چونکہ عموما اکثر جگہوں میں سارا کام حلال مل جائے حرام کی بالکل بھی آمیزش نہ ہو تقریبا مشکل سا ہوگیا، اس لئے شرعا اسے معفو عنہ قرار دیتے ہوئے اس کی تنخواہ کو حلال قرار دیا جائے، کچھ درج ذیل علمی عبارت سے استمداد کرنا ممکن ہے:

"العاشرة: قال فی القنیة من الکراهة غلب علی ظنه أن أکثر بیوعات أهل السوق لا تخلوعن الفساد فإن کان الغالب هو الحرام تنزه علی شرائه ولکن مع هذا لو اشتراه یطیب له" (الاشباہ والنظائر ۱/۳۰۹)۔

سوال نمبر نو کا جواب:

اس سوال کے جواب سے قبل یہ بات قابل توضیح ہے کہ حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد حلال ہے یا حرام؟ اگر حرام ہے تو اس پر مشتری کی ملکیت ثابت ہوگی نہیں؟ ان سب باتوں کا جواب مندرجہ ذیل تفصیلی کلام سے واضح ہوجائے گا ان شاء اللہ العزیز، علامہ شامیؒ نے "فتاوی تاتارخانیہ" کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مال حرام سے کوئی چیز خریدے تو اس کی بظاہر پانچ شکلیں ہیں جن میں سے کتاب میں مذکور پہلی دو شکلوں کے علاوہ باقی تین شکلوں میں مال حرام سے خرید کردہ شئ پر مشتری کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، اور عموماً خرید وفروخت انہی تین شکلوں کے ذریعے ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ جتنی رقم حرام ذرائع سے حاصل ہوئی ہے جب تک اسے مرحلہ وار مالک یا اس کے وارث کو نہ لوٹا دے یا بصورت دیگر صدقہ نہ کردے تب تک ثبوت ملکیت کے باوجود اس میں تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، جیسا کہ ماقبل میں یہ بات کافی بسط وتفصیل سے متعدد بار آچکی **فلا نعیده الآن**، بنابریں اگر کوئی حرام مال سے جائداد خریدے اور کوئی بندہ اس میں حلال کام کرے تو کام کے حلال ہونے کی بناء پر عامل کے لئے اس جائداد میں کام کرنے کی گنجائش ہوگی، اور اس کام کی اجرت لینا بھی حلال ہوگا۔

اگر کسی شخص کی کمائی حرام ہو لیکن اس کے گھر جائز وحلال کام کی نوکری ملے تو وہ نوکری کرنا جائز ہے، اور اس ملازمت کی اجرت وتنخواہ کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اس کی حلال وحرام ہر طرح کی آمدنی مخلوط ہو اور ملازم کو یہ اندازہ نہ ہو کہ غالب آمدنی حلال ہے تو اجرت لینے کی اجازت ہے، لیکن اگر غالب آمدنی کے حرام ہونے کی خبر ملے یا جس پیسے سے اجرت دے رہا ہے بعینہ اس کا حرام ہونا ظاہر ہو تو ان دوصورتوں میں اس پیسے سے تنخواہ لینا حلال نہیں ہوگا، الا یہ کہ مالک یہ کہہ دے کہ یہ اجرت حلال آمدنی سے ہے تو اس وقت لینے کی گنجائش ہوگی، باقی جن شکلوں میں تنخواہ اس مال سے لینے کی گنجائش نہیں ہے ان میں عامل مالک کو زور دے کہ وہ یا تو حلال آمدنی سے تنخواہ دے یا کسی سے قرض لیکر دے جیسا کہ حضرت تھانوی رح کے درج ذیل جواب سے یہی بات مترشح ہوتی ہے، لکھتے ہیں: "جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے جیسے کسی مے فروش یا سودخور وغرہم کے پاس نوکری کرنا ناجائز ہے، اور جو تنخواہ ملتی ہے وہ حلال نہیں ہے۔

ہاں! جن لوگوں کی آمدنی مشتبہ اور مختلط الحلال والحرام ہو مثلاً یہی لوگ کسی مے فروش.....کوئی دوسرا پیشہ مباح مثل تجارت حلال یا کچھ اور بھی کرتے ہیں تو اس وقت نوکری اور اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت جائز ہے (امداد الفتاوی ۳/ ۳۷۴)۔

لہٰذا! اگر کوئی حرام کمائی کرنے والا شخص اپنے بچے کا داخلہ مدرسہ یا اسکول میں کرائے تو فیس کے نام پر ادارہ جو پیسے وصول کرے ان پیسوں کے بارے میں وہی تفصیل ہے جو ابھی گزرا۔

سوال نمبر نو کا جواب:

اور جہاں تک بات ہے حرام کمائی کرنے والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، سفر کرنا، ان کی سواری پر بیٹھ کر گھومنا پھرنا کی کہ وہ کیسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دفع مضرات یا فتن مدنظر نہ ہوں تو ان کے ساتھ یہ رواداری برتنا دراصل گناہ وظلم وا لے کاموں میں تعاون ومدد کرنا ہے جو از روئے قرآن منع ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: ''**و لا تعاونوا على الإثم والعدوان**'' (تم ظلم وگناہ کے کاموں میں کسی مدد نہ کرو)، اس لئے زجراً حرام کمائی کرنے والے سے قطع تعلق کر دینا چاہئے، جب تک کہ وہ توبہ واستغفار کر کے اس کمائی سے باز نہ آئے، اس کے باوجود بھی اگر کوئی ایسے شخص سے تعلق رکھے تو اسے حرام تو نہیں کہا جائے گا، لیکن تعاون علی الاثم کی بناء پر مکروہ وناپسندیدہ گناہ گار ضرور ہوگا۔

سوال نمبر دس کا جواب:

بوقت ضرورت شدیدہ حضرات فقہاء کرام نے رشوت دینے کی گنجائش دی ہے اور مدرسہ یا مکان یا عمارتوں کے نقشہ کی منظوری بھی ایک بڑی ضرورت بن چکی ہے، اس لئے حفاظت حق کے پیش نظر سرکاری عملہ یا کارپوریشن کو رشوت دینے کی گنجائش ہے۔

اس لئے اگر شدید مجبوری ہو اور حلال مال سے رشوت اداء کرنے کی طاقت نہ ہو اور رشوت دینا بھی ضروری ہو تو در این صورت تملیک بے غبار طریقہ اختیار کر کے اس سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

''**رجل مات وكان كسبه من الحرام ينبغي لورثته أن يتعرفوا فإن عرفوا أربابها رد عليهم، وإن لم يعرفوا تصدقوا به**'' (قاضیخان ۲/۱۷۰)۔

سوال نمبر گیارہ کا جواب:

اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ اگر کوئی علاقہ ایسا ہو جہاں کی اکثریت سودی یا دوسرے حرام کاروبار میں ملوث ہو، اگر وہاں سے کوئی چیز خریدنی یا کسی کے ہاتھ کچھ فروخت کرنا ہو یا وہاں کا کوئی بندہ دعوت طعام دے یا ہدیہ وتحفہ پیش کرے تو احتیاط اسی میں ہے کہ پوچھ تاچھ کر لی جائے، کیونکہ اکثریت کے حرام پیشہ ہونے کی وجہ سے بظاہر یہ خیال آنے لگتا ہے کہ مذکورہ بالا یہ

ساری چیزیں بھی حرام آمدنی سے ہوں، اس لئے استفسار تو بہر حال اولی وبہتر ہے، جیسا کہ فتاوی قاضیخاں میں مذکور ہے:

"**رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزم السوال أنه حلال أم حرام؟ قالوا: ينظر: إن كان في بلد وزمان كان الغالب هو الحلال في أسواقهم ليس على: المشترى أن يسأله أنه حلال أم حرام، ويبنى الحكم على الظاهر، و إن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام**" (۱۶۹/۲)۔

سوال نمبر بارہ کا جواب:

جی ہاں! یہ بات تو صحیح ہے کہ حرام کمائی کرنے والے یا حرام کھانے والے کی دعاء قبول نہیں ہوتی، جیسا مسلم وترمذی ودیگر کتب حدیث کے اندر یہ حدیث موجود ہے، لیکن اس میں خود کا سب حرام واکل حرام کی دعاء کے رد کی بات ہے، لیکن دوسروں کی دعاء اس کے حق میں موثر ومقبول نہ ہو اس کا ذکر حدیث میں نہیں ہے اور کیوں کر ہو جبکہ سوال کا سب حرام مسلم کے تعلق سے ہے جو کافر سے ایمان کی بدولت لاکھ درجہ بہتر ہے اور کافر کے حق میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے دعاء کرنا ثابت ہے تو فاسق مسلمان کے لئے کیوں ممنوع ہو۔

بہر حال جب زندگی میں کافر کے لئے دعاء مانگنے کی گنجائش ہے تو فاسق مسلم کے لئے تو بدرجہ اولی اس کے معصیت سے بچنے کی دعاء مانگنے کی گنجائش ہوگی۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق چند اہم مسائل

مولانا عبدالحکیم عبدالرحیم قاسمی پالنپوری☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدالانبياء والمرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين۔

قرآن وحدیث میں حلال وطیب مال کے حصول اور حرام ومشتبہ مال سے بچنے کی غیر معمولی تاکید وارد ہوئی ہے، کیوں کہ اعمال واخلاق کے بننے اور بگڑنے میں حلال وحرام کمائی کا بڑا دخل ہوتا ہے، اور حرام مال کا ضرر دشمن اور باطل طاقتوں سے پہنچنے والے ضرر سے کافی زیادہ ہوتا ہے۔

اس لئے تمام شعبہ ہائے حیات میں حلال وحرام کی رعایت رکھنا ایک مسلمان کا فرض ہے، بالخصوص خوراک وپوشاک جو ہر مسلمان کی بنیادی ضرورت ہے، ان دو چیزوں میں تو حلال وحرام کی پہچان، رعایت اور عملی احتیاط برتنا ہر مسلمان پر بقدر ضرورت فرض عین کے درجے میں ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ذیل میں سوالوں کے جوابات نمبر وار پیش خدمت ہیں۔

وراثت میں ملنے والے حرام مال اور اس سے حلال کاروبار کا حکم:

جواب:(۱)

اگر وارث کو کسی چیز کے بارے میں حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہے کہ مورث نے وہ چیز حرام اور ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی ہے اور وہ اسی حالت میں ہے تو وہ بالکل حرام ہوگی، اس میں تصرف جائز نہ ہوگا، اور نافذ بھی نہ ہوگا، لہٰذا اس سے حاصل ہونے والا منافعہ وکرایہ بھی حرام ہوگا؛ کیونکہ مورث اس کا مالک ہی نہیں بنا ہے۔

اب اگر وارثین اس کے اصل مالک کو جانتے ہوں تو ان پر لازم ہے کہ وہ بعینہ چیز (زمین وجائیداد) مالکان تک

☆ دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی، ضلع: پٹن، گجرات

پہنچادے، یاان کے وارثین کو پہنچادے، اور اگر اصل مالکان اور وارثین معلوم نہ ہوں تب بھی مورث کے وارثین کے لیے اس کا رکھنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ بلا نیت ثواب غریب کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

اور اگر متعین طور پر کسی چیز کے بارے میں معلوم نہیں کہ مورث نے ناجائز طریقے سے حاصل کی ہے یا جائز طریقے سے حاصل کی ہے، احتمال دونوں کا ہے؛ کیوں کہ اس کے پاس کمائی کے جائز طریقے بھی تھے اور ناجائز طریقے بھی، مال حرام اور مال حلال کی ایسی مخلوط صورت میں وراثت توکل مال میں جاری ہوگی اور ورثہ کا استعمال کرنا درست ہوگا، البتہ ورثہ اس کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ان کو حرام کی مقدار معلوم ہو تو اس کا صدقہ کردے، اور اگر مقدار معلوم نہ ہو تو تخمینہ کرکے کچھ رقم صدقہ کردے تو ان شاء اللہ آخرت میں مؤاخذہ نہ ہوگا۔

اور اگر ورثہ مال حرام کی ملاوٹ کی وجہ سے ایسا مال لینے سے احتیاط برتے اور پورا کا پورا صدقہ کردے تو عند اللہ باعثِ اجر وثواب اور موجب برکت ہوگا۔

جیسا کہ امداد الفتاوی میں مرقوم ہے:

ہر چند کہ بعض فقہاء نے مطلقا مال حرام کو وارث کے لیے حلال کہا ہے، لیکن یہ روایت صحیح نہیں، مفتی بہ اور معتمد یہ ہے کہ ان کے لئے بھی حرام ہے، پس اگر ارباب حقوق ورثاء کو معلوم ہیں تو اگر بعینہ ان کی چیز محفوظ ہو تو اس کو، ورنہ اس کی قیمت واپس کردیں، اور اگر معلوم نہیں تو اگر مال حرام معین اور متمیز ہے تو اس کو مالک کی نیت سے تصدق کردیں، اور اگر مخلوط غیر متمیز ہے تو اگر اس کی مقدار قیمت معلوم ہے اس کو تصدق کردیں، ورنہ تخمینہ کرکے تصدق کردیں انشاء اللہ آخرت میں مؤاخذہ نہ ہوگا" (امداد الفتاویٰ ۴/۳۵۰)۔

"وفی منیة المفتی: "مات رجل ویعلم الوارث أن اباه کان یکسب من حیث لایحل، ولکن لایعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الإرث، والأفضل أن یتورع ویتصدق بنیة خصماء أبیه، وکذا لا یحل إن علم عین الغصب مثلا و إن لم یعلم مالکه" (شامی ۷/۳۰۱)۔

علامہ نووی نے المجموع میں ذکر کیا ہے: **"أن من ورث مالا ولم یعلم من أین اکتسبه مورثه أمن حلال أو من حرام ولم تکن علامة فهو حلال بإجماع العلماء .فإن علم أن فیه حراما وشک فی قدره أخرج الحرام بالاجتهاد"** (المجموع شرح المهذب ۹/۴۲۸، بحوالہ المال الحرام ۷۹)۔

والظاهر أن الحنفیة یفرقون فی هذه المسألة بین أمرین:

الأول: إذا کان الوارث یعلم عین المال الحرام لکنه یجهل صاحبه۔

الثانی: إذا كان الوارث يعلم وجود المال المحرم فی التركة ولكنه يجهل قدره ومالكه.

فالحكم فی الصورة الأولی: لايجوز للوارث أن يتملك المال المحرم ديانة ولا قضاء، والواجب فيه الرد إلى المالك أو التصدق به عند الجهل بالمالك.

أما فی الصورة الثانية: وهی إذا كان المال المحرم غير معروف لاختلاطه بغيره ولجهالة مالكه فالحكم فيه جواز الأخذ قضاء والتورع أولی ديانة'' (المال الحرام ۸۸ ألفہ: عباس احمد محمد الباز، دار النفائس للنشر والتوزیع)۔

حرام کاروبار کر کے جمع کی جانے والی جائیداد سے حاصل ہونے والے کرایہ کا کیا حکم ہے؟

جواب:(۲)

مذکورہ صورت میں مال حرام کی مقدار تو واجب التصدق ہی ہے؛ البتہ حرام مال سے جو زمین وغیرہ خریدی ہے، یا حرام مال سے جو جائز کاروبار کر رہا ہے اس کا منافعہ وکرایہ حلال ہوگا، اسے حرام نہیں کہا جائے گا؛ کیونکہ استہلاک کے بعد حکم میں تبدیلی آجاتی ہے، اور چونکہ عقود کے وقت عام طور پر حرام مال کی طرف اشارہ بھی نہیں ہوتا ہے اور اس سے زمین وغیرہ خریدی ہے، اس لیے بقول امام کرخی فسادِ زمانہ کے باعث منافعہ وکرایہ حلال ہوگا۔

لیکن موجودہ حالات کے تناظر میں جبکہ لوگوں کے اندر حد سے زیادہ دنیا پرستی، عیش پرستی اور راحت طلبی کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے، ناجائز حرص وہوس کا یہ عالم ہو چکا ہے کہ دولت اندوزی کے شوق میں حلت وحرمت اور شریعت کے جائز وناجائز امور کا کوئی پاس ولحاظ نہیں، اس کی روک تھام کے لیے اور لوگوں کے دلوں میں حلال کی وقعت وعظمت اور حرام کی نحوست ونفرت جگانے کے لیے ہر جگہ حضرت امام کرخی کے قول کا سہارا لے کر مال حرام کا منافعہ جائز قرار دینے کے بارے میں ذرا تأمل ہے، چنانچہ صاحب احسن الفتاوی نے بھی اسی خلش کو یوں بیان فرمایا ہے:

''راجح یہی ہے کہ بہر حال حرام مال سے حاصل کردہ اشیاء حرام ہیں، خواہ اشارہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اور احتیاط بھی اسی میں ہے، قول کرخی رحمہ اللہ قرآن وحدیث اور قیاس وعقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے، بندہ نے اس کا صحیح محمل تلاش کرنے کی کوشش کی، اور بعض دوسرے علماء محققین سے بھی دریافت کیا، مگر یہ عقدہ حل نہ ہو سکا'' (احسن الفتاوی: ۱۰۴)۔

احتیاط کا تقاضا تو ہے ہی کہ اصل مال حرام اور اس کے توسط سے حاصل ہونے والا نفع دونوں واجب التصدق ہیں، جیسا کہ طرفین رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، نیز دلائل کا باریک بینی اور گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو بھی یہی قول باوزن اور مقصدِ شریعت سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔

ہاں! قولِ کرخی کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں لینا چاہیے کہ باقاعدہ حرام مال کو کمائی اور منافع کا ذریعہ بنالے، ایسا کرنا بالکل جائز نہیں، یہ تو اگر غلطی سے کرلیا تو منافعہ وکرایہ حلال ہوگا، لیکن اصل مال حرام تو واجب التصدق ہی رہے گا۔

"**إذا غصب حنطة فزرعها أو نواة فغرسها غير أن عند أبي يوسف يباح الانتفاع فيهما قبل أداء الضمان لوجود الاستهلاک من كل وجه**" (ہدایہ کتاب الغصب ۴/ ۳۷۴)۔

گھر میں کمانے والے حرام کماتے ہیں تو عورت کیا کرے؟

جواب: (۳)

قرآن وحدیث میں حرام مال کے جو مضرات ونقصانات بیان کئے گئے ہیں اس کے پیش نظر حرام مال تو حرام ہی ہے؛ مگر مذکورہ صورت میں غریب خاتون تین باتوں کا التزام کرتے ہوئے حرام مال سے گذر بسر چلائے تو عند اللہ قابلِ مؤاخذہ نہیں ہوگی۔

الف: عورت اپنے شوہر یا بیٹے کو حلال کمائی کے فوائد اور حرام کمائی کے دنیاوی واخروی مضرات سے برابر آگاہ کرتی رہے۔

ب: حرام کمائی آنے پر دل میں سخت ندامت اور بے چینی ہو، اور جب تک حلال انتظام نہ ہو تب تک اس حرام خوری پر توبہ استغفار کرتی رہے۔

ج: وہ خود شریعت کی پابندی کرتے ہوئے حلال روزگار حاصل کرنے کی فکر اور مقدور بھر کوشش کرے۔

اور اصل تو یہی ہے کہ آدمی حلال کاروبار کرے؛ لیکن سمجھانے کے باوجود کمائی کرنے والا شخص حرام کمائی سے باز نہیں آرہا ہے، اور آل اولاد کے لیے کسب حلال کی کوئی شکل بھی نہیں تو بدرجۂ مجبوری پورے گھرانے کو حرام خوری سے بچانے کے لیے یہ تدبیر بھی اختیار کی جاسکتی ہے کہ والد مسکین بالغ اولاد میں سے کسی کو نقد رقم کا مالک بنادے، پھر وہ گھر کے مصارف پر خرچ کرتا رہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ والد حرام کمائی کرتا رہے اور پورا گھرانہ مذکورہ حیلہ کرکے اس سے کھاتا رہے، اور اسی طرح زندگی گزارتا رہے؛ بلکہ حتی المقدور حلال ذریعہ معاش کی کوشش وتلاش جاری رکھے، جب تک بندوبست نہ ہو اس وقت تک مذکورہ تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے؛ البتہ یہ شرطیں ملحوظ رہیں کہ لڑکا بالغ ہو، مسکین ہو، تملیک تام ہو" (جدید معاملات کے شرعی احکام/ ۱۶۶)۔

مذکورہ بالا تدبیر حرام خوری سے بچنے کی ایک شکل ہے؛ البتہ علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ اگر شوہر اپنی بیوی کو حرام مال کھلاتا ہے، یعنی رشوت اور غصب وغیرہ کا بعینہ حرام مال ہے تو بیوی کے لیے جائز نہیں؛ لیکن اگر اس

مال سے کوئی چیز خرید کر لاتا ہے تو لینا جائز ہے کہ عوض کی چیزوں میں صاحب حق کے لیے وسعت ہے، اور گناہ شوہر پر ہے۔

"**وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أکلت من طعامه، ولم یکن عینه غصبا، أو اشتری طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من ذلک، و الإثم علی الزوج**" (شامی ۶/۳۸۶)۔

حرام مال سے اولاد کی پرورش کی، ان کو پڑھایا لکھایا، ان سب چیزوں میں حرام مال کے استعمال کا گناہ بہر حال والد کو ضرور ہوگا؛ مگر بچہ چونکہ مستقل حلال کاروبار کر رہا ہے، حرام کمائی کا اس کاروبار سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے اس کا کمایا ہوا مال حلال ہوگا، اس کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

"**وفی جامع الجوامع: اشتری الزوج طعاما أو کسوة من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها والإثم علی الزوج،وفی أحکام المال الحرام: فیجوز له (للإبن) أن ینتفع به مع إنکاره فی قلبه لهذا الأمر إلی أن یصبح قادرا علی الاعتماد علی نفسه فی تحصیل الکسب الحلال**" (فتاویٰ عثمانی: ۳/۱۲۷ حاشیہ ۱)۔

جس بستی کے اکثر لوگ حرام کاروبار میں مبتلا ہوں، ان کی دعوت اور ہدیہ کا حکم:

جواب: (۴)

اگر متعین طور پر کسی شخص کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ اس کی کمائی حلال ہے یا حرام ہے؛ اور آثار و قرائن سے بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے؛ بلکہ صرف یہ بات ہے کہ لوگ حرام کاروبار میں ملوث ہیں، لہٰذا یہ بھی حرام کاروبار کرتا ہوگا اور اس کا مال حرام ہوگا۔

اس سلسلے میں حضرت امام غزالی، علامہ ابن تیمیہ، شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی اور حضرت مفتی رشید احمد صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے شخص کی دعوت اور ہدیہ قبول کرنا درست ہے، اور یہ وسوسہ کہ حرام کمائی کا فساد غالب ہے اور عام ہے، لہٰذا یہ شخص بھی اس کا شکار ہوگا، یہ ایک مسلمان کے ساتھ سوئے ظن ہے۔

نیز بلا وجہ براہِ راست اس سے حلال و حرام کے بابت دریافت کرنا بھی درست نہیں؛ کیونکہ اس میں مسلمان کی ایذاء و توہین ہے۔

"**فإنه قد یتأذی بالسوال، و ذلک إذا لم یعلم فسقه**" (مرقاۃ المفاتیح بحوالہ فتاویٰ محمودیہ: ۲۵/۴۸۲ حاشیہ ۱)۔

اور خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام اجمعین حضر و سفر میں کوئی دعوت طعام پیش کرتا تو اسے قبول فرما لیتے اس کی تحقیق و جستجو میں نہیں پڑتے تھے کہ اس کا مال حرام ہے یا حلال ہے۔

ویسے بھی شریعت مطہرہ میں شک وظن کا اعتبار نہیں ہے، اس لیے محض شک کی بنیاد پر دعوت وہدایا ممنوع نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہاں! اگر کسی جگہ بغیر جستجو وتفتیش کے (کیونکہ یہ بہ موجب حدیث ممنوع ہے) باوثوق ذرائع سے یا قرینہ حال سے مال حرام کا غالب گمان ہوجائے تو پھر اجابت ممنوع ہوگی، جیسا کہ نبی پاک-صلی اللہ علیہ وسلم- مدینہ منورہ میں تشریف آوری پر معلوم کرلیا کرتے تھے کہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ کیونکہ قرینہ حال یہی تھا کہ مہاجرین کی مدد کے پیش نظر آپ کو بھی صدقہ دیا جارہا ہو، جب لوگوں کو معلوم ہوگیا تو اس طرح استفسار نہیں فرماتے تھے۔

اور اگر کسی جگہ مال حرام کا یقین ہو تو بھی واضح ہے کہ اجابت ناجائز وحرام ہوگی، اور اگر کسی جگہ حرام وحلال میں اشتباہ کی صورت پیدا ہوجائے تو اس کے دفیعہ کے لیے آس پاس کے لوگوں سے مناسب انداز میں دریافت کرلینا درست ہے، جیسا کہ فتاویٰ محمودیہ (۴۸۱/۲۵) پر فتویٰ درج ہے، اور ابھی گزرا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کے ابتدائی دور میں اسی جیسے شبہ کے دفیعہ کے لیے صدقہ یا ہدیہ دریافت فرمالیتے تھے، ویسے بھی ایسے مواقع میں ورع واحتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ حسن انداز سے پس وپیش اختیار کرلے، تاکہ دع ما یریبک إلی ما لا یریبک پر بھی عمل ہوجائے۔

"عن أبی هريرة مرفوعا أن رسول الله -صلى الله عليه وسلم- قال: إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولايسئله عنه ، وإن سقاه شرابا من شرابه فليشرب من شرابه ولايسئله عنه" (مسند احمد بن حنبل) (المال الحرام:۲۶۰۲۵۹)۔

دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ داعی کی کمائی حرام ہے تو تلافی کیسے کرے؟

جواب:(۵)

لاعلمی میں مال حرام سے کھانے والے مہمان پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اور اس پر اس کا ضمان بھی لازم نہ ہوگا، البتہ ندامت ضرور ہونی چاہیے، اور توبہ واستغفار کرلے۔

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ ہے؟

جواب:(۶)

حیلہ کے جواز وعدم جواز کے سلسلے میں اصولی بات کہ حرام سے بچنے کے لیے یا حلال تک پہنچنے کے لیے تو شریعت مطہرہ میں بہت سی شکلیں اور صورتیں ملتی ہیں، جیسے جلدی میں ٹرین پر سوار ہوگیا اور ٹکٹ نہ لے سکا، تو اس سے سبکدوشی کا

طریقہ یہ ہے کہ اتنے سفر کا ٹکٹ لے کر پھاڑ دے، اب ریلوے کا مطالبہ ذمہ میں باقی نہیں رہے گا، یہ حرام سے بچنے کا ایک حیلہ ہے، اس لیے جائز؛ بلکہ مستحسن؛ بلکہ واجب ہے (اگر کوئی اور راستہ نہ ہو)۔

اسی طرح معاملات میں خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے سود سے بچنے کی تدبیر بتائی ہے، مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی نے دو ادنی صاع کھجور کے عوض ایک عمدہ صاع کھجور خرید لی تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سود قرار دے کر مسترد فرمادیا، اور یہ تدبیر بتلائی کہ دو صاع کھجور درہم کے عوض فروخت کرے اور جو درہم مشتری کے ذمہ لازم ہو اس کے بدلے ایک صاع عمدہ کھجور خرید لے، دونوں عقود کا خلاصہ ایک ہے؛ لیکن اس تدبیر سے ناجائز معاملہ جائز شکل میں تبدیل ہوگیا۔

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ سود اور حرام سے بچنے کے لیے حیلہ کا سہارا لینا جائز ہوگا؛ لیکن عین مال حرام کو حلال وطیب بنانے کا حیلہ کہیں نہیں ملتا، اور بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شریعت جس چیز سے روک رہی ہو دوسرے راستے سے اسی کو درست کرنے کی ہمت افزائی بھی کرے، (حیلہ وتدبیر بتائے) اس لیے حرام مال کو حلال بنانے کے لیے حیلہ کا سہارا لینا ممنوع وناجائز ہوگا۔

اور یہ حیلہ جو کتابوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ بائع کے پاس مشتری سے مال حرام آ گیا، جس کا پہنچانا اب مشکل ہے یا وہ واپسی پر راضی نہیں، تو ایسی صورت میں بائع اس مال حرام کو ادھار یا قرض میں غیر مسلم کو دے کر حیلہ کرے تو صحیح ہے، یہ بھی مجبوری میں اختیار کیا جانے والا ہی حیلہ ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک آدمی جان بوجھ کر حرام کماتا رہے اور مذکورہ حیلہ کر کے مال کو فلٹر کرتا رہے، یہ درست نہیں؛ کیونکہ اس طرح کرنے سے درحقیقت شرعی حرام کو حلال کرنا لازم آتا ہے، پھر اس سے تو امر حرمت بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔

چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ امداد الفتاوی (۴/ ۱۴۴) میں لکھتے ہیں: کہ حرام کو حلال کرنے کے لیے کوئی حیلہ مفید نہیں۔

اسی پر حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں: ''مذکورہ حیلے سے بھی حرام رقم حلال نہیں ہوگی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہوجائے گا؛ لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے کا، اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا'' (فتاویٰ عثمانی ۳/ ۱۲۵)۔

''فالحاصل أن مایتخلص به الرجل من الحرام أو یتوصل به إلی الحلال من الحیل فهو حسن'' (المبسوط للسرخسی بحوالہ فتاوی زکریا: ۵/ ۲۵۵)۔

حرام مال کو بطور قرض لے کر تجارت کرنے کے بعد اصل قرض کو صدقہ دینے کا حکم:

جواب:(۷)

اصول تو یہی ہے کہ حرام مال ذاتی استعمال میں لانا بالکل جائز نہیں؛ البتہ شدید انتہائی مجبوری میں اس نیت سے قرض لیتا ہے کہ گنجائش ہوجانے پر بعد میں اتنی ہی رقم صدقہ کردے گا، ایسا کرنا درست ہے؛ لیکن اس کا پورا حساب رکھنا اور ضرورت رفع ہوجانے پر صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہوگا۔

جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ فقہ البیوع (۱۲۰۱۲/۲) میں لکھتے ہیں:

"ماوجب التصدق به لكاسب الحرام، واحتاج إليه لنفقته ونفقة عياله، يجوز صرفه إلى نفسه، فإن كان فقيرا، لايجب عليه التصدق بمثله، و إن كان غنيا، ولم يكن المال الحلال كافيا لسد حاجته، يسوغ للمفتي بعد النظر في أحواله أن يفتيه بجواز الاقتراض مما عنده من المال الحرام، بشرط أن يلزم نفسه تسديد هذا القرض إلى الفقراء من المال الحلال كلما تيسر له ذلك، فيجب عليه أن يتصدق بمثله".

حلال وحرام کام کی ملازمت کرنے والے کا حکم:

جواب:(۸)

ایسے کاروبار میں پڑنا جائز نہیں ہے، اس سے اجتناب لازم ہے۔

"و أما الوظائف المركبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة، فلا يجوز قبولها لاشتمالها على عمل محرم" (فقہ البیوع ۲/۱۰۲۲)۔

حرام کمائی کرنے والے کے یہاں ملازمت کرنا، اور ان کے بچوں سے مدرسہ واسکول کی فیس وصول کرنا:

جواب:(۹)

اشیاء میں اصل اباحت ہے، اور الیقین لا یزول بالشک، مذکورہ دونوں اصولوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر کل آمدنی کا حرام ہونا متیقن ہو تو اس کے یہاں ملازمت واجرت وغیرہ ناجائز ہوگی، اسی طرح اگر معلوم ہو کہ مال حرام سے فیس دے رہا ہے تو اسکی خباثت منتقل ہوگی اور ناجائز ہوگا، اور اگر مخلوط ہے تو اجرت لینا جائز ہے جب تک کہ حلال کا مغلوب ہونا یقینی طور پر معلوم نہ ہو، جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امداد الفتاوی (۴/۱۴۷) میں ایک فتوے میں یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔

اسی سلسلے میں ایک واضح فتوی فتاوی دارالعلوم دیوبند (۱۵/ ۳۱۷) میں ملتا ہے، سوال وجواب درج ذیل ہیں:

''**سوال**: سودخور یا راشی یا غاصب کے یہاں ملازمت کر کے تنخواہ لینا، یا ان سے خرید وفروخت کرنا، یا اراضی کاشت پر دینا اور غلہ وغیرہ لینا حلال ہے یا نہیں۔

جواب: ان لوگوں کے یہاں ملازمت کرنا درست ہے، البتہ احتیاط اگر ممکن ہو تو انسب ہے، علی ھذا اپنی تجارت کا مال ان کے ہاتھ فروخت کرنا، یا ان کی تجارت سے مال خریدنا، نیز اراضی کو بٹائی پر دینا یہ سب امور درست ہیں، نیز ان صورتوں میں تنخواہ وہ اجرت وثمن مبیع ولگان حلال ہے، بشرطیکہ غاصب نے اجرت یا ثمن مبیع وغیرہ میں وہ مال نہ دیا ہو جسے اس نے غصب کیا ہے اور لینے والے کو بھی معلوم ہو۔

'' کافر ومشرک وغیرہ (سودخور، رشوت خور) کی ملازمت درست ہے؛ لیکن اگر کوئی مسلمان سودخور ہو تو اگر ملازم کو یہ معلوم ہے مجھ کو تنخواہ سود سے دیتا ہے تب تو احتراز بہتر ہے؛ ورنہ کچھ حرج ملازمت میں نہیں'' (فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ۱۵/ ۳۳۷)۔

مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے سودی رقم دینا جائز ہوگا:

جواب: (۱۰)

سود کا مصرف الگ اور واضح ہے، اس لیے شخصی طور پر حاصل کی جانے والی رشوت کی رقم میں سود دینے کا عدم جواز متعین ہے، ہاں اگر سودی رقم کسی غریب سے حیلہ کرا کر رشوت میں دے تو درست ہوگا۔

مشتبہ مال سے ہدیہ دینے وال کا ہدیہ قبول کرنا:

جواب: (۱۱)

احتیاط اور تقوی کا تقاضا یہی ہے کہ احتراز کیا جائے؛ اور فی زماننا از روئے فتویٰ مشتبہ مال سے بچنے کو ضروری بھی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، ورنہ لوگ حرج میں مبتلا ہو جائیں گے، اس لیے دفع حرج کے پیش نظر جبکہ یہاں عدمِ علم کا قرینہ بھی موجود ہے، یوں خیال کیا جائے گا کہ حلال سے دے رہا ہوگا، ہدیہ وغیرہ قبول کرنا درست ہوگا۔

حرام کمائی والے کے یہاں دعا کرنا اور ان بچوں کا نام رکھنا:

جواب: (۱۲)

اس میں کوئی حرج نہیں۔

حرام کمائی سے متعلق بعض سوالات کے مدلل ومفصل جوابات

مفتی محمد صالح الزماں قاسمی ازہری☆

جواب نمبر ا

دارالحرب میں سودی معاملہ کرنے کے جواز وعدم جواز میں حضرات طرفینؒ اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے مابین قدیم ومشہور اختلاف چلا آ رہا ہے، لیکن قول مفتی بہ حضرت امام ابو یوسفؒ کا ہے، یعنی سودی معاملہ ہر جگہ اور ہر کسی سے ناجائز وحرام ہے، چنانچہ ''فتاوی عثمانی'' میں شیخ الاسلام حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم دارالحرب میں سودی معاملہ کرنے کے جواز وعدم جواز کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''سود قرآن وسنت کے صریح ارشادات کے مطابق حرام قطعی ہے، اس کا لینا دینا سب ناجائز ہے، مسلمان اور ذمی سے سود کے لین دین کی حرمت پر تو اجماع ہے، البتہ دارالحرب کے کافروں سے سود کا لین دین بعض فقہاء جائز کہتے ہیں، دوسرے فقہاء اسے بھی ناجائز قرار دیتے ہیں اور فتوی اسی پر ہے'' (۳/۲۶۸۔نعیمیہ)، نیز: امداد المفتیین کے اندر حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے بھی اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں بڑی محتاط بات لکھی ہے، لکھتے ہیں: ''دار الحرب میں کفار سے سود لینا بھی جمہور علماء وائمہ کے نزدیک حرام ہے، امام مالک وامام شافعی اور امام احمد بن حنبل اور ائمہ احناف میں سے امام ابو یوسفؒ اسی حرمت کے قائل ہیں، البتہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمدؒ سے دارالحرب میں اس کا جواز منقول ہے، اور طحاویؒ نے ''مشکل الآثار'' میں سفیان ثوری اور ابراہیم نخعیؒ کا یہی مذہب نقل کیا ہے'' (۲/۷۰۴)۔

لہٰذا! وارث کے پاس جو سودی رقم ایسی ہو جس کے بابت اس کا علم نہ ہو کہ یہ مورث کی آزادی سے پہلے کی حاصل کردہ ہے یا آزادی کے بعد کی؟ تو چونکہ اختلاف کی بناء پر مسئلہ میں خفت پیدا ہو جاتی ہے (جیسا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب رح نے جواب میں ''احتیاط'' کا لفظ استعمال کیا ہے)، اس لئے اس مسئلہ میں سودی رقم کے تعلق سے حکم میں سختی نہ برتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر وارث بنظر شرع غریب ومستحق زکات ہو تو اس کے مصرفِ سود ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ذات میں بھی صرف کر سکتا ہے اور اگر وہ مالدار ہو تو اسے مورث سے حاصل شدہ جملہ سودی رقم فقراء پر صدقہ کر دینا چاہئے، تاکہ مفتی بہ

☆ جامعہ اشرف العلوم کیندراپاڑہ اڑیسہ

قول پر عمل بھی ہوجائے اور بوجہ اختلاف درایں مسئلہ شدت بھی باقی نہ رہے، اب چاہے وہ سودی رقم اپنے خالص پیسوں سے صدقہ کرے یا اس مال حرام سے جو نفع ہوا ہے اس سے کرے، بہر دوصورت اگر اتنی مقدار صدقہ کردے تو اس کے لئے اس سودی رقم سے حاصل شدہ نفع بھی حلال ہوجائے گا، چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں: ''.....اور جو زمین اس نے مال مخلوط سے خریدی ہے وہ سب اس کی ملک ہے مگر بدون اداء حق مسلمین یا بدون تصدق کے ملک میں خبث رہے گا'' (امداد الاحکام ۶/ ۵۰-زکریا)، درمختار میں ہے: ''**علیه دیون و مظالم جهل أربابها و أیس من علیه ذالک من معرفتهم فعلیه التصدق بقدرها من ماله و إن استغرق جمیع ماله، هذا مذهب أصحابنا لا نعلم بینهم خلافا، و متی فعل ذالک سقط عنه المطالبة من أصحاب الدیون فی العقبی**'' (الدرالمختار/ ۶/ ۴۴۳-زکریا)۔

اور ردالمحتار میں ہے: ''**وفی الرد: قوله فعلیه التصدق بقدرها من ماله أی الخاص به أو المتحصل من المظالم وهذا إذا کان له مال، وفی الفصول العلامیة: لولم یقدر علی الأداء لفقره أو لنسیانه أو لعدم قدرته قال شداد الناطفی: لایؤخذ به فی الآخرة۔ إذاکان الدین ثمن متاع قرضا، و إن کان غصبا یواخذ به فی الآخرة و إن نسی غصبه، و إن علم الوارث دین مورثه والدین غصب أو غیره فعلیه أن یقضیه من الترکة و إن لم یقض فهوموا خذ به فی الآخرة، و إن لم یجد المدیون ولا وارثه صاحب الدین ولا وارثه فتصدق المدیون أو وارثه عن صاحب الدین برء فی الآخرة**'' (شامی ۶/ ۴۴۳)۔

جواب نمبر: ۲

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں سے اسے حرام پیسے ملے ہیں اگر ان کا پتہ ہو اور یہ غریب اتنے پیسے اداء کرنے پر قادر بھی ہو تو مالکان تک اگر وہ بقید حیات ہوں ورنہ ان کے ورثہ تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر ان میں سے کسی کا پتہ نہ چلے اور تلاش بسیار کے باجود محرومی ہی ہاتھ لگے تو حرام مال کے بقدر فقراء پر تصدق واجب ہوگا اور اسے مال لقطہ قرار دے کر احکام لقطہ اس پر جاری ہوں گے، چنانچہ حضرات فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اگر ملتقط خود فقیر مستحق زکات ہو تو وہ اپنے استعمال میں لاسکتا ہے بنابرایں فقیر کو حرام جائداد سے جو آمدنی حاصل ہورہی ہے، اگر فقیر مال حرام کے تعلق سے مذکورہ بالا طریقہ پر عمل کرلے تو یہ آمدنی اس کے لئے حلال رہے گی، چنانچہ ''المحیط البرهانی'' کی اس عبارت سے استمداد ممکن ہے ''**رجل غصب شعیرا أو تبناو سمن به دابته فإنه یجب علیه قیمة قیمة ماغصب ومازاد فی الدابة یطیب له**'' (۸/ ۱۲۵-دارالکتب العلمیۃ)

''**فینتفع الرافع بها لو فقیرا وإلا تصدق بها علی فقیر ولو علی أصله وفرعه و عروسه**''۔

قوله ''لوفقیرا'' قید به لأن الغنی لایحل له الانتفاع بها إلا بطریق القرض'' (الدرالمختار مع الرد ۶/ ۴۳۸)۔

"إن كان الملتقط محتاجا فله أن يصرف اللقطة إلى نفسه بعد التعريف" (الفتاوی الھندیۃ)۔

جواب نمبر: ۳

اس سوال کے دو جزء ہیں:

پہلے جزء کا جواب: شریعت مطہرہ میں چونکہ ماں اور بیوی کا نان ونفقہ بیٹے اور شوہر پر واجب ہے، اس لئے اگر ان خواتین کے پاس رزق حلال کے ذرائع دستیاب نہ ہوں اور بیٹے اور شوہر کی کمائی حرام ہو اور اس حرام آمدنی کے علاوہ کوئی اور حلال ذریعہء معاش نہ ہو تو اس اضطراری حالت میں ماں و بیوی کو اولا یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کسی غیر مسلم خاتون یا مرد سے گزارے کے بقدر پیسے لے لیں اور ان کے شوہروں کی طرف سے نفقہ کے بابت جو پیسے ملیں اسے قرض کے بابت ادا کردیں، اس طرح کے حیلے سے ماں اور بیوی حرام پیسے کے استعمال سے بچ جائینگی: "إن الشيخ أبا القاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض لجميع حوائجه ومايأخذه من الجائزة يقضي به ديونه" (الفتاوی الھندیۃ ۵/۳۹۶، زکریا)۔

چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ مغنی کے ہاتھ خرید وفروخت سے متعلق ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں "..... اور بیچنے کے وقت اس سے کہا جاوے کہ کسی ہندو سے روپیہ قرض لیکر قیمت میں اداء کردے اور ہندو کا قرض اپنے روپئے سے اداء کردے" (امداد الاحکام ۴/۵۷۳، زکریا)۔

اسی طرح حضرت تھانویؒ "اخذ اجرت از مال حرام ومس کردن دندان سازرا" کے تحت سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "اور اجرت لینا مال حرام سے حرام ہے، البتہ اگر وہ قرض لے کر دے دے اور اس کو یقین ہو جائے تو درست ہے" (امداد الفتاوی ۵/۲۹۶، زکریا)۔

اور اگر اس طرح غیر مسلم سے قرض لینا دشوار ہو تو وہ حیلہ اختیار کیا جائے جسے فتاوی ھندیہ میں حضرت امام ابو یوسفؒ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ایسی خاتون کسی دوکان سے اپنی ضروریات کی چیزیں ادھار خرید لیا کریں، پھر بعد میں بیٹے یا شوہر کی طرف سے جو پیسے ملیں وہ دوکاندار کو دے دیا کریں، یہ بہت آسان طریقہ ہے: "والحيلة في هذه المسائل أن يشتري نسيئة ثم ينقد ثمنه من أي مال شاء، وقال أبو يوسفؒ سألت أباحنيفة عن الحيلة في مثل هذا فأجابني بماذكرنا" (الفتاوی الھندیۃ ۵/۳۹۶، زکریا)۔

اور اگر یہ دوسری صورت ہمیشہ آسان نہ ہو تو پھر بشکل مجبوری بیٹا یا شوہر حرام کمائی سے جو کچھ لا کر دیں تو خواتین ان کے استعمال کی مجاز ہوں گی اور اس کا گناہ شوہر و بیٹے کو ملے گا: "امرأة زوجها في أرض الجور إن أكلت من طعامه

ولم یکن عین ذالک الطعام غصبا فهی فی سعة من أکله، وکذا لو اشتری طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من تناوله والإثم علی الزوج'' (شامی ۷/۳۰۲،زکریا)۔

دوسرے جزء کا جواب: یہ ہے کہ بچے کو حرام کمائی سے اعلیٰ تعلیم دینے کے بعد اگر وہ بچہ حلال طریقہ پر کمائی کرے تو حرام کمائی سے تعلیم دلانے کی وجہ سے بچہ کی حلال کمائی یا حلال ملازمت کی آمدنی پر اس کا اثر نہیں پڑے گا اور وہ آمدنی حلال بھی رہے گی اور والدین کے لئے اس کمائی کو اپنے استعمال میں لانے کی گنجائش بھی ہوگی، ہاں ماں باپ کو حرام کمائی سے تعلیم دلانے کا گناہ ہوگا، اس لئے ان پر توبہ واستغفار ضروری ہے،

جواب نمبر: ۴

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر تحقیق سے معلوم ہوجائے کہ کسی بستی کے تقریباً سارے لوگوں کی غالب آمدنی حرام ہے یا خاص طور پر جس نے مدعو کیا ہے اس کے تعلق سے غلبۂ ظن ہوجائے کہ اس کی غالب آمدنی حرام ہے تو اس کی دعوت قبول کرنے کی گنجائش نہیں ہے، الا یہ کہ داعی خود صراحت کردے کہ یہ دعوت مال حلال سے ہے تو اس وقت داعی کی غالب آمدنی حرام ہونے کے باوجود بھی دعوت قبول کرنے کی گنجائش ہوگی، مزید تفتیش کی ضرورت نہیں: ''**الاصل ان أمور المسلمین محمولة علی السداد والصلاح حتی یظهر غیره**'' جیسے ضابطوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اسی طرح غالب آمدنی کے حلال ہونے کے باجود یہ معلوم ہوجائے کہ داعی نے مال حرام سے دعوت کی ہے تو اس وقت اجابت دعوت کی گنجائش نہیں ہوگی۔

باقی اگر اس طرح کے علاقے میں جہاں اکثریت حرام کمائی میں ملوث ہو آدمی مدعو ہو تو اپنی بساط کے مطابق تحقیق کرلے، اگر غلبۂ ظن حرمت کا ہو تو نہ جائے اور اگر غلبہ حلت کا ہو تو جانے کی گنجائش ہوگی اور اس شکل میں بھی اگر نہ جانے میں کسی طرح کے فتنے کے برپا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو نہ جائے خاص کر مقتداء حضرات: ''**ولایجوز قبول هدیة أمراء الجور لأن الغالب فی مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أکثر ماله حلال بأن کان صاحب تجارة أو زرع فلابأس به**'' (الفتاوی الھندیۃ ۵/۳۹۶،زکریا)۔

جواب نمبر: ۵

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسان ظاہر کا مکلّف ہے، چنانچہ اگر داعی کے تعلق سے یہ معلوم نہ ہو کہ وہ حرام آمدنی سے دعوت کررہا ہے اور بظاہر وہ دیندار یا حرام سے اجتناب کرنے والا ہو تو اس کی دعوت قبول کرنے میں شرعاً مضائقہ نہیں،

چنانچہ متعدد فقہی نظائر اس کے مؤید ہیں: ''**قال الفقیه أبو اللیث: اختلف الناس فی أخذ جائزة السلطان قال: بعضهم: یجوز مالم یعلم أنه یعطیه من حرام، قال محمدؒ: به نأخذ مالم نعرف شیئا حراما لعینه وهو قول أبی حنیفةؒ وأصحابه کذا فی الظهیریة**'' (الفتاوی الھندیۃ ۵/۳۹۶)۔

''**وینبغی أن تری الأشیاء حلالا فی أیدی الناس فی ظاهر الحکم مالم یتبین لک شیء مما وصفنا**'' (الھامش علی الاشباہ والنظائر ۱/۳۱۰)۔

اس لئے اگر بعد میں یہ پتہ چلے کہ داعی نے مال حرام سے دعوت کی تھی تو اس اکل حرام کا گناہ داعی کو ملے گا، باقی ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ توبہ واستغفار کرے اور آئندہ اس طرح مبہم ومتہم دعوت قبول کرنے سے احتیاط برتے یا صراحۃ حلت وحرمت کے تعلق سے دوٹوک لفظوں میں پوچھ لے۔

جواب نمبر:٦

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی انسان نے بطریق حرام کچھ مال کمایا ہو اس کی دو شکلیں ہیں: (۱) یا تو وہ مال دیگر مال حلال سے علیحدہ موجود ہوگا، (۲) یا دوسرے اموال کے ساتھ خلط ہوگیا ہوگا؟ اگر پہلی صورت ہے تو اسے حلال کرنے یا اس سے انتفاع کی کوئی شکل نہیں ہے، بلکہ اگر مالکان یا ان کے ورثہ کا علم ہوجائے تو ان تک پہنچانا ضروری ہے اور بعد بسیار تلاش بصورت عدم معرفت اس کا تصدق علی الفقراء لازم ہے، ہاں! اتنی گنجائش ہوسکتی ہے کہ اگر ایسا شخص بنظر شارع غنی و صاحب حیثیت نہ ہو تو بصورت عدم معرفت ارباب اموال یا ورثہ بر بناء حکم لقطہ خود بھی استعمال کرسکتا ہے: ''**والحاصل فإن علم عین الحرام لایحل له ویتصدق به بنیة صاحبه**'' (شامی ۷/۳۰۱)۔

''**و إن دفع عین المغصوب من غیر خلط لم یجز**'' (الفتاوی الھندیۃ ۵/۲۹۶)۔

''**ومفاده الحرمة و إن لم یعلم أربابه وینبغی تقییده بما إذا کان عین الحرام لیوافق مانقلناه إذ لو خلط بحیث لایتمیز یملکه ملکا خبیثا لکن لایحل له التصرف فیه مالم یؤد بدله کما حققناه قبیل زکاة الأموال**'' (شامی ۷/۳۰۲)۔

''**إن کان الملتقط محتاجا فله أن یصرف اللقطة إلی نفسه بعد التعریف**'' (الفتاوی الھندیۃ کتاب اللقطۃ)۔

اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کی بھی دو قسمیں ہیں: (۱) بصورت خلط الحرام بالحلال، حرام کی تمیز ممکن ہوگی، (۲) یا ممکن نہیں ہوگی، اگر خلط متمیز ہو تو جتنا مال حرام ہے اس کے ساتھ مذکورہ بالا طریقہ اپنایا جائے گا، اور اگر خلط غیر متمیز ہو تو فقہی عبارات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ خلط چونکہ استہلاک ہے اور استہلاک موجب ملک ہے، اس لئے مال حرام کے بقدر

اموال اگر مالکان یا ان کے ورثہ تک پہنچادیئے جائیں یا بصورت دیگر تصدق علی الفقراء کی راہ اپنالی جائے تو پورا مال حلال ہوجائے گا اور انتفاع بھی جائز ہوگا: ''**و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولايعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه**'' (شامی)، ''**إذ لو خلط بحيث لايتميز يملكه ملكا خبيثا لكن لايحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله كما حققناه قبيل زكاة الأموال**'' (شامی ۷/ ۳۰۲)۔

جواب نمبر: ۷

جس شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہو تو اس کی دو صورتیں: (۱) یا تو وہ مال حرام الگ تھلگ ہوگا، (۲) یا دوسرے اموال کے ساتھ گڈ مڈ ہوگا۔

اگر دوسری شکل ہے اور خلط غیر متمیز ہے تو جیسا کہ ماقبل میں تفصیل سے یہ بات آچکی ہے کہ خلط غیر متمیز سے ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، کیونکہ اس کا تعلق نفس مال سے نہیں؛ بلکہ ذمہ کا سب سے ہوجاتا ہے، اس لئے اس دوسری شکل میں ایسا مجبور شخص جسے تجارت کے لئے کسی اور ادارے یا کسی انسان سے غیر سودی قرض نہ ملے تو اس حرام مال کو بطور قرض تجارت میں لگانے کا مجاز ہوگا، دراں شکل بہتر یہ ہے کہ محض اتنے پیسے بعد میں اداء کرنے کے ارادہ پر اکتفاء نہ کرے؛ بلکہ عملا کچھ اداء بھی کرنا شروع کردے، چنانچہ ارباب اموال یا ان کے ورثہ کے علم ہونے کی شکل میں ان تک پہنچانا، اور بشکل عدم معرفت غرباء پر صدقہ کرنا شروع کردے، ان شاء اللہ اس مجبوری میں مال حرام کو تجارت کے لئے صرف کرنے میں عند اللہ ماخوذ نہیں ہوگا ''..... **لقول إنه لما خلطها ملكها و صار مثلها دينا فی ذمته لا عينها**'' (شامی ۳/ ۲۱۸، زکریا)۔

''**لأن التصرف به قبل أداء بدله لايحل و إن ملكه بالخلط كما علمته**'' (المصدر السابق/ ۲۱۹)۔

''**قال: أحب إلى أن لا يأكل منه ويسعه حكما أن يأكله إن كان ذالک الطعام لم يكن فی يد المطعم غصبا أو رشوة، أی إن لم يكن عين الغصب أو الرشوة لأنه لم يملكه فهو نفس الحرام فلا يحل له ولا لغيره**'' (المصدر السابق)۔

اور اگر پہلی صورت ہے؛ یعنی مال حرام الگ سے موجود ہے یا خلط متمیز ہے تو ان دونوں شکلوں بصورت علم مالکان یا ان کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے، اسے استعمال کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور بوقت عدم علم چونکہ اسے لقطہ قرار دے کر لقطہ کے احکام جاری ہوتے ہیں، اس لئے اگر یہ مستحق زکاۃ ہو تو اس مال حرام متعین یا خلط متمیز کو اپنے اوپر خرچ کرسکتا ہے، لیکن یہ تصرف مالکانہ طور پر ہوگا قرض کے طور پر نہیں۔ کما مر تفصیلہ۔

اور اگر دراں شکل وہ فقیر نہ ہو، صاحب استطاعت ہو اور حالت اس کی اس طرح ناگفتہ بہ ہوجائے کہ اگر اس مال حرام کو

صدقہ کرتا ہے تو لابدی طور پر اسے سودی قرض لینا پڑے گا، تو یہ شخص بعینہ اس مال حرام میں تصرف نہ کرے، بلکہ بوجہ مجبوری اس مال حرام کو اپنے پاس موجود یا کسی سے قرض لیکر مال حلال سے خلط غیر متمیز کردے اور مال حرام کے بقدر فقراء پر صدقہ کرنا شروع کردے تو اس کے لئے اپنے پاس موجود مال حرام کو استعمال میں لانے کی گنجائش ہوگی، کیونکہ خلط غیر متمیز بمنزلہ استہلاک ہے اور استہلاک موجب ملک ہے گو کہ اس میں خبث باقی ہو، لیکن اتنی مقدار میں صدقہ کرنا شروع کردینے سے رفتہ رفتہ اس خبث کا بھی ازالہ ہوجائے گا: ''**لأن التصرف به قبل أداء بدله لايحل و إن ملكه بالخلط كما علمته**'' (المصدر السابق/۲۱۹)۔

''**وفی الرد: قوله لأن الخلط استهلاک أی بمنزلته من حيث أن حق الغير يتعلق بالذمة لا بالعين**'' (۳/۲۱۷)۔

''**والحاصل فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه**'' (شامی ۷/۳۰۱)۔

''**و إن دفع عين المغصوب من غير خلط لم يجز**'' (الفتاوی الھندیۃ ۵/۳۹۶)۔

جواب نمبر:۸

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اولا یہ دیکھا جائے گا کہ مالک مسلم ہے یا غیر مسلم، اگر غیر مسلم ہو اور کارکن کو جائز کاموں کے ساتھ بسا اوقات ناجائز کام کرنا بھی پڑتا ہو تو اصل ضابطہ شرعیہ کے مطابق تو تنخواہ میں سے جو اجرت ناجائز کام کے مقابلے میں ملے گی وہ ناجائز ہوگی، لیکن چونکہ مالک غیر مسلم ہے، اس لئے ایک دوسرے ''**ضابطه إباحة مال غير المسلم والذمی برضاه فی غير دار الاسلام**'' کی بناء پر اس ناجائز کام کی بھی اجرت لینے کی گنجائش ہوگی، چنانچہ حضرت تھانویؒ کے اس جواب کو مسئلہ بالا کی نظیر بنایا جاسکتا ہے، لکھتے ہیں ''الجواب: نقل کرنا سود کے مضمون کا سائل کے دینے کو اعانت ہے سود کی، یہ تو ناجائز ہے ''**إلا لمن لم يكن مخاطبا بحرمته**''، لیکن تنخواہ اس کی ایک قاعدہ فقہیہ کی بناء پر حلال ہے: ''**وهی إباحة مال غير المسلم والذمی برضاه فی غير دار الاسلام**'' (امداد الفتاوی ۳/۳۹۸)۔

اور اگر ناجائز کام بہت کم مقدار میں کبھی کبھار کرنا پڑتا ہو تو اب چونکہ عموما اکثر جگہوں میں سارا کام حلال مل جائے، حرام کی بالکل بھی آمیزش نہ ہو تقریبا مشکل سا ہوگیا، اس لئے شرعا اسے معفو عنہ قرار دیتے ہوئے اس کی تنخواہ کو حلال قرار دیا جائے، چنانچہ درج ذیل فقہی عبارت سے استمداد ممکن ہے: ''**العاشرة: قال فی القنية: من الكراهة غلب علی ظنه أن أكثر بياعات أهل السوق لاتخلو عن الفساد فإن كان الغالب هو الحرام تنزه علی شرائه ولكن مع هذا لو اشتراه يطيب له**'' (الاشباہ والنظائر ۱/۳۰۹)۔

ایک مقام پر حضرت تھانویؒ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں ''شرع میں اعتبار غالب کا ہے: ''**لأن فی**

التحرز عن القليل كثير حرج" پس اگر غالب حلال ہے تو مصارف خیر میں صرف کرنا جائز ورنہ حرام" (امدادالفتاوی ۳/۱۷۹)۔

لیکن اگر ناجائز کام زیادہ کرنے پڑتے ہوں یا حلال وحرام دونوں کام برابر سرابر کرنے پڑتے ہوں تو اس شکل میں اجیر پر ضروری ہے کہ وہ حرام کے مقابلے جو اجرت ملی ہے اسے صدقہ کرے، کیونکہ حرام کام کی اجرت حرام ہی ہوتی ہے، نیز اجیر کو چاہئے کہ وہ کوئی حیلہ وتدبیر کرکے اس طرح کے حرام کام خود انجام دینے کے بجائے کسی غیر مسلم سے کرادے۔

اور جہاں تک تنخواہ کا تعلق تو اگر مالک کے غالب ذرائع آمدنی حلال ہوں تو اس سے تنخواہ لینا بلا تردد درست ہے اور اگر حرام کا غلبہ ہو یا حلال وحرام دونوں مساوی ہوں تو ملازم مالک کو مجبور کرے وہ حلال آمدنی سے تنخواہ دے یا کسی غیر مسلم سے قرض لے کر دے جس قرض کو اس حرام پیسے ادا کردے۔

جواب نمبر:۹

اس سوال کے جواب سے قبل یہ بات قابل توضیح ہے کہ حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد حلال ہے یا حرام؟ اگر حرام ہے تو اس پر مشتری کی ملکیت ثابت ہوگی یا نہیں؟ ان سب باتوں کا جواب مندرجہ ذیل تفصیلی کلام سے واضح ہوجائے گا ان شاءاللہ العزیز۔

علامہ شامیؒ نے فتاوی تاتارخانیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مال حرام سے کوئی چیز خریدے تو اس کی بظاہر پانچ شکلیں ہیں جن میں سے کتاب میں مذکور پہلی دو شکلوں کے علاوہ باقی تین شکلوں میں مال حرام سے خرید کردہ شئی پر مشتری کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، اور عموماً خرید وفروخت انہی تین شکلوں کے ذریعے ہوتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ جتنی رقم حرام ذرائع سے حاصل ہوئی ہے جب تک اسے مرحلہ وار مالک یا اس کے وارث کو نہ لوٹادے یا بصورت دیگر صدقہ نہ کردے تب تک ثبوت ملکیت کے باوجود اس میں تصرف کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، جیسا کہ ماقبل میں یہ بات کافی بسط وتفصیل سے متعدد بار آچکی **فلا نعيده الآن**۔

بنابرایں اگر کوئی حرام مال سے جائداد خریدے اور کوئی بندہ اس میں حلال کام کرے تو کام کے حلال ہونے کی بناء پر عامل کے لئے اس جائداد میں کام کرنے کی گنجائش ہوگی، اور اس کام کی اجرت لینا بھی حلال ہوگا۔" **مطلب: إذا اكتسب مالا حراما ثم اشتراه على خمسة أوجه**"، **توضيح المسئلة مافي التاتارخانية حيث قال: ..... قال أبو نصر :يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا في الوجه الأول و إليه ذهب الفقيه أبو الليث، لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص في الجامع الصغير: إذا غصب ألفا فاشترى بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح**"۔

"**وقال الكرخي:في الوجه الأول والثاني لايطيب وفي الثلاثة الأخيرة يطيب،وقال أبوبكر: لايطيب في الكل،لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس لكثرة الحرام**" (ردالمحتار ۷/۴۹۰)۔

اگر کسی شخص کی کمائی حرام ہو، لیکن اس کے گھر جائز وحلال کام کی نوکری ملے تو وہ نوکری کرنا جائز ہے، اور اس ملازمت کی اجرت وتنخواہ کے بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اس کی حلال وحرام ہر طرح کی آمدنی مخلوط ہو اور ملازم کو یہ اندازہ نہ ہو کہ غالب آمدنی حلال ہے یا حرام تو اسے اجرت لینے کی اجازت ہے، ایسے ہی اگر یہ معلوم ہو جائے کہ غالب آمدنی حلال ہے تو بھی لینے گنجائش ہے، لیکن اگر غالب آمدنی کے حرام ہونے کی خبر ملے یا جس پیسے سے اجرت دے رہا ہے بعینہ اس کا حرام ہونا ظاہر ہو تو ان دو صورتوں میں اس پیسے سے تنخواہ لینا حلال نہیں ہوگا، الا یہ کہ مالک یہ کہہ دے کہ یہ اجرت حلال آمدنی سے ہے تو اس وقت لینے کی گنجائش ہوگی، باقی جن شکلوں میں تنخواہ اس مال سے لینے کی گنجائش نہیں ہے، ان میں عامل مالک کو زور دے کہ وہ یا تو حلال آمدنی سے تنخواہ دے یا کسی سے قرض لیکر دے، جیسا کہ حضرت تھانویؒ کے درج ذیل جواب سے یہی بات مترشح ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

''جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے جیسے کسبی مے فروش یا سود وغرہم کے پاس نوکری کرنا ناجائز ہے، اور جو تنخواہ ملتی ہے وہ حلال نہیں ہے ہاں! جن لوگوں کی آمدنی مشتبہ اور مختلط الحلال والحرام ہو مثلاً یہی لوگ کسبی و مے فروش کوئی دوسرا پیشہ مباح مثل تجارت حلال یا کچھ اور بھی کرتے ہیں تو اس وقت نوکری اور اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت جائز ہے'' (امداد الفتاوی ۳/ ۳۷۴)۔

لہٰذا! اگر کوئی حرام کمائی کرنے والا شخص اپنے بچے کا داخلہ مدرسہ یا اسکول میں کرائے تو فیس کے نام پر ادارہ جو پیسے وصول کرے ان پیسوں کے بارے میں وہی تفصیل ہے جو ابھی سوال نمبر ۹ - تحت گزری۔

اور جہاں تک بات ہے حرام کمائی کرنے والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، سفر کرنا، ان کی سواری پر بیٹھ کر گھومنا پھرنا کا کہ وہ کیسا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دفع مضرات یا فتن مدنظر نہ ہوں تو ان کے ساتھ یہ رواداری برتنا دراصل گناہ وظلم لے کاموں میں تعاون ومدد کرنا ہے جو از روئے قرآن منع ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے ''**ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**'' (تم ظلم وگناہ کے کاموں میں کسی مدد نہ کرو)، اس لئے زجراً حرام کمائی کرنے والے سے قطع تعلق کر دینا چاہئے جب تک کہ وہ توبہ واستغفار کر کے اس کمائی سے باز نہ آئے، اس کے باوجود بھی اگر کوئی ایسے شخص سے تعلق رکھے تو اسے حرام تو نہیں کہا جائے گا، لیکن تعاون علی الاثم کی بناء پر مکروہ وناپسندیدہ ضرور ہوگا۔

جواب نمبر: ۱۰

بوقت ضرورت شدیدہ حضرات فقہاء کرام نے رشوت دینے کی گنجائش دی ہے اور مدرسہ یا مکان کی عمارتوں کی نقشہ منظوری بھی ایک بڑی ضرورت بن چکی ہے، اس لئے حفاظت حق کے پیش نظر سرکاری عملہ یا کارپوریشن کو رشوت دینے کی گنجائش ہے، جیسا کہ متعدد اردو عربی کتب فقہ میں اس کی صراحت ہے۔

جواب نمبر:۱۱

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ اگر کوئی علاقہ ایسا ہو جہاں کی اکثریت سودی یا دوسرے حرام کاروبار میں مبتلاء ہو، اگر وہاں سے کوئی چیز خریدنی یا کسی کے ہاتھ کچھ فروخت کرنا ہو یا وہاں کا کوئی بندہ دعوت طعام دے یا ہدیہ وتحفہ پیش کرے تو احتیاط اسی میں ہے کہ پوچھ تاچھ کرلی جائے، کیونکہ اکثریت کے حرام پیشہ ہونے کی وجہ سے بظاہر یہ خیال آنے لگتا ہے کہ مذکورہ بالا یہ ساری چیزیں بھی حرام آمدنی سے ہوں، اس لئے استفسار تو بہرحال اولی وبہتر ہے، جیسا کہ فتاوی قاضیخاں میں مذکور ہے: ''**رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزم السوال أنه حلال أم حرام؟ قالوا: ينظر: إن كان في بلد وزمان كان الغالب هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأله أنه حلال أم حرام ،ويبنى الحكم على الظاهر، و إن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط و يسأل أنه حلال أم حرام**'' (۱۶۹/۲)۔

لیکن محض علاقہ کے اکثر لوگوں کے حرام پیشہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس سے خرید وفروخت، ہبہ وہدیہ یا دعوت وغیرہ کا معاملہ ہورہا ہے وہ بھی حرام پیشہ ہو۔

جواب نمبر:۱۲

جی ہاں! یہ بات تو صحیح ہے کہ حرام کمائی کرنے والے یا حرام کھانے والے کی دعاء قبول نہیں ہوتی؛ جیسا مسلم وترمذی ودیگر کتب حدیث کے اندر یہ حدیث موجود ہے، لیکن اس میں خود کا سب حرام وآکل حرام کی دعاء کے رد کی بات ہے، لیکن دوسروں کی دعاء اس کے حق میں موثر ومقبول نہ ہو اس کا ذکر حدیث میں نہیں ہے اور کیوں کر ہو جبکہ سوال کا سب حرام مسلم کے تعلق سے ہے جو کافر سے ایمان کی بدولت لاکھ درجہ بہتر ہے اور کافر کے حق میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام سے دعاء کرنا ثابت ہے تو فاسق مسلمان کے لئے کیوں ممنوع ہو، نیز: ابتداء اسلام میں آپ ﷺ نے ابوجہل اور حضرت عمرؓ میں سے کسی ایک کے ایمان لانے کی دعاء کی تھی جبکہ وہ دونوں اس وقت کفر پر تھے۔

بہرحال جب زندگی میں کافر کے لئے دعاء مانگنے کی گنجائش ہے تو فاسق مسلم کے لئے تو بدرجہ اولی اس کے معصیت سے بچنے کی دعاء مانگنے کی گنجائش ہوگی۔

فقط واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

☆☆☆

اسلامی شریعت میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مولانا محمد آزاد بیگ قاسمی بہرائچی ☆

خلاصہ مقالہ

اللہ تعالیٰ نے اکل حلال وطیبات کا حکم دیا ہے اور حرام و باطل طریقہ پر مال کمانے وکھانے سے سختی سے اجتناب کا حکم دیا ہے تاکہ عبادت ودعائیں بے اثر نہ ہوں اور آدمی جہنم سے بچ کر جنت میں پہونچے۔

۱-اگر وارث کو متعین طور پر معلوم نہیں کہ آزادی سے قبل کی رقم ہے جس زمانہ میں از روئے فتوی ہندوستان کے دار الحرب ہونے کی بنا پر غیر مسلم سے سود لینے کی گنجائش تھی یا بعد کے زمانہ کا مال ہے جبکہ ممانعت کا فتوی جاری ہو چکا تھا تو اس مال کا استعمال اور کمائی جائز ودرست رہے گی۔

۲-فقیر ومحتاج شخص حرام جائداد سے حاصل شدہ آمدنی وکرایہ سے استفادہ کرسکتا ہے، کیونکہ وہ خود اپنے فقر و غربت کی وجہ سے ایسے اموال کا مصرف ہے۔

۳-الف: جس عورت کا شوہر یا جس ماں کا بیٹا حرام مال سے نفقہ فراہم کرتا ہے اور یہ عورت (بیوی) اور ماں اس قدر مجبور ہو کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو، فاقہ تک نوبت پہونچ رہی ہو تو جب تک کوئی متبادل نہ ہو کراہت خاطر کے ساتھ اس کا استعمال کرنے کی گنجائش رہے گی، توبہ واستغفار کا معمول بنائے رکھے۔

ب-حرام مال سے حاصل کی ہوئی تعلیم کے نتیجے میں حاصل شدہ ملازمت سے ملنے والی آمدنی حلال رہے گی اگرچہ حرام مال کے تعلیم کے حصول میں استعمال کا گناہ ہوگا۔

۴-اگر معلوم نہیں ہے کہ یہ حرام ہے تو دعوت کھانا مباح ہے۔

۵-حرام مال سے دعوت کھانے کے بعد اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ اتنی رقم صدقہ کردے

۶-حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی یہ تدبیر ہوسکتی ہے کہ حرام کے بقدر مال غریب مستحق صدقہ کو صدقہ

☆ خادم التدریس والافتاء معراج العلوم چیتا کیمپ، ممبئی

کر دیا جائے پھر وہ اپنی طرف سے ہبہ کر دے یا اس سے کہا جائے کہ اتنی رقم قرض لے کر مجھے دیدو اور پھر مال حرام سے اس کا قرض ادا کر دیا جائے۔

۷-اگر مال حرام کی ایک مقدار متعین کر کے کاروبار کرے اور تھوڑی تھوڑی رقم کر کے فقراء پر صدقہ کرتا رہے جب کاروبار کے پونجی کے بقدر فقراء پر صدقہ ہو جائے گا تو پھر پارا کا پورا نفع حلال رہے گا۔

۸-جب آدھا کاروبار حرام وحلال پر مشتمل ہو تو اس میں لگنے سے بچیں اور اس تنخواہ سے احتیاط کریں البتہ اگر ناگزیر صورت پیش آجائے اور کوئی چارہ نہ ہو تو فی الفور ایسی ملازمت ترک نہ کریں بلکہ جائز کسب معاش کی تلاش جاری رکھیں میسر آنے پر اسے ترک کر دیں اور مکمل حلال کو اپنالیں۔

۹-(الف) حرام سے خرید کردہ زمین میں زراعت وکاشتکاری کر کے محنت سے جو غلہ پیدا ہوگا وہ حلال رہے گا۔

ب-حرام کمائی والے کی تمام یا غالب آمدنی حرام ہو اور معلوم ہو تو اس کے گھر نوکری کرنا یا فیس وصول کرنا جائز نہیں ہے اور اگر اکثر حصہ حلال ہے یا معلوم نہیں ہے تو جائز ہے۔

ج-آج کے حالات میں بقول حضرت امام کرخی کے جو کہ مفتی بہ بھی ہے حرام کمائی والے کی گاڑی خریدنے کی جو صورت ہے وہ حد جواز میں داخل ہے، لہٰذا اس کی فور ویلر یا بائک وغیرہ پر بیٹھنا یا خود اس کو چلا کر لے جانا اور سفر کرنا جائز رہے گا، باقی اگر کو احتیاط کرے تو بہتر ہے۔

۱۰-اگر سود کی رقم حکومت کے بینک سے ملی ہوئی ہے تو حکومت کے متعلقہ اداروں تک رشوت کے عنوان سے پہونچائی جاسکتی ہے، ورنہ پھر تصدق علی الفقراء واجب ہے۔

۱۱-ظن غالب میں اگر یہ واقع ہو کہ ہدیہ دینے والے شخص کا مال حلال ہے تو اس پر عمل کرے اور اس کو استعمال کرے ورنہ اس سے اجتناب کرے اس سے زیادہ وہ تحقیقات کا مکلّف نہیں ہے۔

۱۲-جس کی کمائی حرام ہے اس کے لئے کسی بھی موقع پر دوسرا شخص دعا کر سکتا ہے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں دوسرے کی دعا اس کے حق میں قبول ہوگی۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم أما بعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حلال مال کھانے کی تاکید فرمائی ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"**یا أیها الذین آمنوا کلوا من طیبات ما رزقنکم واشکروا الله إن کنتم إیاه تعبدون**" (سورہ بقرہ: ۱۷۲)، اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اس کے بندے ہو۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اکل طیبات کا حکم فرمایا ہے اور اپنا انعام ظاہر کرکے ادائے شکر کا امر کیا ہے (مستفاد فوائد عثمانی ۱/۱۲۰)، جس طریقہ سے حلال کھانے کی تاکید وارد ہے اسی طریقہ سے حرام مال کھانے سے اجتناب کا حکم وارد ہے، ارشاد ربانی ہے: "**یا أیها الذین آمنوا لاتاکلوا أموالکم بینکم بالباطل**" (سورۃ النساء: ۲۹)، اے ایمان والو نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق، "**قوله بالباطل یعنی الحرام بالربا والقمار والغصب والسرقة والخیانة ونحوها و قیل هو العقود الفاسد**" (تفسیر البغوی ۱/۲۹۲)۔ یعنی کسی کو کسی کا مال ناحق کھالینا مثلاً سود جواء غصب چوری اور خیانت کے ذریعہ اسی طریقہ سے دیگر عقود فاسدہ کے طریقہ پر ہرگز درست نہیں ہے)۔

اس مختصر تمہید کے بعد ترتیب وار جواب مندرجہ ذیل ہے:

(۱) اگر وارثین کو یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں کہ یہ مال حرام ہے تو ایسی صورت میں شرعاً اس کا استعمال اس کے لئے حلال ہوگا اور اس سے کمائے ہوئے مال کا استعمال جائز ہوگا، جو بھی جائیداد اس سے وجود میں آئے گی وہ سب جائز رہے گی۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "**و إذا مات الرجل و کسبه خبیث (الی قوله)، و إن کان کسبه من خبث لایحل وابنه یعلم ذلک و مات الأب ولا یعلم الابن ذلک بعینه فهو حلال فی الشرع و الورع أن یتصدق به بنیة خصما أبیه کذا فی الینابیع**" (الفتاوی الہندیہ ۵/۳۴۹، الباب الخامس عشر فی الکسب کتاب الکراہیۃ رشیدیہ)۔

ان عبارات سے معلوم ہوا کہ اگر وارثین کو متعین ومتیقن طریقہ پر حرام مال معلوم نہ ہو تو وارث کے لئے اس کا لینا درست ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ اس پورے مال کا صدقہ کردے اور احتیاط برتے، علامہ شامی آگے مزید واضح طور پر فرماتے

ہیں:"و إن كان مالا مختلطا مجتما من الحرام ولايعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التزه عنه " (شامی ۷/ ۳۰۱، باب البیع الفاسد زکریا)۔

خلاصہ یہ کہ اگر وارث کو متعین طور پر معلوم نہیں کہ آزادی سے قبل کی رقم ہے جس زمانہ میں از روئے فتوی ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تھا اور غیر مسلم سے سود لینے کی گنجائش تھی یا بعد کے زمانہ کا مال ہے جبکہ ممانعت کا فتوی جاری ہو چکا تھا تو اس مال کا استعمال اور کمائی جائز و درست رہے گی۔

(۲) مال خبیث و حرام کا مصرف غرباء و فقراء ہیں؛ جیسا کہ حضرات فقہاء کرام کی تصریحات موجود ہیں، بذل المجہور میں ہے:" صرح الفقهاء من اكتسب مالا بغير حق بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه ..... ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء، ..... و أما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد و حصل له بغير عقد ولايمكنه أن يرده إلى مالكه و يريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيله إلا أن يدفعه إلى الفقراء" (بذل المجہود شرح ابوداؤد ۱/ ۳۱، کتاب الطہارۃ باب مرض الوضوء)۔

شامی میں ہے:"لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (شامی ۹/ ۵۵۳، فصل فی البیع الحظر والاباحۃ زکریا، نیز دیکھئے: تبیین الحقائق ۶/ ۲۱، امدادیہ ملتان، البحر الرائق ۸/ ۲۰۱، کوئٹہ، الموسوعۃ الفقہیہ ۳/ ۲۴۶)، اس کی نظیر یہ ہے کہ قاضی کو بیت المال سے وظیفہ لینا درست ہے؛ لیکن اگر بیت المال میں حلال مال نہ ہو، بلکہ حرام مال ہی ہو تو وہ ارباب اموال پر قابل رد ہے؛ البتہ اگر قاضی محتاج ہو تو لے سکتا ہے،"هذا إذا كان بيت المال جمع من حل فإن جمع من حرام باطل لم يحل لأنه مال الغير يجب رده على أربابه ثم إذا كان القاضي محتاجا فله أن يأخذه ليتوصل إلى إقامة حقوق المسلمين" (البحر الرائق ۸/ ۲۰۸، کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع، کذا فی تبیین الحقائق ۶/ ۲۳، امدادیہ ملتان)۔

اس عبارت سے واضح ہوا کہ فقیر کے لئے خود استعمال کرنے کی گنجائش ہے، تصدق واجب نہیں ہے، ان روایات و نظائر سے ثابت ہوا کہ غریب شخص حرام جائداد سے حاصل شدہ آمدنی و کرایہ سے استفادہ کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے غربت و فقر کی بنا پر ایسے اموال کا مصرف ہے۔

(۳) (الف): عورت جس کا نفقہ شوہر کے ذمہ ہے، اسی طریقے سے ماں جس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے اور خود ان کے پاس کوئی دیگر ذریعہ معاش نہیں ہے تو اضطراری حالت میں ان کے لئے اس رقم کے استعمال کرنے اور گزر اوقات کرنے کی گنجائش ہوگی اور حرام آمدنی کے استعمال کا وبال اور گناہ شوہر اور بیٹے کے ذمہ ہوگا، جب کہ شامی نے خانیہ کے حوالہ سے

نقل کیا ہے:

"وفی الخانیة امرأه زوجها فی أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذالک الطعام غصبا فهو فی سعة من أكله و كذالک اشتری طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهی فی سعة من تناوله و الإثم علی الزوج" (شامی ۷/ ۳۰۲، باب البیع الفاسد، کذا فی الخانیۃ علی الفتاوی الہندیۃ ۳/ ۴۰۲، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

شامی کے اس جزئیہ سے جو تاتارخانیہ سے منقول ہے، صاف واضح ہے کہ مال خبیث سے شوہر اگر ماکولات و ملبوسات کا انتظام کرتا ہے تو اس کو استعمال کرنے کی اجازت ہے اور عورت پر اس کے استعمال کا گناہ نہ ہوگا؛ بلکہ اس کا گناہ شوہر پر ہوگا، اس طریقہ سے وہ ماں جس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے اور وہ مال خبیث سے نفقہ کا انتظام کرتا ہے تو ماں کو استعمال کرنے کی گنجائش رہے گی، گناہ بیٹے کے اوپر ہوگا۔

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے ماں کے لئے بیٹے کی حرام کمائی کے استعمال کے بارے میں فرمایا، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اسے کسی حلال ذریعہ سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ ہے اور جب تک انتظام نہ ہو توبہ اور استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر اور کوشش جاری رکھے (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۲۶، بحوالہ شامی ۹/ ۲۷۹، کتاب الغصب) حضرت مولانا یوسفؒ لدھیانوی فرماتے ہیں کہ ایسے مجبور مبتلی بہ کو یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ ہر مہینے کسی غیر مسلم سے قرض لے کر گھر کا خرچ چلائے اور حرام رقم کو قرض میں دے دیا کریں، بشرطیکہ ایسا کرنا ممکن ہو اور یہ مستفاد ہے حضرات فقہاء کرام کے جزئیات سے:

"وفی شرح حبل الحصاف لشمس الأئمة الحلوانی رحمه الله تعالیٰ أن الشيخ الإمام أبا القاسم الحكيم كان يأخذ جائزة السلطان و كان يستقرض بجميع حوائجه و ما يأخذ منه الجائزة كان يقضی به دينه" (خلاف الشامی ۴/ ۳۴۹، الفصل الرابع من الاصدار والمیراث وغیر ذلک)۔

ان تصریحات و نظائر سے واضح ہے کہ ایسی عورت کے لئے جس کا شوہر یا جس کا بیٹا حرام آمدنی سے نان نفقہ کا انتظام کرتا ہے اور وہ مجبور ہو، اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو حلال مال کمانے کے لئے شوہر یا بیٹے کو تلقین کرے جب تک کوئی متبادل نہ ہو کراہت خاطر کے ساتھ اس کی استعمال کرنے کی گنجائش رہے گی، توبہ و استغفار کا معمول بنائے رکھے۔

(ب): رہا مسئلہ اس لڑکے کی کمائی کا جس کو حرام مال سے پڑھایا لکھایا اعلیٰ ڈگری دلوائی اور اب وہ محنت کر رہا ہے، ملازمت کر رہا ہے، تو اس کی کمائی کو حرام نہیں کہا جائے گا، اگرچہ حرام آمدنی کے استعمال کا گناہ ہوگا، مگر پڑھ لکھ کر جب ملازمت کیا تو یہ آمدنی حرام نہ ہوئی، کیونکہ یہ کمائی اس کے محنت و مزدوری کا عوض و بدل ہے۔

فتاوی شامی میں ہے:

"**الأجرة إنما تكون بمقابلة العمل**" (شامی ۴/ ۳۰۷، باب المہر کتاب النکاح، زکریا)۔

"**والإجارة هي تمليك نفع بعوض وحكمها وقوع الملك في البدلين ساعة فساعة**" (الدر المختار ۹/ ۴-۷، کتاب الاجارۃ، زکریا)۔

خلاصہ یہ ہے کہ حرام کمائی سے پڑھنے کے بعد اگر وہ جائز ملازمت کر رہا ہے تو وہ کمائی اس کے لئے حلال ہے اور اس کی بیوی یا والدین کے لئے اس کا استعمال کرنا جائز و درست ہوگا۔

(۴) دعوت کرنے والے شخص کے مال کے بارے میں اگر یہ معلوم نہیں ہے کہ وہ حرام مال سے دعوت کر رہا ہے تو دعوت کھانا درست ہے، ممانعت اس صورت میں ہے جب یہ معلوم ہو کہ یہ دعوت حرام مال سے کر رہا ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**وفي فتاوى أهل سمرقند: رجل دخل على السلطان فقدم عليه بشئ ماكول فإن اشتراه بالثمن أو لم يشتر ذلك و لكن هذا الرجل لايفهم أنه مغصوب بعينه حل له أكله هكذا ذكر والصحيح أنه ينظر إلى مال السلطان و يبنى الحكم عليه، هكذا في الذخيرة**" (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۴۲، الباب الثانی عشر فی الہدایہ والضیافات المکراہیۃ)۔

مجمع الأنهر، فتاوی ہندیہ اور خلاصۃ الفتاوی کی فقہی روایات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اگر متیقن طریقہ پر معلوم نہیں ہے کہ یہ حرام مال سے دعوت کر رہا ہے تو ایسی دعوت میں شریک ہونا مباح ہے۔

(۵) اگر مال حرام سے دعوت کھانے کے بعد پتہ چلا کہ جو دعوت کھائی ہے وہ مال حرام تھا، اب اس کے تلافی کی شکل یہ ہے کہ جس قدر حرام مال کھایا ہے صحیح اندازہ کر کے اتنی مقدار رقم غرباء و فقراء پر صدقہ کرے، صدقہ کر دینے کے بعد اس کے وبال سے انشاء اللہ وہ بچ نکلے گا۔

الدر المختار میں ہے:

"**عليه ديون و مظالم جهل أربابها و أيس من عليه ذلك من معرفتهم فعليه التصدق بقدرها من ماله، و إن استغرقت جميع مال، هذا مذهب أصحابنا لانعلم بينهم خلافاً**" (الدر المختار ۶/ ۴۴۳، کتاب اللقطۃ، زکریا، حاشیۃ الطحاوی ۲/ ۵۵۴، کتاب اللقطۃ)۔

درمختار کی مذکورہ عبارت سے ثابت ہوا کہ مال خبیث کے بقدر صدقہ کر دینے سے آدمی وبال سے محفوظ ہو جائے گا اور اس سے بریٔ الذمہ ہو جائے گا۔

حضرات فقہاء کرام نے علت بیان فرمائی ہے کہ کسب خبیث یا مال خبیث کا رد الی رب الاموال متعذر ہوجائے تو اب اس کے وبال سے بچنے کا واحد راستہ تصدق علی الفقراء ہے: ''لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ'' جب آدمی نے لاعلمی میں حرام مال سے دعوت کھالیا اب ظاہر ہے کہ بعینہ اس کا رد متعذر ہے، لہٰذا اب اس کے بقدر صدقہ کردینے سے رفع وبال ہوسکتا ہے، اور اس کا تدارک ممکن ہے (شامی ۹/ ۵۵۳، فصل فی البیع کتاب الحظر والاباح زکریا کذا فی معارف السنن ۱/ ۳۴۹)۔

خلاصہ یہ کہ حرام مال سے دعوت کھانے کے بعد اس کی تلافی کی یہی صورت ہے کہ اتنی رقم صدقہ کردے۔

(۶) تبدل ملک سے تبدل عین ہوجاتا ہے، ایک چیز ابھی اس کا استعمال درست نہیں ہے، لیکن جب ملکیت بدل گئی تو وہ حلال ہوگی، جب کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے گوشت پیش کیا گیا جو ان کو صدقہ کا گوشت ملا تھا، اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**هو عليها صدقة و لنا هدية**''، یہ ان کے لئے صدقہ ہے، ان کی ملکیت میں آجانے کے بعد اب ہمارے لئے ہدیہ ہے، تبدل ملک سے صدقہ ہدیہ ہوگیا۔

لہٰذا یہ چیز صدقہ سے نکل گئی اور اس پر ہبہ کا حکم لگادیا گیا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وہ چیز حلال ہوئی، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیہ تناول فرماتے تھے صدقہ نہیں (عمدۃ القاری شرح البخاری ۹/ ۹۲، کتاب الزکاۃ، باب إذا تحولت الصدقۃ)۔

آگے علامہ عینی فرماتے ہیں:

''**وحاصله أنها إذا قبضها التصدق زال عنها وصف الصدقة وحكمها فيجوز الغير شراها للفقير و للهاشمي أكله منها**'' (حوالہ سابق)۔

یعنی جب اس شخص نے جس کو صدقہ کیا گیا اس پر قبضہ کرلیا تو اب صدقہ کا وصف اور اس کا حکم ختم ہوگیا اور وہ غنی و ہاشمی کے لئے حلال ہوگئی۔

اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں فقراء جن کو زکاۃ صدقات کا مستحق ومصرف بتلایا گیا ہے، مال خبیث کا بھی مصرف انہی کو قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ بذل المجہود میں ہے: ''**وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه يعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه و يريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء**'' (بذل المجہود لشرح ابوداؤد ۱/ ۷۳، کتاب الطہارۃ باب الوضو، مکتبہ سہارنپور قدیم)۔

اگر ان کو حرام مال کا مالک بنادیا جائے اور باختیار مالک بنادیا جائے، پھر وہ اپنی مرضی سے اس کو ہبہ کردیں تو ان کے ہبہ کردینے کے بعد موہوب لہ کے لئے وہ چیز حلال ہوجائے گی، کیونکہ یہاں پر بھی تبدل ملک سے تبدل عین ہوگیا، جیسا

کہ حضرات فقہاء کرام نے میت کے تکفین کے حیلہ کی طرف رہنمائی کی ہے، درمختار میں ہے:"**وحیلة التکفین بها التصدق علی الفقیر ثم هو یکفن فیکون النواب لهما و کذا فی تعمیر المسجد و تمامه فی حیل الاشسباه**" (الدرالمختار مع الرد ۳/۱۹۱، کتاب الزکاۃ زکریا)۔

حضرات فقہاء کرام کے اس حیلہ میں بھی تبدل ملک سے تبدل عین ہو رہا ہے، زکوۃ کی رقم جو کہ میت کے کفن میں نہیں لگ سکتی تو فقیر کی ملکیت میں جانے کے بعد اس کی حیثیت بدل گئی، اب وہ اس کی طرف سے کفن کے استعمال کے لئے جواز کے دائرہ میں آ گیا، ان تمام نظائر کی روشنی میں یہ بات منقح ہوجاتی ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام مال ہو تو اس کو حلال کے دائرہ میں لانے کی تدبیر یا حیلہ یہ ہوسکتا ہے کہ حرام رقم کو کسی مستحق و مصرف شخص پر صدقہ کر دیا جائے وہ اس پر مالکانہ طور پر قبضہ کرے، پھر وہ اپنی طرف سے ہبہ کر دے تو ملکیت کے بدل جانے سے یہ رقم موہوب لہ کے لئے حلال ہوجائے گی، پھر اس کے لئے اس کا استعمال کر کے تصرف میں لانا درست رہے گا۔

(۷) ہاں اگر حرام مال کو اپنے طور پر طے کر لے کہ اتنی رقم سے میں کاروبار کروں گا اور پھر آہستہ آہستہ حرام مال کے بقدر صدقہ کرتا رہوں گا اور پھر وہ محنت سے تجارت کرے اور کمائے اور صدقہ کرتا رہے جس وقت حرام مال کے بقدر رقم صدقہ ہوجائے گی تو حرام کے وبال سے بھی بچے گا اور اس کی کمائی حلال ہوجائے گی، کیونکہ حرام کے بقدر رقم مستحق صدقہ تک پہنچ گئی جو اس کا مصرف ہے"**فلیس له حیله إلا أن یدفعه إلی الفقراء**" (بذل ۱/۷۳، کتاب الطہارۃ باب فرض الوضو سہارنپور)،"**لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه**" (شامی ۹/۵۵۳، فصل فی البیع زکریا)۔

اور بقیہ مبتلی بہ شخص نے اپنی محنت سے کمائی کیا تو اپنی محنت و عمل سے کمائی ہوئی رقم اس کے لئے حلال رہے گی، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند حضرت مفتی نظام الدین قدس سرہ فرماتے ہیں:''اس حرام روپیہ سے جو کھیت خریدا ہے اگر اس کو اجارہ یا لگان پر دے گا تو اس کا نفع بھی صدقہ کرنا ہوگا، ہاں اگر اس کھیت میں خود کاشت کرے اور اپنی محنت سے جو غلہ کی پیداوار ہوگی وہ حلال ہوگی، اس کا کھانا درست رہے گا، پس اس سابق حاصل کردہ روپئے سے ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ یا جتنا ہوسکے اراضی خرید کر اس میں اپنا فارم بنا کر کھیتی کرے اور پیداوار حاصل کرے اور اس کو اپنا ذریعہ معاش بنالے اور تھوڑا تھوڑا حسب موقع بغیر نیت ثواب محض وبال سے بچنے کے لئے صدقہ بھی کرتا رہے تو ان شاء اللہ ذریعہ بھی پاک رہے گا اور تطہیر بھی ہوجائے گی، جبکہ اس طرح کمائے ہوئے روپئے کی مقدار صدقہ ہوجائے گا''۔

ان تمام فقہاء کرام کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوئی اگر مال حرام کی ایک مقدار متعین کر کے کاروبار کرے اور تھوڑی تھوڑی رقم کر کے فقراء پر صدقہ کرتا رہے جب کاروبار کے پونجی کے بقدر فقراء پر صدقہ ہوجائے گا تو پھر پورا کاروبار

اور نفع حلال رہے گا۔

(۸) اگر ملازمت کے دوران کسی امر حرام یا کسی معصیت کا ارتکاب کرنا پڑے تو ایسی ملازمت اختیار کرنا اور اس میں تعاون کرنا اور اس کو کمائی کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے: ''**لاتصح الإجارة لأجل المعاصی مثل الغناء والنوح والملاهی**'' (الدر المختار ۹/ ۷۵، باب الإجارة الفاسدة کتاب الاجارة زکریا)۔

بدائع میں ہے: ''**وعلی هذا یخرج الاستئجار علی المعاصی أنه لایصح**'' (بدائع للصنائع ۴/ ۳۹، باب الاستئجار علی المعاصی زکریا)۔

مبسوط سرخی میں ہے:

''**ولاتجوز الإجارة علی شئ من الغناء والنوح والمزامیر والطبل و شئ من اللهو لأنه معصیة والاستئجار علی المعصیة باطل**'' (المبوسط للسرخی باب الإجارة الفاسدة کتاب الاجارة ۱۶/ ۳۸، بیروت)۔

ان تمام فقہی روایات سے ثابت ہوا کہ ایسی ملازمت جس میں حرام کا ارتکاب کرنا پڑے تو وہ ناجائز ہے، اگر مکمل طور سے نہ سہی بلکہ آدھا کاروبار حرام سے متعلق ہو تو بھی یہی حکم ہوگا، کیونکہ ایسی صورت میں جب کہ حرام وحلال برابر ہو حرام کو ترجیح دیتے ہوئے حرام وناجائز کا حکم فقہاء کرام بیان کرتے ہیں، اگر حلال کا غلبہ ہو تو حلت کا حکم بیان کرتے ہیں: ''**آکل الربا و کاسب الحرام أهدی إلیه أو أضافه و غالب ماله حرام لایقبل ولا یأکل مالم یخبره أن ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه**'' (الفتاوی الہندیہ قدیم ۵/ ۳۴۳، الباب الثانی عشر فی الہدی والضیافات کتاب الکراہیۃ، زکریا)۔

لہٰذا جس شخص کی تجارت آدھے حرام وآدھے حلال پر مشتمل ہو اور ملازم کو حرام کاروبار کے لئے تگ ودو کرنی پڑتی ہے اور اس سے تنخواہ بھی دی جاتی ہے تو چونکہ اس میں حرام کی آمدنی حلال کے برابر ہے، لہٰذا اس میں ملازم بن کر کام کرنا اور اس سے تنخواہ وصول کرنا درست نہ ہوگا، فقہی ضابطہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

قاعدہ: ''**إذا اجتمع الحلال والحرام والمحرم والمبیح غلب الحرام و المحرم**'' (قواعد الفقہ ۱/ ۵۵، اشرفی دیوبند)۔

البتہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں: ''آپ کی اصل آمدنی تو جائز تھی، لیکن آپ کو اپنی جائز ملازمت میں کچھ ایسا کرنا پڑتا ہے جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے، جائز کام کے مقابلہ میں اگر دوسرا کام کم ہے تو اپنی ملازمت ترک نہ کریں، اگر جائز کام کم ہو اور دوسرا کام زائد ہو تب بھی فوراً ملازمت ترک نہ کریں، مبادا کہ پریشانی کا سامنا ہو جو قابل برداشت نہ ہو، البتہ دوسری جائز کسب معاش تلاش کرتے رہیں، جب میسر آجائے تب اس موجودہ ملازمت کو ترک کردیں، استغفار بہرحال کرتے رہیں، نیز اللہ پاک سے حلال کسب معاش کی دعا میں لگے رہیں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ دعاء قبول

فرمائیں گے (فتاوی محمودیہ جدید ۱۷/ ۱۱۹، ۱۲۰)۔

(۹) جزئیہ ۹ کے اندر سوالات کے جوابات قدرے فرق کے ساتھ علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں:

الف: حرام کمائی سے خرید کردہ زمین میں کھیتی باڑی کر کے غلہ پیدا کرنا اور اس میں طرح طرح کی سبزیاں ترکاریاں پیدا کرنا، الغرض اس میں ہر طرح کی پیداوار کا استعمال درست ہے؛ کیونکہ براہ راست زمین کی آمدنی نہیں ہے؛ بلکہ اس میں اس کے محنت وعمل کے نتیجہ میں یہ پیداوار حاصل ہورہی ہے:

"**الكسب هو الفعل المفضي إلى اجتلاب نفع أو دفع ضرر**" (قواعد الفقہ ۴۴۲، التعریفات للجرجانی، الموسوعۃ الفقہیۃ ۴/ ۲۳۴)۔

زراعت بھی کمائی کے مباح طریقوں میں سے ایک جائز ومباح طریقہ ہے، لہٰذا حرام مال سے خرید کردہ جائداد میں کھیتی کرنا، دوکان میں لاکر سامان تجارت رکھ کر تجارت کرنا یا اس میں صنعت کاری انجام دینا اس سے جو منافع آئیں گے وہ حلال رہیں گے، اگرچہ زمین یا دوکان حرام آمدنی سے خرید کردہ ہو۔

ب: حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں ملازمت کرنا، اسی طریقہ سے حرام کمائی کرنے والے شخص کے بچہ کو مدرسہ یا اسکول میں داخلہ دے کر اس سے فیس وصول کرنا یا ایسے شخص کے یہاں ٹیوشن پڑھا کر اجرت لینا اس کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اگر بعینہ معلوم ہو کہ جو اجرت یا فیس ملتی ہے خالص حرام مال سے ملت یہ ہے تو جائز نہیں ہے۔

مصنف عبدالرزاق میں ہے: "**عن ابن مسعود رضی الله عنه قال جاز رجل فقال إن لی جارا یأکل الربوا و أنه لایزال یدعونی فقال مهناه لک و إثمه علیه، قال سفیان إن عرفته بعینه فلا تصبه**" (المصنف لعبدالرزاق ۸/ ۱۵۰، رقم ۱۴۶۷۵، باب طعام الامراء وأکل الکربا)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: "**آکل الربا و کاسب الحرام أهدی إلیه أو أضافه و غالب ماله حرام لایقبل ولا یأکل**" (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۴۳، الباب الثانی عشر کتاب الکراہیۃ الہدایا والضیافات)۔

البتہ اگر اس کی آمدنی مشتبہ اور مختلط الحلال والحرام ہے اور غالب حلال ہے تو اس کے یہاں نوکری کرنا یا فیس وصول کرنا جائز ہے، جیسے کہ مذکورہ بالا روایات فقہیہ میں غالب حلال کی صورت میں درست کہا گیا ہے، ہاں اگر بعینہ معلوم نہیں ہے کہ حرام سے دے رہا ہے یا حلال سے تو جائز ہے (مستفاد امداد الفتاوی جدید مطول ۷/ ۳۸۲، زکریا وفتاوی قاسمیہ ۲۱/ ۷۱۲)۔

(ج) حرام کمائی سے کسی چیز کے خریدنے کی حضرات فقہاء کرام نے پانچ صورتیں نقل فرمائی ہیں: فتاوی شامی میں ہے: "**قوله اکتسب حراماً الخ توضیح المسئله ما فی التاتارخانیه حیث قال رجل اکتسب مالا من**

حرام ثم اشترى فهذا على خمسه أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها و دفعها أو اشترى قبل الدفع لها و دفع غيرها أو اشترى مطلقا و دفع تلك الدراهم أو اشترى بدراهم اٰخر و دفع تلك الدراهم و قال الكرخي الوجه الأول والثاني لايطيب و في الثلاث الأخيرة يطيب و قال أبو بكر لايطيب في الكل لكن الفتاوى على قول الكرخي دفعاً للحرج عن الناس" (شامی ۷/ ۳۷۹، کتاب البیوع مطلب إذا اکتسب حراما ثم اشتری علی خمسۃ وجہ زکریا، البحر الرائق ۸/ ۱۱۴، کوئٹہ ۸/ ۲۰۷، کتاب الغصب رشیدیہ (کذا فی التبیین ۶/ ۳۲۲، کتاب الغصب بیروت، کذا فی مجمع الانہر ۴/ ۸۳، کتاب الغصب کوئٹہ)۔

مذکورہ صورتوں میں سے حضرت امام کرخیؒ کے قول کے مطابق پہلی اور دوسری صورت میں حلال نہیں ہے اور تیسری چوتھی اور پانچویں صورت میں جائز ہے، مال حرام دینے سے پہلے خریدا اور مال حرام کے علاوہ رقم دیا یا مطلقا خرید وفروخت کا معاملہ کیا، پھر حرام مال دیدیا یا دوسرے روپیہ سے معاملہ طے کیا، پھر خرید وفروخت طے ہونے کے بعد وہی حرام مال دیدیا تو ان تین صورتوں میں خریدی ہوئی چیز حلال ہے، اس کا استعمال درست ہے اور آج کل عامۃ ایسا ہی ہوتا ہے کہ معاملہ خرید و فروخت کا پہلے طے ہوجاتا ہے اور قیمت کی ادائیگی بعد میں کی جاتی ہے، لہٰذا امام کرخیؒ کے قول کے مطابق یہ خریدنا درست ہوتا ہے اور آج غلبہ حرام کی وجہ سے لوگوں سے حرج کو دفع کرنے کی غرض سے، فتوی حضرت امام کرخیؒ کے قول پر ہی ہے۔

آج کے حالات میں بقول امام کرخیؒ کے جو کہ مفتی بہ بھی ہے حرام کمائی والے کی گاڑی خریدنے کی جو صورت ہے وہ حد جواز میں داخل ہے، لہٰذا اس کی کار یا بائک وغیرہ پر بیٹھنا یا خود اس کو چلا کر لے جانا اور سفر کرنا جائز رہے گا، باقی اگر کوئی احتیاط کرے تو بہتر ہے، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن قدس سرہ فرماتے ہیں: ''پس احتیاط کا مرتبہ یہی ہے کہ اس سے حتراز ہو، لیکن حسب روایت امام کرخیؒ جواز کی گنجائش نکل آتی ہے'' (فتاوی دار العلوم دیوبند ۱۲/ ۳۹۷)۔

(۱۰) مال حرام کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ جہاں سے آیا ہے کسی بھی عنوان سے وہاں واپس کردیا جائے اور اگر واپسی کا کوئی راستہ نہ ہو تو ایسی مجبوری میں کل کا کل مال بغیر نیت ثواب نادار فقیروں میں تقسیم کردینا واجب ہے۔

بذل المجہود میں ہے:'' **وأما إذا كان عند رجل مال خبيث (الى قوله) ولا يمكنه أن يرده إلى مالكه و يريد أن يدفع مظلمة عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء**'' (بذل المجہود قدیم ۱/ ۳۷، سہارنپور، ۱/ ۳۵۹ دار البائر الاسلامیہ باب فرض الوضوء کتاب الطہارۃ)۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری میں کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ ادارہ کی طرف سے بطور رشوت خطیر رقم لی جاتی ہے اگر سود کی رقم کسی سرکاری بینک سے ملی ہوئی ہے تو حکومتی اداروں تک رشوت

کے طور پر ہی سہی وہ رقم ادا کی جاسکتی ہے، کیونکہ حکومت کی طرف سے رقم ملی اور پھر وہ رقم حکومت ہی کے دوسرے ادارہ کے ذریعہ اس تک پہونچ گئی، لیکن سود کی رقم حکومت کے علاوہ دیگر پرائیوٹ بینکوں سے ملی ہوئی ہے یا حکومت تک نہیں پہنچ رہی ہے، بلکہ افسران کے جیب میں ہوکر رہ جاتی ہے تو اس رقم کو بطور رشوت دینا درست نہ ہوگا، کیونکہ یہ رقم اصل اپنے مقام تک نہیں پہنچ رہی ہے، الغرض اگر سود کی رقم حکومت کے بینک سے ملی ہوئی ہے تو حکومت کے متعلقہ اداروں تک رشوت کے عنوان سے پہنچائی جاسکتی ہے، ورنہ پھر تصدق علی الفقراء واجب ہے۔

(۱۱) حدیث شریف میں ہے:

"عن أبی هريرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم إذا دخل أحدكم علی أخيه المسلم فليأكل من طعامه ولا يسأل و يشرب من شرابه و لايسأل" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوۃ ۲۷۹، باب الولیمۃ کتاب النکاح رقم الحدیث ۳۲۲۸)۔

روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے پاس آئے اور کھانے پینے کے لئے بلائے تو اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے کھائے پیئے اس کے بارے میں زیادہ کھود کرید نہ کرے۔

مسلمان کے ظاہری حال پر اعتبار کرنا چاہئے، کیونکہ ایک مسلمان دوسرے کو حرام نہیں کھلاتا؛ بلکہ حلال ہی کھلاتا ہے، لہٰذا نیک گمان کرتے ہوئے اس کھانے کا حال دریافت نہ کرے، کیونکہ پوچھنے اور کریدنے سے اس کو ایذا پہونچے گی (مستفاد مظاہر حق جدید ۳۸۱/۴)۔

لہٰذا کسی کے ہدیہ دیتے وقت یا بچوں کو کھانے پینے کی چیز پیش کرتے وقت یا اور کوئی روزمرہ کے استعمال کی چیز دیتے وقت اس کی آمدنی کے بارے میں اس انداز میں تحقیق نہ کی جائے کہ جس سے اس کو تکلیف ہو، بلکہ ظن غالب پر عمل کرنے کی حد تک وہ شخص مکلّف ہے۔

لہٰذا ظن غالب میں اگر یہ واقع ہو کہ ہدیہ دینے والے شخص کا مال حلال ہے تو اس پر عمل کرے، ورنہ اس سے اجتناب کرے، اس سے زیادہ وہ تحقیقات کا مکلّف نہیں ہے۔

(۱۲) یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ دعاء کی قبولیت وعدم قبولیت میں حلال وحرام غذاء کا بڑا مؤثر کردار ہے، شراح حدیث فرماتے ہیں کہ دعاء کی قبولیت حلال رزق پر موقوف ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ دعاء کے دو بازوں ہیں جن کے سہارے وہ دعاء قبولیت تک پہونچتی ہے، ایک تو اکل حلال، دوسرا صدق مقال، یعنی حلال کھانا اور سچ بولنا (مظاہر حق جدید ۴۳۱/۳)۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس شخص کے لئے جس کی کمائی حرام ہے جب اس کی دعاء قبول نہیں ہوتی تو دوسرا کوئی اس

کے لئے دعاء بھی نہیں کرسکتا ہے، بلکہ دوسرا بندہ اس کے لئے دعا کرسکتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**دعوة المرء المسلم لأخيه بظهر الغيب مستجابة عند رأسه ملک موکل کلما دعا لأخيه بخير قال الملک المؤکل به اٰمين و لک بمثل**" (صحیح مسلم ۴/۳۵۱، کتاب الذکر والدعاء باب فضل الدعاء للمسلمین بظہر الغیب، مشکوۃ ۱۹۴، کتاب الدعوات الفصل الأول رقم ۲۲۲۸) (جو مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرتا ہے تو وہ قبول کی جاتی ہے، دعا کرنے والے کے سرہانے ایک فرشتہ متعین کردیا جاتا ہے، جب وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھلائی کی دعاء کرتا ہے تو وہ متعین شدہ فرشتہ کہتا ہے: یا اللہ اس کی دعاء قبول فرما اور (یہ بھی کہتا ہے) کہ تیرے لئے بھی ایسا ہی ہو)۔

اس حدیث شریف میں جس طرح اپنے مسلمان بھائی کی عدم موجودگی میں قبولیت دعا کی بشارت دی گئی ہے، اسی طرح اگر اس کے سامنے اپنے دل میں یا چپکے سے دعاء کرے تو وہ دعاء بھی اس بشارت کے تحت آتی ہے، یعنی اس کی دعاء قبول ہوتی ہے، مرقاۃ میں ہے: "**و إن کان حاضراً معه بأن دعائه بقلبه حينئذ أو بلسانه و لم يسمعه مستجابة لخوص دعائه من الريا و السمعة**" (مرقاۃ ۵/۱۰، کتاب الدعوات تحت رقم الحدیث ۲۲۲۸ لمستفاد مظاہر حق جدید ۳/۸۵)، لہٰذا اس شخص کے لئے جس کی کمائی حرام ہو کسی بھی موقع پر دعاء کرائے یا بیماری سے شفاء کے لئے دعا کرائے یا پانی پر دم کرائے تو دعا کی جاسکتی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆

حرام تجارت وملازمت سے متعلق بعض احکام

مفتی صفوان احمد حلیمی قاسمی ☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**يا أيها الرسل كلوا من الطيبت واعملوا صالحا**'' (المؤمنون:۵۱)۔

''**يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم واشكروا لله إن كنتم إياه تعبدون**'' (البقرہ:۱۷۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حلال کمائی عمل پر مقدم ہے اور حلال کھانے سے آدمی کے اندر تقوی پیدا ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلام نے کسبِ حلال کو عبادات میں شمار فرمایا ہے اور اس کے بے شمار فضائل بتلائے ہیں؛ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حلال مال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے'' (المعجم الاوسط للطبرانی:۸۶۱۰)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''حلال مال کا طلب کرنا (اصل) فرائض کے بعد فرض ہے'' (المعجم الکبیر للطبرانی:۹۹۹۳)۔

اِس سے معلوم ہوا کہ مطلق مال کمانا فرض اور واجب عبادت نہیں؛ بلکہ حلال اور جائز طریقے سے مال کمانا عبادت ہے، حرام یا مشتبہ مال کمانا عبادت تو کجا بلکہ سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے؛ لیکن افسوس کہ آج کل لوگ مال کمانے کی حرص میں اِس بات کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں کہ حلال طریقے سے کمارہے ہیں یا حرام طریقے سے، بلکہ عام طور سے ان کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مال اکٹھا کیا جائے۔

حرام اور ناجائز طریقے سے مال جمع کرنے کو قرآن وحدیث میں بہت ساری جگہوں پر منع کیا گیا ہے۔

چناں چہ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ! اِلا یہ کہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے وجود میں آئی ہو (تو وہ جائز ہے)'' (سورۃ النساء:۲۹)۔

☆ امام مسجد خضراء ممبئی

علماء نے ناحق طریقے سے مال کھانے کے ضمن میں بے شمار چیزیں ذکر کی ہیں، جن میں سے ڈکیتی، چوری، رشوت، سود، جوا، غصب، خیانت، ناپ تول میں کمی بیشی، دھوکہ دہی، ذخیرہ اندوزی، مالِ یتیم میں خرد برد اور جھوٹی قسم سے حاصل کیا گیا مال سرفہرست ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے، پاک ہی قبول کرتا ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے کہ اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو! وہی حکم اُس نے پیغمبروں کے علاوہ اپنے مومن بندوں کو دیا ہے کہ اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اُس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ!، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبے سفر میں ہو، بال بکھرے ہوئے ہوں، بدن پر غبار لگا ہوا ہو، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر یا رب یا رب کہتا ہو، اُس کا کھانا حرام ہو، اُس کا پینا حرام ہو، اُس کا پہننا حرام ہو، تو ان سب چیزوں کے باوجود اُس کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟ (صحیح مسلم:۱۰۱۵، جامع ترمذی:۲۹۸۹)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے لیے دُعا کیجیے کہ میں مستجاب الدعوات ہوجاوں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اپنے کھانے کو پاک کرو! اللہ کی قسم! جب کوئی شخص حرام کا لقمہ پیٹ میں ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اللہ تعالیٰ اُس کا عمل قبول نہیں کرتا، جس شخص کا بدن حرام مال سے بڑھا تو اُس کا بدلہ سوائے جہنم کے اور کچھ بھی نہیں ہے'' (المعجم الاوسط للطبرانی:۶۴۹۵)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''جس نے دھوکہ کیا وہ ہم میں سے نہیں ہے اور دھوکہ اور فریب (دونوں دوزخ کی) آگ میں (لے جانے والے) ہیں'' (المعجم الصغیر للطبرانی:۷۳۸)۔

اب اصولی طور پر چند باتیں:

۱- ہندوستان کی موجودہ حالت پچھلے زمانے سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے، ملک میں ہونے والی بدامنی سے سبھی واقف ہیں، ہندوستان کے سلسلے میں کہ وہ کون سا دار ہے؟ دارالاسلام یا اس کے علاوہ؟ اس سلسلے میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر جو تالیفات رشیدیہ میں موجود ہے اس کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۲- وہ مال حرام جو مملوک نہ ہو اس کا حکم

اس ضمن میں غصب، رشوت، سرقہ، قرض کے ذریعے ربا اور تمام بیوع باطلہ آتے ہیں اور ان کی حرمت دوسروں تک متعدی ہوتی ہے، پس ایسے اموال کا نہ تو بطور وراثت لینا جائز ہے، نہ بطور ہبہ، نہ بطور بیع، بلکہ اگر ان کے مالکان کا علم ہو تو ردالی المالک ہے، ورنہ واجب التصدق ہے۔

"ويشمل هذا التعبير كل مال حرام لا يملكه المرأ في الشرع، سواء كان غصباً، أو سرقة، أو رشوة، أو رباً في القرض، أو مأخوذاً ببيع باطل، وإنه حرام للغاصب الانتفاع به أو التصرف فيه فيجب عليه أن يرده إلى مالكه أو إلى وارثه بعد وفاته وإن لم يمكن ذلك لعدم معرفة المالك أو وارثه أو لتعذر الرد عليه لسبب من الأسباب وجب عليه التخلص منه بتصدقه عنه من غير نية سبب الصدقة لنفسه۔

وما ورد في كلام بعض الفقهاء الحنفية أن الحرمة لا تتعدى إلى ذمتين، فهو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك أي إذا لم يعلم الآخذ أن هذا المال حرام غير مملوك للمعطى .وكذلك الصحيح أنه لا يحل للورثة إذا علموا أنه حرام، سواء علموا أربابه، أم لم يعلموا فإن علموا ردوه إلى أربابه، وإن لم يعلموا تصدقوا به" (فقہ البیوع ص۱۰۰۶-۱۰۰۷)۔

"وفي رد المحتار، كتاب الحظر والإباحة، فصل في البيع ٦ :٥٨٣ وليتنبه أن ما ذكره ابن عابدين رحمه الله تعالى في باب البيع الفاسد (مطلب في من ورث مالاً حراماً) من أن الحرمة على الورثة مقيدة بما إذا كان عين المال الحرام، بخلاف ما إذا كان مختلطاً، يوهم أن المخلوط ليس بحرام للورثة، ولكنه صرّح هنا أي في كتاب الحظر والإباحة بما يأتي: "بخلاف ما تركه ميراثاً، فإنّه عين المال الحرام، وإن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام، فإنه لا يحل له التصرف فيه قبل أداء ضمانه، وكذا لوارثه" (٦:٣٨٦)(حاشیۃ فقہ البیوع ص/۱۰۰۷)۔

۳-اگر کسی کے پاس حلال اور حرام دونوں قسم کا مال ہو تو اس کا حکم

اگر کسی شخص کی ملکیت میں حلال وحرام دونوں ہوں اور دونوں الگ الگ ہوں تو دونوں پر اس کے الگ الگ احکام نافذ ہوں گے، لیکن اگر لینے والے کو اس کا تو علم ہو کہ حلال وحرام اس کے پاس ممتاز ہیں، لیکن تفصیل کا علم نہ ہو کہ وہ حرام مال سے دے رہا ہے یا حلال مال سے تو غلبہ کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر معطی کے مال میں حلال ہی غالب ہو، تب تو گنجائش ہوگی اور اگر حرام غالب ہے تو گنجائش نہیں ہوگی، اور یہی محمل ہے اس عبارت کا جو الأشباہ والنظائر اور دوسری کتابوں میں ہے:

"إذا كان غالب مال المهدى حلالاً، فلا بأس بقبول هديته وأكل ماله، مالم يتبين أنه من حرام، وإن كان غالب ماله الحرام، لا يقبلها، ولا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه" (الاشباہ والنظائر، الفن الاول القاعدہ الثانیۃ، اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام ۱/۳۰۹)۔

اور اگر کسی کی ملکیت میں حلال اور حرام دونوں ہوں اور دونوں کو ملا دیا ہو اس طور سے کہ دونوں غیر ممتاز ہوں تو بقدر

حلال انتفاع حلال ہے۔

"وقد رُوی عن الإمام محمد رحمه الله تعالی حِلُّ الانتفاع بقدر الحلال بصراحة .جاء فی التتارخانية عنه: غَصب عشرة دنانير، فألقى فيها ديناراً، ثمّ أعطى منه رجلاً ديناراً، جاز، ثم ديناراً آخر، لا۔ والحلال ههنا أقل، ولكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة" (فقہ البیوع ص/۱۰۲۱، ۱۰۳۴)۔

۴-اگر مال حلال، مال حرام سے مخلوط ہو تو اس کا حکم

خلط چونکہ استہلاک کے درجہ میں ہے، لہٰذا خلط سے ملکیت خبیثہ ثابت ہوگی اور بدل کی ادائیگی یا مالک کو راضی کیے بغیر اس کا نفع خبیث ہوگا اور اس کا نفع فقیر کے لئے بقدر ضرورت اپنے اوپر خرچ کرنا جائز ہے اور صاحب نصاب کے لئے بھی خرچ کرنا جائز ہے، لیکن اس کے اوپر اس کے مثل کا صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

"و ذكر صاحب "الاختيار" فی شرح المختار أنه وإن وجب التصدق بالفضل، ولكن إن احتاج إليه، بأن لم يكن فی ملكه ما يسد به حاجة نفقته ونفقة عياله، فصرفه فی حاجته بنيّة أنّه يتصدق بمثله فيما بعد، جاز له ذلک، قال رحمه الله تعالی بعد بيان مذهب أبی حنيفة ومحمد رحمهما الله تعالی فی وجوب ا التصدق بالفضل:

ولهما أنه حصل بسبب خبيث، وهو التصرف فی ملک الغير، والفرع يحصل علی صفة الأصل، والملک الخبيث سبيله التصدق به، ولو صَرفه فی حاجة نفسه جاز، ثمّ إن كان غنيّاً، تصدق بمثله، وإن كان فقيراً لا يتصدق" (الاختیار شرح المختار، ۳/۶۱ أوائل کتاب الغصب تحت قول الماتن: "تصدقا بالفضل)۔

ولكنه مقيد بما إذا لم يكن عنده مال آخر لدفع حاجته، قال صاحب الهداية:

"إلا إذا كان لا يجد غيره، لأنه محتاج إليه، وله أن يصرفه إلی حاجة نفسه، فلو أصاب مالاً، تصدق بمثله إن كان غنياً وقت الاستعمال .وإن كان فقيراًفلاشیء عليه" (الہدایۃ مع فتح القدیر، کتاب الغصب ۸:۲۵۷، فقہ البیوع ص ۱۰۴۵)۔

۵-اگر نقود مخلوطہ غیر مملوکہ سے خریداری کیا تو اس کا حکم:

ایسی صورت میں بائع کے لئے تو ایسے نقود کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے اور مشتری کے لئے اس کے عوض حاصل کردہ چیز کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، جب تک کی وہ مغصوب منہ کو ضمان نہ دے دے۔

"والظاهر من قول أبی حنیفة رحمه الله تعالی أنه ینفذ البیع بمعنی أنه ینتقل إلی المشتری الغاصب ملک ما اشتراه، ولکن لا یحل له الانتفاع به إلی أن یؤدی الضمان إلی المغصوب منهم .أما البائع الذی باع إلیه، فالظاهر أنه یحل له الانتفاع بالثمن الذی ،قبضه، ولو کان الثمن من النقود لأن فریضة الرد إلی المغصوب منهم انتقل بالخلط إلی الزمان الواجب فی ذمة المشتری الغاصب، فلم یکن ما قبضه البائع عین المغصوب" (فقہ البیوع ص/۱۰۲۷)۔

"ولم یُذکر عن الکرخی حکم البائع الذی أخذ من المشتری النقود المغصوبة، هل یسوغ له استعمال تلک النقود؟ وقد أفتی کثیر من علمائنا أنه یجوز له ذلک أیضًا" (فتاوی دارالعلوم دیوبند للمفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ تعالی، کتاب البیوع، ۱۴: ۹۳ و ۹۶ و ۳، فقہ البیوع ص/۱۰۱۶)۔

۶- اگر خریداری مافی الذمہ کے ذریعہ کی جائے اور ادائیگی ایسے نقود سے کی جائے جو مملوکہ نہ ہوں، اس کا حکم:

تو اس کا نفع اداء بدل تک یا صدقہ کرنے تک جائز نہیں، البتہ بدل کی ادائیگی یا صدقہ کرنے کے بعد اس سے پہلے حاصل کئے گئے نفع کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، جمہور علماء، اداء بدل اور تصدق سے قبل حاصل ہونے والے ربح کو حلال نہیں مانتے ہیں، یہاں تک کہ بدل کی ادائیگی وتصدق سے پہلے اگر بیچ دیا، پھر اس کے بعد بدل کی ادائیگی ہوئی یا صدقہ کیا، تب بھی نفع درست نہیں ہوگا۔

لیکن امام کرخی کے مذہب کے مطابق بدل کی ادائیگی یا تصدق کے بعد اس سے پہلے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا۔

اس زمانے میں کثرت حرام کی وجہ سے امام کرخی ہی کے قول کو اختیار کرنا چاہیے۔

".....وذکر کثیر من المتأخرین أن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعاً للحرج عن الناس، قال ابن عابدین رحمه الله تعالی: وعلی هذا مشی المصنف (یعنی صاحب الدر المختار) فی کتاب الغصب تبعاً للدرر وغیرها" وقد أفتی به جماعةٌ من مشایخنا" (ردالمحتار، کتاب البیع باب المتفرقات ۱۵: ۴۴۱ و ۴۴۲، وفقہ البیوع ص/۱۰۱۵، ۱۰۱۶)۔

۷- لمبی مدت سے جاری رہنے والے حرام کاروبار کا حکم

آ گر کسی شخص کے یہاں ایک لمبے زمانے سے حرام کاروبار کا سلسلہ چلا آ رہا ہو، مثلاً شراب کا کاروبار ہو یا رشوت یا ربا یا اس کے علاوہ دیگر محظورات کے ذریعہ سے حاصل کیا گیا ہو، پھر اللہ کی توفیق سے اسے توبہ کی توفیق ہو جائے، اور اس کے

پاس اس کے علاوہ کوئی مال نہ ہو، تو اس کو فقیر سمجھا جائے گا، اس اعتبار سے وہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے، تو اس صورت میں وہ شخص اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے بقدر اس مال کو خرچ کر سکتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ حرام مال کے ذریعہ بنیت قرض حلال کاروبار کرلے تو اب حلال کاروبار سے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ حلال شمار ہوگی اور اس کے ذمے جتنی رقم حرام کاروبار میں لگی ہے اس کا تصدق واجب ہوگا؛ چاہے قسط وار صدقہ کرے، یہاں تک کہ حرام مال سے سبکدوش ہوجائے (دیکھئے فقہ البیوع ۱۰۴۹/۲)۔

لیکن اگر حرام میں کچھ حصہ ایسا ہو جس کو مالک کے معلوم ہونے کی وجہ سے واپس لوٹانا واجب ہو تو اس مال کو بنیت قرض حلال کاروبار کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس کو لوٹانا واجب ہے (حوالہ کے لئے دیکھئے فقہ البیوع: ۱۰۴۵-۱۰۴۹)۔

ملاحظہ: غنی شخص جتنی رقم حرام مال میں بنیت قرض استعمال کرنا چاہے تو وہ باذن امام یا مفتی کے فتویٰ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

"**وإن كان غنيا يجوز له اقتراضه بإذن الإمام**" (فقہ البیوع ۱۰۴۶/۲)۔

۸-سود مال مملوک میں شمار کیا جائے گا یا غیر مملوک میں

جو سود دار الکفر میں لیا گیا وہ مال حرام مملوک بشراء فاسد کے حکم میں داخل ہے، کیونکہ اس قسم کے سود کی حرمت مجتہد فیہ ہے، خواہ ربا فضل ہو یا ربا نساء ہو، نہ کہ ربا قرض۔

"**إن الفقهاء الحنفية جعلوا العقود الربوية نوعاً من العقود الفاسدة، فقد نقل ابن نجيم عن البزدوى رحمهما الله تعالى، قال:**

"**من جملة صور البيع الفاسد جملة العقود الربوية، يُملك العوضُ فيها بالقبض** (البحر الرائق، باب الربوا ۲۰۹/۶ وردالمحتار ۲۲۱/۱۵، افقرہ ۲۴۳۱۵)۔

وفرعوا على العقود الربوية تفريعات كثيرة على أساس أنه بيع فاسد۔

وكذلك قال ابن تيمية رحمه الله تعالى:

"**و القبض الذى لا يُفيد الملك هو الظلم المحض۔ فأما المقبوض بعقد فاسد كالربوا والميسر، ونحوهما، فهل يُفيد الملك؟ على ثلاثة أقوال للفقهاء۔ أحدها أنه يُفيد الملك، وهو مذهب أبى حنيفة۔ والثانى: لا يُفيده وهو مذهب الشافعى وأحمد فى المعروف من مذهبه والثالث: أنه إن فات أفاد الملك، وإن أمكن ردُّه إلى مالكه، ولم يتغير فى وصف، ولا سعر، لم يفد الملك۔**

وھو المحکی عن مذھب مالک'' (مجموع فتاوی ابن تیمیۃ:۱۸۰۲۹ قبیل باب الشروط فی البیع ،فقہ البیوع ص/۱۰۵۸)۔

ان اصولی وبنیادی باتوں کے بعد سوالنامہ کا جواب مندرجہ ذیل ہے:

پہلے سوال کا جواب:

جس شخص کے آباؤاجداد کسی حرام کاروبار مثلاً رشوت، سود، شراب، چوری، غصب جیسے کاموں میں ملوث رہے ہوں اور وراثت میں اس کو جو مال ملا ہے اس میں مال حرام کا شامل ہونا یقینی ہو، لیکن مقدار قطعیت کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ کتنا مال غصب، رشوت، سود، سرقہ سے حاصل کیا گیا ہے اور آباؤاجداد سے ترکہ میں ملے مال سے حلال کاروبار کیا جائے، گھر جائداد بنایا جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ غور فکر سے یہ اندازہ کرلے کہ آباؤاجداد سے ترکہ میں حاصل شدہ مال میں کتنا مال عین حرام کا شامل تھا، اندازہ لگا کر اور غور وفکر کر کے عین حرام کے بقدر صدقہ کردے، خواہ وہ حرام مال آزادی سے پہلے حاصل کیا گیا ہو یا آزادی کے بعد، اندازہ لگا کر عین حرام کے بقدر صدقہ کردینے سے اب پورا کاروبار اور اس کا نفع خواہ آباؤاجداد نے حاصل کیا ہو یا ورثہ نے سب حلال اور جائز شمار ہوگا، اس لئے کہ جب حرام کا ملنا یقینی طور سے معلوم ہے تو وہ ورثہ کے لئے حلال نہیں ہے، اب جب مقدار معلوم نہ ہو تو اس کی پاکیزگی کا طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ تحری کے ذریعے اندازہ لگا کر اس کے حکم پر عمل کیا جائے (ردالمحتار ۳/ ۲۲۳، مکتبہ زکریا، نیز فقہ البیوع ۲/ ۱۰۳۸)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حرام مال، چاہے مملوک ہو یا غیر مملوک، جب اس کو کاروبار میں لگا دیا جائے اور اس سے نفع ہوتا رہے تو اس کے نفع کے بارے میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف بھی ہے، چنانچہ امام یوسف رح کے نزدیک اس کا نفع واجب التصدق نہیں ہے۔

اسی طرح غیر اسلامی ممالک کا سود مجتہد فیہ ہے، نیز سود مملوک بشراء فاسد کے حکم میں ہے، ان سب وجوہات کی بنا پر نفع کی حرمت ظنی ہوگی جس کا حکم یہ ہے کہ آج کے کثرت حرام کے زمانے میں احتراز کرلے تو بہتر ہے، ورنہ استعمال کی گنجائش ہے۔

امداد الفتاوی اور دیگر فتاوی سے معلوم ہوتا ہے کہ جن سے رشوت لی ہے اگر معلوم ہوں یا کوئی چیز خاص رشوت میں لی ہوئی بعینہ موجود ہو تب تو زید کو انتفاع حلال نہیں، ورنہ فتوی کی رو سے حلال ہے، گو تقوی کے خلاف ہے.

دوسرے سوال کا جواب

اگر غریب آدمی کو معلوم ہے اس کی حاصل شدہ پوری جائیداد عین حرام ہے، یعنی رشوت، غصب وغیرہ کے ذریعہ لی گئی ہے اور اس کا مالک معلوم ہے تو مالک کو لوٹانا ضروری ہے، کرایہ وغیرہ لینا جائز نہیں ہے؛ خواہ غاصب فقیر ہو یا غنی۔

البتہ اگر اس کو مالک کا علم نہیں ہے تو فقیر کے لئے گنجائش ہے کہ وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کے ضرورت کے بقدر استعمال کرلے، اور غنی کے لئے بطور قرض استعمال کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں وہ بحکم لقطہ ہے۔

اور اگر وہ جائیداد عین حرام نہیں؛ بلکہ حرام کاروبار کے نفع سے حاصل شدہ ہے تو ایسی صورت میں جتنا مال اس میں حرام ہے اس کو اندازہ لگا کر صدقہ کرنے کے بعد جائیداد اور اس کی آمدنی حلال ہوگی؛ اس لئے کہ حرام کاروبار کے نتیجہ میں حاصل شدہ جائیداد کی حرمت ظنی ہے جس میں حضرات فقہاء نے سہولت کو ملحوظ رکھا ہے۔

"وعلى هذا يخرج ما إذا غصب ألفاً، فاشترى جارية، فباعها بألفين، ثم اشترى بالألفين جارية، فباعها بثلاثة آلاف أنّه يتصدق بجميع الربح في قولهما .وعند أبي يوسف رحمه الله تعالى: لا يلزمه التصدقُ بشيء، لأنه ربح مضمون مملوك، لأنه عند أداء الزمان يملكه مستندا إلى وقت الغصب ومجرد الزمان يكفي للطيب فكيف إذا اجتمع الضمان والملك" (فقہ البیوع ۱۰۴۳/۲)۔

تیسرے سوال کا جواب

اس قسم کی ماتحت ومجبور خاتون کے لیے، جب کہ کمائی کا دوسرا راستہ بھی نہیں ہے، اپنے کفیل کی حرام کمائی سے ضرورت کے بقدر استفادے کی گنجائش ہے۔

"لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناوله والإثم على الزوج" (ردالمحتار ۳۰۲/۷، فتاوی عثمانی ۱۲۶/۳)۔

حرام کمائی کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے کے ملازمت حاصل کرلی، تو اب اس ملازمت کے ذریعے ملنے والی آمدنی کے اوپر حرام کا حکم نہیں لگے گا، بلکہ یہ حلال ہے، البتہ اس کی تعلیم پر جو حرام مال لگا ہے اگر وہ یقینی طور پر معلوم ہے تو اتنی مقدار، ورنہ اس کے بقدر اندازہ لگا کر صدقہ کرنا ضروری ہے، اور یہ بھی اس وقت جب کہ وہ مستحق نہ ہو اور اگر مستحق ہو تو صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

لیکن اگر حرام کے ذریعے جو کمائی ہوئی، اس کو خرچ کیا گیا ہے اس کی تعلیم پر، تو چونکہ اس قسم کے نفع کی حرمت ظنی ہے، اس لئے صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، تاہم اس شکل میں بھی صدقہ کرنا بہتر ہوگا۔

چوتھے سوال کا جواب

اور اگر کسی کی ملکیت میں حلال اور حرام دونوں ہوں اور دونوں کو ملا دیا ہو اس طور سے کہ دونوں غیر ممتاز ہوں تو بقدر

حلال انتفاع حلال ہے، اوراس قسم کے آدمی کے یہاں دعوت میں شرکت کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ دعوت کی مقدار حلال کے اندر ہے۔

"وقد رُوی عن الإمام محمد رحمه الله تعالی حِلُّ الانتفاع بقدر الحلال بصراحة۔ جاء فی التتارخانية عنه: غَصب عشرة دنانير، فألقی فيها ديناراً، ثمّ أعطی منه رجلاً ديناراً، جاز، ثم ديناراً آخر، لا۔والحلال ههنا أقل، ولكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة" (فقہ البیوع:۱۰۲۱، ۱۰۳۴)۔

تاہم احتیاط بہتر ہے۔

"والأولی فی هذه الصورة التنزه، ولكن يجوز للآخذ أن يأخذ منه بعض ماله هبة أو شراء، لأن الأصل الإباحة .وينبغی أن يُقيَّد ذلک بأن يغلب علی ظن الآخذ أن الحلال فيه بقدر ما يأخذه أو أكثر منه وهو مَحْمِل ما جاء فی العبارات الآتية:

قال الإمام محمد رحمه الله تعالی فی كتاب الآثار: "أخبرنا أبو حنيفة، قال: حدثنا محمد بن قيس أن أبا العوجاء العشار كان صديقاً لمسروق، فكان يدعوه، فيأكل من طعامه ويشرب من شرابه، ولا يسأله" قال محمد وبه نأخذ، ولا بأس بذلک، مالم يعرف خبيثاً بعينه، وهو قول أبی حنيفة رحمه الله تعالی ..... (فقہ البیوع:۱۰۳۸، ۱۰۳۹)۔

پانچویں سوال کا جواب

اگر دعوت کھانے والے کو دعوت کھانے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ داعی کا پورا مال حرام ہے، تو اگر وہ مستحق ہے تو اس کے لئے صدقہ کرنا ضروری نہیں اور اگر وہ غیر مستحق ہیں تو جتنی مقدار کھایا ہے اتنی مقدار صدقہ کرنا ضروری ہے۔

"والملک الخبيث سبيله التصدق به .ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله، و إن كان فقير لا يتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار:۶۱/۳)۔

چھٹے سوال کا جواب:

پہلے سے کمائے ہوئے مال میں سے جتنا مال قطعی طور پر بعینہ حرام ہے، تو اگر اس کا مالک معلوم ہے تو اس کو مالک کو لوٹانا ضروری ہے، ورنہ پورے مال کے بقدر صدقہ کر دینا ضروری ہے، چاہے قسط وار صدقہ کرے، یہاں تک کہ حرام مال سے سبکدوش ہوجائے۔

تاہم اتنی گنجائش ہے کہ اگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورتیں پوری کر سکے تو اس کے لئے بقدر ضرورت استعمال کرنا جائز ہے اور اتنی مقدار صدقہ کرنا بھی ضروری نہیں ہوگا (دیکھئے: فقہ البیوع ۱۰۴۹/)۔

لیکن اگر حرام میں کچھ حصہ ایسا ہو جس کو مالک کے معلوم ہونے کی وجہ سے واپس لوٹانا واجب ہو تو اس مال کو بنیت قرض حلال کاروبار کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو لوٹانا واجب ہے (فقہ البیوع ۱۰۴۵/-۱۰۴۹)۔

ملاحظہ۔ جتنی رقم حرام مال میں بنیت قرض استعمال کی جائے اتنی رقم پر گواہ بنالینا اور تحریری ثبوت رکھ لینا ضروری ہے، تاکہ خود اس کے لئے اور اس کے ورثاء کے لئے اس کے مصرف میں خرچ کرنا یقینی ہو سکے۔

ساتویں سوال کا جواب:

اگر کسی کے پاس حرام کمائی کا مال ہے ہے اور متعین طور پر کس کا مال ہے یہ معلوم نہیں ہے، تو اس کے لئے گنجائش ہوگی کہ وہ تجارت کرنے کے لیے قرض کے طور پر اس مال کو لے لے، اور بعد میں اس قرض کو ادا کر دے۔

"**ولكن الظاهر أنه إن لم يُعرف المالك الأصلي، وانتقلت الفريضة من رد العين إلى التصدق على الفقراء، فيكون حكمه حكم الغلّة والربح، حيث يجوز الانتفاع به للفقير عند الحاجة، ولا يجوز للغني إلا بطريق الاقتراض بإذن الإمام وأداء مثله إلى الفقراء**" (فقہ البیوع ۱۰۴۹/)۔

اور اگر ایسا مال حرام ہو جس کا لوٹانا یا اس کے بدل کا لوٹانا مالک اصلی کو واجب ہو تو اس کی ادائیگی سے پہلے اس مال کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

"**أما المغصوب الذي وجب رده أو رد بدله إلى المالك الأصلي، فلا يجوز له أن يصرفه في حاجة نفسه قبل أداء بدله، ولو كان بنية أداء بدله إلى المالك فيما بعد**" (فقہ البیوع ۱۰۴۹/)۔

آٹھویں سوال کا جواب:

اگر کسی ملازمت میں حلال وحرام دونوں کام کرنے پڑتے ہوں تو ایسی ملازمت کا قبول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں عمل حرام کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر کوئی اس جیسی ملازمت کو اختیار کر لے، تو اگر حلال اور حرام دونوں کاموں کی اجرت متعین ہو تو حلال ملازمت کے مقدار اجرت جائز ہوگی اور زائد اجرت کو صدقہ کرنا ہوگا۔

اوراگراجرت متعین نہ ہوسکتی ہوتواجرت مثل کے برابر لے کر بقیہ صدقہ کردے۔

"..... **والحاصل أن الإجارة فی الخدمة المباحة إنّما تصح إذا كانت أجرتها معلومة بانفرادها .ولا تصح فيما إذا لم تكن أجرتها معلومة .فإن كان كذلک فی خدمات الفنادق والمطاعم والبنوک وشركات التأمين صارت أجرة الموظف فيها مركبة من الحلال والحرام .فدخلت فی الصورة الثالثة من القسم الثالث، وحلّ التعامل معه بقدر الحلال .أما إذا لم تُعرف أجرةُ الخدمة المباحة على حدتها، فالإجارة فاسدة، ولكن الأجير يستحق أجر المثل فی الإجارات الفاسدة، كما صرح به ابن قدامة رحمه الله تعالى بذلک فی إجارات فاسدة أخرى.**

وعلى هذا فان ما يقابل أجر المثل للخدمة المباحة فی راتبه ينبغی أن يكون حلالا، فصار راتبه مخلوطا من الحلال والحرام فی هذه الصورة أيضا فينبغی أن يجوز معه التعامل بقدر الحلال" (فقہ البیوع:۱۰۵۶، ۱۰۵۷)۔

نوٹ: اگر حلال ملازمت میں بہت معمولی کچھ حرام کام کرنا پڑتا ہے تو اس کے اندر گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

"**غير أن بعض المعاصرين أجازوا شراء أسهمها إن كانت نسبة المحظورات فيها قليلة تابعة غير مقصودة، ولا تتجاوز خمسة فی المائة من إيراداته المباحة وبشرط أن يتصدق مالک السهم تلک النسبة من أرباح تلک الأسهم**" (المعیار الشرعی رقم ۲۱، بشأن الأوراق المالیۃ فقہ البیوع ۱۰۵۷)۔

نوے سوال کا جواب:

حرام آمدنی والے کے یہاں حلال ملازمت جائز ہے؛ بشرطیکہ اجرت عین حرام سے دیے جانے کا علم نہ ہو، اسی طرح اجرت کے بارے میں یہ گمان ہو کہ یہ اس حرام آمدنی والے شخص کے مجموعہ حلال کے اندر سے دی جارہی ہے۔

اسی طرح حرام کمائی سے حاصل کی جانے والی بائیک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا بھی درست ہوگا؛ بشرطیکہ کار، یا بائیک عین حرام سے نہ ہو یعنی وہ غصب سرقہ یا رشوت سے حاصل نہ کی گئی ہو۔

دسویں سوال کا جواب

ذاتی عمارت کے نقشے کی منظوری کے سلسلے میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس میں سود کی رقم کا استعمال اسی صورت میں جائز ہے جب کہ دینے والا شخص فقیر ہو۔

مدارس کے لئے اور مال دار شخص کے لیے سود کا اس مد میں دینا جائز نہیں ہوگا۔

"إلا إذا كان لا يجد غيره لأنه محتاج إليه، وله أن يصرفه إلى حاجة نفسه فلو أصاب مالا تصدق بمثله إن كان غنيا وقت الاستعمال و إن كان فقيرا فلا شيء عليه" (الہدایۃ مع فتح القدیر ج۸/۲۵۷)۔

گیارہویں سوال کا جواب:

اگر کسی بستی، شہر یا مارکیٹ میں حرام کمائی کا رواج ہو، لیکن مارکیٹ میں حلال کمائی زیادہ ہو تو جس شخص سے بھی معاملہ کرے، اس کے بارے میں کوئی تحقیق نہ ہو تو ایسی صورت میں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس سے معاملہ کرنا، اس کی دعوت کھانا، چائے پینا اور ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہے۔

لیکن اگر حرام کمائی غالب ہو تو احتیاط کرے اور سوال کرلے کہ یہ حلال میں سے ہے یا حرام میں سے۔

"رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (الفتاوی الہندیۃ کتاب البیوع، الباب العشرون فی البیاعات)۔

لیکن اگر جس سے معاملہ کرنا ہے اس کے بارے میں یقین سے معلوم ہو کہ اس کی آمدنی میں حرام آمدنی شامل ہے تو اس صورت میں ظن غالب پر عمل کرے، اگر اس کے گمان میں یہ ہو کہ یہ ہدیہ یا دعوت وغیرہ مال حلال سے متجاوز نہیں ہے تو جائز ہے۔

تاہم اس صورت میں بھی احتیاط بہتر ہے۔

"إن لم يعرف في المخلوط من الحلال والحرام أنهما متميزان أو مختلطان، وكم حصة الحلال في المخلوط ؟ فالأولى التنزه، ولكن يجوز التعامل بذلك المخلوط إذا غلب على الظن أن المتعامل به لا يتجاوز قدر الحلال" (فقہ البیوع: ۱۰۵۴)۔

بارہویں سوال کا جواب:

روایات میں حرام کھانے والے کی دعا کی عدم قبولیت کا ذکر ہے.:

"يا أيُّها النَّاسُ إنَّ اللَّهَ طيِّبٌ لا يقبلُ إلَّا طيِّبًا ، وإنَّ اللَّهَ أمرَ المؤمنينَ بما أمرَ بِه المرسلينَ فقالَ

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ وقالَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ قالَ وذَكرَ الرَّجلَ يُطيلُ السَّفرَ أشعثَ أغبرَ يمدُّ يدَه إلى السَّماءِ يا ربِّ يا ربِّ ومطعمُه حرامٌ ومشربُه حرامٌ وملبسُه حرامٌ وغذِّيَ بالحرامِ فأنَّى يستجابُ لذلِک" (الترمذی:۲۹۸۹)۔

لیکن اس کا تعلق دوسروں سے نہیں ہے جو حرام کھانے والوں کے حق میں دعا کریں، قرآن کریم میں ہے:

"**ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم جاؤوک فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحيما**" (سورہ نساء:۶۴)۔

والله اعلم بالصواب

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی أبومحمد، محمد سعد نور القاسمی ☆

اسلام ایک مستقل نظام حیات ہے جس کا مکلّف اللہ تعالیٰ نے کائنات انسانی کو بنایا ہے، ہر وہ انسان جو اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہے اور تعلیمات کتاب وسنت پر ایمان رکھتا ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اسلامی نظام حیات کو اپنائے اور اس ضابطہ کے مطابق اپنی زندگی گذارے اور اسی پر موت ہو۔

رب العالمین نے اپنی آخری آسمانی کتاب میں بھی کلیات واصول کو سامنے رکھ کر حلال وحرام کی نشاندہی کی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تفصیل بیان فرمائی، اور آپ کے بعد امت کے مجتہدین اور فقہائے کرام نے کتاب وسنت کو سامنے رکھ کر اصول وکلیات کی روشنی پر فقہی جزئیات اور مسائل کا استنباط واستخراج کیا، اور احکام ومسائل مرتب کئے۔

قرآن پاک میں حلال وحرام دونوں مسائل آئے ہیں، حلال کے بارے میں فرمایا: ''**اليوم أُحل لكم الطيبات و طعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم و طعامكم حل لهم**'' (المائدہ۔۱۵)۔

(آج حلال ہوئیں تمہارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے، اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے)۔

''**يـأيهـاالـرسـل كـلوا من الطيبات و اعملوا صالحا**'' (سورہ مومنون:۵۱)، (اے پیغمبروں صاف ستھری و پاک چیزیں کھاؤ اور بھلے کام کرو)۔

''**يـأيهـاالذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناك**''(البقرہ۔۱۷۲)،(اے ایمان والوں پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ جو ہم نے تم کو دی ہیں)۔

حرام کے بارے میں فرمایا: ''**ولـحـم الخنزير وماأهل لغيرالله به والمنخنقة والموقوذة والمتردية والنطيحة**'' (المائدۃ۔۳)(سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا اور وہ جو گلا گھونٹنے سے یا چوٹ سے یا

☆ مدرس ومفتی مدرسہ مظہر العلوم، بیکن گنج، کانپور، یوپی

اونچے سے گرکر یا سینگ مارنے سے مرگیا) خرید وفروخت کے سلسلے میں ارشاد ہے:

"وأحل الله البيع و حرّم الربوا" (سورۃ البقرہ۔۲۷۵) (اللہ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا)، غیروں کا مال بالخصوص یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھانے کے سلسلے میں فرمایا گیا:

"إن الذين يأكلون أموال اليتٰمىٰ ظلماً إنما يأكلون فى بطونهم ناراً وسيصلون سعيراً" (سورۃ النساء۔۱۰)

(جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب آگ میں داخل ہوں گے)۔

اسی طرح احادیث نبوی میں حلال وحرام کا بڑا ذخیرہ ہے، اختصار کے ساتھ ۲، ۳ حدیثیں ذکر کرتا ہوں، آپ نے ارشاد فرمایا:

"ألا لايحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه" (مشکوۃ شریف)۔

(سن لو کسی آدمی کا مال دوسرے کیلئے حلال نہیں ہوتا ہے جب تک وہ بخوشی اجازت نہ دے)۔

آپ نے فرمایا: "الحلال بين والحرام بين وبينهما مشتبهات لايعلمهن كثير من الناس" (مشکوۃ شریف۔ص:۲۴۱)، (حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی اور ان دونوں کے درمیان جو چیزیں مشتبہ ہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے)۔

آپ نے فرمایا: "لايدخل الجنة جسد غذى بالحرام" (مشکوۃ شریف۔۲۴۳)۔

(جس جسم کی پرورش حرام غذا سے ہوئی ہے وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا)۔

پھر حضرات فقہائے کرام نے بھی حلال وحرام کی تعریف کی ہے:

"والحلال فى الشرع ماأباحه الكتاب والسنة أى ما أباحه الله وضده الحرام" (التعریفات الفقہیۃ)۔

(شریعت میں حلال وہ ہے جسے اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت نے مباح قرار دیا ہے، یعنی جس کی حلت اللہ کی طرف سے ثابت ہے، حلال کے مقابلے میں حرام ہے)۔

علامہ بسوانی محمد بن عبدالسلام نے اپنی کتاب "المنهيات الشرعية فى كتاب رب البرية" میں مال حرام کی ان اقسام کا ذکر کیا ہے جو قرآن کریم میں ذکر کی گئی ہیں، ان میں سب سے پہلے انہوں نے "اكل أموال الناس بالباطل" کو رکھا ہے اور اس قسم میں ان تمام قسم کے اموال کو شامل کیا ہے جو ناحق اور باطل ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں، ان میں غصب، چوری، وغیرہ شامل ہیں دوسرے نمبر پر یتیم کے مال کو ناحق کھانے کو رکھا ہے، تیسرے نمبر پر سود کھانے کو، جبکہ چوتھے نمبر پر رشوت کھانا اور پانچویں نمبر پر بلا استحقاق اور عمل معاوضہ یا اجرت کی وصولی کو مال حرام قرار دیا ہے (۱/۱۵۵، طبع لبنان بیروت)۔

اس لئے فقہاء کرام نے ذات کے لحاظ سے مال حرام کی دو قسمیں ذکر کی ہیں:

(الف) **حرام لذاتہ**: وہ مال کہلاتا ہے جو اپنی ذات اور وصف دونوں لحاظ سے حرام ہو، یعنی ایسی چیز جس کی ذات میں بھی حرمت ہو جیسے مردار، خون وغیرہ۔

(ب) **حرام لغیرہ**: وہ مال کہلاتا ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے حلال اور جائز ہو، لیکن کسی خارجی وصف کی وجہ سے اس میں حرمت پیدا ہوئی ہو، جیسے یتیم کا مال ناحق کھانا، دوسرے کا مال بغیر اجازت کے لینا، یا چوری کا مال وغیرہ، تو ان صورتوں میں اگرچہ مال اپنی ذات کے اعتبار سے حلال ہوگا، لیکن کسی اور کی ملکیت ہونے کی وجہ سے اس کے غیر شرعی استعمال کو حرام قرار دیا جاتا ہے، اسی تقسیم کو ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف میں اختیار کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''**سواء کان لحرمته لذاته بما فيه من ضرر أو خبث كالميتة والخمر أم لحرمته لغيره لوقوع خلل في طريق اكتسابه لأخذه من مالكه بغير إذنه كالغصب أو لأخذه منه بأسلوب لايقر الشرع ولو بالرضا كا لربا والرشوة**'' (الفقہ الإسلامی وأدلتہ ۱۰/۷۹۴۵)۔

درج بالا اقسام کو دیکھتے ہوئے فقہائے کرام نے مال حرام کے مصرف اور اس کے توبہ کے طریقۂ کار کو متعین کیا ہے، لہٰذا اگر کسی نے بصورت غصب یا چوری لیا ہو تو اگر اصل مالک معلوم ہو تو اس کا لوٹانا لازم ہے یہی توبہ کی قبولیت کی بھی شرط ہے، اور اگر اصل مالک معلوم نہ ہو تو اس کے ورثاء کو مال دیا جائے گا اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اصل مالک کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے گا، ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں: ''**حائز المال الحرام لخلل في طريقة اكتسابه لايملكه مهما طال الزمن ويجب عليه رده إلى مالكه أو وارثه إن عرفه فإن يئس من معرفته وجب عليه صرفه في وجوه الخير للتخلص منه وبقصد الصدقة عن صاحبه**'' (حوالہ سابق)۔

علمائے احناف کی رائے کو عالمگیریہ میں نقل کیا گیا ہے کہ امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر زبردستی کسی سے عطیات یا ہدایا وصول کئے ہوں اور اب وہ ان ہدایا کو ان کے اصل مالکوں کو واپس کرنا چاہتا ہے تو اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو اصل مالکوں کو ان کی اشیاء واپس لوٹا دے اور اگر اُن کو واپس لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کو بیت المال میں رکھ دے اور پورا واقعہ اس کے ساتھ لکھ کر بیت المال میں جمع کر دے اور اس پر لقطہ کے احکام جاری ہوں گے (الہندیہ ۲/۲۳۴ بیروت)

لیکن اصل مالک کو لوٹانے کے سلسلے میں علماء و محققین کا اختلاف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اصل مالک اگرچہ معلوم ہو اس کو نہ لوٹا کر اس مال کو صدقہ کر دیا جائے، بلکہ اس میں یہ بھی گنجائش رکھی ہے کہ اگر یہ شخص خود مستحق ہے تو بقدر ضرورت اس مال کو اپنے تصرف میں لا سکتا ہے (زاد المعاد لابن قیم ۵/۷۷۸)۔

اس آخری نکتے کو صاحب اختیار نے بھی بیان فرمایا ہے (دیکھئے الاختیار لتعلیل المختار ۳/۶۱)۔

بہرحال اس پر تمام محققین کا اتفاق ہے کہ مال حرام کا اگر مالک کو لوٹانا ممکن نہ ہو تو اس کا صدقہ کرنا لازم ہے، اور اگر یہ مال کسی حرام کام یا اشیاء کا عوض ہو تو اس کو فقراء اور مساکین میں صدقہ کردے اور اگر یہ شخص خود نادار ہے تو بقدر ضرورت اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔

بلکہ علامہ سرخسی نے تو اس شخص کو فقراء سے مقدم قرار دیا ہے، اور اس کا حکم لقطہ کے حکم کی طرح قرار دیا ہے کہ جیسے وہاں پر غنی کے لئے اس کا تصدق لازم ہے اور مستحق کے لئے اس کے استعمال کی گنجائش ہے، فرماتے ہیں: ''**وحاجته تقدم على حق الفقراء وإنما قلنا ذلك لأن حق الفقراء في هذا المال بمنزلة حقهم في اللقطة على معنى أن له أن يتصدق وله أن يردها على المالك إن شاء**'' (المبسوط للسرخسی ۱۱/۷۷)۔

حلال وحرام سے متعلق مذکورہ بالا تمہید کے بعد سوالات کا جواب درج ذیل ہے:

جواب: ۱

صورت مسئولہ میں اس طرح کا جو مال وارث کو ملا ہے وہ حلال ہے، اور اس کی کمائی بھی حلال ہے، تاہم اتنا فرق کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ شخص مالدار ہے تو اندازہ لگا کر اتنی رقم صدقہ کردے اور اگر یہ غریب اور مستحق ہے تو اس کے لئے خود اس کا استعمال ازراہِ فتوی جائز اور درست ہوگا، جیسا کہ اس سلسلے میں صاحب اختیار کے قول کو احقر نے تمہید میں ذکر کیا ہے، بلکہ علامہ سرخسی نے تو اس شخص کو فقراء پر مقدم قرار دیا ہے اور اس کا حکم لقطہ کی طرح مانا ہے۔

البتہ بہتر یہی ہے کہ ازراہ تقوی اس مال سے پرہیز کرے اور کسی حلال آمدنی اور کاروبار میں لگے؛ تاکہ علماء کے اختلاف سے باہر آجائے۔

جواب: ۲

مال حرام کا مصرف یہی ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو، اس کو واپس کرنا ضروری ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بلا نیت ثواب اس کو فقراء پر صدقہ کردے، چنانچہ شامی میں ہے: ''**لو مات الرجل و كسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة ولايأخذون بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**'' (الدر المختار مع الرد ۶/۳۸۵ فصل فی البیع)، لیکن چونکہ اس سلسلے میں بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اگر ایسا شخص خود مستحق ہے تو بدرجۂ مجبوری اس مال حرام سے استفادہ کرسکتا ہے، جیسا کہ صاحب اختیار کی رائے ہے، بلکہ علامہ سرخسی نے تو اس کو

فقراء پر مقدم قرار دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں" **وحاجته تقدم على حق الفقراء**"(المبسوط للسرخسی ۱۱/۷۷)۔

اوراس کی تائید شامی کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"**وفی منیة المفتی: مات رجل ویعلم الوارث أن أباه کان یکسب من حیث لایحل ولکن لایعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الإرث والأفضل أن یتورع ویتصدق بنیة خصماء أبیه**"(الشامی ۷/ ۲۲۳، کتاب البیوع)۔

اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ یہ مال صدقہ کردے؛ تاہم چونکہ خود مستحق ہے اور دوسرا کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے تو اس کے لئے بھی بدرجۂ مجبوری استعمال کی گنجائش ہوگی۔ واللہ أعلم بالصواب

جواب: ۳

صورت مسئولہ میں ایسی خواتین کو چاہئے کہ اولاً شوہر کو ایسے کاروبار سے باز رکھنے کی کوشش کریں اور حلال کاروبار پر آمادہ کریں، اور اگر وہ باز نہیں آتا ہے تو اگر ان خواتین کے لئے جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لئے اپنے شوہروں کے حرام مال سے کھانا جائز نہ ہوگا، لیکن اگر اُن کے لئے جائز طریقے سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو تو اپنے شوہروں کے مال سے کھانا جائز ہوگا اور حرام کھلانے کا گناہ شوہر پر ہوگا، اسی طرح نابالغ اور چھوٹے بچوں کا معاملہ ہوگا، البتہ بالغ اولاد کو چاہئے کہ وہ جائز کما کر کھائیں باپ کے حرام مال سے کھانا جائز نہ ہوگا۔

شامی میں ہے:" **وفی جامع الجوامع اشتری الزوج طعاماً أو کسوة من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها والإثم علی الزوج**" (شامی ۹/ ۲۳ کتاب الغصب)،"**وفیه أیضاً وفی الخانیة: امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أکلت من طعامه ولم یکن عینه غصباً أو اشتری طعاماً أو کسوة من ماله أصله لیس بطیب وهي من سعة من ذلک والإثم علی الزوج**"(شامی ۹/ ۴۷۱ کتاب الحظر والإباحۃ)،اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

"حرام مال تو حرام ہی ہے، ایسی صورت میں ماں کو کوشش کرنی چاہئے کہ اُسے کسی حلال ذریعہ سے آمدنی حاصل ہوجائے، نیز بیٹے کو حرام کمائی کے بجائے حلال کمائی پر آمادہ کرنا بھی اس کے ذمہ واجب ہے اور جب تک انتظام نہ ہو تو بہ استغفار کرتی رہے اور حلال کی فکر و کوشش جاری رکھے" (فتاوی عثمانی: ۳/ ۱۲۶، نیز دیکھئے: فقہی مقالات ۱/ ۲۶۶، ۲۶۷، اسلام اور جدید معاشی مسائل ۴/ ۵۲)۔

اسی طرح باپ نے اپنے بچوں کو مال حرام سے جو اعلی تعلیم دلوائی ہے اور اب وہ بچہ کمائی کر رہا ہے اس کو چاہئے کہ

وہ اتنی رقم کا اندازہ لگا کر جو اس کی تعلیم پر خرچ ہوئی ہو، صدقہ کردے۔

اور اس کی تائید شامی کی درج ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"وفی منیة المفتی: مات رجل ویعلم الوارث أن أباه کان یکسب من حیث لایحل ولکن لایعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الإرث والأفضل أن یتورع ویتصدق بینه خصماء أبیه" (الشامی۔ ۷/ ۲۲۳ کتاب البیوع)۔

البتہ اس کی اپنی حلال کمائی جو اپنی صلاحیت اور اہلیت کی بنیاد پر حاصل کر رہا ہے وہ حلال ہوگی، اسکو حرام نہیں کہا جائے گا، یعنی والد کی حرام کمائی سے اعلی تعلیم دلوانے کی بنیاد پر اس کی اپنی حلال آمدنی حرام نہیں ہوجائے گی، اور حرمت متعدی نہیں ہوگی، چنانچہ بنوری ٹاؤن کے مفتی صاحب ایک سوال کے جواب میں تحریر کرتے ہیں: "بیٹا اگر بالغ ہے تو اُسے چاہئے کہ وہ اپنی کمائی کا انتظام خود کرے کہ اس کی بلوغت کے بعد اس کی کفالت کی ذمہ داری باپ پر نہیں یا کسی سے قرض لے کر اپنی تعلیمی ضرورت پوری کرے اور بعد میں جب اس کے لئے ممکن ہو اس رقم کو ادا کردے" (آن لائن فتوی نمبر۔ 144107200123)

جواب: ۴

عالمگیری میں ہے: **"أهدي إلی رجل شیئاً أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلابأس إلا أن یعلم بأنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی أن لا یقبل الهدیة ولایأکل الطعام إلا أن یخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل الخ"** (الھندیہ ۵/ ۳۴۲ کتاب الکراھیۃ)، نیز فتاوی دارالعلوم میں اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"حرام کی آمدنی سے اگر کسی کو ہدیہ دیا جائے اور اس شخص کو معلوم ہو جس کو دیا جائے کہ یہ حرام کی آمدنی سے دیا ہے تو اس کا لینا درست نہیں ہے اور اگر اس کو معلوم نہیں ہے تو حلال ہے، اور حرام کی کمائی سے دعوت کرنے کا بھی یہی حکم ہے، اگر معلوم ہو تو نہ کھائے اور اگر معلوم نہ ہو تو درست ہے" (فتاوی دارالعلوم: ۱۷/ ۳۷۹)۔

جواب: ۵

اب رہا یہ مسئلہ کہ دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے اور یہ بھی یقینی طور پر معلوم ہو کہ اس نے اُسی مال حرام سے دعوت کا کھانا کھلایا ہے تو اس کھانے کی رقم کا اندازہ لگا کر اس کا صدقہ کرنا واجب ہے، کیونکہ

صریح حرام سے بچنا ضروری ہے اور اگر یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ کھانا مال حرام سے ہے تو پھر صدقہ کرنا واجب نہیں، کیونکہ مشتبہ سے احتراز ہو سکے تو تقوی ہے اور نہ ہو سکے تو از روئے فتوی درست ہے، البتہ اگر بطور تقوی صدقہ کرنا چاہے تو بہتر ہے، اور یہی بات فتاوی محمودیہ کے ایک جواب سے سمجھ میں آتی ہے، مفتی صاحب فرماتے ہیں: ''جب کہ یہ بات یقینی نہیں کہ یہ سامان ہندہ کے خالو نے حرام مال سے حاصل کیا ہے تو اس کا صدقہ کرنا واجب نہیں، تاہم بکر بطور تقوی صدقہ کرنا چاہتا ہے تو بہتر ہے'' (فتاوی محمودیہ: ۱۸/۱۷۱)۔

جواب: ٦

مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک موجود ہو تو اس کو لوٹا دے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو بلا نیت ثواب کسی فقیر کو دے دے، چنانچہ شامی میں ہے: ''**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم والإ فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه**'' (شامی: ۵/۹۹)۔

لیکن اگر اس کے پاس اس حرام مال کے سوا کوئی دوسرا مال موجود نہ ہو جس سے اپنے اوپر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کر سکے تو پھر مجبوری کے درجے میں اس کو استعمال کرنے کا حیلہ اور تدبیر یہ ہے کہ کسی غیر مسلم سے قرضہ لے کر اس کو اپنی اور اہل وعیال کی ضرورتوں میں خرچ کر کے یہ حرام مال اس غیر مسلم کے قرض کی ادائیگی میں دے دے، قرضے میں لی ہوئی رقم اس کے لئے حلال ہوگی، اگرچہ ناجائز رقم سے قرض ادا کرنے کا وبال اس قرض لینے والے پر ہوگا، خلاصۃ الفتاوی میں ہے:

''**وفی شرح حیل الخصاف شمس الأئمة الحلوانی رحمه الله أن الشيخ الإمام أباالقاسم الحكيم كان مِمَّن يأ خذ جائزة السلطان وكان يستقرض بجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة كان يقضی به دينه**'' (خلاصۃ الفتاوی: ۴/۳۴۹)۔

جواب: ۷

احقر نے تمہید میں یہ بات تفصیل سے بیان کی تھی کہ مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ اگر مالک معلوم ہو تو اس کو لوٹا دیا جائے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو اس کو بلا نیت ثواب فقراء پر صدقہ کر دے، لیکن اگر یہ شخص خود مستحق اور ضرورت مند ہو اور اس کے پاس کوئی حلال مال استعمال کے لئے اور اپنی اور بیوی بچوں کی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے لئے نہ ہو تو اس کے لئے اس مال حرام کے استعمال کی مجبوری کے درجے میں گنجائش ہوگی اور جب بعد میں اس کے پاس مال حلال کا انتظام ہو جائے تو مال حرام کا اندازہ لگا کر صدقہ کر دے، اسی طرح اگر اس شخص نے مال حرام کے ذریعے تجارت کی تو نفع اور اضافہ کو ناجائز اور حرام نہ کہا

جائے گا، بلکہ اس کے لئے اصل حرام رقم صدقہ کرنے کے بعد وہ نفع اور اضافہ استعمال کرنے کی گنجائش ہوگی، اس سلسلے میں صاحب اختیار کا حوالہ دیا گیا تھا کہ اگر چہ وہ اضافہ بھی اس کو صدقہ کر دینا چاہئے، لیکن اگر وہ ضرورت مند ہے تو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: ''**أنه و إن وجب التصدق بالفضل ولكن إن احتجاج إليه بأن لم يكن في ملكه مايسد به حاجة نفقته ونفقة عياله فصرفه في حاجته بنية أنه يتصدق بمثله فيما بعد جازه له ذلك**''۔

اس کے بعد طرفین کی رائے ذکر کرتے ہیں: ''**ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصرف في ملك الغير والفرع يحصل على صفة الأصل والملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز ثم إن كان غنياً تصدق بمثله وإن كان فقيراً لايتصدق**'' (الاختیار شرح المختار ۳/ ۶۱)، اور اس کا محمل متعین کرتے ہیں کہ اس صدقہ کا وجوب اس صورت میں ہے کہ جبکہ وہ شخص خود مستحق نہ ہو، اگر مستحق ہو تو خود پر خرچ کر سکتا ہے۔

اور یہی رائے صاحب ہدایہ کی ہے، لکھتے ہیں: ''**إلا إذا كان لايجد غيره لأنه محتاج إليه وله أن يصرفه إلى نفسه**'' (الہدایہ مع فتح ۸/ ۲۵۷)۔

بلکہ علامہ سرخسی اسی میں یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ اس مستحق شخص کی حاجت کو فقراء پر مقدم رکھا جائے گا، اور وہ اس مسئلہ کو لقطہ کے مسئلہ پر قیاس کرتے ہیں کہ ملتقط اگر محتاج ہے تو اپنے اوپر بھی خرچ کر سکتا ہے: ''**وحاجته تقدم على حق الفقراء وإنما قلنا ذلك لأن حق الفقراء في هذ المال بمنزلة حقهم في اللقطة على معنىٰ أن له أن يتصدق وله أن يردها على المالك إن شاء ثم الملتقط إذا كان محتاجاً فله أن يصرف اللقطة إلى حاجة نفسه بخلاف ماإذا كان غنياً فكذلك حكم هذه الغلة**'' (المبسوط للسرخسی ۱۱/ ۷۷)۔

پھر لقطہ کے سلسلے میں حنفیہ کا بھی مذہب یہی ہے کہ ملتقط اگر مالدار ہے تو اس کے لئے لقطہ کے مال سے انتفاع جائز نہیں ہے، لیکن اگر اس کو ضرورت ہے تو امام کی اجازت سے بطور قرض کے وہ اس مال سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور یہ رقم اس کے ذمہ قرض ہوگی جو بعد وہ میں فقراء پر صدقہ کر دے گا، صورت مسئولہ میں بھی اس شخص کے پاس مال حرام تو ہے مال حلال نہیں، اور مال حرام پر اس کا کوئی حق نہیں بلکہ فقیروں کا حق ہے، لہٰذا یہ شخص شرعاً فقیر مانا جائے گا اور اس پر فقراء کے احکام جاری ہوں گے۔

جواب: ۸

جس جگہ جائز اور ناجائز دونوں طرح کے معاملات ہوں، وہاں ملازمت کے جواز اور عدم جواز کا دارومدار مفوضہ امور کی نوعیت پر ہے، اگر مفوضہ کام بنیادی طور پر ناجائز ہیں، اُس جگہ ملازمت شرعاً جائز نہ ہوگی اور جس جگہ مفوّضہ کام بنیادی طور پر جائز ہیں، اُس جگہ ملازمت شرعاً جائز ہوگی اور جس جگہ مفوضہ کام جواز اور عدم جواز کے درمیان مشترک ہوں تو وہاں پر ''إذا

اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام" کے قاعدے کے تحت عدم جواز کو ترجیح ہوگی، اِلا یہ کہ کوئی شخص ضرورت مند ہو جس کے پاس اپنے اور بیوی بچوں کی ضروریات کے تکفل کے لئے کوئی دوسرا جائز راستہ نہ ہو تو توبہ واستغفار کے ساتھ ایسی جگہ کام کرنے کی گنجائش ہوگی، اور اُس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ کسی جگہ جائز ملازمت کی تلاش میں لگا رہے۔

اس لئے صورت مسئولہ میں اگر مذکورہ شخص کی ذمہ داری حلال بزنس سے متعلق ہے تو اس کے لئے اس جگہ ملازمت کرنا جائز ہے، البتہ اگر کبھی کبھار حرام بزنس کا بھی کچھ کام کرنا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں چونکہ یہ اصلاً جائز کاروبار میں لگا ہے اور ضمناً حرام کام کرنا پڑتا ہے تو اس کو چاہئے کہ اندازہ لگا کر اس حرام کام کی اجرت صدقہ کردے، اور اگر مذکورہ شخص کی ذمہ داری حرام امور سے متعلق ہے تو پھر یہ ملازمت ناجائز اور حرام ہوگی، اس کو چاہئے فوراً توبہ واستغفار کرے اور اسکو چھوڑے اور دوسرا ذریعۂ معاش استعمال کرے، اور اگر دوسرا ذریعہ معاش نہ ہو اور چھوڑنے میں نقصان کا اندیشہ ہو تو توبہ واستغفار کے ساتھ لگا رہے اور حلال ملازمت کی بھرپور کوشش کرتا رہے۔

جواب:۹

اصل جواب سے پہلے دو باتیں اصولی طور پر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسکو حضرات فقہائے کرام نے ذکر کیا ہے: (۱) حرام کمائی سے حاصل ہونے والی رقم سے خریدی ہوئی اشیاء مثلاً غلہ وانا ج اور دیگر سامان میں حرمت اس وقت واقع ہوتی ہے جب عقد ونقد دونوں اُسی مال حرام پر جمع ہوئے ہوں، مثلاً زید کے پاس شراب کی کمائی کے پانچ سو روپیہ تھے اور اُس نے شراب کی کمائی سے حاصل ہونیوالا وہ پانچ سو کا نوٹ کسی دوکاندار کو دکھایا اور کہا کہ اس نوٹ کے عوض مجھے فلاں شئ (مثلاً پرس) دے دو، یہ حرام پر عقد کہلایا پھر جب زید نے وہی پانچ سو کا نوٹ اُسے دے دیا تو یہ حرام کا نقد ہوا، اور جب عقد و نقد دونوں حرام پر ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں وہ خریدی ہوئی شئ بھی حرام ہوجائے گی اور جب تک عقد ونقد دونوں مال حرام پر جمع نہیں ہوں گے اس وقت تک خریدی ہوئی شئ میں حرمت واقع نہیں ہوگی اور ہمارے یہاں عام طور پر خرید و فروخت کا جو طریقہ کار ہوتا ہے اس میں چونکہ عقد ونقد دونوں جمع نہیں ہوتے، لہٰذا حرام کمائی کرنا اور اس سے کوئی چیز خریدنا بلاشبہ حرام فعل ہے اور گناہ ہے، لیکن اُس سے وہ خریدی ہوئی چیز حرام نہیں ہوتی، علامہ شامی فرماتے ہیں کہ مختار قول یہ ہے کہ حرام مال کے ذریعہ خریدی ہوئی اشیاء بھی حرام ہونی چاہئے، لیکن ہمارے زمانے میں حرام کی کثرت کے پیش نظر لوگوں کے حرج ونقصان کو دور کرنے کے لئے فتوی امام کرخیؒ کے قول پر ہے (یعنی اگر عقد ونقد جمع نہ ہوں تو حرام مال سے خریدی ہوئی شئ کی طرف حرمت سرایت نہیں کرے گی اور وہ شئ حلال ہوگی)۔

"**وقال أبوبكر: لايطيب في الكل لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعاً للحرج عن**

الناس، وفی الولوالجیة: وقال بعضهم: لایطیب فی الوجوه کلها وهو المختار لکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعاً للحرج لکثرة الحرام''(شامی:۵/۲۳۵)۔

دوسری بات یہ ہے کہ نقود متعین نہیں ہوتے، قاعدہ ہے:''**الأصل أن النقود لاتتعین فی العقود والفسوخ**''(المبسوط للسرخسی:۳/۲۷)یعنی عقد کے منعقد ہونے میں اور عقد کے فسخ ہوجانے میں نقود متعین نہیں ہوتے، کیونکہ مقصود اس کی قیمت ہے نہ کہ اس کا عین (قواعد ابن رجب:۴۱۴)۔

مذکورہ بالا دونوں اصولوں کے بعد مسئولہ صورت میں کئی اجزا ہیں:

پہلا جز یہ ہے کہ حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے جیسے کھیتی باڑی کا کیا حکم ہے اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر نوکری کرنے کا کیا حکم ہے؟ تو عرض ہے کہ چونکہ نقود معین نہیں ہوتے اور ہمارے یہاں عقد ونقد جمع نہیں ہوتے، اس لئے حرام کمائی کرنے والا جب تک یہ صراحت نہ کرے کہ میں یہ مال حرام سے دے رہا ہوں اُس کے گھر میں نوکری کرنا درست ہوگا اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہوگی، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے ایک فتوی میں ہے:

''ازراہ فتوی یہ سب امور درست ہیں، کیونکہ حرمت کا یقین اس طعام میں اور روپیہ میں نہیں ہے اور تقوی اور احتیاط اسی میں ہے کہ روپیہ سے احتیاط کی جائے''(فتاوی دارالعلوم ۱۶/۱۰۲)۔

دوسرا جز یہ ہے کہ حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا کیسا ہے، اولاً تو یہ متعین نہیں کہ یہ گاڑی اس نے مال حرام سے خریدی ہے اور ثانیاً اگر اس نے مال حرام ہی سے خریدی ہے تو مال حرام سے خریدنا یہ اس کا اپنا فعل ہے، بلاشبہ گناہ کا کام ہے، لیکن اس سے اس گاڑی پر بیٹھنا اور سفر کرنا حرام نہیں کہلائے گا، تاہم ازراہ تقوی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔

تیسرا جز یہ ہے کہ حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو اُن سے فیس وصول کرنا کیسا ہے؟ تو جواباً عرض ہے کہ ایسا شخص جب تک یہ صراحت نہ کرے کہ وہ مال حرام سے فیس دے رہا ہے اس فیس کو لینے کی گنجائش ہے، لہٰذا اس کے بچے کو پڑھا کر فیس لے سکتے ہیں اور اس کو جائز ہی کہا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ مذکورہ صورتوں میں حرام کمائی والوں سے مزدوری اور اجرت وفیس لینے کی گنجائش ہے، زیادہ سے زیادہ اسکو مکروہ کہا جاسکتا ہے۔

جواب:۱۰

شریعت میں کمائی کے جن طریقوں کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے ان میں سے ایک رشوت بھی ہے، رشوت وہ مال

کہلاتا ہے جو اپنے موافق فیصلہ کروانے کے لئے دیا جائے، حضرت ابن عطیہ نے رشوت کی جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"**أخذ الأموال على فعل مايجب على الأخذ فعله أو فعل مايجب عليه تركه**" (تفسیر بحر محیط ۴/ ۵۳۳)۔

یعنی جو کام کرنا اس کے ذمہ واجب ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہے، اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی ویب سائٹ میں ایک سوال کے جواب میں ہے:

''رشوت میں سود کی رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہے، اس لئے کہ سود کی رقم یا مالک (بینک یا حکومت) کو لوٹانا ضروری ہے یا پھر غریبوں مسکینوں کو بلا نیت ثواب دینا ضروری ہے۔

رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضہ میں نہیں جاتی بلکہ افسران کی جیب میں جاتی ہے'' (جواب نمبر۔69751)

مذکورہ فتاوی کی روشنی میں یہ نقطۂ نظر واضح ہو گیا کہ سود کی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں، البتہ عصر حاضر کے بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ بدرجۂ مجبوری سود کی رقم رشوت میں دینے کی گنجائش ہے، چنانچہ فقیہ العصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی رائے یہی ہے کہ اگر ایسے حالات بن جائیں تو بدرجۂ مجبوری سود کی رقم بھی رشوت میں دی جاسکتی ہے۔

جواب:۱۱

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فليأكل من طعامه ولايسئل ويشرب من شرابه ولايسئل**'' (مشکاۃ المصابیح باب الولیمۃ: ۲/ ۲۷۹)۔

ملا علی قاریؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں: '' **فليأكل من طعامه ولايسئل أى من أين هذاالطعام ليتبين أنه حلال أم حرام ويشرب من شرابه ولايسئل فإنه قديتأذى بالسوال وذلك إذا لم يعلم فسقه كما ينبئ عنه قوله على أخيه المسلم**'' (مرقاۃ المفاتیح: ۶/ ۳۷۷)۔

فتاوی ہندیہ میں ہے: ''ایک شخص نے کسی آدمی کو ہدیہ دیا یا اس کی میزبانی کی اگر اس کا اکثر مال حلال ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں، مگر یہ کہ جانتا ہو کہ یہ شئ حرام ہے اور اگر حرام غالب ہو تو ہدیہ قبول نہ کرے اور نہ ضیافت کا کھانا کھائے، مگر یہ کہ وہ اس کی خبر دے کہ یہ حلال کمائی سے مجھ کو میراث ملا ہے یا میں نے اس کو قرض لیا ہے، جیسا کہ ینابیع میں ہے، فاسق معلن کی دعوت قبول نہ کرے تاکہ اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ اس کے فسق پر راضی نہیں، اسی طرح اس شخص کی دعوت قبول نہ کرے جس کا غالب مال حرام سے ہو جب تک یہ خبر نہ دے کہ یہ حلال ہے اور اس کے برعکس صورت میں قبول کرے مگر یہ ظاہر ہو جائے کہ

یہ حرام ہے، تمر تاشی میں اسی طرح ہے'' (ہندیہ:۵/۳۴۲)۔

صورت مسئولہ میں جب کسی بستی کی اکثریت سود میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر اس سے پوچھنا ناگواری کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہو تو اس موقع پر جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ غالب کیا ہے تو تحقیق کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اگر وہ شخص فاسق معلن نہ ہو تو پھر بلاوجہ پوچھ کر اس کو اذیت نہ پہونچایا جائے، بلکہ تحری کرے، اگر طبیعت آمادہ ہو تو استعمال کرے ورنہ کسی کو صدقہ کی نیت سے دے دے اور اگر تحقیق کرنا خلافت مصلحت ہو تو پھر حالت اضطرار میں تحری پر عمل کرے اور حالت اختیار میں قبول نہ کرکے یا قبول کرکے کسی مستحق کے حوالے کردے۔

جواب:۱۲

قرآنی آیات اور احادیث سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی عبادت اور دعا قبول نہیں ہوتی، لیکن یہ کہیں نظر سے نہیں گذرا کہ ایسے لوگوں کے لئے دعاء کرنے سے منع کیا گیا ہو، اس لئے صورت مسئولہ میں ایسے لوگوں کے لئے دعاء کرنے میں اور پانی وغیرہ پر دم کرنے میں کوئی حرج نہیں، البتہ ان کے لئے دو دعائیں کی جائیں، ایک تو جس مقصد کے لئے وہ دعاء کروا رہے ہیں اس مقصد کے لئے دعاء کردی جائے اور دوسرے ان کے لئے بطور خاص یہ دعاء کی جائے کہ اللہ پاک اُن کو حرام سے بچنے کی اور حلال کمانے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق چند مسائل

مولانا احمد مکین☆

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم ـــــــــــ أما بعد:

حرام مال وحرام روزی حاصل کرنے کو شریعت نے سخت گناہ قرار دیا ہے اور قرآن کریم واحادیث مبارکہ میں متعدد مقامات پر مال حرام کو حاصل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے اس پر وعید کا بھی ذکر کیا گیا ہے، نیز اس کی قباحت ومذمت بیان کی گئی ہے؛ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:"وَ لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" (البقرہ:۱۸۸)(اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ اور ان کے (جھوٹے مقدمے) کو حکام کے پاس اس غرض سے مت لے جاؤ کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے مال کا کوئی حصہ گناہ کے طریقے پر کھا جاؤ جب کہ تم کو اپنے جھوٹ اور ظلم کا علم بھی ہو)۔

قرآن مقدس نے اس آیت میں حرام طریقوں سے مال حاصل کرنے اور استعمال کرنے کی ممانعت کو بڑے جامع انداز میں ذکر کیا ہے، اسی طرح دوسری جگہ ذکر کیا گیا"اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ا وَ سَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا" (النساء:۱۰)(جو لوگ یتیموں کے مالوں کو ناحق کھاتے ہیں وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب داخل ہوں گے آگ میں)،"يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"، "فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِه"(البقرہ:۲۷۸،۲۷۹) (کہ اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمان کا پس اگر نہی چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے)، اس آیت میں حکم کی مخالفت کرنے والو کو سخت وعید سنائی گئی ہے کہ اگر تم سود سے باز نہیں آتے تو اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو، یہ وعید شدید ایسی ہے کہ کفر کے سوا اور کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآن میں ایسی وعید نہیں آئی ہے۔

☆ خادم التدریس بالجامعۃ العربیۃ ہتورا، باندہ یوپی

احادیث مبارکہ میں رسول کریم ﷺ نے مال حرام کی شناعت وقباحت ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''جوآدمی اپنے پیٹ میں حرام کا لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کی عبادت قبول نہیں کی جاتی'' (احیاء علوم الدین/ ۳۳۱۲)، ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: ''جس بندے کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو جہنم کی آگ اس کے زیادہ لائق ہے'' (ترمذی رقم الحدیث ۴۱۶)۔

الغرض حلت وحرمت انسانی ذہن کی اختراع نہیں ہیں؛ بلکہ یہ خالصتاً وحی پر مبنی ہے، شریعت مطہرہ جس امر کو حلال بتائے وہ ''طیب'' اور ''طاہر'' ہے اور جسے حرام قرار دے وہ ''ممنوع'' و ''ناجائز'' ہے، لہٰذا شریعت کے معاملہ میں عقل پرستی سے کام لینا شیطان کا راستہ ہے۔

حرام کی لغوی واصطلاحی تعریف:

حرام حلال کی ضد ہے، امام راغب فرماتے ہیں: ''حرام وہ ہے جس سے روک دیا گیا ہو''۔

الحرام ضدالحلال قال الراغب: الحرام الممنوع منه (قواعد الفقہ ص ۲۶۴)۔

صاحب فواتح الرحموت نے ان الفاظ میں ذکر کی ہے کہ ''جس کے نہ کرنے کا لازمی مطالبہ کسی دلیل قطعی سے ثابت ہو''۔

''**ماطلب ترک فعله حتماً بدليل قطعي**'' (فواتح الرحموت ۱/ ۵۵)۔

حرام کے اقسام:

فقہاء نے حرام کی دو قسمیں ذکر کی ہیں: حرام لعینہ، حرام لغیرہ۔

حرام لعینہ: وہ شئ جس کی حرمت خود اس کی ذات میں پائے جانے والے کسی وصف کی وجہ سے ہو، جیسے شراب۔

حرام لغیرہ: وہ شئ جس کی حرمت خارجی کسی چیز کی وجہ سے ہو، جیسے غیر کے مال کا استعمال کہ نفس مال اپنے اندر کوئی ایسا وصف نہیں رکھتا کہ جس کی وجہ سے اس کا استعمال حرام ہو، بلکہ اس کی حرمت مالک کی اجازت کے بغیر اس کے استعمال کی وجہ سے ہوتی ہے (التوضیح ۲/ ۶۱۱، ۶۱۲)۔

مال حرام کی تعریف:

جس چیز سے شارع لازمی طور پر رکنے کا مطالبہ کرے (منہاج الأصول وعلم الأصول مع شرح الابہاج ۱/ ۵۸)۔

حرام طریقہ پر مال کا اکتساب جبکہ حرمت کا علم ہو تو وہ حرمت اکتساب مال والے تک ہی موقوف ومحدود نہیں رہتی، بلکہ ہر اس شخص تک پہونچتی اور تجاوز کرتی ہے جو مال کی حرمت کا علم رکھنے کے باوجود حرام مال حاصل کرنے والے کے ساتھ

معاملہ کرتا ہے، جیسا کہ موسوعۃ قواعد الفقہیہ میں ہے:

"إن اكتساب المال من حرام لا يقف حرمته عند مكتسبه بل تتعداه لكل متعامل معه إذا علم إن هذا المال حرام" (ج۵/ ۱۱۴)۔

۱- وراثت میں ملے ہوئے مال حرام کا حکم:

جس شخص کو وراثت میں مال ملا اور اسے اس بات کا علم بھی تھا کہ میرے مورث کی کمائی حلال طریقہ سے نہیں حاصل کی ہوئی تھی، ایسے شخص کا وراثت میں ملے ہوئے مال سے جبکہ وہ اس مال کے مالک کو نہ جانتا ہو جس کے مال کو اس کے باپ نے حرام طریقہ سے حاصل کیا تھا کہ اس متعین شخص کے مطالبہ پر مال کو واپس لوٹا دے تو حلال کاروبار کرنا، گھر جائیداد بنانا درست ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدینؒ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

"في منية المفتي: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لايحل ، ولكن لايعلم الطالب بعينه يرد عليه حل له الإرث" (شامی ۷/ ۳۰۱، کتاب البیوع/ باب البیع الفاسد)۔

نیز شہاب الدین عبدالحیؒ شذرات الذہب فی أخبار من الذھب میں ذکر کرتے ہیں:

"اس کی صورت یہ ہے کہ مورث کی طرف سے جو مال وارث کو ملا ہے جسے مورث نے ناجائز طریقے سے سمیٹ رکھا ہے؛ علماء کی اس مال کی حرمت کے حکم اعتبار سے رائے مختلف ہوگئی؛ کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ جب مال بطور میراث کے وارث کی طرف منتقل ہوگیا تو وہ اس کیلئے حلال ہے، تھوڑا ہو یا زیادہ اور اس میں وارث پر کسی طرح کا گناہ نہیں ہے، گناہ تو اس مورث کے سر ہوگا جس نے اسے حرام طریقے سے حاصل کیا اور یہی قول حسن بصریؒ کا ہے" (ص: ۸۴۲)۔

دارالحرب میں سودی معاملہ کا جواز:

اور چونکہ دارالحرب میں خود مسلمانوں کیلئے بعض اقوال و روایات کی رو سے سود کے لین دین کی گنجائش نکلتی ہے، چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد رحمہما اللہ بعض قیود و شرائط کے ساتھ جواز کے قائل ہیں، جبکہ جمہور علماء امت ایک طرف عدم جواز کے قائل ہیں۔

فقہاء نے جواز سود کے لئے تین صورتیں ذکر ہیں:

(۱) ایک مسلمان جو دارالاسلام کا باشندہ ہو امان لے کر دارالحرب میں جائے اور وہاں کے کسی کافر باشندے کے ساتھ معاملہ کرے۔

(۲) یہی مسلمان دارالحرب کے اس مسلم باشندے کے ساتھ معاملہ کرے جو دارالحرب میں ہی ایمان لایا ہو اور وہیں رہ رہا ہو۔

(۳) دارالحرب میں اسلام لانے والے وہیں رہتے ہوئے آپس میں یہ معاملہ کریں۔

فقہ البیوع میں ہے: ''جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ سود کی حرمت میں دارالاسلام اور دارالحرب دونوں برابر ہیں اور کسی مسلمان کیلئے یہ جائز نہیں کہ کسی حربی کافر سے سودی معاملہ کرے؛ جیسا کہ حربی کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ مسلمان سے سودی معاملہ کرے اور یہی قول امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ اور جمہور فقہاء امت کا ہے، امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے، اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں داخل ہو کر کسی حربی سے سودی معاملہ کرے تو یہ درست ہے، وجہ یہ ہے کہ حربی کا مال مسلمان کیلئے ان کی رضامندی سے مباح ہے، جب تک اس میں کسی طرح کا دھوکہ نہ ہو اور مستدل وہ روایت ہے جس کی تخریج امام بیہقی نے کی ہے، جسے حضرت مکحول مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ حربی کے درمیان رباء نہیں ہے، حضرت مکحول کہتے ہیں کہ جہاں تک میرا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے اہل اسلام بھی فرمایا ہے'' (فقہ البیوع ۲/۷۰۷، الربا فی دارالحرب)۔

لیکن یہ جواز طرفین کے نزدیک (مطلقاً) نہیں ہے، بلکہ اس کیلئے شرائط وقیود ہیں۔

طرفین کے نزدیک سودی معاملہ کے جواز کی شرطیں:

(۱) مسلمان دارالاسلام کا باشندہ ہو اور امان لے کر دارالحرب میں داخل ہوا ہو۔

(۲) ایسا مسلمان ہو جو دارالحرب ہی میں اسلام لایا ہو اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کیا ہو تو اس کیلئے کافر سے یا ایسے مسلمان سے جو دارالحرب میں اسلام لایا اور دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کیا سود لینا جائز ہے۔

(۳) اور مسلم اصلی جو دارالحرب میں آنے سے پہلے اسلام لا چکا ہو۔

(۴) یا وہ جو دارالحرب میں اسلام لایا پھر ہماری طرف ہجرت کر کے آیا پھر دار الحرب میں واپس لوٹ گیا تو مسلمان کیلئے اس سے سود لینا جائز نہیں۔

۲- غیر مشروع طریقہ سے بنائی گئی پراپرٹی سے کرایہ وصول کرنے کا حکم:

جس غریب شخص کی پوری جائیداد اور مال حرام کاروبار سے حاصل ہوئے ہیں اور اسی حرام جائیداد سے جو کرایہ موصول ہو رہا ہے آثار تابعین اور کتب فقہیہ کی تصریحات واطلاق کی روشنی میں اس شخص کیلئے اپنے ملکیت سے مال حرام

کونکالنااوراسے اس کے مالک تک پہونچانااور مالک کا پتہ نہ لگنے پر سارے مال حرام کا تصدق ضروی ہے۔

لیکن آج جبکہ حرام کی کثرت اوراس میں اختلاط بڑھتاہی جارہاہے جس سے بچنا مشکل ہوتا چلا جارہاہے،اب وہ غریب شخص جس نے حرام مال حاصل کیا اگر سارا مال حرام اپنے ملکیت سے نکالتاہے تو اسے حرج اور مشقتیں لاحق ہوجاتی ہیں توبعض علماء امت نے ایسے شخص کیلئے اپنے سے حرج کو دفع کرنے کیلئے کچھ گنجائش ذکر کی ہے۔

"**عن الزهری قد سئل عن رجل یصیب المال الحرام ؟قال: إن سرّ ه أن یتبرأ منه فلیخرج منه**"۔

(امام زہریؒ سے مروی ہے کہ ان سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا جو مال حرام حاصل کرتاہے؟ تو انہوں نے فرمایا:اگراسے مال حرام سے بری ہونے میں خوشی ہوتو چاہئے کہ اس سے خلاصی حاصل کرے)۔

"**عن مالک بن دینار قال: قال رجل: لعطاء ابن أبی رباح رجل أصاب مالاً من حرام؟ قال: یرده علی أهله، فإن لم یعرف أهله فلیتصدق به ولا أدری ینجیه ذالک من إثمه**"۔

(حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عطاء بن ابی رباحؒ سے پوچھا کہ ایک شخص کے ہاتھ کچھ حرام مال لگے ہیں؟ تو حضرت عطاء بن ابی رباح علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ اسے مال حرام کو اس کے مالک کو واپس لوٹادینا چاہئے، اگراس کے مالک کا پتہ نہ چلے تو اس مال حرام کو صدقہ کرے اور مجھے پتہ نہیں کہ اس کا صدقہ کرنا بھی اسے گناہ سے بچاسکتاہے)۔

یہ وہ آثار اور فقہی عبارتیں ذکر کی گئی ہیں جن میں یہ صراحت تھی کہ ایسا شخص جس کی پوری پونجی حرام کاروبار سے حاصل ہوئی ہوتو اسے سارے مال حرام کو اپنی ملکیت سے نکالنا اور صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہے۔

اب ذیل میں وہ فقہی عبارات ذکر کی جاتی ہیں جن سے کچھ نہ کچھ ایسے شخص کیلئے گنجائش نکلتی ہے جو دراصل امام کرخی کا قول ہے،جنہوں نے کچھ صورتیں ذکر کی ہیں جس سے کچھ گنجائش اور جواز کا ثبوت ملتاہے اور لوگوں سے حرج کو دور کرنے کیلئے بعد کے لوگوں نے امام کرخی کے قول پر فتویٰ دیا ہے، چنانچہ علامہ شامی نقل کرتے ہیں:

''ایک شخص حرام طریقہ سے مال کماتاہے، پھر اس سے خریداری کرتاہے تو اس کی پانچ صورتیں ہیں: (۱) بائع کو حرام رقم پہلے پیش کردی جائے پھر اس کے ذریعہ خریداری کی جائے، (۲) حرام رقم کی طرف اشارہ کردیا جائے اور اس کے ذریعہ خریداری کرلی جائے، پھر وہی رقم بائع کو دی جائے، (۳) حرام رقم کی طرف اشارہ کردیا جائے، اور اسی کے ذریعہ خریداری کرلی جائے،لیکن بعد میں دوسری رقم ادا کی جائے، (۴) مطلقاً خریداری کا معاملہ کیا جائے پھر حرام رقم سے ثمن ادا کیا جائے، (۵) بائع کو دوسری رقم دکھلادی جائے اور اسی کے ذریعہ خریداری بھی ہو،لیکن ثمن کی ادائیگی حرام رقم سے ہو، ابو نصر فرماتے ہیں کہ اس کیلئے جائز ہے اور پہلی صورت کے علاوہ اس پر صدقہ کرنا واجب نہیں ہے اور یہی رائے ابواللیث فقیہ کی

بھی ہے،لیکن یہ ظاہر الروایہ کے خلاف ہے اور امام کرخی نے فرمایا پہلی اور دوسری صورت میں جائز نہیں ہے اور واخیر کی تینوں صورتوں میں جائز ہے اور ابوبکر فرماتے ہیں کہ کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے،لیکن فتویٰ اب امام کرخی کے قول پر ہے لوگوں سے حرج کو دور کرنے کیلئے'' (ردالمحتار ۷/ ۴۹۰،طبع زکریا)۔

''**وفی الولوالجیة: وقال بعضهم لایطیب فی الوجوه کلها وهو المختار لکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعاً للحرج لکثرة الحرام**'' (شامی:۷/ ۴۹۰ شامی)۔

(اور ولوالجیہ میں ہے کہ بعض لوگوں نے کہا تمام صورتوں میں ناجائز ہے اور یہی مختار اور پسندیدہ ہے،لیکن آج فتویٰ امام کرخی کے قول پر ہے حرج کو دفع کرنے کیلئے اور حرام کی کثرت ہوجانے کی وجہ سے)۔

احیاء علوم الدین میں ابوحامد الغزالی لکھتے ہیں:

'' جب کسی کے ہاتھ میں کچھ ایسا مال آجائے جس کے مالک کا پتہ نہ ہو اور ہم نے اس کیلئے جائز قرار دیا ہے کہ فقراء اور مفلسی کی وجہ سے حاجت وضرورت کے بقدر لے لے،حاجت بقدر (اس کا معیار کیا ہے)اس میں نظر ہے (غور کرنے کی ضرورت ہے)،کچھ لوگوں نے کہا کہ اتنی مقدار لے لے کہ خود اس کیلئے اور اور اس کے اہل وعیال کیلئے ایک سال تک کافی ہوجائے اور اگر جائیداد خریدنے کی یا تجارت کرنے کی قدرت رکھتا ہو جس سے اپنے بال بچوں کیلئے کسب معاش کرسکتا ہو تو کرے اور یہ محاسبی کا اختیار کردہ ہے،لیکن انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر اپنے اندر توکل کی قدرت رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم اور اس کی مہربانی سے مال حلال کا منتظر رہ سکتا ہو تو پورے مال کا صدقہ کردے اور اگر اپنے اندر وہ اس کی قدرت واستطاعت نہیں پاتا تو اس کیلئے جائز ہے کہ جائیداد خریدے اور سرمایہ کاری اور رأس المال جمع کرے اور دستور کے مطابق فارغ البالی اور آسودگی کی زندگی گذارے اور جس دن اسے مال حلال میسر ہوجائے تو اس دن ان مالوں کے استعمال کرنے سے گریز کرے، پھر جب مال حلال ختم ہوجائے تو ان مالوں کو استعمال کرے پھر جب حلال مال حاصل ہونے لگے تو جو کچھ ان مالوں سے پہلے خرچ کر چکا ہے اسی کے برابر صدقہ مال حلال سے کردے (احیاء علوم الدین ۲/ ۱۹۰،۱۹۱)۔

۳-شوہر یا بیٹے کے حرام مال سے بیوی یا ماں کے اخراجات کا حکم:

ایسی صورت میں جبکہ شوہر یا بیٹا ماحول کی وجہ سے حرام کمائی کررہے ہیں اور منع کرنے کے باوجود حرام کمائی سے باز نہیں آرہے ہیں تو ماں اور بیوی کیلئے جب کسی طرح حلال روزی کا انتظام نہ ہوسکے تو مجبوراً دفعاً للحرج اس مال خبیث سے استعمال کی گنجائش ثابت ہوتی ہے،اس کیلئے اس مال حرام سے انکار قلب کے ساتھ استعمال کرنا جائز ہوگا اور اس کسب حرام کا گناہ شوہر یا بیٹے پر ہوگا،جیسا کہ علامہ شامی نے اس کو ذکر کیا ہے:

"اشتری الزوج طعاماً أو کسوة من مال خبیث جاز للمرأة أکله ولبسها والإثم علی الزوج" (شامی ۹/۷۹ ۲، کتاب الغصب)۔

(شوہر نے مال حرام سے کھانا یا کپڑا خریدا تو عورت کیلئے اس کا کھانا، پہننا جائز ہے اور گناہ شوہر پر ہوگا)۔

مذکورہ بالا مسئلہ کی اس عبارت سے پوری طرح وضاحت ہوگئی کہ جس طرح بیٹے کیلئے مال حلال سے عاجز ہونے یا اس پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اس کے حق میں اضطراری حالت کا حکم مان کر اس کیلئے باپ کے مال حرام سے انتفاع کا جواز ثابت ہو رہا ہے، اسی طرح ماں اور بیوی کیلئے بیٹے اور شوہر کے مال خبیث سے بدرجہ مجبوری انتفاع کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

امام ابوحامد الغزالی لکھتے ہیں:

"إنّ له أن یتصدق علی نفسه وعیاله إذا کان فقیراً أما عیاله وأهله فلایخفی لأن الفقر لا ینتفی عنهم بکونهم من عیاله وأهله بل هم أولی من یتصدق علیهم" (إحیاء علوم الدین ۲/۱۸۹)۔

(اس کیلئے جائز ہے کہ اپنے اوپر اور اپنے عیال کے اوپر جبکہ وہ فقیر ہوں صدقہ کرے، بہرحال اس کے اہل وعیال تو مخفی نہیں، اس لئے کہ فقر ان سے منتفی نہیں ہوسکتا، ان کے اس کے اہل وعیال ہونے کی وجہ سے، بلکہ وہ صدقہ کئے جانے کے زیادہ حقدار ہیں اور رہا اس کا مسئلہ تو وہ بھی اس میں سے اپنی ضرورت کے بقدر لے گا، اس لئے کہ وہ بھی فقیر ہے)۔

۴-مشتبہ مال کے مالک کی دعوت میں شرکت کا حکم:

جس بستی کے لوگ زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہیں اور شادی وغیرہ کے موقع سے دعوت دیتے ہیں، جبکہ یہ معلوم نہیں کہ ان کی پوری کمائی حرام ہے یا آدھی حرام اور آدھی حلال تو ایسی دعوت میں شرکت کے حکم کے متعلق روایات وآثار سے شرکت کا جواز ثابت ہوتا ہے، چونکہ اس بات کا امکان ہے کہ قرض وغیرہ لے کر یا کسی اور طریقہ سے مال طیب حاصل کر کے دعوت کر رہے ہوں؛ جیسا کہ ہندیہ میں ہے:"أن ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه" (کہ اس کو حلال مال وراثت میں مل گیا ہو یا حلال مال کسی سے قرض لیا ہو) اور اگر کچھ بھی پتہ نہ چلے تو آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت قبول کر لینا چاہئے، باقی اس کا گناہ داعی کو ہوگا اور اگر یہ یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ دعوت مال حرام سے ہو رہی ہے تو پھر دعوت قبول نہ کرے۔

مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

"جاء إلیه رجل فقال: إن لی جاراً یأکل الربو وأنه لایزال یدعونی؟ فقال: مهناء لک، قال سفیان: إن عرفته بعینه فلاتصبه" (مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث ۱۴۷۵۶)۔

(میرے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ میرا پڑوسی سود خور ہے اور برابر وہ مجھے دعوت دیتا رہتا ہے، تو عبداللہ ابن

مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تمہارے لئے تو مزا ہے، حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں یقینی طور پر معلوم ہو جائے (کہ مال حرام ہی سے دعوت ہو رہی ہو) تو اس میں شرکت نہ کرو)، صاحب نہایہ نے "مھنـاء" کا معنی ومفہوم (کـل أمـر یأتیک من غیر تعب فھو ھنیٔ) سے ذکر کیا ہے کہ ہر وہ چیز جو بغیر تکان کے حاصل ہو جائے وہ مزے دار ہے۔

۵- دعوت کھانے کے بعد داعی کے مال میں حلت وحرمت کے اشتباہ کا حکم:

ایسے آدمی کی دعوت میں شرکت کرنا اور کھانا جس کے بارے میں پہلے سے معلوم نہیں ہے کہ اس کا کاروبار بالکل حرام ہے؛ بعد میں ظاہر ہوا کہ کاروبار حرام ہے، اگر دعوت کا کھانا پورا حرام ہی مال سے ہو تب تو قبول کرنا جائز نہیں ہے اور اگر مال کا اکثر حصہ حلال ہو اور حرام مغلوب ہو تو غالب کا اعتبار کرتے ہوئے ایسی دعوت کھانے کی گنجائش فقہاء ذکر کرتے ہیں، چونکہ لوگوں کے مال تھوڑے حرام سے بھی خالی نہیں ہیں، اس لئے جس دعوت میں حلال غالب ہو تو اس کے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، فتاوی قاضی خان میں:

"**إن کـان غـالـب مـال المھدی من الحلال لابأس بأن یقبل الھدیة ویأکل مالم یتبین عنده أنه حـرام لأن أمـوال الـناس لاتخلوعن قلیل حرام فیعتبر الغالب، وإن کان غالب مال المھدی من الحرام ینبغی له أن لا یقبل الھدیة ولا یأکل من طعامه مالم یخبر أنه حلال**" (قاضی خان ۳/۲۸۹، کتاب الحظر والإباحۃ)۔

ان عبارات فقہیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کی دعوت کھانا جو حرام کاروبار کرتا ہے لیکن کاروبار کا اکثر حصہ حلال طریقہ پر ہے اور کچھ حصہ حرام طریقہ پر ہے تو غالب مال کا اعتبار کرتے ہوئے جائز ہے، البتہ اس صورت میں جب دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا پورا کا پورا کاروبار حرام ہے، اب چونکہ لاعلمی میں حرام دعوت کھالیا ہے تو اس کی تلافی کی صورت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر وہ مالدار ہو تو جو مال حرام کھایا ہے اس کا اندازہ کر کے اسی کے برابر صدقہ کر دے۔

۶- مال حرام کو حلال میں بدلنے کا حیلہ:

مال حرام کو حلال بنانے کا کوئی حیلہ مفید وکارگر نہیں، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا وہ حلال ہو جائے گا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا، جیسا کہ امداد الفتاویٰ/ ۴ ۴۴۱ (مطبوعہ دار العلوم کراچی) پر ہے، لیکن اس حیلہ سے حکم میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پڑتا ہے کہ ایک ہے بعینہ مال حرام سے کھانا جو اشد درجہ کا گناہ ہے بنسبت اس مال حرام کے جو قرض لے کر کھایا جائے، اگرچہ مال حرام سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ہوگا، لیکن یہ اس کے مقابلہ میں اہون ہے۔

لہٰذا کسی مکروہ یا حرام سے بچنے کیلئے کوئی شرعی حیلہ اختیار کیا جائے تو جائز ہے، ایسے حیلہ کا جواز خود قرآن کریم سے ہوتا ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کے واقعہ میں مذکور ہے "وَ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهٖ وَ لَا تَحْنَثْ" (پکڑا اپنے ہاتھ میں سینکوں کا مٹھا بھر پھر اس سے مار لے اور اپنی قسم میں جھوٹا نہ ہو)۔

ہندیہ میں ہے:

"والحيلة في هذه المسائل أن يشترى نسية ثم ينقد ثمنه من أى مال شاء وقال أبويوسف رحمه الله تعالى سألت أباحنيفة رحمه الله تعالىٰ عن الحيلة فى مثل هذا فأجابنى بما ذكرنا ،كذا فى الخلاصة" (ھندیۃ ۵/ ۳۴۲، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)۔

(ان مسائل میں حیلہ یہ ہے کہ ادھار خرید لے اور ثمن جس مال سے چاہے ادا کرے، امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے اس طرح کی چیزوں کے بارے میں حیلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے وہی جواب دیا جو ہم نے ذکر کیا، اسی طرح خلاصہ میں ہے)۔

۷- مال حلال نہ ملنے کی صورت میں اپنے مال حرام کو بطور قرض لینے کا حکم:

ایسا شخص جس کے پاس حرام کمائی کا مال ہے اور وہ اسے صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن اسے تجارت کرنے کیلئے قرض کے طور پر مال حلال مل نہیں رہا ہے تو ایسے شخص کیلئے کوئی ایسا حیلہ اور تدبیر اختیار کرنا جس سے وہ حرام سے چھٹکارا پا سکے یا کوئی حلال کا راستہ نکل آئے جائز ہے اور مستحسن بھی ہے، جیسا کہ ہندیہ کی اس عبارت سے واضح ہے، لہٰذا مذکورہ شخص کیلئے اپنے مال سے ہی خود قرض لے کر کاروبار کر کے پیسہ کمانے کے بعد اصل قرض کو صدقہ کر دینا جائز ہے۔

"وكل حيلة يحتال بها الرجل يتخلص بها عن حرام أو يتوصل بها إلى حلال فهى حسنة"
(ھندیۃ ۶/ ۳۹۰، الفصل الأول فی بیان جواز الحیل وعدم جوازھا)۔

۸- مخلوط مال والے کے یہاں ملازمت کرنے کا حکم:

ایسے شخص کے پاس کام کرنا جس کا بزنس آدھا حلال اور آدھا حرام دونوں طرح کا ہے جس میں دونوں کے متعلق کام کرنا پڑتا ہے تو اس میں کام کرنے والے کی تنخواہ شریعت کے اصول "**إذ اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**" کے اطلاق کی وجہ سے حرام ہے؛ دفع حرج کیلئے غالب کا اعتبار کیا گیا ہے جو شریعت کا ایک دوسرا اصول ہے کہ اگر مال حرام اور حلال سے مخلوط ہو اور حرام مال زیادہ ہو تو اس سے تنخواہ یا ہدیہ لینا جائز نہیں، لیکن اگر حرام مال کم ہو تو جائز ہے، مذکورہ صورت میں مال

حرام وحلال سے مخلوط تو ہے لیکن حرام کا غلبہ نہیں ہے اور قاعدہ ہے کہ اصل اباحت ہے اور یقین شک سے زائل نہیں ہوتا، اس لئے جب تک حلال کا غیر غالب نہ ہونا یقیناً نہ معلوم اس مخلوط سے تنخواہ لینا حلال ہے، جیسا کہ امداد الفتاویٰ ۴/ ۱۷ پر ہے:

''لہٰذا مذکورہ صورت میں اس شخص کے پاس کام کرنا اور تنخواہ لینا جائز ہے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے:

"إن كان غالب ماله من الحلال فلابأس إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لايقبل الهدية ولايأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل.

ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب في مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب'' (ھندیہ ۵/ ۳۹۶، الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات)۔

لہٰذا صورت مذکورہ میں چونکہ حرام کا غالب ہونا یقینی ہی نہیں ہے کہ استئجار علی المعاصی لازم آئے، بلکہ قاعدہ فقہیہ الیقین لایزول بالشک کی بناء پر صورت مذکورہ بالا میں ایسے آدمی کے یہاں کام کرنا اور مال مخلوط سے تنخواہ لینا درست وجائز ہے۔

اور جس طرح اجارہ منفعہ مباحہ پر درست ہے اور معاصی پر درست نہیں ہے، اسی طرح معقود علیہ کا مقدور الاستیفاء ہونا حقیقۃً اور شرعاً ضروری ہے، لہٰذا اگر بھگوڑے غلام کو اجرت پر لیا جائے تو استئجار درست نہ ہوگا، کیونکہ اس کی منفعت مقدور الاستیفاء نہیں ہے اور اسی طرح مذکورہ مسئلہ میں حرام کے غالب نہ ہونے کی وجہ سے استئجاء علی المعاصی کا بھی تحقق نہیں ہوا کہ معقود علیہ شرعاً غیر مقدور الاستیفاء ہونے کی وجہ سے استئجار درست نہ ہو، جیسا کہ ہندیہ میں ہے:

"ومنها: أن يكون مقدور الاستيفاء حقيقة أو شرعاً فلايجوز استيجار الابق ولا الاستيجار على المعاصي لأنه استيجار على منفعة غير مقدور الاستيجار شرعاً'' (ھندیہ ۴، کتاب الإجارۃ/ شرائط الصحۃ)۔

اس لئے شریعت کا ضابطہ ہے کہ اگر ایک مال حلال اور حرام سے مخلوط ہو اور حرام مال زیادہ ہو تو اس سے تنخواہ یا ہدیہ لینا جائز نہیں، لیکن اگر حرام مال کم ہو تو جائز ہے کی بناء پر مذکورہ صورت میں ایسے شخص کے یہاں کام کرنا اور تنخواہ لینا جائز ہے۔

ہندیہ میں ہے:

۹-حرام کمائی سے تیار کردہ جائیداد سے انتفاع کا حکم:

حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کھیتی باڑی کرنا اور اس کی پیداوار کا استعمال جائز وحلال ہوگا، لیکن اصل مال جو حرام طریقہ سے حاصل ہوا تھا اس کو اصل مالک کی طرف اگر معلوم ہو تو لوٹانا ضروری اور لازم ہے اور اگر مالک کا پتہ نہ ہو تو پھر اس اصل مال کو بلا نیت ثواب فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔

صورت مسئلہ میں جوحرام مال سے جائیداد خریدی گئی ہے اگر اصل مالک معلوم ہوتو ان حرام مال کے بقدر رقم واپس لوٹادی جائے، بصورت دیگر معلوم نہ ہونے کی صورت میں صدقہ کردیا جائے اوران جائیداد میں جوکھیتی باڑی کا عمل کیا گیا وہ ناجائز وحرام نہ ہوگا، بلکہ حلال وجائز ہے، جیسا کہ علامہ شامی نے ذکر کیا ہے۔

لہٰذا صورت میں مذکورہ میں حرام کمائی کرنے والے کے گھر نوکری کرنا، ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا، ان کے بچوں کی مدرسہ یا اسکول کی ان سے فیس وصول کرنا جائز ہے۔

۱۰-سودی رقم کو بطور رشوت دینے کا حکم:

مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے یہ جوایک خطیر رقم رشوت کی دے کر لی جاتی ہے اوراس میں سودی رقم کا استعمال کیا جاتا ہے تو یہ سودی رقم کا رشوت میں دینا شرعاً درست وجائز نہیں، اس لئے کہ سود کی رقم یا تو مالک (بینک یا حکومت وغیرہ) کولوٹانا ضروری ہے یا پھر غریبوں مسکینوں کو بلانیت ثواب دے دینا ضروری ہے اور رشوت جودی جاتی ہے وہ افسران کے جیب میں جاتی ہے، حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضہ میں نہیں جاتی ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں ان چیزوں کیلئے رشوت میں سودی رقم دینا جائز نہیں ہے، شامی میں ہے:

"ویردونها علی أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه" (شامی ۹/ ۵۵۳، کتاب الحظر والإباحة/ باب الاستبراء)۔

۱۱- کثرت سے سودی کاروباری تاجروں سے ہدیہ وغیرہ قبول کرنے کا حکم:

جس بستی میں لوگ بکثرت سودی کاروبار میں ملوث ہوں اور ہدیہ دینے پر ان سے ہر مرتبہ پوچھنا کہ یہ مال حلال سے ہے یا حرام سے ناگواری اور اختلافات کا سبب بنتا ہے، اسی طرح ان کا بچوں وغیرہ کو ٹافی دینا، پانی پلانا اور دیگر دوسری اشیاء ضروریہ کے ذریعہ مدد کرنا جبکہ یہ معلوم بھی نہیں کہ اس کی کمائی کیسی ہے؟ حرام ہونے کا بھی امکان ہے تو ایسی صورت میں ان چیزوں کو لینے اور استعمال کرنے کے حکم کے تعلق سے شریعت مطہرہ کے اصول کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لینے اور استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی، بلکہ درست وحلال ہے، شریعت کا جواصول ہے کہ اگر غالب حرام ہوتو اس صورت میں لینا اور استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور اگر حرام غالب نہ ہو، بلکہ حلال کا غلبہ ہوتو اس صورت میں جائز اور درست ہے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے:

"إن کان الغالب ماله من الحلال فلابأس إلا أن یعلم بأنه حرام فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی

أن لايقبل الهدية ولايأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل۔

ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب فی مالهم الحرمة إلاإذا علم إن أكثر ماله حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلابأس به لأن أموال الناس لا تخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب" (ھندیہ ۵/۳۹۶،الباب الثانی عشر فی الھدایاوالضیافات)۔

۱۲-حرام کمائی کرنے والوں کیلئے دعا کرنے کا حکم:

جومسلمان ایسی دعا کرتا ہے جس میں نہ تو کوئی گناہ ہواور نہ قطع رحمی ہوتو اس کی اجابت کی تین صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اسے مطلوبہ ومسئولہ چیز سے اللہ رب العزت نواز دیتا ہے، دوسرے یہ کہ اللہ رب العالمین اس کے عوض اس سے بڑھ کر نعمت عطاءفرمادیتے ہیں، مثلاً پیش آمدہ آفات وبلیات کا اس کے عوض ازالہ فرمادیتے ہیں، تیسرے یہ کہ اس کیلئے آخرت کے واسطہ ذخیرہ فرمادیتے ہیں۔

"عن أبی سعيد الخدری ؓ عن النبی ﷺ قال: ما من مسلم يدعو بدعوة ليس فيها إثم ولا قطيعة رحم إلا أعطاء الله بها إحدى الثلاث إما أن يعجل له دعوته و إما أن يوخرها فی الآخرة و إما أن يكف عنه من الشر مثلها" (مسند أحمد رقم الحدیث:۱۱۱۳۳)۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا جو دعا معصیت والی نہ ہوتو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتے ہیں، لہٰذا صورت مسئولہ کا حکم حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ ہے کہ اگر کوئی حرام کمائی کرنے والا کسی سے دعا کیلئے کہتا ہے تو اس کیلئے اس کے حق میں دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس کو دعاء دینے میں کوئی معصیت نہیں ہے۔

☆☆☆

تیسرا باب

مختصر تحریریں

حرام کمائی سے متعلق مسائل

ڈاکٹر قاری ظفر الاسلام صدیقی ☆

حضرت مولانا عتیق احمد صاحب زید مجدہ کا مضمون ''غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کے مسائل'' شمارہ بحث ونظر ۱۴/ ۵۲، جنوری تا مارچ جلد ۴/ ۱۳، ص: ۱۹ تا ۴۱ بڑا ہی پُر مغز، چشم کشا اور اس سلسلہ میں انتہائی جامع ہے، دار الاسلام دار الکفر دار الامن والشر کے تعلق سے اکابرین متقدمین کی آراء اور نصوص فقہاء سے دور حاضر کا مسئلہ ثابت فرمایا ہے، شیخ عبد القادر بغدادی متوفی ۴۲۹ دار الاسلام اور دار الکفر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہر وہ ملک دار الاسلام ہے جس میں باشندگان ملک کے درمیان اسلام کی دعوت، معاہدہ، پناہ اور جزیہ دیئے بغیر نمایاں ہوجائے اور اس ملک میں مسلمانوں کا حکم ذمیوں پر جاری ہو اگر اس ملک میں ذمی پائے جاتے ہوں؟ اور اس ملک میں اہل بدع اہل سنت پر غالب نہ ہوں اور اگر معاملہ مذکورہ امور کے برعکس ہو تو وہ دار الکفر ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ دار الکفر کے متصل مسلمانوں کا ملک ہو، جیسے پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ تو وہ دار الکفر نہ کہلائے گا۔

دور حاضر میں بھی اگر کسی ملک کے مسلمانوں پر دین کی بنیاد پر ظلم کیا جارہا ہو، ان کے لئے دین وایمان بچانا مشکل ہورہا ہو اور مسلمانوں کے لئے اپنا تحفظ ممکن نہ ہو اور ایسا ملک ہو جہاں وہ اپنا دین وایمان جان ومال، عزت وآبرو بچا سکتے ہوں تو ان کے لئے ہجرت واجب ہوگی، لیکن تمام غیر مسلم ممالک سے ہجرت کو موجودہ حالات میں واجب قرار دینا درست نہیں ہے؛ کیونکہ اکثر ممالک میں انہیں امن وامان حاصل ہے، مذہب میں عمل کرنے میں آزاد ہیں، معاشی ترقی کے وسیع امکانات بھی موجود ہیں'' (بحث ونظر ۳۳)، حضرت تھانوی نے بیاض اشرفی میں ایک استفتاء اور اس کا جواب نقل کیا ہے، فتوی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب بذل المجہود کے قلم سے ہے، مظاہر علوم کے کئی اساتذہ نے اس پر تائیدی دستخط ثبت فرمائے ہیں، حضرت تھانوی نے اسے پسند فرما کر اپنی بیاض میں نقل فرمایا، الجواب ''زید کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ جو اہل اسلام کفار کی حکومت میں رہتے ہیں وہ مصیبتوں میں سے ایک مصیبت میں گرفتار ہیں، اگر سیاسی محکموں میں مراتب حاصل کریں اور عہدے قبول کریں تو من لم یحکم میں داخل ہوں گے، ورنہ دنیا کے آگے عضو معطل ہوکر رہ جائیں گے، عضو معطل سے بڑھ کر

☆ رکن اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا وسابق شیخ الحدیث دار العلوم مئو

بیکار ثابت ہوں گے اوران پر ہجرت فرض ہے۔

ہمارے نزدیک زید کا خیال غلط ہے، اول شق میں یہ تسلیم نہیں کہ سرکاری تمام ملازمتیں کے لئے حکم خلاف ما انزل اللہ ضروری ہو؛ بلکہ بہت سے ایسے محکمے ہیں جن میں حکم ہی نہیں یا شریعت کے مطابق جائز اور شرعی حکم ہو، نیز دوسری شق میں یہ خیال بھی غلط ہے، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مراتب یعنی عہدے حاصل نہ کرنے کی صورت میں عضو معطل اور بے کار ہونے کی وجہ سے اگر دنیاوی اعضاء سے مراد ہے تو ظاہر ہے غلط ہے، کیونکہ زراعت، تجارت، حرفت اور دنیاوی کاروبار کر سکتے ہیں، اگر دینی اعتبار سے مراد ہو تو غلط ہونا بہت ہی زیادہ روشن ہے، جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، ان معروضات کی روشنی میں کہ جمعہ و جماعت نماز عید و دیگر شعائر اقامت دین و دعوت دین میں کبھی بھی کسی زمانہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، اس لئے انگریزوں کی عملداری سے قبل اور مابعد کما یا ہوا یکساں ہے، دونوں آمدنی کا حکم یکساں ہوگا، بلاشبہ صدقات و نافلہ دونوں سے بلاتفریق ادا کی جاسکتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد مذکورہ سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں:

۱-اس کی کمائی حلال ہے، اگر سابقہ ریکارڈ سے کچھ پتہ نہ چل رہا ہو۔

۲-واقعتاً غریب آدمی لاچار اور مفلس کو اضطرار اگنجائش ہوگی۔

۳-میرے خیال میں معاملہ اس کے اضطرار کا ہے، وہ جو کچھ خرچ کرتا ہے کرے؛ لیکن توبہ اور استفسار بھی کرتا رہے اور کسی طرح اس سے نکلنے کی کوشش کرے۔

۴-اگر کسی طرح کے انتشار یا فساد کا باعث نہ ہو تو احتیاط کرے، ورنہ شریک ہو جائے۔

۵-کسی غیر مسلم یہودی، عیسائی سے قرض لے لے اور قرض میں یہ سودی رقم اسے دیدے۔

۶-تجارت کے لئے کوئی بھی غیر مسلم تیار ہوسکتا ہے، آپ اس کو یہ پیسہ تجارت کے لئے دیدیں اور پھر اس سے کہہ دیں، یہ تجارت تمہاری ہے، تم اتنی رقم مجھے دیدو۔

۷-مسئولہ طریقہ درست نہیں معلوم ہوتا۔

۸-نتیجہ ارذل کے تابع ہوگا، اس کاروبار میں ملوث ہونا جائز نہیں بالکل حرام ہے۔

۹-اگر جائز دوسری آمدنی نہ ہو تو اضطرار ا یہ ساری چیزیں درست ہیں، مگر میرے نزدیک توبہ اور استغفار بھی کرنا چاہئے، امام الحرمین علامہ جوینی کی غیاث الظلم فی التیاث الظلم میں ہے کہ حرام بالکل عام ہو جائے تو پھر بقدر ضرورت استعمال کرے گا (توبہ واستغفار میری رائے ہے)۔

۱۰-یہ صورت ناجائز ہے، اس میں اپنا انتفاع بھی ہے۔

۱۱-اس کا استعمال درست ہے، پوچھا نہ جائے، ورنہ طرح طرح کے مفاسد اور شر کے ابواب قائم ہوں گے، ہاں اپنے طور پر یا دیگر سورسیس کی بنیاد پر حرام کی کمائی کا تیقن ہوسکتا ہے تو احتیاط کرسکتا ہے۔

۱۲-حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے پاس انگریز اور ان کی عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر دم کرانے آتیں تھیں، حضرت بطیب خاطر دم کردیا کرتے تھے۔

☆☆☆

حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل

مفتی حبیب اللہ قاسمیؔ ☆

۱۔صورت مسئولہ میں جب وہ آدمی فی الحال حلال کاروبار کررہا ہے تو اس کی کمائی حلال ہے، رہا یہ معاملہ کہ اس کے آباء واجداد حرام کاروبار میں ملوث تھے اور شخص مذکور کو وہ حرام مال وراثت میں ملے ہیں اور یہ معلوم نہیں کہ وہ حرام مال یعنی سودی رقم آزادی سے قبل کے کمائے ہوئے ہیں یا آزادی کے بعد کے اس خلجان کا حل یہ ہے کہ وہ حساب لگائے کہ وراثت میں مجھے کیا اموال ملے تھے، اس کی مقدار کیا تھی اور اب میرے کاروبار کی مالیت اور مقدار کیا ہے تو جو اموال وراثت میں ملے تھے تو چونکہ وہ سودی کاروبار کی وجہ سے حرام تھے اور مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ اس کے مالک تک کسی بھی عنوان سے پہنچا دیا جائے اور اگر مالک موجود نہ ہوں یا اس کا پتہ لگانا دشوار ہو تو غرباء کو بلا نیت ثواب رفع وبال کے لئے صدقہ کردے۔

"لو مات رجل و كسبه من بيع الباذق أو الظلم أو أخذ الرشوة يتورع الورثة ولايأخذوا منه شيئاً وهو أولى لهم و يردونها علي أربابها إن عرفوهم، و إلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد علي صاحبه" (تبیین الحقائق" کتاب الکراہیۃ فصل فی البیع زکریا ۷/ ۶۰)۔

"و إذا كان في ماله حلال و حرام واختلط لم يحرم الحلال بل له أن يأخذ قدر الحلال كما لو كان المال لشريكين فاختلط مال أحدهما بمال اٰخر فإنه يقسم بين الشريكين و كذلك من اختلط بمال الحلال و الحرام أخرج قدر الحرام و الباقي حلال له" (فتاوی ابن تیمیہ ۲۹/ ۲۷۷)۔

۲۔جب غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائداد اور مال، حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے تو اس کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں، کیونکہ مال حرام کا اصل حکم یہ ہے کہ اس کے مالک تک پہنچا دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کو غرباء وفقراء پر بلا نیت ثواب صدقہ کردیا جائے، رہا یہ معاملہ کہ حرام جائداد سے اس کو کرایہ مل رہا ہے تو فی نفسہ یہ کرایہ جائز ہے، اگرچہ اس کی جائداد حرام ہے (دلائل سوال نمبر ایک کے جواب میں گزر چکے ہیں)۔

☆ بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم، مہذب پور، اعظم گڈھ

۳۔صورت مسئولہ میں جب ماں اور بیوی بیٹے اور شوہر کو حرام طریقہ پر کمانے سے روک رہی ہیں، لیکن پھر بھی یہ باز نہیں آ رہے ہیں اور غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو اگر وہ خاتون کچھ ذریعہ معاش شرعی حدود میں رہتے ہوئے اختیار کر سکتی ہے تو کرے، ورنہ بدرجۂ مجبوری بادل ناخواستہ اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ رہے، شرعاً وہ گنہگار نہ ہوگی، لیکن خوبصورت پیرایہ اور بہتر اسلوب میں حتی المقدور تذکیر و نصیحت کرتی رہے اور اللہ رب العزت سے دعاء بھی کرے، إن شاء اللہ رب العالمین انقلاب لائے گا اور مرد حضرات راہ راست پر آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**و ذکر فإن الذکریٰ تنفع المومنین**'' (سورۂ ذریٰت، آیت:۵۵)، اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فإن لم یستطع فبلسانہ فإن لم یستطع فبقلبہ و ذالک أضعف الإیمان**'' (رواہ مسلم)۔

ردالمحتار میں ہے: ''**اشتری الزوج طعاما أو کسوۃ من مال خبیث جاز للمرأۃ أکلہ و لبسھا و الإثم علی الزوج**'' (شامی، ۱۹۱/۶)۔

۴۔ جب اکثر بستی والے شادی بیاہ زیادہ تر اپنی بستی کے اندر ہی کرتے ہیں اور زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہیں تو ان کی دعوت میں کھانا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ تعاون علی المعصیت کے قبیل سے ہے جس کی ممانعت نص قطعی سے ثابت ہے: ''**وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**'' (سورہ مائدہ، آیت:۲)، خواہ ان کی پوری کمائی حرام ہو یا آدھی حرام اور آدھی حلال ہو، دونوں کا حکم یکساں ہے کہ ایسی دعوت میں شرکت جائز نہیں۔

۵۔ اولاً کوئی بھی دعوت دے تو داعی کی دعوت کی نوعیت اور اس کی کمائی کے متعلق معلومات کر لینا ضروری ہے، اس کے بعد اس کی دعوت قبول کرنی چاہئے، بلا تحقیق و بلا معلومات دعوت قبول کرنے میں مختلف شرعی قباحتیں موجود ہیں، صورت مسئولہ میں بلا تحقیق کسی کے یہاں دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ فلاں شخص کی کمائی اور کاروبار بالکل حرام ہے تو اس فعل پر کھانے والے شخص کو توبہ و استغفار کرنا چاہئے اور آئندہ کے لئے احتیاط برتنا چاہئے۔

قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے: ''**یا أیھا الذین آمنوا کلوا من طیبات مارقناکم واشکروا للہ**'' (بقرہ:۱۷۲)، دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**یا أیھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا**'' (سورہ مومنون، آیت جزء: ۵۱)، اور حدیث شریف میں موجود ہے کہ مسافر کی دعاء قبول ہوتی ہے، لیکن اگر اس کی غذاء اور لباس حرام ہو تو اس کی دعاء رد کر دی جاتی ہے۔

۶۔جی ہاں پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کا حیلہ اور طریقہ یہ ہے کہ جتنے حرام مال اس نے کمائے ہیں اصل مالک تک اس کی واپسی اور رسائی ممکن ہو تو واپسی کردے اور اگر رسائی ممکن نہ ہو تو وہ مال حرام فقراء پر بلانیت ثواب صدقہ وخیرات کردے: "**ویردونها علی أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه**" (ردالمحتار ۶/۳۸۵)۔

"**صرح الفقهاء بأن من اکتسب مالابغیر حق (إلی قوله) یجب علیه أن یرده إلی مالکه إن وجد المالک وإلا ففی جمیع الصور یجب علیه أن یصدق بمثل تلک الأموال علی الفقراء** (بذل المجہود، کتاب الطہارۃ، باب فرض الوضوء سہارنفور، ۱/۳۷، الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۳۴/۲۴۶، شامی زکریا ۹/۵۵۳، البحر الرائق زکریا ۹/۳۶۹)۔

۷۔مذکورہ حیلہ شرعاً جائز نہیں کہ حرام مال کو خود قرض لے اور کاروبار میں لگا کر زیادہ پیسہ کما کر اصل قرض کو ادا کردے اور یہ کہنا کہ تجارت کے لئے حلال مال ملنے کا امکان نہیں، قابل تسلیم نہیں، کیا تجارت کی غرض سے سودی قرض لینا شرعاً جائز ہے؟ ظاہر ہے کہ جائز نہیں، یہ دنیا عارضی ہے، حتی الامکان حتی المقدور حرام سے احتراز واجتناب لازم ہے، قرآن کریم میں حرام کمائی کی ممانعت صراحتاً وارد ہے: "**یا أیها الذین آمنوا لاتأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم**" (سورہ نساء، آیت:۲۹)، "**أحل الله البیع و حرم الربوا**" (سورہ بقرہ:۲۷۵)۔اور "**و تعاونوا علی البر و التقوی و لا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (سورہ مائدہ:۲)۔

۸۔مذکورہ صورت میں جبکہ کسی آدمی کی تجارت آدھی حرام اور آدھی حلال ہے اور اس میں اختلاط ہے، دونوں الگ الگ نہیں ہیں اور اس میں جو عملہ ہے وہ دونوں کا کام انجام دیتا ہے خواہ حساب وکتاب کا لکھنا یا لین دین کرنا یا وصولی وغیرہ تو یہ سب کام شرعاً جائز نہیں، کیونکہ حلت وحرمت دونوں کا اجتماع ہو رہا ہے اور اس سلسلہ میں فقہاء کا مشہور ومعروف ضابطہ ہے کہ حرمت کو ترجیح ہوتی ہے، نیز اس میں تعاون علی المعصیت بھی ہے جو صراحتاً ممنوع ہے: "**و تعاونوا علی البر والتقوی و لاتعاونوا علی الإثم والعدوان**" (سورہ مائدہ، آیت:۲)۔

۹۔اس سوال کے تحت چند اجزاء ہیں بالترتیب جوابات پیش خدمت ہیں:

(الف) حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد میں کھیتی باڑی کرنا شرعاً ممنوع ہے، کیونکہ حرام مال کا مصرف ماقبل میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ اس کو اصل مالک تک واپس کیا جائے اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو غرباء پر بلانیت ثواب صدقہ کردیا جائے۔

(ب) حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا جب کہ نوکر کو اس کی اطلاع ہو ایک طرح گناہ میں شرکت

اور تعاون وتائید ہے، لہٰذا نوکری کرنا کراہت سے خالی نہیں، البتہ اگر نوکری کرتا ہے تو اس کی آمدنی حلال ہے، کیونکہ وہ اپنے اوقات اور کام کی اجرت لے رہا ہے:"**و إن استأجره لينحت له طنبورا ..... ففعل طاب له الأجر**"۔

(ج) جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کی کمائی حرام ہے تو اس کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ انتفاع من مال الحرام ہے جو شرعاً جائز نہیں (مستفاد: احسن الفتاوی ۸/ ۱۰۴)۔

"**اشترى بالثوب المغصوب جارية يحرم عليه و طؤها حتى يدفع قيمة الثوب إلى صاحبه، إن الصحيح لايحل له الأكل ولا الوطؤ لأن في السبب نوع خبث**" (شامی کتاب الغصب زکریا ۹/ ۲۷۸)۔

"**صرح الفقهاء بأن من اكتسب مالا بغير حق أو بغير عقد كالسرقة والغصب والخيانة والغلول ففي جميع الأحوال المال الحاصل له حرام عليه**" (بذل المجہود سہارنپور ۱/ ۳۷)۔

(د) حرام کمائی والا شخص اپنے بچے کو اسکول یا مدرسہ میں داخل کرائے تو اس سے داخلہ فیس، تعلیمی فیس، خوراکی فیس وغیرہ لینا شرعاً جائز ہے، کیونکہ یہ داخلہ یا تعلیم یا خوراکی کی اجرت لی جارہی ہے جو شرعاً درست ہے، جیسا کہ شامی کی درج ذیل عبارت سے مفہوم ہوتا ہے:"**لو اٰجره دابة لينقل عليها الخمر أو اٰجره نفسه ليرعى له الخنازير يطيب له الأجر عنده و عندهما يكره**" (شامی، زکریا کتاب الحظر والاباحۃ ۹/ ۵۶۲)۔

۱۰۔ مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے کارپوریشن یا حکومتی متعلقہ اداروں کو رشوت دینا شرعاً جائز نہیں، وہ بھی سودی رقم سے یہ تو ظلم بالائے ظلم ہے، سود کا مصرف اس سے قبل کئی سوالات کے ذیل میں ذکر کیا جاچکا ہے، اگر حصول حق کے لئے رشوت دینے کی مجبوری ہو تو اپنے اصل مال سے دینے کی گنجائش ہے اور لینے والے کے لئے رشوت کا لینا کسی حالت میں بھی جائز نہیں:**لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**" (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیۃ ۳۴/ ۲۴۶)۔

اور شامی میں ہے:"**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه و ماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع**" (شامی کتاب الحظر والاباحۃ زکریا ۹/ ۶۰۷)۔

۱۱۔ جب کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر حلال وحرام کے سوال اور معلومات سے ہدیہ دینے والے کو تکلیف ہوتی ہو تو چونکہ یہ مال مشتبہ ہے پتہ نہیں ہے کہ حلال ہے یا حرام ہے، اس لئے ایسے ہدیہ سے احتراز اور احتیاط ضروری ہے، کیونکہ شریعت نے جس طرح حرام مال سے بچنے کی تاکید کی ہے اسی طرح مشتبہ مال سے بھی بچنے کی ترغیب دی ہے، إلا یہ کہ ہدیہ دینے والے سے تحقیق کے بعد اس کا حلال ہونا معلوم ہو

تو اس ہدیہ کے قبول کرنے میں قباحت نہیں۔

اسی طرح بچوں کو کوئی ٹافی، پانی، دیا سلائی، وغیرہ دے دیتا ہے، لیکن دینے والے کی آمدنی کی تحقیق نہیں ہے تو بلا معلومات کے اس کا استعمال کرنا کراہت سے خالی نہیں، بلکہ پہلے معلومات کی جائے اگر وہ حلال ہے تو بچوں کے لئے اس کا استعمال درست ہے، لیکن اگر وہ حرام یا مشتبہ ہوں تو اس کا استعمال درست نہیں، لیکن بچوں کو چونکہ اس کا شعور نہیں ہوتا اس لئے بچوں کو اس کی تاکید کی جائے کہ دوسروں کی دی ہوئی چیزوں سے احتراز کریں، یہی احتیاط کا تقاضہ ہے، اِلا یہ کہ نہ لینے کی صورت میں کسی ضرر یا خطرہ کا اندیشہ ہو۔

اس سلسلہ میں احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إن الله طيب لايقبل إلا طيبا و ان الله أمر المؤمنين بما أمر به المرسلين، فقال: "يا أيها الرسل كلوا من الطيبات واعملوا صالحا"، و قال تعالىٰ: "يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقنكم .....", ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء يا رب يا رب ومطعمه حرام و مشربه حرام و ملبسه حرام و غذي بالحرام فأنى يستجاب له" (رواہ مسلم)

اور انہیں سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"يأتي علي الناس زمان لايبالي المرأ ما أخذ منه من الحلال أم من الحرام" (رواہ البخاری)۔

اور حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الحلال بين والحرام بين و بينهما مشتبهات لايعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه و عرضه و من وقع فى الشبهات وقع فى الحرام كالراعى يرعي حول الحمى يوشك أن يرتع فيه ألا و إن لكل ملك حمي ألا و إن حمى الله محارمه" (متفق علیہ، مشکوۃ، ۲۴۱/۱، کتاب البیوع)۔

۱۲۔ دعاء تو ہر نیک و بد کے لئے کرنے کی شرعاً اجازت ہے، دیکھئے نماز جنازہ بھی ایک دعاء ہے جو ہر مسلمان نیک و بد کی پڑھی جاتی ہے، خواہ اس کی کمائی حلال ہو یا حرام، لہٰذا حرام کمائی والے کے لئے دعاء کرنا، پانی پر دم کرنا شرعاً جائز ہے، بلکہ ایسے آدمی کی ہدایت و مغفرت کے لئے زیادہ فکر و دعاء کی ضرورت ہے، تاکہ وہ راہ راست پر آجائے، احادیث مبارکہ میں جو ادعیہ ماثورہ و منقولہ ہیں وہ عمومی انداز کے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل طائف کے ظلم و زیادتی کے باوجود ان کی ہدایت کی دعاء کی تھی: "**اللهم اهد قومى فإنهم لايعلمون، يا اللهم اغفر للمؤمنين والمؤمنات**" وغیرہ۔

مال حرام سے متعلق چند مسائل

مولانا مفتی جمیل احمد نذیری ☆

جواب:۱

جو شخص فی الحال، حلال کاروبار کر رہا ہے، اور اس کے آباء واجداد، سود یا کسی حرام کاروبار میں ملوث تھے، اور آباء واجداد کی وہی کمائی، وراثتہً اس شخص کو ملی ہو، تو جتنا مال وراثتہً ملا تھا، اگر معلوم ہو کہ فلاں فلاں سے آباء واجداد نے سود لیا تھا، یا حرام طریقہ سے حاصل کیا تھا، تو ہر ایک کی متعینہ رقم، انھیں واپس کر دے، لیکن اگر معلوم نہ ہو تو اتنی رقم صدقہ کر دے، اور اگر اشخاص بھی معلوم نہ ہوں اور رقم بھی متعینہ طور پر معلوم نہ ہو، لیکن یہ معلوم ہو کہ وراثتہً حرام مال ملا ضرور ہے، تو ایسی صورت میں اندازہ سے کچھ رقم صدقہ کر دے، اور احتیاطاً اندازہ سے زیادہ صدقہ کر دے، اور اگر حرام وحلال مخلوط ہو اور اربابِ مال بھی معلوم نہ ہوں، اور مقدارِ حرام بھی معلوم نہ ہو، اور مالِ حرام ومالِ حلال ممتاز ومتمیز بھی نہ ہوں تو اس کا استعمال جائز ہے۔

علامہ شامی نے بزازیہ کے حوالہ سے لکھا ہے:

"أخذ مورثه رشوة أو ظلما إن علم ذالک لایحل له أخذه و إلا فله أخذه حکماً أما فی الدیانة فیتصدق به بنیة إرضاء الخصماء" (ردالمحتار:۵/۹۹)۔

(اس کے مورث نے رشوت کے طور پر لیا تھا یا ظلماً لیا تھا، اگر وارث اسے (متعینہ طور پر) جان رہا ہے تو اس کے لئے لینا حلال نہیں، ورنہ حکماً اسے لے سکتا ہے، اور دیانتہً اسے صدقہ کر دے خصماء (اربابِ مال) کو راضی کرنے کی نیت سے)۔

دوسری جگہ ہے:

"والحاصل أنه إن علم أرباب المال وجب رده علیهم و إلا إن علم عین الحرام لا یحل ویتصدق بنیة صاحبه و إن کان مالا مختلطاً مجتمعاً من الحرام ولا یعلم أربابه ولا شیئا بعینه حل له حکماً والأحسن دیانة التنزه عنه" (حوالہ سابق)۔

☆ مہتمم جامعہ عربیہ عین الاسلام مبارک پور اعظم گڑھ

(اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ارباب مال کو جانتا ہو تو انہیں لوٹانا واجب ہے، ورنہ اگر عین حرام کو جانتا ہو تو حلال نہیں، مال والوں کی نیت سے صدقہ کردے، اور اگر مال، حرام کے ساتھ خلط ملط ہوا اور اربابِ مال کو بھی بالکل نہ جانتا ہو تو حکما اس کے لئے حلال ہے، اور زیادہ بہتر ہے کہ دیانۃً اس سے بچے)۔

جواب: ۲

جس شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائداد اور پورا مال، حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اس میں بھی نمبر (۱) والی تفصیل کی جائے گی، حرام جائداد اور حرام مال کی مقدار، اربابِ مال کو واپس کی جائے گی، اربابِ مال معلوم نہ ہونے کی صورت میں، انھیں لوگوں کی نیت سے صدقہ کیا جائے گا، اس کے علاوہ جو حاصل شدہ کرایہ اور جو کچھ اس کے پاس موجود ہے، اسے حلال کہا جائے گا۔

حوالہ جات نمبر (۱) کے تحت گزر چکے۔

جواب: ۳

شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمارہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود، اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے، خواہ ماحول کے زیرِ اثر، یا خود اپنے مزاج وطبیعت کی وجہ سے، اور اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے، تو اللہ سے ڈرتے ہوئے اس نیت کے ساتھ اس مال کو استعمال کرے کہ استطاعت ہونے کے بعد اتنا مال صدقہ کردوں گی، یا اربابِ مال معلوم ہوئے تو انھیں لوٹادوں گی۔

اسی طرح اگر حرام کمائی سے بچے کو پڑھایا لکھایا ہو، اور پڑھائی کے بعد بچہ کمائی کررہا ہے، تو اس میں بھی حرام مال سے پڑھائی لکھائی کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا، اور اگر اربابِ مال معلوم ہوں تو انھیں لوٹانا ہوگا۔

جواب: ۴

اگر متعین طور پر معلوم ہے کہ یہ دعوت حرام مال سے کی گئی ہے تو دعوت کھانا جائز نہیں، اور اگر متعین طور پر معلوم نہ ہو اور حرام مال کا غلبہ اس دعوت کے سلسلے میں معلوم ہو تو بھی دعوت کھانا جائز نہیں، اور حلال کا غلبہ ہو تو جائز ہے، اور کچھ معلوم نہ ہو کہ کتنا حلال ہے، کتنا حرام، تو بھی دعوت کھانا جائز ہے۔

کسی دعوت کے متعلق حلال وحرام کو معلوم کرنا ہے تو وہاں جانے سے پہلے معلوم کرلینا چاہئے، وہاں جاکر معلوم کرنا

درست نہیں، مسلمان کے متعلق خوش گمانی رکھنا چاہئے، اِلّا یہ کہ اس کا ظلم اور حرام میں ملوث ہونا بالکل ظاہر ہو (مرقاۃ المفاتیح ۶/۳۴۶)۔

"عن أبی هريرة قال قال النبیﷺ إذا دخل أحدكم علىٰ أخيه المسلم فاليأكل من طعامه ولا يسأل ويشرب من شرابه ولا يسأل رواه البيهقی فی شعب الايمان" (مشکاۃ المصابیح ۲/۲۷۹، سنن البیہقی ۵/۱۲۹، ۶۷،۶۸)۔

(حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے مسلمان بھائی کے یہاں جائے تو اس کا کھانا کھالے اور سوالات نہ کرے، اور جو پینے کو دے پی لے اور سوالات نہ کرے)۔

اس حدیث کی شرح لمعات التنقیح میں مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

"(ولا يسأل) بحيث يفضی إلىٰ سوء الظن و إيذائه ويستكشف حقيقة الحال من غير سوال و إيذاء وذالک إذا لم يعلم فسقه وظلمه وتجاوزه عن الحد وبالجملة إذا علم بيقين أو غلبة الظن أنه محتاط فی أمر طعامه فذاک، و إن تساويا فالاحتياط فی الترک، و إن كان له وجوه متعددة فی الرزق بعضها طيب وبعضها خبيث وأحسن الظن باحتمال أنه يأكل من الوجوه الطيبة فله وجه الجواز، و إن تعين أنه لايحتاط وتعين أنه يأكل الحرام أو ليس له إلا مدخل سوء فكلّا" (لمعات التنقیح ۶/۱۰۰)۔

(ولا یسأل (سوالات نہ کرے)، کیونکہ اس میں اس سے بدظنی بھی ہے اور اس کی ایذا بھی ہے، جبکہ حقیقت حال کا انکشاف بغیر سوال اور ایذا کے بھی ہوسکتا ہے، یہ بات اس وقت ہے جب اس کے فسق، اس کے ظلم اور حد سے تجاوز کرنے کو نہ جانتا ہو، خلاصہ یہ کہ جب یقینی طور پر اور غلبۂ ظن سے جانتا ہو کہ وہ کھانے کے معاملے میں محتاط ہے تب یہ بات ہے (کہ سوالات نہ کرے اور انکشاف حال پہلے سے کرلے) اور اگر حلال وحرام کے متعلق گمان برابر ہو تو ترک میں احتیاط ہے، اور اگر اس کی کمائی کے مختلف ذرائع ہوں، بعض حلال ہوں، بعض حرام اور حسنِ ظن زیادہ تر یہ ہو کہ وہ حلال کمائی سے کھاتا ہے تو بھی اس کے یہاں کھانا کھانا جائز ہے، اور اگر متعین طور پر معلوم ہوجائے کہ وہ کھانے کے معاملے میں محتاط نہیں اور متعین ہو کہ وہ حرام کھاتا ہے، یا یہ کہ اس کے یہاں بس حرام کمائی ہی ہے، تو ہرگز اس کی دعوت نہ کھائے)۔

جواب:۵

کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ کھائے ہوئے کھانے وغیرہ کی قیمت اور مالیت کا اندازہ لگائے اور احتیاطاً زیادہ اندازہ لگائے اور اتنی قیمت صدقہ کردے۔

جواب:٦

پہلے یا بعد کے حرام مال کو، جو بالکل متمیز وممتاز ہو، حلال کے دائرے میں لانے کی کوئی تدبیر نہیں۔

اور اگر متمیز وممتاز نہ ہو، مخلوط ہو تو قدرِ حرام، اربابِ مال کو دے دے، اگر وہ زندہ نہ ہوں تو ان کے ورثہ کو دے دے، ورثہ بھی زندہ نہ ہوں تو صدقہ کر دے۔

"**والواجب في الكسب الخبيث تفريغ الذمة والتخلص منه إلىٰ أربابه إن علموا و إلّا إلىٰ الفقراء**" (منحۃ الخالق علی البحر الرائق ۲/۲۲۱، الطحطاوی علی الدر المختار ۱/۳۹۰)۔

(حرام کمائی کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو فارغ کرنا واجب ہے، اور اس سے چھٹکارے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر ارباب مال کو جانتا ہو تو ارباب مال کو دے دے، ورنہ فقراء کو دے دے)۔

جواب:۷

ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے اور وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن تجارت کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو اس صورت میں اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کما کر اصل قرض صدقہ کرنا اس وقت جواز کے دائرے میں آئے گا، جب وہ مالِ حرام، حرام لعینہ نہ ہو، حرام لغیرہ ہو، حرام لعینہ کو قرض لینا بھی درست نہ ہوگا۔

جواب:۸

ایک آدمی کا بزنس آدھا حلال ہے اور آدھا حرام ہے، اور اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصہ کا کام کرنا پڑتا ہے، مثلاً دونوں کا حساب لکھنا، دونوں کے لئے لین دین کرنا، یا دونوں کی اصولی کے لئے جانا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ کام حرام لعینہ ہو مثلاً رشوت، شراب، جوا، بت گری، حرام جانوروں کا کاروبار، حرام گوشت و چربی یا حرام سامان کا کاروبار ہو تو اس شخص کو حرام کام کرنے سے انکار کرنا چاہئے اور اچھے انداز میں مالک کو سمجھا کر، خود کو صرف حلال سے وابستہ رکھنا چاہئے، اور اگر بچنے کی گنجائش نہ ہو تو ایسی ملازمت چھوڑ دینی چاہئے۔

جواب:۹

حرام کمائی سے خرید کردہ جائدادوں میں کام کرنا جیسے کھیتی باڑی یا نوکری کرنا درست ہے، حرام جائداد میں کام

کرنے سے کام کرنے والے کی اجرت حرام نہیں ہوجائے گی۔

اسی طرح بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا، لیکن اگر متعین طور پر معلوم ہو کہ یہ بائک یا کار حرام کمائی کی ہے تو اس پر بیٹھنے سے احتراز کرنا چاہئے۔

اسی طرح اس کے بچے کی فیس وصول کرنا جائز ہے، البتہ اگر متعین طور پر معلوم ہوجائے کہ یہ شخص اپنے بچے کی فیس اپنی حرام کمائی سے دے رہا ہے، تو اس سے کہہ دیا جائے کہ حلال کمائی سے فیس بھیجے، متعینہ طور پر حرام کمائی والی فیس واپس کردی جائے۔

جواب:۱۰

ذاتی عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے کرانے میں سودی رقم سے رشوت دینا جائز نہیں، کیوں کہ یہ اپنے کام میں اپنی سود کی رقم کا استعمال کرنا ہوا، اور اپنی سود کی رقم اپنے کاموں میں استعمال نہیں کی جاسکتی، سود کا حکم یہ ہے کہ تفریغِ ذمہ کے لئے بلانیتِ ثواب غرباء ومساکین کو دے دی جائے، اپنے نجی کاموں میں نہ استعمال کی جائے۔

البتہ مدارس یا رفاہی اداروں کے نقشوں کی منظوری میں سودی رقم بطور رشوت دی جاسکتی ہے، کیوں کہ سودی رقم کا ایک مصرف رفاہی امور بھی ہیں۔

جواب:۱۱

کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں مبتلا ہو تو ان کی دی ہوئی چیزیں اس صورت میں استعمال کی جاسکتی ہیں جب تک متعین طور پر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ حرام کمائی کی ہے، اور اگر متعینہ طور پر معلوم ہے کہ وہ حرام کمائی کی ہے تو لینا جائز نہیں، اور لے لینے کی صورت میں یا مال کے مشتبہ ہونے کی صورت میں اگر وہ چیز بعینہ موجود ہے تو کسی غریب کو دے دی جائے، موجود نہ ہو تو اس کی قیمت صدقہ کردی جائے۔ (ردالمحتار ۵/۹۹ اور لمعات التنقیح ۶/۱۰۰ کے حوالے گزر چکے ہیں)۔

جواب:۱۲

جس کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کو بھی دعاء مانگنا بند نہیں کرنا چاہئے، کسی کے بارے میں متعین طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی دعاء قبول نہیں ہوگی، الفاظِ حدیث ہیں: ''**فأنّٰی یستجاب لذالک رواہ مسلم**'' (مشکوۃ المصابیح ۱/۲۴۱)۔

(پس اس وجہ سے اس کی دعاء کیسے قبول کی جائے گی)۔

اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ قبول ہونے کی امید نہیں، لیکن یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ دعاء قبول ہی نہیں ہوگی، یعنی عدم قبولیت کی طرف یقینی اشارہ نہیں، قبول ہونے کی بھی امید ہے، لیکن مذکورہ اسباب کی وجہ سے عدمِ قبولیت کا زیادہ خطرہ ہے۔

پھر یہ کہ سوال میں مذکور ہے کہ اب حرام کمائی والا اپنے بچے کے نام کے رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعاء کراتا ہے یا پانی پر دم کرنے کے لئے کہتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

حکم یہ ہے کہ بالکل جائز اور درست ہے، یہاں حرام کمائی والا دعاء نہیں کر رہا ہے، کوئی دوسرا اس کے بچے کے نام رکھنے کے موقع اور دیگر مواقع پر اس کے حق میں دعاء کر رہا ہے، جب خود حرام کمائی کرنے والا دعاء کر سکتا ہے تو دوسرا اس کے حق میں کیوں نہیں کر سکتا، ایسا نہیں ہے کہ حرام کمائی والے کے لئے اب کوئی دعاء ہی نہیں کر سکتا۔

کم از کم ایک دعاء ایسی ہے جو ہر ایک کو کرنی چاہئے، حرام کمائی والا، حرام سے توبہ کی توفیق اور حرام سے بچنے کی دعاء کرے، دوسرا بھی اس کے حق میں یہی دعاء کرے کہ وہ حرام کمائی چھوڑ دے۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد عفان منصور پوری ☆

جواب: ۱

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ حرام مالِ میراث کی تین صورتیں ہیں:

پہلی: اگر حرام مال کا مالک معلوم ہے تو یہ مال ورثاء کے لے حلال نہیں ہے؛ بلکہ مالک کو لوٹایا جائے گا۔

دوسری: اگر حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے؛ لیکن حرام مال معلوم، متعین اور الگ موجود ہے، مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو یہ بھی ورثاء کے لیے حلال نہیں ہے؛ بلکہ اسے اصل مالک کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے گا۔

تیسری: صورت یہ ہے کہ حرام مال کا مالک معلوم نہیں ہے؛ لیکن وہ مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہے کہ متعین طور پر یہ پتہ نہیں چل پا رہا ہے کہ کون سا مال حرام ہے اور کون سا مرحوم کا اپنا حلال مال ہے تو ایسی صورت میں قضاءً یہ مال ورثاء کے لیے حلال ہے؛ لیکن دیانۃً ترکہ سے اتنے مال کے بقدر مال صدقہ کرنا چاہیے۔

قضاءً حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اور شخص مثلاً وصی یا نگراں ایسے مال کو صدقہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی ورثاء پر ایسے مال کے سلسلے میں کوئی دعوی کیا جا سکتا ہے، جہاں تک دیانت کے طور پر ایسے مال کے صدقہ کرنے کی بات ہے تو علامہ شامیؒ کی بعض عبارات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مال کو صدقہ کرنا واجب نہیں ہے؛ بلکہ محض بہتر ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارت کے آخر میں ہے:

"وَالْحَاصِلُ أَنَّهُ إِنْ عَلِمَ أَرْبَابَ الْأَمْوَالِ وَجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الْحَرَامِ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صَاحِبِهِ، وَإِنْ كَانَ مَالًا مُخْتَلِطًا مُجْتَمِعًا مِنَ الْحَرَامِ وَلَا يَعْلَمُ أَرْبَابَهُ وَلَا شَيْئًا مِنْهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، وَالْأَحْسَنُ دِيَانَةً التَّنَزُّهُ عَنْهُ" (ردالمحتار ۵/۹۹)۔

پس صورت مسئولہ میں حرام مال جو وراثت میں ملا ہے بہتر یہ ہے کہ اس کے بقدر صدقہ کر دے، بقیہ اس مال سے

☆ استاذ و مفتی جامعہ اسلامیہ عربیہ، جامع مسجد، امروہہ

جو نفع حاصل ہوا ہے وہ جائز اور مباح ہوگا۔

جواب: ۲

صورت مسئولہ میں حرام اور ناجائز مال سے کسی بھی قسم کی تجارت کرنا درست نہیں؛ لیکن اگر کسی شخص نے اس طرح کے مال سے تجارت کر لی تو اس سے حاصل شدہ آمدنی اور نفع کو حرام نہیں کہا جائے گا؛ البتہ اگر حرام مال غصب اور رشوت وغیرہ سے حاصل ہوا ہے تو اصل مالک کی طرف اس اصل رقم کا لوٹانا ضروری ہوگا، اور اگر سودی رقم ہے یا مالک کا پتہ ہی نہیں تو ایسی صورت میں اصل رقم کو غرباء ومساکین وغیرہ پر صدقہ کر دیا جائے۔

"**اكتسب حراما واشترى به أو بالدراهم المغصوبة شيئا. قال الكرخي: إن نقد قبل البيع تصدق بالربح وإلا لا وهذا قياس، وفي الشامي: قوله (اكتسب حراما) توضيح المسألة ما في التتارخانية حيث قال: رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم آخر ودفع تلك الدراهم. قال أبو نصر: يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا في الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبو الليث، لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص في الجامع الصغير: إذا غصب ألفا فاشترى بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح. وقال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب في الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج عن الناس**" (شامی ۴/ ۲۴۴)۔

جواب: ۳

صورت مسئولہ میں ماں یا بیوی کو چاہیے کہ وہ بیٹے یا شوہر سے حرام ذریعۂ آمدنی چھڑانے کی پوری کوشش کرتی رہیں، پوری کوشش کے باوجود اگر وہ نہ چھوڑیں تو ماں یا بیوی کے لیے جائز طریقے سے اگر اپنے اخراجات کا بندوبست کرنا ممکن ہو تو ایسی صورت میں ان کے لیے بیٹے یا شوہر کے مال سے کھانا جائز نہیں اور اگر اپنے اخراجات انتظام کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں بیٹے یا شوہر کے مال سے کھانا جائز ہے، حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ شوہر پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لیے بھی یہی حکم ہے۔

اور اگر حرام کمائی سے بچے کو خوب پڑھایا لکھایا، اب وہ بچہ ملازمت کر رہا ہے تو اس کی تنخواہ جائز ہوگی؛ مگر بہتر یہ ہے جتنی حرام رقم اس کی تعلیم پر صرف ہوئی ہے اتنی رقم صدقہ کر دے۔

"المال الحرام كالمأخوذ غصباً أو سرقةً أو رشوةً أو رباً أو نحو ذلك ليس مملوكاً لمن هو بيده" (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۲۳/۲۴۸)۔

"وفي جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاماً أو كسوةً من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج" (شامی ۶/۱۹۱)۔

جواب: ۴

جن لوگوں کی کل یا اکثر آمدنی حرام ہو ان کے یہاں دعوت کھانا اس وقت تک جائز نہیں جب تک یہ بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ دعوت کا انتظام حلال آمدنی سے کیا گیا ہے۔

"غالب مال المهدى إن كان حلالاً، لا بأس بقبول هديته وأكل ماله، ما لم يتعين أنه من حرام، وإن كان غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل، إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه" (البزازیۃ علی ہامش الفتاویٰ الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ/ الفصل الرابع فی الہدیۃ والمیراث ۶/۳۶۰، زکریا)۔

"لا يجيب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راضٍ بفسقه، وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام ما لم يخبر أنه حلال، وبالعكس يجيب ما لم يتبين عنده أنه حرام، كذا في التمرتاشي، آكل الربا وكاسب الحرام أهدىٰ إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل ما لم يخبره أن ذٰلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه" (الفتاویٰ الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ/ الباب الثانی عشر ۵/۳۴۳)۔

جواب: ۵

صورت مسئولہ میں لاعلمی میں اگر کسی نے حرام مال کھلا دیا تو کھانے والے کے لیے توبہ استغفار کے علاوہ تلافی کی کوئی شکل نہیں ہے۔

ردالمحتار مع الدر المختار میں ہے: "الحرمة تتعدد مع العلم بها وفي الشامي في تحته: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لايتعدى ذمتين سألت عن الشهاب بن الشلبي فقال هو محمول على ما إذا لم يعلم بذالك الخ" (۴/۱۴۶)۔

جواب: ۶

حرام مال کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو اور وہ بلا عوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے: سود، چوری، رشوت وغیرہ تو

اس کے مالک کو واپس کرنا ضروری ہے، یعنی وہ جہاں سے آیا ہے وہیں اسے واپس دے دیا جائے، مالک وفات پاچکا ہو تو اس کے ورثاء کو لوٹا دیا جائے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر اسے مستحقِ زکاۃ کو صدقہ کرنا ضروری ہے اور اگر وہ بالعوض حاصل کیا گیا ہو، جیسے حرام ملازمت وغیرہ کے ذریعے تو اسے مالک کو واپس کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ اس کا یہی ایک مصرف ہے کہ اسے ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کر دیا جائے، پھر جس کو صدقہ کیا گیا ہے وہ اگر اس مال کو دینے والے پر خرچ کرتا ہے یا اس کا کچھ حصہ معطی کو ہبہ کر دیتا ہے تو یہ اس کے لیے تبدل ملک کی بناء پر جائز ہوسکتا ہے۔

"والحاصل: أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه"۔ (شامی۵/۹۹،مَطْلَبٌ فِيمَنْ وَرِثَ مَالًا حَرَامًا)

جواب: ۷

مذکورہ شخص جس کے پاس حرام کمائی کا مال ہے وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کر دینا چاہتا ہے؛ لیکن تجارت کے لیے حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو وہ اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرضہ کو صدقہ کر دیتا ہے تو اس کی گنجائش ہونی چاہیے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علمائے کرام کا قول ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فإن تابت هذه البغي وهذا الخمار، وكانوا فقراء جاز أن يصرف إليهم من هذا المال قدر حاجتهم، فإن كان يقدر يتجر أو يعمل صنعة كالنسيج والغزل، أُعطي ما يكون له رأس مال انتهى"۔ (مجموع الفتاوی۲۹/۳۰۸)۔

(اگر جسم فروش عورت توبہ کر لے، شراب کی تجارت کرنے والا تائب ہو جائے اور وہ غریب بھی ہوں تو اپنی ضرورت کے مطابق اس مال سے لے سکتے ہیں، اور اگر ممکن ہو کہ وہ تجارت کرے، یا کوئی پیشہ اپنائے مثلاً: کپڑا بنے، یا سوت کاتے وغیرہ تو اسے اتنا دے دیا جائے کہ جو اس کا رأس المال بن جائے)۔

علامہ ابن القیمؒ فرماتے ہیں:

"إذا عاوض غيره معاوضة محرمة وقبض العوض، كالزانية والمغني وبائع الخمر وشاهد الزور ونحوهم ثم تاب والعوض بيده .فقالت طائفة: يرده إلى مالكه؛ إذ هو عين ماله ولم يقبضه بإذن الشارع ولا حصل لصاحبه في مقابلته نفع مباح"۔

وقالت طائفة: بل توبته بالتصدق به ولا يدفعه إلى من أخذه منه، وهو اختيار شيخ الإسلام

ابن تيمية وهو أصوب القولين ....انتهى (مدارج السالکین ۱/ ۳۸۹)۔

وقد بسط ابن القيم الكلام على هذه المسألة في (زادالمعاد:۵/ ۷۷۸) **وقرر أن طريق التخلص من هذا المال وتمام التوبة إنما يكون: "بالتصدق به، فإن كان محتاجا إليه فله أن يأخذ قدر حاجته، ويتصدق بالباقي" انتهى۔**

جواب: ۸

صورت مسئولہ میں ایسی کمپنی جہاں حلال وحرام دونوں طرح کے کام کرنے پڑتے ہوں وہاں حلال کام کے بقدر تو اجرت جائز ہوگی، مگر حرام کام کرنے کے عوض جو اجرت حاصل ہوگی وہ جائز نہیں ہوگی۔

"لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (شامی، کتاب الحظر والإباحۃ/ باب الاستبراء، فصل فی البیع، ۹/ ۳۵۵)

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ" (المائدۃ)۔

جواب: ۹

حرام آمدنی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے سے حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے، اس کا استعمال جائز ہے، مگر جتنی رقم حرام طریقے سے حاصل کی ہے اس کو اصل مالک یا اس کے ورثہ کو لوٹانا واجب ہے، اگر اصل مالک موجود ہے اور اگر ممکن نہ ہو تو اتنی رقم اصل مالک کی طرف سے صدقہ کرنا لازم ہے، اسی طرح جس شخص کی آمدنی حرام ہو، اس کے یہاں نوکری اور ملازمت کر کے نفع حاصل کرنا درست ہے، بشرطیکہ وہ حرام مال کی صراحت کے ساتھ اسے متعین کر کے نہ دیں، اسی طرح حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو اسکول یا مدرسے میں داخل کرائے تو فیس کے سلسلے میں یہی جواب ہوگا؛ مگر بہتر یہ ہے کہ اس سے احتراز کرے، اسی طرح حرام کمائی کی مزدوری سے اسکول یا مدرسے کی فیس جمع کرے تو ایسی صورت میں اجرت اور فیس کی رقم میں کراہت آئے گی (تفصیل کے لئے دیکھئے: ردالمحتار مع الدر ۵/ ۲۳۵)۔

جواب: ۱۰

سودی رقم سے کسی طرح کا فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے اور رشوت میں دینا در پردہ ذاتی فائدہ ہے، اس لیے رشوت میں بھی سودی رقم نہ دینی چاہیے؛ لیکن اگر تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے باوجود صرف رشوت نہ دینے کی وجہ سے کام نہ ہو رہا

ہوتو ایسی صورت میں حکومت سے متعلق اداروں کو سرکاری بینک سے ملنے والی سودی رقم دے کر کام نکالنے کی گنجائش ہے۔

فتاوی شامی میں ہے:

"دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعنى فى حق الدافع اه" (۶/ ۴۲۳)۔

جواب: ۱۱

اگر کسی مسلمان کی آمدنی کے مشتبہ ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو، محض وہم یا وسوسہ ہو، تو ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کیے بغیر اس کا ہدیہ قبول کرنا درست ہے، بلا وجہ کسی مسلمان پر یا اس کے ذریعۂ آمدنی پر شبہ کرنا درست نہیں ہے۔

تاہم اگر واضح دلیل سے کسی کی آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو تو ایسے شخص سے ہدیہ لینا یا اس کی دعوت قبول کرنا ناجائز ہے۔

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا ...إلخ" (الحجرات:۱۲)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **"إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا، ولا تجسسوا"** (سنن أبي داود، حدیث نمبر: ۴۹۱۷، ط: دار الرسالة العالمية، صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۵۷۲۰، دار طوق النجاة، باب من لم یر الوساوس ونحوہا من الشبہات)۔

"رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان فى بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال فى أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (فقہ البیوع: ۲/ ۱۰۵۲، مکتبۃ معارف القرآن)۔

جواب: ۱۲

صورت مسئولہ میں حرام کھانے والا شخص فاسق ہے، ایسے شخص کی دعاء قبول نہیں ہوتی جیسا کہ حدیث میں میں بھی مذکور ہے؛ پس مذکورہ صورت میں بہتر یہ ہے کہ ایسا شخص دعا کرانے سے احتراز کرے یا پھر صدق نیت سے توبہ کرائے اور عہد کرے کہ آئندہ حرام ذرائع آمدنی کو اختیار نہیں کروں گا اور جو مال حرام فی الوقت موجود ہے، اس کو ضرورت مندوں کے

درمیان صدقہ کردوں گا تو امید قوی ہے کہ اب اس کی دعائیں بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوں گی۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر، يمد يديه إلى السماء، يارب، يارب، ومطعمه حرام، ومشربه حرام، وملبسه حرام، وغذى بالحرام، فأنى يستجاب لذلك؟**" (صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف، ۱/۳۲۶)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ**" (البقرۃ:۱۷۲)۔

فقط واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

مال حرام و مال مشتبہ- احکام و مسائل

ڈاکٹر حافظ کلیم اللہ عمری مدنی ☆

مال حرام کی شناعت وخباثت شرعا وعرفا معروف ہے، عبادات کی قبولیت کا دارومدار مال حلال پر ہے، اکل مال حلال عبادت ہے، بڑی سے بڑی عبادت خواہ حج بھی کیوں نہ ہو مال حرام کی وجہ سے منہ پر ماردی جاتی ہے، اسی سلسلہ میں مال حرام مال موروث بن کر کسی کے حق میں آئے تو اس کا قبول کرنا شرعا جائز ہے؟ یا اسے اس مال کے تعلق سے کیا رویہ اپنانا چاہئے؟ اس سلسلہ میں اہل علم وارباب دانش کی آراء پیش خدمت ہے، اسی کی روشنی میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات بھی دئے جائیں گے باذن اللہ۔

"**ذهب الجمهورمن الحنفية و المالكية و الشافعية و الحنابلة و هو اختيار شيخ الاسلام ابن تيمية الى أن الموت لايطيب المال الحرام بل الواجب فيه الرد على مالكه إن كان معروفا فإن لم يكن معروفا تصدق به على الفقراء و المساكين**" (حاشیۃ ابن عابدین:۵/۱۰۴، المجموع:۹/۴۲۸، الانصاف:۸/۳۲۸، الفتاوی الکبری:۱/۴۷۸)۔

(جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ کسی کی موت مال حرام کو پاک نہیں کرتی، بلکہ واجب تو یہ ہے کہ اس مال کا مالک اگر معروف ومشہور ہو تو اسے لوٹا دیا جائے، ورنہ اس مال کو صدقہ کر دیا جائے، یہی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی ہے)۔

"**قال ابن رشد الجد: و أما الميراث فلا يطيب المال الحرام ، هذا هو الصحيح الذى يوجبه النظر، وقد روى عن بعض من تقدم أن الميراث يطيبه للوارث، وليس ذلك بصحيح**" (المقدمات الممہدات:۲/۶۱۷)۔

"**وقد سئل يحى بن إبراهيم المالكى عن المال الحرام : هل يحله الميراث أم لا؟ فأجاب: لايحل المال الحرام فى قول مالك، انتهى**" (المعیار المعرب:۶/۴۷)۔

(ابن رشد (الجد) نے فرمایا کہ مال میراث کسی مال حرام کو پاک صاف نہیں کرتا، یہی رائے غور وخوض کے بعد درست لگتی ہے، البتہ ان علماء کا یہ قول مال موروث وارث کے حق میں پاک وحلال ہے صحیح نہیں ہے، جیسا کہ یحی بن ابراہیمؒ

☆ مفتی و پرنسپل جامعہ دارالسلام عمرآباد

سے سوال کیا گیا کہ کیا مال حرام میراث بن کر آجائے تو حلال ہوگا؟ تو جواب میں عرض فرمایا کہ بقول امام مالکؒ میراث مال حرام کو حلال نہیں بناتا)۔

"قال النوویؒ: من ورث مالا ولم یعلم من أین کسبه مورثه، أمن حلال أم من حرام؟ و لم تکن علامة، فهو حلال باجماع العلماء، فإن علم أن فیه حراما وشک فی قدره أخرج قدر الحرام بالاجتهاد، انتهی" (المجموع ۹/۴۲۸)۔

(امام نوویؒ نے فرمایا: اگر وارث کو یہ نہ معلوم ہو مال میراث مورث نے کہاں سے کمایا ہے، حرام راستہ سے یا حلال راہ سے؟ کیا یہ مال وارث کے حق میں حلال ہوگا؟ اس سلسلہ میں کوئی خاص قرینہ یا علامت بھی نہیں ہے، جواب میں فرمایا: پس یہ مال علماء کے اجماع کے مطابق حلال ہے، ہاں اگر وارث کو معلوم ہو جائے کہ اس مال میں حرام بھی شامل ہے، اور شک ہو اس مال حرام کی مقدار کے متعلق تو اپنے اجتہاد سے حرام مال کا اندازہ لگائے اور اسے خارج کر دے)۔ (الفتاوی الکبری: ۱/۴۷۸)۔

''شیخ الاسلام ابن تیمیہ سے سوال کیا گیا اس شخص کے بارے میں جو سود خور تھا اور وراثت میں کچھ مال اور وارث چھوڑ چلا ہے، تو کیا یہ مالِ میراث وارث کے حق میں حلال ہوگا؟ جواب: مال حرام کی مقدار معروف ہو تو وارث حقداروں تک اس مال کو پہنچائے گا، اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس مال کو صدقہ کر دے گا۔

ایک اور موقع سے شیخ الاسلامؒ نے فرمایا کہ مال حرام کی دو نوعیتیں ہیں: ایک جو مال حرام ہے بعینہ، جیسے مال مسروق، غصب شدہ مال وغیرہ، بالاتفاق یہ مال میراث نہیں بنے گا، اس مال کا مالک اگر معروف ہو تو اس تک پہنچایا جائے گا، ورنہ صدقہ کیا جائے گا، مال کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسبی اعتبار سے حرام ہے، جیسے حرام تجارت، شراب و جوا اور رقص و سرور کی محفلوں سے کمائی ہوئی دولت وغیرہ، اس سلسلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے، کیا یہ مال مال موروث ہے؟ وارث کے لئے حلال ہے یا حرام ہے؟ کیا یہ صرف کمانے والے کے حق میں حرام ہے، اور مال موروث کی شکل میں پانے والے کے حق میں، یا کسی مباح صورت سے مثلاً ہبہ وغیرہ جس کے پاس پہنچے اس کے حق میں حلال ہے؟ راجح قول کے مطابق وارث کے حق میں حلال ہے''۔

دار العلوم دیوبند کا ایک فتوی ہے (۱۷۰۹۹۳): ''اگر کسی کے والد نے جوا سٹہ، سود وغیرہ سے مال کمایا ہو تو ایسی کمائی کا استعمال ورثاء کے لئے جائز نہیں ہے، بلکہ اگر صاحب مال کا علم ہو تو اس کو واپس کرنا ضروری ہے، ورنہ بلا نیت ثواب فقراء پر صدقہ کر دیا جائے، واضح رہے کہ یہ حکم اس صورت میں جب کہ مال حرام مخلوط نہ ہو، بلکہ متمیز ہو اور اگر مال حرام حلال کے ساتھ مخلوط ہو تو مال حرام کے بقدر صدقہ کر کے یا مالک کا علم ہونے کی صورت میں اس کو واپس کر کے اس تمام مال کو ورثاء کے لئے استعمال میں لانا جائز ہو جائے گا (ردالمحتار: باب البیع الفاسد، دار الافتاء دار العلوم، دیوبند)۔

جواب نمبر ۱:

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کسی کی موت مال حرام کو پاک نہیں کرتی، بلکہ واجب تو یہ ہے کہ اس مال کا مالک اگر معروف ومشہور ہوتو اسے لوٹا دیا جائے، ورنہ اس مال کو صدقہ کر دیا جائے، یہی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی بھی ہے (حاشیۃ ابن عابدین: ۵/ ۱۰۴، المجموع: ۹/ ۴۲۸، الانصاف: ۸/ ۳۲۸، الفتاوی الکبری: ۱/ ۴۷۸)۔

ابن رشد (الجد) نے فرمایا: کہ مال میراث کسی مال حرام کو پاک صاف نہیں کرتا، یہی رائے غور وخوض کے بعد درست لگتی ہے، البتہ ان علماء کا یہ قول کہ مال موروث وارث کے حق میں پاک وحلال ہے، صحیح نہیں ہے (المقدمات الممہدات: ۲م ۶۱۷)۔

اہل علم کی اس سلسلہ میں مختلف آراء ہیں، مثال کے طور پر جو مال حرام اولاد کے لئے ہبہ کے طور پر یا وراثت میں ترکہ کے طور پر آئے اس مال کو حاصل کرنے یا قبول کرنے میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ مال حرام کا گناہ اس کے کمانے والے پر ہے نہ کہ اس کی اولاد پر، خواہ وہ مال حرام سود یا جوا وغیرہ کی حرام کمائی سے ہو، دوسری رائے یہ ہے کہ احوط یہی کہ اس مال حرام سے اجتناب کیا جائے۔

وارث کے لئے ضروری ہے کہ اسے مال حرام کے تعلق سے اچھی طرح واقفیت ہو، تو مال حرام کے بارے میں صحیح معلومات ہونے کے باوجود اس کا استعمال تقوی کے اعتبار سے درست نہیں ہے، وارث پر ضروری ہے کہ اس مال موروث کو اگر ممکن ہو سکے تو اس کے حقداروں تک پہنچانے کی کوشش کرے، ورنہ اسے صدقہ کر دے، خود اسے استعمال نہ کرے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''**إن الله طيب لايقبل إلا طيبا**'' (یعنی اللہ پاکیزہ ہے، مال حلال ہی کو اللہ قبول کرتا ہے، یعنی حرام مال کو قبول نہیں کرتا)۔

جواب نمبر ۲:

شیخ ابن عثیمینؒ نے سودی مال کے تعلق سے فرمایا:

''**أما بالنسبة لأولاده: فلاحرج عليهم أن يأكلوا منه فى حياة أبيهم و يجيبوا دعوته ، لأن النبى ﷺ أجاب دعوة اليهود مع أنهم يأكلون الربا**'' (لقاء الباب المفتوح: ۱۹/ ۱۸۱)۔

(سود کی کمائی کرنے والے کی اولاد کے حق میں اس کا مال اس کی زندگی میں کھانے اور اس کی دعوت قبول کرنے کے سلسلہ میں کوئی حرج نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے یہود کی دعوت کو قبول کیا تھا، حالانکہ وہ لوگ سود خور تھے)۔

شیخ ابن عثیمینؒ نے یہ بھی فرمایا: ''جو مال کسب کے لحاظ سے حرام ہو وہ مال حرام ہے کمائی کرنے والے پر، نہ کہ اسے

قبول کرنے والے پر، جسے اس نے مباح صورت میں پایا تھا، لیکن جو مال بعینہ حرام ہو جیسے خنزیر کا گوشت یا غصب شدہ مال وغیرہ یہ تو حرام ہے، اس کے حرام ہونے میں کوئی دو رائے نہیں ہے، یہ قول مناسب قول ہے، جیسا کہ آثار سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے یہودی سے گھر والوں کی خاطر غلہ خریدا تھا، ان کے تحفہ کو (گوشت) قبول کیا تھا، یہود کی دعوت کو بھی قبول فرمایا تھا، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ اکثر یہودیوں کی تجارت اور لین دین سود خوری اور حرام پر مشتمل تھی، نیز حضرت بریرہؓ کے ہدیہ اور تحفہ کے بارے میں فرمایا تھا، وہ تو ان کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے تحفہ ہے" (القول المفید علی کتاب التوحید ۳/ ۱۱۲)۔

شیخ محمد علیش المالکیؒ نے فرمایا: "**أما عين الحرام المعلوم مستحقه كالمسروق و المغصوب فلا يحل له**" (منح الجلیل شرح مختصر خلیل: ۲/ ۴۱۶) (یعنی مال حرام جس کا مستحق معلوم ہو جیسے چوری کا مال یا غصب شدہ مال وغیرہ اس مال کو وارث کے لئے مال میراث کے طور پر قبول کرنا جائز نہیں ہے)۔

بعض علماء کرام کا خیال یہ ہے کہ حرام مال جس نے کمایا ہے، اس کا گناہ اسی پر ہوگا، دوسرا شخص یا وارث پر کوئی گناہ نہ ہوگا؛ جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "**ألا تزر وازرة وزر أخرى**" (النجم: ۳۸) (کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا)۔

مذکورہ نصوص، اقوال اور فتاوی کی روشنی میں مال حرام سے استفادہ کے سلسلہ میں مختلف آراء ہیں، مگر احوط یہی ہے کہ مال حرام سے اجتناب کیا جائے، تقوی کے لحاظ سے یہی مناسب ہے، لہٰذا اسباب اختیار کرنے کے ساتھ اللہ پر توکل کیا جائے، اللہ اس کے لئے راہیں ہموار کرے گا اور اس راہ سے روزی دے گا کہ آدمی سوچ بھی نہیں سکتا؛ "**ومن يتق الله يجعل له مخرجا ويرزقه من حيث لايحتسب ومن يتوكل على الله فهو حسبه**" (الطلاق) (اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لئے (رنج ومحن سے) مخلصی (کی صورت) پیدا کر دے گا، اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کو کفایت کرے گا)۔

جواب نمبر ۳:

یعنی شیخ ابن عثیمینؒ نے فرمایا ہے:

"**و أما الخبيث لكسبه فمثل المأخوذ عن طريق الغش ، أو عن طريق الربا أو عن طرق الكذب و ما أشبه ذلك وهذا محرم على مكتسبه وليس محرما على غيره إذا اكتسبه منه بطريق مباح**" (تفسیر سورۃ البقرۃ: ۱/ ۱۹۸)۔

(مال حرام جو کسب/کمائی کی حرام صورتوں میں سے آئے، مثلاً دھوکہ دہی، سودی لین دین، جھوٹ وغیرہ یہ سارے

راستے حرام راستے ہیں، یہ کمائی کرنے والے پر حرام ہے، البتہ دوسرے لوگ جو اس مال کو مباح طریقہ سے حاصل کریں جیسے میراث، ہبہ یا تحفہ وغیرہ ان کے لئے اس کا قبول کرنا جائز ہے)، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے، حالانکہ وہ سود خور تھے، لوگوں کا مال حرام طریقہ سے ہڑپ کرتے تھے، سود خوری عام تھی، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مال حرام کا گناہ کمائی کرنے والے پر ہے نہ کہ حاصل کرنے والے پر (احکام القران لابن العربی، ۱/ ۳۲۴، المجموع ۹/ ۴۳۰، الفتاوی الفقہیۃ الکبری للہیثمی: ۲/ ۲۳۳، کشاف القناع: ۳/ ۴۹۶، سؤال رقم: ۲۱۷۰۱)۔

اولاد اور بیوی کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اگر باپ یا سرپرست روکنے کے باوجود حرام مال کی کمائی سے نہ رکے تو روکنے والے کی ذمہ داری ادا ہوگئی، وہ عند اللہ بری ہوں گے، البتہ حرام کمائی کرنے والا وہی عند اللہ مسؤل ہوگا، اس غریب خاتون نے اپنے فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ادا کر دیا، اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی، آخری شکل اس خاتون کو حرام مال کے تعلق سے اپنے دل میں کراہت محسوس کرنی چاہئے، ساتھ ہی ساتھ بقدر ضرورت اس مال کو استعمال کرنے کی اجازت بھی ہوگی، اس مال حرام کو اتنا ہی لے جتنا اس کی ضرورت ہو، یہ بھی تقوی کا تقاضا ہے کہ حرام مال سے تعیش پسندی ہرگز نہ آنے پائے، نیز اس کے بچہ کی تعلیم وتربیت پر حرام مال بقدر ضرورت استعمال کرے اور وہ بچہ جب مستقبل میں خود کفیل ہوجائے تو اس کی کمائی حلال ہوگی، البتہ تقوی کے اعتبار سے اس عورت اور بچہ کو چاہئے کہ توبہ واستغفار کی کثرت کے ساتھ مال حلال سے خوب صدقہ وخیرات کریں، تاکہ اللہ کا غضب ٹھنڈا ہو، اور انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، یہاں تک کہ اسے مال حرام کی تلافی ہونے پر اطمینان ہوجائے، توبہ نصوح کا اہتمام بھی برابر جاری وساری ہو: ''**إلا من تاب و أمن وعمل عملا صالحا فأولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات**'' (الفرقان)، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''**أن الإسلام یھدم ما کان قبلہ و أن الھجرۃ تھدم ما کان قبلھا، و أن الحج یھدم ما کان قبلہ**'' (مسلم ۱۲۱)، (یعنی اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے اسلام سے قبل کی ساری غلطیاں معاف ہوجائیں گی، اور ہجرت ماقبل کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، اور حج بیت اللہ ماقبل کے گناہوں کو دور کر دیتا ہے)، ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''**أن الاسلام یھدم ما کان قبلہ و التوبۃ تحجب ما کان قبلھا**'' (مجموع فتاوی ابن باز: ۱/ ۱۶۲)، (اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے اسلام سے قبل کی ساری غلطیاں معاف ہوجائیں گی، نیز توبہ بھی ماقبل کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے)، واللہ اعلم بالصواب

جواب نمبر ۴:

داعی اگر حرام کاروبار میں ملوث ہو تو مدعو کو چاہیے کہ حتی المقدور داعی کو روکنے اور اکل حلال کی راہ پر لگانے کی کوشش کرے، امر بالمعروف کی طرح نہی عن المنکر بھی ایک فریضہ ہے، آخری شکل یہ بھی ہے کہ حرام کو دل سے کراہت محسوس کرے،

البتہ داعی کی دعوت قبول کرنا مدعو پر واجب ہے، اس سلسلہ میں فرمان نبوی اور اسوہ محمدی کو مدنظر رکھنے سے ایسے حضرات کی دعوت قبول کرنے اور اس میں شریک ہونے میں شرعا کوئی قباحت نظر نہیں آتی، جیسا کہ آپ ﷺ نے یہودی سے گھر والوں کی خاطر غلہ خریدا تھا، ان کے تحفہ (گوشت) کو قبول کیا تھا، یہود کی دعوت کو بھی قبول فرمایا تھا، حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ اکثر یہودیوں کی تجارت اور لین دین سود خوری اور حرام پر مشتمل تھی، نیز حضرت بریرہؓ کے ہدیہ اور تحفہ کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ تو اس کے لئے صدقہ ہے اور ہمارے لئے تحفہ ہے ''**لها صدقة ولنا هدية**''، مطلب یہ ہے کہ مال حرام سے استفادہ کی گنجائش ہے مگر احوط یہی ہے کہ مال حرام سے اجتناب کیا جائے، تقوی کے لحاظ سے یہی مناسب ہے۔

جواب نمبر ۵:

حرام کمانے والا عنداللہ مجرم ہوگا اور وہ مسؤل ہوگا، البتہ جس نے اس کی دعوت قبول کی یا دعوت میں شریک رہا یا اس کا تحفہ قبول کیا وہ عنداللہ ذمہ دار نہ ہوگا، آپ ﷺ نے یہودی سے گھر والوں کی خاطر غلہ خریدا تھا، ان کے تحفہ (گوشت) کو قبول کیا تھا، یہود کی دعوت کو بھی قبول فرمایا تھا، حالانکہ اکثر یہودیوں کی تجارت اور لین دین سود خوری اور حرام کمائی پر مشتمل تھی، نیز حضرت بریرہؓ کے ہدیہ اور تحفہ کے بارے میں فرمایا تھا ''**لها صدقة ولنا هدية**''، البتہ اس مال حرام کو کھانے کے بعد مدعو کو تسلی نہ ہو تو خوب صدقہ وخیرات کرے، توبہ واستغفار میں خوب وقت لگائے، انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ اس کی تلافی کی کوشش کرے، یہاں تک کہ اس کا دل مطمئن ہوجائے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''**البر حسن الخلق و الإثم ما حاك في نفسك و كرهت أن يطلع عليه الناس**'' (صحیح الترمذی:۲۳۸۹) (نیکی حسن اخلاق کا نام ہے، گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے اور آپ یہ نہ پسند کریں کہ لوگ اس سے واقف ہوجائیں)۔

جواب نمبر ۶:

مالِ حرام اگر معروف ہو، یعنی لوگوں سے ظلما لیا گیا ہو خواہ وہ رشوت کے طور پر ہو یا سود کی کمائی ہو، یا غصب شدہ مال ہو، اس مال کو حقدار تک پہنچانا لازم ہے، نیز شریعت کی نظر میں حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، دوسری طرف کچھ مشتبہ امور ہیں، تقوی کے تقاضا کے مطابق مشتبہ مال/امور سے بچنا بھی لازم ہے، لہٰذا حرام مال کو حلال بنانے کی تدبیر تلاش کرنا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''**الحلال بين والحرام بين و بينهما أمور مشتبهات**'' (بخاری:۵۲)۔

جواب نمبر ۷:

صورت مسؤلہ میں کسی کے پاس صرف حرام مال ہی ہو، اسے صدقہ کرنے سے قبل حقوق العباد میں سے کسی پر ظلم

وزیادتی ہوئی ہو (رشوت، سود، غصب) تو سب سے پہلے حقوق کی ادائیگی ضروری ہے، پھر اس کے بعد کچھ مال بچ جائے تو اسے صدقہ کردے، غرباء اور فقراء میں تقسیم کردے، البتہ تجارت کرنے کا ارادہ ہو تو لوگوں سے قرض حاصل کر کے تجارت کرے، لیکن اپنے ہی حرام مال کو بطور قرض استعمال کرنا پھر اسے کاروبار کرنے کے بعد صدقہ کردینا یہ سب حیلہ ہے، لہذا حرام مال کو حیلہ کے ذریعہ حلال بنانے کی تدبیر شرعا درست نہیں ہے۔

جواب نمبر ۸:

کسی بھی شخص کو ملازمت سے قبل کام کی نوعیت معلوم کرنا ضروری ہے، جہاں صرف حرام تجارتیں معروف ہوں، اس نوکری سے دور بھاگنا ضروری ہے، اس لئے کہ مسلمان کسی حرام تجارت میں نوکری یا تعاون کسی بھی صورت میں نہیں کرسکتا، جیسا کہ حدیث شریف میں سودی کاروبار میں تعاون کرنے والے پر بھی وعید وارد ہے: ''**لعن الله الربا و آكله وموكله و كاتبه و شاهده**.....'' (صحیح الجامع: ۵۰۹۴)۔

جواب نمبر ۹:

ملازم اپنی جگہ میں اجیر بالاجرہ ہے، اس کا کام مالک کی تابعداری ہے، اگر اس کا کوئی کام حرام پر مشتمل ہو تو ایسی نوکری سے اجیر کو دستبردار ہونا چاہئے، جیسے سودی حساب وکتاب لکھنا وغیرہ، البتہ اس کا کام کھیتی باڑی ہے، زراعت پیشہ ہے، یا ڈرائیور ہے، یا اس حرام کمائی کرنے والے کی گاڑی میں بیٹھ کر عند الضرورۃ سفر کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، جیسے کسی غیر مسلم یا یہودی کے پاس نوکری کرتے ہوئے حرام کاروبار سے اجتناب اولی ہے، نیز حرام کمائی کرنے والے شخص کے بچوں کی اسکول فیس وغیرہ وصول کرنے میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ حرام مال کا مسؤل وہی شخص ہوگا جس نے کمایا ہے، نہ کہ اس کی آل واولاد یا بیوی بچے وغیرہ۔

جواب نمبر ۱۰:

''**الضرورات تبيح المحظورات**'' یعنی ضرورت اور مجبوری کی صورت میں حرام کام بھی جائز ہوجاتا ہے، آج کے دور میں مختلف حکومتی اداروں کا حال یہی ہے، کراہت کے باوجود رشوت دینی کی صورت پیدا ہوگئی ہے، متبادل صورت نہ ہونے کی وجہ سے ثابت شدہ حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینے کی اجازت ہوگی، لیکن اس مجبوری کے لئے سودی رقم دینے کی اجازت نہ ہوگی، چونکہ جو شخص اپنا حق حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کی خاطر سود کی رقم دینا گویا خود سود کھانے کے برابر ہے، جیسا کہ دار العلوم دیوبند کا فتوی (۸۹ ۵۱۳) ہے: بینک کی سودی رقم پٹواریوں کو رشوت میں دینا جائز نہیں ہے، بلکہ لینا

دینا سب حرام ہے، اگر رقم دئے بغیر پٹواری جائز کام نہ کرے تو مجبوری میں دینے کی گنجائش ہے، لینا ہر حال میں حرام ہے، البتہ بینک کی سودی رقم دینا جائز نہیں۔ دارالعلوم دیوبند۔

جواب نمبر ۱۱:

کسی کے بارے میں اچھی طرح یقین ہو کہ وہ حرام کمائی ہی کرتا ہے اور اس کی غالب کمائی حرام پر مشتمل ہے تو ایسی صورت میں ظن غالب کی بنیاد پر اس کا تحفہ یا مدد قبول نہ کی جائے گی، البتہ جس کی کمائی مشتبہ ہو، اور اس سے سوال کرنا باعث نزاع ہو تو ایسی صورت میں اس کی مدد یا تحفہ قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

جواب نمبر ۱۲:

اکل مال حرام کی شناعت اور خباثت واضح ہے، سب سے بڑی وعید تو یہی ہے کہ دعائیں اور عبادتیں قبول نہیں کی جاتیں، لہٰذا شخص مذکور کی کمائی مکمل حرام ہو تو اس کی دعوت قبول نہ کی جائے، اور نہ اس کے کسی فنکشن میں حاضری دی جائے، خواہ وہ بچہ کے نام رکھنے کا ہی کیوں نہ ہو، علماء حضرات کو محتاط رہنا چاہئے، خودداری اور غیرت کے ساتھ جینا اور مرنا چاہیے، ایسے لوگوں کی دعوت یا امداد قبول نہ کرنا منکر کے ازالہ کی ایک صورت یہ بھی ہے، علماء کرام اپنے مقام اور مرتبہ کو سمجھ کر معاشرہ میں قدم پھونک پھونک کر رکھیں، یہی عین تقوی کا تقاضا ہے، علماء کرام ایسے لوگوں کی دعوتوں اور مجلسوں میں نہ بیٹھیں، ورنہ یہ لوگ علماء کی حاضری کو اپنی کمائی کے حلال ہونے کے لئے بطور شہادت پیش کریں گے، ارشاد باری ہے: ''**فاتقوا اللہ ما استطعتم**'' (جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو)۔

واللہ اعلم و ھو شھید علی ما نقول وکیل ۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وبارک وسلم والحمد للہ رب العالمین ۔

☆☆☆

حرام کمائی کے چند شرعی مسائل

مفتی راشد حسین ندوی☆

الف: وراثت میں ملا ہوا کل مال حرام ہو، اور جس کا مال ہے وہ معلوم ہو، تو اصل مالکوں پر اس کو لوٹانا ضروری ہوگا، خواہ اس طرح کا مال خود حاصل کیا ہو یا وراثت میں ملا ہو، چنانچہ علامہ ابن عابدین ''الدر المختار'' کی عبارت: ''**الحرمة تتقدر مع العلم بها إلا فی حق الوارث**'' کے تحت لکھتے ہیں:

''**أی فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له، لكن إذا علم المالک بعينه فلا شک فی حرمته و وجوب رده عليه**'' **الخ** (ردالمحتار کتاب البیوع باب البیع الفاسد، مطلب فیمن ورث مالا حراما ۴/۱۴۶)۔

ب: کل مال حرام ہو، لیکن اصل مالکوں کا علم نہ ہو، اور اصل مالکوں سے لیا ہوا مال بعینہ موجود ہو، تو اس صورت میں بھی یہ مال واجب التصدق ہے، اس میں تصرفات کرنا ناجائز ہے، علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں: ''**وكذا لايحل له إذا علم عين الغصب مثلا و إن لم يعلم مالكه**'' **الخ** (ایضاً)۔

ج: کل مال حرام ہو، اصل مالکوں کا پتہ نہ ہو، لیکن یہ مال حرام، بعینہ وہ مال نہ ہو جو حرام سے حاصل کیا گیا، بلکہ تصرفات کے بعد دوسری شکلوں میں ہو، تو اس مال کا استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ اس کو اصل مالکوں کی طرف سے صدقہ کردیا جائے: ''**و إلا فله أخذه حكماً، أما فی الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء الخ**'' (ایضاً)۔

د: مال حلال اور حرام ملا ہوا ہو، کل مال حرام نہ ہو، مالکوں کا علم نہ ہو، اور کوئی مال حرام بعینہ موجود نہ ہو، تو حکماً یہ مال اس کے لئے حلال ہے، اگرچہ دیانۃ اس سے بچنا ہی مناسب ہے، علامہ شامی تمام شکلوں کا خلاصہ کرتے ہوئے اخیر میں اس شکل اور گزشتہ شکلوں کے احکام بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه، و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولايعلم أربابه ولا شيئاً منه بعينه**

☆ مدرسہ ضیاء العلوم تکیہ کلاں، رائے بریلی

حل له حكماً، والأحسن ديانة التنزه عنه" (ایضاً)۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"**(قوله وهو حرام مطلقا على الورثة) أی سواء علموا أربابه أولا، فإن علموا أربابه ردوه عليهم، و إلا تصدقوا به كما قدمناه آنفا عن الذخيرة والخانية، لأن الطعام والكسوة ليس عين المال الحرام، فإنه إذا اشترى به شيئا يحل أكله (إلى) بخلاف ما تركه ميراثا، فإنه عين المال الحرام وإن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام، فإنه لايحل التصرف فيه قبل أداء ضمانه و كذا لوارثه، ثم الظاهر أن حرمته على الورثة فی الديانة لا الحكم**" (ردالمحتار کتاب الحظر والاباحۃ فصل البیع ۵/ ۲۷۳، مطبوعہ فیض القرآن)۔

اور دارالعلوم دیوبند کے ایک فتوی میں ہے:

''حرام اور ناجائز مال سے کسی بھی قسم کی تجارت کرنا درست نہیں ہے، لیکن اگر کسی شخص نے اس طرح کے مال سے تجارت کرلی تو اس سے حاصل شدہ آمدنی اور نفع کو حرام نہیں کہا جائے گا، البتہ اگر حرام مال (غصب اور رشوت) وغیرہ اسے حاصل ہوا ہے تو اصل مالک کی طرف اس اصل رقم کا لوٹانا ضروری ہوگا، اور اگر سودی رقم ہے یا مالک کا پتہ ہی نہیں، تو ایسی صورت میں اصل رقم کو غرباء ومساکین وغیرہ پر صدقہ کردیا جائے:"**اكتسب مالا حراما واشترى به أو بالدراهم المغصوبة شيئاً، قال الكرخي إن نقد قبل البيع تصدق بالربح و إلا لا (إلى) لكن الفتوى الآن على قول الكرخي دفعا للحرج على الناس (شامي)**"(فتوی نمبر ۱۵۵-۶۰/ ۱۴۳۴/۲)۔

خلاصہ کلام یہ کہ ایسی صورت میں مال حرام سے جو کمائی ہورہی ہے اس کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے، لیکن جو اصل مال ہے، اس کو اگر اصل مالک معلوم ہوں تو ان پر لوٹانا ضروری ہے، اصل مالک معلوم نہ ہوں تو ان کی طرف سے صدقہ کردیا جائے، واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۲: جب غریب کے پاس مال حرام ہو:

اگر کسی غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائداد اور مال حرام مال سے حاصل شدہ ہے، اور اسی حرام جائداد کے کرایہ وغیرہ سے اس کی زندگی گزر رہی ہے تو مال حرام کے سلسلہ میں وہی تفصیلات رہیں گی جن کا ذکر سوال نمبر ۱ کے تحت گزر چکا ہے۔

البتہ جن صورتوں میں اصل مالکوں کا پتہ نہ ہو، اور غریبوں پر صدقہ کرنے کو ضروری قرار دیا جارہا ہو، ان صورتوں میں کیونکہ وہ خود غریب ہے، لہٰذا اس کے لئے اتنی مقدار میں روک لینے کی گنجائش ہے جس سے اس کا کام چل جائے، اس

طرح کے ایک سوال کے جواب میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کا ایک فتوی ملاحظہ ہو:

''.....لہٰذا صورت مسئولہ میں کسی غریب شخص نے جوا وغیرہ کھیل کر یا اپنے کسی ناجائز کسب سے جو مال حاصل کیا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ مستحق لوگوں میں ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کردے، خود استعمال نہ کرے، ہاں جو حرام مال اس کے کسب کے بغیر حاصل ہوا ہے، اسے اس کے مالکان کی طرف لوٹانے کی کوشش کرے، اگر مالکان کو لوٹانا ناممکن ہو، اور خود مستحق ہو تو خود بھی استعمال کرسکتا ہے، فتاوی شامی میں ہے:''**والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له، و يتصدق به بنية صاحبه**'' (فتوی نمبر ۱۴۴۴۰۴۱۰۰۸۳۵)۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ جب مالکان معلوم ہوں تو غریب شخص پر بھی لوٹانا واجب ہے، لیکن اگر مالکان معلوم نہ ہوں تو سوال نمبر ا کے تحت جو صورتیں درج کی گئی ہیں ان میں سے بقیہ صورتوں میں وہ مال حرام کی آمدنی کو استعمال کرسکتا ہے، لیکن کوشش کرتا رہے کہ اصل مال حرام کی قیمت دوسرے مستحقین کو ادا کردے۔

سوال نمبر ۳: جب شوہر کی کمائی حرام ہو:

جب شوہر یا بیٹے کی کمائی حرام ہو، اور اس کے لئے اس کے استعمال کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو تو وہ اس کو استعمال کرسکتی ہے، حرام کمائی کرنے اور بیوی یا ماں کو حرام کھلانے کا گناہ شوہر اور بیٹے پر ہوگا، شامی میں اس مسئلہ کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے:

''**امرأة زوجها في أرض الجور، و إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلك الطعام غصبا فهي في سعة من أكله، و كذا لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناوله، و الإثم على الزوج**'' (ردالمحتار ۴/۱۴۶)۔

لیکن اس طرح کی صورت حال میں ماں یا بیوی پر لازم ہے کہ وہ بیٹے یا شوہر کو حکمت عملی کے ساتھ کسب حلال کی ترغیب دیں اور حرام مال سے بچنے کی نصیحت کرتی رہیں۔

اسی مسئلہ کے بارے میں مولانا تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:''لیکن اس کی کوشش کے باوجود اگر وہ اس کاروبار کو نہ چھوڑیں، تو پھر اگر ان بیویوں کے لئے جائز طریقہ سے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کے لئے اپنے شوہروں کے مال میں سے کھانا جائز نہیں، لیکن اگر ان کے لئے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہو، تو اس صورت میں ان کے لئے اپنے شوہروں کے مال سے کھانا جائز ہے، اور حرام کھانے کا گناہ ان کے شوہروں پر ہوگا، نابالغ اور چھوٹے بچوں کے لئے بھی یہی حکم ہے، اور حرام کھلانے کا گناہ باپ پر ہوگا، البتہ بالغ اور بڑی اولاد خود کما کر کھائیں، باپ کے مال سے نہ کھائیں۔

اوران حالات میں بیوی کے لئے حرام مال کھانے کے جواز کی بعض فقہاء نے تصریح بھی فرمائی ہے، چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''**اشتری الزوج طعاما أو کسوة من مال خبیث جاز للمرأة أکلها و لبسها و الإثم علی الزوج**'' (ردالمحتار ۶/۱۹۱، کتاب الغصب، فقہی مقالات ۱/۲۶۶-۲۶۷)۔

پھر جب کسی بچہ نے اسی مال کے ذریعہ تعلیم حاصل کی تو جب تک وہ نابالغ ہے اس وقت تک تو اس کے لئے اس مال کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا جائز ہی تھا، البتہ بالغ ہونے کے بعد اس کو خود کمائی کرنی چاہئے تھی، اس نے کمائی نہیں کی پڑھائی جاری رکھی، اور موجودہ حالات میں اس کے خلاف کرنا مشکل بھی ہے، تو اگرچہ اس نے گناہ کا کام کیا، لیکن بہرحال تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب وہ جائز کمائی کر رہا ہو جو کہ اسی تعلیم کی بنیاد پر ہو تب بھی اس کی کمائی جائز ہوگی، اس لئے کہ اب اسے جو تنخواہ مل رہی ہے وہ اس کی محنت کی مل رہی ہے، اور جو منصب ملا ہوا ہے وہ اس کی اہلیت بھی رکھتا ہے، اس لئے اس کی تنخواہ کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس حکم کی تخریج دیوبند کے اس فتوی سے ہو رہی ہے:'' اعلی درجہ کی نوکری حاصل کرنے کے لئے جعلی سرٹیفکٹ بنوانا یہ دھوکہ دہی اور خیانت ہے، اور اس فعل پر آدمی گنہگار ہوگا، اور اگر نوکری حاصل کر لی تو اس کی تنخواہ جائز رہے گی، البتہ جعلی اور فرضی سرٹیفکٹ بنوانے اور جمع کرنے پر وہ گنہگار ہوگا'' (فتوی نمبر ۱۰، B/۷۴۰-۷۴۰)۔

خلاصہ جواب یہ کہ صورت مسئولہ میں بحالت مجبوری یہ خاتون اپنے شوہر یا بیٹے کی کمائی کھا سکتی ہیں، گناہ اس کو نہیں حرام کمائی کرنے والے کو ہوگا، واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۴: جب یہ نہ معلوم ہو کہ پورا مال حرام ہے یا کچھ تو ایسی صورت میں دعوت قبول کرنا:

اگر اکثر مال حلال ہے تو دعوت قبول کرنا جائز ہے، الا یہ کہ معلوم ہو کہ دعوت حرام مال سے کی گئی ہے، اور اگر کل یا اکثر مال حرام ہو تو دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ وہ بتائے کہ دعوت میں حلال مال سے کر رہا ہوں:''**أهدی إلی رجل شیئاً أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن یعلم أنه حرام، فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی أن لایقبل الهدیة و لا یأکل الطعام إلا أن یخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل**'' (ہندیہ ۵/۳۴۲، کتاب الکراہیۃ الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات)۔

اسی میں ص ۳۴۳/ پر ہے:''**وکذا دعوة من کان غالب ماله من حرام مالم یخبر أنه حلال وبالعکس یجیب مالم یتبین عنده أنه حرام، کذا فی التمر تاشی**''۔

لہٰذا جس صورت سے متعلق سوال ہے اس کے مبتلی بہ کو چاہئے کہ تحقیق کرنے کی کوشش کرے، قرائن سے اگر پتہ چلے کہ ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہے تو اس پر عمل کرے، لیکن اگر پتہ نہ چل سکے، لیکن حرام کاروبار کا یقینی پتہ ہو تو ایسی

صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ دعوت قبول نہ کرے، لیکن اگر قبول کرلیتا ہے تو اس تاویل سے اس کی گنجائش ہوگی کہ بظاہر ایک مسلمان پورا کاروبار حرام نہیں رکھے گا، اور اس سے نہیں کھلائے گا: "**رجل أهدى إلى إنسان أو أضافه إن كان غالب ماله من حرام لاينبغي أن يقبل و يأكل من طعامه مالم يخبر أن ذلك المال حلال استقرضته أو ورثته**" (المحیط البرہانی ۵/ ۳۶۷، الفصل السابع عشر فی الہدایا والضیافات)۔

سوال نمبر ۵: کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ دعوت دینے والے کی آمدنی حرام ہے:

گزشتہ اوراق میں فقہی عبارات کے حوالوں کے ساتھ وضاحت کی جاچکی ہے کہ حرام آمدنی والے کے یہاں عمداً کھانا کھانا یا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کھالینے کے بعد حرمت کا پتہ چلتا ہے، پہلے معلومات نہیں ہوسکیں تو ظاہر ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**لایکلف الله نفسا إلا وسعها**"، لیکن پیچھے گزرا کہ اگر کسی کے پاس مال حرام آجائے تو اگر مالک معلوم ہو تو اس کو لوٹا دیا جائے، اور معلوم نہ ہو تو صدقہ کردیا جائے، یہی حکم اس ہدیہ کا ہے جو مال حرام سے دیا گیا ہو، اور اگر مغصوبہ مال ہلاک ہوگیا ہو تو اس کی قیمت واپس کرنے کا حکم ہے، اور آیات کے اس مجموعہ سے یہ حکم نکالا جاسکتا ہے کہ دعوت کھانے کے بعد اگر پتہ چلے کہ دعوت میں مال حرام کھلایا گیا ہے تو اگر اس مال حرام کا مالک معلوم ہو تو جتنا کھایا ہے اس کے بقدر اس کو لوٹا دے، اور اگر معلوم نہ ہو تو اسی کے بقدر صدقہ کردے تو ان شاء اللہ ماخوذ نہیں ہوگا، اور اگر کھانے کے معاً بعد پتہ چلے تو اگر ممکن ہو تو اسوہ صدیقی اختیار کرے، اس طرح کا حرام مال کھانے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قے کردی تھی: "**فأدخل أبو بكر يده فقاء كل شئ في بطنه**" (بخاری کتاب مناقب الانصار باب أیام الجاہلیۃ (۳۸۴۲)، لیکن ایسا کرنا نہ لازم ہے نہ ضروری، اس لئے کہ اس کے تحت بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے ابن سیرین سے یہ بات بھی نقل کی ہے: "**لم أعلم أحداً استقاء من طعام غير أبي بكر**"۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگرچہ راقم کو اس کے بارے میں کوئی صریح جزئیہ نہیں مل سکا، لیکن گزشتہ سوالات کے تحت جو فقہی عبارات درج کی گئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں جتنا کھایا ہے اس کے بقدر اصل مالک معلوم ہو تو اس کو لوٹا دے، معلوم نہ ہو تو صدقہ کردے، اور سچے دل سے اللہ سے توبہ کرے، واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۶: حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کا حیلہ:

جو مال بعینہ حرام ہے، اس کو حلال کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، اگر متعین مالک ہو تو اس کو لوٹانا ورنہ اس کو غریبوں پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

خلاصہ جواب یہ کہ عین مال حرام کو حلال کرنے کا میرے علم کے مطابق کوئی طریقہ موجود نہیں ہے، بقیہ اس کے ذریعہ کمائے ہوئے مال کا حکم اوپر درج کیا جاچکا ہے، واللہ اعلم۔

سوال نمبر ۷: اپنے پاس موجود مال حرام کو قرض لینا:

یہ بات کئی بار آچکی ہے کہ اپنے پاس موجود حرام مال کا مصرف متعین ہے، اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں ہے، اگر انجانے میں اس سے نفع کمایا ہے تو اس کا حکم بھی اوپر بیان کیا جاچکا ہے، جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ وہ اس کو بطور قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟ تو اگر ایک لفظ میں جواب دیا جائے تو وہ یہی ہوگا کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا، اس لئے کہ مذکورہ مصارف میں اس کا ذکر نہیں ہے، لیکن اگر صورت حال یہ ہو کہ اس کو ان اموال کو کاروبار میں لگانے کی شرعی حاجت ہو، مال حلال اس کو نہ مل رہا ہو، اس کے صرف دو راستے ہوں، یا وہ سودی قرض لے یا اس مال حرام کو بطور قرض لے، تو اس طرح کی صورت حال میں وہ کیا کرے؟

راقم کے خیال میں اس طرح کی صورت حال میں اہون البلیتین اختیار کرتے ہوئے اس کے لئے اس مال سے کاروبار کی اجازت ہوگی، لیکن اس سے مال کی خرید وفروخت کرتے ہوئے طریقہ وہی ہونا چاہئے جس کو بعض فقہاء نے جائز قرار دیا ہے، اور امام کرخی نے جس پر فتوی دیا ہے:

"توضیح المسألة فی التتارخانیة حیث قال رجل اکتسب مالا من حرام (إلی) لکن الفتوی الآن علی قول الکرخی دفعاً للحرج عن الناس" (ردالمحتار)۔

مذکورہ بالا مسئلہ پر قیاس کرکے کہا جاسکتا ہے کہ اصلاً تو مذکورہ مال کو بطور قرض لینا جائز نہیں ہے، لیکن جب کاروبار کے لئے مال حلال نہ مل رہا ہو، یہ مال ہو یا سودی قرض لیا جاسکتا ہو تو اس کے ذریعہ کاروبار کی گنجائش ہوگی، لیکن اس کو یقینی بنایا جائے کہ ہر صورت میں مال حرام کو صدقہ کیا جائے گا؛ خواہ کاروبار میں نقصان ہی کیوں نہ ہوجائے، اور جب مال حرام کسی متعین شخص کا ہو تو اس کی گنجائش نہیں ہوگی، واللہ اعلم۔

☆☆☆

حلال وحرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مولانا رحمت اللہ ندوی☆

تمہیدی گفتگو:

اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس نے حلال وحرام میں امتیازی خط کھینچا ہے اور دونوں کا حکم بیان کیا ہے، قرآن وحدیث میں تفصیل موجود ہے، نہ صرف حرام سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیا ہے، بلکہ مشتبہ چیزوں کو چھوڑنے کی بھی تاکید کی ہے، اسی لئے کسب معاش میں جائز ذرائع اختیار کرنے اور ناجائز ذرائع کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے، ناجائز اور حرام آمدنی میں چوری، ڈاکہ زنی، سود، جوا، رشوت، خیانت، دھوکہ اور بدعہدی وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا ہوا مال شامل ہے۔

اگرچہ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں حلال وحرام واضح کردیئے گئے ہیں، لیکن موجودہ دور میں انسان کی بے جا حرص وہوس اور راتوں رات مالدار بننے کا سپنا اور خواب اسے اندھا اور بہرا بنا دیتا ہے اور جلد کروڑ پتی بننے کا بھوت حلال وحرام کی تمیز ختم کردیتا ہے، پھر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ روپے جائز ہیں یا ناجائز، ذریعہ آمدنی حلال ہے یا حرام، بلکہ اس کا نظریہ اور مزاج یہ بن جاتا ہے کہ ''پیسہ ہو چاہے جیسا ہو''۔

حرام کمائی سے متعلق مسائل کسی شخص، قوم اور علاقہ کے ساتھ خاص نہیں، غیروں کی نقل میں مسلمان دانستہ اور غیر دانستہ طور پر من حیث القوم مبتلا ہیں، اس لئے یہ موضوع اہم بھی ہے اور وقت کا تقاضا بھی۔

ذیل کی سطروں میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے سوالنامے کے مختصر جوابات پیش خدمت ہیں:

حرام سرمایہ سے حاصل ہونے والی جائیداد:

۱- وارثین کو اگر بہ تحقیق معلوم ہوجائے کہ ان کو اپنے مورث سے وراثت میں حاصل ہونے والا مال حرام ذریعہ مثلاً غصب یا ناجائز قبضہ یا سودی لین دین سے حاصل ہوا ہے، تو ایسی صورت میں وارثین کے لیے لینا اور استعمال کرنا جائز نہ ہوگا۔

☆ استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

علامہ ابن رشد مالکیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"**أما الميراث فلا يطيب المال الحرام هذا هو الصحيح**" (المقدمات الممہدات ۲/ ۶۱۷)۔

علامہ شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"**مات و كسبه حرام فالميراث حلال، ثم رمز الناقل و قال: لا نأخذ بهذه الرواية و هو حرام مطلقا على الورثة فتنبه**" (ردالمحتار ۵/ ۱۰۴)۔

البتہ ملک کی آزادی سے قبل جو سودی رقم برادران وطن سے حاصل ہوئی تھی اگر محقق ہو تو وہ جائز ہے اور اس کا استعمال بھی درست ہے، کیونکہ آزادی سے پہلے ملک کو دارالحرب قرار دے دیا گیا تھا۔

لیکن یہاں حلت وحرمت دونوں جمع ہو گئے ہیں اور جب ایسا ہو تو حرمت، حلت پر غالب آتی ہے۔

حرام مال وجائیداد کا حکم:

۲- جس مال اور جائیداد کے بارے میں قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ حرام طریقہ سے حاصل کی گئی ہے، خواہ خود حاصل کیا ہو یا وراثت میں ملی ہو، تو وہ مال اور جائیداد اس کے لئے ناجائز اور حرام ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری لکھتے ہیں:

"**الحرمة تتعدى مع العلم بها**" (الاشباہ والنظائر ۲۳۵)۔

الموسوعۃ الفقہیۃ میں ہے:

"**المال الحرام كالمأخوذ غصباً أو سرقة أو رشوة أو نحو ذلك ليس مملوكاً لمن هو بيده**" (الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۳)۔

امام شافعیؒ کے نزدیک حرام مال و دولت اگر کئی لوگوں تک پہنچ جائے، پھر بھی اس کی حرمت باقی رہتی ہے اور اصل مالک کو واپس کرنا واجب ہوتا ہے۔

البتہ بعض فقہاء کی رائے ہے کہ وہ مال و جائیداد "قابض شخص کے لئے حلال ہے، کیونکہ "اثمان" (غیر اعیان) کے ذریعہ حاصل ہوا ہے، اگر اعیان ہی مغصوب (غصب شدہ) ہیں تو ان کو صدقہ کرنا ضروری ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں: ردالمحتار مع الدر، کتاب اللقطۃ ۶/ ۴۴۳)۔

خاکسار کی رائے میں نقود غیر متعینہ سے حاصل کردہ موجودہ مال و دولت، زمین، جائیداد، مکان اور دیگر آمدنی اور اشیاء حلال ہیں، کرایہ لینا بھی جائز اور درست ہے، لیکن پوری جائیداد کے انتظام و انصرام میں جو ناجائز رقم لگی ہے اس کا

اندازہ کر کے اتنی مقدار صدقہ کر دیا جائے۔

سرپرستوں کے حرام کاروبار اور ماتحتوں کا حکم:

۳-اگر عورت مجبور ہے اور اس کے پاس جائز آمدنی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہے، نہ کوئی ہنر جانتی ہے اور نہ باہر جا کر کہیں سے کچھ کما سکتی ہے، تو اس کے لئے اپنے شوہر یا اولاد کی آمدنی سے کھانے کی اجازت ہے، حرام آمدنی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس تعلیم سے حاصل ہونے والی کمائی اور آمدنی حلال ہے، البتہ جو رقم اس کی تعلیم پر خرچ ہوئی ہے اس کا اندازہ کر کے صدقہ کر دے، تاکہ باپ یا سرپرست سے گناہ ساقط ہو جائے:

"**لأن الطعام والكسوة ليس عين المال الحرام، فإنه إذا اشترى به شيئاً يحل أكله**" (الردمع الدر، کتاب الحظر والإباحۃ ۵/ ۵۵۴، زکریا)۔

عورت کو چاہئے کہ اپنے شوہر یا اولاد کو حرام کمائی سے روکے، اور جائز کمائی کے ذرائع کی نشاندہی کر کے اس میں مشغول کرنے کی حتی الامکان کوشش کرے، پھر بھی اگر وہ باز نہیں آئیں تو اگر عورت کے پاس حلال روزی کا کوئی طریقہ ہو تو اسے اپنائے ورنہ مجبور ہو تو اس مال حرام سے کراہت کے ساتھ کھائے، اور دیگر ضروریات کی تکمیل کرے، اس پر گناہ نہ ہوگا، بلکہ شوہر یا اولاد پر ہوگا۔

"**اشترى الزوج ..... طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله، ولبسها والإثم على الزوج**" (ردالمحتار علی الدر ۶/ ۱۹۱)۔

حرام وحلال کی مخلوط آمدنی سے دعوت:

۴-اصول شریعت یہ ہے کہ اگر آدمی کی آمدنی کا اکثر حصہ حرام ہے اور مدعو کو اس کا علم ہے تو ایسے شخص کی دعوت قبول کرنا یا ہدیہ لینا جائز نہیں ہے، جب تک داعی کی طرف سے اس کی وضاحت نہ ہو جائے کہ دعوت حلال آمدنی سے کی جارہی ہے اور اگر اس شخص کی آمدنی کا اکثر حصہ حلال ہے اور کچھ حرام بھی ہے تو دعوت قبول کرنا جائز ہے، إلا یہ کہ داعی یہ واضح کر دے کہ دعوت مال حرام سے کی جارہی ہے۔

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"**إن كان غالب ماله من حلال فلا بأس به بأن يقبل الهدايا و يأكل، مالم يبين له أن ذلك من الحرام**" (الفتاوی التاتارخانیۃ ۱۸/ ۱۷۵)۔

خلاصۂ کلام یہ کہ جب داعی یا واہب حرام کمائی میں مبتلا ہے اور اس کے پاس حرام کمائی آتی ہے، لیکن یہ متعین نہیں کہ اس کی کیا مقدار ہے؟ پورا مال حرام ہے یا کچھ حصہ حرام ہے؟ تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ زیادہ کھود کرید اور تحقیق وتفتیش کی ضرورت نہیں، مسند احمد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن رکھ کر ادھار لیا تھا، حالانکہ یہودیوں کی سودخوری محتاج بیان نہیں۔

''شرح السنۃ'' میں ہے:

"قالوا إذا كان المال فيه الحلال والحرام فلا بأس أن يوكل منه إلا أن يعلم أن الذى يطعمه أو يهديه إليه حرام بعينه فلايحل" (شرح السنۃ ۸/ ۱۴)۔

معلوم ہوا کہ اگر حلال وحرام دونوں طرح کے مال مخلوط ہوں تو دعوت کھانے کی گنجائش ہے جب تک کہ وہ خود وضاحت نہ کرے کہ مال حرام سے کھلا رہا ہے، لیکن علماء اور مقتدا قسم کے لوگوں کو ایسی دعوت قبول کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

مال حرام سے دعوت کھانے کی تلافی:

۵- اگر دعوت کھانے والا شخص غریب اور محتاج ہے، صدقہ کرکے تلافی نہیں کرسکتا ہے تو اس کو چاہئے کہ توبہ و استغفار کرے۔

لیکن اگر وہ مالدار شخص ہے تو توبہ واستغفار کے ساتھ ساتھ ایک اندازہ کرکے اس کی قیمت صدقہ کردے، کیونکہ مال حرام کے استعمال اور استفادہ کا یہی حکم ہے کہ اگر بعینہ وہی چیز واپس کرنا ممکن ہو تو ٹھیک ہے ورنہ قیمت صدقہ کردے، اگر حرام کھانے کے فوراً بعد پتہ چلے تو قے کرکے نکال دے۔

لیکن صورت مسئولہ میں کھانے کے بعد دیر سے علم ہو رہا ہے، اس لئے قیمت ہی صدقہ کرنا ایک حل ہے؛ کیونکہ اصل فوت ہو تو بدل پر عمل ہوتا ہے۔

"إذا بطل الأصل يصار إلى البدل" (مجلۃ الاحکام العدلیۃ)۔

البتہ فقہاء نے یہ صراحت کی ہے کہ اگر کھانے والا خود فقیر اور محتاج ہے تو اس کے لئے صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے، کھانے کی گنجائش ہے، کیونکہ بوقت ضرورت مال حرام سے نادار اور ضرورت مند کو فائدہ اٹھانے کی اجازت دی گئی ہے۔

"الملك الخبيث سبيله التصدق، ولو صرفه فى حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنياً تصدق بمثله وإن كان فقيرا لايتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۷۰)۔

مال حرام کو جائز دائرہ میں لانے کی تدبیر:

۶- گزشتہ سالوں میں حرام کمائی کو حلال کے دائرہ میں لانے کی تدبیر اور حیلہ بعض علماء اور ارباب افتاء نے یہ لکھی ہے کہ اگر اس شخص نے کوئی سامان ادھار خریدا، پھر اس ناجائز مال سے اس کی قیمت ادا کردی تو وہ سامان اس کے لئے حلال ہوجائے گا، اس طرح بالواسطہ اس کی رقم پاک اور استعمال درست ہوجائے گا۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

''**والحيلة في هذه المسائل أن يشترى نسيئة، ثم ينقد ثمنه من أى مال شاء**'' (الفتاوی الہندیۃ ۵/ ۳۴۲، کتاب الکراہیۃ)۔

لیکن یہ واضح رہے کہ یہ حیلہ مطلقا درست نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ مال حرام کو ملکیت میں لانے، پھر جان بوجھ کر نفع اٹھانے کا گناہ ختم کیسے ہوسکتا ہے؟

لہٰذا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''اس حیلہ سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض سے جو کھانا خریدے گا، وہ حلال ہوجائے گا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام رقم سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا'' (فتاوی عثمانی ۳/ ۱۲۵)۔

معلوم ہوا کہ اوپر ذکر کردہ طریقہ مال حرام کو پاک کرنے مکمل طور پر صحیح نہیں ہے۔

مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مال حرام جس کا صدقہ کرنا واجب قرار دیا جاتا ہے، وہ ہر مال حرام نہیں بلکہ صرف وہ مال حرام ہے، جس کے مالک نامعلوم یا لاپتہ ہونے کی وجہ سے مالک کو واپس نہیں کیا جاسکتا، نیز یہ صورت بحکم لقطہ ہوجاتا ہے، اور اصل مالک کی طرف سے صدقہ کیا جاتا ہے؛ اس لئے فقراء کو اس کا لینا جائز ہے، ان کے لئے حرام نہیں، اس بناء پر ایسے اموال کا صدقہ اپنے ماں، باپ، اولاد اور بیوی پر کرسکتا ہے؛ کیونکہ اس کا صدقہ نہیں ہے؛ بلکہ اصل مالک کا ہے۔

لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جمع شدہ حرام مال کو اصل مستحق تک واپس کیا جائے یا صدقہ کردیا جائے۔

لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جمع شدہ حرام مال کو اصل مستحق تک واپس کیا جائے یا صدقہ کردیا جائے۔

لیکن اگر اصل حرام مال تجارت میں لگا دیا تو اب جاری تجارت اور کاروبار کی آمدنی حلال ہوگی، البتہ جتنی مقدار میں حرام مال تجارت میں لگ۔ یا ہے اتنی مقدار کا اندازہ کرکے صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

حرام مال بطور قرض لینے کا حکم:

۷-حرام کمائی کا پہلا مصرف یہ ہے کہ جس سے وہ مال لیا ہے یا جس سے حاصل ہو رہا ہے اس کو واپس کیا جائے، اگر یہ صورت مشکل ہو تو صدقہ کر دیا جائے۔

لیکن بعض فقہاء نے ضرورت مند اور اصحاب حاجت کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، اپنے استعمال میں لانے کی ایک وقتی طور پر قرض واپس کر دینے کی بھی ہے۔

چنانچہ علامہ موصلیؒ لکھتے ہیں:

"**الملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجة نفسه جاز، ثم إن کان غنیاً تصدق بمثله، و إن کان فقیرا لایتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/۷۰، بیروت)۔

بعض حضرات کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتی طور پر قرض لے کر بوقت سہولت رأس المال کے بقدر صدقہ کر دے۔

"**فإن کان یقدر یتجر أو یعمل صنعة کالنسج والغزل، أعطی ما یکون له رأس، و إن اقترضوا منه شیئاًلیکتسبوا به، ولم یردوا عوض القرض کان أحسن**" (مجموع فتاوی ابن تیمیہ)۔

لیکن بہتر شکل یہ ہے کہ وہ شخص پہلے اس رقم کو کسی غریب کو صدقہ کر دے، پھر اس سے قرض لے لے، بعد میں واپس کر دے، اسی طرح بیوی، بالغ فقیر اولاد، محتاج والدین پر صدقہ کر دے، پھر ان سے قرض یا ہدیہ لے لے۔

حلال وحرام سے مخلوط کاروبار میں ملازمت:

۸-حرام وحلال مخلوط کاروبار میں ملازمت کا حکم یہ ہے کہ کام کرنے کی مقدار دیکھی جائے گی، اگر حلال کام کی مقدار زیادہ ہے تو اس کی آمدنی حلال سمجھی جائے گی، اور اگر حرام کی مقدار زیادہ ہے تو حرام کی نوعیت پر غور کیا جائے گا کہ وہ ملازم حرام کاروبار کا سبب بن رہا ہے یا مباشر؟

اگر سبب بن رہا ہے تو جائز اور اگر مباشر بن رہا ہے تو ناجائز ہوگا۔

اسی طرح یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اصلاً حلال کام کے لئے معاہدہ ہوا تھا، لیکن اس کے ساتھ خلاف معاہدہ کچھ حرام بھی کرنا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں آمدنی جائز ہوگی، لیکن کام کرنے والے کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی ملازمت کو جلد چھوڑنے کی کوشش کرے اور دوسری جائز ملازمت متبادل کے طور پر اختیار کر لے، کیونکہ یہ تعاون علی الإثم ہے اور اسلام نے

"ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان" کہہ کر منع کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ اگر آدمی کا کاروبار حرام چیزوں کا ہو اور اس میں اس کا عملاً تعاون پایا جاتا ہو تو وہاں نوکری اور ملازمت کرنا اور اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر مخلوط کاروبار میں صرف جائز کام کرنا پڑتا ہو، ناجائز نہیں، تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔

حرام کمائی سے حاصل شدہ جائیداد سے استفادہ:

۹- اگر کسی شخص کی ملازمت اور ڈیوٹی متعین اور مخصوص حرام کام میں نہیں ہے، البتہ اس شعبہ میں ناجائز کام بھی ہوتا ہے تو ایسی جگہوں میں ملازمت کی اجرت حلال ہے، غیر متعین اور غیر مشارالیہ حرام نقود سے خریدی گئی گاڑی میں خبث و ناپاکی کا اثر نہیں ہوتا، اس لئے ایسی گاڑیوں میں سفر کرنا درست ہے۔

یہی حکم فیس کا ہے، ایسے لوگوں کے بچوں کی تعلیمی فیس اس رقم سے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن متعین و مشار إلیہا حرام نقود سے فیس دیتا ہو تو لینا جائز نہیں ہے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ حرام کمائی سے حاصل کردہ جائیداد اگر بعینہ حرام ہے، مثلاً غصب کردہ یا رشوت سے ہے، تو وہ زمین بالکلیہ حرام ہوگی، اس میں کاشت کرنا بھی ناجائز ہوگا، اس کو اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ اس پر ملکیت ثابت ہی نہیں ہوئی۔

"**المال الحرام کالماخوذ غصبا أو سرقة أو رشوة أو رباً أو نحو ذلک لیس مملوکاً لمن هو بیده**" (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۳/۲۴۸)۔

اگر نفس جائیداد حرم نہ ہو، بلکہ حرام مال سے خریدی گئی ہو تو پھر اس میں تفصیل ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض صورت میں جائز اور بعض میں ناجائز ہے۔

رشوت میں سود کی رقم دینا:

۱۰- بوقت مجبوری رشوت میں معمولی رقم کا استعمال کیسا ہے؟ اس تعلق سے ارباب فقہ وفتاوی کی دو آراء ہیں:

۱- جواز ۲- عدم جواز

عدم جواز کے قائلین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سود کا اولین مصرف یہ ہے کہ اصل مالک کو واپس کردی جائے، ورنہ بصورت دیگر بلا نیت ثواب صدقہ کردیا جائے، رشوت کا بھی یہی حکم ہوگا، یہ رقم سرکاری خزانے میں نہیں جاتی؛ بلکہ ملازمین اور کلرک لوگوں کی جیبوں میں جاتی ہے۔

لہٰذا اس قسم کی رقم کارپوریشن کے ملازمین کو بطور رشوت دینا جائز نہیں، لیکن جواز کے قائلین کے نزدیک بوقت مجبوری رشوت میں سود کی رقم استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

مفتی عبید اللہ اسعدی لکھتے ہیں:

''ایک جماعت کے نزدیک رفاہی کاموں میں اس کا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے،.....لقطہ، واجب التصدق ہوتا ہے؛ لیکن واجب التملیک نہیں، اور لقطے کے مصارف میں کارِ خیر مثلاً حکومت کی ضرورت کے مختلف کام، عامۃ الناس اور عامۃ المسلمین کی ضرورت کے کاموں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

لہٰذا یہ رقم رفاہی کاموں میں بھی استعمال کی جاسکتی ہے.....جو عام انسانوں کے لئے مفید ہوں'' (مقالات اسعدی، ج: ۶/۲۲۶/۲۲۷)۔

موجودہ دور میں حالات اور مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ مجبوری اور اضطرار کی حالت میں سود کی رقم ملی کاموں میں استعمال کرنے کی گنجائش ہو، جبکہ دوسرا جائز متبادل نہ ہو۔

اکثر آمدنی حرام ہو تو ہدیہ قبول کرنے کا حکم:

۱۱- جس شخص کی اکثر آمدنی حرام ہو اس سے ہدیہ قبول کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کے بارے میں متعین طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ سود خور ہے تو صرف امکان کی وجہ سے رقم اور کمائی کے حرام اور ناپاک ہونے کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، لیکن اگر یقین ہو تو حرام ہوگا۔

اگر اکثر آمدنی حلال اور کچھ حرام ہے تو ہدیہ قبول کرنا درست ہے، اس کے برعکس نہیں، کھود کرید کرنا درست نہیں، بلکہ حسن ظن ہے کہ حلال سے دے رہا ہوگا، لیکن تقوی احتیاط کرنے اور بچنے میں ہے۔

''**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فأطعمه طعاما فليأكل من طعامه ولا يسأله عنه، فإن سقاه شراباً يشربه، فليشرب من شرابه ولم يسأله عنه**'' (مسند احمد ۲/۲۹۹، ج: ۹۱۷۳)۔

حرام کمائی والے کی دعا کا حکم:

۱۲- کسی عالم یا بزرگ کا حرام کھانے والے کے لئے دعا کر دینا، پانی پر دم کرنا، اس کے بچوں کا نام رکھنا درست ہے؛ کیونکہ دعا کرنے والا خود اس حرام میں ملوث نہیں ہے، دوسرے کا حرام کمائی میں شامل ہونے سے اس عالم اور بزرگ کی دعا پر اثر نہیں پڑے گا۔

لیکن جس کی کمائی حرام ہو اور حرام کمائی سے کھاتا ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، صحیح مسلم میں ہے:

"الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء، يا رب! يا رب! و مطعمه حرام و مشربه حرام، و غذى بالحرام فأنى يستجاب" (صحیح مسلم: ۱۰۱۵۔ کتاب الزکوۃ باب قبول الصدقۃ)۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث قبول دعا کے استبعاد کو ظاہر کرنے کے لئے بطور تمثیل ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر کسی شخص کا کاروبار حلال اور پاکیزہ نہ ہو تو اس کو دعا کرنے سے روکا نہیں گیا ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کی دعا قبول نہیں ہوگی، لہٰذا مذکورہ شخص اپنے یا بچوں کے لئے کسی نیک شخص سے دعا کی درخواست کرے تو اس کے لیے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆☆☆

حرام کاروبار سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد مقصود فرقانی ☆

۱-اس شخص کی کمائی حلال ہے اور وراثت میں جو اسے حرام مال ملا ہے اس کے جوابدہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے وہ مال چھوڑا ہے اور اس مال سے اس کی جوابدہی کا کوئی تعلق نہیں ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ اگر اس کے پاس اس قدر مال ہو جائے کہ وراثت میں جو اسے مال حرام ملا ہے وہ مال صدقہ کر دے تو خود غریب نہ ہو تو ایسی صورت میں مال حرام صدقہ کر دینا چاہئے، تاکہ اس کے مورث آخرت میں بری الذمہ ہو جائیں یا ان کی جوابدہی میں تخفیف ہو جائے، الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۶/ ۳۳۵ پر ہے: "**و علی هذا یستحب أن یختار الرجل أحل ماله و أبعده عن الحرام و الشبهة فیتصدق به، و إذا کان فی عهدة المکلف مال حرام فإن علم أصحابه وجب رده إلیهم و إن لم یعلم أصحابه یتصدق به**"۔

۲-اس سوال کے جواب کی دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ وہ مال وراثت میں ملا ہے یا اس کا کمایا ہوا ہے، اگر اسے وراثت میں ملا ہے تو اس کا حکم وہی ہے جو پہلے جواب یعنی نمبر ۱، کا ہے اور اگر وہ مال اس کا کمایا ہوا ہے تو پھر اس کا تصدق کمائے ہوئے مال کے بقدر واجب ہے، موسوعہ میں ہے: "**إذا کان علیه دیون و مظالم لایعرف أربابها و أیس من معرفتهم فعلیه التصدق بقدرها من ماله و إن استغرقت جمیع ماله**" (موسوعہ فقہیہ ۲۶/ ۳۳۵)۔

۳-مذکورہ صورت میں جہاں تک ممکن ہو سکے بیوی شوہر کو اور ماں اپنے بیٹے کو حرام کمائی سے روکتی رہے، اگر بیوی اور ماں کے حرام کمائی سے منع کرنے کے باوجود بھی شوہر یا بیٹا باز نہیں آئے تو اس کا گناہ شوہر اور بیٹے پر ہوگا، بیوی اور ماں پر نہیں ہوگا اور بچہ کو حرام کمائی سے نہیں پڑھانا چاہئے، اگر بچہ کو حرام کمائی سے پڑھایا اور بچہ پڑھ لینے کے بعد کمائی کر رہا ہے تو ایسی صورت میں اگر اس شخص کے پاس مال ہے تو وہ اپنے مال سے اس قدر مال تصدق کرے جس قدر بچہ کی پڑھائی پر خرچ کیا ہے اور اگر اس کے پاس مال نہیں ہے تو پھر بچہ کی کمائی سے تصدق کرے اور اگر باپ بچہ کو پڑھا لکھا کر حرام کمائی سے انتقال ہو جائے تو پھر وہ بچہ یا تو وراثت کے مال سے یا اپنی کمائی سے اس قدر تصدق کر دے جتنا اس کی تعلیم پر خرچ ہوا ہے، الموسوعۃ

☆ جامع العلوم فرقانیہ، رامپور

الفقہیہ میں ہے:"وقال ابن الهمام يؤمر بالتصدق بالأموال التى حصلت بالقدر كالمال المغصوب و صرح الحنابلة بأن من بيده نحو غصوب أو رهون أو أمانات لايعرف أربابها و أيس من معرفتهم فله الصدقة بها منهم أى من قبلهم و قال بعضهم يجب عليه التصدق" (موسوعہ فقہیہ ۲۶/۳۳۵)۔

۴-صورت مذکورہ میں اگر اس شخص کی کمائی کے بارے میں معلوم ہے کہ اس کا کل کاروبار حرام ہے تو اس صورت میں اس کی دعوت میں نہیں کھانا چاہئے، اور اگر اس کا کاروبار حرام وحلال سے مخلوط ہے تو از روئے فتوی اس کی دعوت کھائی جاسکتی ہے، البتہ تقوی یہ ہے کہ ایسی صورت میں بھی اس کی دعوت میں کھانا نہ کھائے اور اگر اس شخص کے کاروبار کے بارے میں بالکل معلوم نہیں ہے کہ حرام ہے یا حلال یا اس کی کمائی مخلوط ہے تو اس صورت میں اس کی دعوت میں کھالینا چاہئے اور اگر اس کی کمائی کے بارے میں معلوم تو نہیں ہے، مگر حرام کام کا شبہ ہے تو از روئے تقوی شبہ کی بنیاد پر دعوت سے بچنا چاہئے اور از روئے فتوی دعوت میں کھانے کی گنجائش ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے:"أما الأموال التى فيها شبهة فالأولى الابتعاد عنها، قال النبى صلى الله عليه وسلم فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه و عرضه" (حوالہ سابق)۔

اور الموسوعۃ ہی میں ہے:"سئل ابن تيمية عن حكم معاملة من غالب أموالهم حرام مثل المكاسين و أكلة الربا و أشباههم فهل يحل أخذ طعامهم بالمعاملة أم لا؟ فأجاب إذا كان فى أموالهم حلال وحرام ففى معاملتهم شبهة لايحكم بالتحريم إلا إذا عرف أنه يعطيه مايحرم إعطاؤه ولايحكم بالتحليل إلا إذا عرف أنه أعطاه من الحلال فإن كان الحلال هو الأغلب قيل بحل المعاملة و قيل بل هى محرمة" (حوالہ سابق ۳۸/۳۸۰)۔

اور الموسوعۃ ہی میں ہے:"الفقهاء متفقون على أنه لاتجب إجابة دعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال ونص الشافعية والحنابلة على أنه تكره إجابته و إنما اختلفوا فى إجابة وليمة من كان فى ماله حرام فذهب الشافعية والحنابلة فى المعتمد إلى أنه تكره إجابة من فى ماله حرام لحديث من اتقى الشبهات فقد استبرأ لدينه و عرضه و يرى الحنفية أن المدعو يجيب دعوة من كان غالب ماله حلال مالم يتبين عنده أنه حرام، وقال المالكية: إذاكان فى الطعام شبهة لايجوز الحضور ولا الأكل و يرى ذلك جميع من الحنابلة منهم الشيرازى والازجى حيث قالوا بتحريم الأكل مطلقاً ولو قل الحرام كما لو كان كله حراماً كما اختار جمع منهم الخرقى و ابن الجوزى أنه إن كان الحرام أكثر حرم الأكل و إلا فلا يحرم إقامة للأكثر مقام الكل و اختار جمع آخر منهم صاحب

الرعاية أنه إن زاد الحرام على الثلث حرم الأكل و إلا فلا" (حوالہ سابق ۴۵/ ۲۴۳)۔

۵-اس صورت میں اگر ممکن ہو تو کھانے کی قئ کردے؛ بشرطیکہ اسے طبی اعتبار سے نقصان نہ پہنچے اور اگر قئ کرنے سے نقصان پہنچے یا قئ دشوار ہو تو پھر کھانے کے بقدر تصدق کردے اور یہ تصدق واجب نہیں ہے، بلکہ افضل ہے اور اگر تصدق نہ کرے تو پھر اللہ رب العزت سے معافی طلب کرے، قرآن کریم میں ہے:"**لایکلف الله نفساً إلا وسعها**"۔

۶-پہلے کے حرام مال کمائے ہوئے کو حلال کرنے کا صرف ایک طریقہ سمجھ میں آتا ہے کہ اتنے مال کے بقدر تصدق کردے اور اللہ رب العزت سے معافی مانگے کہ جو اس نے حرام مال کمایا، البتہ اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ حرام مال غصب کیا ہوا ہے یا کسی دوسرے ذریعہ سے مثلاً رشوت وغیرہ کے ذریعہ حاصل ہوا ہے تو پہلے تو جن سے وہ مال لیا ہے انہیں واپس کرے، اگر وہ نہ ہوں تو ان کے وارثوں کو پہنچائے اور اگر وارث بھی نہ ہوں تو پھر غرباء پر بغیر ثواب کی نیت کے تصدق کرے، اس سلسلہ میں جواب نمبر ۱، اور جواب ۲، میں الموسوعۃ الفقہیہ ۲۶/ ۳۳۵ کی عبارت بطور دلیل گزر چکی ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

۷-صورت مذکورہ میں اس شخص کو چاہئے کہ جو اس کے پاس حرام مال ہے اگر وہ لوگ موجود ہیں جن سے حرام مال حاصل کیا ہے تو انہیں واپس کردے اور اگر وہ موجود نہیں ہیں تو پھر اس مال کا تصدق کردے، لیکن اس مال کے ذریعہ دوسرا مال کھانا اور حرام مال سے قرض لے کر اسے استعمال کرنا درست نہیں ہے؛ کیونکہ اگر حرام مال اس نے صدقہ نہیں کیا اور اسے قرض سمجھ کر خرچ کیا اور اس سے کاروبار بڑھایا اور اسی درمیان اس کا انتقال ہوگیا یا خود غریب وفقیر ہوگیا تو اس حرام مال کا بوجھ اس پر رہے گا اور اس کا وبال اس پر ہوگا، اس لیے اس مال کا تصدق کردے اور اللہ کی ذات پر توکل رکھے، اللہ کی ذات مسبب الاسباب ہے وہی رازق ہے، اس سے طلب کرے، قرآن کریم میں ہے:"**و على الله فليتوكل المؤمنون**"۔

۸-تقوی تو اس مسئلہ میں یہ ہے کہ ایسے شخص کے پاس کام کرنے سے اجتناب کرے اور فتوی یہ ہے کہ جب تک دوسری جگہ حلال کام نہ ملے اس جگہ کام کرے اور حلال کام کی تلاش رکھے، جب حلال کام مل جائے تو پہلی جگہ چھوڑ دے اور دوسری جگہ کام شروع کرے، قرآن کریم میں ہے:"**فاتقوا الله ماستطعتم**" اور الموسوعۃ میں ہے:"**بل يجب تقديم الأصلح والأمثل في كل ولاية بحسبها إذ الضرورات تبيح المحظورات و لأن حفظ بعض المصالح أولى من تضييعها كلها۔ و لأن البعيد ومع الأبعد قريب و أهون الشرين خير بالإضافة۔ و إن الأمر يقسط بالعجز ..... بناء اً على أنا إذا أمرنا بأمر أتينا منه بما قدرنا عليه ويسقط عنا ما عجزنا عنه ولاشك أن حفظ البعض أولى من تضييع الكل، و مع أنه يجوز تولية غير الأمل للضرورة إذاكان أصلح الموجود فيجب مع ذالک السعي في إصلاح الأحوال**" (حوالہ سابق ۴۵/ ۱۴۴-۱۴۵)۔

۹-مسئلہ تو ایسے شخص کے بارے میں یہ ہے کہ ایسے شخص سے قطع تعلق کیا جائے، تاکہ حرام کام پر اس کی مزید ہمت افزائی نہ ہو، لیکن اگر ضرورتاً ایسے شخص کے کھیت میں کام کیا یا نوکری کی تو اس کا حق الخدمت جائز ہے اور اس شخص کی کار میں سفر کرنا بھی درست ہے اور اگر وہ شخص اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو اس سے اس بچہ کی فیس وغیرہ وصول کرنا بھی جائز ہے؛ اس لئے کہ اس حرام کمائی کا وبال اس پر ہوگا، دوسرے پر نہیں ہوگا، قرآن کریم میں ہے: "لاتزر وازرة وزر أخرى"۔ اور الموسوعۃ میں ہے: "يجب على المضطر أن يراعى عند دفع الضرورة مبدأ درء الأفسد فالأفسد والأرذل فالأرذل۔ إلا يقدم المضطر على فعل لايحتمل الرخصة بحال قال ابن عابدين الإكراه على المعاصى أنواع: نوع يرخص له فعله و يثاب على تركه" (حوالہ سابق ۲۸/۱۹۵)۔

۱۰-مذکورہ چیزوں کی منظوری لینے کے لیے سود کی رقم کا استعمال جائز ہے۔

۱۱-صورت مذکورہ میں اگر یہ شبہ ہے کہ ہدیہ دینے والے کا ہدیہ حرام مال سے ہوسکتا ہے تو تقوی یہ ہے کہ قبول تو کرلے، مگر خود نہ کھائے، بلکہ کسی غریب شخص کو وہ ہدیہ دے اور فتوی کے اعتبار سے مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس ہدیہ کا خود استعمال کرسکتا ہے، الموسوعۃ الفقہیہ میں ہے: "نص الشافعية على أنه لايحرم قبول الهدية ممن أكثر ماله حرام إلا ما علم حرمته بعينه" (حوالہ سابق ۴۲/۲۶۱)، رہا مسئلہ بچوں کو ٹافی وغیرہ کھلانے کا اور چائے پلانے کا یا سوئی اور دیا سلائی وغیرہ سے مدد کرنے کا تو یہ چیزیں رسم ورواج میں عام ہوتی ہیں، ان میں اس قدر احتیاط مشکل ہے، اس لیے ان جیسی چیزوں میں جواز کی گنجائش ہے اور ان شاء اللہ خدا کی ذات سے امید ہے کہ آخرت میں ان جیسی چیزوں پر گرفت نہیں ہوگی۔

۱۲-حرام کمائی کرنے والے کی کمائی کا گناہ اس پر ہوگا اور اس کی دعا قبول نہیں ہوتی یہ بات بالکل صحیح ودرست ہے، لیکن یہ کہ اس کے بچہ کے نام رکھنے کے موقع پر یا کسی دوسرے موقع پر اس کے لیے دعا نہ کی جائے یا اگر وہ پانی پر دم کرائے تو اسے پانی پر دم کرکے نہ دیا جائے یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے دعا بھی کی جاسکتی ہے اور اسے پانی پر دم کرکے بھی دیا جاسکتا ہے؛ البتہ دعا میں یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کو حرام کمائی سے باز رکھے اور اسے حلال روزی کمانے کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مولانا خورشید احمد مفتاحی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين و على آله و صحبه أجمعين۔

اسلام نے حرام مال اور نہ حرام طریقہ سے کمائے ہوئے مال کی اجازت دی ہے؛ بلکہ حلال مال اور حلال ذرائع کو اختیار کرنے تاکید کی ہے، قرآن کریم میں ہے:" يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا"، (اے رسول! پاکیزہ مال کھاؤ اور اچھے اعمال کرو)،"اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا" (اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کو حلال اور سود کو ابدی طور پر حرام قرار دیا ہے، کیونکہ اس سے بڑے مفاسد ہیں جو دنیا میں آج بالکل ظاہر ہیں، درج ذیل سطروں میں حرام کمائی سے متعلق سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

جواب نمبر ۱:

جس آدمی کے آبا واجداد حرام کام میں ملوث تھے اور اسی کو وراثت کے طور پر چھوڑ کر چلے گئے، ان کا فعل بھی ناجائز اور ان کا چھوڑا ہوا مال بھی ناجائز، لیکن اس شخص کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے اس کی کمائی حلال مانی جائے گی، البتہ اس کو چاہیئے کہ اپنے علم کے مطابق اپنے آبا واجداد کے حرام مال کو رفتہ رفتہ صدقہ کرکے ان کو اور اپنے کو حرام سے بچائے اور جائیداد ومکان بھی اگر ممکن ہو تو اپنی کمائی کے حساب سے اس کی قیمت بھی صدقہ کردے، تاکہ خدا کے یہاں گرفت سے محفوظ رہ سکے۔

فتاویٰ محمودیہ میں مذکور ہے کہ حرام اور حرام مال نہ اپنے اوپر خرچ کرنا جائز ہے، نہ اپنے اہل وعیال پر، نیز اپنے پاس رکھنا بھی درست نہیں ہے، بہ نیت ثواب صدقہ کرنا بھی جائز نہیں ہے (محمودیہ: ۲۲/۵۵)۔

جواب نمبر ۲:

اگر کسی وارث کو معلوم ہو کہ مورث کے پاس فلاں مال حرام ہے تو اس کو وراثتاً لینا وارث کے لئے جائز نہیں ہے،

☆ استاذ حدیث جامعہ مفتاح العلوم، شاہی کٹرہ، مئو

اگر اصل مالک معلوم ہو تو اسے واپس کردے، ورنہ صدقہ کردے (ردالمحتار:۱/۱۸۰، فتاویٰ محمودیہ ۲۳/:۵۷)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صورت مسئولہ میں وہ شخص غریب ہے جس کو مورث کی جانب سے حرام مال حاصل ہوا ہے اس لئے اس کا استعمال فی الحال جائز اور درست ہے، لیکن جب اس سے نجات کی صورت حاصل ہو جائے گی تو اس کا صدقہ کرنا ہوگا، تاکہ وہ حرام مال کے استعمال سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے۔

جواب نمبر ۳:

عورت کی حیثیت گھر میں منتظمہ کی ہے، کمانے کی ذمہ داری مرد کی ہے، شوہر کی شکل میں ہو یا بیٹا یا بھائی، البتہ مرد حضرات کو چاہئے کہ حلال ذرائع کو اختیار کریں اور حلال رزق کے ذریعہ اپنے ماتحتوں بیوی بچوں کی پرورش کریں، اگر وہ حرام طریقوں سے روزی کماتے ہیں تو عورت کی ذمہ داری ہے کہ ان کو منع کرے، اگر عورت کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئے تو عورت اس صورت میں مضطر مانی جائے گی اور بوجہ مجبوری اس کی حرام کمائی کو استعمال کرنا جائز ہوگا اور اس پیسہ سے بچہ کو جو لکھایا، پڑھایا، پرورش کی اور پھر بچہ بڑا ہو کر کمائی کرے تو اس کی کمائی حلال ہوگی (ھٰکذا فی فتاویٰ محمودیہ ۲۸/ ۳۷۲، ۳۷۳، ردالمحتار)۔

جواب نمبر ۴:

جو شخص حرام کاروبار میں ملوث ہو اس کی دعوت میں شرکت سے پرہیز کرنا چاہئے؛ کیونکہ معلوم نہیں کہ اس نے حرام کمائی سے دعوت کی ہے یا حلال کمائی سے، حدیث میں ہے: "**نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن اجابت طعام الفاسقين**" (مشکوٰۃ:۵/۲۷۹)، اگر یہ بات متحقق ہو جائے کہ اس کے پاس کل مال حرام ہے تو اس کی دعوت کھانا جائز نہیں، اگر متحقق نہ ہو، بلکہ اس کے مال کے حلال وحرام ہونے کا احتمال ہو تو پرہیز بہتر ہے اور اگر اس طرح کی بات نہ ہو تو اس کے مسلمان ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے اس کی دعوت کھانا جائز ہوگا؛ جیسا کہ حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فليأكل من طعامه ولا يسئل ويشرب من شرابه ولا يسأل**" (مشکوٰۃ:ص:۲۷۹)۔

جواب نمبر ۵:

دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ داعی کا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس کی تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اگر فوراً معلوم ہوا اور قے کرنا ممکن ہو تو قے کر کے اس حرام کھانے کو اپنے پیٹ سے باہر کرے، کیونکہ حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ امام حسن ابن علیؓ نے اپنے بچپن میں صدقہ کی ایک کھجور کھالیا اور منہ میں ڈال لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کخ کخ"

یعنی الٹی کر کے پھینک دو، نیز فرمایا کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے ہیں (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ص:۱۶۱) اور اگر قے ممکن نہ ہو تو جس قدر کھایا ہے اتنا روپیہ صدقہ کر دے۔

جواب نمبر ۶:

حرام مال کے حلال ہونے کا کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں؛ بلکہ بغیر نیت ثواب اس کا صدقہ کرنا ضروری ہے (ھٰکذا فی ردالمحتار: ۴/ ۱۳۰)۔

جواب نمبر ۷:

جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ حرام کمائی سے حاصل ہوا ہے تو اس کو چاہیئے کہ اگر جس سے وہ مال بطور رشوت یا ظلم حاصل ہوا ہے اس کو فوراً واپس کر دے اور اگر معلوم نہ ہو تو صدقہ کر دے اور گر وہ غریب شخص ہے اور تجارت کرنے کے لئے اس کے پاس مال نہیں ہے تو کسی سے قرض لے کر کاروبار شروع کر دے اور اگر قرض نہ ملے تو بوجہ مجبوری بطور قرض کے اس حرام مال کو تجارت میں اس وقت تک استعمال کرے جب تک کہ فائدہ حاصل نہ ہو جائے اور جب استغنا ہو جائے تو فوری طور پر اس حرام مال کو بغیر نیت ثواب صدقہ کر دے (محمودیہ: ۲۸/ ۳۷۳)۔

جواب نمبر ۸:

جس آدمی کا کاروبار حلال وحرام کے درمیان مشترک ہو ایسے شخص کے یہاں نوکری اور ملازمت سے پرہیز کیا جائے اور کسی اچھی جگہ معاش کی تلاش جاری رکھے اور اللہ پاک سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے لئے رزق حلال کی جگہ کا انتظام فرما دے اور جب کوئی حلال ذریعہ سے معاش میسر آ جائے تو ایسی جگہ کو چھوڑ دے (آپ کے مسائل اور انکا حل: ۷/ ۷۳)۔

جواب نمبر ۹:

حرام کمائی سے خرید کردہ زمین جائیداد و مکان بائک اور کار اور دوسرے سامان سب کا استعمال ناجائز اور حرام ہے، اس میں کام کرنے والا اس سے فائدہ اٹھانے والا دونوں برابر کے شریک ہوں گے، اس لئے ایسی جگہوں سے احتراز ضروری ہے، قرآن کریم نے اس کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا" (سورہ نساء: ۲۹)، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم اكل الربوٰ وموكله

وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء" (رواہ مسلم،مشکوۃ:۱/۲۴۴)۔

ایسے شخص کے بچے جو اسکول اور مدرسہ میں پڑھتے ہوں تو ان سے فیس لینا جائز ہے اور حرام مال کا وبال صاحب مال پر ہوگا۔

جواب نمبر ۱۰:

سود کا استعمال ناجائز اور حرام ہے، اپنے ذاتی مفاد یا کسی ادارہ کے تعمیری نقشہ کے پاس کرانے میں بطور رشوت کے سود کی رقم کا دینا جائز نہیں ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رشوت اور ڈونیشن میں سودی رقم دی جاسکتی ہے وہ سخت غلطی پر ہیں، رشوت میں سودی رقم کا دینا گویا اس کا ذاتی استعمال کرنا ہے، اس لئے کہ اس میں سودی رقم اس کے رب المال کی طرف نہیں لوٹ رہی ہے، بلکہ سرکاری یا غیر سرکاری افسروں یا انتظامیہ کی جیب میں جاتی ہے، اس لئے اگر کسی نے سودی رقم سے رشوت ادا کردیا تو اس پر اتنی رقم مصارف میں خرچ کرنا واجب ہوگا۔

"**ويردونها على أربابها إن عرفوهم ولا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**"(شامی:۹/۳۸۵)۔

جواب نمبر ۱۱:

کسی بستی کی اکثریت کے سودی کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے ہر شخص کا اس میں ملوث ہونا لازم نہیں آتا ہے، اگر قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ یہ شخص بھی ملوث ہے تو اس سے پرہیز کرے اور اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے ہدیہ کو قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

"**أهدىٰ إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله الحلال فلابأس به إلا أن يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام**" (عالمگیری۵/۳۴۲)۔

جواب نمبر ۱۲:

جس آدمی کا مال یا کمائی حرام ہے اس کو توبہ اور استغفار کرنا چاہئے، نہ کہ برکت کی دعا کرانا چاہئے، کیونکہ برکت کی دعا کا اثر حلال مال میں ہوتا ہے، نہ کہ حرام مال میں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "**إن الربوٰ و إن كثر فإن عاقبته تصير إلىٰ قِلٍ**" (مشکوۃ:۱/۲۴۶)، اگر ایسا شخص پانی وغیرہ پر دم کرنے کو کہتا ہے تو دم کرکے دیا جائے گا اور اللہ پاک سے اس کے ہدایت کی دعا کی جائے گی۔

شریعت میں حرام کمائی سے متعلق چند مسائل

مفتی نثار احمد گودھروی، گجراتی ☆

الحمد لله رب العالمين و الصلاة والسلام على النبى الكريم و على آله و صحبه أجمعين، أما بعد!

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے جاری کردہ سوالنامہ ''حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل'' کا جواب مندرجہ ذیل سطروں میں دینے کی کوشش کی گئی ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب(۱)

اگر کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور اس کی ملکیت میں حرام مال موجود تھا جو ترکہ کی صورت میں مرحوم کے ورثہ کی طرف منتقل ہوا ہے، اگر ورثہ کو اس بات کا علم ہے کہ ہمارے وارث کے مال میں حرام مال موجود ہے تو ایسی صورت میں فقہ حنفی کی کتابوں میں غور کرنے سے بعض اقوال سامنے آئے ہیں:

(۱) اس صورت میں ورثہ کے لئے ترکہ کا مال لینا اور استعمال کرنا حلال ہے، لیکن علامہ حصکفیؒ نے اس قول کو رد کر دیا اور دوسری رائے اختیار فرمائی ہے اور فرمایا کہ ورثہ کے لئے ایسا مال حلال نہیں، بلکہ مطلقاً حرام ہوگا، خواہ اس کا مالک معلوم ہو یا نہ ہو، آپ لکھتے ہیں:

''وفى المجتبى مات وكسبه حرام فالميراث حلال ثم رمز وقال: لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقا على الورثة''۔

(۲) دوسری رائے علامہ ابن نجیم مصریؒ کی ہے، اگر حرام مال میراث کا مالک معلوم ہے تو یہ مال اصل مالک کو واپس کر دیا جائے، وہ ورثہ کے لئے حلال نہ ہوگا، لیکن اگر حرام مال کا مالک معلوم نہیں تو پھر ورثہ کے لئے یہ مال حلال ہے۔

(۳) تیسری رائے علامہ شامیؒ کی ہے جو سب سے زیادہ تفصیلی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ حرام مال میراث کی تین صورتیں ہیں:

☆ دارالافتاء، جامعہ رحمانیہ، گودھرا، پنچ محل، گجرات

(۱) اگر حرام مال کا مالک معلوم ہے تو یہ مال ورثہ کے لئے حلال نہیں ہوگا، بلکہ یہ مال مالک کو لوٹا دیا جائے گا۔

(۲) اگر حرام مال کا مالک معلوم نہیں، لیکن حرام مال معلوم متعین اور الگ موجود ہے، مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط نہیں تو یہ بھی ورثہ کے لئے حلال نہیں، بلکہ اصل مالک کی طرف سے صدقہ کر دیا جائے۔

(۳) حرام مال کا مالک معلوم نہیں اور حرام مال مرحوم کے دیگر اموال کے ساتھ مخلوط ہو گیا ہے جس میں متعین طور پر پتہ نہ چلے کہ کونسا مال حرام ہے اور کونسا مرحوم کا اپنا مال حلال ہے تو ایسی صورت میں یہ مال قضاء ورثہ کے لئے حلال ہوگا، لیکن دیانۃً ترکہ کے مال میں سے حرام مال کی بقدر صدقہ کرنا چاہیے۔

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولاشيأ منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانةً التنزه عنه" (شامی ۵/۹۹)۔

البتہ علامہ شامیؒ کی بعض عبارات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے مال کو صدقہ کرنا واجب نہیں بلکہ محض بہتر ہے۔

لیکن درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صورت میں ورثہ کے لئے ایسا مال صدقہ کرنا محض مستحب نہیں؛ بلکہ واجب ہے، مرحوم نے جب حرام مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کر دیا تو بقول صاحبینؒ کے مرحوم اس حرام مال کا مالک نہیں بنا تھا، بلکہ اس پر لازم تھا کہ ایسا مال اصل مالک کو واپس کرتا ورنہ صدقہ کر دیتا، اب یہ ہی حکم ورثہ کے لئے بھی ہوگا۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی رائے کے مطابق حرام مال کو اپنے مال کے ساتھ خلط کرنے سے مرحوم شخص مال کا مالک بن گیا تھا، لیکن اس کی ملکیت خبیث تھی، لہذا اس پر لازم تھا کہ حرام مال کا بدل اصل مالک کو لوٹاتا یا اگر اس کا علم نہ تھا تو صدقہ کرتا، اس سے پہلے مرحوم کے لئے حرام مال میں تصرف جائز نہ تھا، یہ حکم مرحوم کے لئے مستحب نہ تھا؛ بلکہ واجب تھا، لہٰذا ورثہ کے لئے بھی یہ ہی حکم ہے کہ اصل مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا مال صدقہ کر دے۔

اگرچہ علامہ شامیؒ کی عبارت سے ایسے مال کا تصدق محض مستحب معلوم ہوتا ہے، لیکن درج ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی رائے بھی دیانت سے متعلق یہ ہی ہے کہ ورثہ پر ایسا مال صدقہ کرنا لازم ہے، آپ فرماتے ہیں:

و إن ملكه بالقبض والخلط عند الإمام فإنه لايحل له التصرف فيه قبل أداء ضمانه، وكذا لوارثه ثم الظاهر أن حرمته على الورثة فى الديانة لاالحكم" (شامی)۔

جواب (۲)

حرام مال کا اصل حکم یہ ہے اگر اس کا مالک معلوم ہو تو ایسا مال اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے؛ خواہ مال اس کی

رضامندی سے لیا گیا ہو یا رضامندی کے بغیر، اگر مالک معلوم نہ ہو یا اس کا انتقال ہو چکا ہو تو اس کے ورثہ کو دیا جائے، اگر ورثہ کا بھی علم نہیں تو ایسا مال بلا نیت ثواب فقراء پر صدقہ کرنا ضروری ہے، البتہ ایسے حرام مال سے فائدہ اٹھانے میں تھوڑی تفصیل ہے:

(۱) حرام مال سے خود فائدہ اٹھانا، اگر اس کے پاس صرف اتنا حلال مال موجود ہے جس سے اس کے اہل وعیال کا گزارہ ہو سکے تو حرام مال سارا کا سارا اصل مالک یا اس کے ورثہ کو دینا ضروری ہے، ورنہ صدقہ کرنا ضروری ہے، لیکن اس کے پاس صرف حرام مال ہے یا حلال اتنا ہے کہ اس سے ضرورت پوری نہیں ہوتی اور حرام مال کو ایک ساتھ صدقہ کرنا مشکل بھی ہے تو ایسا شخص بقدر ضرورت حرام مال اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کر سکتا ہے، اگر حرام رقم استعمال کے وقت یہ شخص مستحق زکوۃ تھا اور اصل مالک بھی معلوم نہیں تو بعد میں اس پر یہ لازم نہ ہوگا کہ حرام مال کی بقدر صدقہ کرے، تاہم بہتر یہ ہے کہ استطاعت کے بعد اتنا مال صدقہ کرے۔

لیکن حرام رقم کے استعمال کے وقت وہ مستحق زکوۃ نہ تھا تو یقیناً حرام مال اس نے استعمال کیا ہے، وہ اس کے ذمہ قرض سمجھا جائے گا، اس کو چاہے کہ حرام رقم کی مقدار لکھ لے، پھر حسب ضرورت حرام مال اس نیت سے استعمال کرے کہ جیسے ہی حلال رقم آئے گی فوراً اتنی رقم صدقہ کردوں گا اور وہ توبہ استغفار بھی کرتا رہے اور حلال کمانے کی بھرپور کوشش کرے۔

یہ ہی بات حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب نے فقہ البیوع میں بھی لکھی ہے:

"ما وجب التصدق به واحتاج إليه يجوز صرفه إلى نفسه فإن كان فقيرا لايجب عليه التصدق بمثله و إن كان غنيا وجب عليه أن يتصدق بمثله ويجوز له إذا لم يكن المال الحلال كافيا لسد حاجته يسوع للمفتي بعد النظر في أحواله أن يفتيه بجواز الاقتراض من ما عنده من المال الحرام بشرط أن يلزم نفسه تسديد هذا القرض إلى الفقراء من المال الحلال كلما تيسر له ذالک" (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۵)۔

جواب (۳)

اگر بیوی مستحق زکوۃ نہ ہو تو شوہر کی ذمہ داری ہے، وہ کہیں سے حلال رقم لاکر بیوی کو بطور نفقہ دے، لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے اور حرام رقم لاکر بیوی کو نفقہ دے اور بیوی کو مجبوری ہو تو اس کے لئے اپنا جائز نفقہ لینا درست ہوگا اور حرام کا گناہ شوہر پر ہوگا۔

علامہ شامیؒ رقم طراز ہے:

"وفي جامع الجوامع اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها والإثم على الزوج" (شامی:۶/۱۹۱)۔

مال حرام اپنی اولاد کو دینے کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ مال حرام ایسی بالغ اولاد کو دیا جائے جن کا نفقہ والد پر

لازم نہیں ہے اور اولاد مستحق زکوۃ بھی ہیں تو ان کو یہ رقم دینا جائز ہے اور اولاد کے لئے والد کی طرف سے دی ہوئی رقم کا استعمال بھی جائز ہے، کیونکہ مالک نہ ملنے کی صورت میں حرام مال کسی بھی مستحق زکوۃ کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے، یہ صدقہ اجنبی کو دینا ضروری نہیں؛ بلکہ مستحق اولاد کو بھی دی جاسکتی ہے۔

فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے:

"له مال فيه شبهه إذا تصدق به على أبيه يكفيه ذالک ولايشترط التصدق على الأجنبى"۔

اس طرح حرام کمائی سے اولاد کو پڑھایا اور اب وہ جائز حلال کاروبار کر رہی ہے تو ان کے لئے اس کا استعمال کرنا جائز ہوگا اور اولاد کے لئے ضروری ہے کہ اپنی کمائی میں سے کچھ بچا کر صدقہ تلافی کی نیت سے دیتا رہے۔

جواب (۴)

اگر کسی کی کل آمدنی یا غالب آمدنی کے حرام ہونے کا علم ہے تو ایسی صورت میں دعوت کھانا یا ہدیہ لینا جائز نہیں، یہ بات قرائن سے پتا چلتی ہے، اس لئے کہ عام طور پر کاروبار کسی سے چھپا نہیں رہتا، خصوصا حرام کا کاروبار سب کے سامنے آ ہی جاتا ہے، اگر مخلوط آمدنی ہو اور اس میں غالب حلال آمدنی ہو اور دل اس پر گواہی دیتا ہو اور اطمینان ہو تو گنجائش ہے۔

"التاجر الذى تتمحض تجارته فى البيوع الباطلة شرعا تنطبق على ماله أحكام: القسم الأول من المال الحرام فلا يجوز قبول الهدية منه ولا إجابة دعوته ولا شراء شئ منه ولا بيع شيء إليه ولا عقد إلاجارة معه، لأن كل ماله حرام و إن أهدى هدية فإنها تصرف فى وجوه البر" (فقہ البیوع)۔

جواب (۵)

اگر حرام کی دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ دعوت دینے والے کی آمدنی مکمل حرام ہے تو اتنی رقم کا صدقہ کرے اور توبہ واستغفار بھی کرے، اور آئندہ اس سے احتراز کرے، امید ہے کہ اس کی تلافی ہو جائے۔

جواب (۶)

جو حرام مال کمایا گیا ہے اس کے ذریعہ اب حلال کاروبار ہو رہا ہے تو حرام مال کا اندازہ لگائے اور اپنے مال میں جس قدر حرام مال معلوم ہو اس کو صدقہ کرایا جائے، امید ہے مال حلال ہو جائے گا۔

جواب(۷)

اگر کوئی آدمی جس کے پاس حرام کمائی کا مال موجود ہے اور وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کے پاس آئندہ تجارت اور کام کرنے کے لئے کوئی رقم کسی طرح کی نہیں ہے سوائے مال حرام کے تو وہ بدرجۂ مجبوری اس مال کو خود قرض کے طور پر رکھ لے اور اس سے آگے کاروبار کر کے جب اس کے پاس کچھ سرمایہ ہو جائے تو وہ رقم صدقہ کر دے تو اس کی گنجائش ہے، اس لئے کہ اگر اس کے پاس حلال کی رقم نہ ہو تو وہ خود زکوۃ کا حقدار ہو جاتا ہے اور زکوۃ کے حقدار کے لئے ایسی رقم کا استعمال درست ہوگا، شریعت نے مجبوری اور اضطراری حالت میں گنجائش رکھی ہے۔

جواب(۸)

اگر مال دونوں طرح کا ہے اور قرائن سے پتہ نہ چلتا ہو تو اس کے لئے اس کام کو انجام دینا درست ہوگا، اس لئے کہ مالی معاملات میں امام کرخی کے قول پر فتوی دیا گیا ہے، اگر وہ ذاتی طور پر احتراز کرے تو اس کے لئے افضل اور بہتر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

جواب(۹)

اگر جائداد پوری حرام کمائی کی ہے اور بالکل حلال رقم نہیں تو اس کے یہاں کام کرنا درست نہ ہوگا، اگر اس کے پاس حلال وحرام مخلوط ہے تو اس کی حلال آمدنی سے کرایہ وصول کرنے اور اپنی اجرت لینے کا مطالبہ کیا جائے، اگر وہ حلال اجرت ہونے کے باوجود دینے کے لئے تیار نہ ہو اس کے یہاں کام کرنا درست نہ ہوگا۔

اس طرح اگر اس کے پاس گاڑی چاہے بائیک یا کار وغیرہ ہے اور پوری سواری حرام کی رقم سے ہو تو ایسی گاڑی میں سواری کرنے سے احتیاط رکھا جائے، اگر مجبوری ہو اور کوئی سواری نہ ہو تو گنجائش ہے، تو بہ استغفار کرتا رہے۔

اگر ایسا آدمی جس کے پاس کل رقم حرام ہو اور وہ اپنے بچوں کو مدرسہ اور اسکول میں داخل کرتا ہے، اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی رقم نہ ہو اور خود بھی زکوۃ کا حقدار ہو تو بچوں کی فیس وغیرہ میں اس کا استعمال درست ہوگا اور اس سے فیس وصول کرنا بھی درست ہوگا، آگے چل کر بچوں کی پڑھائی کے بعد ان کی آمدنی درست ہوگی؛ البتہ اپنی کمائی میں سے صدقہ نکالتا رہے اور توبہ استغفار کرتا رہے۔

جواب(۱۰)

حرام رقم کا مصرف ردالی رب المال بتایا جاتا ہے، اگر یہ رقم جو بطور رشوت طلب کی جاتی ہے وہ سرکاری ادارہ میں

داخل کی جاتی ہے تو اس میں سود کی رقم کا استعمال درست ہوگا اور اگر وہ رشوت کی رقم کارندوں کے جیب میں جاتی ہے تو سود کی رقم خود اپنے خود کے کام میں استعمال کرنے کے درجہ میں ہوگی اور بطور رشوت دینا درست نہ ہوگا، اسی طرح سود کی رقم غیر واجبی ٹیکس وغیرہ میں استعمال کرنا درست ہوگا۔

جواب (۱۱)

اگر قرائن سے معلوم ہو اور لوگوں میں اس کا چرچا عام ہو کہ اس شخص کی کمائی درست نہیں ہے اور مکمل آمدنی کا ذریعہ حرام ہے تو اس کا ہدیہ لینے اور کوئی چیز کھانے پینے سے دور رہا جائے اور اگر وہ گاؤں کا کوئی بڑا بارسوخ آدمی ہے اور اس سے ضرر کا اندیشہ ہے اور اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں تو مجبوری کے درجہ میں استعمال کرے اور بعد میں اتنی رقم صدقہ کرے، یہ بہتر ہوگا۔

جواب (۱۲)

اولاً ایسے آدمی کو حرام سے بچنے کی ترغیب دی جائے اور کہا جائے کہ اگر آپ حرام میں ملوث رہیں گے تو ہماری دعائیں اللہ کے یہاں قبول نہ ہوگی، کیا معلوم اس وقت ترغیب دینا اس کے لئے حرام سے بچنے کا ذریعہ بن جائے اور باز آجائے اور توبہ واستغفار کرے۔

اس لئے دعاء بھی کی جائے اور ساتھ ساتھ اس کو حرام سے بچنے کی تلقین اور تدبیر بھی بتائی جائے، حق بات بہت اثر انداز ہوتی ہے، وہ کبھی نہ کبھی حرام سے باز آجائے گا، یا دعا اس نیت سے کی جائے کہ اللہ تعالی اس کو ہدایت دے دے اور حرام سے چھٹکارا مل جائے، بزرگوں کی دعائیں اور اس کی خود کی کوشش کام کر جاتی ہے۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد شاکر نثار مدنی اعظمی☆

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وأصحابه أجمعين، أما بعد!

تمہید:

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارکانِ اسلام؛ نماز، روزہ، حج اور زکوۃ یعنی فرائض کے بعد حلال مال کمانا فرض ہے، اپنے اہل وعیال کے ضروری خرچ کے لئے حلال مال کمانا، اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے حلال مال کا انتظام کرنا ہر انسان پر ضروری ہے، اگر کسی انسان کے پاس ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے جائداد یا کسی اور طرح کا کاروبار میسر ہو تو اسے عبادت میں لگنا سب سے افضل ہے۔

قرآن کریم میں متعدد جگہ پر حلال مال کمانے کی ترغیب موجود ہے، سورہ نساء، سورہ اعراف، سورہ مزمل اور سورہ جمعہ وغیرہ میں کئی آیتوں میں اللہ کا فضل اور اس کی روزی تلاش کرنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے، سورہ جمعہ میں ہے:

''زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو'' (سورۃ الجمعہ ۱۰)۔

شریعتِ اسلامی نے کسبِ حلال کو عبادات میں شمار فرمایا ہے اور اس کے بے شمار فضائل بتلائے ہیں؛ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا'' حلال مال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے'' (المعجم الاوسط للطبرانی: ۶۸۱۰)۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:'' حلال مال کا طلب کرنا (اصل) فرائض کے بعد فرض ہے'' (المعجم الکبیر للطبرانی: ۹۹۹۳)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا:'' جس

☆ استاذ حدیث وفقہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم، سرائمیر اعظم گڑھ یوپی

آدمی نے بھی حلال مال کما کر خود اپنے کھانے اور پہننے میں خرچ کیا یا اپنے علاوہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی دوسرے کو کھلایا یا پہنایا تو یہ بھی اُس کے لیے صدقہ ہوگا'' (صحیح ابن حبان:۲۴۳۶)۔

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے'' (صحیح بخاری:۲۰۷۲)۔

ان احادیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ مال کمانا فرض اور واجب ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ حلال اور جائز طریقے سے مال کمانا عبادت ہے، حرام یا مشتبہ مال کمانا عبادت تو کجا اُلٹا سخت گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں داخل ہے؛ لیکن افسوس کہ آج کل لوگ مال کمانے کی حرص میں اِس بات کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں کرتے کہ حلال طریقے سے کمارہے ہیں یا حرام طریقے سے؛ بلکہ آج کل تو لوگ جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی اور دونمبری کے ذریعہ مال کمانے کو کمالِ ہنر سمجھتے ہیں اور اسے اپنی ہوشیاری و چالاکی خیال کرتے ہیں؛ حالاں کہ حقیقت میں یہ دوسروں کے ساتھ نہیں؛ بلکہ اپنے ساتھ ہی دھوکہ اور فریب ہے۔

سود، قمار، سٹہ بازی، لاٹری اور اس قسم کے بے شمار طریقے اس زمانہ میں ایجاد ہو چکے ہیں اور آج کا نوجوان بڑی بے باکی سے ان طریقے سے مال کمارہا ہے اور غضب یہ ہے کہ اسے اس کا بھی خیال نہیں رہتا کہ آیا یہ حلال طریقے سے کمایا ہے یا حرام طریقے سے، حدیث میں حرام کمائی کی سخت مذمت بیان کی گئی ہے، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے، پاک ہی قبول کرتا ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے کہ اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو! وہی حکم اُس نے پیغمبروں کے علاوہ اپنے مؤمن بندوں کو دیا ہے کہ اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اُس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ! اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبے سفر میں ہو، بال بکھرے ہوئے ہوں، بدن پر غبار لگا ہوا ہو، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر یارب یارب کہتا ہو، اُس کا کھانا حرام ہو، اُس کا پینا حرام ہو، اُس کا پہننا حرام ہو، تو ان سب چیزوں کے باوجود اُس کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟'' (صحیح مسلم:۱۰۱۵، جامع ترمذی:۲۹۸۹)۔

شریعت مطہرہ میں جس طرح عبادت کے احکام بیان ہوئے ہیں، ٹھیک اسی طرح مال کمانے کے طور طریقے بھی بیان ہوئے ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے، اسی طرح مشتبہ مال یا وہ مال جسے مشتبہ کمائی سے حاصل کیا گیا ہو

اس مال سے بچنا بھی ضروری ہے، وہ بھی حرام کے حکم میں ہے، سیدنا حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات یاد رکھی ہوئی ہے کہ جو چیز شک میں ڈالے اُس کو چھوڑ دیا جائے اور اُس چیز کی طرف بڑھا جائے جو شک میں نہ ڈالے؛ اِس لیے کہ صحیح چیز میں اطمینان ہوتا ہے اور غلط چیز میں شک ہوتا ہے (مشکوٰۃ شریف)۔

اس مقالہ میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے سوالات کو سامنے رکھتے ہوئے حرام کمائی کے متعلق چند مسائل اور مشتبہ کمائی کے بارے میں فقہاء کرام کے اقوال کی روشنی میں چند مسائل اور ان کا حکم لکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھنے اور درست عمل کی طرف پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۱) اگر کوئی شخص فی الحال حلال کاروبار کر رہا ہے؛ لیکن اس کے آباء واجداد سودی کاروبار میں ملوث تھے، اور اس کو معلوم ہے کہ اسی حرام کاروبار کا مال اس کو وراثت میں ملا ہے مگر اسی سے اب وہ حلال کاروبار کر رہا ہے اور گھر جائداد بھی اسی نتیجے میں حاصل ہوئی ہے؛ البتہ اسے یہ معلوم نہیں کہ سود کا پیسہ آزادی سے پہلے کمایا ہوا ہے یا آزادی کے بعد؟ تو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے اپنے حلال کاروبار کے نتیجے میں حاصل ہونے والی آمدنی حلال ہے، نیز جو مال وراثت میں ملا ہے وہ اگر آزادی سے پہلے سودی کاروبار کے ذریعہ حاصل کیا گیا تھا تو بلا شک وشبہہ حلال ہے، اس لئے کہ آزادی سے پہلے ہندوسان کے دارالحرب ہونے کی وجہ سے کفار کے ساتھ سودی کاربار کی اجازت تھی، اور اگر یہ معلوم نہ ہو کہ آزادی سے پہلے حاصل کردہ ہے یا بعد میں تو بھی اس کے لیے حلال ہے؛ اس لیے کہ یقین سے معلوم نہیں ہے کہ آزادی سے پہلے کا ہے یا بعد کا، چونکہ اشیاء میں اصل اباحت ہے؛ اس لیے وراثت میں ملے مال کے جب تک حرام ہونے کا یقین نہ ہو حلال ہے؛ البتہ احتیاطاً اگر اتنا مال غرباء کو صدقہ کر دیا جائے تو بہتر ہے، آمدنی بہر حال حلال ہے۔

ردالمحتار میں ہے: "**لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذّر الردّ على صاحبه**" (ردالمحتار: ۹/۳۵۵، زکریا)۔

"**ويردّونها علي على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها**" (ردالمحتار: ۹/۳۵۵، زکریا)۔

"**الأصل في الأشياء الإباحة**" (المبسوط للسرخسي: ۲۴/۷۷، ط مطبعۃ السعادۃ مصر)۔

"**رجل اكتسب مالاً من حرام، ثم اشترى، فهذا على خمسة أوجه، أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولاً ثم اشترى منه بها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها أو اشترى مطلقًا ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم أخر ودفع تلك الدراهم، قال أبو النصر يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا في الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبو الليث، وقال**

الكرخي: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب في الكل؛ لكن الفتوى على قول الكرخي دفعًا للحرج عن الناس'' (ردالمحتار:۷/۴۹۰،زکریا)۔

(۲) اگرکوئی غریب شخص ایسا ہے جس کو یقینی طور پر یہ معلوم ہے کہ اس کے پاس موجود پوری جدائیداد اور مال، حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے، اب اسی حرام جائیداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، تو جب تک یہ غریب شخص حرام جائیداد کے بقدر مال صدقہ نہ کردے اس کے لیے کرایہ کا استعمال درست نہیں ہے، چنانچہ اسی طرح کے ایک سوال کے جواب میں دارالعلوم دیوبند کے حضرات مفتیان کرام تحریر فرماتے ہیں:

''جواب: فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ خالص حرام مال سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہے، اسی طرح اگر مال حرام وحلال دونوں مخلوط ہوں، حرام کو حلال سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے تو اکثر حصہ مالِ حرام ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے؛ البتہ اگر حلال حصہ زیادہ اور حرام کم ہے تو اس سے کرایہ حاصل کرنے کی اجازت ہے، یہاں جب کہ مکان بقول آپ کے حرام کمائی سے بنا ہوا ہے تو اس کو کرایہ پر دے کر اس سے کرایہ حاصل کرنا پھر اسے اپنی ضروریات میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے؛ جب تک مکان میں لگی ہوئی ساری رقم صدقہ نہ کردی جائے، بیوہ کو اپنی گذر بسر کا اور کوئی انتظام کرنا چاہیے''۔ (آن لائن فتویٰ نمبر 50-97/B+02/1441)

''إن كان المال بمقابلة المعصية فكان الأخذ معصية، والسبيل في المعاصي ردّها، وذلك هاهنا بردّ المأخوذ إن تمكن من ردّه بأن عرف صاحبه، وبالتصدق به إن لم يعرفه ليصل إليه نفع ماله إن كان لا يصل إليه عين ماله'' (الفتاوی الھندیۃ: الکراھیۃ/الخامس عشر في کسب الحرام:۵/۳۴۹،حقانیۃ)۔

''كما لو غصب عبداً وآجره، فنقص في هذه الإجارة بالاستعمال ..... و إن استغله فنقصه الاستغلال أو آجر المستعار ونقص، ضمن النقصان و تصدق بما بقي من الغلة والأجرة'' (رد المختار:۶/۸۸،سعید)۔

(۳) اگر کسی غریب خاتون کا بیٹا یا شوہر حرام طریقہ پر کمائی کر رہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے اور اس غریب خاتون کے لیے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں بھی ایسی آمدنی کا استعمال حرام ہے، البتہ اگر اس غریب خاتون کے گذر بسر کا کوئی اور نظم نہ ہو تو بقدر ضرورت استعمال کرسکتی ہے اور اس پر توبہ واستغفار بھی کرتی رہے۔

''قوله: الحرام ينتقل) أي: تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدي و تبدلت الأملاک، قوله: ولا للمشتري منه فيكون بشرائه مسيئاً؛ لأنه ملكه بكسب خبيث، وفي شرائه تقرير للخبث، و يؤمر بما

كان به البائع من ردّه على الحربي'' (ردالمحتار: البیع الفاسد لایطیب لہ ولایطیب المشتری منہ: ۴/ ۱۴۵)۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے والد کی حرام آمدنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرلے، حالانکہ بیٹے کو آمدنی کے حرام ہونے کا علم نہیں ہو تو اس کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا درست ہے، اب اس تعلیم کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی بھی حلال ہے، اور اگر بیٹے کو اپنے والد کی آمدنی کے حرام ہونے کا علم ہو تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ ایسی صورت میں بیٹے کو خود حلال ذریعہ آمدنی اختیار کرنا ضروری ہے، اور اگر علم کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا رہا تو گناہ کا کام کیا، پھر بھی آمدنی حلال ہوگی۔

''**وكذا طلبة العلم إذا كانوا عاجزين عن الكسب لا يهتدون إليه لا تسقط نفقتهم عن آبائهم إذا كانوا مشتغلين بالعلوم الشرعية لا بالخلافيات الركيكة وهذيان الفلاسفة ولهم رشد، وإلا لا تجب، كذا في الوجيز للكردري، ونفقة الإناث واجبة مطلقًا على الآباء ما لم يتزوجن إذا لم يكن لهن مال، كذا في الخلاصة**''(الفتاوی الہندیۃ: ۱/ ۴۴۷)۔

(۴) کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بستی والے شادی بیاہ اپنی بستی کے اندر ہی کرتے ہیں اور زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے شادی وغیرہ میں جب دعوت دیتے ہیں تو ایسی صورت میں اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے یا آدھا حصہ حرام اور آدھا حصہ حلال ہے؟ تو اگر صرف شبہہ ہو، کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو تو محض وہم یا وسوسہ کی صورت میں تحقیق وجستجو کا تکلف کیے بغیر دعوت قبول کرنا درست ہے، تاہم واضح دلیل سے آمدنی کا حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہو تو ایسے شخص کے یہاں دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے اور اگر حرام وحلال دونوں کا امکان ہے تو استفسار کرلینا بہتر ہے، ورنہ ایسی دعوت سے پرہیز کرنا ہی بہتر ہے۔

''**عن عمران بن حصين قال: نهانا رسول الله صلى الله عليه وسلم عن إجابة طعام الفاسقين**'' (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۸/ ۱۶۸، المعجم الأوسط: ۴۴۴)۔

''**رجل اشترى من التاجر شيئاً هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام؟ قالوا: ينظر إن كان في بلد وزمانٍ كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشتري أن يسأل أنه حلال أم حرام، و مبني الحكم على الظاهر، و إن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلاً يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام**''(الفتاوی الھندیۃ: ۳/ ۲۱۰ دارالفکر)۔

''**المال المغصوب وما في حكمه مثل ما قبضه الإنسان رشوةً أو سرقة أو بعقد باطل شرعاً لايحل له الانتفاع به ولا بيعه ولا هبته، ولا يجوز لأحد يعلم ذلك أن يأخذه منه شراء أو هبة أو إرثاً،**

ويجب عليه أن يردّه إلى مالكه، فإن تعذر ذلک وجب عليه أن يتصدق به عنه، وإن كان المال نقداً واشترى به شيئاً بالرغم من عدم الجواز، فإن اشترى بعين المال الحرام فلا يجوز الانتفاع بما اشتراه حتى يؤدى بدله إلى صاحبه" (فقہ البیوع:۲/۱۰۵۲)۔

(۵) اگر کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ اس کا کاروبار بالکل حرام ہے تو ایسی صورت میں توبہ واستغفار کرے۔

"**عن أبي بكر الصديق يقول: ليس من عبد يذنب ذنبًا فيقوم فيتوضأ فيحسن الوضوء ثم يصلي ركعتين ثم يستغفر الله إلا غفر له**" (عمل الیوم واللیلۃ۔ص:۱۳۸ح:۴۱۷)

"**قال في الدر: الحرمة تتعدد مع العلم بها، و في الشامي تحته: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا تتعدى ذمتين سألت عن الشهاب بن الشلبي فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلک۔ الخ**" (ردالمحتار:۴/۱۴۶رکوئٹہ)۔

(۶) پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ نہیں ہے، اس کو اصل مالک کو واپس کرنا یا بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

"**لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**" (ردالمحتار۹/۳۵۵،زکریا)۔

"**ويردّونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها**" (ردالمحتار۹/۳۵۵،زکریا)۔

(۷) اگر کسی شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے، وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے، لیکن تجارت کرنے کے لیے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو ایسا شخص مجبوراً وقتی طور پر مال تجارت کی قیمت میں حرام مال کو متعین کیے بغیر خریدے پھر حرام مال کو ادا کر دے تو گنجائش ہوگی اور اس سے حاصل شدہ آمدنی حلال ہوگی، جب بقدر ضرورت حلال مال حاصل ہو جائے تو پورے حرام مال کو صدقہ کر دے۔

"**رجل اكتسب مالاً من حرام، ثم اشترى، فهذا على خمسة أوجه، قال أبو النصر يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا في الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبو الليث، وقال الكرخي: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب في الكل؛ لكن الفتوى على قول الكرخي دفعًا للحرج عن الناس**" (ردالمحتار:۷/۴۹۰،زکریا)۔

(۸) اگر کوئی شخص ایسے تاجر کے یہاں نوکری کرتا ہے جس کا آدھا بزنس حلال اور آدھا حرام ہو، اور نوکر کو کبھی کبھی

دونوں حصہ کا کام کرنا پڑتا ہو، جیسے کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہو یا دونوں کے لیے لین دین کرنا پڑتا ہو، یا دونوں کی وصولی کے لیے جانا پڑتا ہو، تو ایسے شخص کے حرام کاموں کو کرنا شرعًا جائز نہیں ہے، اس شخص کو کہیں اور نوکری تلاش کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب**'' (المائدۃ:۲)۔

'' **فالواجب ترك العمل في هذا المجال والاقتصار على الأعمال المباحة، ومن ترك شيئاً لله عوضه الله خيرًا منه**''۔

اتفقوا على أنه لا يجوز للمسلم أن يؤجر نفسه للكافر لعمل لا يجوز فعله كعصر الخمر و رعي الخنازير وما أشبه ذلك'' (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ:۱۹/۴۵)۔

(۹) حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنا: جیسے کھیتی باڑی کرنا، یا حرام کمائی کرنے والوں کے گھر میں نوکری کرنا، یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنے کی شرعًا گنجائش ہونی چاہئے، کیونکہ عموماً عقد ونقد کا اجتماع نہیں ہوتا۔

اگر کوئی حرام کمائی کرنے والا شخص اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان کی فیس حرام مال سے وصول کرنا درست نہیں ہے۔

چنانچہ صاحب فتاوی محمودیہ ڈاکٹر کو طوائف سے فیس لینے سے متعلق ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اگر وہ حرام کی کمائی کا روپیہ دے تو ڈاکٹر یا دوکاندار کو فیس یا قیمت لینا درست نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ہاں وہ قرض لے کر حلال روپیہ دے تو لینا درست ہے'' (فتاوی محمودیہ ۲۸/۴۰۶ زکریا)۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''**ولا تتبدلوا الخبيث بالطيب**'' (سورۃ النساء:۲)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لعن الله اليهود، ثلاثًا، إن الله حرم عليهم الشحوم فباعوها وأكلوا أثمانها، وإن الله إذا حرم على قوم أكل شيء حرم عليه ثمنه**'' (سنن أبي داود، رقم الحدیث:۳۴۸۸)۔

''**أهدى إلى رجل شيئًا أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغي أن لا يقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه من حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا في الينابيع**'' (الفتاوی الہندیۃ:۵/۳۴۲، رشیدیہ)۔

(۱۰) آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں کو ایک خطیر رقم رشوت میں دینی پڑتی ہے، چونکہ یہ ایک طرح کا ظلم ہے، اس لیے اگر سود کی رقم سرکاری بینک سے حاصل ہوئی ہو تو کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں کو دی جاسکتی ہے، والدلائل واضحۃ۔

(۱۱) اگر کسی بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام؟ ناگواری یا اختلاف کا باعث بنے، حالانکہ اس کے حرام ہونے کا بھی امکان ہے، اسی طرح لوگ بچوں کو ٹافی وغیرہ دے دیتے ہوں، کبھی پانی چائے پلاتے ہوں اور کبھی ضروری چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتے ہوں، لیکن اس شخص کی کمائی کیسی ہے، معلوم نہیں تو ایسی صورت میں اگر غالب آمدنی حرام ہے تو بلا استفسار ہدیہ قبول نہ کرے، اگر بار بار سوال کرنے میں حرج ہو یا قبول نہ کرنے کی صورت میں اختلاف وانتشار کا اندیشہ ہو تو لے کر کسی غریب پر صدقہ کردے، اور اگر غالب مال حلال ہے تو قبول کرنا جائز ہے۔

"**رجل اشترى من التاجر شيئاً هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام؟ قالوا: ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشتري أن يسأل أنه حلال أم حرام، ويبني الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلاً يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام**" (الفتاوی الھندیۃ ۳/۲۱۰، دارالفکر)۔

(۱۲) جن کا مال یا کمائی حرام ہو، ان کی دعا قبول نہیں ہوتی، پھر بھی اگر حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر دعا کراتا ہے یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے تو دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر ایسے مواقع پر ان سے قطع تعلق رکھا گیا تو مزید نقصان کا اندیشہ ہے، اس لئے ان مواقع سے فائدہ اٹھا کر ان کو دین کی باتیں بتانی چاہئے، حرام مال کی قباحت اور حلال طریقے سے مال حاصل کرنے کی ترغیب دینی چاہئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "**شفاعتي لأهل الكبائر من أمتي**" (سنن أبی داود، رقم الحدیث: ۴۷۳۹)۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مولانا محمد عثمان صاحب قاسمی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله و أصحابه أجمعين أما بعد:

قال الله سبحانه وتعالى: "يأيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم واشكروا لله إن كنتم إياه تعبدون" (سورہ بقرہ:۱۷۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حلال کمائی عمل پر مقدم ہے اور حلال کھانے سے آدمی کے اندر تقوی پیدا ہوتا ہے۔

شریعتِ اسلامی نے کسبِ حلال کو عبادات میں شمار فرمایا ہے اور اس کے بے شمار فضائل بتلائے ہیں؛ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "حلال مال کا طلب کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے" (المعجم الاوسط للطبرانی)۔

الجواب عن السؤال الاول

جس شخص کے آباء واجداد کسی حرام کاروبار مثلاً رشوت، سود، شراب، چوری، غصب جیسے کاموں میں ملوث رہے ہوں اور وراثت میں اس کو جو مال ملا ہے اس میں مال حرام کا شامل ہونا یقینی ہو، لیکن مقدار قطعیت کے ساتھ معلوم نہ ہو کہ کتنا مال غصب، رشوت، سود، سرقہ سے حاصل کیا گیا ہے اور آباء واجداد سے ترکہ میں ملے مال سے حلال کاروبار کیا جائے، گھر جائداد بنایا جائے تو اس کا حکم یہ ہے کہ غور فکر سے یہ اندازہ کرلے کہ ترکہ میں حاصل شدہ مال میں عین حرام کی کتنی مقدار ہوگی، پھر اسی کے بقدر صدقہ کردے، خواہ وہ حرام مال آزادی سے پہلے حاصل کیا گیا ہو یا آزادی کے بعد۔

اس کے بعد اس کا سب مال حلال اور جائز شمار ہوگا، اس لئے کہ جب حرام کا ملنا یقینی طور سے معلوم ہے تو ورثہ کے

☆ استاذ مدرسہ عربیہ ریاض العلوم گورینی، یوپی

لئے استعمال حلال نہیں ہے اور حرام مال کو اس کے مالک کی طرف لوٹانا یا صدقہ کرنا ہوگا۔

اب جب مقدار معلوم نہیں ہے تو اس کی پاگیزگی کا طریقہ یہی ہوسکتا ہے کہ تحری کے ذریعے اندازہ لگا کر اس کے حکم پر عمل کیا جائے۔

فقہ البیوع میں ہے:

"قال فی البحر: وقعت حادثة هی أن من شک هل أدّی جمیع ما علیه من الزکاة أم لا بأن کان یؤدی متفرقاً ولا یضبطه هل یلزمه إعادتها ؟ ومقتضی ما ذکرنا لزوم الإعادة حیث لم یغلب ظنه دفع قدر معین لأنه ثابت فی ذمته بیقین فلا یخرج عن العهدة بالشک اهـ .

قلت: وحاصله أنه یتحرّی فی مقدار المؤدی کما لو شک فی عدد الرکعات، فما غلب علی ظنه أنه أداه سقط عنه وأدی الباقی، وإن لم یغلب علی ظنه شیء أتی الکل، والله أعلم" (ردالمحتار ۳/ ۲۲۳، مکتبہ زکریا، فقہ البیوع ۱/ ۱۰۳۸)۔

الجواب عن السؤال الثانی

اگر غریب آدمی کو معلوم ہے کہ اس کی حاصل شدہ پوری جائیداد عین حرام ہے، یعنی رشوت، غصب وغیرہ کے ذریعہ لی گئی ہے اور اس کا مالک معلوم ہے تو مالک کو لوٹانا واجب ہے، کرایہ وغیرہ لینا جائز نہیں ہے، خواہ غاصب فقیر ہو یا غنی۔

البتہ اگر اس کو مالک کا پتہ نہیں، تو فقیر کے لئے گنجائش ہے کہ وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے بقدر استعمال کرلے، اور غنی کے لئے بطور قرض استعمال کی گنجائش ہے؛ اس لئے کہ مالک معلوم نہ ہونے کی صورت میں وہ بحکم لقطہ ہے۔

اور اگر وہ جائیداد عین حرام نہیں، بلکہ حرام کاروبار کے نفع سے حاصل شدہ ہے تو ایسی صورت میں جتنا مال اس میں حرام ہے اس کا اندازہ لگا کر صدقہ کرنے کے بعد جائیداد اور اس کی آمدنی حلال ہوگی؛ اس لئے کہ حرام کاروبار کے نتیجہ میں حاصل شدہ جائیداد کی حرمت ظنی ہے جس میں حضرات فقہاء نے سہولت کو ملحوظ رکھا ہے۔

"وعلی هذا یخرج ما إذا غصب ألفاً، فاشتری جاریة، فباعها بألفین، ثم اشتری بالألفین جاریة، فباعها بثلاثة آلاف أنّه یتصدق بجمیع الربح فی قولهما .وعند أبی یوسف رحمه الله تعالی: لایلزمه التصدقُ بشیء، لأنه ربح مضمون مملوک، لأنه عند أداء الضمان یملکه مستندا إلی وقت الغصب ومجرد الضمان یکفی للطیب فکیف إذا اجتمع الضمان والملک" (فقہ البیوع ۱/ ۱۰۴۳)۔

الجواب عن السؤال الثالث

اس قسم کی مجبور خاتون کے لیے، جب کہ کمائی کا دوسرا راستہ بھی نہیں ہے، اپنے کفیل کی حرام کمائی سے ضرورت کے بقدر استفادے کی گنجائش ہے۔

"لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهي في سعة من تناوله والإثم على الزوج" (ردالمحتار ۷/ ۳۰۲، فتاوی عثمانی ۳/ ۱۲۶)۔

حرام کمائی کے ذریعے تعلیم حاصل کر کے ملازمت حاصل کر لی، تو اب اس کے ذریعے ملنے والی آمدنی کے اوپر حرام کا حکم نہیں لگے گا بلکہ یہ حلال ہے۔

البتہ اس کی تعلیم پر جو حرام مال لگا ہے اگر وہ یقینی طور پر معلوم ہے تو اتنی مقدار، ورنہ اس کے بقدر اندازہ لگا کر صدقہ کرنا ضروری ہے، اور یہ بھی اس وقت جب کہ وہ مستحق نہ ہو اور اگر مستحق ہو تو صدقہ کرنا ضروری نہیں ہے۔

لیکن اگر حرام کے ذریعے جو کمائی ہوئی، اس کو اس کے اوپر خرچ کیا گیا ہے، تو چونکہ اس قسم کے نفع کی حرمت ظنی ہے، اس لئے صدقہ کرنا واجب نہیں ہے، تاہم اس شکل میں بھی صدقہ کرنا بہتر ہوگا۔

"والملك الخبيث سبيله التصدق به ولو صرفه في حاجة نفسه جاز ثم إن كان غنيا تصدق بمثله و إن كان فقيرا لا يتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۳/ ۶۱)۔

الجواب علی السؤال الرابع

اور اگر کسی کی ملکیت میں حلال اور حرام دونوں ہوں اور دونوں کو ملا دیا ہو، اس طور سے کہ دونوں غیر ممتاز ہوں تو بقدر حلال انتفاع حلال ہے، اور اس قسم کے آدمی کے یہاں دعوت میں شرکت کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ دعوت کی مقدار حلال کے اندر ہو۔

"وقد رُوي عن الإمام محمد رحمه الله تعالى حِلُّ الانتفاع بقدر الحلال بصراحة .جاء في التتارخانية عنه: غَصب عشرة دنانير، فألقى فيها ديناراً، ثمّ أعطى منه رجلاً ديناراً، جاز، ثم ديناراً آخر، لا. والحلال ههنا أقل، ولكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة" (فقہ البیوع ۱۰۲۱، ۱۰۳۴)۔

لیکن ایسی صورت میں بھی احتیاط بہتر ہے۔

"والأولى في هذه الصورة التنزه، ولكن يجوز للآخذ أن يأخذ منه بعض ماله هبة أو شراء،

لأن الأصل الإباحة .وينبغي أن يُقيَّد ذلک بأن يغلب على ظن الآخذ أن الحلال فيه بقدر ما يأخذه أو أكثر منه وهو مَحْمِل ما جاء في العبارات الآتية:

قال الإمام محمد رحمه الله تعالى في كتاب الآثار: "أخبرنا أبو حنيفة، قال: حدثنا محمد بن قيس أن أبا العوجاء العشار كان صديقاً لمسروق، فكان يدعوه، فيأكل من طعامه ويشرب من شرابه، ولا يسأله". قال محمد وبه نأخذ، ولا بأس بذلک، مالم يعرف خبيثاً بعينه، وهو قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى.

أخرج عبد الرزاق في مصنفه عن الثوري عن سلمة بن كهيل عن زربن عبدالله عن ابن مسعود رضي الله تعالى عنه قال:" جاء إليه رجل، فقال: إن لي جاراً يأكل الربوا، وإنه لا يزال يدعوني، فقال: مهنأه لک وإثمه عليه "قال سفيان: فإن عرفته بعينه، فلا تصبه" (فقہ البیوع ۱۰۳۸، ۱۰۳۹)۔

الجواب عن السؤال الخامس

اگر دعوت کھانے کے بعد یہ پتہ چلا کہ دعوت دینے والے کا پورا مال حرام ہے، تو اگر وہ مستحق ہے تو اس کے لئے صدقہ کرنا ضروری نہیں اور غیر مستحق ہونے کی صورت میں جتنی مقدار کھایا ہے اتنی مقدار صدقہ کرنا ضروری ہے۔

"والملک الخبيث سبيله التصدق به .ولو صرفه في حاجه نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله، و إن كان فقير لا يتصدق" (الاختیار لتعلیل المختار ۶۱/۳)۔

الجواب عن السؤال السادس

پہلے سے کمائے ہوئے مال میں سے جتنا مال قطعی طور پر بعینہ حرام ہے، تو اگر اس کا مالک معلوم ہے تو اس کو مالک کو لوٹانا ضروری ہے، ورنہ پورے مال کے بقدر صدقہ کر دینا ضروری ہے، چاہے قسط وار صدقہ کرے، یہاں تک کہ حرام مال سے سبکدوش ہو جائے۔

البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورتیں پوری کر سکے تو اس کے لئے بقدر ضرورت استعمال کرنا جائز ہے اور اتنی مقدار صدقہ کرنا بھی ضروری نہیں ہوگا۔

اور غنی ہے تو اس کے لئے امام کی اجازت یا مفتی کے فتوے کے بعد قرض لینے کی گنجائش ہوگی۔

"وكثيرا ما يقع في زماننا أن ما كسبه المرء مدى سنين طويلة، كله حرام عن طريق الربا أو الرشوة وغيرها من التعاملات المحظورة، ولا سبيل إلى رد تلک الأموال إلى أصحابها فوجب عليه

التصدق بها، ثم يوفقه الله سبحانه وتعالى أن يتوب عن الكسب الحرام ولكن ليس عنده مال سواه ليسد به حاجته وحاجه عياله فيحتمل أن يعتبر ذلک المرء فقيرا من حيث أنه لا يملک من المال الحلال شيئا وما فی يده ليس مملوكا له شرعا، فتجرى عليه أحكام الفقراء فی هذه المسالة، فيجوز له أن يصرف ذلک المال فی حاجه نفسه إلى أن يملک نصاب الزكاة من مال الحلال.....

فإذا ملک النصاب وصار غنيا شرعا ولا يكفی النصاب لحاجته وحاجة عياله فحينئذ يجوز له الاقتراض مما عنده من المال المكتسب بطريق الحرام بشرط أن يلتزم أداء مثله إلى الفقراء" (فقہ البیوع ۱۰۴۹/)۔

نوٹ: لیکن اگر حرام میں کچھ حصہ ایسا ہو جس کو مالک کے معلوم ہونے کی وجہ سے واپس لوٹانا واجب ہو تو اس مال کو بنیت قرض حلال کاروبار کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو لوٹانا واجب ہے۔

"ثم إن هذا الحكم من حل الانتفاع للفقير لحاجته، وجواز اقتراضه للغنى بإذن الإمام مختص بالملک الخبيث الذى وجب التصدق به .أمّا المغصوب الذى وجب ردُّه أو رد بدله إلى المالک الأصلى، فلا يجوز له أن يصرفه فی حاجة نفسه قبل أداء بدله، ولو كان بنية أداء بدله إلى المالک فيما بعد .والفرق بينهما أن ما وجب التصدق به لا يتعلق به مطالبة أحدٍ بعينه، وإنّما يتعلّق به حقٌّ الفقراء دون تعيين، وهذا بخلاف المال الخبيث الذى وجب ردُّ بدله إلى مالكه الأصلى، فإن له مطالباً معيناً، فلا يجوز التأخير فی أداء حقه إلا برضاه، وإن كان الغاصب فقيراً۔

ولكن الظاهر أنه إن لم يُعرف المالک الأصلى، وانتقلت الفريضة من رد العين إلى التصدق على الفقراء، فيكون حكمه حكم الغلّة والربح، حيث يجوز الانتفاع بها عند الحاجة، ولا يجوز للغنى إلا بطريق الاقتراض بإذن الإمام وأداء مثله إلى الفقراء" (فقہ البیوع ۱۰۴۵/تا۱۰۴۹)۔

نوٹ۔جتنی رقم حرام مال میں بنیت قرض لی جائے وہ امام کے فیصلے یا مفتی کے فتوے کے بعد ہو۔

"ولكن الظاهر أنه إن لم يُعرف المالک الأصلى، وانتقلت الفريضة من رد العين إلى التصدق على الفقراء، فيكون حكمه حكم الغلّة والربح، حيث يجوز الانتفاع به للفقير عند الحاجة، ولا يجوز للغنى إلا بطريق الاقتراض بإذن الإمام وأداء مثله إلى الفقراء "(فقہ البیوع ۱۰۴۹/)۔

الجواب عن السؤال السابع

اگر کسی کے پاس حرام کمائی کا مال ہے اور متعین طور پر کس کا مال ہے یہ معلوم نہیں ہے، تو اس کے لئے گنجائش ہوگی

کہ وہ تجارت کرنے کے لیے قرض کے طور پر اس مال کو لے لے، اور بعد میں اس قرض کو ادا کر دے۔

واضح رہے کہ اگر وہ آدمی مالدار ہو تو اس مال کو بنیت قرض امام کی اجازت یا مفتی کے فتویٰ کے بعد لے گا۔

اور اگر ایسا حرام مال ہو جس کا لوٹانا یا اس کے بدل کا لوٹانا مالک اصلی کو واجب ہو تو اس کی ادائیگی سے پہلے اس مال کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

"أما المغصوب الذی وجب رده أو رد بدله إلی المالک الأصلی، فلا یجوز له أن یصرفه فی حاجة نفسه قبل أداء بدله، ولو کان بنیة أداء بدله إلی المالک فیما بعد" (فقہ البیوع ۱۰۴۹/۲)۔

الجواب عن السؤال الثامن

اگر کسی ملازمت میں حلال وحرام دونوں قسم کے کام کرنے پڑتے ہوں تو ایسی ملازمت کا قبول کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں عمل حرام کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر کوئی اس جیسی ملازمت کو اختیار کر لے، تو اگر حلال اور حرام دونوں کاموں کی اجرت متعین ہو تو حلال ملازمت کے مقدار اجرت جائز ہوگی اور زائد اجرت کو صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

اور اگر اجرت متعین نہ ہو سکتی ہو تو اجرت مثل کے برابر لے کر بقیہ کو صدقہ کرنا ضروری ہے۔

"وأما الوظائف المرکبة من الخدمات المباحة والخدمات المحظورة، فلا یجوز قبولها لاشتمالها علی عمل محرم .ولکن إن قبل أحد مثل هذه الوظیفة، فما حکم الراتب الذی أخذه علیها؟ لم أجد فیها نقلاً فی کلام الفقهاء، إلا ما ذکره ابن قدامة رحمه الله تعالی:

"قال (أی للأجیر: استأجرتک) لتَحْمِل لی هذه الصبرة والتی فی البیت بعشرة ...فإن کانا یعلمان التی فی البیت لکنّها مغصوبة، أو امتنع تصحیح العقد فیها لمانع اختص بها، بطل العقد فیها، وفی صحة الأخری وجهان بناء علی تفریق الصفقة، إلا أنهما إن کانت قفزانهما معلومة، أو قدر أحدهما معلوم من الأخری، فالأولی صحته، لأنّ قسط الأجر فیها معلوم .وإن لم یکن کذلک. فالأولی بطلانه لجهالة العوض فیها.

والحاصل أن الإجارة فی الخدمة المباحة إنّما تصح إذا کانت أجرتها معلومة بانفرادها .ولا تصح فیما إذا لم تکن أجرتها معلومة .فإن کان کذلک فی خدمات الفنادق والمطاعم والبنوک وشرکات التأمین صارت أجرة المؤظف فیها مرکبة من الحلال والحرام .فدخلت فی الصورة الثالثة

من القسم الثالث، وحلّ التعامل معه بقدر الحلال .أما إذالم تُعرف أجرةُ الخدمة المباحة على حدتها، فالإجارة فاسدة، ولكن الأجير يستحق أجر المثل فى الإجارات الفاسدة، كما صرح به ابن قدامة رحمه الله تعالى بذلک فى إجارات فاسدة أخرى۔

وعلى هذا فإن ما يقابل أجر المثل للخدمة المباحة فى راتبه ينبغى أن يكون حلالا، فصار راتبه مخلوطا من الحلال والحرام فى هذه الصورة أيضا فينبغى أن يجوز معه التعامل بقدر الحلال'' (فقہ البیوع ۱۰۵۶، ۱۰۵۷)۔

نوٹ: اگر حلال ملازمت میں بہت معمولی کچھ حرام کام کرنا پڑتا ہے، تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

''غير أن بعض المعاصرين أجازوا شراء أسهمها إن كانت نسبة المحظورات فيها قليلة تابعة غير مقصودة، ولا تتجاوز خمسة فى المائة من إيراداته المباحة وبشرط أن يتصدق مالک السهم تلک النسبة من أرباح تلک الأسهم'' (المعیار الشرعی رقم ۲۱ بشأن الأوراق المالیۃ، فقہ البیوع ۱۰۵۷/۲)

الجواب عن السؤال التاسع

حرام آمدنی والے کے یہاں حلال ملازمت جائز ہے، بشرطیکہ اجرت عین حرام سے دیے جانے کا علم نہ ہو، اسی طرح اجرت کے بارے میں یہ گمان ہو کہ یہ اس حرام آمدنی والے شخص کے مجموعہ حلال مقدار کے اندر سے دی جارہی ہے۔

''وقد رُوى عن الإمام محمد رحمه الله تعالى حِلُّ الانتفاع بقدر الحلال بصراحة .جاء فى التتارخانية عنه: غَصب عشرة دنانير، فألقى فيها ديناراً، ثمّ أعطى منه رجلاً ديناراً، جاز، ثم ديناراً آخر، لا۔ والحلال ههنا أقل، ولكنه أجيز بقدر الحلال بدون اعتبار الغلبة'' (فقہ البیوع ۱۰۲۱، ۱۰۳۴)۔

''والظاهر من قول أبى حنيفة رحمه الله تعالى أنه ينفذ البيع بمعنى أنه ينتقل إلى المشترى الغاصب ملک ما اشتراه، ولكن لا يحل له الانتفاع به إلى أن يؤدى الضمان إلى المغصوب منهم .أما البائع الذى باع إليه، فالظاهر أنه يحل له الانتفاع بالثمن الذى قبضه، ولو كان الثمن من النقود لأن فريضة الرد إلى المغصوب منهم انتقل بالخلط إلى الزمان الواجب فى ذمة المشترى الغاصب، فلم يكن ما قبضه البائع عين المغصوب'' (فقہ البیوع ۱۰۲۷/۲)۔

''ولم يُذكر عن الكرخى حكم البائع الذى أخذ من المشترى النقود المغصوبة، هل يسوغ له استعمال تلک النقود؟ وقد أفتى كثير من علمائنا أنه يجوز له ذلک أيضًا'' (فتاوی دار العلوم دیوبند للمفتی عزیز

الرحمٰن رحمہ اللہ تعالی، کتاب البیوع ۱۴/ ۳۹۳ و ۳۹۶، فقہ البیوع ۱۰۱۶/)۔

اسی طرح حرام کمائی سے حاصل کی جانے والی بائیک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا بھی درست ہوگا، اسی طرح اس سے فیس حاصل کرنا بھی، بشرطیکہ کار، یا بائیک یا فیس عین حرام سے نہ ہو، یعنی وہ غصب، سرقہ یا رشوت سے نہ دی جارہی ہو، اور یہ گمان ہو کہ یہ چیزیں اس کی مجموعہ حلال مقدار کے اندر سے ہیں۔

الجواب عن السوال العاشر

ذاتی عمارت کے نقشے کی منظوری کے سلسلے میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس میں سود کی رقم کا استعمال اسی صورت میں جائز ہے جب کہ دینے والا شخص فقیر ہو۔

مدارس کی عمارت کے لئے سود اور مال دار شخص کے لیے سود کا اس مد میں دینا جائز نہیں ہوگا۔

"إلا إذا كان لا يجد غيره لأنه محتاج إليه، وله أن يصرفه إلى حاجة نفسه فلو أصاب مالا تصدق بمثله إن كان غنيا وقت الاستعمال و إن كان فقيرا فلا شيء عليه" (الہدایۃ مع فتح القدیر ۸/ ۲۵۷)۔

الجواب عن السؤال الحادی عشر

اگر کسی بستی، شہر یا مارکیٹ میں حرام کمائی کا رواج ہو، لیکن مارکیٹ میں حلال کمائی زیادہ ہو تو جس شخص سے بھی معاملہ کرے اس کے بارے میں کوئی تحقیق نہ ہو تو ایسی صورت میں پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس سے معاملہ کرنا، اس کی دعوت کھانا، چائے پینا اور ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہے۔

لیکن اگر حرام کمائی غالب ہو تو احتیاط کرے اور سوال کرلے کہ یہ حلال میں سے ہے یا حرام میں سے۔

"رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا: ينظر إن كان في بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال في أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (الفتاوی الہندیۃ کتاب البیوع، الباب العشرون فی البیاعات)۔

لیکن اگر جس سے معاملہ کرنا ہے اس کے بارے میں یقین سے معلوم ہو کہ اس کی آمدنی میں حرام آمدنی شامل ہے تو اس صورت میں ظن غالب پر عمل کرے، اگر اس کے گمان میں یہ ہو کہ یہ ہدیہ یا دعوت وغیرہ مال حلال سے متجاوز نہیں ہے تو جائز ہے۔

البتہ اس صورت میں بھی احتیاط بہتر ہے۔

"إن لم يعرف في المخلوط من الحلال والحرام أنهما متميزان أو مختلطان، وكم حصة الحلال في المخلوط ؟ فالأولى التنزه، ولكن يجوز التعامل بذلك المخلوط إذا غلب على الظن أن المتعامل به لا يتجاوز قدر الحلال" (فقہ البیوع ۱۰۵۴/۲)۔

الجواب عن السؤال الثانی عشر

احادیث میں حرام مال کھانے والے کی دعا کی عدم قبولیت کا ذکر ہے:

"يا أيُّها النَّاسُ إنَّ اللَّهَ طيِّبٌ لا يقبلُ إلَّا طيِّبًا ، وإنَّ اللَّهَ أمرَ المؤمنينَ بما أمرَ بِه المرسلينَ فقالَ يَا أيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ وقالَ يَا أيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ قالَ وذَكرَ الرَّجلَ يُطيلُ السَّفرَ أشعثَ أغبرَ يمدُّ يدَه إلى السَّماءِ يا ربِّ يا ربِّ ومطعمُه حرامٌ ومشربُه حرامٌ وملبسُه حرامٌ وغذِّيَ بالحرامِ فأنَّى يستجابُ لذلِك" (سنن الترمذی، حدیث نمبر:۲۹۸۹)۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے نہیں ہے جو حرام کھانے والوں کے حق میں دعا کریں، بلکہ خود حرام کھانے والے سے ہے۔

لہٰذا حرام کمائی کرنے والے کے حق میں دوسرے لوگوں کا دعا کرنا درست ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

☆☆☆

حرام تجارت وملازمت سے متعلق احکام

مفتی فیاض احمد محمود برمارے حسینی ☆

۱-الجواب وباللہ التوفیق:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ منفعت ضمان کے ساتھ ہوتی ہے (سنن الترمذی:۱۲۸۶)۔

حدیث پاک کی بنیاد پر فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مال حرام کے ذریعے سے تجارت کرے اور اسے تجارت میں نفع حاصل ہو تو یہ نفع اس شخص کے لئے حلال ہے، اس لئے کہ اگر اسے نقصان ہوتا تو وہ بھی اسی کے ذمہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص کے پاس مال حرام ہو اور وہ اس سے تجارت کرے یا انویسٹ کرے تو کاروبار کا نفع اس کے لئے حلال ہوگا، لیکن جو حرام مال ہے وہ حرام ہی رہے گا، امام شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لَوْ اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ فَالرِّبْحُ لَهُ فِي الْأَظْهَرِ" (مغنی المحتاج ۳/ ۳۶۳)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إِذَا اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ، فَقَوْلَانِ .الْجَدِيدُ: أَنَّهُ إِنْ بَاعَهُ أَوِ اشْتَرَى بِعَيْنِهِ، فَالتَّصَرُّفُ بَاطِلٌ. وَإِنْ بَاعَ سَلَمًا أَوِ اشْتَرَى فِي الذِّمَّةِ وَسَلَّمَ الْمَغْصُوبَ فِيهِ، فَالْعَقْدُ صَحِيحٌ، وَالتَّسْلِيمُ فَاسِدٌ، فَلَا تَبْرَأُ ذِمَّتُهُ مِمَّا الْتَزَمَ، وَيَمْلِكُ الْغَاصِبُ مَا أَخَذَ، وَأَرْبَاحُهُ لَهُ" (روضۃ الطالبین:۵/ ۵۹)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مَنْ وَرِثَ مَالًا وَلَمْ يَعْلَمْ مِنْ أَيْنَ كَسَبَهُ مُوَرِّثُهُ أَمِنْ حَلَالٍ أَمْ حَرَامٍ وَلَمْ تَكُنْ عَلَامَةً فَهُوَ حَلَالٌ بِإِجْمَاعِ الْعُلَمَاءِ فَإِنْ عَلِمَ أَنَّ فِيهِ حَرَامًا وَشَكَّ فِي قَدْرِهِ أَخْرَجَ قَدْرَ الْحَرَامِ بِالِاجْتِهَادِ" (المجموع:۹/ ۳۵۱)۔

شیخ بن باز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

☆ جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک

"أما الأرباح التی حصلت عن عمله وبیعه وشرائه فهی ماله فی أحد قولی العلماء؛ لأنه نماها بعمله واجتهاده فیکون المال الذی دخل علیه من طریق الرشوة حراماً، ولکن ما عمله فیه باجتهاده وبیعه وشرائه یکون له؛ لأنه تسبب عن عمله وعن تصرفاته" (فتاوی بن باز)(التہذیب ۴/ ۳۹۲، حاشیتا قلیوبی وعمیرة: ۳/ ۵۶، الحاوی الکبیر: ۸/ ۳۴)۔

۲-الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کسی غریب کو معلوم ہو کہ اس کا سارا مال حرام ہے تو چوں کہ حرام مال سے کی گئی تجارت کا نفع جائز ہے، اس لئے یہ غریب شخص ضرورت کے بقدر مال تجارت میں لگا کر اپنا گزر بسر کرلے، باقی مال صدقہ کرے، نیز ضرورتاً استعمال کیا ہوا مال بھی حالات سازگار ہونے پر صدقہ کرے، اس لے کہ فقہاء نے حرام مال کے مصارف میں سے ایک غرباؤ مساکین بھی ذکر کیا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قال الْغَزَالِیُّ رحمه الله إِذَا کَانَ مَعَهُ مَالٌ حَرَامٌ فَیَنْبَغِی أَنْ یَصْرِفَهُ فِی مَصَالِحِ الْمُسْلِمِینَ الْعَامَّةِ کَالْقَنَاطِرِ وَالرُّبُطِ وَالْمَسَاجِدِ وَمَصَالِحِ الطَرِیقِ وَنَحْوِ ذَلِکَ مِمَّا یَشْتَرِکُ الْمُسْلِمُونَ فِیهِ.....وَلَهُ هُوَ أَنْ یَأْخُذَ مِنْهُ قَدْرَ حَاجَتِهِ لِأَنَّهُ أَیْضًا فَقِیرٌ" (المجموع ۱۰/ ۳۸۱، موسوعۃ الفقہ ۳۴/ ۲۴۵)۔

۳-الجواب وباللہ التوفیق:

اگر شوہر کا مال مکمل طور پر حرام ذرائع سے ہو تو اس کے لیے اس میں سے کھانا جائز نہیں ہے، بلکہ بیوی کو چاہیے کہ وہ اسے ناجائز کمائی کی وعید سے باخبر کرے اور اسے توبہ کی ترغیب دے، اور اپنے شوہر سے حلال کمائی سے نفقہ کا مطالبہ کرے یا اپنا معاملہ دار القضاء سے رجوع کرے، یا خود کسی حلال طریقہ سے نفقہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، لیکن اگر حلال طریقہ سے نفقہ کا حاصل دشوار ہو جائے تو بطور مجبوری ضرورت کے بقدر حرام مال سے اپنے اخراجات لینا جائز ہے، اس لئے کہ اس صورت میں ان کا حکم مضطر کی طرح ہے۔

امام دویش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إذا کانت تعلم أن الکسب الذی یأتی به إلی البیت حرام فلا یجوز لها أن تأکل منه، وعلیها أن تطالبه بالنفقة من کسب طیب، أو ترفع أمره إلی الجهة المسئولة ،کالمحکمة الشرعیة" (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۲۱/ ۱۶۷)۔

"وأما انتفاع الزوجة والأولاد بهذا المال المحرم، فله حالتان: الأولی: أن تکون الزوجة والأولاد

غير قادرين على تحصيل المال الحلال إما لعجز أو صغر، فحكمهم حكم المضطر فيأخذون منه ما يكفيهم، وينكرون بألسنتهم إن استطاعوا، فإن عجزوا فبقلوبهم إلى أن يصبحوا قادرين على الكسب والاستغناء فيحرم عليهم عندئذ الأكل مما مصدره حرام۔ الثانية: أن يكون لهم القدرة على الاعتماد على أنفسهم والاستغناء عن مال الأب الحرام، فلا يجوز لهم الأكل منه،فإذا كان مال زوجک كله من الحرام فلا يجوز لكم الأكل من ماله إلا أن تضطروا فتأكلوا بقدر الحاجة" (فتاوی الرئیسیۃ ۴/۹۳)۔

۴-الجواب وباللہ التوفیق:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:" حلال واضح ہے، حرام بھی واضح ہے، ان دونوں کے درمیان چند مشتبہ امور ہیں جن کو اکثریت نہیں جانتی، جو شخص ان مشتبہ امور سے محفوظ رہا اس نے اپنے دین اور عزت کی حفاظت کی اور جس نے ان مشتبہ امور کو اختیار کیا وہ ایک دن حرام کاموں میں پڑ جائے گا، جیسا کہ چراگاہ کے قریب جانور چرانے والا اس بات کے قریب ہوتا ہے کہ اس کا جانور اس چراگاہ میں بھی داخل ہوگا، خبردار ہر بادشاہ کی ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے، اور اللہ کی چراگاہ اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں" (بخاری:۵۲)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام کے علاوہ مشتبہ اور مشکوک چیزوں اور مال سے بچنا ضروری ہے، اسی پس منظر میں فقہاء نے ایک اصول مرتب فرمایا کہ جس مال کا یقینی طور پر حرام ہونا معلوم ہو اس کا استعمال حرام ہے اور اگر یقین نہ ہو؛ بلکہ شک ہو تو مکروہ ہے، اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی دعوت کے قبول کرنے اور رد کرنے یا اس میں شرکت کرنے اور نہ کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا، لہٰذا شادی کی دعوت ایسے گھرانہ سے دی جائے جن کی آمدنی کے ذرائع یقینی طور پر حرام پر مبنی ہیں تو اس دعوت کو قبول کرنا اور کھانا حرام ہے، لیکن اگر یقین نہ ہو بلکہ تردد ہو تو ناپسندیدہ اور مکروہ ہے۔

امام شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ومنها أن لا يدعوه من أكثر ماله حرام فمن كان كذلک كرهت إجابته، فإن علم أن عين الطعام حرام حرمت إجابته، وإلا فلا" (بجیرمی علی الخطیب ۳۳/۴۵۵)۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إذا دعاه من أكثر ماله حرام، كرهت إجابته كما تكره معاملته، فإن علم أن عين الطعام حرام حرمت إجابته" (روضۃ الطالبین:۷/۳۳۷، الفقہ المنہجی:۳/۴۸، حاشیۃ الجمل:۶/۶۱۵، أسنی المطالب ۱۱/۵۵)۔

۵-الجواب وباللہ التوفیق:

کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس کی تلافی کے لیے اس شخص کو چاہیے کہ اپنے اجتہاد کے ذریعے جتنا کھایا ہو اسی کے بقدر صدقہ کرے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مَنْ وَرِثَ مَالًا وَلَمْ يَعْلَمْ مِنْ أَيْنَ كَسَبَهُ مُوَرِّثُهُ أَمِنْ حَلَالٍ أَمْ حَرَامٍ وَلَمْ تَكُنْ عَلَامَةً فَهُوَ حَلَالٌ بِإِجْمَاعِ الْعُلَمَاءِ فَإِنْ عَلِمَ أَنَّ فِيهِ حَرَامًا وَشَكَّ فِي قَدْرِهِ أَخْرَجَ قَدْرَ الْحَرَامِ بِالِاجْتِهَادِ" (المجموع شرح المہذب ۹/۳۳۲)۔

"وَذَهَبَ الشَّافِعِيَّةُ إِلَى أَنَّ مَنْ وَرِثَ مَالًا، وَعَلِمَ أَنَّ فِيهِ حَرَامًا وَشَكَّ فِي قَدْرِهِ، أَخْرَجَ الْقَدْرَ الْحَرَامَ بِالاجْتِهَادِ" (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ ۳۴/۲۴۶)۔

۶-الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کسی شخص نے کسی کا مال غصب کیا تو اس شخص کے لیے وہ مال حرام ہوتا ہے، لیکن اگر اس کو تجارت میں لگا دے تو اس کے منافع اس کے لیے حلال ہوں گے، البتہ غصب کیا ہوا مال لوٹانا ضروری ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر کسی شخص کی کمائی حرام ہے اور وہ اس حرام مال کو تجارت میں لگا دے اور اس تجارت سے جو منافع حاصل ہوں گے، وہ اس شخص کے لیے حلال ہوں گے، البتہ جو مالِ حرام تجارت کے لیے لگایا ہے اسی کے بقدر لوٹا دے گا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إِذَا اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ، فَقَوْلَانِ .الْجَدِيدُ: أَنَّهُ إِنْ بَاعَهُ أَوِ اشْتَرَى بِعَيْنِهِ، فَالتَّصَرُّفُ بَاطِلٌ .وَإِنْ بَاعَ سَلَمًا أَوِ اشْتَرَى فِي الذِّمَّةِ وَسَلَّمَ الْمَغْصُوبَ فِيهِ، فَالْعَقْدُ صَحِيحٌ، وَالتَّسْلِيمُ فَاسِدٌ، فَلَا تَبْرَأُ ذِمَّتُهُ مِمَّا الْتَزَمَ، وَيَمْلِكُ الْغَاصِبُ مَا أَخَذَ، وَأَرْبَاحُهُ لَهُ" (روضۃ الطالبین: ۵/۵۹)۔

امام خطیب شربینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"لَوْ اتَّجَرَ الْغَاصِبُ فِي الْمَالِ الْمَغْصُوبِ فَالرِّبْحُ لَهُ فِي الْأَظْهَرِ" (مغنی المحتاج ۳/۳۶۳)۔

۷-الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کسی آدمی کے پاس حرام مال کی ایک خاص مقدار ہو تو اسے چاہیے کہ اگر مالک نہ مل سکے تو اسے فوراً صدقہ دے

دے، لیکن اگر وہ غریب آدمی ہے، (اور کسی دوسرے ذریعہ سے اس کے پیسے ملنے کے امکانات کم ہیں) اور وہ اس رقم کو کاروبار کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے اس حرام مال کو کاروبار کے لیے استعمال کرنے کی گنجائش ہے، البتہ اس پر ضروری ہے کہ بسہولت وہ اصل حرام کی رقم کو صدقہ کردے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قَالَ الْغَزَالِيُّ إِذَا كَانَ مَعَهُ مَالٌ حَرَامٌ وَأَرَادَ التَّوْبَةَ وَالْبَرَائَةَ مِنْهُ .....وَلَهُ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِهِ عَلَى نَفْسِهِ وَعِيَالِهِ إِذَا كَانَ فَقِيرًا لِأَنَّ عِيَالَهُ إِذَا كَانُوا فُقَرَاءَ فَالْوَصْفُ مَوْجُودٌ فِيهِمْ بَلْ هُمْ أَوْلَى مَنْ يُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ وَلَهُ هُوَ أَنْ يَأْخُذَ مِنْهُ قَدْرَ حَاجَتِهِ لِأَنَّهُ أَيْضًا فَقِيرٌ" (المجموع ۱۰/۳۸۱، الموسوعۃ الفقہیۃ ۳۴/۲۸۴)۔

۸-الجواب وباللہ التوفیق:

ایسی کمپنی کے لیے کام کرنا جو حلال اور حرام دونوں لین دین کرتی ہے، اگر ایسی کمپنی میں صرف حلال شعبوں میں کام کرنا ممکن ہو اور ان شعبوں کا حساب کتاب کلی طور پر الگ ہو تو اس کمپنی میں کام کرنا جائز ہے، لیکن اگر ممکن نہ ہو، بلکہ دونوں یعنی حرام وحلال کاروبار مشترک ہے تو ایسی کمپنی میں کام کرنا جائز نہیں ہے، گرچہ صرف حلال ہی امور میں اسے کام مل رہا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" (المائدۃ:۲)، اس سے پتہ چلتا ہے کہ نفس حرام کام کے علاوہ ہر وہ کام جو حرام کام کے لئے وسیلہ اور ذریعہ بنے یا معین ومددگار بنے حرام ہے، اور احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے بارے میں دس آدمیوں پر لعنت فرمائی ہے: اسے دبانے والا، جس کے لیے اسے نچوڑا جائے، پینے والا، اسے اٹھانے والا، ایک جس کے پاس لے جایا جاتا ہے، اسے ڈالنے والا، اسے بیچنے والا، اس کی قیمت کھانے والا، اسے خریدنے والا اور جس کے لیے خریدا گیا ہے" (سنن الترمذی، أبواب البیوع باب النہی أن یتخذ الخمر خلا، حدیث رقم: ۱۲۹۵)، اس کا واضح مطلب ہے کہ حرام کام سے متعلق کاموں کا بھی وہی حکم ہے جو اصل حرام کام کا ہے، اس اعتبار حرام وحلام مشترک کاروبار وبزنس میں کسی بھی قسم کی ملازمت درست نہیں ہے۔

امام رملی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَدَلِيلُ ذَلِكَ لَعْنُهُ ﷺ فِي الْخَمْرِ عَشَرَةً: عَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا.....الْحَدِيثُ الدَّالُّ عَلَى حُرْمَةِ كُلِّ تَسَبُّبٍ فِي مَعْصِيَةٍ وَإِعَانَةٍ عَلَيْهَا" (نہایۃ المحتاج: ۳/۴۸۱)۔

امام رویانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"والإعانة على المعصية معصية" (بحر المذہب ۲/۳۴۱)۔

۹-الجواب وباللہ التوفیق:

اگر کسی کو یقین ہو کہ کوئی خاص جائیداد یا کاروبار مکمل طور پر حرام ہے تو ضروری ہے کہ وہ ان سے لین دین سے پرہیز کرے، اسی طرح ان کے ساتھ کسی قسم کے لین دین یا میل جول یا فیس یا تنخواہ لینے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے، لیکن اگر اس مال کا صرف ایک حصہ حرام ہو تو اس کا سودا کرنا، کام کرنا اور ان سے احسان لینا مکروہ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وَلَا نُحِبُّ مُبَايَعَةَ مَنْ أَكْثَرُ مَالِهِ الرِّبَا أَوْ ثَمَنُ الْمُحَرَّمِ مَا كَانَ أَوْ اكْتِسَابُ الْمَالِ مِنْ الْغَصْبِ وَالْمُحَرَّمِ كُلِّهِ، وَإِنْ بَايَعَ رَجُلٌ رَجُلًا مِنْ هَؤُلَاءِ لَمْ أَفْسَخْ الْبَيْعَ؛ لِأَنَّ هَؤُلَاءِ قَدْ يَمْلِكُونَ حَلَالًا فَلَا يُفْسَخُ الْبَيْعُ وَلَا نُحَرِّمُ حَرَامًا بَيِّنًا إلَّا أَنْ يَشْتَرِيَ الرَّجُلُ حَرَامًا يَعْرِفُهُ، أَوْ بِثَمَنٍ حَرَامٍ إذا علم أن فلانًا من الناس كل ماله حرام.....فإنه يحرم بيعه كما يحرم الشراء منه، وكذلک كل أنواع التعامل معه كإجارة أو عارية أو نحو ذلک۔ كما يحرم الأكل من طعامه.فإذا لم يكن كل ماله حرامًا، بل كان مخلوطًا من حرام وحلال، كره التعامل معه بجميع الأوجه التي سبقت" (الام:۴۵۶، الفقہ المنہجی ۳/۴۸، انجم الوہاج ۴/۱۰۷، مختصر المزنی ۳/۱۲۳)۔

۱۰-الجواب وباللہ التوفیق:

آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشے کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے ایک خطیر رقم رشوت دے کر لی جاتی ہے، علماء نے اپنی مصلحت کے لیے رشوت دینے کی اجازت دی ہے، لیکن اس رشوت کے لیے سود کی رقم دینے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ سود کی رقم پر کسی کی ملکیت نہیں ہے، اس لئے اسے اپنے مقاصد وفوائد کے لئے صرف کرنا درست نہیں ہے، بلکہ اس کے متعین مصارف پر خرچ کرنا چاہئے، یعنی فقراء ومساکین پر خرچ کی جائے یا مصالح المسلمین پر خرچ کی جائے۔

"الفوائد الربوية من الأموال محرمة قال تعالى (و أحل الله البيع و حرم الربا)فمن وقع تحت يده شي منها التخلص منها بإنفاقهما في ما ينفع المسلمين ومن ذلک إنشاء الطرق و بناء المدارس وإعطاؤها الفقراء" (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۱۳/۳۵۴)۔

"إذا كان معه مال حرام فينبغي أن يصرفه في مصالح المسلمين العامة كالقناطير والربط والمساجد ومصالح طريق مكة ونحو ذلك مما يشترك المسلمون فيه و إلا فيتصدق به على فقير أو فقراء" (المجموع ۹/۳۳۲)۔

۱۱-الجواب وباللہ التوفیق:

حضرت حسن بن علیؓ فرماتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا ہے کہ جو چیز تمہیں شک میں ڈالے اسے چھوڑ کر غیر مشکوک چیزوں کو اختیار کرو، کیونکہ سچائی میں سکون ہے اور جھوٹ میں اشتباہ ہے'' (سنن الترمذی)، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حتی الامکان مشتبہ چیزوں سے احتیاط کرنا چاہئے، لہٰذا جہاں پر کسی کے ہدیہ کے بارے یہ امکان ہے کہ یہ مشتبہ ہے یا حرام مال ہے تو اسے قبول کرنے سے بچنا چاہئے، لیکن ممکن نہ ہو اور ہدیہ دینے والے کی آمدنی کے بارے میں صرف حرام کا امکان ہو تو ایسے لوگوں سے ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، البتہ ناپسندیدہ ہے، لیکن یقینی طور پر ہدیہ کا حرام مال سے ہونا معلوم ہو تو اسے قبول کرنا درست نہیں ہے، اگر واپس کرنا ممکن نہ ہو تو قبول تو کرلے، لیکن کسی فقیر و مسکین کے حوالے کردے کہ اصل اس کا مستحق وہی ہے۔

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"تُكْرَهُ مُعَامَلَةُ مَنْ لَا يَتَوَقَّى الشبهة فِي كَسْبِهِ وَمَنْ خَلَطَ الْحَرَامَ بِمَالِهِ لِقَوْلِهِ ﷺ -: دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ فَلَنْ تَجِدَ فقْد شَيْءٍ تَرَكْتَهُ لِلَّهِ" (الحاوی الکبیر ۵/۳۱۰)۔

"مشتبه لخفائه فلا يدرى هل هو حلال أو حرام؟ ولذا ينبغي اجتنابه لأنه إن كان حراما فقد برء من الوقوع فيه و إن كان حلالا فقد أجر لتركه الحلال بنية تجنب الوقوع في الحرام" (الموسوعۃ الفقہیہ ۲۵/۳۴۱)۔

۱۲-الجواب باللہ والتوفیق:

اس سوال میں تین صورتیں ہیں: ۱-حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کے نام رکھنے کے وقت دعاء کراتا ہے تو اس بچہ کے لیے صالحیت کی دعاء کرنا چاہیے، البتہ اس موقع پر کھانے کی دعوت کا انتظام کیا گیا ہے، اس دعوت سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "وَ إِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" (آل عمران: ۳۶)۔

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو میں اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام ابراہیم رکھا'' (صحیح البخاری ۶۱۹۸)۔

''فَإِنْ كَانَ الْغَالِبُ هُوَ الْحَرَامَ يَنْبَغِي أَنْ لَا يَقْبَلَ الْهَدِيَّةَ، وَلَا يَأْكُلَ الطَّعَامَ إِلَّا أَنْ يُخْبِرَهُ بِأَنَّهُ حَلَالٌ وَرِثْتُهُ أَوْ اسْتَقْرَضْتُهُ مِنْ رَجُلٍ، كَذَا فِي الْيَنَابِيعِ'' (الفتاوی العالمگیریۃ ۵/ ۳۴۲)۔

''لایجوز للأب أن یربی أولاده علی کسب حرام، وهذا معلوم عند السائل، وأما الأولاد فلا ذنب لهم فی ذلک، وإنما الذنب علی أبیهم'' (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ ۲۶/ ۳۳۲)۔

۲- دوسرے موقع پر دعاء کرتے وقت ان چیزوں کا خیال کرے گا، اس مجلس میں اسکے کام اور ذات کی تعریف نہ کی جائے، اس کے مال میں اضافہ و برکت کی بھی دعاء نہ کی جائے، نیز اگر وہ بیمار ہوجاتا ہے تو اس کی اعادت کرنا بدرجہ اولی ضروری ہے اور یہ حقوق المسلمین میں سے ہے؛ جبکہ آپ صل اللہ علیہ وسلم نے تو غیر مسلموں کی اعادت کی ہے، البتہ ان موقعوں پر حرام کمائی سے بچے رہنے کی ترغیب و دعاء کی جائے:

''فَالدُّعَاءُ بِتَحْصِيلِ أَعْظَمِ الْمُحَرَّمَاتِ أَقْبَحُ الدُّعَاءِ وَيُرْوَى مَنْ دَعَا لِفَاسِقٍ بِالْبَقَاءِ فَقَدْ أَحَبَّ أَنْ يُعْصَى اللَّهُ تَعَالَى وَمَحَبَّةُ مَعْصِيَتِهِ'' (الفروق للقرافی ۴/ ۲۹۶)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کررہا تھا، وہ بیمار ہوگیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ اس پر رحمت نازل فرمائے اور یہ کہتے ہوئے باہر نکلے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے اسے آگ سے بچایا'' (صحیح البخاری ۱۳۵۶)۔

۳- جہاں تک پانی دم کرکے دینے کا تعلق ہے تو یہ دعاء اور تعویذ کے لیے ہوسکتا ہے، اسکی شریعت میں میں اجازت ہے، اور آپ صل اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے، واللہ اعلم۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الحمۃ سے رقیہ کرنے، العین اور النملۃ میں اجازت دی تھی (جامع الترمذی ۲۰۵۶)۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنوں اور انسان کی نظر بد سے پناہ مانگتے تھے، یہاں تک کہ معوذتین (سورہ فلق اور سورہ ناس) نازل ہوگئی، جب یہ نازل ہوئیں تو آپ نے انہیں لے لیا اور باقی سب کچھ چھوڑ دیا، (جامع الترمذی ۲۰۵۸)۔

☆☆☆

حرام کاروبار سے متعلق بعض مسائل

حافظ سید فاروق عمری مدنی ☆

الحمد لله والصلاة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه ومن والاه، وبعد!

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا: "**الذين يأكلون الربا لا يقومون إلا كما يقوم الذى يتخبطه الشيطان من المس ذلك بأنهم قالوا إنما البيع مثل الربا وأحل الله البيع وحرم الربا فمن جائه موعظة من ربه فانتهى فله ما سلف وأمره إلى الله ومن عاد فأولئك أصحاب النار هم فيها خالدون**" (البقرۃ:۲۷۵)۔

(قیامت کے دن) سود خور لوگ کھڑے نہ ہوں گے مگر اسی طرح جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جس کو شیطان چھو کر خبطی بنا دیتا ہے، یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا: خرید وفروخت بھی سود کے مثل ہے، جب کہ اللہ تعالی نے خرید وفروخت کو جائز قرار دیا اور سود کو ناجائز، پس جس کے پاس اللہ کی طرف سے نصیحت آئی اور وہ باز آ گیا تو اس کے لئے وہ ہے جو گذر چکا، اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو (سود کی طرف) واپس لوٹے تو ایسے لوگ جہنمی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**إن الله يغار وغيرة الله أن يأتى المؤمن ما حرم الله**" (صحیح البخاری:۵۲۲۳)۔

(بے شک اللہ تعالی کو غیرت آتی ہے، اور اللہ تعالی کی غیرت یہ ہے کہ مومن وہ کام کرے جس کو اللہ تعالی نے حرام ٹھہرایا ہے)۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالی نے سود کی حرمت کو بڑی شدت کے ساتھ بیان فرمایا، جس سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ سود کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، نہ لینا جائز ہے اور نہ دینا، نہ دار الاسلام میں اور نہ دار الحرب میں، نہ کفار کے ساتھ سودی معاملہ کرنا جائز ہے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ، اس لئے یہ فتوی ہی غلط ہے کہ دار الحرب میں کفار کو سود پر رقم دینا جائز ہے، یہی جمہور علماء کا موقف ہے، صرف امام ابو حنیفہ اور محمد بن حسن رحمہما اللہ کی طرف اس کا جائز ہونا منسوب کیا گیا ہے،

☆ جامعہ دار السلام عمر آباد

جو میری نظر میں مشکوک معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

امام ابو یوسف فرماتے ہیں: ''لا یجوز للمسلم فی دار الحرب إلا ما یجوز له فی دار الاسلام'' (بدائع الصنائع: ۷/ ۱۳۲) (مسلمان کے لئے دار الحرب میں صرف وہی جائز ہے جو دار الاسلام میں جائز ہے)، اور یہی صحیح ہے، مال حرام کھانے سے جس طرح اہل اسلام کو منع کیا گیا اسی طرح سب کو منع کیا گیا، اللہ تعالی یہودیوں کے متعلق فرماتے ہیں: ''وأخذهم الربا وقد نهوا عنه'' (المائدہ:۱۶۱) (اور ان کے سود لینے کے سبب (ان پر لعنت کی گئی) جب کہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا)۔

اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ دار الحرب میں کافر کا مال حلال ہے، تو ان سے سود لینا بھی جائز ہے، اس بارے میں یہ کہنا ہے کہ انڈیا کو دار الحرب کہنا ہی صحیح نہیں ہے، کیونکہ علامہ حصکفی الدر المختار میں رقم طراز ہیں: ''لا تصیر دار الإسلام دار حرب إلا بأمور ثلاثه: بإجراء أحكام أهل الشرک، وباتصالها بدار الحرب، وبأن لا يبقى فيها مسلم أو ذمی آمنا بالأمان الأول علی نفسه، ودار الحرب تصير دار الاسلام بإجراء أحكام أهل الإسلام فيها؛ كجمعة وعيد'' (درالمختار: ۴/ ۱۷۵) (دار الاسلام تین امور سے دار الحرب بن جاتا ہے: مشرکین کے احکام نافذ ہوں، دار الاسلام دار الحرب سے مل جائے، اس میں کوئی مسلمان اور ذمی باقی نہ رہیں، اور دار الحرب دار الاسلام بن جاتا ہے اس میں اہل اسلام کے احکام جاری ہونے سے؛ جیسے: نماز اور عید وغیرہ)، اس فتوی کی بنیاد پر صاف ظاہر ہے کہ انڈیا کبھی دار الحرب نہیں رہا۔

اور یہ بات بھی محل نظر ہے کہ دار الحرب میں کافر کا مال مسلمان کے لئے جائز ہے، حق یہی ہے کہ جو چیز دار الاسلام میں حرام ہے وہ دار الحرب میں بھی حرام ہے، چنانچہ سود لینا، دینا، اس کا حساب و کتاب لکھنا، گواہ بننا، ہر جگہ گناہ کبیرہ ہے، اللہ تعالی سے اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کے مترادف ہے، جس طرح سود، جوا، رشوت، شراب، بدکاری اور فحاشی وغیرہ ہر جگہ حرام ہے؛ اسی طرح سود کا لینا اور دینا دونوں دار الاسلام اور دار الحرب دونوں جگہ ناجائز ہے، بلکہ جہاں غیر مسلم زیادہ تعداد میں ہوں وہاں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنا اور اچھے اخلاق و کردار کو اپنانا اور بھی زیادہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ہم دوسروں کے لئے نمونہ ہیں، اچھے اخلاق و کردار کے سبب ہی اسلام اس قدر تیزی سے اغیار میں پھیلا، اپنوں کے لئے ایک اصول اور دوسروں کے لئے دوسرا اصول روح شریعت کے منافی ہے؛ بلکہ یہ یہودیوں کی سوچ ہے؛ وہ آپس میں سودی لین دین نہیں کرتے تھے، ایک دوسرے کا مال ہڑپتے نہیں تھے، لیکن عربوں سے سود لینا اور ان کا مال ہڑپنا غلط نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ اللہ تعالی نے انہیں پھٹکار سنائی؛ ارشاد باری تعالی ہے: ''ومنهم من إن تأمنه بدينار لا يؤده إليک إلا

مادمت علیه قائما ذلک بأنهم قالوا لیس علینا فی الأمیین سبیل ویقولون علی الله الکذب وهم یعلمون'' (آل عمران:۷۵)(اوران (یہودیوں) میں بعض وہ ہیں جن کے پاس تم ایک دینار بھی امانت رکھوتو وہ تمہیں واپس نہ کریں، الا یہ کہ تم ان کے سر پر کھڑے ہوجاؤ، یہ اس سبب سے کہ انہوں نے کہا: ہم پر امیوں (غیر عرب) کے بارے میں کوئی حرج نہیں، اور وہ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں جب کہ وہ جانتے ہیں)، اب بتایئے کہ اگر مسلمانوں کی سوچ بھی ایسی ہی ہوتو معاملات میں ان کے اور یہودیوں کے بیچ کیا فرق باقی رہ جائے گا؟

جواب:۱

یہاں سوال یہ ہے جس نے اس فتوی کی بنیاد پر سودی لین دین کیا اور اور بہت سارا مال بھی کمایا، بعد میں علماء نے فتوی جاری کیا کہ اب انڈیا دارالحرب نہ رہا، اس لئے اب سودی لین دین غیر مسلموں سے بھی جائز نہیں، اب وہ اس رقم کا کیا کرے؟ جب کہ اس نے اسی رقم کو لگا کر بعد میں جائز طریقہ سے بھی تجارت کی ہے، اور اگر اس کی وفات ہوگئی اور اسکے ورثہ کو یہ مال منتقل ہوا تو ورثہ اس مال کا کیا کریں؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ورع وتقوی کا اعلی مرتبہ یہ ہے کہ اس سارے مال کو غریبوں کے اندر تقسیم کردے جو اس نے حرام طریقہ سے کمایا، ائمہ کرام سے اس قسم کے بہت سے واقعات منقول ہیں کہ تھوڑی سی مشتبہ رقم سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سارا مال ہی غریبوں کو دے دیا، اگر ایمان اتنا مضبوط نہیں ہے تو اندازے سے اتنی رقم بہر حال نکالے کہ اس کے دل کو اطمینان ہوجائے کہ حرام طریقہ سے حاصل کردہ رقم اس کے پاس نہیں رہی۔

ایک مسلمان کو اس بات کی فکر کرنا چاہئے کہ اس کا کھانا پینا کپڑا مکان سب کچھ حلال کمائی کا ہو، کیونکہ حرام کمائی کے متعلق شریعت نے یہ وعید سنائی ہے کہ جس کا جسم حرام طریقہ سے بڑھا، جہنم کی آگ اس کی مستحق ہے، رسول اللہ ﷺ نے کعب بن عجرہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:''**یا کعب بن عجرة! أنه لا یدخل الجنة لحم ودم نبتا علی سحت، النار أولی به**'' (تخریج صحیح ابن حبان لشعیب الارناؤوط:۵۵۶۷)،(اے کعب بن عجرہ! جنت میں وہ گوشت اور خون داخل نہ ہوگا جو حرام مال سے بڑھا ہو، جہنم کی آگ اس کی زیادہ مستحق۔

جواب:۲

اگر کسی شخص کے پاس اتنی جائداد ہے کہ اس سے کرایہ بھی مل رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی غریب نہیں ہے، اگر یہ ساری جائداد اور مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے تو اس کو چاہئے کہ پہلی فرصت میں صدق دل کے ساتھ توبہ واستغفار

کرے، دل میں شرمندگی ہو، آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم کرے، اور اس جائداد کو اور مال و دولت کو بلا نیت ثواب غریبوں میں تقسیم کردے، ''من ترک شیئا لله عوضه الله خیرا منه'' (جس نے اللہ کے لئے کوئی چیز چھوڑ دی اللہ تعالی اس کو اس سے بہتر عطا فرمائے گا)، "ومن یتق الله یجعل له مخرجا ویرزقه من حیث لا یحتسب" (سورۃ الطلاق:۲-۳) (جس نے اللہ کا تقوی اختیار کیا اللہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا، اور اس طرح رزق دے گا کہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا)، اگر مال حرام سے حاصل شدہ جائداد اور مال و دولت کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہ بچتا ہو تو اسی قدر رقم اپنے پاس رکھ سکتا ہے جتنی وہ غریبوں میں بانٹ رہا ہو، اس میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ ساری دولت سے چھٹکارے کے بعد وہ خود بھی مسکین شمار ہوگا، واللہ اعلم۔

جواب: ۳

اگر خاندان کے سرپرست کا ذریعۂ آمدنی حرام طریقہ سے ہو تو اس کے زیر سرپرستی بیوی اور بچے کیا کریں، جبکہ ان کے پاس آمدنی کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں؟ مذکورہ صورت مسئولہ میں بیوی بچے مسلسل اپنے سرپرست کو نصیحت کرتے رہیں، اس کو حرام کمائی کے مضرات سے آگاہ کرتے رہیں، اور حلال کمائی کی برکتیں بھی بیان کریں، اور اس کے حق میں ہدایت کی اور اپنے لئے حلال رزق کی دعا کرتے رہیں، بندوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہیں، وہ جیسے چاہے پلٹتا رہتا ہے، جس کو چاہے جب چاہے ہدایت سے نواز دے، مذکورہ صورت میں بیوی بچوں کے لئے یہ جائز ہوگا کہ صرف بقدر حاجت اپنے سرپرست کی کمائی سے پیسے لیں، اور صبر کرتے رہیں، واللہ مع الصابرین، اگر حرام کمائی ہی سے بچوں کی تعلیم مکمل ہوئی ہو اور بچے تعلیم سے فارغ ہو کر خود بھی کمائی کر رہے ہوں، تو ان کی کمائی میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ حسب المقدور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہیں، اور توبہ اور استغفار کرتے رہیں، لاعلمی یا مجبوری میں ان سے جو غلطی ہوئی اللہ تعالی اس کو معاف فرمانے والا ہے۔

جواب: ۴

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حق المسلم علی المسلم ست، وذکر منها: و إذا دعاک فأجبه'' (صحیح مسلم:۲۱۶۲) (ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں، ان میں سے ایک یہ فرمایا کہ جب وہ تمہیں دعوت دے تو تم اس کی دعوت قبول کرو)۔

یہاں شریعت ہم کو اس بات کا کھوج لگانے کا حکم نہیں دے رہی ہے کہ دعوت دینے والے کی کمائی کا پتہ کریں، کہ وہ حرام کی ہے یا حلال کی؟ یا ملی جلی ہے! جب کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض یہودیوں کی دعوت بھی قبول کی، ہاں دو صورتوں میں

دعوت قبول نہیں کرنا چاہئے ؛ا۔اگر اس دعوت میں منکرات بھی ہوں ؛ جیسے: ناچ گانا اور موسیقی بھی ہو، یا مرد وزن کا اختلاط ہو تو اس شرط پر اس دعوت میں جاسکتے ہیں کہ آپ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں، اس کو نصیحت کریں، ورنہ معذرت پیش کردیں، اگر مدعو کا معاشرہ میں کوئی اونچا مقام ہو اور ایسے شخص کی دعوت قبول نہ کرنے سے عبرت حاصل ہونے کی امید ہو تو ایسی صورت میں اس کا دعوت میں شرکت نہ کرنا اولی ہے۔اسی طرح جن کا کاروبار حرام کا ہے ان کی دعوت امام اور ایسے لوگ قبول نہ کریں جن کا معاشرہ میں ایک مقام ہے، واللہ اعلم۔

جواب:۵

جیسا کہ پچھلے مسئلہ میں وضاحت ہوئی ایسے آدمی کی دعوت جائز ہے، ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کو نصیحت کی جائے، حرام کمائی کے نقصانات سے آگاہ کرے اور حلال کمائی کی فضیلت اس کو بتائے، اگر دعوت کھانے سے پہلے اس کو پتہ نہ تھا کہ اس کی کمائی حرام کی ہے تو دعوت کھانے کے بعد بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کی گنجائش ہے۔

جواب:٦

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ کرنا بالکل جائز نہیں، ذرا بنی اسرائیل کا انجام سوچیں، جب انہیں ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تو حیلہ سازی سے اس کو حلال کرنا چاہا تو اللہ تعالی نے ان کی شکل بندروں جیسی بنادی، حیلہ کے ذریعہ حرام چیز کو حلال بنانے کی کوشش کرنا اللہ تعالی کے پاس نہایت ہی مبغوض فعل ہے، حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر مکہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: ''بے شک اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار جانور، خنزیر اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے، تو سوال ہوا: اے اللہ کے رسول! آپ مردار کی چربی کے بارے میں بتادیجئے! کیونکہ اس سے کشتیوں کا رنگ وروغن کیا جاتا ہے، چمڑوں کو رنگا جاتا ہے، لوگ اس سے چراغ جلاتے ہیں؟! تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں وہ حرام ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر فرمایا: اللہ تعالی یہودیوں پر لعنت بھیجے، جب اللہ تعالی نے مردار جانوروں (کی یا گائے اور بکری) کی چربی حرام قرار دی تو انہوں نے اس کو بدل دیا (پگھلا دیا) پھر اس کو بیچ کر اس کے پیسے کھالئے'' (صحیح البخاری:۲۲۳٦)، بنی اسرائیل کے مذکورہ واقعہ اور مذکورہ حدیث کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ حرام مال کسی صورت میں حلال نہیں ہوسکتا، اس سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے، جس کے پاس حرام مال ہے وہ یہ سمجھ لے کہ وہ مال اس کا ہے ہی نہیں، اس صورت میں اس کو اس مال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں زیادہ تکلیف نہ ہوگی، اور اس اصول کو یاد رکھیں: ''جس نے کوئی چیز اللہ کے لئے چھوڑ دی اللہ اس کو اس کے عوض اور بہتر چیز

عنایت فرمائے گا'' وماذلک علی اللہ بعزیز۔

جواب:۷

اگر کسی کے پاس مال حرام ہے، اور وہ کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے، اس کے پاس کاروبار کے لئے مذکورہ رقم کے علاوہ کوئی اور رقم نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہو اس کو چاہئے کہ جلد از جلد اس کو غریبوں میں بانٹ کر بری ءالذمہ ہوجائے، اس کے پاس کیا ضمانت ہے کہ اس کو منافع ہی ہوں گے؟ اسی طرح اس کو موت کبھی بھی آسکتی ہے، اگر اس مال کو غریبوں میں بانٹنے سے قبل موت آگئی تو اللہ تعالی کے پاس محاسبہ ہوگا، وہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو یاد کرے، جس کے راوی ابو برزہ اسلمی ہیں، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''**لا تزول قدما عبد یوم القیامة حتی یسأل عن عمره فیما أفناه، وعن علمه فیم فعل، وعن ماله من أین اکتسبه وفیم أنفقه، وعن جسمه فیم أبلاه**'' (صحیح الترمذی:۲۴۱۷) (قیامت کے دن بندے کے قدم ہٹیں گے نہیں یہاں تک کہ اس سے اس کی عمر کے بارے میں سوال کیا جائے کہ کس طرح گذارا، اور اس کے علم کے بارے میں کہ اس نے کیا عمل کیا، اور اس کے مال کے بارے میں کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اور اس کے جسم کے بارے میں اس کو اس نے کیسے استعمال کیا؟)

اور اگر کسی نے مال حرام کو اپنے کاروبار میں استعمال کرلیا ہے تو پہلی فرصت میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور اپنی وصیت میں لکھ کر رکھ دے کہ اس قدر مال حرام میرے کاروبار میں ہے، کیونکہ نہیں معلوم کب موت اچانک اس کو آجائے، اگر اس کو نکال کر غریبوں میں تقسیم کرنے سے قبل موت آگئی تو ورثہ اس کو پہلے نکال کر تقسیم کردیں، اس کے بعد مال موروث کو تقسیم کریں، واللہ المستعان

جواب:۸

اگر کسی کا کاروبار کچھ حلال کا ہے اور کچھ حرام کا تو اس کے پاس ملازمت کا کیا حکم ہے جب کہ اس کو دونوں قسم کے کاروبار میں کام کرنا پڑتا ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اگر غالب کاروبار حلال کا ہے اور اس میں حرام کی کچھ آمیزش ہوجاتی ہے تو اس شخص کے پاس ملازمت کرنا جائز ہے، البتہ اس کو چاہئے کہ اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ غریبوں میں تقسیم کردے، اس طرح اس کی تلافی ہوجائے گی، لیکن اگر حلال اور حرام کا تناسب نصف نصف ہے یا حرام کا تناسب نصف سے زیادہ ہے تو ایسے شخص کے پاس اس قسم کی ملازمت بالکل جائز نہیں، الحمد للہ تلاش کرنے والے کو بہت ملازمتیں مل جائیں گی، یا کوئی چھوٹی موٹی تجارت ہی کرلے، اگر کم تنخواہ والی ملازمت بھی مل جاتی ہے تو ایسی ملازمت پر ترجیح دے جس میں حرام کا تناسب نصف یا نصف سے

زیادہ ہے، کیونکہ حرام کمائی کا برا اثر اس پر بھی پڑے گا اور اس کے بال بچوں پر بھی، بلکہ اس کے برے اثر سے کوئی چیز محفوظ نہیں رہے گی، اس کی ہر چیز میں بے برکتی نمایاں ہوگی۔

جواب:۹

اس سوال میں تین شقیں ہیں:

أ۔جس آدمی کی کمائی حرام کی ہو اس کے پاس ملازمت کرنے کا حکم؟ اگر اس ملازمت کا تعلق اس کی حرام کمائی سے ہو تو اس کے پاس ملازمت کرنا جائز نہیں ہے، جیسے وہ اگر گانجہ تمبا کو وغیرہ جیسی حرام چیزوں کی کاشت کرتا ہو تو ایسی ملازمت جائز نہیں ہے؛ یا گھر میں شراب وغیرہ بنانا اور اس کو پیش کرنا اس کی ذمہ داریوں میں ہو تو یہ بھی جائز نہیں ہے، لیکن اگر وہ اپنے باغ اور کھیت میں جائز چیزیں ہی اگاتا ہو تو اس کے پاس ملازمت میں کوئی حرج نہیں، اسی طرح گھر میں اس کی حیثیت خادم کی ہے؛ پاکی صفائی وغیرہ کی ذمہ داری اس کی ہے تو اس ملازمت میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "**وتعاونوا علی البر والتقوی ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان**" (المائدہ:۳) (اور نیکی اور تقوی پر ایک دوسرے کا تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کا ساتھ نہ دو)، لیکن بہتر یہی ہے کہ ایسے آدمی کے پاس کام جائز ہونے کے باوجود ملازمت نہ کرے جس کی آمدنی حرام کی ہو، کیونکہ اس کے ساتھ رہنے کے سبب اس کی بری عادتوں سے یہ خود بھی متاثر ہوسکتا ہے، صحبت بہر حال اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے۔

ب۔ایسے آدمی کی گاڑی میں سفر کرنا جس کی کمائی حرام کی ہے؟ اگر کرایہ دے کر سفر کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر بلا معاوضہ سفر کرتا ہے تو ایسی صورت میں بھی کوئی گناہ تو نہیں، لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ رہنا، ان کی صحبت اختیار کرنا کراہت سے تو خالی نہیں، خاص کر کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**لا تصاحب إلا مؤمنا، ولا يأكل طعامک إلا تقي**" (صحیح الترمذی: ۲۳۹۵ وحسنہ الألبانی) (تم صرف مومن کی صحبت اختیار کرو، اور تمہارا کھانا نہ کھائے مگر متقی)۔

ج۔اگر آپ کے مدرسہ یا اسکول میں ایسا آدمی اپنے بچے کو داخل کرانا چاہتا ہے جس کی آمدنی حرام کی ہے، اور آپ نے اپنے مدرسہ یا اسکول میں فیس رکھی ہے تو آپ بلا حرج اس سے فیس لے سکتے ہیں، کیونکہ اسکی آمدنی حرام کی ہے نہ کہ اس کے پاس موجود رقم، ہاں اس کا فرض بنتا ہے کہ جو حرام پیسہ اس کے پاس ہے اس سے چھٹکارا حاصل کرلے، لیکن اگر وہ اس پیسے سے کوئی چیز خریدنا چاہتا ہے یا کوئی خدمت حاصل کرتا ہے تو اس سے خرید وفروخت کرنا یا معاوضہ پر اس کا کوئی کام کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اس کو نصیحت کرنے کی ذمہ داری ضرور پوری کریں، واللہ اعلم بالصواب

جواب:۱۰

اس سوال میں تین شقیں ہیں: اَ۔رشوت کا حکم، ب۔اپنا حق حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا اگر اس کے سوا کوئی حل نہ ہو، ج۔اپنا حق حاصل کرنے لئے سود کی رقم رشوت کے طور پر دینا۔

اَ۔رشوت کا حکم واضح ہے کہ کبیرہ گناہ ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی'' (رواہ احمد (۶۷۹۱)، وابوداود (۳۵۸۰) وصححہ الالبانی فی ارواء الغلیل (۲۶۲۱)، اگر کوئی کام بغیر رشوت کے ہوسکتا ہو چاہے جائز سفارش کے ذریعہ ہی ہو تو رشوت دینا بالکل جائز نہ ہوگا۔

ب۔لیکن اگر آپ کا جائز کام رکا ہوا ہو اور بغیر رشوت کے اس کام کے پایۂ تکمیل کو پہنچنا بہت مشکل ہو تو دل میں کراہت کو محسوس کرتے ہوئے رشوت دینا جائز ہوگا، اسی میں مسجد و مدرسہ کا نقشہ یا اپنے کسی بھی کام کی منظوری حاصل کرنا ہے، اس کے لئے دلیل امام احمد رحمہ اللہ کی مسند میں روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص مجھ سے کچھ طلب کرتا ہے (بلا حاجت بہ اصرار مانگتا ہے) تو میں اس کو دے دیتا ہوں، تو وہ اس کو بغل میں دبا کر نکلتا ہے، یہ ان لوگوں کے لئے محض آگ ہے''، تو عمرؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ان کو کیوں دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: ''وہ مجھ سے بہ اصرار مانگتے ہیں، اور اللہ تعالی میرے لئے بخل کو پسند نہیں کرتا'' (مسند احمد: ۱۰۷۳۹، صححہ الالبانی فی صحیح الترغیب: ۸۴۴)، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کچھ صورتوں میں دینا جائز ہوتا ہے لیکن لینا جائز نہیں ہوتا۔

ج۔تیسری شق کا جواب یہ ہے کہ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جائز آمدنی کی رقم ہی اس میں دے، لیکن (مال حرام بود، جائے حرام رفت) کے نظریہ کے تحت بکراہت سود کی رقم بھی دی جاسکتی ہے، واللہ اعلم بالصواب

جواب:۱۱

ایک کافر سے بھی ہدیہ قبول کرنا جائز ہے تو جن کی آمدنی کا ذریعہ حرام کا ہے اگر وہ مسلمان ہیں تو بطریق اولی جائز ہے، ان سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ یہ مال انہوں نے حلال طریقہ سے کمایا ہے یا حرام طریقہ سے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ یہودیوں سے بھی ہدیہ قبول کرلیا کرتے تھے، جب کہ ان میں کی اکثریت سودی معاملات میں مبتلا تھی، ان کے ہاں رشوت کا بھی چلن تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے کبھی ان سے یہ نہیں پوچھا کہ جو ہدیہ وہ دے رہے ہیں وہ حلال مال کا ہے یا حرام مال کا، ہدیہ میں قیمتی چیز بھی ہوسکتی ہے اور معمولی اشیاء بھی، جیسے چائے اور ٹافی وغیرہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا اس شخص کے بارے میں جس کا پڑوسی علانیہ سود کھاتا ہے، مال خبیث سے ذرا بھی پرہیز نہیں کرتا، وہ اس کو کھانے پر

بلاتا ہے؟! تو فرمایا: ''اس کی دعوت قبول کرو؛ وہ مفت کا مزیدار کھانا تمہارا ہوا، اور گناہ اس پر ہوگا'' (جامع العلوم والحکم لابن رجب: ۲۰۱/۱)، قاعدہ یہ ہے کہ جس نے کوئی حرام مال کمایا ہو وہ صرف اس پر حرام ہے، دوسرے لوگ اگر جائز طریقہ سے اس کو حاصل کرتے ہیں تو ان کے لئے یہ مال حرام نہیں ہوتا، جیسے ہدیے کے طور پر ملا، یا ہم نے اس سے خرید وفروخت کی، ہاں اگر ایسی کوئی چیز ہدیے میں دے رہا ہے جو چوری کی ہے یا غصب شدہ ہے تو اس کو ہدیے میں قبول کرنا جائز نہیں۔

جواب: ۱۲

یہ بات ثابت ہے کہ حرام کھانے پینے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے آدمی کا ذکر کیا'' جو پراگندہ بالوں کے ساتھ غبار آلود ہو کر بڑا المبا سفر کرتا ہے، اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف پھیلا کر کہتا ہے: اے رب! جب کہ اس کا کھانا حرام کا ہے، اس کا پینا حرام کا ہے، اس کا لباس حرام کا ہے، اور اس کی غذا حرام کی ہے، تو اسکی دعا کیسے سنی جائے گی؟'' (صحیح مسلم: ۱۰۱۵)، لیکن اس حدیث میں دعا کی عدم قبولیت کا تعلق اس شخص کے ساتھ مذکور ہے جو حرام کا کھاتا ہے، کسی اور شخص کو اس کے حق میں یا اس کے بچوں کے حق میں دعا کرنے سے منع نہیں کیا گیا، خاص کر اگر کسی مناسبت سے وہ دعا کی درخواست کرتا ہے تو دعا کر سکتے ہیں، ہاں البتہ پہلے اس کے حق میں ہدایت کی دعا کریں، اس کے بعد جس دعا کا وہ خواہاں ہے وہ دعا بھی کر دیں، ھذا ما عندی، واللہ اعلم بالصواب۔

☆☆☆

فقہ اسلامی میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی خلیل احمد، گجرات☆

حرام مال موروث کا حکم:

حرام مال موروث کا حکم یہ ہے کہ اگر ارباب اموال معلوم ہیں تو ان کو لوٹا دے، ورنہ اس کو صدقہ کردے؛ لہٰذا سوال میں مذکور شخص کے لئے کاروبار، کمائی، گھر اور جائداد سے انتفاع اس وقت حلال ہوگا جب وہ مال حرام کا بدل اور ضمان ارباب اموال کو یا ان کے وارثین کو ادا کردے، اور اگر اصل مالک یا ان کے ورثاء معلوم نہ ہوں تو حرام مال موروث کے بقدر صدقہ کردے، جیسا کہ امام ابو یوسف کا مذہب ہے:

"مات و كسبه حرام فالميراث حلال وقال: لانأخذبهذه الرواية، وهو حرام مطلقا على الورثة أى سواء علموا أربابه أو لا، فإن علموا أر بابه ردوه عليهم وإلا تصدقوا به" (شامی دارالکتاب ۹/۴۷۱)۔

"الغلة والربح الذى حصل للغاصب أو كاسب الحرام قبل أداء بدله إلى المالک أو قبل التصدق لا يطيب له الانتفاع به حتى يؤدى بدله .....فإن أدى البدل انقلب الربح جائزا عند أبى يوسف" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۵۳)۔

حرام مال اور حرام جائیداد سے انتفاع:

مذکورہ شخص پر تصدق واجب ہے، پھر اس کے پاس کوئی حلال مال موجود نہیں ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت پوری کر سکے، تو چونکہ یہ شخص شرعاً حرام مال کا مالک نہ ہونے کی وجہ سے فقیر ہے؛ اس لیے حرام مال میں سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت کے بقدر استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اور بعد میں اس کا تصدق بھی واجب نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے بہتر ہے؛ اور جب یہ نصاب کے بقدر مال کا مالک ہوجائے اور وہ نصاب اس کی اور اس کے اہل وعیال

☆ مدرسہ جامعۃ العلوم دسادا (گجرات)

کی ضرورت کے لیے کافی نہیں ہے تو اس کے لیے بقدر ضرورت حرام مال میں سے قرض لینے کی گنجائش ہے، اس شرط کے ساتھ کہ جب اس کے پاس گنجائش ہو جائے گی تو وہ اصل مالک کی طرف سے اتنے مال کا صدقہ کر دے گا، اور اس صورت میں تصدق واجب ہوگا۔

"وكثيرا ما يقع في زماننا أن ماكسبه المرأ مدى سنين طويلة كله حرام عن طريق الربا أو الرشوة وغيرها من التعاملات المحظورة، ولا سبيل إلى ردتلك الأموال إلى صاحبها، فوجب عليه التصدق بها .ولكن ليس عند ه مال سواه ليسد به حاجته وحاجة عياله .فيحتمل أن يعتبر ذلك المرأ فقيرا من حيث أنه لا يملك من المال الحلال شيئا، وما في يده ليس مملوكا له شرعا ...فيجوز له أن يصرف ذلك المال في حاجة نفسه إلى أن يملك نصاب الزكاة من مال حلال ..فإذا ملك النصاب وصار غنيا شرعا، ولا يكفي النصاب لحاجته وحاجة عياله، فحينئذ يجوز له الاقتراض مما عند ه من المال المكتسب بطريق الحرام بشر ط أن يلتزم أداء مثله" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۴۸)۔

شوہر یا بیٹے کی حرام کمائی سے نفقہ لینا:

اگر کمائی کا کوئی جائز طریقہ ممکن نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس حرام کمائی میں سے بقدر ضرورت استعمال کرنے کی گنجائش ہے، اور حرام کا گناہ بیٹا یا شوہر پر ہوگا۔

"اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها والإثم على الزوج" (شامی بہ حوالہ فقہی مقالات ۱/ ۲۶۴)۔

حرام کمائی سے تعلیم پانے کے بعد اس کی کمائی کا حکم:

بچہ کی کمائی حلال ہوگی؛ کیونکہ مال حرام بالکلیہ ہلاک ہو چکا ہے، لہٰذا اس کا خبث اس کی کمائی میں سرایت نہیں کرے گا، البتہ اس کے ولی (جس نے حرام مال خرچ کیا ہے) پر ضمان یا تصدق کے ذریعے اس کی تلافی ضروری ہوگی۔

حرام کمائی میں ملوث افراد کے یہاں دعوت:

اگر داعی کے بارے میں یقین یا ظن غالب ہے کہ وہ حرام کاروبار میں ملوث ہے، لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے یا آدھا حصہ حلال ہے اور آدھا حرام؛ تو اس کی دعوت قبول نہ کرے، جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اس نے حلال

مال سے دعوت کی ہے۔

"آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل ما لم يخبر ه أن ذلك المال حلال ورثه أو استقرضه" (ہندیہ زکریا ۵/ ۳۹۷)۔

حرام لقمہ کھانے کے بعد اس کی تلافی:

وہ استغفار کرلے، اور کچھ صدقہ کرلے، ان شاء اللہ اس کی تلافی ہوجائے گی۔

"ما ورد في كلام بعض الفقهاء الحنفية أن الحرمة لا تتعدى إلى ذمتين، فهو محمول على ما إذا لم يعلم بذلك" (فقہ البیوع ج ۲ ص ۱۰۰۸)۔

پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر یا حیلہ:

حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی کوئی تدبیر اور حیلہ نہیں ہے، بلکہ اس کا حکم یہ ہے کہ مالک کو یا اس کے ورثاء کو لوٹا دیا جائے، یا ان سے معاف کرایا جائے، اگر مالک معلوم نہ ہو تو صدقہ کردیا جائے (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم ۱۷/ ۳۷۳، احکام المال الحرام)۔

مال حرام سے قرض لینا:

اگر اس کے لیے کوئی ایسی جائز تجارت نہیں ہے جس سے وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورت پوری کرسکے تو اس کے لیے قرض لینے کی گنجائش ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ بعد میں اس اصل قرض کو صدقہ کردے گا۔

"ماوجب التصدق به لكاسب الحرام، واحتاج إليه لنفقته ونفقة عياله، يجوز صرفه إلى نفسه، فإن كان فقيرا، لا يجب عليه التصدق بمثله، وإن كان غنيا، ولم يكن المال الحلال كافيا لسد حاجته، يسوغ للمفتي بعد النظر في أحواله أن يفتيه بجواز الاقتراض مما عنده من المال الحرام بشرط أن يلزم نفسه تسديد هذا القرض إلى الفقراء من المال الحلال كلما تيسر له ذلك، فيجب عليه أن يتصدق بمثله" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۵۵)۔

حلال وحرام دونوں طرح کے کام میں ملازمت کرنا:

ایسی ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس میں حرام عمل میں معاونت پائی جاتی ہے، لیکن اگر کسی نے ایسی

ملازمت اختیار کر لی تو اگر حلال حصہ کی اجرت الگ سے متعین ہے تو صرف حلال حصہ میں ملازمت صحیح ہوگی، اور اگر اس کی اجرت الگ سے متعین نہیں ہے تو ملازمت جائز نہ ہوگی، بلکہ فاسد ہوگی اور وہ اجرت مثل کا مستحق ہوگا اور اس وقت اس کی تنخواہ مخلوط من الحلال والحرام ہوگی۔

"أما الوظائف المركبة من الخدمات المباحات والخدمات المحظورة، فلا يجوز قبولها لاشتمالها على عمل محرم .ولكن إن قبل أحد مثل هذه الوظيفة فما حكم الراتب الذى أخذ عليها ـ والحاصل أن الإجارةفى الخدمة المباحةإنما تصح إذا كانت أجرتها معلومة بانفرادها .ولا تصح فيما إذا لم تكن أجرتها معلومة ..أما إذا لم تعرف أجرة الخدمة المباحةعلى حدتها فالإجارة فاسدة ولكن الأجير يستحق أجر المثل فى الإجارات الفاسدة ...وعلى هذا، فإن ما يقابل أجر المثل للخدمة المباحة فى راتبه ينبغى أن يكون حلالا .فصار راتبه مخلوطا من الحلال والحرام الخ" (فقہ البیوع ۲/ ۱۰۵۷)۔

حرام کمائی سے خرید کردہ جائدادوں میں کام کرنے کا حکم:

حرام کمائی سے خرید کردہ جائدادوں میں کام کرنا اس وقت جائز ہوگا، جب کہ خریدار حرام مال کا ضمان ادا کر دے اگر مالک معلوم ہے، ورنہ اسی قدر مال کا صدقہ کر دے؛ بہ صورت دیگر کام کرنا جائز نہ ہوگا اور اجیر کے لیے اجرت حلال نہ ہوگی (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم دیوبند جدید: ۱۷/ ۲۷۳، احسن الفتاوی ۷/ ۱۵۳، ۸/ ۴۰۱)۔

اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کا حکم:

اگر اس کی کمائی خالص حرام ہے تو اس کے گھر نوکری کرنا جائز نہیں ہے؛ اور اگر کمائی مخلوط ہے لیکن غالب حرام ہے تو بھی نوکری کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر حرام مال کم ہے تو جائز ہے (مستفاد: فتاویٰ عثمانی ۳/ ۵۹۳)

"ولا يجوز قبول هدية أمراء الجور؛ لأن الغالب فى مالهم الحرمة، إلا إذا علم أن أكثر ماله حلال، بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به الخ" (ہندیہ زکریا ۵/ ۳۹۶)

یا حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا:

اگر اس سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کی خصلت بد سے متأثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کی اصلاح کی نیت سے ہو تو جائز ہے، ورنہ اجتناب بہتر ہے؛ کیونکہ بری صحبت سے نفع کی امید نہیں، بلکہ نقصان کا اندیشہ ہے (مستفاد: کتاب الفتاوی ۶/ ۱۰۲)۔

حرام کمائی سے مدرسہ یا اسکول کی فیس ادا کرنا:

اگر اس کی کمائی زیادہ تر حرام ہے تو فیس وصول کرنا جائز نہیں ہے؛ الا یہ کہ وہ حلال کی تصریح کرے، اور اگر مخلوط کمائی ہو تو فیس وصول کرنے کی گنجائش ہے (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم دیوبند جدید: ۱۶/ ۱۰۲)۔

"آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولا يأكل ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه" (ہندیہ زکریا: ۵/ ۵۹۷)۔

مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے لئے رشوت میں سودی رقم دینا:

سود کی رقم کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں میں بہ طور رشوت دینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ اس کا اصل حکم یہ ہے کہ جس سے سود لیا ہے اسے واپس کردے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب فقراء کو صدقہ کردے (مستفاد: فتاویٰ دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۰۳/ ۴۰۱۱)۔

"وأما إذا كان عند رجل مال خبيث فأما إذا ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرد إلى مالكه ويريدأن يدفع مظلته فليس له حيلة إلا أن يدفع إلى الفقراء" (بذل المجہود: ج ۱ ص: ۴۱۱ بہ حوالہ فتاوی دار العلوم زکریا: ۵/ ۴۱۱)۔

سودی کاروبار میں ملوث سے ہدیہ وصول کرنا:

جس شخص کے بارے میں یقین یا ظن غالب ہو کہ اس کی کمائی زیادہ تر حرام ہے تو اس سے ہدیہ لینا یا کوئی چیز کھانا پینا جائز نہیں ہے؛ لیکن جس شخص کی کمائی کے بارے میں محض شک اور گمان ہو تو بغیر پوچھے ہدیہ لینے اور کھانے پینے کی گنجائش ہے؛ البتہ احتراز بہتر ہے۔

"لا يجوز للمسلم أن يعامل حائز المال الحرام أو أن يأكل طعامه أوأن يقبل هديته، إذا تيقن أن ثمن الطعام أو ثمن الهدية هو عين المال الحرام، فإن اشتبه عليه الأمر كره له أن يعامله أوأن يأكل طعامه أوأن يقبل هديته واستحب له أن يتورع عن ذلك كله" (أحکام المال الحرام: ص ۱۰)

حرام کمائی کرنے والے کے لئے دعا کرنا:

اگر چہ اس کے لیے دوسرے سے دعا کرانا فی نفسہ درست ہے؛ مگر جہاں تک بات قبولیت کی ہے، تو اس سلسلے میں

عرض یہ ہے کہ جس حدیث میں حرام خور کی دعا کے عدمِ قبولیت کو بیان کیا ہے، اس میں اس شخص کی پر کیف، پر اثر اور دعا کی قبولیت کی مؤثر حالت کو بیان کیا ہے کہ وہ لمبا سفر کر کے مقامات مقدسہ پہنچا، پراگندہ بال اور غبار آلود حالت میں اللہ سے دعا کرتا ہے مگر حرام مال کی نحوست اور اس سے اجتناب نہ کرنے کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اس کی دعا قبول نہیں ہوتی اور یہ اثر اور نحوست اس وقت بھی موجود ہے جب کوئی اس کے لیے دعا کرے تو اس کے حق میں کیسے دعا قبول ہوگی؛ نیز جس حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے اس کا آخری جملہ ہے "**فأنى يستجاب لذلك**" اس میں "لام" استعمال کیا ہے اور وہ استحقاق کے لیے بھی آتا ہے یعنی کیسے اس کے حق میں دعا قبول ہوسکتی ہے؟ وہ کیسے قبولیت کا حق دار ہے؟ خواہ وہ دعا کرے یا کوئی دوسرا دعا کرے؛ اس سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دوسرے کی دعا بھی اس کے لیے مؤثر نہ ہوگی۔ واللہ أعلم بالصواب۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق چند مسائل

مولانا محمد صادق مبارک پوری ☆

جس طرح قرآن وحدیث میں کسبِ حلال کی ترغیب دی گئی ہے، اسی طرح حرام مال کی مذمت، سزا، اور اس پر وعید بیان کی گئی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"**لایدخل الجنة جسد غذی بحرام**" (رواہ ابویعلیٰ)

وہ جسم جنت میں داخل نہیں ہوگا، جس کی حرام غذا سے پرورش ہوئی ہو)۔

حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"**یا کعب بن عجرة! أنه لایدخل الجنة لحم ودم نبتا علی سحت ،النار أولیٰ به**" (رواہ ابن حبان)۔

اے کعب بن عجرہ! جنت میں وہ گوشت اور خون نہیں داخل ہوں گے، جن کی پرورش حرام کے ذریعہ ہوئی ہے، جہنم اس کے زیادہ مستحق ہے)۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا:

"**من اشتریٰ ثوبا بعشرة دراهم وفیه درهم من حرام لم یقبل اللّٰه عزوجل له صلاة مادام علیه، قال: أدخل إصبعیه فی أذنیه ثم قال صمتا إن لم یکن النبي ﷺ سمعته یقول**" (رواہ احمد فی المسند ۲/۲۵۷)۔

جس نے دس درہم کے ذریعہ کوئی کپڑا خریدا، اور اس میں ایک درہم بھی حرام تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کی نماز نہیں قبول فرمائیں گے، جب تک وہ کپڑا اس کے بدن پر ہے، انھوں نے اپنی دونوں انگلیاں اپنے دونوں کان میں ٹھوس لیں، پھر فرمایا کہ یہ دونوں کان بہرے ہوجائیں، اگر میں نے نبی ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے نہ سنا ہو)۔

حرمت واباحت کے لحاظ سے مال کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

(۱) مال حرام (۲) مال مباح

مال حرام: جس سے استفادہ کرنا شرعاً جائز نہ ہو۔

☆ صدر المدرسین ومفتی جامعہ نور الاسلام ولید پور ضلع مئو

مال مباح: جس سے استفادہ کرنا شرعاً مباح ہو (لسان العرب ابن منظور افریقی ۱۲/ ۱۲۰، ۱۲۱)۔

مال حرام کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں:

(الف) حرام لذاتہ: وہ مال کہلاتا ہے، جو اپنی ذات اور وصف دونوں کے اعتبار سے حرام ہو، یعنی جس کی ذات میں بھی حرمت ہو، اور وصف کے اعتبار سے حرمت ہو جیسے مردار، خون وغیرہ۔

علامہ قرافی رقم طراز ہیں:

"وهو ما كان حراما في أصله ووصفه" (الفروق ۲/ ۹۶)۔

(جو شئ اپنی اصل اور وصف دونوں میں حرام ہو)۔

(ب) حرام لغیرہ: وہ مال کہلاتا ہے، جو اپنی ذات کے اعتبار سے حلال ہو، لیکن خارجی وصف کی وجہ سے اس میں حرمت پیدا ہوئی ہو، جیسے یتیم کا مال ناحق کھانا، دوسرے کا مال بغیر اجازت لینا، چوری کا مال۔

مال حرام سے خریدی گئی چیزوں کا حکم

اگر کسی کے پاس مال حرام ہو، اور اس سے کوئی چیز خریدے، اس کی پانچ صورتیں ہیں:

(۱) بائع کو حرام رقم دیدی جائے، پھر اسی کے ذریعہ خریداری کی جائے۔

(۲) حرام رقم کی طرف اشارہ کر دیا جائے، اور اس کے ذریعہ خریدی جائے، پھر وہی رقم بائع کو دی جائے۔

(۳) حرام رقم کی طرف اشارہ کر دیا جائے، اس کے ذریعہ خریداری کا عقد کیا جائے، پھر بعد میں ثمن دوسری رقم سے ادا کی جائے۔

(۴) مطلقاً خریداری کی جائے، یعنی عقد کے وقت رقم کا تذکرہ نہ ہو، پھر حرام رقم سے ثمن ادا کیا جائے۔

(۵) بائع کو جائز رقم دکھلا دی جائے، اور اسی کے خریداری کی جائے، لیکن ثمن کی ادائیگی حرام رقم سے کی جائے (ردالمحتار ۵/ ۲۳۵)۔

مال حرام کے منافع کا حکم:

حرام مال سے نفع کمائے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہوگا؟ اس بارے میں فقہائے کرام کی آراء مختلف ہیں:

امام شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ کی ایک ایک روایت یہ ہے کہ چوں کہ یہ مال ایسے مال کا نفع ہے، جو حلال نہیں تھا، اس لیے اس کا نفع غاصب کے لیے حلال نہیں ہے، بلکہ اس نفع کا مستحق مال کا اصل مالک ہے۔

علامہ مرداوی تحریر فرماتے ہیں:

"و إن اتجر بالدراهم فالربح لمالكها يعنى إذا اتجر بعين المال وبثمن العيان المغصوبة فالمال وربحه لمالكها هذاهو الصحيح من المذهب ونص عليه ونقله الجماعة وعليه الأصحاب"

(الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف ۶/ ۲۰۸)۔

(اگر ان درہموں کے ذریعہ تجارت کی تو نفع مالک کا ہوگا، یعنی عین مال مغصوبہ یا مال مغصوبہ کے عین ثمن سے تجارت کرے، اور یہی ہمارا صحیح مذہب ہے، اور اسی کو علماء کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے، اور اسی پر (ہمارے) اصحاب ہیں)۔

علامہ بہوتی فرماتے ہیں:

"إن نصوص أحمد متفقة على الربح للمال" (کشاف القناع ۴/ ۱۱۲) ۔

(امام احمد بن حنبل کی متفق تصریحات ہیں کہ ایسے مال کا نفع مالک کو ملے گا)۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

"ولايطيب له ما شراه بالعين أوبثمنها ولا يصير ملكا له ولم يأذن الشرع بذلك ولاسوغه وهكذا لا يطيب له الربح بل يجب عليه إرجاعه لمالكها هكذا ينبغى أن يقال فى مثل هذا البحث عملا لما تقتضيه القواعد الشرعية" (السیل الجرار ۲/ ۱۱۳)

حضرات مالکیہ، حضرات شوافع اور احناف میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس نفع کا مالک غاصب ہوگا۔

علامہ ابن رشد فرماتے ہیں:

"إن مااغتل من المغصوب بتصريفه وتحويل عينه كالدنانير يغتصبها الغاصب فيتجر فيها فيربح فالغلة له قولا واحدا فى المذهب" (بدایۃ المجتہد ۲/ ۲۴۱)۔

علامہ نووی شافعیؒ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"غاصب غصب کیے ہوئے مال سے کوئی چیز خریدے، اور اس سے نفع حاصل کرے، تو عقد اس سے خالی نہیں ہے کہ خریدنا عین مال سے ہوگا یا غیر عین سے، عین مال سے ہو تو خریدنا باطل ہوگا، اس لیے کہ مغصوب مال کی بیع باطل ہے، یہ خریدنا باطل ہے تو نفع بھی باطل ہے، اور غاصب کے ذمہ مال کی ذمہ داری آجائے تو ثمن مال مغصوب سے ادا کی جائے تو ثمن کے ذمہ میں ثابت ہونے کی وجہ سے خریدنا صحیح ہے، اور اس کے مستحق کے بارے میں دو قول ہیں: دوسرا جدید قول یہ ہے کہ اس کا نفع غاصب کو ملے گا، نہ کہ مغصوب منہ کو" (روضۃ الطالبین ۴/ ۲۱۱)۔

اس مسلک کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے:

''**الخراج بالضمان**'' (سنن الترمذی باب ماجاء فیمن یشتری العبد ویستغلہ... ۲/ ۵۸۲[۱۲۸۵]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی کسی کاروبار میں نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، نفع بھی اسی کو ملے گا۔

پس زیر بحث مسئلہ میں غاصب ہی اس کاروبار میں نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، نہ کہ مغصوب منہ، اس لیے نفع کا حق دار غاصب ہی ہونا چاہئے۔

علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

''اس مال کے منافع کو غاصب اور مغصوب کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا جائے گا، کیوں کہ یہ نفع اصل مالک کے مال اور غاصب کی محنت سے حاصل ہوا ہے، تو دونوں کو ان کی سرمایہ کاری کے بقدر حصہ ملے گا، چوں کی غاصب کا عمل اس کے لیے استعمال ہوا ہے، اس لیے وہ آدھے کا حق دار ہوگا، اور اس نفع کے حصول میں مالک کا مال اور سرمایہ لگا، اس لیے وہ آدھے حصہ کا حق دار ہوگا' (أحکام المال الحرام، الدکتور عباس أحمد الباز ص:۳۷۹)۔

علمائے احناف کی رائے:

احناف اس بات کے قائل ہیں کہ اگر غاصب مال مغصوب کا ضمان ادا کردے تو مال مغصوب غاصب کی ملکیت میں تصور کیا جائے گا، اس کے لیے شئ مغصوب کو مالک کے حوالہ کرنا ضروری نہیں، مگر اس مال سے حاصل ہونے والے نفع سے استفادہ کے سلسلہ میں فقہائے احناف کے اقوال مختلف ہیں:

حضرت امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ ضمان کی ادائیگی کے بعد غاصب کے لیے اس نفع سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے، اور وہ حاصل شدہ منافع کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام محمد رحمہا اللہ تعالیٰ کی رائے ہے کہ حاصل شدہ منافع سے استفادہ کرنا غاصب کے لیے جائز نہیں۔

صاحب ہدایہ علامہ مرغینانیؒ رقم طراز ہیں:

''**ومن غصب عبدا فاستغله فنقصته الغلة فعليه النقصان لما بينا .....ويتصدق بالغلة قال رضي الله عنه :وهذا عندهما أيضا وعنده لا يتصدق بالغلة لأبي يوسف أنه حصل في ضمانه وملكه أما الضمان فظاهر وكذاالملك لأن المضمونات تملك بأداء الضمان مستندا عندنا ولهما أنه حصل بسبب خبيث وهو التصدق في ملك الغير وما هذا حاله فسبيله التصدق** ....'' (ہدایہ ۴/ ۲۹۸)۔

(کسی نے کسی سے غلام چھین لیا، پھر اسے نفع بخش کام میں استعمال کیا اور اس کی وجہ سے اس کی قیمت میں کمی آ گئی، تو اس نقصان کا ذمہ دار غاصب ہوگا، اور جو نفع حاصل ہوا ہے، وہ غاصب صدقہ کرے گا، اور یہ حضرات طرفین کا قول ہے، اور امام ابو یوسف کی رائے ہے کہ نفع کو صدقہ کرنا ضروری نہیں۔

امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ ضمان اور ملکیت دونوں اس صورت میں غاصب کی ہیں، اس لیے اس سے حاصل ہونے والا نفع بھی غاصب کا ہونا چاہئے، ضمان تو اس لیے کہ اگر مال مغصوب ہلاک ہوجاتا تو اس کی ذمہ داری بہر صورت غاصب پر آتی، اور ملکیت تو اس لیے کہ احناف کے یہاں متفقہ قاعدہ ہے کہ مضمونات میں ضمان کی ادائیگی کی صورت میں ملکیت سابقہ وقت کی طرف منسوب ہوتی ہے، جس کو استناد کہا جاتا ہے، اور حضرات طرفین کی دلیل یہ ہے کہ ملکیت اگرچہ ہوجاتی ہے مگر اس کا سبب خبیث ہے، اور وہ دوسرے کے مال میں تصرف کرنا ہے، اور جس کا یہ حال ہو، اس کو صدقہ کرنے کا حکم ہے)۔

احناف کے متاخرین اہل فتویٰ حضرات سے مختلف اقوال کتب فتاویٰ میں نظر آتے ہیں:

فتاویٰ فریدیہ میں مال حرام سے کمائے گئے منافع کو علی الاطلاق کمانے والے کے لیے جائز کہا گیا ہے (۷/۲۵۵)۔

منتخب نظام الفتاویٰ میں مال حرام سے کمائے گئے مال کو جائز کہا گیا ہے (۱/۲۲۲)۔

عصر حاضر میں کسی غنی کے لیے ان اَموال سے قرض حاصل کرنے کی گنجائش کے تعلق سے شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں:

''چوں کہ اس طرح کے مسائل آج کل حکمرانوں کے سامنے پیش نہیں کیے جاتے، اس لیے اس طرح کے مسائل میں اگر کسی راسخ فی العلم متقی مفتی کسی شخص کو اس طرح کے اَموال کو بطور قرض استعمال کرنے کی اجازت دے تو اس کی بھی گنجائش ہونی چاہئے'' (فقہ البیوع ۲/۱۰۵۲)۔

کچھ اصحاب افتاء نے مال حرام سے کمائے گئے نفع کو جائز قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کو قابل تصدق بتایا ہے، ہاں اگر یہ آدمی مستحق ہے تو اس کو استعمال کرسکتا ہے (احسن الفتاویٰ ۸/۱۰۲)۔

بعض اہل افتاء کا خیال ہے کہ کسب حرام کے ذرائع دو طرح کے ہیں:

ایک تو وہ ذرائع ہیں، جن کی بنیاد ہی حرام ہے، مثلاً کسب مغنیہ، سود کی کمائی وغیرہ۔

اس کمائی کے حرام ہونے کے ساتھ اس کمائی کے منافع بھی حرام ہیں، مثلاً کسی نے سودی رقم سے جائیداد بنائی، عمارتیں تعمیر کیں، یا کوئی کاروبار کیا ہو، سب کی سب حرام ہے، اس کے منافع میں خباثت بدستور قائم ہے۔

دوسرے وہ ذرائع ہیں، جو اصلاً حرام نہیں ہیں، بلکہ سبب حرام اور سبب مجاورت کی وجہ سے اس میں حرمت آئی،

جیسے مال مغصوب۔

اس صورت میں غاصب ضمان ادا کردے تو ان اموال کی ملکیت اور منافع غاصب کے حق میں ثابت ہوجائیں گے۔

سوالات کے جوابات:

(۱) اس کی کمائی حلال ہوگی، آباء واجداد کی حرام کمائی کے بقدر صدقہ کردے، سود آزادی سے پہلے کا ہے یا بعد کا، اس میں شک ہے اور شک کی وجہ سے کمائی حرام نہ ہوگی۔

امام نوویؒ "المجموع شرح مہذب" میں تحریر فرماتے ہیں:

"من ورث ما لا ولم يعلم من أين اكتسبه مورثه أمن حلال أو من حرام ولم تكن علامة فهو حلال بإجماع العلماء فإن علم أن فيه حراما وشک في قدره أخرج الحرام بالاجتهاد"(۹/۴۲۸)۔

(۲) غریب شخص کو حرام جائیداد کے کرایہ سے انتفاع کی گنجائش ہے۔

(۳) اس غریب خاتون کو جب کہ کوئی دوسری کمائی نہیں ہے، شوہر کی اس کمائی سے انتفاع کی گنجائش ہے۔

(۴) جس شخص کی کمائی کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ کمائی کا کتنا حصہ حلال ہے اور کتنا حصہ حرام ہے؟ اس کی دعوت کھانے کی گنجائش ہے۔

(۵) دعوت کھانے کے بعد حرام کاروبار کا علم ہوا تو توبہ واستغفار کرے۔

(۶) پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر اور حیلہ راقم الحروف کے علم میں نہیں ہے۔

(۷) ایسے شخص کو بطور قرض حرام مال کو استعمال کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم العالیہ کی تحریر سے معلوم ہوتی ہے۔

(۸) جس شخص کا کاروبار آدھا حرام ہے اور آدھا حلال ہے، اس میں کام کرنا جائز نہیں ہے۔

(۹) حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنے کی گنجائش ہے، حرام کمائی والے کے ساتھ اس کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنے کی گنجائش ہے، نیز حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو اس سے فیس وصول کرنے کی گنجائش ہے، اس کی بنیاد امام ابوالحسن کرخیؒ کا قول ہے۔

(۱۰) نقشہ کی منظوری کے لیے سود کی رقم کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس سے اپنی منفعت مقصود ہے، اور اپنی منفعت میں سودی رقم استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

(۱۱) جب حرام کا قطعی علم نہیں ہے، صرف امکان ہے، ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، جس کی کمائی کا علم نہیں، اس سے ٹافی لینا، چائے پینا، یا مالی مدد لینا جائز ہے، بشرطے کہ وہ حرام کی صراحت کے ساتھ متعین کر کے نہ دے، اس کی بنیاد مالی معاملات میں امام کرخیؒ کے قول پر عمل کرنا ہے۔

(۱۲) جس شخص کا مال یا کمائی حرام ہے، اس کے لیے دعا کرنا یا پانی پر دم کرنا جائز نہیں ہے۔

☆☆☆

حرام آمدنی واُس کے متعلقات کا حکم

مفتی سید محمد علی مدنی ☆

الحمد لله وحده والصلوة والسلام على من لا نبى بعده ،أمابعد!

جواب:(۱)

وراثت میں حاصل شدہ مال اوراس سے حاصل شدہ نفع دونوں حلال ہیں، کیونکہ فقط شک کی بنیاد پر حرمت کا حکم متفرع نہیں ہوتا؛"**اليقين لايزول بالشک**"، البتہ اگر یقیناً یہ معلوم ہوجائے کہ مرحوم آزادی کے بعد بھی سودی کاروبار کیا کرتے تھے تو پھر وراثت میں ملا ہوا مال اگر ممکن ہوتو اس کے مالک کو لوٹا دیں اور ومتعذر رہونے کی صورت میں تصدق علی الفقراء کریں،جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

"**(قوله الحرام ينتقل) أى تنتقل حرمته و إن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاک، قوله: ولا للمشترى منه فيكون بشرائه منه مسيئا لأنه ملكه بكسب خبيث وفى شرائه تقرير للخبث ويؤمر بما كان يؤمر به البائع من رده على الحربى**" (ردالمحتار،مطلب البیع الفاسد لایطیب لہ ویطیب للمشتری منہ، ۱۴۵/۴)۔

جواب(۲)

حرام مال سے حاصل شدہ نفع کراہت کے ساتھ حلال ہوتا ہے،لہٰذا اس جائیداد کے کرایہ پر بھی حلت کا حکم نافذ ہوگا،جیسا کہ شامی میں ہے:

"**قال ابن عابدين: قوله (اكتسب حراما) توضيح المسألة ما فى التاتارخانية حيث قال: رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلک الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو**

☆ خادم جامعہ قمر المعارف اشوک نگر رتلام (ایم پی)

اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم أخر ودفع تلك الدراهم .قال أبو نصر: يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا فى الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبو الليث، لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص فى الجامع الصغير: إذا غصب ألفا فاشترى بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح. وقال الكرخى: فى الوجه الأول والثانى لا يطيب، وفى الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب فى الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخى دفعا للحرج عن الناس" (ردالمحتار)۔

جواب(۳)

اس عورت کو چاہیے کہ اپنے نفقہ کا خود انتظام کرے، اگر کوئی سبیل نہ نکل سکے تو بقدر ضرورت شوہر کی حرام کمائی سے نفقہ کا وصول کرنا درست ہے، نیز اس بچہ کی تنخواہ وغیرہ پر بھی حلال کا حکم لگے گا، کیونکہ وہ اسکی محنت کی اجرت ہے، جبکہ اس کی تعلیم پر صرف شدہ حرام مال کا گناہ اس کے سرپرست کو ہوگا، اسی طرح شق اول میں حرام مال سے نفقہ دینے کا گناہ شوہر کو ہوگا، جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

"**وفى جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاماً أو كسوةً من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج**" (الدرالمختار وحاشیہ ابن عابدین ۶/۱۹۱)۔

جواب(۴)

جب اس بات کا یقین ہے کہ اہل قریہ کی اکثر کمائی حرام ہے تو، "**للأكثر حكم الكل**" کے تحت حرمت کا ہی حکم لگے گا، لہٰذا "**اتقوا عن مواضع الشبهات**" کے تحت دعوت قبول نہیں کی جائے گی، البتہ اگر کسی کے متعلق یقیناً یہ معلوم ہوجائے کہ اسکی اکثر کمائی حلال کی ہے تو پھر دعوت قبول کر سکتے ہیں۔

"**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغى أن لايقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا فى الينابيع ... .لا يجيب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راض بفسقه، وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام ما لم يخبر أنه حلال وبالعكس يجيب ما لم يتبين عنده أنه حرام، كذا فى التمرتاشى .. .آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل، ولا يأكل ما لم يخبره أن ذلك المال أصله حلال ورثه أو استقرضه، وإن كان غالب ماله حلالا لابأس بقبول هديته**

والأكل منها، كذا في الملتقط" (ھندیہ۔کتاب الکراہیۃ،الباب الثانی عشر فی الھدایا والضیافات،۵/ ۳۴۲-۳۴۳،ط: دارالفکر)۔

جواب(۵)

اگر کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ داعی نے مال خبیث سے دعوت کی تھی تو استعمال شدہ کھانے کی بقدر رقم داعی کو دیدیں اور اگر اس کو دینا ناگزیر ہو تو صدقہ کریں، جیسا کہ علامہ شامی نے لکھا ہے:

"**ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه اھ**" (الدرالمختار وحاشیۃ ابن عابدین ۶/ ۳۸۵)۔

جواب(۶)

اگر وہ مال چوری ڈکیتی یا سود ورشوت یا کسی کا حق مار کر حاصل ہوا تو پھر اسکے مالک کو واپس کریں یا متعذر ہونے کی صورت میں صدقہ کرنا ہوگا، البتہ اگر اس کو کمایا تو حرام طریقہ سے، لیکن اسکے ساتھ حقوق العباد وابستہ نہیں ہیں تو اسکو کسی مستحق کو دے کر مالک بنادیں، پھر اگر وہ مستحق اپنی خوشی سے بعض یا کل واپس کردے تو وہ حلال کہلائے گا، حدیث میں ہے:

"**عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: كَانَ فِي بَرِيرَةَ ثَلَاثُ سُنَنٍ عَتَقَتْ فَخُيِّرَتْ، وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "الْوَلَاءُ لِمَنْ أَعْتَقَ"، وَدَخَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبُرْمَةٌ عَلَى النَّارِ فَقُرِّبَ إِلَيْهِ خُبْزٌ وَأُدْمٌ مِنْ أُدْمِ الْبَيْتِ، فَقَالَ: "لَمْ أَرَ الْبُرْمَةَ؟ "فَقِيلَ: لَحْمٌ تُصُدِّقَ بِهِ عَلَى بَرِيرَةَ وَأَنْتَ لَا تَأْكُلُ الصَّدَقَةَ، قَالَ: "هُوَ عَلَيْهَا صَدَقَةٌ وَلَنَا هَدِيَّةٌ**" (صحیح البخاری، کتاب النکاح ۵۰۹۷)۔

جواب(۷)

بہتر ہے کہ کسی سے قرض لے کر تجارت شروع کرے، تاہم صورت مکتوبہ بھی اگر اختیار کرتا ہے تو بھی جائز ہے، کیونکہ نیت حرام سے بچنے کی ہے اور موجود حرام مال کو صدقہ کرنے کا ارادہ بھی ہے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے:

"**غصب حانوتا واتجر فيه وربح يطيب الربح كذا في الوجيز للكردي**" (الفتاوی الہندیہ، کتاب الغصب، الباب الثامن، ۵/ ۱۴۲)۔

جواب(۸)

ملازم چونکہ حکم کا پابند ہوتا ہے، لیکن پھر بھی حرام کاروبار میں تعاون کرنے کا گناہ ہوگا، تاہم اسکی تنخواہ بہرصورت

کراہت تنزیہی کیساتھ حلال ہوگی، جیسا کہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**إذا استاجر رجلاً ليحمل له خمراً فله الأجر في قول أبي حنيفةؒ**" (الفتاویٰ الہندیۃ ۱/۴۴۹)۔

"**و إن استاجره ليكتب له غناء بالفارسية أوبالعربية، قيل: لا يحل الأجر، والمختار أنه يحل؛ لأن المعصية في القراءة**" (الفتاویٰ البزازیۃ، کتاب التجارات/نوع فی المتفرقات ۴/۴۵۰، زکریا)۔

"**وإذا استأجر الذمي مسلمًا ليحمل له ميتة أو دمًا يجوز عندهم**" (الفتاویٰ الہندیۃ/الباب السادس عشر مسائل الشیوع فی الإجارۃ ۴/۴۵۰)۔

جواب(۹)

حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری درست ہے، نیز اسکے بچہ کی فیس وغیرہ بھی لے سکتے ہیں، جب تک کہ وہ یہ صراحت نہ کردے کہ میں یہ تنخواہ یا فیس حرام آمدنی سے دے رہا ہوں، نیز ذاتی طور سے تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے مال سے کسی عوض کے بغیر استمتاع جائز نہیں۔

جواب(۱۰)

اگر سودی رقم سرکاری بینک کی ہے تو سرکاری غیر واجبی ٹیکسوں میں اسکو دے سکتے ہیں، ورنہ نہیں، دلیل مندرجہ ذیل ہے:

ويردونها على أربابها إن عرفوهم، وإلا تصدقوا بها؛ لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (شامی۔کتاب الحظر والاباحۃ ۶/۳۸۵، ط:ایچ ایم سعید)، "**قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا كالهداية وغيرها: أن من ملك بملك خبيث، ولم يمكنه الرد إلى المالك، فسبيله التصدقُ على الفقراء ...قال: و الظاهر أن المتصدق بمثله ينبغي أن ينوى به فراغ ذمته، ولايرجو به المثوبة**" (معارف السنن۔أبواب الطہارۃ، باب ماجاء: لاتقبل صلاۃ بغیر طہور، ۱/۳۴، ط:المکتبۃ الأشرفیۃ)۔

جواب(۱۱)

جب بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہے تو (للاکثر حکم الکل) کے تحت انکی طرف سے پیش کردہ ہدایا وغیرہ قبول کرنا درست نہیں، نیز (**لاطاعة لمخلوق في معصية الخالق**) کی روشنی میں انکی ناراضگی کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

"**وأما إن كانت الهجرة لأمر أنكر عليه من الدين كمعصية فعلها أو بدعة اعتقدها فليهجره حتى ينزع عن فعله وعقده فقد أذن النبي صلى الله عليه وسلم في هجران الثلاثة الذين خلفوا**

خمسين ليلة حتى صحت توبتهم عند الله فأعلمه فعاد إليهم" (عارضۃ الاحوذی لابن العربی المالکی ۸/ ۱۱۶، ابواب البر والصلۃ، ط: دار الکتب العلمیہ)۔

جواب (۱۲)

اگر آپ کی روگردانی سے اسکو نصیحت ملنے کی امید ہے تو پھر منع کر دینا چاہیے، ورنہ اس کے حق میں ہدایت وحلال کمائی کی دعاء کر دیں، نیز پانی وغیرہ پر بھی دم کر سکتے ہیں، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے:

"**إذا قال للذمي أطال الله بقائك إن كان نيته أن الله تعالى يطيل بقائه ليسلم أو يؤدى الجزية عن ذل وصغار فلا بأس به وإن لو ينو شيئا يكره كذا في المحيط**" (الفتاوی الھندیۃ: ۵/ ۳۴۸، ط: دار الفکر)۔

والله أعلم بالصواب وعلمه أتم.

☆☆☆

اسلامی فقہ میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی ارشاد عالم صاحب☆

جواب:۱

چونکہ آباء واجداد کا کمایا ہوا سود کا پیسہ یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ یہ آزادی سے پہلے کا ہے یا بعد کا، اس لئے وارث کے لئے یہ لینا حکما جائز ہے اور دیانۃ صدقہ کر دینا چاہئے۔

"وفی الشامیة عن البزازیة أخذ مورثه رشوة أو ظلما إن علم ذلک بعینه لایحل له أخذه و إلا فله أخذه حکما أما فی الدیانة فیتصدق به بنیة إرضاء الخصماء" (احسن الفتاوی:۸/۳۱۹)۔

اب یہ ان پیسوں سے جو حلال کمائی کر رہا ہے تو یہ اس کے لئے درست ہے، کیونکہ غیر شرعی طریقہ پر کمائے گئے روپئے سے اگر کوئی چیز خریدے تو یہ خریدی ہوئی شئ اور اس سے حاصل شدہ نفع کن صورتوں میں حلال ہے اور کن صورتوں میں حرام اس کے بارے میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

"رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة أوجه: أما إنه دفع تلک الدراهم إلی البائع أولا ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها و دفعها أوا شتری قبل الدفع بها و دفع غیرها أو اشتری قبل الدفع جمعا و دفع غیرها أو اشتری مطلقاً و دفع تلک الدراهم أو اشتری بدراهم آخر و دفع تلک الدراهم قال الکرخی فی الوجه الأول والثانی لایطیب و فی الثلاث الأخیر یطیب و قال أبو بکر لایطیب فی الکل لکن الفتوی علی قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس" (تاتارخانیہ۸/۳۴۶)۔

(کسی شخص نے مال حرام کمایا، پھر اس سے خرید کیا تو اس کی پانچ صورتیں ہیں: پہلی یہ ہے کہ یا تو پہلے بائع کو دراہم دیا، پھر اس کے بدلہ اس سے کچھ خرید کیا، دوسری یہ ہے کہ انہیں دراہم کے بدلہ پہلے خرید کیا پھر دراہم دیئے، تیسری یہ ہے کہ انہیں دراہم سے خرید کیا اور بعد میں اس کی بجائے دوسرا درہم دیدیا، چوتھی یہ ہے کہ مطلقا کسی خاص درہم کی تعیین کے بغیر خرید

☆ دارالحدیث پرمائی بھئی-آسام

کیا اور عوض میں یہی درہم ادا کر دیئے، پانچویں یہ ہے کہ دوسرے دراہم متعین کئے اور ان کی بجائے یہ درہم دیدیئے، امام کرخی نے کہا کہ پہلی اور دوسری صورت میں خرید کی ہوئی چیز اس کے لئے بہتر نہیں، باقی تینوں صورتوں میں جائز ہے، اور ابوبکر نے کہا کہ کسی صورت میں حلال نہیں، لیکن لوگوں سے حرج دور کرنے کے لئے امام کرخی کے قول پر فتوی ہے)۔

اگر اس مال سے زمین خریدی گئی ہے یا اس سے کوئی جائز تجارت جاری ہے تو اس زمین وتجارت کی آمدنی حلال ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ ابھی جو حلال کمائی کر رہا ہے یہ حلال ہے؛ کیونکہ باپ دادا کی طرف سے اس کو جو وراثت میں ملا ہے وہ بھی اس کے لئے حکما جائز تھا، اب اس پیسے سے اپنا حلال کمائی کر رہا ہے تو وہ کمائی مطلق حلال ہونا چاہئے۔

جواب: ۲

مذکورہ کرایہ وغیرہ اس کے لئے حلال ہوگا، فتاوی محمودیہ اور دیگر فتاوی کی کتابوں میں یہ مسئلہ مذکور ہے اور تفصیل کے ساتھ اس کا جواب ماقبل میں گزرا ہے؛ چونکہ یہ خود یہاں غریب ہے، اس لئے اس سے لینے کی گنجائش ہے، البتہ اس سے توبہ کرے اور مستقبل میں اس قدر مال صدقہ کرنے کی نیت رکھے۔

جواب: ۳

شوہر یا بیٹا اگر عین حرام (رشوت، غصب) کا مال لاکر دے تو اس سے مکمل پرہیز کرے اور اگر مال عین حرام نہ ہو تو استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور گناہ کمانے والے پر ہوگا، چنانچہ فتاوی محمودیہ میں ذخیرہ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

"**وفی الذخیرة سئل أبو جعفر عمن اکتسب ماله من أمر السلطان والغرامات المحرمة وغیر ذلک هل یحل لمن عرف ذلک أن یأکل من طعامه قال: أحب إلی فی دینه أن لایأکل و بیعه حکما إن لم یکن غصبا أو رشوة**" (فتاوی محمودیہ ۱۸/ ۱۲ ۱۴، اشرفی بک ڈپو)۔

حرام کمائی سے اپنے بچے کو پڑھنے کے بعد اب بچہ جو کمائی کر رہا ہے یہ کمائی حلال ہوگی؛ کیونکہ حرام کمائی سے خریدی ہوئی جائداد کی پیداوار فقہاء کے یہاں حلال ہے۔

جواب: ۴

ایسے کھانے سے احتیاط کرنا بہتر ہے، البتہ اگر داعی سے کوئی دینی غرض ہو اور عین اس کھانے میں اموال مغصوبہ وغیرہ نہ رکھا گیا ہو تو کھانے کی گنجائش ہے۔

جواب:۵

جب دعوت کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ داعی کا پورا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس کی تلافی کے لئے توبہ واستغفار کرے گا۔

جواب:٦

حرام مال کے مالک معلوم ہونے کی صورت میں مالک کو واپس کرنا اگر متعذر ہو تو صدقہ کرنا واجب ہے، پھر صدقہ لینے والا غریب شخص مالک بن جانے کے بعد اس کو ہدیہ دے دے تو یہ مال اس کے لئے حلال ہو جائے گا، "**لک صدقة ولنا هدية**" کی وجہ سے، لیکن اسی قاعدہ کو بہانا بنا کر صرف شریعت کے ساتھ مذاق کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے؛ بلکہ اتفاقاً اگر ایسا ہو گیا تو یہ مال درست ہو جائے گا۔

جواب:۷

اگر چہ یہ حقیقت ہے، قرضہ نہیں ہے، اور اس کے اندر دین داری کا احساس پیدا ہوا، اس لئے اگر ہم اس مسئلہ کو "**مغصوب قبل الضمان انتفاع**" والا مسئلہ پر قیاس کرتے ہیں تو صورت مسئولہ کا حکم جواز کا ہونا چاہئے۔

"**مغصوب قبل الضمان انتفاع**" والا مسئلہ یہ ہے:

"**واختلفوا فی أنه هل یباح له الانتفاع به بأن یأکله بنفسه أو یطعمه غیره قبل أداء الضمان فإذا حصل فیه فضل هل یتصدق بالفضل؟**"۔

"**قال أبو حنیفة و محمدؒ لایحل له الانتفاع حتی یرضی صاحبه وقال أبو یوسفؒ یحل له الانتفاع ولا یلزمه التصدق وهو قول الحسن و زفرؒ وهو القیاس و قول أبی حنیفة ومحمد استحسان**" (بدائع الصنائع)۔

لہٰذا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جب اپنے پاس موجود حرام کمائی کا پیسہ بطور قرضہ لے کر بعد نفع مقدار قرضہ صدقہ کرے گا تو یہ درست ہے، لیکن بہتر اور احتیاط اس میں ہے کہ قرضہ نہ لے؛ کیونکہ اگر بعد میں حرص میں مبتلا ہو گیا تو گناہ گار ہوگا۔

جواب:۸

حرام کام میں معاون ہونے کی وجہ سے اس کو گناہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"**ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (سورہ مائدہ:۲)۔

مگر ملازمت کی تنخواہ حرام نہیں ہے:

" و إذا استاجر مسلما يحمل له ميتة أو دما يجوز عندهم الإجارة" (الفتاوی الہندیہ کتاب الاجارۃ ۴/۴۵۰)۔

" و إن استأجره ليكتب الغناء بالفارسية أو بالعربية قيل لايحل الأجر والمختار أنه يحل" (الفتاوی البزازیہ کتاب التجارت نوع فی المتفرقات)۔

جواب:۹

حرام کمائی سے خرید کردہ جائداد میں کام کرنا درست ہے؛ کیونکہ فقہاء کے نزدیک غیر متعین حرام کمائی سے جو چیز خریدی جائے اس کا مالک بن جاتا ہے، پھر اس میں کام کرنا تو جائز ہوگا، حرام کمائی والے کے گھر نوکری کرنا، نیز ان کے ساتھ کار، بائک میں بیٹھ کر سفر کرنے سے اس وقت احتراز کرنا ضروری ہے جب یہ عادت اپنے اندر متعدی ہونے کا خطرہ ہو اور یہ بائک وغیرہ عین غصب کا ہو؛ ورنہ درست ہے اور آج کے زمانہ میں بغرض اصلاح ان کے ساتھ بیٹھنا چاہئے؛ تاکہ یہ دین کی باتیں سن کر اپنی زندگی کو بدلنے کا احساس پیدا کرے۔

مدرسہ یا اسکول والوں کے لئے ان سے فیس وصول کرنا درست ہے، ہاں اگر معلوم ہو کہ یہ بعینہ چوری یا غصب کا پیسہ دے رہا ہے تو نہ لے؛ بلکہ دوسرا حلال پیسہ طلب کرے۔

"قال ابن تيميه رحمهم الله فمن علمت أنه سرق مالا أو خانه فی أمانته أو غصبه فأخذ من المغصوب قهرا بغير حق لم يجز لی أن آخذه منه لا بطريق الهبة ولا بطريق المعاوضة ولا وفاء عن أجرة" (فتاوی محمودیہ ۱۸/۴۵۴)۔

جواب:۱۰

سودی رقم رشوت میں استعمال کرنے کو علماء نے ناجائز قرار دیا ہے۔

"لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه" (شامی کتاب الحظر والاباحۃ ۹/۵۵۳، زکریا)۔

ہاں سرکاری بینک سے ملنے والا سود اپنے اوپر غیر واجبی ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس، ہاؤس ٹیکس میں لگانے کی گنجائش ہے؛ کیونکہ اس کے ذریعہ سے سرکار سے لی ہوئی رقم سرکاری خزانے میں واپس پہنچ جاتی ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ رشوت سرکاری خزانے میں جمع نہیں ہوتی ہے، بہرحال آج کے اس اسلام دشمن ماحول میں مدارس کے کچھ کام بغیر رشوت کے ناگزیر اور ادھر سودی رقم رشوت میں دینا جائز نہیں ہے، اس لئے براہ راست سودی رقم

رشوت میں استعمال کرنے کے بجائے بعد تصرف شرعیہ کے استعمال کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

جواب:۱۱

سودی کاروبار میں ملوث کی طرف سے ہدیہ قبول نہ کرنے یا یہ بات پوچھنے پر کہ یہ مال حلال ہے یا حرام اگر ناگواری اور اختلاف کا باعث ہو اور اس کے پاس کچھ حلال مال بھی ہو اور ہدیہ میں دی جانے والی چیز کے بارے میں حرام کا اگرچہ امکان ہو، لیکن یقین نہ ہو تو اس کو اموال مخلوطہ پر محمول کرتے ہوئے اس ہدیہ کو لینا درست ہونا چاہئے؛ کیونکہ سماج میں حرام کمانے والوں کی دو قسمیں ہیں:

اکثر حرام خور ایسا نہیں ہوتا ہے جو حرام کو الگ رکھتا ہو اور حلال کو الگ۔

لہٰذا دلالت عرف اور دلالت حال سے اسے خلط پر محمول کیا جائے گا۔

حرام خوروں کی دوسری قسم جن کے اندر اتنا شعور ہے کہ حرام وحلال کو الگ الگ رکھتے ہیں تو یہ شخص کسی دیندار آدمی کو حرام مال ہدیہ میں نہیں دیتے ہیں؛ بلکہ حلال میں سے دیتے ہیں (احسن الفتاوی ۸/ ۳۱۸)۔

جب کسی شخص کی کمائی کے بارے میں پتہ نہ ہو کہ حلال ہے یا حرام اور یہ چائے پانی پلانا چاہتا ہے یا بچوں کو ٹافی وغیرہ دیتا ہے تو ان کا استعمال درست ہے؛ کیونکہ مسلمانوں کے معاملہ کو درستگی پر محمول کیا جائے گا، جب تک اس کے خلاف ظاہر نہ ہو جائے۔

"**الأصل أن أمور المسلمين محمولة على السداد والصلاح حتى يظهر غيره**" (من أصول الإمام الكرخي قواعد الفقہ / ۱۲)۔

جواب:۱۲

دعا یا پانی پر دم کرنے سے پہلے حرام کمائی سے توبہ کی شرط لگالے اور حرام کمائی کو صدقہ کرنے کی تاکید کرے، اگر اس نے توبہ کرلیا اور حرام مال کو صدقہ کرنیکا پختہ ارادہ کرلیا تو الحمدللہ اس کی دعا قبول کرے گا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**التائب من الذنب كمن لا ذنب له**"۔

اگر توبہ کی شرط لگانے پر اختلاف کا باعث ہو تو دعا کے بعد نصیحت کرے اور اصلاح کرنے کی کوشش کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

"**ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة**" اور ترک تعلق نہ کرے؛ کیونکہ ترک تعلق اس پُرفتن ماحول میں اس کے مزید بگڑنے کا باعث ہوسکتا ہے۔

مشتبہ وحرام کمائی سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد مدثر قاسمی☆

قرآن واحادیث میں جگہ جگہ حرام کمائی سے منع کیا گیا ہے اور حلال کمائی کی ترغیب دی گئی ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا: "**یا أیھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربا أضعافا مضاعفة**" (اے ایمان والو تم سود کو دوگنا چوگنا کر کے نہ کھاؤ)، تو اس اعتبار سے انسان کو چاہئے کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو حرام کمائی سے بچاتا رہے اور حلال آمدنی کو اپنانے کی کوشش کرے اور حلال کمائی میں اللہ نے خیر وبرکت بھی رکھی ہے، خوشی کی بات ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے اپنے فقہی سمینار میں اس موضوع کو بحث وتحقیق کے لئے منتخب کیا، ان سوالات کے جوابات مندرجہ ذیل ہیں:

جواب نمبر:۱

مثلاً زید فی الحال حلال کاروبار کر رہا ہے، اور اسے یہ بھی پتہ ہے کہ اس کے آباء واجداد حرام کاروبار میں ملوث تھے اور حرام کاروبار کا مال اور زمین جائیداد اس کو وراثت میں ملی ہے جو سب کچھ حرام کمائی کے نتیجے میں حاصل ہوا ہے تو زید کے لیے وارث بننا حلال ہے اور اس کی کمائی حلال ہوگی، لیکن جتنا حرام مال یا مشکوک مال اس نے کاروبار میں لگا رکھا ہے اور جس کا ہے اس کے مالک کا علم بھی نہیں ہے تو مال مشکوک یا حرام مال کو صدقہ کر دے تو بہتر ہوگا۔

"**مات رجل و یعلم الوارث أن أباہ کان یکسب من حیث لایحل ولکن لایعلم الطالب بعینه لیرد علیه حل له الإرث، والأفضل أن یتورع و یتصدقَ والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم، و إلا فإن علم عین الحرام لایحل له ویتصدق به بنیة صاحبه، و إن کان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولایعلم أربابه ولاشیئا منه بعینه حل له حکما، و الأحسن دیانة التنزه عنه**" (ردالمحتار ۷/۳۰۱، طبع زکریا)۔

جواب:۲

حرام مال میراث سے کمایا گیا نفع حلال ہے، بشرطیکہ اصل رقم فقراء پر صدقہ کر دیا جائے، جیسا کہ جواب نمبر ایک

☆ استاذ دارالعلوم شیخ علی متقی برہانپور (مدھیہ پردیش)

کے ذیل میں فقہی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

جواب نمبر: ۳

شوہر یا بیٹا حرام طریقے پر کمائی کر رہے ہوں اور عورت کے سمجھانے کے باوجود یہ حرام کمائی سے باز نہ آتے ہوں اور عورت کے پاس الگ سے کوئی کمائی کا راستہ بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں یہ عورت اس حرام کمائی میں سے اپنی ضرورت کو پورا کرتی رہے، اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس کا وبال اور گناہ کمائی کرنے والے پر ہوگا، اس عورت پر نہیں، اب رہ جاتا مسئلہ یہ کہ بچے کو حرام کمائی سے پڑھایا لکھایا اعلیٰ تعلیم دی تو پڑھنے کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اس بچے کی کمائی کا راستہ حلال ہے تو حلال ہونے کا حکم لگے گا اور اگر حرام ہے تو حرام ہونے کا حکم لگے گا۔

"إمرأة زوجها فی أرض الجوری، إن أکلت من طعامه ولم یکن عین ذلک الطعام غصبا فهی فی سعة من أکله، و کذا لو اشتری طعاما أو کسوة من مال أصله لیس بطیب فهی فی سعة من تناوله والإثم علی الزوج" (ردالمحتار ۷/ ۳۰۲، طبع زکریا)۔

جواب نمبر: ۴

شادی بیاہ کے موقع پر یا کسی بھی موقع پر کھانے کی دعوت دی جائے اور دعوت دینے والے کی کمائی کا علم نہ ہو تو خود کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور ایسے کھانے کی دعوت کو قبول کر لینا چاہئے اور ہم اپنے مومن بھائی کے بارے میں اچھا گمان ہی رکھیں، جب تک کہ ہمیں یقینی طور پر اس کی کمائی کا علم نہ ہو، لہٰذا ایسے شخص کے ہدیہ اور دعوت کو قبول کیا جاسکتا ہے:

"أهدی إلی رجل شیئاً أو أضافه إن کان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن یعلم بأنه حرام فإن کان الغالب هو الحرام ینبغی أن لایقبل الهدیة ولا یأکل الطعام إلا أن یخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل" (الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۴۲، طبع زکریا)۔

جواب نمبر: ۵

کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد میں اس کی کمائی کے حرام ہونے کا علم ہوتا ہے تو ایسی صورت میں کچھ رقم غریب کو صدقہ کر دیں۔

"و أما إذا کان عند رجل مال خبیث فإما إن ملکه بعقد فاسد ، أو حصل له بغیر عقد ولا

یمکنه أن یرده إلی مالکه، و یرید أن یدفع مظلمته عن نفسه، فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء" (بذل المجہود ۱/ ۳۵۹، طبع دار البشائر الاسلامیۃ)۔

جواب نمبر:۶

حرام مال کو حلال بنانے کے لیے شریعت کی نظر میں کوئی حیلہ اور تدبیر نہیں، حرام مال کے بارے میں اصل یہی ہے کہ وہ حرام مال جس سے لیا ہے اس کے مالک تک واپس پہنچا دیا جائے اور مالک کا علم نہ ہونے کی صورت میں غریبوں کو صدقہ کیا جائے گا" **و أما إذا کان عند رجل مال خبیث، فإما إن ملکه بعقد فاسد، أو حصل له بغیر عقد، ولا یمکنه أن یرده إلی مالکه و یرید أن یدفع مظلمته عن نفسه، فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء**" (بذل المجہود ۱/ ۳۵۹، طبع، دار البشائر الاسلامیہ)۔

جواب نمبر:۷

مال حرام سے حلال کاروبار اگر کوئی شخص شروع کرتا ہے جس کے نتیجے میں اسے نفع بھی حاصل ہوتا ہے تو حلال کاروبار سے حاصل ہونے والا نفع حلال ہوگا، البتہ جتنی کمائی شروع میں حرام کی لگائی ہے تو اسے صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

"**رجل إکتسب مالا من حرام ثم اشتری فهذا علی خمسة أوجه: أما إن دفع تلک الدراهم إلی البائع أولا ثم اشتری منه بها أو اشتری قبل الدفع بها و دفعها، أو اشتری قبل الدفع بها و دفع غیرها، أو اشتری مطلقا و دفع تلک الدراهم، أو اشتری بدراهم أخر و دفع تلک الدراهم. و قال الکرخی: فی الوجه الأول والثانی لایطیب، و فی الثالث الأخیرة یطیب و قال أبو بکر: لایطیب فی الکل، لکن الفتوی الیوم علی قول الکرخی دفعا للحرج لکثرة الحرام**" (ردالمحتار ۷/ ۴۹۰)۔

جواب نمبر:۸

جس آدمی کا آدھا بزنس حلال ہو اور آدھا حرام ہو، اب اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصوں کا کام کرنا پڑتا ہے، جیسے کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہے اور کبھی دونوں بزنس کا لین دین کرنا پڑتا ہو یا دونوں کی وصولیابی کے لیے جانا پڑتا ہو تو ایسے شخص کو چاہئے کہ جب تک کوئی حلال آمدنی کا راستہ نہ مل جائے کام کرتا رہے، جب حلال آمدنی مل جائے تو اس کام کو چھوڑ دے، اس بنیاد پر کہ حرام کمانے والے کے ساتھ اس طرح مل کر کام کرنا گویا کہ گناہ پر مدد کرنا ہے؛ جبکہ قرآن کریم کے اندر اللہ نے ہمیں گناہ پر مدد کرنے سے منع فرمایا ہے: "**ولاتعاونوا علی الاثم والعدوان**" (گناہ پر

اور ظلم وزیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)۔

جواب نمبر:۹

حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے جیسے کھیتی باڑی کرنا حلال ہے، اسی طرح حرام کمائی کرنے والے کے یہاں نوکری کرنا جائز ہے، اسی طرح حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ اس کی بائیک یا کار میں بیٹھ کر اس کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے، اسی طرح حرام کمائی کرنے والا اپنے بچے کو اسکول یا مدرسے میں داخل کراتا ہے تو فیس لینا محتنانہ کے طور پر جائز ہے، اس بنیاد پر کہ اللہ کے رسول علیہ الصلاۃ والسلام نے یہودیوں کے ساتھ معاملات فرمائے ہیں؛ جبکہ قرآن کریم کے اندر اللہ نے یہود کے بارے میں فرمایا ہے: ''**أكالون للسحت**'' (سود کھانے والے ہیں) لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول نے ان کے ساتھ معاملات فرمائے ہیں جو اشارہ کرتا ہے کہ حرام کمائی کرنے والوں کے ساتھ معاملات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لہٰذا معاملہ خریداری کا ہو یا پھر حرام کمائی کرنے والے کے پاس مزدوری کرنے کا، خریداری کا معاملہ کرنے کے سلسلے میں بخاری کے اندر ایک روایت موجود ہے:

''**عن عائشة أن النبي صلى الله عليه وسلم اشترى طعاما من رجل يهودي إلى أجل و رهنه درعا من حديد**'' (الصحیح للبخاری باب شراء النبی بالنسیئۃ، حدیث نمبر:۲۰۲۱)۔

(اللہ کے رسول علیہ الصلوۃ والسلام نے ایک یہودی شخص سے غلہ خریدا ایک مدت کے لیے اور اپنی زرہ گروی رکھ دی اس کے پاس)۔

جواب نمبر:۱۰

آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے اجازت لینے میں ایک خطیر رقم جو رشوت کے طور پر دی جاتی ہے، اس میں سودی رقم دینا جائز ہے، اس بنیاد پر کہ یہ سودی رقم حکومت کے پاس سے ہی ہمارے پاس میں آئی ہے تو اس اعتبار سے حکومت سے منظوری لینے میں رشوت کھلانا پڑے تو رقم جہاں سے آئی ہے وہیں پر واپس جارہی ہے، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جواب نمبر:۱۱

کسی بستی کی اکثریت اگر سودی کاروبار میں ملوث ہو اور ہمارے پاس کوئی شخص ہدیہ لے کر آتا ہو اور ہمیں اس کے

بارے میں معلومات بھی نہیں ہے کہ اس کی کمائی حلال ہے یا حرام تو ہمیں اس سلسلے میں کھود کرید کرنے کی اور زیادہ تحقیق و تفتیش میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، جب تک کے ہمیں یقینی طور پر علم نہ ہوجائے کہ یہ شخص حرام کاروبار میں ملوث ہے، لہٰذا ہمیں اپنے مومن بھائی کے بارے میں اچھا گمان رکھتے ہوئے اس کے ہدیہ کو قبول کرلیا جائے؛ جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عورت کے ہدیہ کو قبول کیا جبکہ اس نے اللہ کے رسول کی خدمت میں ایک بکری پیش کی، حالانکہ یہود کے بارے میں قرآن نے فرمایا کہ وہ سود کھانے والے ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کے رسول نے اس عورت کے ہدیہ کو قبول کیا؛ جیسا کہ بخاری کی روایت کے الفاظ ہیں:

"**عن أبی هريرة رضی الله عنه لما فتحت خبير أهديت لرسول الله صلی الله عليهوسلم شاة فيها سم**" (الصحیح للبخاری باب الشاۃ التی سمت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر)۔

جواب: ۱۲

جس کی کمائی حرام ہو اس کی عبادات کے قبول نہ ہونے والی بات حدیث میں موجود ہے، لیکن اگر وہ کسی دوسرے سے دعا کی درخواست کرتا ہے یا پانی پر کسی سے دم کرواتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض احکام

مولانا رضی احمد رحمانی ندوی☆

جواب:۱

صورت مسئولہ میں حرام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔حرام کی پہلی قسم حرام بنفسہ ہے، یعنی جو چیز اپنی ذات میں حرام ہو، تو یہ مال وراثت کے طور پر منتقل نہیں ہوتا ہے۔

۲۔حرام کی دوسری قسم حرام لغیرہ ہے، یعنی جو شیء بنفسہ حرام نہ ہو، لیکن فاعل کے فعل کی وجہ سے حرام قرار پائے، جیسا کہ مال تجارت یا بیع وشراء میں جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر یا سود وغیرہ سے کمانا، تو ایسی صورت میں اگر اس حرام مال کا مالک موجود ہو تو اسے لوٹانا ضروری ہے، ورنہ بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کردے، جہاں تک بات ہے منافع کی تو وہ حلال ہوگا۔

"وَالْحَاصِلُ أَنَّهُ إنْ عَلِمَ أَرْبَابَ الْأَمْوَالِ وَجَبَ رَدُّهُ عَلَيْهِمْ، وَإِلَّا فَإِنْ عَلِمَ عَيْنَ الْحَرَامِ لَا يَحِلُّ لَهُ وَيَتَصَدَّقُ بِهِ بِنِيَّةِ صَاحِبِهِ، وَإِنْ كَانَ مَالًا مُخْتَلِطًا مُجْتَمِعًا مِنْ الْحَرَامِ وَلَا يَعْلَمُ أَرْبَابَهُ وَلَا شَيْئًا مِنْهُ بِعَيْنِهِ حَلَّ لَهُ حُكْمًا، وَالْأَحْسَنُ دِيَانَةً التَّنَزُّهُ عَنْهُ" (ردالمحتار ۵/۹۹)۔

جواب:۲

صورت مسئولہ میں حرام مال سے تجارت کرنا درست نہیں، تاہم اگر کسی نے اس طرح کے مال سے تجارت کرلی تو اس سے حاصل شدہ نفع حرام نہیں ہوگا، البتہ اگر حرام مال غصب، رشوت وغیرہ سے حاصل ہوا ہے تو اصل مالک کی طرف اس کا لوٹانا ضروری ہوگا، نیز اگر سودی رقم ہے یا مالک کا پتہ ہی نہیں ہے تو ایسی صورت میں اصل رقم کو غرباء ومساکین وغیرہ پر صدقہ کردیا جائے۔

"اكتسب حراما واشترى به أو بالدراهم المغصوبة شيئا .قال الكرخي: إن نقد قبل البيع تصدق بالربح وإلا لا وهذا قياس، وفي الشامي: قوله (اكتسب حراما) توضيح المسألة ما في

☆ قاضی شریعت امارت شرعیہ خانقاہ رحمانی مونگیر بہار

التتارخانية حيث قال: رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه: أما إن دفع تلك الدراهم إلى البائع أولا ثم اشترى منه بها أو اشترى قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترى قبل الدفع بها ودفع غيرها، أو اشترى مطلقا ودفع تلك الدراهم، أو اشترى بدراهم أخر ودفع تلك الدراهم .قال أبو نصر: يطيب له ولا يجب عليه أن يتصدق إلا فى الوجه الأول، وإليه ذهب الفقيه أبو الليث، لكن هذا خلاف ظاهر الرواية فإنه نص فى الجامع الصغير: إذا غصب ألفا فاشترى بها جارية وباعها بألفين تصدق بالربح .وقال الكرخى: فى الوجه الأول والثانى لا يطيب، وفى الثلاث الأخيرة يطيب، وقال أبو بكر: لا يطيب فى الكل، لكن الفتوى الآن على قول الكرخى دفعا للحرج عن الناس" (ردالمحتار:۷/۴۹)۔

جواب:۳

صورت مذکورہ میں شوہر یا بیٹا جو حرام طریقہ پر کمائی کر رہا ہو، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود باز نہیں آ رہا ہے اور اس غریب خاتون کے لیے کمائی کا دوسرا راستہ نہیں ہے اور ذریعہ معاش کی کوئی دوسری صورت نہ ہو تو اس عورت کے لیے اس حرام کمائی سے کھانا جائز ہوگا، اور گناہ شوہر یا بیٹے پر ہوگا، اسی طرح اس نے اپنے بچے کو خوب پڑھایا لکھایا اعلی تعلیم دی، اب پڑھنے کے بعد بچہ کمائی کر رہا ہے تو اسکی کمائی حلال ہے، مگر بہتر یہ ہے کہ جتنی رقم اس کی تعلیم پر صرف ہوئی ہے اتنی رقم صدقہ کر دے۔

"**وفى جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاماً أو كسوةً من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج**" (شامی۶/۱۹۱)۔

جواب:۴

جس شخص کی آمدنی کا اکثر و بیشتر حصہ حرام ہو اس کے یہاں دعوت کھانا جائز نہیں ہے، ہاں داعی یہ کہہ دے کہ وہ حلال مال سے دعوت کر رہا ہے، تو ایسی صورت میں دعوت کھانا حلال ہوگا۔

"**غالب مال المهدى إن كان حلالاً، لا بأس بقبول هديته وأكل ماله، ما لم يتعين أنه من حرام، وإن غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل، إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه**" (البزازیۃ علی ہامش الفتاوی الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ/ الفصل الرابع فی الہدیۃ والمیراث ۶/۳۶۰، زکریا)۔

"**رجل اشترى من التاجر شيئا هل يلزمه السؤال أنه حلال أم حرام قالوا ينظر إن كان فى بلد وزمان كان الغالب فيه هو الحلال فى أسواقهم ليس على المشترى أن يسأل أنه حلال أم حرام ويبنى**

الحكم على الظاهر، وإن كان الغالب هو الحرام أو كان البائع رجلا يبيع الحلال والحرام يحتاط ويسأل أنه حلال أم حرام" (الفتاوی الہندیۃ:۳/۲۱۰)۔

جواب:۵

مذکورہ صورت میں دعوت کھانے کے بعد جب معلوم ہو کہ فلاں شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو وہ ایسی صورت میں توبہ واستغفار کرے۔

"**الحرمة تتعدد مع العلم بها وفي الشامي في تحته: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لاتتعدى ذمتين سألت عن الشهاب بن الشلبي فقال هو محمول على ما إذا لم يعلم بذالک الخ**" (رد المحتار مع الدر المختار:۴/۱۴۶)۔

جواب:۶

حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کا کوئی حیلہ یا تدبیر نہیں ہے، اگر وہ حرام مال بغیر کسی عوض کے حاصل کیا گیا ہے جیسے چوری اور سود وغیرہ، تو ایسی صورت میں اس مال کو اس کے مالک کو لوٹانا واجب ہے اگر مالک فوت ہو چکا ہو تو اس کے ورثاء کو دے دے، اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو صاحب مال کی نیت سے مستحق زکوٰۃ پر صدقہ کر دے، اور اگر بالعوض حرام مال حاصل کیا ہے تو ایسی صورت میں اس مال کو بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔

" **والحاصل: أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم، وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه**" (شامی ۵/۹۹، مَطْلَبٌ فِيمَنْ وَرِثَ مَالًا حَرَامًا)۔

جواب:۷

ایسی صورت میں مذکورہ شخص جس کے پاس حرام کمائی کا مال ہے وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کر دینا چاہتا ہے، لیکن تجارت کے لیے حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو اپنے ہی اس مال کو خود ہی قرض لے کر اس سے کاروبار کر کے زیادہ پیسہ کمانے کے بعد اس اصل قرض کو صدقہ کر دیتا ہے تو اس کا منافع اس کے لیے حلال ہوگا (ردالمحتار ۷/۴۹۰)۔

جواب:۸

صورت مسئولہ میں جہاں حلال وحرام دونوں طرح کے کام کرنے پڑتے ہوں، وہاں حلال کام کے عوض میں جو اجرت

ملے گی وہ جائز ہوگی، لیکن حرام کام کرنے کے عوض جو اجرت حاصل ہوگی، وہ جائز نہیں ہوگی اور اس کو صدقہ کرنا ضروری ہوگا۔

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ" (المائدۃ:۲)۔

"يا أيها الذين آمنوا اتقوا الله وذروا مابقي من الربا إن كنتم مؤمنين، فإن لم تفعلوا فآذنوا بحرب من الله ورسوله" (البقرۃ:۲۷۸-۲۷۹)۔

جواب:۹

مذکورہ بالا صورت میں حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنے یا حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کے عوض جو اجرت ملے گی وہ جائز ہوگی، اسی طرح حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھ کر سفر کرنا، نیز حرام کمائی کرنے والا شخص اگر اپنے بچے کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا بھی جائز ہوگا، لیکن ایسے شخص کے یہاں نوکری کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، اور اس کی گاڑی میں بیٹھنے سے بھی بچنا چاہیے، البتہ اگر وہ شخص یہ کہہ دے کہ ہم جو یہ پیسے بطور اجرت دے رہے ہیں یا بطور فیس دے رہے ہیں وہ مال حرام سے دے رہے ہیں تو ایسی صورت میں وہ اجرت کی رقم جائز نہیں ہوگی۔

"ومن حمل لذمي خمرا، فانه يطيب له الأجر عند أبي حنيفه، وقال أبي يوسف ومحمد: يكره له ذلك لانه إعانة على المعصيه" (ھدایہ:۴/۴۷۲)۔

جواب:۱۰

مذکورہ صورت میں اگر تمام قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کے باوجود صرف رشوت نہ دینے کی وجہ سے نقشہ منظور نہ ہو رہا ہو، تو ایسی صورت میں حکومت کے متعلق اداروں سے خطیر رقم بطور رشوت دے کر منظوری لینے کی گنجائش ہوگی۔

فتاوی شامی میں ہے:

"دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة يعني في حق الدافع اهـ" (۶/۴۲۳)۔

جواب:۱۱

جس بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہوں، اور کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال

ہے یا حرام ناگواری اور اخلاف کا باعث بنتا ہے تو ایسی صورت میں پوچھے بغیر بھی ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، اسی طرح پانی چائے وغیرہ بھی پینا جائز ہوگا، ہاں صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہوجائے کہ یہ ہدیہ مال حرام سے دیا ہے یا چائے پانی وغیرہ مال حرام سے کررہا ہے تو ایسی صورت میں جائز نہیں ہوگا۔

"**يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا ...إلخ** (الحجرات ۱۲)۔

"**عن أبی هريرة، أن رسول الله –صلى الله عليه وسلم – قال: "إياكم والظن، فإن الظن أكذب الحديث، ولا تحسسوا، ولا تجسسوا**" (سنن أبي داود: رقم الحدیث: ۴۹۱۷، ط: دار الرسالۃ العالمیۃ)۔

جواب: ۱۲

صورت مذکورہ میں حرام کمائی کرنے والے شخص کے کہنے پر دعا کی جاسکتی ہے اور آیات قرآنی پڑھ کر دم بھی کیا جاسکتا ہے، دعا کا اس شخص کے حق میں قبول ہونے کا امکان کم ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے، پاکی قبول کرتا ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ نے جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے کہ اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاو اور نیک عمل کرو! وہی حکم اُس نے پیغمبروں کے علاوہ اپنے مومن بندوں کو دیا ہے کہ اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اُس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاو! اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبے سفر میں ہو، بال بکھرے ہوئے ہوں، بدن پر غبار لگا ہوا ہو، آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر یارب یارب کہتا ہو، اُس کا کھانا حرام ہو، اُس کا پینا حرام ہو، اُس کا پہننا حرام ہو، تو ان سب چیزوں کے باوجود اُس کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے؟ (صحیح مسلم: ۱۰۱۵، جامع ترمذی: ۲۹۸۹)۔

☆☆☆

حلال وحرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد ابوبکر قاسمی عفا اللہ عنہ☆

آزادی سے پہلے محققین علماء نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا، دار الحرب میں جواز سود کے سلسلہ میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے، جمہور فقہاء ائمہ ثلاثہ اور قاضی ابو یوسف دار الحرب میں سود لینے کو ناجائز وحرام قرار دیتے ہیں، البتہ حضرات طرفین صرف حربی سے چند شرائط کے ساتھ جواز کے قائل ہیں، لیکن متاخرین فقہاء احناف نے جمہور کے قول کو ترجیح دیا ہے اور اسی میں احتیاط ہے (ملاحظہ ہو فتاوی دار العلوم زکریا ۵/ ۶۲)۔

۱- ہندوستان کے کفار سے لئے گئے سود کا حکم:

ہندوستان کے کفار سے جو سود کی رقم لی گئی وہ علماء محققین کے نزدیک واجب التصدق ہے، اور بعض علماء اس قسم کی رقم کو رفاہی کاموں میں خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، اگر کسی غریب کے پاس اس قسم کی رقم ہے تو اسکے لئے استعمال کرنے کی اجازت ہے، البتہ مالدار شخص کے لئے اس کا تصدق لازم ہے۔

۲- غریب شخص کے پاس سود سے حاصل شدہ جائیداد کا حکم:

اگر کسی غریب شخص کے پاس سود سے حاصل شدہ جائیداد ہے جس میں وہ رہائش پذیر ہے تو اس کے لیے اس میں رہنے کی گنجائش ہے، کیونکہ غریب شخص شرعاً زکوۃ وصدقات کا مصرف ہے۔

۳- شوہر یا بیٹے کا کاروبار سودی ہو عورت کیا کرے؟

اگر کسی عورت کا شوہر یا بیٹا سودی کاروبار میں ملوث ہے، اور عورت غریب ہے تو اس کے لئے شوہر یا بیٹے کی طرف سے دی گئی رقم کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہے، ہاں اگر عورت مالدار ہو تو ایسی رقم کے استعمال سے احتراز کرے، "**لعن رسول**

☆ مہتمم جامعہ رحیمیہ، برہم پور، دربھنگہ، بہار

الله صلی الله علیه وسلم آکل الربوا و موکله الخ" (رواہ مسلم ۲/۲۸)۔

فقہاء کے یہاں قاعدہ ہے:"**الضرورات تبیح المحظورات**"(الاشباہ والنظائر)۔

۴-سودی رقم یا حرام آمدنی سے کی گئی دعوت کا حکم:

حرام آمدنی یا سودی رقم سے کی گئی دعوت کا قبول کرنا ناجائز ہے، اگر کھانے کے بعد معلوم ہو تو اتنی رقم کا صدقہ کردے۔

۶-اگر کسی کے پاس پہلے سے کمایا ہوا حرام مال ہے تو وہ کیا کرے؟

اگر کوئی شخص مالدار ہے اور اس کے پاس حرام طریقے سے کمایا ہوا مال ہے تو اس پر لازم وواجب ہے کہ وہ اس مال کا صدقہ کردے، اور اگر غریب ہے تو بہتر ہے کہ اگر کوئی سامان کسی دوکاندار سے خریدے تو پہلے سامان لے لے پھر سامان پر قبضہ کرنے کے بعد اس پر جو قرض واجب ہے، اس کو ادا کردے تو اس کے لیے ایسا کر کے حرام مال کا استعمال کرنا جائز ہوجائے گا، اور اسے حرام مال کے کھانے کا گناہ نہ ہوگا۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۷-حرام مال کو قرض لے کر استعمال کرنا:

اگر کسی شخص کے پاس حرام مال ہے اور وہ اسے صدقہ کر کے ختم بھی کرنا چاہتا ہے؛ لیکن کاروبار کر کے وہ فی الوقت مال کمانا چاہتا ہے، لیکن اس کے لئے اسے قرض لینا ناگزیر ہے، اب ایسی صورت میں کیا وہ شخص حرام مال کو بطور قرض لے کر استعمال کرتا ہے اور پھر منافع حاصل کر کے وہ حرام مال کو صدقہ کردے گا، تو کیا اس کے لئے اس مال کو فی الوقت استعمال کرنا جائز ہے، تو اس سلسلہ میں میری ناقص رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ شخص غریب ومحتاج ہے اور حضرات فقہاء نے ضرورت مند ومحتاج شخص کے لئے استقراض بالربح کو جائز لکھا ہے، لہٰذا اس شخص کے لئے بھی ایسا کرنا جائز ہے، الاشباہ والنظائر میں ہے:

"**یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح**" (الاشباہ والنظائر)۔

۸-حلال وحرام سے کئے گئے کاروبار کا حساب لکھنا یا دیگر کام کرنا:

اگر کسی شخص کا کاروبار دونوں طرح کا ہے، آدھا آدھی حلال مال پر مشتمل ہے اور آدھا حرام مال پر مشتمل ہے تو ان دونوں قسم کے کاروبار کا حساب لکھنا یا دونوں کا لین دین کرنا یا دونوں قسم کے مالوں کی وصولی کے لئے جانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ تو قرآن مجید نے "**تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (مائدہ: آیت ۲) کا واضح اصول ذکر کیا ہے، اس اصول کی روشنی میں حلال مال سے کی جانے والی بزنس کا حساب لکھنا یا لین دین کرنا، اس کی وصولی

کرنا شرعاً جائز ہے اور ناجائز وحرام مال سے کی جانے والی بزنس کا حساب لکھنا لین دین کرنا یا وصولی کرنا تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

۹-حرام مال سے حاصل کردہ اشیاء کا استعمال:

اگر کسی کے پاس حرام مال سے حاصل کردہ اراضی ہے، اس میں کھیتی کرنا یا حرام مال سے خرید کردہ مکان میں رہائش پذیر ہونا یا اس میں نوکری یا حرام مال کمانے والے شخص کے ساتھ اس کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا یا حرام مال کمانے والے کے بچوں سے مدرسہ یا اسکول کی فیس وصول کرنا شرعاً جائز ہے، اور ان تمام صورتوں میں حرام مال کا سب کو تو گناہ ہوگا، لیکن اس کی اراضی یا گھر میں نوکری کرنے والے شخص کو گناہ نہ ہوگا، اسی طرح حرام مال حاصل کر کے خود استعمال کرنے والوں کو تو گناہ ہوگا، لیکن جو شخص اس کے بچوں کو تعلیم دے گا اس کے لئے تعلیمی فیس وصول کرنا شرعاً جائز ہے، نیز حرام کمانے والے شخص کی بائک یا کار پر بیٹھ کر سفر کرنا شرعاً جائز ہوگا، البتہ اس کے ساتھ رہنے والوں کو چاہئے کہ ایسے شخص کے ساتھ رہ کر اس کو برے کام اور ناجائز مال حاصل کرنے سے منع کرے، اگر وہ رک جائے تو بہتر ہے، ورنہ ساتھ رہنے والا شخص گناہ سے محفوظ رہے گا، البتہ اگر کوئی نیک شخص اس قسم کے لوگوں سے علیحدہ رہے تو بہتر ہے، خداوند قدوس کا فرمان واجب الاذعان ہے: "**ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار**" (سورۂ ہود)، اسی طرح دعاء قنوت میں ہے: "**ونخلع و نترک من یفجرک**" (اے اللہ جو شخص آپ کی نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے ترک تعلق کرتے ہیں، علیحدگی اختیار کرتے ہیں)، یاد رہے کہ برے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا یا برے شخص کی نماز جنازہ پڑھنا یا برے شخص کی ماتحتی میں جہاد کرنا شرعاً جائز ہے، کبھی کبھی اللہ تعالیٰ برے شخص کے ذریعہ بھی اپنے دین کی مدد کروا دیتا ہے، لہٰذا ہمیں کسی شخص کے برے فعل سے تو ضرور نفرت ہونی چاہئے، لیکن برے شخص سے ہرگز نفرت نہ ہونی چاہئے؛ بلکہ اسے سدھارنے کی کوشش کرنی چاہئے اور برائی اور گناہ کے دلدل سے نکالنے کی فکر رکھنی چاہئے، **اللھم احفظنا آمین**۔

حضرات فقہاء نے شراب خانہ کی تعمیر یا گرجا گھر یا مندر وغیرہ کی تعمیر میں کام کرنے والے انجینئر و دیگر ملازمین کی اجرت کے متعلق بحث کرتے ہوئے حضرات صاحبین کا مسلک کراہت کا اور امام ابوحنیفہ کا مسلک جواز کا نقل کیا ہے، درمختار میں ہے:

"**وجاز تعمیر کنسیة و حمل خمر وھی بنفسه .....لقیام المعصیة وقال "لاینبغی ذلک لأنه إعانه علی المعصیة و به قالت الأئمة الثلاثة .....و فی الشامیة و جاز تعمیر کنسیة قال فی الخانیة ولو آجر نفسه لیعمل فی الکنیسة ویعمرها لا بأس به لأنه لا معصیة فی عین العمل قوله وحمل خمر**

ذمی قال الزیلعی ..... و هذا عنده وقالا هو مکروه ..... و له أن الإجارة علی العمل وهو لیس بمعصیة ولا سبب لها و إنما تحصل المعصیة بفعل فاعل مختار'' (درمختار مع ردالمحتار ۶/ ۳۹۱، کتاب الحظر والاباحۃ)۔

'' **وفی التتارخانیة ولو آجر المسلم نفسه لذمی لیعمل فی الکنیسته فلا بأس به**'' (البحرالرائق ۸/ ۲۰۳، فصل فی البیع)۔

۱۰- مدارس یا دیگر عمارتوں کے نقشہ پاس کرانے میں سود کی رقم رشوت میں دینا:

مدارس یا عام عمارتوں کے نقشہ جات کے پاس کرانے میں اگر سود کی رقم رشوت میں افسران کو دی جائے تو یہ جائز ہے یا نہیں تو اس سلسلہ میں حضرات فقہاء نے سود کی رقم سے رشوت دینے کو ناجائز لکھا ہے، چنانچہ مولانا لدھیانوی نے آپ کے مسائل اور ان کا حل ۶/ ۲۴۲، میں لکھا ہے: الجواب: '' سود بھی حرام ہے اور رشوت بھی حرام ہے، لہٰذا دوہرا گناہ ہوگا، سود لینے کا اور رشوت دینے کا'' فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

یاد رہے نقشہ پاس کرانے میں اگر قانونی طور پر حکومت رقم وصول کرتی ہے تو حکومتی بینک سے وصول کی ہوئی سود کی رقم خود حکومت کے خزانے میں لوٹا سکتے ہیں، لیکن افسران کو دی جانے والی رقم جو بطور رشوت دی جاتی ہے وہ حکومت کے خزانے میں نہیں جاتی، اس لئے بطور رشوت کے سودی رقم دینا جائز نہیں ہے (محمود الفتاوی ۳/ ۲۷، باب الربوا، فتاوی دارالعلوم زکریا، جلد پنجم ۴۳۵)۔

۱۱- بستی والوں کے سود میں ملوث ہونے کے سبب وہاں کے لوگوں کا ہدیہ قبول کرنا:

اگر کسی بستی کے اکثر افراد سودی کاروبار میں ملوث ہوں اور وہاں کے لوگوں کی عادت بڑوں یا بچوں کو ہدیہ دینے کی ہو تو ایسے لوگوں کا ہدیہ بچوں یا بڑوں کے لئے قبول کرنا کیسا ہے، تو اس کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ مال حرام ہے یا مخلوط ہے اور غالب حلال کمائی کا ہے تو پھر ہدیہ قبول کرنے میں حرج نہیں ہے، اسی طرح اگر مال مخلوط ہے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ استہلاک ہے، لہٰذا امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس قسم کے ہدیہ کو قبول کرنے کی گنجائش ہے، اور اگر غالب کمائی حرام پر مشتمل ہے تو پھر ہدیہ وضیافت کا قبول کرنا حرام ہے، ہاں اگر از خود اطلاع دیدے کہ یہ حلال ہے، تو پھر ہدیہ قبول کرنا جائز ہے، اور اگر یقینی طور سے معلوم ہو جائے کہ اس میں مال حرام کی ملاوٹ ہے تو اس کا قبول کرنا حرام ہے (ملاحظہ ہو فتاوی دارالعلوم زکریا ۵/ ۶۱۴، شامی ۵/ ۹۸، امداد الاحکام ۴/ ۳۹۷ و ۴۰۰، فتاوی عثمانی ۳/ ۳۹۵)۔

''**ولایجوز قبول هدیة أمراء الجوز لأن الغالب فی مالهم الحرمة إلا إذا علم أن أکثر ماله حلال بأن کان صاحب تجارة أو زرع فلا بأس به لأن أموال الناس لاتخلو عن قلیل حرام فالمعتبر**

الغالب، وكذا أكل طعامهم، كذا في الاختيار شرح المختار" (فتاوی ہندیہ ۵/ ۳۴۲)۔

۱۲-جس کی کمائی حرام ہو اس کے بچہ کا نام رکھنے یا دیگر مواقع پر دعا ودم کرنا:

سوال کی وجہ یہ ہے کہ حدیث نبوی کی صراحت کے مطابق ایسے شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی، اسی لئے وہ شخص مصیبت زدہ ہے، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسے شخص کے لئے اور اس کے بچوں کے لئے ہدایت کی دعا کرے اور بعد ہدایت بیماری سے شفایابی کی دعا کرے، کیونکہ سورۃ فاتحہ کی آخری تین آیات میں ہم مسلمانوں کو یہی حکم ہے کہ سب کے لئے ہدایت کی دعا کرے۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل کا تحقیقی جائزہ

مفتی راسخ الاسلام صاحب قاسمی ارریاوی ☆

الحمد لله رب العالمين و الصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين و على آله و صحبه أجمعين، أما بعد!

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل کے جزئیات کے جوابات ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

سوال نمبر ا کا جواب:

اگر وارث کو وراثت میں حرام مال حاصل ہو تو اس سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر حرام مال متعین و منفصل طور پر محفوظ ہے اور ورثا کو مستحقین اموال بھی معلوم ہیں تو حکم یہ ہے کہ ورثا پر وہ اموال صاحب مال کو لوٹانا ضروری ہے، اور اگر ورثا کو مستحقین معلوم نہ ہوسکیں اور مال حرام متعین طور پر معلوم ہو تو ان اموال حرام کو مستحقین کی جانب سے صدقہ کرنا ضروری ہے، اور اگر مستحقین اموال معلوم نہیں ہیں اور نہ ہی مال حرام متعین و ممیّز ہے تو ورثا کے لئے اس مال کو قضاء اپنے استعمال میں لانا جائز ہے، لیکن دیانتاً مستحقین کی طرف سے صدقہ کر دینا افضل ہے؛ لہٰذا اگر اس مال حرام سے حلال کاروبار کیا جائے اور اس سے گھر جائیداد بھی خرید لے تو بقدرے مال حرام ادا کرنے یا صدقہ کر دینے کے بعد اس گھر جائیداد کو استعمال کرنا بھی جائز ہے اور اس سے کیے جانے والے کاروبار کا نفع حاصل کرنا بھی جائز ہے، اور اگر مورث کا وہ مال آزادی کے بعد حلال طریقے سے حاصل شدہ ہے تو پھر وارث کے لئے اس کے استعمال کرنے کے جواز میں کوئی کلام ہی نہیں ہے: ''**قوله إلا في حق الوارث أي فإنه إذا علم أن كسب مورثه حرام يحل له لكن إذاعلم المالك بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه وهذا معنى قوله قيده في الظهيريه الخ وفي منية المفتي: مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكسب من حيث لايحل ولكن لايعلم الطالب بعينه ليرد عليه حل له الإرث والأفضل أن يتورع ويتصدق بنية خصماء أبيه ..... والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم و إلا فإن**

☆ استاذ حدیث وفقہ ادارہ فیض القرآن اتر دیناج پور بنگال

علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولاشيئا منه يعلم بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه" (ردالمحتار مع الدر، البیوع، باب البیع الفاسد ۳۰۱، مکتبہ زکریا، فتاوی محمودیہ، باب المال الحرام ومصرفہ ۱۸/ ۴۰۸، مکتبہ دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی)۔

میراث میں ملے ہوئے مال حرام کے عنوان کے تحت حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی تحریر فرماتے ہیں کہ ردالمحتار میں اس پر بہت بسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے، حاصل مجموعہ کا یہ ہے کہ اگر کوئی مال حرام علیحدہ رکھا ہے تو وہ بالکل حرام ہے، یعنی اس میں تصرف بھی نافذ نہ ہوگا، بس اگر اس کا مالک ہے تو اس کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر معلوم نہیں تو لقطہ کی طرح مساکین پر تصدق کردے اور اگر وہ مال حرام مال حلال کے ساتھ باہم مخلوط ہوگیا تو اگر مالک مستحق معلوم ہے تو اس کا بدل واپس کردیں، اگر مالک بھی معلوم نہیں تو قضاءً اس میں تصرف نافذ ہوسکتا ہے، لیکن دیانۃً اس کے لئے حلال نہیں (امداد الفتاوی ۴/ ۱۴۵ مکتبہ زکریا)۔

سوال نمبر ۲ کا جواب:

جو جائیداد یا مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے اگر مستحقین معلوم ہوں تو ان کو یا معلوم نہ ہونے کی صورت میں جائیداد کے بقدر رقم کو صدقہ کرنا لازم ہے، جہاں تک مسئلہ ہے اس حرام جائیداد سے کرایا وغیرہ وصول کرکے استعمال کرنے کا تو اس سلسلے میں ہدایہ وغیرہ میں بہرصورت اس طرح کی آمدنی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے: ''**وقال مشايخنا رحمهم الله تعالى لا يطيب له قبل أن يضمن وكذا بعد الضمان بكل حال وهو المختار لإطلاق الجواب في الجامعين والمبسوط**'' (الھدایہ، الغصب ۳/ ۳۷۶، مکتبہ فیصل دیوبند)؛ ''**كما استفاده من الهدايه أن الغاصب والمودع إذا تصرف في المغصوب أو الوديعة وربح لا يطيب له الربح عندهما**'' (الھدایہ، الغصب ۳/ ۳۷۵، مکتبہ فیصل- بدائع الصنائع ۵/ ۱۲۰، مکتبہ زکریا دیوبند)۔

البتہ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر بغیر تعین مال حرام سے کوئی مال خریدا اور اس شخص نے مال حلال قیمت میں ادا کردیا یا متعین تو کیا مال حرام کو مگر ادا کیا مال حلال یا متعین تو کیا مال حلال مگر ادا کیا مال حرام تو ان تینوں صورتوں میں امام کرخی کے نزدیک آمدنی اس کی حلال ہوگی، صرف اصلی مال حرام کو ادا کرنا یا صدقہ کرنا لازم ہوگا، محمود الفتاوی میں ذخیرہ قہستانی مختصر وقایہ سے اسی پر فتوی نقل کیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۳ کا جواب:

گھر کی مستورات بیوی اور ماں کے روکنے کے باوجود اگر شوہر یا بیٹا حرام کمائی سے باز نہ آئے تو حکم یہ ہے کہ شوہر

یا بیٹے کی کمائی اگر رشوت غصب وغیرہ خالص حرام کی ہے تو گھر کے تمام افراد کے لیے وہ حرام رہے گا یا تو گھر والے سب شوہر اور بیٹے کو مجبور کریں کہ وہ حرام کمائی چھوڑ کر حلال کمائی میں لگ جائیں اور اگر ایسا نہیں کر سکتے ہیں تو گھر والوں کو چاہیے کہ وہ کوئی حلال کمائی کا ہنر سیکھ لیں، جب تک کوئی ہنر نہ سیکھیں تو مجبوری میں شوہر یا بیٹا کی کمائی کھا سکتے ہیں، ساتھ میں توبہ اور استغفار بھی کرتے رہے ہیں، ایسی صورت میں سارا گناہ شوہر اور بیٹا پر ہوگا: ''**وفی الخانیه امرأة زوجها فی أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عينه غصبا أو اشترى طعاما أو كسوه من مال أصله ليس بطيب فهی فی سعة من ذلک والإثم علی الزوج**'' (ردالمحتار، کتاب الحضر والاباحۃ ۱۸/ ۴۱۲، مکتبہ سعید) ''**وفی الذخيره سئل أبو جعفر عمن اكتسب ماله من أمر السلطان والغرامات المحرمة وغير ذلک هل يحل لمن عرف ذلک أن يأكل من طعامه قال أحب إلی فی دينه ألا يأكل ويسعه حكما إن لم يكن غصبا أو رشوة**'' (ردالمحتار، کتاب الحضر والاباحۃ ۶/ ۳۸۶، مکتبہ سعید، فتاوی محمودیہ، باب المال الحرام ج ۶/ ۳۸۶، مکتبہ دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی)۔

حرام کمائی سے اپنی اولاد کو پڑھانا لکھانا اعلی تعلیم دلانا یقیناً ناجائز ہے، حرام ہے اور گناہ ہے، ان کو مستحقین تک پہنچانا اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ان کی طرف سے غریب فقیر کو صدقہ کرنا لازم اور ضروری ہے، البتہ اس ڈگری کے ذریعے اولاد اگر دوسری کوئی حلال کمائی کر رہی ہے تو پھر اس کو حرام نہ کہا جائے گا (مستفاد از فتاوی محمودیہ، باب المال الحرام ومصرفہ ۱۸/ ۴۰۸)۔

سوال نمبر ۴ کا جواب:

جب تک کسی مسلمان کی کل آمدنی کے سو فیصد حرام ہونے یا نصف آمدنی کے حرام یا مشتبہ ہونے کی کوئی واضح دلیل یا وجہ معلوم نہ ہو تو محض وہم، شک اور وسوسہ کی بنیاد پر اس کی دعوت طعام کو حرام نہیں کہا جا سکتا ہے، ایسی صورت میں تحقیق وجستجو کیے بغیر دعوت طعام قبول کرنے کی گنجائش ہے، اسی طرح اگر کسی شخص کی مکمل آمدنی حرام ہو، لیکن اس کا کسی سے حلال پیسہ لے کر دعوت کرنے کا یقین ہو جائے تو پھر ایسے حلال پیسے سے تیار شدہ دعوت طعام کو قبول کرنے کی بھی گنجائش ہے، لہٰذا شادی کے موقع پر مسؤلہ بستی والے کی دعوت طعام قبول کرنے کی بھی گنجائش ہے، البتہ اگر کل یا اکثر آمدنی کا واضح دلیل سے یقینی طور پر حرام ہونا معلوم ہو جائے تو پھر ایسے شخص کا ہدیہ لینا یا اس کی دعوت طعام قبول کرنا جائز نہیں ہے: ''**آكل الربا وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يؤكل ما لم يخبره أن ذلک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه و إن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هديته والأكل منها كذا فی الملتقط** (الفتاوی العالمگیریۃ، کتاب الکراہیہ، مجمع الانہر، کتاب الکراہیہ، فصل فی الکسب ۶/ ۳۶۰، مکتبہ دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

سوال نمبر ۵ کا جواب:

لاعلمی میں کسی کی دعوت کھانے کے بعد جب یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا کاروبار حرام کا تھا اور اس نے دعوت طعام مال حرام سے تیار کیا تھا تو اب اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ اولا سچے دل سے توبہ واستغفار کرے اور ثواب کی نیت کے بغیر جتنی رقم کی دعوت طعام کھائی ہے اتنی رقم غریبوں کو دے دے، امید ہے کہ اللہ تعالی معاف فرمادیں گے۔

سوال نمبر ٦ کا جواب:

پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کرنے کے لئے کوئی حیلہ وتدبیر مفید نہیں ہے، لہٰذا اگر وہ شخص جس سے وہ مال حرام حاصل کیا ہے تو اگر وہ معلوم ہے اور یہ مال حرام بھی ممیّز ہے تو اس کو واپس کرنا لازم ہے اور اگر وہ شخص متعین نہیں ہے یا معلوم نہیں ہے تو مال حرام کے ممیّز ہونے کی صورت میں بعینہ اور مال حلال کے ساتھ مخلوط ہونے کی صورت میں اس کے بقدر بلا نیت ثواب اس شخص کی طرف سے غریب فقیر کو صدقہ کرنا لازم ہے۔

سوال نمبر ۷ کا جواب:

کسی مسلمان کیلئے یہ جانتے ہوئے کہ یہ مال حرام کمائی والا ہے پھر بھی بلا عذر شدید اس حرام رقم کو بطور قرض وصول کر کے تجارت وغیرہ میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، حرام مال کا ضابطہ یہ ہے کہ اسے اصل مالک کو لوٹایا جائے اگر مالک نہ ہو تو اسے بلا نیت ثواب صدقہ کرنا ضروری ہے، اپنی ضروریات یعنی تجارت وقرض کی ادائیگی وغیرہ میں اس مال کا استعمال کرنا جائز نہیں ہے، البتہ شدید عذر اور انتہائی مجبوری میں اس نیت سے خود حرام مال استعمال کرنے کی اجازت ہے کہ گنجائش ہو جانے پر فوری طور پر اتنی رقم صدقہ کردے گا، لیکن اس کا پورا حساب رکھنا اور ضرورت رفع ہوجانے پر فورا صدقہ کرنا ضروری ہوگا، البتہ اس مال سے اگر جائز کاروبار کیا گیا تو اس سے حاصل شدہ نفع حرام نہیں کہلائے گا، البتہ کراہت آئے گی، اس لیے حتی الامکان جلد از جلد مال حرام والا قرض ادا کرنا ضروری ہے۔

سوال نمبر ۸ کا جواب:

ایسے بزنس میں جس میں آدھا حلال اور آدھا حرام ہو کسی مسلمان کا کام کرنا ملازمت کے طور پر اور دونوں کا حساب وکتاب کرنا، لین دین کرنا یا وصولیابی کیلئے آنے جانے کی شرعا اجازت ہے، اس صورت میں اس ملازم کو جو تنخواہ ملے گی وہ بھی ناجائز نہیں، البتہ اگر کوئی شخص از راہ تقوی پرہیز کرے تو اس کے بہتر اور اولی ہونے میں کوئی شبہ بھی نہیں۔

"**و إنما المعصیه فی صورة اتخاذ المعصیة بفعل المستاجر وهو مختار فیه فقطع نسبه ذلک الفعل عن الموجر**" (فتح القدیر ۱۰/ ۷۳، مکتبہ زکریا، ردالمحتار ۹/ ۵۶۲، مکتبہ زکریا)۔

سوال نمبر ۹ کا جواب:

کسی مسلمان کیلئے حرام کمائی سے جائیداد وغیرہ خریدنا یقیناً ناجائز اور حرام ہے، لیکن ایسی جائیداد میں کسی دوسرے مسلمان کا ملازمت کے طور پر کھیتی باڑی کا کام کرکے اجرت لینے کی گنجائش ہے اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں حلال نوکری کرنا بھی جائز ہے، البتہ اجرت لینے کے سلسلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کی ساری کمائی سود کی ہے اور اسی سے مزدوری دیتا ہے تو ایسے شخص کے یہاں مزدوری نہیں کرنا چاہیے اور خالص حرام سے مزدوری وصول کرنا بھی جائز نہیں ہے اور اگر اس کی حلال وحرام دونوں طرح کی آمدنی ہے اور حلال غالب ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ مزدوری حلال پیسے سے ہی ادا کرے گا اور وہ مزدوری اس کے لئے حلال ہوگی اور اگر حرام غالب ہے تو اس کے یہاں مزدوری نہیں کرنی چاہیے: "**و إن علم أنه مغصوب عینه لا یحل أن یاکل لأنه علم بالحرمة**" (قاضی خان علی ہامش الفتاوی العالمکیریہ، کتاب الحظر والاباحۃ وما یکرہ اکلہ ۳/ ۴۰۰، مکتبہ رشیدیہ) "**غالب مال المهدی إن حلالا لا بأس بقبول هدیته وأكل ماله ما لم یتبین أنه حرام**" (مجمع الانہر ۴/ ۱۸۶، مکتبہ دارالکتب العلمیہ بیروت- الفتاوی الہندیہ ۵/ ۲۹۷، مکتبہ زکریا جدید)، حرام کمائی سے خریدی گئی بائک یا کار کا کسی بھی طرح استعمال جائز نہیں ہے، نہ پیسہ کمانے کے لئے اور نہ ہی اپنی ذاتی ضرورت کے لئے اور نہ ہی کسی دوسرے کے لئے ایسے بائک یا کار پر سوار ہونا درست ہے، البتہ جتنے پیسوں کی بائک یا کار خریدی گئی ہے اتنی رقم اگر حلال مال میں سے صاحب مال کو ادا کرے یا ان کی طرف سے صدقہ کردے تو اس بائیک اور کار کا استعمال کرنا خود اس کے لیے اور دوسرے کے لئے بھی حلال ہوجائے گا۔

اگر مدرسہ یا اسکول کے ذمہ دار کو یہ معلوم ہوجائے کے بچے کے گارجین نے خالص حرام کی کمائی کا روپیہ فیس میں ادا کیا ہے تو ایسے فیس کو وصول کرنا درست نہیں ہے، البتہ اگر گارجین حلال روپے سے فیس ادا کرے تو پھر ایسے فیس کو وصول کر لینا درست ہے (حوالہ سابق)۔

سوال نمبر ۱۰ کا جواب:

نقشہ عمارت کی منظوری کے لئے رشوت میں سودی رقم ادا کرنا گویا اس سودی رقم کا ذاتی استعمال کرنا ہے اس لئے کہ اس میں سودی رقم اس کے رب المال کی طرف نہیں لوٹ رہی ہے؛ بلکہ سرکاری یا غیر سرکاری افسروں یا انتظامیہ کی جیب میں جاتی ہے ہے، اس لیے رشوت میں سود کی رقم دینا شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ سود کی رقم یا تو مالک بینک یا حکومت وغیرہ کو

لوٹانا ضروری ہے یا پھر غریب مسکین کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے: ''**ویردونها علی أربابها إن عرفوهم و إلا تصدقوا بها**'' (ردالمحتار کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع ۶/ ۳۸۵، مکتبہ سعید)؛ ''**لا یجوز لأحد من المسلمین أخذ مال أحد بغیر سبب شرعی**'' (البحر الرائق، کتاب الحدود، باب حد القذف، فصل فی التعزیر ۵/ ۶۸، مکتبہ رشیدیہ)۔

سوال نمبر ۱۱ کا جواب:

سودی کاروبار میں ملوث اشخاص کے ہدیہ اور دعوت طعام کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر مہدی الیہ کو یہ یقین ہو کہ مہدی کے گھر والوں کی تمام یا غالب آمدنی حرام ہے اور کھانے پینے میں سودی رقم شامل ہے تو ان کے گھر کا کھانا کھانا یا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے، تاہم اگر یہ یقین ہو جائے کہ مہدی الیہ کے سامنے پیش کئے گئے کھانے یا ہدیہ میں سودی رقم شامل نہیں ہے تو اس صورت میں کسی قسم کی کوئی کراہت نہیں ہے اور اگر مہدی کا غالب آمدنی حرام نہ ہو بلکہ حرام مغلوب ہو اور جو پیش کیا جا رہا ہے حرام آمدنی سے نہ ہو تو اس کے کھانے یا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اور اگر مہدی کے لیے حلال طریقے سے حصول معاش کا کوئی اور ذریعہ بھی ہو تو پھر اس سے ہدیہ یا کوئی سامان لیتے وقت یا اس کے کسی مالی احسان کرتے وقت یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آپ کا دیا ہوا مال حلال ہے یا حرام بلکہ اس طرح پوچھنا شرعاً ممنوع ہے۔

''**عن ابی هریره رضی الله تعالی عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إذا دخل أحدکم علی أخیه المسلم فأطعمه طعاما فیأکل من طعامه ولایسأله عنه فإن سقاه شرابا من شرابه فلیشرب من شرابه ولایسأل عنه**'' (مسند احمد، حدیث نمبر: ۹۰۹۶)۔

نیز مسلمان کا ظاہر حال بھی اس پر دال ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کو حلال مال ہی میں سے کھلائے گا یا ہدیہ دے گا: ''**فلأن الظاهر أن المسلم لا یطعمه ولا یسقیه إلا ما هو حلال عنده**'' (مرقات المفاتیح، النکاح، باب الولیمہ ۶/ ۳۷۷)۔

البتہ اگر کوئی شخص ایسا ہے جس کے پاس حرام کے علاوہ کوئی حلال ذریعے آمدنی نہیں ہے اور وہ شخص دعوت طعام کرے یا ہدیہ دے تو پھر اس کی آمدنی، دعوت طعام اور ہدیہ وغیرہ کے سلسلے میں حلال وحرام کی تحقیق کر لینی چاہیے، تحقیق کے بعد ہی ہدیہ وغیرہ قبول کرنا چاہیے۔

''**و إن کان الرجل یأخذ المال من حیث وجده ولا یامل فی الحلال والحرام فالسؤال عنه حسن**'' (الاشباہ والنظائر صفحہ نمبر: ۱۵۸)۔

سوال نمبر ۱۲ کا جواب:

مسلمان کا حرام کمائی کر کے مال اکھٹا کرنا اگر چہ حرام اور گناہ ہے، لیکن جب تک گناہ کو حلال سمجھ کر یا بنیت استخفاف بالدین نہ کیا جائے تو اس سے شرعا ایمان سلب نہیں ہوتا، بلکہ وہ شخص بدستور مسلمان باقی رہتا ہے۔

اور مسلمان کے لئے دعاء کرنے کی شرعا بہر حال اجازت ہے، بلکہ حدیث میں اس کی ترغیب دی گئی ہے، اور اگر ایسے شخص کی دعوت قبول کرنے میں یا اس کے لئے دعا کرنے میں یا اس کے لئے پانی میں دم کرنے سے اس کی اصلاح کی توقع ہو تو پھر ایسا ضرور کر لینا چاہیے (مستفاد: فتاوی محمودیہ، باب الضیافات والھدایات ۱۸/ ۱۱۲۴، مکتبہ دارالافتاء جامعہ فاروقیہ کراچی)۔

☆☆☆

فقہ اسلامی میں حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد برکت علی قاسمی عفی عنہ☆

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله و أصحابه أجمعين۔

مال حرام کے متعلق سوالات کے ترتیب وار جوابات پیش خدمت ہیں:

الجواب:۱

اس صورت مسئلہ میں بندہ موجودہ مال کو مال مخلوط بالحرام سمجھتا ہے، لہٰذا مال مخلوط بالحرام کے سلسلہ میں علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اگر مال مخلوط بالحرام کے مالک معلوم نہ ہوں اور کس قدر مال حرام مخلوط ہے یہ بھی معلوم نہ ہو تو احتیاط یہی ہے کہ ایسے مال سے احتراز کیا جائے، لیکن فتوی کی رو سے ایسا مال اس کے لئے جائز ہوگا، عبارت ملاحظہ ہے: ''**و إن كان مالا مختلطا مجتمعا من الحرام ولا يعلم أربابه ولا شيئا منه بعينه حل له حكما والأحسن ديانة التنزه عنه**'' (ردالمحتار علی الدرالمختار، ۵/۹۹)۔

الجواب:۲

صورت مسئولہ میں جو مال کسی حرام یا ناجائز ذریعہ سے آ گیا ہو اور اسکو اصل مالک یا وارثوں تک پہونچانا ممکن نہ ہو تو اسکا حکم یہ ہی کہ اسے نیت ثواب کے بغیر ہی اپنی جان چھڑانے کے لئے صدقہ کر دیا جائے، البتہ حکیم الامت اشرف علی تھانوی قدس سرہ کا رجحان اس طرف ہے کہ اس قسم کا مال بحکم لقطہ ہے اور لقطہ کا حکم یہ ہیکہ وہ اصل مالک غیر معلوم کی طرف سے صدقۂ نافلہ ہے اور اس میں تملیک ضروری نہیں ہے، اس سلسلہ میں امداد الاحکام جلد سوم میں حضرت مولانا ظفر عثمانی رحمہ اللہ نے حکیم الامت کا یہ رجحان صراحۃ نقل فرمایا ہے:

''لقطہ کے بارے میں فقہاء کے اقوال سے اتنا تو ہے کہ غنی پر اسکا تصدق واجب ہے، نیز فقہائے حنفیہ کی

☆ استاذ مدرسہ مظاہر العلوم، سیلم، تامل ناڈو، الہند

تصریحات سے یہ بات بھی واضح ہوئی ہے کہ جو ملک خبیث واجب التصدق ہو وہ مصرف کے لحاظ سے من کل الوجوہ زکوۃ کی طرح نہیں ہے، لہٰذا تقریباً تمام فقہاء نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ یہ مال متصدق اپنی اولاد کو بھی دے سکتا ہے، چنانچہ علامہ حموی لکھتے ہیں: ''**لو كان غنيا لم يحل له ذلك بل يتصدق على الفقير أجنبيا ولو زوجة أو قريبا ولو أصلا أو فرعا و مثله فى الدر المختار ۲۷۸/۴۔ و إلا تصدق بها على فقير ولو على أصله و فرعه و عرسه الخ**'' (فتاوی عثمانی ۱۳۹/۳)، یہی رجحان حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کا ہے، لہٰذا مذکورہ شخص اگر چاہے تو اپنی جائداد کو اپنی ہی غریب بیوی یا غریب اولاد کو صدقہ کر سکتا ہے۔

الجواب: ۳

اگر حرام کی آمدنی سے شوہر یا بیٹا کھانا کھلاتا ہے اور وہ رشوت اور غصب نہ ہو تو گنجائش ہے، یعنی بعینہ حرام مال لینا جائز نہیں ہے، البتہ اسکے عوض کی چیزوں میں وسعت ہے اور حرام آمدنی سے کھلانے کا وبال شوہر یا بیٹے پر ہوگا ''**فى الخانيه من كتاب الحظر والإباحة، امرأة زوجها فى أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلك الطعام غصبا فهو فى سعة من أكله.**

حرام کمائی سے اپنے بچے کو خوب پڑھایا لکھایا الخ

الجواب: جس قدر مال بطریق حرام کمایا اسکی واپسی لازم ہے، اگر وہ شخص مر گیا ہو جس سے مثلاً مال حرام یا مثلاً رشوت یا غصب کے طور پر لیا ہو تو اسکے ورثاء کو دیا جائے، ورثاء بھی موجود نہ ہوں یا کوشش کے باوجود انکا علم نہ ہو سکے تو غریبوں محتاجوں کو صدقہ کر دیا جائے، لیکن اس مال کے ذریعہ دوسرا حلال مال کمایا گیا تو اسکو حرام نہ کہا جائے گا، لہٰذا بچہ کی کمائی حلال سمجھی جائے گی، جیسا کہ ردالمحتار میں ہے:

''**رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترى فهذا على خمسة أوجه وقال بعضهم لا يطيب فى الوجوه كلها وهو المختار ولكن الفتوى اليوم على قول الكرخى دفعا للحرج على الناس**'' (ردالمحتار ۲۳۵/۵)۔

الجواب: ۴

احوط یہی ہے کہ ایسی دعوتوں میں شرکت نہ کرے، اگر کوئی شرکت کر لے تو جائز ہے: ''**ففى الذخيره سئل الفقيه أبو جعفر عمن اكتسب ماله من أمراء السلطان أو من الغرامات المحرمات و غير ذلك هل يحل**

لمن عرف ذلک أن یاکل من طعامه قال أحب إلی فی دینه أن لایأکل و یسعه حکما إن لم یکن ذلک الطعام غصبا أو رشوة'' (ردالمحتار علی الدرالمختار ۵/۹۹)۔

الجواب:۵

اگر کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ فلاں آدمی کا کاروبار بالکل حرام ہے تو توبہ اور استغفار کرنا چاہئے اور تلافی کے لئے اتنی رقم صدقہ کر دینا چاہئے: ''**والملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجه نفسه جاز ثم إن کان غنیا تصدق بمثله و إن کان فقیرا لا یتصدق**'' (الاختیار لتعلیل المختار ۳/۶۱، کذا فی فتاوی عثمانی ۳/۱۲۶)۔

الجواب:۶

حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے میں کوئی حیلہ مفید نہیں ہے (امداد الفتاوی، ۴/۱۴۴، وکذا فی فتاوی عثمانی ۳/۱۲۵)۔

الجواب:۷

اس مسئلہ کا حکم بندہ کے نزدیک وہی ہے جو سوال نمبر ۲ کے جواب میں گزرا کہ اگر حرام مال کو اس کے اصلِ مالک یا وارثوں تک پہونچانا ممکن نہ ہو تو ایسا مال بحکم لقطہ ہے، لہٰذا یہ مذکورہ مال متصدق غریب یا اپنی غریب اولاد کو بھی دے سکتا ہے، اس طریقہ سے دے کر بطور قرض لے لے اور تجارت کر لے۔

الجواب:۸

اصل اباحت ہے اور **الیقین لا یزول بالشک** کی بنا پر جب تک حرام کا غالب ہونا یقینی نہ ہو اس مخلوط سے تنخواہ لینا حلال ہے، جیسا کہ امداد الفتاوی ۵/۳۴۲، اسی طرح الاختیار شرح المختار ۴/۱۸۷، الہندیہ ۵/۳۴۲ میں ہے۔

الجواب: مزدوری دینے والا جب تک ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کرے کہ یہ پیسے میں تم کو خالص حرام کمائی کے دے رہا ہوں اس وقت تک وہ حرام نہ ہوگا، مالک آپ کی مزدوری کے پیسے دے تو آپ کو کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ چپکے سے لے کر اسے اپنی جیب میں رکھیں اور اپنے استعمال میں لائیں، وہ مزدوری کے پیسے جائز ہی سمجھے جائیں گے: ''**و تنتقل حرمته من ذمة إلی ذمة و إن تداولته الأیدی و تبدلت الأملاک بشرط العلم**'' (ردالمحتار ۵/۹۷)۔

جزئیہ ۳: حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا۔

الجواب: اگر یقینی طور پر معلوم ہو کہ حرام مال سے خریدی گئی ہے تو جائز نہیں ہے، علامہ شامی فرماتے ہیں: ''**وتنتقل حرمته من ذمة إلى ذمة و إن تداولته الأيدى و تبدلت الأملاک بشرط العلم والخبث فيه لعدم الملک**'' اور اگر یقینی طور پر معلوم نہ ہو تو کراہت سے خالی نہیں ہوگا ''**فى الشاميه عن الحموى ،وما نقل عن بعض الحنفية إن الحرام لا يتعدى إلى ذمتين سالت عنه الشهاب ابن الشلبى فقال هو محمول على ما إذا لم يعلم بذالک**'' (ردالمحتار ۵/ ۹۸)۔

جزئیہ ۴:

الجواب۔ فیس وصول کرنے کا مسئلہ بھی ماقبل والے مسئلہ (حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک میں سفر کرنے کا) حکم رکھتا ہے۔

الجواب: ۱۰

سود کی رقم یا تو اصل مالک کو لوٹا دی جائے گی یا پھر غریبوں میں تقسیم کر دی جائے گی، اسے رشوت میں دینا جائز نہیں ہے:

''**لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد على صاحبه**'' (فصل فی البیع ۶/ ۳۸۵)۔

الجواب: ۱۱

حرام کاروبار والے شخص کی دعوت یا ہدیہ کے مسئلہ میں آمدنی کا اعتبار ہوتا ہے، یعنی اگر کسی شخص کی کل یا اکثر آمدنی حرام ہے تو اسکی دعوت یا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں، البتہ کہیں سے حلال رقم کا انتظام کر لے اور اس سے دعوت کرے یا ہدیہ دے تو گنجائش ہے، اور اگر کل یا اکثر آمدنی جائز ہے تو ایسے شخص کی دعوت یا ہدیہ قبول کرنے کی گنجائش ہے اور اگر کوئی پرہیز کرے تو اچھی بات ہے، اگر کسی شخص کے بارے میں یہ بات یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس کا کوئی کاروبار حرام پر مبنی ہے تو ایسے شخص کے یہاں دعوت میں حلال وحرام کی بابت سوال کرنا درست نہیں، کیونکہ اس میں مسلمان کی ایذاء اور توہین ہے، رسول ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

''**أهدى إلى رجل شيئا أو أضافه الخ**'' (الاختیار شرح المختار ۴/ ۱۸۷)، وفی الفتاوی الہندیہ ۵/ ۳۴۲۔ وکذا فی کتاب الفتاوی ۶/ ۲۰۰)

الجواب: ۱۲

سودخور سے تعلقات رکھنے اور اس کی تقریباتِ خوشی میں شرکت کرنے کا بھی بتقاضائے مصلحت متعلق ہے، یوں تعلق تو کافر ومشرک سے بھی رکھا جا سکتا ہے، پس اگر سودخور سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اسکی خصلت بد سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہوتو تعلق رکھنا جائز ہے اور اسکی اصلاح کی امید کی نیت ہوتو بہتر ہے، کیونکہ بری صحبت سے نفع کی امید نہیں اور نقصان کا اندیشہ ہے، لہٰذا بتقاضائے مصلحت سودخور کے گھر جانا اور اس کے لئے دعا کرنا جائز ہونا معلوم ہوتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''**إنما المومنون إخوة فاصلحوا بين اخويكم**''، درمختار میں ہے: **ويكره السلام على الفاسق لو معلناو إلا لا**'' (۴۱۵/۶)۔

☆☆☆

معیشت وتجارت میں حرام مال کے اثرات

مفتی نیاز احمد ندوی☆

۱-وراثت کے ذریعہ ملا ہوا مال حرام

اگر اس مسئلہ کو وراثت کے حرام مال کے حصول اور اس کے استعمال سے متعلق جان کر روشنی ڈالی جائے تو فقہ کی کتابوں میں کچھ تفصیلات ملتی ہیں، جیسے: اگر کسی کے والد نے حرام مال کمایا ہو تو ایسی کمائی کا استعمال ورثاء کے لئے جائز نہیں؛ بلکہ اگر صاحب مال کا علم ہو تو اس کو واپس کرنا ضروری ہے، ورنہ بلا نیت ثواب فقراء پر صدقہ کر دیا جائے، واضح رہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ مال حرام مخلوط نہ ہو، بلکہ معلوم ہو اور اگر مال حرام مال حلال کے ساتھ مخلوط ہو تو مال حرام کے بقدر صدقہ کر کے یا مالک کا علم ہونے کی صورت میں اس کو واپس کر کے اس تمام مال کو ورثاء کے لئے استعمال میں لانا جائز ہو جائے گا۔

فتاوی شامی میں ہے:"**مات و كسبه حرام فالميراث حلال ثم رمز و قال لا نأخذ بهذه الرواية وهو حرام مطلقاً على الورثة فتنبه**" (کتاب البیوع باب البیع الفاسد تحت مطلب فی من ورث مالا حراما ۷/ ۲۲۳)۔

اس کے برعکس قرآنی کچھ آیات جیسے:"**لاتزر وازرة وزر أخرى**"۔

"**ومن يكسب إثما فإنما يكسبه على نفسه**"۔

"**ولاتكسب كل نفس إلا عليها**" ۔

"**و أن ليس للإنسان إلا ما سعى**" ۔

ان آیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وارث کے لئے اس مال سے استفادہ باعث گناہ نہیں اور اس کی اس مال سے کمائی حلال ہوگی، لیکن ساؤتھ انڈیا یعنی تامل ناڈو کے عرف کو اگر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ماضی میں باپ اپنی اولاد کو جیسے جیسے وہ بلوغت میں قدم رکھتی اپنی تجارت میں ساتھ رکھتا اور ان بچوں کا کوئی الگ سے کاروبار نہ ہوتا تھا، معلوم ہوا کہ اس وارث کو تقریباً ساری تفصیلات معلوم ہوا کرتی کہ مال کی آمد ورفت کہاں سے کتنی ہے۔

☆ مہتمم مدرسہ ابوبکر صدیقؓ بنگلور

لہٰذا ایسی صورت میں یہ حکم ہوگا کہ آخرت کی کامیابی اور حصول تقوی کی خاطر جتنے مال میں شک اور تردد ہو اس کو صدقہ وخیرات کے ذریعہ مال پاک کر کے اپنی تجارت کو مکمل حلال کر لے۔

"ومن تزکی فإنما یتزکی لنفسه"۔

(جو شخص پاک ہوتا ہے تو اپنے ہی لئے پاک ہوتا ہے)۔

نوٹ: سوال میں یہ ہے کہ اس کو معلوم نہیں کہ آزادی سے پہلے کا ہے یا بعد کا اور مسائل عرف سے ہٹ کر بھی سوال پوچھا گیا ہوگا۔

لہٰذا عرف کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا جواب تلاش کیا جائے تو مورث کو تقریباً اندازہ ہوگا کہ مال کب سے زیادہ بڑھا ہے وغیرہ۔

۲-مال حرام سے انتفاع:

قرآن مجید میں رسولوں سے کہا گیا کہ پاک رزق کھاؤ اور حلال رزق کا استعمال کرو، اسی طرح الگ سے مؤمنین سے کہا گیا کہ پاکیزہ رزق کھاؤ۔

"یا أیها الرسل کلوا من الطیبات"۔

"یا أیها الذین آمنوا کلوا من الطیبات"۔

جب انبیاء اور مؤمنین کو رزق طیب پر تاکید کی گئی ہے تو اس کی اہمیت میں دو رائے نہیں، مگر اس کے برعکس ایک غریب شخص کے لئے اسلام نے گنجائش دی ہے، اب اگر فقہی اصول "الضرورات تبیح المحظورات" کے تحت دیکھا جائے تو اس کو اس غربت کی صف سے نکلنے تک کی گنجائش ہے، وہ اس مال کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں علماء کی رائے یہ ہے کہ جس طرح مال حرام غریب کو بغیر ثواب کی نیت کے دینے کی اور اس کو استعمال کرنے کی اجازت ہے، اسی نکتہ سے استفادہ کرتے ہوئے، ساڑھے سات تولے سونے کی قیمت کے بقدر مال وہ اپنے پاس رکھ لے اور بقیہ کو بغیر ثواب کی نیت کے اس سے زائد ضرورت مند شخص کو دے دے، تاکہ حلال رزق کے ساتھ ساتھ اللہ کی پکڑ سے بھی بچ سکے اور رہی بات مکان کے کرایہ کی اس کو بھی بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کر دے اور جو ذاتی ضرورت کی اشیاء ہیں جیسے گھر وغیرہ ایک ہو تو اس میں خود رہے، اگر زائد ہوں اور کرایہ پر دے رکھا ہو تو فی الحال کرایہ صدقہ کر دے، اور اپنی حلال کمائی سے گھر کی قیمت صدقہ کرنے کے بعد سے کرایہ بھی خود اپنے لئے استعمال کر سکتا ہے۔

۳-ماں یا بیوی کے لئے بیٹے یا شوہر کی حرام کمائی سے نفقہ لینا:

اگر گھر کا فرد حرام کمائی کر رہا ہے تو مسلسل اس کو اس فعل سے اجتناب کی گزارش کرتے رہیں اور ساتھ ہی ساتھ دعاء بھی ہی کرتے رہیں، اگر پھر بھی وہ نہ رکتا ہو اور حرام کمائی لاکر اہل خانہ کو کھلاتا ہو تو ایسی صورت میں وہ خود گناہ گار ہوگا، اہل خانہ نہیں۔

"**إمرأة زوجها فی أرض الجور إذا أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلک الطعام غضبا أو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهی فی سعة من ذلک و الإثم علی الزوج**" (شامیہ:۵/۷۳۲)۔

دوسری شق میں اگر اپنے بچے کو حرام کمائی سے پڑھاتے وقت حرام سے نہ پڑھوانے کا علم نہیں تھا تو ایسی صورت میں اس کی کمائی حلال ہوگی۔

اگر جان بوجھ کر بھی حرام سے پڑھوایا ہے تو اب دو صورتیں ہیں:

ایک یہ کہ اس کا گناہ بچے کے سر نہیں ہوگا، لہٰذا اس کی کمائی کراہۃً درست ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس پڑھائی سے جو کام کر کے کھاتے ہیں اس کے علاوہ کسی ایسی نوکری میں چلا جائے جو بدنی محنت کی ہو، تاکہ زندگی بھر اس کا حلال اور حرام کی کمائی کا خدشہ نہ رہے۔

۴-حرام کاروبار میں ملوث افراد کی دعوت میں شرکت:

از روئے شرع حرام مال سے کی گئی دعوت میں شرکت ناجائز ہے، ہاں اگر یہ کہا جارہا ہے کہ مکمل آمدنی حلال ہے یا حرام ہے، لیکن اس کا علم نہیں، تو ایسی صورت میں حسنِ ظن کا تقاضا یہ ہے کہ اجازت کراہۃً دی جائے، لیکن ایسی دعوتوں سے اجتناب کرنا اولی معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ فتاوی ہندیہ میں ہے:

"**أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس إلا أن يعلم بأنه حرام، فإن كان الغالب هو الحرام ينبغی أن لايقبل الهدية، ولا يأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أو استقرضته من رجل، كذا فی الينابيع**" (کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات ۵/۳۴۲-۳۴۳، ط: دار الفار)۔

۵-دعوت کھانے کے بعد حرام کا علم ہو تو اس کی تلافی کی صورت:

ایسی دعوت کھاتے ہی اگر فوراً معلوم ہو جائے تو ممکن ہو سکے تو قے کر کے نکال دے، جیسے: حضرت ابوبکر صدیقؓ

نے فرمایا تھا:

" ..... **فأدخل أبوبكر يده فقاء كل شئ فى بطنه**" (صحیح بخاری)۔

اس کے علاوہ کچھ دن تک صدقہ کرتے رہے، تاکہ اس گناہ کی ایک حد تک تلافی ہو سکے، جیسے قرآن کی اس آیت کریمہ سے اس پر روشنی ملتی ہے: "**إن الحسنات يذهبن السئيات**" (سورۃ الہود: ۱۱۴)۔

۶- پہلے کے کمائے ہوئے حرام مال کو حلال کے دائرے میں لانے کی تدبیر یا حیلہ:

(۱) صاحب مال حرام کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: یا تو اس شخص کے علم میں نہیں تھا کہ اس کی کمائی حرام ہے، تو ایسے شخص کو چاہئے کہ جیسے ہی اس کا علم ہو توبہ کر لے، علماء کہتے ہیں اس کی توبہ کے بعد مال حلال ہو جائے گا۔

(۲) دوسرا وہ شخص جس کو معلوم تھا کہ اس کی کمائی حرام ہے، مگر پھر بھی وہ اس میں لگا ہوا تھا، آخر کار اس نے سچے دل سے توبہ کر لی تو علامہ شیخ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اس کی توبہ کے بعد سابقہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ بھی معاف ہو جائے گا۔

"**التوبة النصوح تهدم ما كان قبله**"۔

جہاں تک حیلہ کی بات ہے، احقر کی رائے ہے کہ کسی غریب کو ہدیہ کے طور پر حرام مال دے دے اور خفیف اشارہ سے اس کو اس بات کی وضاحت کر دے کہ حیلۃً یہ ہدیہ ہے اس کے بعد وہ کچھ اپنے پاس رکھ کر بقیہ لوٹا دے۔

یہ اور بات ہے کہ حرام مال کے ہدیہ کے سلسلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، جو لوگ لینے کے قائل ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہود سے تحائف لئے ہیں۔

"دومہ (تبوک کے قریب ایک مقام) کے اکیدر (نصرانی) نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ بھیجا تھا" (صحیح بخاری، حدیث: ۲۶۱۶)۔

۷- حرام مال کو بطور قرض لے کر استفادہ کرنا:

ذکر کردہ صورت میں اس کو مجبور شخص مانا جائے گا اور "**الضرورات تبيح المحظورات**"، اسی طرح حدیث کے اصول "**أهون البليتين**" کے تحت کراہۃً اس کی مجبوری کو مانتے ہوئے یہ حکم لگایا جائے گا کہ جیسے ہی اس کی ضرورت پوری ہو اس کو صدقہ کر کے کثرت سے توبہ استغفار کرتا رہے۔

۸-حرام وحلال کاروبار میں ملازمت:

مذکورہ صورت میں یہ واضح نہیں کہ اس کی تنخواہ حلال سے مل رہی ہے یا حرام سے، لہٰذا حسن ظن کے ساتھ کہ تنخواہ حلال سے مل رہی ہوگی وہ اس میں لگا رہے اور اسے وہاں کام کی تنخواہ لینے کی اجازت ہوگی، رہی بات اس کے لئے یہ تاکید کی جائے گی کہ مالک کو حلال وحرام کا اسلام میں جو وضاحتیں ہیں وہ بتاتا رہے اور کوشش کارگر ہوتی نظر نہ آتی ہو تو یہ کہا جائے گا کہ کوئی حلال نوکری تلاش کرنے کے بعد وہ نوکری چھوڑ دے۔

۹-حرام کمائی سے خرید کردہ جائیدادوں میں کام کرنا اور حرام کمائی والے سے فیس اصول کرنا:

جائیداد کی بیع کے وقت یہ وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ حرام مال سے خرید رہا ہوں، بلکہ مطلق بیع ہوئی اور بعد میں رقم کی ادائیگی کے وقت وہ حرام مال دے دے تو اس میں کھیتی باڑی درست ہونے کا حکم لگایا جائے گا، مزور کو چاہئے کہ جس کمائی میں شک ہے اسے چھوڑ دے، کیونکہ اس میں اطمینان نہیں۔

"**و عن الحسن بن علی رضی الله عنه قال حفظت من رسول الله صلی الله علیه وسلم: د ع ما یریبک إلی مالایریبک فإن الصدقة طمانینة و إن الکذب ریبة**" (رواہ احمد والترمذی والنسائی)۔

اسی طرح اگر کوئی حرام کمائی سے فیس ادا کر رہا ہے تو اس کی وضاحت کے لئے ایک فارم رکھا جائے اور اس میں اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے کہ اپنی عمدہ کمائی کے ذریعہ اپنے بچوں پر خرچ کرے، کیونکہ یہاں مستحق طلبہ بھی قیام کرتے ہیں یا داخلہ فارم میں اس کی ایک شق داخل کر کے ادارہ بری ہو جائے۔

۱۰-کارپوریشن یا حکمت کے متعلق اداروں کو رشوت میں سودی رقم دینا:

پہلی بات یہ ہے کہ حتی المقدور بغیر رشوت کے اپنے رسوخ کے استعمال سے مسئلہ حل کروائے، اگر نہ ہو رہا ہو تو حلال رقم سے مجبوراً رشوت ادا کرے، پھر بھی کام نہ بنے جیسا کہ آج کل کے حالات ہیں، اس کے بغیر چارہ بھی نہیں اور رقم بھی غبن فاحش کی طرح حد سے زیادہ لی جاتی ہے، ایسی صورت میں دو غلط میں سے ایک جو کم غلط ہو اس کو اختیار کر لیا جائے، کیونکہ حالات حاضرہ میں دینی اداروں کی بنیاد رکھنا اور نسل نوع کی اسلامی انداز کی تربیت کرنا از حد ضروری ہے، لہٰذا اس فقہی قواعد کے پیش نظر اس کی اجازت ہونی چاہئے۔

"**یتحمل الضرر الأدنی لدفع الضرر الأعلی**"۔

۱۲-حرام کمائی کرنے والوں کے لئے دعا کرنا یا دم کرنا:

عام طور پر اسلامی تقریبات میں لوگ اپنی جائز آمدنی خرچ کرتے ہیں، ایسی صورت میں ان کے گھر جانا دعوت کھانا سب درست ہے۔

رہی بات پانی پر دم کرنے کی تو اس میں کوئی حرج نہیں، پانی پر دم کرنے کے ساتھ اس شخص کے لئے بھی دعا کر دی جائے۔

اس نیت سے اس کے گھر جایا جائے کہ دھیرے دھیرے اس کو صحیح بات پر متوجہ کرایا جائے۔

اگر غالب علم نہ ہو کہ اس کی مکمل کمائی حرام ہے یا حلال تو حسن ظن کے ساتھ جانے کی اجازت ہو۔

"**دعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال و بالعكس يجيب مالم يتبين أنه حرام، كذا في التمرتاشي**" (الفتاوی الہندیہ، کتاب الکراہیۃ الباب الثانی عشرہ ۵/ ۳۴۳)۔

☆☆☆

حرام آمدنی سے متعلق بعض مسائل

مفتی محمد اطہر حسین رشیدی قاسمی☆

جواب:۱

اس مسئلہ کا مدار تین باتوں پر ہے:

الف: حرام مال ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی طرف منتقل ہوتا ہے یا نہیں؟ بلکہ جس شخص نے حرام کمایا ہے اسی تک وہ محدود رہے گا، تو اگرچہ اس مسئلہ میں کچھ اختلاف ہے، لیکن زیادہ صحیح حکم اس بارے میں یہی ہے کہ حرام مال ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، اور جس طرح وہ مال کمانے والے کے لئے حرام تھا اسی طرح اس کے وارثین کی طرف بھی اس کی حرمت منتقل ہوکر وہ حرام مال ہی شمار ہوگا، خاص طور پر جب کہ اس مال کے حرام ہونے کا علم بھی ہو: ''**الحرمة تتعدد مع العلم بها، نقل الحموی عن سیدی عبد الوهاب الشعرانی أنه قال فی کتابه المنن ومانقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لا یتعدی إلیٰ ذمتین سألت عنه الشهاب ابن الشلبی فقال هو محمول علیٰ ما إذا لم یعلم بذالک أمالو رأی المکاس مثلاً یأخذ من أحد شیئاًمن المکس ثم یعطیه آخر ثم یأخذ ذالک الآخر فهو حرام**'' (الدرالمختار مع الشامی ۷/۳۱۰ مطلب الحرمۃ تتعدد، باب البیع الفاسد)۔

ب: وہ مال عین حرام ہو: مثلاً وہ مال سود، رشوت، غصب وغیرہ کا ہو، اور اس کے مالک کا علم ہو یا نہ ہو پھر بھی وہ مال حرام ہی شمار ہوگا اور اس کا استعمال کرنا ناجائز ہوگا، اور اگر ایسے مال حرام پر قبضہ کرکے اپنے مال میں اس طرح شامل کرلیا ہے کہ امتیاز ناممکن ہے تو وہ شخص مالک تو ہوجائے گا، لیکن یہ ملکیت حرام ہوگی، اور اس مال کا بدل مالک کو ادا کئے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھانا بھی حلال نہیں ہوگا۔

''**مات وکسبه حرام فالمیراث حلال ثم رمز وقال لانأخذ هذه الروایة وهو حرام مطلقاًعلیٰ**

☆ صدر مفتی مدرسہ مظاہر العلوم سلیم تمل ناڈو

الورثة فتنبه اه ح ومفاده الحرمة و إن لم يعلم أربابه وينبغي تقييده بما إذا كان عين الحرام ليوافق مانقلناه إذ لو اختلط بحيث لايتميز يملكه ملكاً خبيثاً لكن لايحل له التصرف فيه مالم يؤد بدله كماحققناه'' (شامی ۷/ ۳۰۲ قبیل باب زکاۃ المال، مطلب فیمن ورث مالاحراما)۔

ج: اوراگرمورث نے خالص ناجائز وحرام پیسہ: مثلارشوت سودوغصب وغیرہ کاروپیہ وارث کے لئے چھوڑا ہے، یاایسامخلوط روپیہ دیتا ہے جس میں زیادہ حرام ہے اورکم حلال تو اس کو استعمال کرنا جائز نہیں، اگر کسی وجہ سے لے لیا ہے تو واپس کردے، اگر واپس نہیں کرسکتا تو خود اپنے مصرف میں نہ لائے، بلکہ جن سے باپ نے لیا ہے ان کو واپس کردے، وہ موجود نہ ہوتو اس کے ورثہ کو دے دے، اگر اصل مالک اوراس کے ورثہ کا علم نہ ہوتو مسکینوں کو اصل مالک کی طرف سے صدقہ کردے:'' **إلا في حق الوارث أي فإنه إذاعلم أن كسب مورثه حرام يحل له لكن إذاعلم المالك بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه وهٰذامعنى قوله و قيد به في الظهيرية الخ وفي منية المفتي مات رجل ويعلم الوارث أن أباه كان يكتسب من حيث لايحل ولكن لايعلم الطالب بعينه ليرده عليه حل له الإرث والأفضل أن يتورع و يتصدق بنية خصماء أبيه وكذالايحل إذاعلم عين الغصب مثلاً و إن لم يعلم مالكه لمافي البزازية: أخذمورثه رشوةً أوظلماً إن علم ذالك بعينه لايحل له أخذه و إلا فله أخذه حكماً أمافي الديانة فيتصدق به بنية إرضاء الخصماء والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده عليهم وإلا فإن علم عين الحرام لايحل له ويتصدق به بنية صاحبه و إن كان مالاً مختلطاً مجتمعاً من الحرام ولا يعلم أربابه ولاشيئاً منه بعينه حل له حكماً والأحسن ديانةً التنزه عنه**'' (شامی ۷/ ۳۰۱، باب البیع الفاسد، مستفاد محمودیہ ۱۸/ ۴۴۱)۔

جواب: ۲

غریب شخص کو معلوم ہے کہ اس کی پوری جائیداد اور مال حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے اوراسی حرام جائیداد سے اس کو کرایہ وغیرہ مل رہا ہے، اب جو کچھ اس کے پاس موجود ہے وہ سب حرام ہی شمار ہوگا، اس سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ حلال وحرام مال کا حساب لگائے اور جس قدر مال حرام ہو تمام کو غریبوں پر صدقہ کردے، اگر ایک وقت میں پورا مال صدقہ کرنا ممکن ہے تو صدقہ کردے، اوراگر ممکن نہ ہوتو تھوڑا تھوڑا کرکے صدقہ کرتا رہے، یہاں تک کہ مقدار حرام مکمل صدقہ کردے، اگراس مال کا اصل مالک معلوم ہے تو اس کو دے کر واپس کرنا ضروری ہے، اگر مالک معلوم نہیں، البتہ وہ مال بجنسہ جو حرام ہے معلوم ہے تو کسی فقیر کو صدقہ کرنا اصل مالک کو ثواب پہنچانے کی نیت سے ضروری ہے، اوراگر مال مخلوط ہے، یہ معلوم نہیں کہ کونسا

حرام اور کونسا حلال ہے تو ورثاء کو استعمال کرنا درست ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ اس سے احتیاط کرے، یعنی اگر مالک کا علم ہو تو اس کو دے دے ورنہ صدقہ کردے، اگر تمام مال حرام ہے تو اس کا استعمال درست نہیں، مالک معلوم ہونے کی صورت میں واپسی ضروری ہے، نہ معلوم ہونے کی صورت میں صدقہ کردیا جائے: ''**و إذا مات الرجل و كسبه خبيث فالأولىٰ للورثة أن يردوا المال إلىٰ أربابه فإن لم يعرفوا أربابه تصدقوا به و إن كان كسبه من خبيث لايحل وابنه يعلم ذالک ومات الأب ولا يعلم الابن ذالک بعينه فهو حلال فی الشرع والورع أن يتصدق به بنية خصماء أبيه**'' (ہندیہ ۵/۳۴۹، مستفاد محمودیہ ۲۰/۳۴۰)۔

جواب: ۳

شوہر یا بیٹا حرام طریقہ پر کمائی کر رہا ہے، ماں یا بیوی کے روکنے کے باوجود ماحول کی وجہ سے وہ اس کاروبار سے باز نہیں آرہا ہے اور اس غریب خاتون کے لئے کمائی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے، تو اس صورت میں اس عورت کے لئے شوہر یا بیٹے کی کمائی غصب شدہ نہ ہو تو کھانے کی گنجائش ہے، اگرچہ بعینہ غصب کا مال کھانا جائز نہیں، عورت پر گناہ نہیں ہوگا، بلکہ گناہ شوہر یا بیٹے پر ہوگا: ''**وفی الخانية امرأة زوجها في أرض الجور إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلک الطعام غصباً فهی فی سعة من أكله وكذا لو اشترىٰ طعاماً أو كسوةً من مال أصله ليس بطيب فهی فی سعة من تناوله والإثم على الزوج**'' (شامی ۷/۳۰۲، باب البیع الفاسد و۹/۵۵۳ فصل فی البیع)۔

رہا یہ مسئلہ کہ حرام کمائی سے اپنے بچہ کو تعلیم دیا خوب پڑھایا یا لکھایا اعلیٰ تعلیم دی، تو اس کا ولی جس نے اس بچہ کو حرام کمائی سے تعلیم دیا وہی اس کا ذمہ دار اور گنہگار ہوگا، لیکن اب پڑھنے کے بعد بچہ جو کمائی کر رہا ہے، چونکہ وہ اپنی محنت و کام کی مزدوری لے رہا ہے، لہٰذا اس کی کمائی حلال شمار ہوگی۔

جواب: ۴

اکثر بستی والے زیادہ تر حرام کاروبار میں ملوث ہونے کی وجہ سے شادی وغیرہ میں جو دعوت دیتے ہیں تو اگر معلوم ہو جائے کہ اس کی پوری یا اکثر کمائی حرام ہے تو اس کی دعوت کھانا جائز نہیں ہے، الا یہ کہ وہ خود بتادے کہ میں نے جس مال سے دعوت کی ہے، وہ حلال ہے تو پھر دعوت قبول کرنا جائز ہے، اور اگر اس کا اکثر مال حلال ہے تو اس شخص کی دعوت کھانے کی گنجائش ہے: ''**آكل الربٰو وكاسب الحرام أهدىٰ إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولايأكل مالم يخبره أن ذالک المال أصله حلال ورثه أو استقرضه و إن كان غالب ماله حلالاً لابأس بقبول هديته**

والأكل منها" (ہندیہ ۵/ ۳۴۳، الباب الثانی عشر)، اور اگر کچھ معلوم نہ ہو سکے کہ اس کی پوری کمائی حرام ہے یا آدھا حصہ حرام اور آدھا حلال ہے تو اس وقت ایسی دعوت سے پرہیز کرنا بہتر ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں موجود ہے کہ شبہ کی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے: "**عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه دعوا الرباو الريبة**" (مشکوٰۃ: ۱/ ۲۴۶ باب الربا)۔

جواب: ۵

کسی آدمی کی دعوت کھانے کے بعد معلوم ہو کہ اس شخص کا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ جتنے روپئے کا کھانا کھایا ہے اس کا اندازہ کر کے اگر واپس کرنا ممکن ہو تو واپس کر دے، خواہ اسی کو دے یا اس کے بچوں کو دے دے، کسی طرح بھی کسی نام سے واپس کر دے، اگر کسی وجہ سے واپس کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی طرف سے غریب کو صدقہ کر دے: "**ويردونها على أربابها إن عرفوهم و إلا تصد قوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد علىٰ صاحبه**" (شامی ۹/ ۵۵۳ فصل فی البیع)۔

جواب: ۶

پہلے کے کمائے ہوئے مال حرام کو حلال کے دائرہ میں لانے کی کوئی تدبیر یا حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا؛ جب تک کہ حرام مال کی مقدار مال کو مالک کے پاس واپس نہ کر دے، یا بوقت تعذر اس کی طرف سے صدقہ نہ کر دے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے: "**عن ابن عباس قال من نبت لحمه من السحت فالنار أولىٰ به**" (مشکوٰۃ المصابیح: ۱/ ۲۴۶، باب الربا)، حرام مال پوری طرح اس وقت حلال ہو سکتا ہے کہ بقدر حرام مال کو فقراء پر صدقہ کر دے، اور اگر کسی شخص کا حق ہے تو اس کو واپس کر دے یا معاف کرائے، یا اس کے ورثہ کو دے دے یا معاف کرائے (مستفاد فتاوی دار العلوم: ۱۷/ ۳۷۳)۔

اور بعض علماء نے اگرچہ حرام رقم کو حلال کرنے کا حیلہ بتایا ہے کہ کسی غیر مسلم سے قرض لے اور حرام رقم سے قرضہ ادا کر دے، مگر حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اس حیلے سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی (فتاویٰ عثمانی: ۳/ ۱۲۵)۔

جواب: ۷

ایک شخص کے پاس حرام کمائی کا مال ہے وہ اس کو صدقہ کر کے ختم کرنا چاہتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور ایسا ہی کرنا ضروری بھی ہے، لیکن اگر تجارت کے لئے قرض کے طور پر حلال مال ملنے کا امکان نہیں ہے تو جان بوجھ کر معلوم ہوتے ہوئے بھی اس اپنے حرام مال کو خود ہی قرض لینا اور اس سے کاروبار کر کے پیسے کمانا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ مال واجب

التصدق ہے، البتہ اگر مجبوری یا لاعلمی کی وجہ سے کسی نے ایسا کرلیا ہے اور پیسہ بھی کمالیا ہے تو اس کی کمائی کا پیسہ حلال ہوگا اور اصل مال جو حرام ہے اس کو صدقہ کرنا واجب ہوگا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''**یاأیھاالذین اٰمنوالاتأ کلوا أموالکم بینکم بالباطل**'' (سورۃ النساء:۲۹)۔

جواب:۸

ایک آدمی کا بزنس آدھا حلال اور آدھا حرام ہے اور اس میں کام کرنے والے کو کبھی کبھی دونوں حصہ کا کام کرنا پڑتا ہے، جیسے کبھی دونوں کا حساب لکھنا پڑتا ہے، یا دونوں کے لئے لین دین کرنا پڑتا ہے، یا دونوں کی وصولی کے لئے جانا پڑتا ہے، تو اس نے جس قدر حلال کام انجام دیا ہے اس کے بقدر اس کی کمائی حلال شمار ہوگی، اور جس قدر حرام کام کا ارتکاب کیا ہے اس کے بقدر اس کی کمائی حرام ہوگی، جس کو واپس کرنا یا صدقہ کرنا ضروری ہوگا: ''**القاعدۃ الثانیۃ: إذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام**'' (الاشباہ والنظائر:۳۶۶)۔

جواب:۹

حرام کمائی سے خریدے ہوئے جائیداد میں کام کرنا جیسے کھیتی باڑی کرنا، اور حرام کمائی کرنے والے کے گھر میں نوکری کرنا علم ہونے کے باوجود ناجائز اور حرام ہے، کیونکہ معلوم ہے کہ اس کی تنخواہ حرام مال سے ہی دی جائے گی، لہٰذا یہ اعانت علی المعصیۃ میں بھی داخل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ولاتعاونواعلیٰ الإثم والعدوان**'' (سورۃ المائدہ:۲)۔ اسی طرح حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ ان کی بائک یا کار میں بیٹھ کر سفر کرنا علم کے باوجود جائز نہیں ہے، نیز اگر حرام کمائی کرنے والا شخص اپنے بچہ کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کرائے تو ان سے فیس وصول کرنا بھی ناجائز ہے، کیونکہ مال حرام ہے تو اس کو واپس کرنا یا صدقہ کرنا ہی واجب ہے: ''**القاعدۃ الرابعۃ عشر: ماحرم أخذہ حرم اعطاءہ**'' (الاشباہ والنظائر:۴۷۲)۔

جواب:۱۰

آج کل مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کارپوریشن یا حکومت کے متعلقہ اداروں سے ایک خطیر رقم رشوت دے کر لی جاتی ہے، تو اس حکومتی ادارہ کو رقم ادا کرنے کی صورت میں اگر حکومتی خزانہ میں وہ رقم پہنچ جاتی ہے تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ حرام کمائی کا اصل حکم مالک کو لوٹانا ہے، لہٰذا یہ جائز ہے: ''**غصب دراھم إنسان من کیسہ ثم ردھا فیہ بلاعلمہ برئ وکذا لوسلمہ إلیہ بجھۃ أخریٰ کھبۃ و إیداع وشراء وکذالوأطعمہ فأکلہ**''

(الدر المختار علی الشامی ۹/ ۲۶۷ مطلب فی رد المغصوب)۔

جواب:۱۱

کسی بستی کے اکثر لوگ سودی کاروبار میں ملوث ہوں اس کے باوجود کسی کے ہدیہ دینے پر ہر مرتبہ یہ پوچھنا کہ آپ کا مال حلال ہے یا حرام واقعتہً ناگواری اور اختلاف کا باعث بنتا ہے، لیکن دوسرے عام لوگوں سے تحقیق کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کس کا کاروبار حرام ہے، لہٰذا لوگوں سے تحقیق کرلے، اگر حرام کاروبار والا ہو تو اس سے ہدیہ لینا ناجائز اور حرام ہے، اور اگر معلوم ہو جائے کہ یہ شخص حلال کاروبار والا ہے تو اس کا ہدیہ لے لے اور اس سے نہ پوچھے کہ تمہارا مال حلال ہے یا حرام، کیونکہ حدیث میں ہے کہ مسلمان حلال ہی کھاتا اور کھلاتا ہے، اس لئے خواہ مخواہ صرف شبہ کی بنیاد پر نہ پوچھے، اسی طرح بچوں کو ٹافی وغیرہ دے دیتا ہو، کبھی پانی چائے پلاتا ہو اور کبھی ضروی چیزیں جیسا کہ دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرتا ہو تو جب تک اس کے مال کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو تو خواہ مخواہ شبہ کرنا جائز نہیں: ''**عن أبی هريرة قال قال النبی** ﷺ **إذا دخل أحدكم علىٰ أخيه المسلم فليأ كل من طعامه ولايسئل ويشرب من شرابه ولايسئل رواه البيهقی فی شعب الايمان**'' (مشکوۃ المصابیح: ۲/ ۲۷۹ باب الولیمۃ)۔

البتہ اگر اس کے مال کے حرام ہونے کا یقین ہو تو پھر اسے استعمال کرنا جائز نہیں: ''**آكل الربوٰ وكاسب الحرام أهدى إليه أو أضافه وغالب ماله حرام لايقبل ولايأكل مالم يخبره أن ذالک المال أصله حلال ورثه أواستقرضه و إن كان غالب ماله حلالاً لا بأس بقبول هديته و الأكل منها**'' (ہندیہ ۵/ ۳۴۳، الباب الثانی عشر)۔

جواب:۱۲

جس کا مال یا کمائی حرام ہو اس کی دعا یقیناً قبول نہیں ہوتی، اب اگر حرام کمائی کرنے والا اپنے بچہ کے نام رکھنے کے موقع پر دعا کراتا ہے یا پانی پر دم کرنے کے لئے کہتا ہے، تو اس سے جہاں تک ممکن ہو بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ اس طرح کے عمل سے گویا ہمارا بھی اس کے برے فعل اور حرام پر راضی رہنا لازم آتا ہے جو کہ اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''**ولاتعاونوا علىٰ الإثم والعدوان**'' (سورۃ المائدہ:۲)۔

☆☆☆

حرام کمائی سے متعلق چند مسائل

مفتی محمد ابراہیم بن سلیمان ورتیٹھی فلاحی☆

ریاست تامل ناڈو کے ضلع کرور کے علاقے میں آزادی سے پہلے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی جاری کیا گیا تھا اور اس بنیاد پر غیر مسلموں سے سود لینے کی اجازت دی گئی تھی، اس کے نتیجے میں حرام کاروبار کا دروازہ کھل گیا، ملک کے آزاد ہونے کے بعد اس سلسلے میں علماء کی رائے تبدیل ہوگئی، انھوں نے ہندوستان کو دارالامان قرار دیا اور سود کو منع کیا؛ لیکن لوگوں کو سودی کاروبار کی عادت پڑ گئی تھی، اس سے نجات نہیں مل سکی: چناں چہ یہاں کے بہت سے لوگ حرام کاروبار میں ملوث ہیں، اس پس منظر میں چند سوالات کے جوابات پیش خدمت ہیں:

جواب(۱):

"(الحرام ينتقل) أى تنتقل حرمته وإن تداولته الأيدى وتبدلت الأملاک" (شامی ۷/ ۳۰۰، زکریا، دیوبند)۔

"إن علم أن العين التى يغلب على الظن أنهم أخذوها من الغير بالظلم قائمة وباعوها فى الأسواق فإنه لاينبغى شراؤها منهم وإن تداولته الأيدى" (طحطاوی علی الدر ۴/ ۱۹۲، بحوالہ فتاوی عثمانی، ۸/ ۳۱۵، دارالاشاعت دیوبند)۔

"(الحرمة تتعدد) نقل الحموى عن سيدى عبد الوهاب الشعرانى أنه قال فى كتابه المنن: وما نقل عن بعض الحنفية من أن الحرام لا يتعدى ذمتين، سألت عنه الشهاب ابن الشبلى فقال: هو محمول على ما إذا لم يعلم بذلک، (إلا فى حق الوارث)' (الدرمع الرد ۷/ ۳۰۰، ۳۰۱، زکریا، دیوبند)۔

"لو خلط السلطان المال المغصوب بماله،ملكه (إلى) لأن الخلط استهلاک إذا لم يمكن تمييزه عند أبى حنيفة رحمه الله تعالى وفى الشامية عن المجتبى: مات وكسبه حرام فالميراث حلال"۔

☆ خادم حدیث وفقہ دارالعلوم مرکز اسلامی انکلیشور، گجرات

مذکورہ عبارتوں سے حسبِ ذیل چند باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) حرام مال بعینہ موجود ہے اور اس کا مالک معلوم ہے، تو اس صورت میں حرمت ایک ذمہ سے دوسرے ذمہ کی طرف منتقل ہوتی ہے؛ اس لیے اس مال کو واپس کرنا واجب ہے۔

(۲) اور اگر حرام مال کا مالک معلوم نہیں اور حرام مال بعینہٖ موجود ہے، تو حرمت کے منتقل ہونے کی وجہ سے مال لینے والے کے لیے حلال نہیں ہے؛ اس لیے صاحب مال کی نیت سے صدقہ کرنا واجب ہے۔

(۳) اور اگر حرام مال علاحدہ رکھا نہیں ہے؛ بلکہ مال حلال وحرام باہم مخلوط ہوگیا، اس طور پر کہ باہم تمیز ممکن نہیں ہے اور خلط استہلاک ہے؛ اس لیے خالط اس کا مالک بن جائے گا، اور وہ مال باصلہ حلال ہونے کی وجہ سے اس کے لیے خالص حرام نہیں رہے گا، البتہ مالک معلوم ہے، اس لیے قبل ادائے ضمان اس سے انتفاع حرام ہے، اور جب ایک چیز اول کے لیے باصلہ حلال ہو تو دوسرے کی ملک میں جانے سے وہ حلال وطیب ہوگی، اور حرمتِ عارضہ ختم ہوجائے گی۔

(۴) اور اگر مالک معلوم نہیں ہے تو قضاءً اس کے لیے حلال ہے؛ لیکن دیانۃً اس کے لیے احتراز کرنا بہتر ہے، اور مالک کی نیت سے صدقہ کرنا چاہے تو جائز ہے۔

اب صورتِ مسئلہ کا جواب آسان ہے کہ آباء واجداد نے سودی رقومات سے کاروبار کیا ہے، اور سودی رقومات ذوی الامثال سے ہیں جس میں خلط سے حرمت منتقل نہیں ہوتی ہے؛ اس لیے وارث کے لیے یہ مال حلال رہے گا، اور اس سے جو بھی کمائی حاصل کیا ہے وہ حلال ہے، واللہ اعلم بالصواب (مستفاد از امداد الفتاوی جدید مطول حاشیہ، ۹/۱۰۹، زکریا، دیوبند)۔

جواب (۲):

"إن المراد ليس هو نفس الحرام؛ لأنه ملكه بالخلط، وإنما الحرام التصرف فيه قبل أداء بدله، ففي البزازية قبيل كتاب الزكوة: ما يأخذه من المال ظلما، ويخلطه بماله أو بمال مظلوم آخر، يصير ملكا له، وينقطع حق الغير؛ فلا يكون أخذه عندنا حراما محضا" (شامیۃ)۔

صورت مسؤلہ میں حرام جائیداد پانے والا خود ہی غریب ہے، اور حرام مال کا مصرف غرباء ہی ہیں؛ اس لیے غریب شخص کے لیے حرام جائیداد سے حاصل ہونے والا کرایہ حلال رہے گا، پھر بھی دیانۃً تنزُّہ اور احتیاط اولیٰ ہے۔

جواب (۳)

خداوند قدوس کی مہربانی ہے کہ اس نے عورت پر معاشی تگ ودو اور باہر کی ذمہ داری نہیں ڈالی، عورت کو کسی کا کفیل

نہیں بنایا، حتیٰ کہ خود اس کا اپنا بھی نہیں، بیوہ یا مطلقہ ہونے کی صورت میں بھی نہیں، ایسی صورت میں بیٹا، باپ یا بھائی پر اس کی کفالت کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے، اور کسی عورت کے خاندان میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں جو اس کی کفالت کر سکے، تو اسلامی حکومت پر ذمہ داری عائد کردی گئی کہ اس کی ضروریات کو پورا کرے، ہمارے یہاں اسلامی حکومت نہیں ہے کہ اس کی ضروریات کی وہ کفالت کرے، اور دوسری طرف شوہر یا بیٹا کمائی کے حلال طریقے اپنانے کو تیار نہیں، تو ایسی صورت میں حرام مال کھا کر اپنے جسم کو جہنم کی آگ کا مستحق نہ بنائے۔

الغرض! جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ حلال کی فکر اور حرام مال سے بچنے کی کوشش جاری رکھے، اور جب تک انتظام نہ ہو توبہ اور استغفار کے ساتھ بہ قدرِ ضرورت استعمال کرتی رہے۔

"وفی الخانیة: إمرأة زوجها فی أرض الجور، إن أكلت من طعامه ولم يكن عين ذلک الطعام غصبا فهی فی سعة من أكله، وكذا لو اشترى طعاما أو كسوة من مال أصله ليس بطيب فهی فی سعة من تناوله، والإثم على الزوج" (شامی ۷/ ۳۰۲، زکریا دیوبند، بحوالہ فتاویٰ عثمانی ۳/ ۱۲۷، نعیمیہ دیوبند)۔

"وفی جامع الجوامع: اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبيث جاز للمرأة أكله ولبسها، والإثم على الزوج.....الخ" (شامی ۷/ ۲۷۹، کتاب الغصب، زکریا دیوبند)۔

(۲) اور بچے کو حرام کمائی خرچ کر کے خوب پڑھایا، لکھایا، اعلیٰ تعلیم دلوائی، یہ فعل معصیت ہے جو ناجائز ہے، اس کا گناہ ہوگا؛ مگر بچے کے لیے ڈگری حاصل کر کے اس سے کمائی کرنا حلال طریقے سے ہو تو جائز ہے؛ ورنہ ناجائز ہوگی۔

جواب (۴)

"قال الناطفی رحمه الله: إذا أهدى الرجل إلى إنسان أو أضافه، إن كان غالب مال المهدى من الحرام ينبغی له أن لايقبل الهدية، ولا يأكل من طعامه ما لم يخبر أنه حلال، ورثه أو استقرضه من غيره؛ وإن كان غالب مال المهدى من الحلال لابأس بأن يقبل الهدية ويأكل، ما لم يتبين عنه أنه حرام؛ لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام، فيعتبر الغالب" (قاضی خان ۳/ ۲۸۹، فیصل دیوبند)۔

"وفی الأشباه فی القاعدة الثانية من النوع الثانی: إذا اجتمع عند أحد مال حرام وحلال فالعبرة للغالب مالم يتبين" (الأشباہ والنظائر ۱/ ۱۴۷)۔

حرام آمدنی کی چند صورتیں ہیں:

۱- خلط متیقن ہو، خواہ حلال غالب ہو یا حرام، تو بہر حال دعوت قبول کرنا حرام ہے۔

۲- خلط مشتبہ ہو، اور حرام غالب ہو یا دونوں برابر ہوں، تو ان دونوں صورتوں میں دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

۳- خلط مشتبہ ہو اور حلال غالب ہو تو دعوت قبول کرنا جائز ہے۔

۴- اور حرام مال جدا اور ممتاز ہے تب بھی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

۵- حلال وحرام میں سے کسی کے غلبہ کا علم نہ ہو تو چوں کہ مال مخلوط ہے، اور خلط استہلاک ہے؛ اس لیے جواز تو رہے گا، پھر بھی تورُّع یہ ہے کہ دعوت قبول نہ کرے، اجتناب کرے، اور فساد کا حکم نہ لگائے جب تک کہ عین مال کے حرام ہونے کا یقین نہ ہو جائے، یہی پانچویں صورت سوال کا جواب بنے گی۔

جواب (۵)

اگر دعوت کھانے کے بعد فوراً معلوم ہو تو اس کھانے کو قے کے ذریعے نکال باہر کردے، جیسا کہ ایک بار حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا غلام، آپؓ کی خدمت میں دُودھ لایا، آپؓ نے اسے پی لیا، غلام نے عرض کیا: میں پہلے جب بھی کوئی چیز پیش کرتا تو آپؓ اس کے مُتَعلِّق دریافت فرماتے تھے؛ لیکن اِس دودھ کے مُتَعلِّق کوئی استِفسار نہیں فرمایا؟ یہ سن کر آپؓ نے پوچھا: یہ دودھ کیسا ہے؟ غلام نے جواب دیا کہ: میں نے زمانۂ جاہلیّت میں ایک بیمار پر مَنتر پھونکا تھا، جس کے مُعاوضے میں آج اس نے یہ دودھ دیا ہے، حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے یہ سن کر اپنے حَلق میں انگلی ڈالی، اور دودھ اگل دیا، اِس کے بعد نہایت عاجزی سے دربارِ الٰہی میں عرض کیا: ''اے اللہ عزوجل! جس پر مَیں قادر تھا وہ مَیں نے کر دیا، اس کا تھوڑا بہت حصّہ جوزَگوں میں رہ گیا ہے وہ مُعاف فرمادے'' (بخاری، مناقب الانصار، ایام الجاھلیۃ، حدیث: ۳۸۴۲، ۲/۵۷۱، منھاج العابدین، الفصل الخامس، البطن وحفظہ، ص ۹۷)۔

اور اگر کمائی کے بالکل حرام ہونے کی اطلاع تاخیر سے ہوئی کہ کھانا ہضم ہو گیا تو وہ کھانا جتنی رقم اور قیمت کا بازار (ہوٹل) میں ملتا ہے اتنی رقم کا تصدق کردے، اور توبہ واستغفار کرتا رہے؛ تاکہ غلطی کی کدورت بھی ختم ہو جائے، واللہ أعلم وعلمہ أتم۔

جواب (۶)

"فی شرح حیل الخصاف لشمس الأئمة رحمه الله تعالی: أن الشیخ أبی القاسم الحکیم کان یأخذ جائزة السلطان، و کان یستقرض لجمیع حوائجه، و ما یأخذ من الجائزة یقضی بها دیونه، والحیلة فی هذه المسائل: أن یشتری نسیئة ثم ینقد ثمنه من أی مال شاء، وقال أبو یوسف رحمه الله

تعالى: سألت أبا حنيفة رحمه الله تعالى عن الحيلة فى مثل هذا، فأجابنى بما ذكرنا، كذا فى الخلاصة .فقيل له (أى لأبى نصير): لو أن فقيراً يأخذ جائزة السلطان مع علمه أن السلطان يأخذها غصبا، أيحل له؟ قال: إن خلط ذلك بدراهم أخرىٰ فإنه لا بأس به، وإن دفع عين المغصوب من غير خلط لم يجز" (عالمگیری ۵/ ۳۴۲، زکریا دیوبند، الباب الثانی عشر فی الہدایا والضیافات)۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے حرام مال کو حلال کے دائرہ میں لانے کی مختلف تدبیریں معلوم ہوئیں، جو حسب ذیل ہیں:

پہلی تدبیر: شیخ ابوالقاسم حکیمؒ بادشاہ کی طرف سے ملنے والے ہدیے قبول کرتے تھے، اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے لوگوں سے قرضہ لیتے تھے، اور بادشاہ کی طرف سے ملنے والے ہدیوں کے مال سے قرض کی بھرپائی کرتے تھے۔

دوسری تدبیر یہ ہے کہ حرام رقومات حلال رقومات میں خلط (ملانا) ہوجائے، خلط ہونے سے خالط مالک بن جاتا ہے، اور مغصوب منہ کو غاصب، غصب کے بہ قدر واپس کردے۔

تیسری تدبیر: یا مال مغصوبہ یا مسروقہ کی مالک اجازت دے دے اور بخش دے تو بھی مالِ حرام، حلال ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں کے ظاہر سے کچھ تدبیریں اور حیلے جواز کے معلوم ہورہے ہیں؛ مگر فتاویٰ عثمانی (۳/ ۱۲۵) میں عدم جواز کا قول منقول ہے۔

پس صورتِ مسئولہ کا جواب یہ ہے کہ صاحبِ امداد الفتاویٰ اور صاحبِ فتاویٰ عثمانی کی تحریرات کے بہ موجب حرام کو حلال کرنے کا کوئی حیلہ اختیار کرنا مفید نہیں ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

جواب (۷)

"**والملك الخبيث سبيله التصدق به، ولو صرفه فى حاجة نفسه جاز، ثم إن كان غنيا تصدق بمثله، وإن كان فقيرا لا يتصدق**" (الاختیار لتعلیل المختار، کتاب الغصب، ۴/ ۱۹ دار الکتب العلمیۃ، بیروت)۔

مذکورہ عبارت سے تو جواز مترشح ہوتا معلوم ہورہا ہے؛ لیکن فتاوی عثمانی (۳/ ۱۲۴) سے پتہ چلتا ہے کہ حرام رقم غلطی سے آجاوے تب بھی توبہ واستغفار کے ساتھ صدقے کے ذریعے تلافی کرے، جبکہ صورت مسئولہ میں حرام رقومات کا استعمال بھول سے نہیں؛ بلکہ بالقصد ہے، تب تو اجازت دے دینا بے جا جرأت استعمال کرنا کہلائے گا اور سنگین نتائج پیدا ہوں گے، **أعاذ الله منه جميع المسلمين**۔

اور قرض میں ایک دائن اور ایک مدیون ہوتا ہے، اور یہاں یہ صورت نہیں پائی جارہی ہے؛ نیز قرض میں مملوک رقم کا لین دین ہوتا ہے، اور یہاں تو یہ بھی نہیں ہے؛ نیز حرام رقومات کا مصرف تو غریب ہے، اور یہاں تو تجارت کرنے کے لیے

لینا ہے، معلوم ہوا کہ غریب نہیں ہے؛ اس لیے صورت مسئولہ میں خود کے پاس موجود حرام رقومات کے ذریعہ تجارت کرنا، اور اس سے حاصل شدہ منافع سے صدقات کر کے تلافی کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

جواب (۸)

اگر حلال بزنس اور حرام بزنس دونوں الگ الگ ہیں، مخلوط نہ ہوں، تب تو آسانی ہے کہ حلال کے لیے حساب لکھنا، لین دین کرنا اور وصولی کرنا جائز ہے، اور حرام کے لیے یہ سب امور ناجائز ہیں، اور اگر اموال مخلوط غیر متمیز ہیں، اور بہ قول فقہائے کرام: خلط استہلاک ہے جس سے حرمت آگے منتقل نہیں ہوتی؛ اس لیے حلال وحرام دونوں کا حساب لکھنا، لین دین کرنا اور دونوں کی وصولی کرنا جائز ہے، اور کام کرنے والے کے لیے حق المحنت کے عنوان سے اجرت لینے کی گنجائش رہے گی، واللہ اعلم بالصواب

"**وفی الأشباہ: وأما مسألة ما إذا اختلط الحلال بالحرام فی البلد، فإنه یجوز الشراء والأخذ إلا أن تقوم دلالة علیٰ أنه من الحرام، کذا فی الأصل**" (الأشباہ والنظائر ۱/ ۱۴۸، بحوالہ احسن الفتاوی ۸/ ۳۲۴، دار الاشاعت، دیوبند)۔

اس سے ثابت ہوا کہ خلط کے اندر غلبہ کی قید نہیں ہے، علامہ حمویؒ نے بھی اس کے حاشیہ میں تمرتاشی سے جو صورت خلط ذکر کی ہے، اس میں بھی غلبہ کی قید نہیں ہے۔

"**وفی الحاشیة للحموی: (قوله وأما مسألة ما إذا اختلط الحلال بالحرام الخ) فی التمرتاشی فی باب مسائل متفرقة من کتاب الکراهیة ما نصه: لرجل مال حلال اختلطه مال من الربوا أو الرشاء أو الغلول أو السحت أو من مال الغصب أو السرقة أو الخیانة أو من مال یتیم، فصار ماله کله شبهة، لیس لأحد أن یشارکه أو یبایعه أو یستقرض منه أو یقبل هدیته أو یأکل فی بیته**" (حوالہ بالا)۔

جواب (۹)

(۱) پہلی صورت میں حرام کمائی سے زمین خریدنا حرام ہے جس کا گناہ ہوگا؛ لیکن اس زمین میں خود کھیتی کر کے پیداوار حاصل کرنا یا بٹائی پر دے کر کرایہ حاصل کرنا، کراہت کے ساتھ جائز ہوگا۔

(۲) مزدوری دینے والا جب تک ہاتھ میں پیسے لے کر یہ صراحت نہ کرے کہ: یہ پیسے مَیں تم کو خالص حرام کمائی کے دے رہا ہوں، اس وقت تک وہ حرام نہ ہوگا، مالک آپ کی مزدوری کے پیسے دے تو آپ کو خود کر ید کرنے کی ضرورت نہیں ہے،

آپ چپکے سے لے کر اسے اپنی جیب میں رکھیں، اور اپنے استعمال میں لائیں، وہ مزدوری کے پیسے جائز ہی سمجھے جائیں گے۔

(۳) حرام کمائی کرنے والے کی بائک یا کار میں اس کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرنا کراہت کے ساتھ جائز ہے۔

(۴) مدرسہ یا اسکول والوں کے لیے حرام کمائی کرنے والے کے بچے کی فیس وصول کرنا بھی جائز ہے؛ اس لیے کہ رقوم متعین نہیں ہوتیں؛ مگر تنبیہًا یا احتیاطًا انکار کی بھی گنجائش ہے۔

اِن مذکورہ صورتوں میں گرچہ فی نفسہ جواز رہے گا، پھر بھی تنزُّہ اولیٰ اور بہتر ہے؛ تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو، اور ان کو بریک لگے، اور ایک صالح معاشرہ کی راہیں ہموار ہوں۔

جواب (۱۰)

اگر ضرورت شدید ہو اور کوئی دوسرا متبادل راستہ نہ ہو، تو اپنے جائز ثابت شدہ حق کے حصول کے لیے مجبوراً رشوت دینے کی گنجائش ہے؛ لیکن رشوت میں سود کی رقم دینا شرعاً جائز نہیں ہے؛ اس لیے کہ سود کی رقم میں اصل تو یہ ہے کہ اس کے مالک (بینک یا حکومت وغیرہ) کو لوٹانا ضروری ہے، اور بہ صورتِ تعذُّر غریبوں مسکینوں کو بلانیتِ ثواب دے دینا ضروری ہے، رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضہ میں نہیں جاتی؛ بلکہ افسران کے جیب میں جاتی ہے؛ اس لیے صورت مسئولہ میں سود کی رقم رشوت میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، فتاوی شامی میں ہے:

"**دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له ليس برشوة، يعنى فى حق الدفع**" (کتاب الحظر والإباحۃ، فصل فی البیع ۹/ ۶۰۷، زکریا، دیوبند)۔

جواب (۱۱)

صورت مسئولہ میں پوچھے بغیر ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے، محض امکانِ حرام کی وجہ سے حرام نہیں ہوجائے گا؛ اس لیے کہ فتاویٰ بزازیہ میں ہے کہ: ہدیہ دینے والے کے مال میں حلال کا غلبہ ہو تو اس کے ہدیہ کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جب تک کہ صریح طور پر حرام مال میں سے ہونے کی وضاحت نہ ہوجائے؛ اس لیے کہ لوگوں کے اموال کچھ نہ کچھ حرمت وکراہت کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتے، اور ویسے بھی مؤمن کے مال میں عامۃً حلال ہی کو غلبہ ہوتا ہے؛ اس لیے حلال وحرام کی تفتیش کیے بغیر ہدیہ قبول کیا جاسکتا ہے؛ البتہ اگر یہ بات پہلے سے معلوم ہوجائے کہ مہدی کا ہدیہ حرام لعینہٖ سے ہے، اور دینے والا فاسق معلن بھی ہے، تو ایسے وقت میں ہدیہ قبول کرنا ناجائز اور حرام ہوگا۔

"**غالب مال المهدى إن حلالا، لابأس بقبول هديته وأكل ماله، ما لم يتبين أنه من حرام؛ لأن**

أموال الناس لا يخلو عن حرام" (مجمع الأنہر: ۴/ ۱۸۶، کتاب الکراہیۃ، فصل فی الکسب، م: فقیہ الأمۃ، دیوبند)۔

"**لایجب دعوۃ الفاسق المعلن؛ لیعلم أنه غیر راض بفسقه، وکذا دعوۃ من کان غالب ماله من حرام ما لم یخبر أنه حلال، وبالعکس یجیب ما لم یتبین عنده أنه حرام**" (الفتاوی الہندیۃ، کتاب الکراہیۃ، الباب الثانی عشر، ۵/ ۳۴۳)۔

"**عن أبی ہریرۃ رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: إذا دخل أحدکم علی أخیه المسلم، فلیأکل من طعامه ولا یسأل، ویشرب من شرابه ولا یسأل**" (مشکاۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب الولیمۃ، الفصل الثالث: ۲/ ۲۲، ادارہ فیصل)۔

اس طرح بچوں کو ٹافی دینا، پانی چائے پلانا اور کبھی ضروری چیزیں مثلاً دیا سلائی یا سوئی وغیرہ دے کر مدد کرنا، جب کہ دینے والے کی کمائی کیسی ہے یہ معلوم نہیں ہے، تو ان چیزوں کا استعمال کرنا بھی جائز ہے؛ کیوں کہ ایک فقہی قاعدہ ہے: "**أمور المسلمین محمولة علی السداد والصلاح حتی یظهر غیره**" (القواعد الفقہیہ، ص: ۳۲، مکتبۃ الاتحاد، دیوبند) نیز مذکورہ حدیث شریف میں "**علی أخیه ال**" کہا گیا ہے، کہ مسلم بھائی اسلامی اخوت کے ناطے ناجائز چیزوں سے خود بھی پرہیز کرے گا، اور اپنے مسلم بھائی کو بھی پرہیز کرائے گا۔

جواب (۱۲)

حرام کمائی کرنے والے کی دعا قبول نہیں ہوتی؛ اس لیے وہ اپنے بچے کے نام رکھنے کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر کسی حافظ اور عالم وغیرہ سے دعا کراتا ہے، یا پانی پر دم کراتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ حرام کمائی کرنے کی وجہ سے اس کا اپنا گنہگار ہونا الگ بات ہے، اور کسی سے دعا کرانا یہ الگ بات ہے، اس میں تو یہ دیکھا جائے گا کہ کلماتِ دعا اور دَم، شریعت کے خلاف نہیں ہونا چاہیے؛ بلکہ جو حرام کمائی میں مبتلا ہے وہ زیادہ محتاج ہے کہ اس کے لیے حرام کمائی سے خلاصی کی دعا کی جائے۔

☆☆☆

حرام کاروبار سے متعلق بعض احکام

مفتی کامران سعید رشادی

حامدا لله و مصليا على رسول الله، أما بعد!

مسلمان کی زندگی امانت و دیانت کا آئینہ ہوتی ہے، وہ کبھی کسی کو دھوکہ یا فریب نہیں دیتا، کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کرتا، کبھی کسی کے ساتھ وعدہ خلافی یا بدعہدی نہیں کرتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایسا ہی نظام متعارف فرمایا، اور صحابہ کرام کی شکل میں ایسے ہی اوصاف سے متصف افراد پر مشتمل معاشرہ تشکیل دیا، جنہوں نے بڑے سے بڑے نقصان اور خسارے کو گوارا کیا؛ لیکن نبوی تعلیمات سے سرِ مو انحراف گوارا نہ کیا، جس کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا بھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دی۔

آج بھی ہر ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی نبوی تعلیمات کے مطابق بنائے، کسب وانفاق میں حلال وحرام کی تمیز کرے اور اپنے مال کو پاکیزہ رکھے، تاکہ وہ مال دنیا وآخرت کے وبال کا ذریعہ نہ بنے، چنانچہ کسب حلال وحرام سے متعلق چند مسائل درج ذیل ہیں:

(۱) دارالحرب میں سودی لین دین اور ہندوستان:

جب ہندوستان پر انگریزوں کا کامل تسلط تھا اور ہندوستان کے تمام داخلی وخارجی امور کا مکمل اختیار انہیں کے پاس تھا تو ان حالات میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دینا گو درست تھا؛ لیکن آزادی کے بعد ہندوستان قانوناً دارالحرب نہ رہا، بلکہ جمہوریت اور مشترکہ حکومت والا ملک بن گیا۔

سودی کاروبار دارالحرب میں بھی حرام ہے، اس لئے کہ اس کی حرمت پر نص قطعی وارد ہے: ''**أحل الله البيع و حرم الربا**'' (البقرۃ:۲۷۵)، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک دارالحرب میں حربی سے سود لینا چند قیود کے ساتھ جائز ہے:

(۱) معاملہ کا محل دارالحرب ہو۔

(۲) معاملہ حربی سے ہو، چاہے وہ کافر ہو یا غیر مہاجر مسلمان۔

(۳) معاملہ کرنے والا وہ مسلمان ہو جو دار الحرب میں ویزے پر رہائش پذیر ہو یا وہ مسلمان ہو جو دار الحرب میں اسلام لایا ہو اور دار الاسلام کی جانب ہجرت نہ کیا ہو۔

امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور ائمہ ثلاثہ غیر حنفیہ بہر حال سود کے حرام ہونے کے قائل ہیں۔

حضرات طرفین رحمہما اللہ تعالیٰ کی دلیل حضرت مکحول رحمہ اللہ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "**لا ربا بين أهل الحرب**" (نصب الرایہ للزیلعی: ۴/ ۴۴) (حربیوں سے حاصل کیا جانے والا سود حرام نہیں)، نیز یہ کہ حربیوں کے اموال مباح غیر محفوظ ہیں، دار الاسلام میں حربی مستامن کا مال عقد امان کی بنا پر محفوظ ہوتا ہے، پس جب دار الحرب میں یہ وجہ مفقود ہے تو ان کا مال ان کی رضامندی کے ساتھ بطریق سود حاصل کرنا مباح ہے: "**وأما شرائط جريان الربا فمنها: أن يكون البدلان معصومين، فإن كان أحدهما غير معصوم لا يتحقق الربا عندنا، وعند أبي يوسف هذا ليس بشرط. وعلى هذا الأصل يخرج ما إذا دخل مسلم دار الحرب تاجراً فبايع حربياً درهماً بدرهمين أو غير ذالك من سائر البيوع الفاسدة في حكم الإسلام أنه يجوز عند أبي حنيفة و محمد. وعند أبي يوسف: لا يجوز، وعلى هذا الخلاف المسلم الأسير في دار الحرب أو الحربي الذي أسلم هناك ولم يهاجر إلينا فبايع أحدا من أهل الحرب**" (بدائع الصنائع: ۷/ ۸۰) "**قال رحمه الله: (وبين الحربي والمسلم ثمة) أي لا ربا بينهما في دار الحرب ولم يهاجر إلينا فكذالك الحكم عند أبي حنيفة رحمه الله لأن ماله غير معصوم عنده على ما عرف في موضعه**" (تبیین الحقائق: ۴/ ۴۷۲) "**ولا ربا بين حربي و مسلم مستامن ثمة (أي في دار الحرب) لأن ماله ثمة مباح فيحل برضاه مطلقاً بلا عذر خلافاً للثاني والثلاثة، وحكم من أسلم في دار الحرب ولم يهاجر كحربي فللمسلم الربا معه خلافاً لهما، لأن ماله غير معصوم. فلو هاجر إلينا ثم عاد إليهم فلا ربا اتفاقاً، جوهرة**" (الدر مع الرد: ۷/ ۴۲۳)۔

مذکورہ بالا قیودات کے ساتھ ہندوستان میں کفار سے سود لینا آزادی سے پہلے مباح تھا، لیکن آزادی کے بعد جب ہندوستان دار الحرب نہ رہا تو سودی لین دین مطلقاً حرام ہو گیا، اب اس حرام کاروبار سے حاصل شدہ مال آزادی سے پہلے حاصل کئے گئے مباح سود اور آزادی کے بعد لئے گئے حرام سود سے مخلوط ہے۔

مال مخلوط سے کسب معاش:

اس مخلوط مال میں آزادی کے بعد حاصل کئے گئے حرام سود کا ضمان لازم ہوگا، یعنی وہ مال حرام اس کے اصل مالک کو

واپس کرے، اور اگر اصل مالک کو لوٹانا متعذر ہو تو بلا نیت اجر وثواب فقراء پر تصدق کرے، اس کے بغیر اس مالِ مخلوط سے کسب معاش حلال نہیں: ''**قال الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: أو اختلط المغصوب بمال الغاصب بحيث يمتنع امتيازه كاختلاط بره ببره أو يمكن بحرج كبره بشعيره ضمنه وملكه بلا حل انتفاع قبل أداء ضمانه**'' (الدرمع الرد:۹/۲۷۹)، لیکن جب یہ معلوم نہیں کہ یہ سود کا پیسہ آزادی کے بعد کمایا ہوا ہے یا آزادی سے پہلے تو ان کے درمیان تناسب کا اندازہ کرے، اگر غالب آزادی سے پہلے کا ہو تو آزادی کے بعد حاصل شدہ مال کا تخمینہ لگا کر اس کا ضمان ادا کرے اور اگر غالب آزادی کے بعد کا ہو تو پورے مال کا ضمان لازم ہوگا، ضمان کی ادائیگی کے بغیر اس مال سے حلال کاروبار کرنا بھی درست نہیں، البتہ اگر کوئی شخص اس مال سے حلال کاروبار کرتا ہے تو اس سے حاصل ہونے والی کمائی کو حرام نہیں قرار دیا جائے گا: ''**اكتسب حراماً واشترىٰ بهاو بالدراهم المغصوبة شيئاً، قال الكرخي رحمه الله: إن نقد قبل البيع تصدق بالربح و إلا لا**'' (الدرعلی الرد:۷/۴۹۰)۔

(۲) مال حرام سے خرید کردہ چیز کا کرایہ:

حرام کاروبار کے ذریعہ حاصل کی گئی جائیداد اگر مال حرام کو متعین کر کے اس کے بدلہ میں خریدی گئی ہو اور پھر وہی متعینہ حرام مال بطورِ ثمن ادا کیا ہو تو اس جائیداد کا کرایہ ناجائز ہے، اور اگر مال حرام کو متعین کئے بغیر جائیداد خریدی گئی ہو اور پھر مال حلال بطور ثمن ادا کیا ہو تو اس جائیداد کا کرایہ جائز ہے، اور اگر مال حرام کو متعین کیا ہو، لیکن بطورِ ثمن مال حلال ادا کیا ہو تو بھی اس جائیداد کا کرایہ جائز ہے، اور اسی طرح اگر مالِ حلال کو متعین کیا، لیکن مال حرام کو بطور ثمن ادا کیا تو بھی اس جائیداد کا کرایہ جائز ہے: ''**رجل اكتسب مالا من حرام ثم اشترىٰ فهٰذا علىٰ خمسة أوجه: إما إن دفع تلك الدراهم إلىٰ البائع أولاً ثم اشترىٰ منه بها أو اشترىٰ قبل الدفع بها ودفعها، أو اشترىٰ قبل الدفع بها و دفع غيرها، أو اشترىٰ مطلقاًودفع تلك الدراهم...قال الكرخي رحمه الله تعالىٰ: في الوجه الأول والثاني لا يطيب، وفي الثلاث الأخيرة يطيب و...الفتوىٰ على قول الكرخي رحمه الله دفعاً للحرج عن الناس**'' (ردالمحتار:۷/۴۹۰)۔

(۳) شوہر یا بیٹا کسبِ حرام میں مبتلا ہو تو بیوی اور ماں کیا کریں؟

کسبِ حرام میں مبتلا شوہر یا بیٹے کی بیوی اور ماں کو چاہئے کہ حلال ذریعہ سے روزی کی حتی المقدور کوشش کریں اور اپنے بیٹے یا شوہر کو حرام کے بجائے حلال پر آمادہ کریں اور جب تک انتظام نہ ہو تو بہ واستغفار کرتی رہیں: ''**اشترىٰ الزوج طعاماً أو**

كسوةً من مال خبيث جاز للمراة أكله و لبسها والإثم على الزوج" التاتارخانية، (ردالمحتار:۹/۲۷۹)۔

حرام مال سے اونچی تعلیم حاصل کرنے والے کی کمائی:

حرام مال سے بچے کو پڑھانا،لکھانا یا اعلیٰ تعلیم دینا حرام ہے،لیکن اس طرح پڑھ کر کوئی نوکری حاصل کرلے تو وہ نوکری اوراس سے حاصل ہونے والی کمائی حرام نہیں۔

(۴) کسب حرام کرنے والے کی دعوت کا حکم:

جولوگ علانیہ حرام کاروبار کرتے ہیں وہ تو فاسق ہیں،ان کی دعوت میں شرکت ممنوع ہے:''**عن عمران بن حصين رضى الله تعالى عنه قال: نهى رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم عن إجابة طعام الفاسقين**'' (مشکوٰۃ المصابیح:۳۲۲۷)اورجن لوگوں کی تمام کمائی یا غالب کمائی کے حرام ہونے کا محض شبہ ہو،یقین یا ظن غالب نہ ہو،ان کی دعوت کھانا جائز ہے،اورجن لوگوں کی تمام کمائی یا غالب کمائی کے حرام ہونے کا ظن غالب ہوان سے دعوت کا حال معلوم کیا جائے کہ دعوت مال حلال سے کی گئی ہے یا مال حرام سے:''**عن أبى هريرةرضى الله عنه قال:قال النبى صلى الله عليه وآله وسلم: إذا دخل أحدكم على أخيه المسلم فليأكل من طعامه ولا يسأل ويشرب من شرابه ولايسأل**'' (مشکوٰۃ:۳۲۲۸)۔''**قال على القارىؒ: فإنه قد يتأذىٰ بالسؤال، وذالك إذا لم يعلم بفسقه كما ينبىء عنه قوله صلى الله عليه وآله وسلم: على أخيه المسلم، وقال الطيبىؒ: الفاسق --- فالغالب أن لايجتنب من الحرام**'' (مرقاۃ المفاتیح:۶/۳۴۶)۔

(۵) لاعلمی میں حرام کھالینے کی تلافی:

دعوت کھانے کے بعد اگر معلوم ہو کہ دعوت کرنے والے کا کاروبار بالکل حرام ہے تو اس کی تلافی توبہ واستغفار سے ہوجاتی ہے:''**ومن يعمل سوءً أو يظلم نفسه ثم يستغفر الله يجد الله غفوراً رحيماً**'' (النساء:۱۱۰)،البتہ اگر ممکن ہوتو اس کھانے کی قیئ کردے،یہ تقوے کی بات ہے۔

(۶) مال حرام کو حلال کرنے کا حیلہ:

مالِ حرام کے سلسلہ میں اصل حکم یہ ہے کہ اس مال کو اس کے اصل مالک کی جانب لوٹانا واجب ہے اور اگر اس کے مالک کو لوٹانا متعذر رہو،دراں حالیکہ یہ اس حرام کے بوجھ کو اتارنا چاہتا ہوتو اس کے لئے صرف ایک ہی مخلص ہے کہ وہ اس کو

فقراء پر صدقہ کردے، اس لئے کہ اگر وہ اس مالِ حرام کو اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے تو اس کا گناہ مزید مؤکد اور مستحکم ہوگا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس وعید کا مستحق ہوگا کہ پراگندہ حال اور پراگندہ بال والا لمبے سفر کا مسافر آسمان کی جانب ہاتھ اٹھائے یارب یارب کہتا ہے، دراں حالیکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا لباس حرام ہے، اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔۔؟ اور اگر وہ اس مال کو ھلاک کردیتا ہے تو اس وعید کا مستحق ہوگا جو مال ضائع کرنے پر وارد ہوئی ہے، لہٰذا اس پر لازم ہے کہ وہ اس مال کو بلانیت اجر وثواب صرف حرام کا بوجھ اتارنے کے قصد سے فقراء پر صدقہ کردے: ''**و أما إذا كان عند رجل مال خبيث فإما إن ملكه بعقد فاسد أو حصل له بغير عقد ولا يمكنه أن يرده إلىٰ مالكه ويريد أن يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة إلا أن يدفعه إلى الفقراء لأنه لو أنفق على نفسه فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام ودخل تحت قوله صلى الله عليه وسلم: "ثم ذكر الرجل يطيل السفر أشعث أغبر يمد يديه إلى السماء يا رب يا رب و مطعمه حرام و ملبسه حرام" (الحديث) أو أضاعه و استهلكه فدخل تحت قوله صلى الله عليه وآله وسلم نهى عن إضاعة المال فيلزم عليه أن يدفعه إلى الفقراء ولكن لا يريد بذالک الأجر و الثواب ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه**'' (بذل المجہود: ۸۱/۱)۔

لیکن اگر حالت انتہائی نازک ہو اور کسی طرح کا کوئی روزگار نہ ہو تو اپنی ضروریات کے لئے کسی غیر مسلم سے قرض لے لے اور اس مالِ حرام سے قرض ادا کردے: ''**وفي شرح حيل الخصاف لشمس الأئمة الحلوانيؒ أن الشيخ أبا القاسم الحكيم كان ممن يأخذ جائزة السلطان وكان يستقرض بجميع حوائجه وما يأخذ من الجائزة كان يقضي به دينه**'' (خلاصۃ الفتاویٰ: ۳۴۹/۴) ''**قال الغزاليؒ... و إذا أراد أن يحج ولم يكن معه إلا مال حرام أو فيه شبهة فيستدين للحج من مال حلال ليس فيه شبهة ويحج به ثم يقضي دينه في ماله**'' (ارشاد الساری إلی مناسک الملاعلی القاری: ۵)۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی دام اقبالہم لکھتے ہیں: اس حیلے سے حرام رقم حلال نہیں ہوتی، صرف اتنا ہوتا ہے کہ قرض لے کر جو کھانا (وغیرہ) خریدے گا وہ حلال ہوجائے گا، لیکن حرام رقم ملکیت میں لانے اور حرام سے قرض ادا کرنے کا گناہ پھر بھی ملے گا'' (فتاویٰ عثمانی: ۱۲۵/۳)۔

(۷) بعد میں صدقہ کرنے کے قصد سے مالِ حرام بطور قرض کاروبار میں لگانا:

مال حرام کاروبار میں لگانا بہرصورت حرام ہے، سخت گناہ کا باعث ہے، جس کاروبار میں مال حرام لگایا جائے وہ کاروبار بھی ناپاک ہوجاتا ہے، البتہ اس میں لگی ہوئی مال حرام کی اصل رقم بلانیت اجر وثواب فقراء پر صدقہ کردی جائے تو وہ

کاروبار پاک ہوجاتا ہے:''یردونها علی أربابها إن عرفوهم، و إلا تصدقوا بها، لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه۔اھ'' (ردالمحتار:۹/۵۵۳)، ''اکتسب حراماًو اشتریٰ به أو بالدراهم المغصوبة شیئاً۔ قال الکرخیؒ: إن نقد قبل البیع تصدق بالربح و إلا لا'' (الدرعلی الرد:۷/۴۹۰)۔

(۸)معصیت پر مشتمل ملازمت جائز نہیں:

جس ملازمت میں مال حرام کا حساب کتاب کرنا پڑتا ہو یا حرام لین دین کرنا پڑتا ہو یا مال حرام کی وصولی کرنی پڑتی ہو وہ ملازمت معصیت پر مشتمل ہونے کی وجہ سے شرعاً جائز نہیں:''لا تصح الإجارة لعسب التیس وهو نزوه علی الإناث ولا لأجل المعاصی والنوح و الملاحی ولو أخذ بلا شرط یباح۔ الدر۔ وفی المنتقیٰ: امرأة نائحة أو صاحبة طبل أو زمر اکتسبت مالا ردته علی أربابه إن علموا و إلا تتصدق به، و إن من غیر شرط فهو لها، قال الإمام الاستاذ: لا یطیب، والمعروف کالمشروط۔اھ'' (ردالمحتار علی الدرالمختار:۶/۷۵،۹/۷۵)۔

(۹)حرام کمائی سے خرید کردہ زمین میں کاشت کاری کا حکم:

حرام کمائی سے زمین خریدنا شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر زمین خرید لی ہے تو جتنی حرام رقم اس زمین کی خرید میں لگی ہے اس کو اس کے اصل مالک تک لوٹانا واجب ہے، اور اگر یہ متعذر ہو تو وہ رقم بلا نیت اجر وثواب فقراء پر صدقہ کردی جائے، اس کے بغیر اس زمین میں کاشت کاری جائز نہیں، وأما إذا کان عند رجل مال خبیث فإما إن ملکه بعقد فاسد أو حصل له بغیر عقد ولا یمکنه أن یرده إلی مالکه ویرید أن یدفع مظلمته عن نفسه فلیس له حیلة إلا أن یدفعه إلی الفقراء'' (بذل المجہود:۱/۸۱)۔

حرام کمائی کرنے والے کے گھر پر نوکری کرنے کا حکم:

حرام کمائی کرنے والے کے گھر پر نوکری کرنا اور مزدوری وصول کرنا جائز ہے، الّا یہ کہ مستاجر مسلمان ہو اور یقینی طور پر معلوم ہو کہ وہ حرام کمائی سے مزدوری ادا کر رہا ہے تو اس صورت میں مزدوری حرام ہوگی، اور جب یقینی طور پر اس کا علم نہ ہو اور اس پر کوئی قرینہ بھی نہ ہو تو خواہ مخواہ کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں:''ولو کان لمسلم علی نصرانی دین،فباع النصرانی خمراً أخذ بثمنها وقضاه المسلم من دینه، جاز له أخذه۔ لأن بیعه له مباح۔ ولو کان الدین لمسلم علی مسلم فباع المسلم خمراً و أخذ بثمنها و قضاه صاحب الدین کره له أن یقبض ذالک

من دينه، كذا في السراج الوهاج'' (الفتاوی الھندیہ:۵/۳۶۷)''**وكره لرب الدين أخذ ثمن خمر باعها مسلم لا كافر، يعنى إذا كان لشخص مسلم دين على مسلم فباع الذى عليه الدين خمرا و أخذ ثمنها وقضى الدين لا يحل للمدين أن يأخذ ذلك بدينه۔ و إن كان البائع كافراً جاز له أن يأخذ**'' (تکملۃ البحر:۸/۲۰۱)۔

حرام کمائی والے کی بائک یا کار میں سفر کرنا:

حرام کمائی کرنے والے نے بائک یا کار مال حرام کو متعین کر کے اس کے بدلہ میں خریدی ہو اور پھر وہی متعینہ مال حرام بطور ثمن ادا کیا ہو تو ایسی بائک یا کار میں سفر کرنا جائز نہیں، اور اگر یہ صورت نہ ہو تو سفر کرنا جائز ہے، لہٰذا جس شخص کی غالب کمائی کے حرام ہونے کا ظن غالب ہو اس سے معاملہ کی تفتیش کرنی چاہئے، اور اگر یہ متعذر ہو تو اس سواری میں سفر نہ کیا جائے۔

حرام کمائی والے سے مدرسہ یا اسکول کی فیس وصول کرنا:

حرام کمائی کرنے والے سے مدرسہ یا اسکول کی فیس وصول کرنا جائز ہے، البتہ اگر کسی مسلمان کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ فیس کی ادائیگی مال حرام سے کرتا ہے تو اس سے حلال مال سے فیس کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جائے۔

(۱۰) سودی رقم کارپوریشن وغیرہ حکومتی اداروں کو رشوت میں دینا:

کارپوریشن وغیرہ حکومتی ادارے فیس وصول کرتے ہیں، رشوت نہیں لیتے، رشوت افسران لیتے ہیں، جنہیں اپنا حق حاصل کرنے کے لئے بحالت مجبوری رشوت دینا جائز ہے، لیکن سودی رقم دینا جائز نہیں، ہاں اگر کارپوریشن یا دیگر کوئی حکومتی ادارہ خود رشوت وصول کرتا ہو اور وہ رقم سرکاری خزانہ میں پہنچتی ہو تو اس میں سرکاری ادارہ سے حاصل کردہ سودی رقم دینا درست ہے:''**المال الحاصل له حرام عليه إن أخذه من غير عقد لم يملكه ويجب عليه أن يرده على مالكه إن وجد المالك و إلا ففي جميع الصور يجب عليه أن يتصدق بمثل تلك الأموال على الفقراء**'' (بذل المجہود:۱/۸۱)۔

(۱۱) جس بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو وہاں کوئی چیز بطور ہدیہ یا بطور عاریت لینا:

جس بستی کی اکثریت سودی کاروبار میں ملوث ہو وہاں اس وقت تک کوئی چیز بطور ہدیہ یا بطور عاریت نہ لی جائے جب تک اس کے متعلق حلال ہونے کا علم نہ ہو جائے، اس کے لئے کوئی عذر کر دے، یا پھر ان سے کنایۃً استفسار کر لے، مثلاً یہ کہے کہ'' آج کل چونکہ عموماً لوگوں میں حلال وحرام کی تمیز ختم ہو چکی ہے اس لئے کسی کا مال لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے، اس

استفسار پر وہ صراحت کر دیں تو فبہا، ورنہ صراحتاً طلب کرے: ''**إن كان غالب مال المهدى من الحرام ينبغى له أن لايقبل الهدية ولايأكل من طعامه مالم يخبر أنه حلال أدانه أو استقرضه من غيره**'' (خانیۃ: ۳/ ۲۴۴)۔

(۱۷) حرام کمانے والے یا اس کی اولاد کے لئے دعا کرنے کا حکم:

جس کا مال یا کمائی حرام ہو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی، چنانچہ صحیح مسلم کی روایت میں مال حرام رکھنے والے شخص کی دعا کے قبول ہونے کی نفی ہے، ان کے لئے دعا کرنے پر نہی وارد نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی ابن سلول کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے لئے استغفار فرمایا: ''**عن جابر رضى الله عنه قال: أتىٰ رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم عبد الله ابن أبى بعد ما أدخل حفرته فأمر به فأخرج فوضعه على ركبتيه فنفث فيه من ريقه و ألبسه قميصه۔قال و كان كسا عباساً قميصاً**'' (صحیح البخاری: ۲/ ۹۷)، لہٰذا حرام کمانے والوں کے لئے یا ان کی اولاد کے لئے دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ فقط، واللہ تعالیٰ اعلم، وعلمہ اتم۔

☆☆☆

مال حرام سے متعلق بعض احکام

مفتی محمد ضیاء الحق قاسمی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، أما بعد!

موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔جب تک یقینی طور پر معلوم نہ کہ آباء واجداد کی کمائی آزادی سے پہلے کی ہے یا بعد کی تب تک اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جائے گا،لہٰذا مذکورہ کمائی حلال شمار ہوگی۔

۲۔اس کا حکم وہی ہے جو عام مال حرام کا ہے،حلال گزران کی کوشش کرے جب تک کوئی حلال ذریعہ آمدنی نہ مل جائے اس وقت تک مذکورہ مال کو بقدر ضرورت استعمال کی گنجائش ہوگی۔

۳۔حرام کمانے والوں کے گھر والوں کے لئے یہ حکم ہے کہ حرام کمانے والوں سے حرام ذریعہ آمدنی چھڑانے کی کوشش کرتے رہے،پوری کوشش کے باوجود اگر نہ چھوڑیں،اوران کے بیوی بچوں کے لئے اپنے اخراجات برداشت کرنا ممکن نہ ہوتو ایسی صورت میں اپنے شوہر یا بیٹے کے مال سے ماں یا بیوی کے لئے استعمال کرنا جائز ہے،حرام کھانے اور کھلانے کا گناہ شوہر یا بیٹے پر ہوگا،اسی طرح نابالغ بچوں کے لئے اپنے باپ کا مال استعمال کرنا جائز ہوگا،پھران بچوں کے بڑے ہونے کے بعدان کی کمائی بھی جائز ہوگی۔

"و في جامع الجوامع :اشترى الزوج طعاما أو كسوة من مال خبث جاز للمرأة أكله ولبسها والإثم على الزوج" (الدرمع الرد۶/۱۹۱)۔

۴۔جس مسلمان کے بارے میں یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ اس کی مکمل یا اکثر کمائی حرام ہے ایسے شخص کی دعوت قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں،تاہم اگر واضح دلیل سے کسی کی کل یا اکثر آمدنی حرام ہونا یقینی طور پر معلوم ہوتو ایسے شخص کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں۔

☆ مفتی واستاذ حدیث جامعہ رشید العلوم چترا (جھارکھنڈ)

"عن أبی هریرةؓ أن رسول الله ﷺ قال: إیاکم والظن، فإن الظن أکذب الحدیث ولا تحسسوا ولا تجسسوا" (ابوداؤد، رقم الحدیث:۴۹۱۷)۔

"عن عائشةؓ أن قوما قالوا: یا رسول الله إن قوما یاتوننا باللحم لاندری أذکروا اسم الله علیه أم لا، فقال رسول الله ﷺ: سموا الله علیه و کلوه" (بخاری، رقم الحدیث:۲۰۵۷)۔

۵۔اگر کھانے والے کو معلوم نہیں تھا، لاعلمی میں کسی نے حرام مال کھلا دیا تو اس پر توبہ استغفار ضروری ہے۔

"الحرمة تتعدد مع العلم بها، و فی الشامی فی تحته: و مانقل عن بعض الحنفیة من أن الحرام لاتتعدی ذمتین سألت عن الشهاب بن الشلبی فقال هو محمول علی ما إذا لم یعلم بذلک" (الدرمع الرد ۴/۱۴۶)۔

نیز حرام مال کا اصولی حکم یہ ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو اور وہ مال بلاعوض حاصل ہوا ہو تو اس کو مالک کو واپس کرنا لازم ہے، یعنی وہ مال جہاں سے آیا ہے اس کو وہیں واپس کر دیا جائے، لہٰذا مذکورہ مسئلہ میں اگر اس کھانے کی رقم اس داعی کو کسی طریقے سے پہنچا دیا جائے تو اس کی تلافی ہو جائے گی، البتہ توبہ استغفار بہر حال ضروری ہے: "الحلء أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده علیهم، و إلا فإن علم عین الحرام لا یحل له و یتصدق به بنیة صاحبه" (فتاویٰ شامی مطلب فیمن ورث مالا حراما ۵/۹۹)۔

۶۔ایسی کوئی تدبیر نہیں ہے۔

۷۔حرام مال کا حکم یہی ہے کہ اس کو اصل مالک تک پہنچا دیا جائے، اور اگر پہنچانا متعذر ہو تو اس کو بلا نیت ثواب صدقہ کر دیا جائے، اس کو اپنے مصرف میں لانا جائز نہیں، لہٰذا بطور قرض بھی اس مال کو استعمال کرنا درست نہیں: "السبیل فی الکسب الخبیث التصدق" (المبسوط للسرخسی ۱۲/۱۷۲)۔

"لأن السبیل فی الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبه" (شامی کتاب الحظر والاباحة فصل فی البیع ۶/۳۸۵)۔

۸۔تعاون علی الاثم کی وجہ سے ایسی ملازمت مکروہ ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان" (سورہ مائدہ:۲)۔

۹۔ایسے شخص کے گھر میں مزدوری اور نوکری کر کے اپنی مزدوری اور تنخواہ وصول کرنا، اسی طرح بچوں کی فیس وصول کرنا جائز ہے؛ الا یہ کہ دینے والا یہ صراحت کر کے دے کہ یہ پیسہ میں تم کو حرام کمائی سے دے رہا ہوں۔

۱۰۔رشوت میں سود کی رقم دینا جائز نہیں، اس لئے کہ سود کی رقم یا تو مالک کو لوٹانا ضروری ہے یا پھر غریبوں، مسکینوں کو بلا نیت ثواب دے دینا ضروری ہے، رشوت میں جو رقم دی جاتی ہے وہ حکومت کے کھاتے یعنی مالک کے قبضے میں نہیں

جاتی، بلکہ افسران کے جیب میں جاتی ہے (فتاوی دار العلوم)۔

۱۱-أهدى إلى رجل شيئاً أو أضافه، إن كان غالب ماله من الحلال فلا بأس، إلا أن يعلم بأنه حرا م، فإن كان الغالب هو الحرام، ينبغى أن لا يقبل الهدية، ولايأكل الطعام إلا أن يخبره بأنه حلال ورثته أواستقرضته، كذا فى الينابيع، لايجب دعوة الفاسق المعلن ليعلم أنه غير راض بفسقه، وكذا دعوة من كان غالب ماله من حرام مالم يخبر أنه حلال، وبالعكس يجيب مالم يتبين عنده أنه حرام كذا فى التمرتاشى" (فتاوی عالمگیری ۵/ ۳۴۲)۔

۱۲۔ایسے شخص کے مطالبہ پر دعا کرنے یا پانی وغیرہ پر دم کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

☆☆☆

حرام اشیاء کے متعلق بعض مسائل

مولانا محمد ارشد ربانی مکی احمد

خلاصہ جوابات:

(۱) اگر مورث کے مال حرام کا مالک معلوم ہو یا کسی متعینہ شیء کا حرام ہونا معلوم ہو تو وارث کے لئے اس مال کا استعمال بہر صورت ناجائز اور حرام ہے اور اگر مالک کا علم نہ ہو یا کسی متعینہ شیء کا حرام ہونا معلوم نہ ہو تو وارث کے لئے اس مال کا استعمال اگرچہ جائز اور حلال ہے؛ لیکن مال حرام کے بقدر صدقہ کر دینا تقوی و پرہیز گاری، نیز خشیت الٰہی کا تقاضہ ہے۔

(۲) غریب شخص اپنے مال حرام کو بقدر ضرورت روک کر استعمال کر سکتا ہے، وسعت کے بعد اس کو صدقہ کرنا ضروری ہے اور اگر وسعت نہ ہو سکا تو معاف ہے۔

(۳) اگر کسی کا شوہر یا بیٹا مال حرام سے کفالت کرتا ہے، بیوی اور ماں کے پاس اس کے علاوہ اپنے گزارے کی کوئی راہ نہیں ہے تو شوہر اور بیٹا کا پیسہ اگر بعینہ حرام نہیں ہے تو ان دونوں کے لئے اس کو استعمال کرنا جائز ہے اور گناہ اس صورت میں شوہر اور بیٹا پر ہوگا۔

(۴) مشتبہ اور مشکوک شخص کے مال کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ اس کا آدھا یا اس سے بھی زیادہ حرام ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے اور اگر یہ اندازہ ہو کہ آدھا سے کم حرام ہے تو تقوی اور پرہیز گاری کا تقاضہ یہ ہے کہ دعوت قبول نہ کیا جائے؛ لیکن قبول کرنا جائز ہے، تقوی کے خلاف ہے۔

(۵) مال حرام کھانے کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ جتنی مقدار میں کھانا کھایا ہے اتنا صدقہ کر دے اور اللہ سے توبہ کرے۔

(۶) مال حرام کو حلال نہیں کیا جا سکتا ہے اور اس کی کوشش کرنا گناہ اور خیانت ہے، حرام کو حلال کرنے میں کوئی حیلہ اور تدبیر موثر نہیں ہے۔

☆ تخصص فی الفقہ والافتاء (سال دوم) دار العلوم وقف دیوبند

(۷)اگر کسی کے پاس مال حرام ہے جس کو صدقہ کرنے کے بعد تجارت کے لئے قرض ملنے کا امکان نہیں ہے تو مال حرام سے بقدر ضرورت روک کر باقی کو صدقہ کر دیں اور وسعت کے بعد اس حصہ کو بھی صدقہ کر دیں۔

(۸)جس شخص کا آدھا بزنس حلال اور آدھا حرام ہو ایسے شخص کے یہاں کام کاج کرنا جائز نہیں ہے۔

(۹)حرام کمائی سے خرید کردہ جائیداد میں کھیتی باڑی کرنا تاوان ادا کرنے کے بعد جائز ہے، حرام کمانے والے کے گھر نوکری کرنا جائز اور درست ہے، حرام کمائی والے کے ساتھ بائک وغیرہ پر بیٹھنا جائز ہے اور اگر یہ لوگ اپنے بچوں کو مدرسہ یا اسکول میں داخل کراتے ہیں تو ان سے فیس لینا بھی درست ہے۔

(۱۰)سود کی رقم کو رشوت میں دینا جائز نہیں ہے۔

(۱۱)اگر کسی کے کمائی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز ہے اور یہ سوال کرنا کہ حلال ہے یا حرام؟ جائز نہیں ہے اور ہدیہ وغیرہ قبول نہ کرنا تقوی وللّٰہیت ہے۔اور اگر کسی کے کمائی کے متعلق حرام ہونے کا امکان ہو اور اکثر مال کا حرام ہونا معلوم ہوتا ہو تو ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں ہے اور مقدار حرام کا کم ہونا معلوم ہو تو جائز ہے۔

(۱۲)حرام کمانے اور کھانے والے کے لئے اور اس کی بیوی و بچوں کے لئے دعا کرنا جائز ہے۔

☆☆☆

حرام مال سے متعلق بعض مسائل

محمود اختر کیفی ابن حافظ محبوب عالم صاحب ☆

جوابات:

(۱) وہ شخص جس کے آباء واجداد حرام کاروبار میں ملوث تھے اور اُسی حرام کاروبار کا مال وراثت کی شکل میں اُسے ملا ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر صاحبِ مال موجود ہو تو وہ مال اُسے لوٹا دیا جائے گا، ورنہ مستحقین زکوٰۃ پر صدقہ کر دیا جائے گا۔

تاہم اگر صاحبِ مال کا کچھ علم نہ ہو یا حرام مال کا حلال مال کے ساتھ اس طرح اختلاط ہو جائے کہ اس کا امتیاز کرنا ممکن نہ ہو تو اس مال پر ورثاء کی ملکیت ثابت ہو جائے گی اور وہ مال حکماً اُن کے لیے حلال ہو جائے گا، لہٰذا اُس مال کے ذریعہ سے اگر کوئی تجارت کرتا ہے تو وہ جائز اور درست ہوگی، مگر افضل اور بہتر یہ ہے کہ اُس مال کا صدقہ کر دیا جائے۔

(۲) ایسا غریب شخص جس کی کل جائیداد حرام کاروبار سے حاصل شدہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور حلال جائیداد نہیں ہے تو اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو مالِ حرام کے ضابطہ کے تحت ماقبل میں گذر چکا ہے، البتہ حاجت وضرورت کے پیشِ نظر اُس غریب شخص کے لیے اتنی گنجائش ہوگی کہ وہ بقدرِ ضرورت اُس مالِ حرام سے لے لے اور بقیہ ماندہ مالِ حرام کو صدقہ کر دے۔

(۳) ایسا شوہر یا بیٹا جو بیوی یا ماں کے روکنے کے باوجود حرام کمائی سے باز نہ آئے اور بیوی یا ماں کے لیے اُس حرام کمائی کے علاوہ کوئی اور حلال راہ نہ ہو تو ایسی صورت میں اُن کا اپنے شوہر یا بیٹے کے مالِ حرام سے جملہ حاجات پوری کرنے کی گنجائش ہوگی۔

(۴) اگر کوئی بچہ نابالغی کے زمانہ میں حرام مال کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم اور ڈگری حاصل کرے اور اس سے کمائی کرے تو اُس بچے کے کمائے ہوئے پیسے حلال اور درست ہوں گے، حتی کہ اُس بچے کے ذمہ کچھ بھی صدقہ کرنا واجب نہیں ہوگا۔

تاہم اگر بلوغت کے بعد اس بچہ نے مالِ حرام کے ذریعہ تعلیم وترقی پائی ہو تو اُس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ پیسے کمانے کے بعد اُس مال کے بقدر صدقہ کر دے جتنا کہ حصولِ تعلیم میں خرچ ہوا تھا۔

☆ تخصص فی الفقہ والافتاء (سالِ دوم) دار العلوم وقف دیوبند

البتہ دونوں کے کمائے ہوئے پیسے جائز اور درست ہوں گے۔

(۵) جس شخص کی کمائی حتمی طور پر حرام کاری پر مبنی ہو تو اُس کی دعوت قبول کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کسی کی کمائی حلال وحرام کے درمیان مخلوط ہو تو اگر غالبِ گمان حلال مال کا ہے تو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اُس کے برعکس یعنی غالبِ گمان حرام مال کا ہو تو ایسی دعوت قبول کرنا درست نہیں ہے۔

تاہم اگر کسی کی کمائی حلال وحرام کے درمیان مشتبہ ہو جائے تو ایسی صورت میں پہلے تحقیق کر لی جائے، اگر تحقیق ممکن نہ ہو تو حالتِ اضطراری میں تحری پر عمل کیا جائے گا، ورنہ حالتِ اختیار میں دعوت قبول نہ کرنا افضل اور اولیٰ ہے۔

(۶) حرام کمانے والے کی دعوت کھانے کے بعد اس کی تلافی اس طرح ہوگی کہ وہ اُس کھانے کے بقدر مال کا صدقہ کر دے۔

(۷) شریعت میں مالِ حرام کا دو ہی مصرف ہے، یا تو اُس کے مالک کو لوٹا دیا جائے یا مصارفِ زکوٰۃ پر صدقہ کر دیا جائے، تاہم ان کے علاوہ مالِ حرام کو حلال کرنے کے لیے کوئی مفید تدابیر اور حیلے شریعت میں موجود نہیں ہیں۔

(۸) حرام مال چاہے بالعوض ہو یا بلاعوض ہو اُس کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک موجود ہو تو اُسے وہ مال دے دیا جائے، ورنہ غرباء ومساکین پر بلانیتِ ثواب کے صدقہ کر دے۔

تاہم اگر کوئی غیر شرعی طریقہ پر حرام مال کے ذریعہ تجارت کرتا ہے تو شرعی رو سے یہ درست نہیں ہے، البتہ اُس کے ذریعہ حاصل کردہ منافع جائز اور درست ہوں گے، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ اُس مالِ حرام کا صدقہ کر دے جتنا کہ تجارت کرنے میں صرف ہوا تھا۔

(۹) مطلقاً ایسی جگہ ملازمت کرنا جائز اور درست نہیں ہے جہاں نصف نصف کی بنیاد پر حلال وحرام کا روبار ہوتا ہو اور حرام کام میں معاونت کرنی پڑتی ہو۔

تاہم اگر کوئی حلال کی صراحت کے ساتھ ملازمت کرے تو یہ جائز اور درست ہے۔

(۱۰) مطلقاً حرام کمائی سے خریدی ہوئی جائداد میں کھیتی باڑی کے جواز کے ساتھ اُس کی آمدنی بھی جائز اور درست ہوگی، البتہ اُس حرام کمائی کے بقدر مال کا صدقہ کر دیا جائے گا، چاہے وہ موجودہ منافع کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۱) حرام کمائی کرنے والا اگر بلا کسی تعیین وصراحت کے کسی کو اجرت یا تنخواہ دیتا ہے تو اُس کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، حتی کہ اُس کے گھر میں ملازمت بھی جائز اور درست ہوگی۔

(۱۲) دینی مصالح کے پیشِ نظر بظاہر باہمی تعلقات کو استوار رکھتے ہوئے حرام کمائی کرنے والے کے ساتھ اُس کی

بائک پر سفر کرنا جائز اور درست ہے۔

(۱۳) حرام کمانے والا شخص اگر بغیر کسی تعیین وصراحت کے اپنے پیسوں سے اسکول یا مدرسہ کی فیس ادا کرتا ہے تو اُس کا لینا جائز اور درست ہے۔

(۱۴) مدارس یا دوسری عمارتوں کے نقشہ کی منظوری کے سلسلہ میں سودی رقم بطورِ رشوت دینا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہاں سود کا مصرف نہیں پایا جاتا ہے اور نہ ہی یہاں ردالی الارباب پایا جارہا ہے۔

(۱۵) ایسا شخص جس کی کمائی کا حتمی طور پر کچھ علم نہ ہو اور اس کی آمدنی کے حرام ہونے پر کوئی واضح دلیل موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں بغیر کسی تفتیش کے اُس کا ہدیہ قبول کرنا جائز اور درست ہے۔

اور اگر اُس کی کمائی کا بیشتر حصہ حرام آمدنی پر مبنی ہو اور وہ مطلقاً یوں ہی بغیر کسی صراحت کے ہدیہ پیش کرے تو اُس کا ہدیہ قبول کرنا درست نہیں ہے، تاہم اگر حلال کی صراحت کے ساتھ ہدیہ دے تو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

(۱۶) حرام کمانے والا اگر بچے کے نام رکھائی کے موقع پر یا دیگر کسی مواقع پر کسی کو دعاء کرنے یا پانی پر دم کرنے کے لیے کہتا ہے تو اُس کے لیے دعاء کرنا یا پانی وغیرہ پر دم کرنا جائز اور درست ہے، اس لیے کہ اس میں بظاہر کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆☆☆

چوتھا باب

اختتامی امور

مناقشہ:

حرام کمائی سے متعلق بعض مسائل

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علی سیدنا محمد و علی الہ و صحبہ أجمعین۔

عالی قدر، صدر محترم علماء و معزز مفتیان کرام!

سب سے پہلے ہم تینوں عارضین کا شکریہ ادا کرتےہیں کہ انہوں نے خوبصورت انداز میں سیکڑوں صفحات سے عرق کشید کر کے ان کی روح عرض کے طور پر پیش فرمایا، بندہ ایک اہم امر کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے اور پہلے سوال سے یہ مربوط ہے، سوال نمبر ایک میں ہے: لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سود کا پیسہ آزادی سے پہلے کا کمایا ہوا ہے یا آزادی کے بعد تو اس کی کمائی حلال ہے یا حرام؟، گزارش یہ ہے کہ اس ملک میں ایک طویل عرصہ تک مسلم حکمرانوں کی حکمرانی رہی، یہاں تک کہ شاہ ثانی کے عہد تک جب انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو ۱۸۲۲ء میں سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے فتوی دیا کہ پورے ملک میں نصاریٰ کا غلبہ ہوگیا ہے، اور ان کے قوانین بلا روک ٹوک جاری ہیں، یہ چونکہ اعلان ہوگیا تھا کہ زمین خدا کی ہے، سلطنت بادشاہ کی اور حکم کمپنی بہادر کا، اس لیے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۸۲۲ء میں یہ فتوی جاری کیا کہ ملک دارالحرب ہوگیا ہے، دارالحرب ہونے کی بنیاد پر علماء کرام نے سود کے حلال ہونے کا فتوی جاری کیا اور سودی کاروبار چلتے رہے، وہ رقم جو حاصل ہوئی اس کو مفتیان کرام نے جائز اور حلال رقم قرار دیا ہے۔

عرض یہ ہے کہ ۱۸۴۷ء کے بعد کیا کسی شخصیت، کسی ہستی نے کسی ادارے نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتوی کو جس فتوی کے مطابق بالاکوٹ کی جنگ آزادی لڑی گئی، اس کے بعد کی آزادی کی جنگیں لڑی گئیں، تو کیا کسی ہستی نے یا کسی ادارے نے اس فتوی کو کینسل کیا یا آج بھی وہ فتوی نافذ ہے، یہ اہم نکتہ ہے، وہ فتوی آج بھی فتاوی عزیزیہ میں موجود ہے، اس لئے کہ جو اسباب تھے کہ یہاں نصاری کا تسلط ہے اور ان کے قوانین بلا روک ٹوک جاری ہیں، یہ اسباب اگر آپ غور فرمائیں تو آج بھی کسی نہ کسی شکل میں آپ کو نظر آجائیں گے، اس لیے آزادی کے بعد یا آزادی سے پہلے کا معاملہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح سے اس معاملہ میں جن حضرات نے کمایا وہ سود کے ذریعہ ہی

کیوں نہ ہو اس کو حلال ہونا چاہئے، دوسرا پوائنٹ اس سلسلہ میں جس کا تعلق آخری سوال سے ہے، یہ ہے کہ رشوت کی رقم افسران کو دی جاسکتی ہے، اس میں بات یہ آئی کہ افسران چونکہ حکومت ہی کے نمائندہ ہوتے ہیں، اگر وہ رشوت کی رقم حکومت کو نہیں پہنچائیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے کہ ایک آدمی، ایک افسر رشوت بھی لے اور اس کو حکومت کے خزانے میں وہ جمع بھی کرے، اگر اتنا ہی وہ ایماندار ہوتا تو وہ رشوت کیوں لیتا، وہ رشوت اسی لیے لے رہا ہے کہ اس کے اندر وہ خباثت ہے، کرپشن ہے، اور وہ ناجائز ذرائع سے آمدنی حاصل کرنا چاہتا ہے، اس لیے یہ کہنا کہ وہ حکومت کا نمائندہ ہے اور وہ رشوت لے کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرے یہ بعید بات ہے، لہٰذا ہمیں تو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے، حکومت کے نگرانی کے محکمے جو اس طرح کی رشوت کے معاملات کو دیکھتے ہیں، چھاپہ ماری کرتے ہیں، گرفتاریاں ہوتی ہیں تو اس میں تعاون کرنا چاہئے "**تعاون علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم و العدوان**" کے مطابق، یہ نہیں کہ ہم سرینڈر ہو جائیں کہ بھائی ہم اس کو دیکھ رہے ہیں، ہاں یہ الگ مسئلہ ہے کہ جب ہمارا حق رک جائے اور افسر اپنے پاور کا غلط استعمال کرتے ہوئے ہمارا جائز حق نہیں دے رہا ہے تو اس موقع پر علماء نے باضابطہ لکھا ہے کہ جائز اور حلال آمدنی سے بھی اس کو رقم دے سکتے ہیں، مجبور ہونے کی وجہ سے اور جو رشوت حرام آمدنی کا پیسہ ہے تو اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اس کی بنیاد دوسری ہے، اس کی بنیاد وہ نہیں ہے کہ یہ حکومت کا نمائندہ ہے، اس لیے ہم ان کو ادا کر رہے ہیں، یہ دو پوائنٹ تھے جو میں نے عرض کر دیا، بہت بہت شکریہ۔

مولانا مظاہر حسین عماد قاسمی صاحب (تنقیح سوالات ۱-۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ حرام مال کے بکراہت یا بلا کراہت جائز ہونے کے دلائل ہیں جن میں یہ کہا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کی دعوت قبول کی تھی..... ایک سے لے کر تین تک کے جو سوالات ہیں اس کے دلائل میں..... میرے خیال سے یہ دلیل دینا صحیح نہیں ہے، ایک بات تو یہ ہے کہ تمام یہودی سود خور تھے، کیا اس کی تحقیق ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خور یہودی ہی کی دعوت کو قبول کیا تھا، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اگر یہ تحقیق ہو جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود خور یہودی کی ہی دعوت کو قبول کیا تھا تو پھر اس کو بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے، ورنہ نہی، میرا اپنا خیال ہے کہ یہ ہمارا ایمانی جذبہ کی وجہ سے ہے، اسکی کوئی تحقیق نہیں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جس یہودی کی دعوت کو قبول کیا ہوگا یا جس کے مال کو کسی بھی صورت میں لیا ہوگا وہ یا تو ان کو وحی کے ذریعہ یا اپنی فراست ایمانی کے ذریعہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ یہودی جس کا مال میں کسی طور پر بھی استعمال کر رہا ہوں یا جس کی دعوت قبول کر رہا ہوں،

اس میں سود کی آمیزش نہیں ہے، اس لئے یہ جو لوگوں نے دلیل پیش کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کو قبول فرمایا یا یہودی کے مال کو لیا، یہ نہ کہا جائے تو بہتر ہے، **و اٰخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔**

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

یہ اہم نکتہ ہے، ویسے ایک بات عرض ہے کہ توریت میں اور موجودہ بائبل میں موجود ہے کہ یہودیوں کے یہاں سود لینے کی اجازت ہے، مدینہ میں یہودیوں کے پانچ قبائل تھے، وہ آپس میں سودی لین دین کرتے تھے یا نہیں، واللہ اعلم، لیکن اوس اور خزرج دونوں قبائل آپس میں سودی معاملہ کرتے تھے، تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہودی اس کو جائز سمجھتے تھے اور بیشتر معاملات میں سود کی آمیزش ہوتی تھی۔

مولانا مغفور باندوی صاحب:

میرا سوال، سوال نمبر دو کے شق ''ب، ج، د'' سے متعلق ہے اور مقالہ کے اندر اس کا حوالہ بھی موجود ہے، معاشرہ کے اندر بہت سی دکانیں ہوتی ہیں جن سے لوگ سامان خریدتے ہیں، دکان والا کسی بھی خریدنے والے سے یہ تحقیق نہیں کرتا کہ جو پیسہ سے مل رہا ہے وہ حرام کمائی کا پیسہ ہے یا حلال کمائی کا، دوکان والے کو سامان بیچنے سے اور مال کمانے سے مطلب ہوتا ہے، اگر یہ شرط قرار دی جائے، دوکان والے کے لیے کہ وہ مشتری سے یہ معلوم کرے کہ اس نے جو رقم بطور معاوضہ کے دی ہے، وہ حرام ہے یا حلال تو کیا کاروباری حضرات اس معاملہ سے بڑی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوں گے؟، ایک ہے عمل حلال کی اجرت اور ایک ہے عمل حرام کی اجرت، حضرت تھانویؒ نے صراحت کی ہے اس کی کہ جو عمل حلال ہے اس کی اجرت حلال ہے، عمل حرام کی اجرت حرام ہے، ایک آدمی قرآن شریف پڑھا رہا ہے اس پر اس کو اجرت مل رہی ہے، عمل حلال ہے، اجرت حلال ہوگی، اب وہ اس کی تحقیق میں لگے کہ یہ آدمی کیا کرتا ہے، سرکاری آدمی ہے تو رشوت لیتا ہوگا یا نہیں لیتا ہوگا، تو میرا خیال ہے کہ اس سے لوگ حرج اور تنگی میں مبتلا ہوں گے، اس لیے یہ فرق واضح ہوجائے کہ عمل حلال اور عمل حرام ان دونوں میں فرق اور ان کی اجرت میں فرق کا کیا مطلب ہے، والسلام علیکم۔

مولانا عبدالرشید صاحب کانپوری:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سود کی بات آئی تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے جو دعوت کھائی ہو وہ سود کی حرمت سے پہلے کی ہو، سوال نمبر ۶ میں جو ملازمت کے بارے میں بات آئی ہے، ملازم کو کوئی حرام مال سے اجرت دے اور اس کو پتہ

چلے تو اس کو صدقہ کر دے، یہاں اس بات کی تفصیل ضروری ہے کہ اس ملازم کو پہلے سے معلوم ہے یا نہیں ہے، اگر پہلے سے معلوم ہے کہ وہ حرام مال سے اجرت دے رہا ہے، پھر بھی وہ اس کے یہاں ملازم ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن اگر اس کو پہلے سے نہیں معلوم ہے، وہ مہینہ دو مہینہ اس کے یہاں کام کر چکا ہے، اس نے اجرت حاصل کی، بعد میں اس کو معلوم ہوا، اب اس کا نقصان یہ ہے کہ وہ اب صدقہ بھی کرے گا تو بیچارہ پیٹ کیسے پالے گا، اس لیے یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ اگر پہلے سے معلوم ہو تب تو تصدق والی بات ہوگی، لیکن اگر بعد میں معلوم ہو تو وہ اس کا حق اجرت ہے، جیسے کسی نے کوئی آٹا خریدا، خریدنے کے بعد وہ کھا گیا، بعد میں اجرت دے رہا ہے کہ ہم نے دس کلو آپ کے یہاں سے آٹا خریدا تھا، یہ اس کی اجرت حرام مال سے ہے، مجھے تو دوکان چلانی ہے تم حلال سے دو، حرام سے دو، مجھے کیا لینا دینا، اس پہلو سے غور کرنے کی ضورت ہے، تیسرا سوال بچے کی تعلیم کے تعلق سے تجاویز کمیٹی میں یا تو یہ تجویز نہیں آئے اور اگر آئے تو اس میں کوئی ایسی شق لگا دی جائے، جس سے اس کی تعلیم متاثر نہ ہو، بیچارہ وہ بچہ پڑھے گا کیسے، اگر اسے پہلے سے معلوم ہے کہ اس کے باپ کا مال حرام ہے تو مکتب والے بھی اس کو نہیں لیں گے، اسکول والے بھی نہیں لیں گے تو یہ تو بڑی مصیبت ہو جائے گی اس بچے کی تعلیم کیسے ہوگی، نمبر گیارہ کے تعلق سے بار بار یہ بات آئی سود و رشوت میں ذاتی مفاد ہے، بھائی ذاتی مفاد کہاں ہے؟ مثال کے طور پر ایک شخص نے مکان بنایا، مکان بنایا نقشہ پاس کرایا، کسی انجینئر سے اب وہ چھت ڈالنے جاتا ہے تو اس وقت ایک نارمل چھت میں جو تھانے میں جاتا ہے وہ پچاس ہزار روپے جاتا ہے، پچاس ہزار روپے میں یہ اپنا فائدہ کہاں حاصل کر رہا ہے، یہ تو چھت ڈالنا اس کا اپنا فائدہ نہیں ہے، یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہئے، آخری چیز جو مولانا خالد نیموی صاحب نے فرمایا کہ کوئی بھی افسر رشوت نہیں دیتا، مولانا شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ رشوت کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ سو پچاس ہزار دو ہزار لی جاتی ہے، اس میں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ افسر تک نہیں جاتی، ایک رشوت وہ ہے جو کروڑوں میں لی جاتی ہے، وہ منتری تک جاتی ہے، جو جانتے ہیں وہ لوگ ہماری بات کی تصدیق کریں گے، اس لئے یہ بات آئی کہ اوپر تک رشوت نہیں پہنچتی، ایسا نہیں ہے، رشوت کے دائرے ہیں، رشوت اوپر تک بھی پہنچتی ہے، جزاکم اللہ، بات خزانے کی نہیں ہے، میں نے اس میں لکھا ہے کہ وہ سبب بن رہا ہے، آپ لوگ بتائیں کہ سرکاری خزانہ کس چیز کا نام ہے، سرکاری خزانہ کوئی خلا نہیں ہے، سرکاری خزانہ یہ حکومت ہی کا خزانہ ہے، یہی افراد چلاتے ہیں، یہی افراد حکومت ہیں، سرکاری خزانہ کا خارج میں کوئی وجود نہیں ہے، یہ حکومت ہی سرکاری خزانہ ہے اس کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا۔

نامعلوم آواز (غالباً مفتی امانت علی قاسمی)

یہاں ایک دو بات میں بھی عرض کر دوں، بچوں کے اسکول کی فیس کا مسئلہ یہاں زیر بحث آیا ہے جس پر کچھ

عرصہ قبل مباحث فقہیہ کے سمینار میں باضابطہ یہ تجویز منظور بھی ہوچکی ہے کہ بچوں کی فیس میں اور اسکول کی فیس میں وہ پیسے لینا جائز ہے، تو یہ ایک طرح سے متفقہ تجویز منظور ہوچکی ہے اور جہاں تک مولانا کہہ رہے ہیں کہ رشوت میں دینے کی بات ہے، یہ افسر کے جیب کا نام حکومت کا خزانہ نہیں ہے، اگر افسر کو آپ رشوت دیتے ہیں تو وہ افسر کے جیب میں ہیں، وہ اس کو حکومت تک جانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، وہ حکومت تک پہنچانے کے لیے لے ہی نہیں رہا ہے، وہ تو اپنے جیب میں رکھنے کے لیے لے رہا ہے، تو اس لیے یہ کہنا کہ وہ حکومت کا نمائندہ ہے اور افسران حکومت چلاتے ہیں تو حکومت چلانا الگ چیز ہے، لیکن حکومت کے یہاں پیسہ جانا الگ ہے اور افسر کے جیب میں جانا الگ ہے۔

مولانا عبدالرشید کانپور:

میں اس کی وضاحت آپ کے لیے کرنا چاہتا ہوں، میں نے اپنے مقالہ میں سبب والی بات لکھی ہے، مثال کے طور پر آپ جارہے ہیں، ہم دبنگ ہیں ہم نے کسی سے یہ کہا کہ مولانا امانت علی کے پاکٹ سے سو روپے چھین لو، آپ یہ بتائیے کہ اگر آپ میرے سو روپئے کہیں پڑے پا جائیں تو آپ کے لیے حلال ہوگا یا نہیں ہوگا، حلال ہوجائے گا، کیونکہ ہم سبب بنے اس کے لینے کے لیے تو مولانا اس کو اس پس منظر میں بھی سمجھنا ہے کہ کہیں نہ کہیں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، کیوں آپ لوگوں کو مظلوم درمظلوم بنا رہتے ہیں۔

مفتی سعیدالرحمٰن صاحب قاسمی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، گزارش اتنی ہے کہ تجویز میں اگر مناسب ہو تو ایک بات اور بڑھائی جائے، علماء کی طرف سے یہ بات مفید ہوگی کہ اگر حلال کمائی سے اجتماعی دعوت ہو اور وہ منکرات سے بھری ہوئی ہو، مثلاً ٹیبل پر عورتیں کھانا لگاتی ہوں اور کھانا غلط طریقے سے کھلائے جائیں، اسراف ہو جس کا آج کل رواج بہت بڑھ رہا ہے، یہ بھی امر منکر ہے حلال ہے، مگر طریقہ حرام ہے، اس کی بھی میں سمجھتا ہوں سفارش کرنی چاہئے، اس کو روکا جائے تو ان شاء اللہ یہ بہتر ہوگا، جزاک اللہ۔

مفتی ظہیر احمد صاحب کانپور:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، جو دس نمبر سوال ہے، رشوت میں سودی رقم خرچ کرنے کے سلسلہ میں میری گفتگو ہے سودی رقم کا جو اصل مصرف ہے وہ ردالی المالک ہے، اگر ہم کو مالک معلوم ہے، اگر معلوم نہیں ہے تب اس کو صدقہ کرنے کا حکم ہے، بعض علماء نے جیسے مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہ نے رفاہی امور میں صرف کرنے کا جواز نقل کیا ہے، لیکن اس کے علاوہ میں

نہیں،لیکن سوالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مطلقاً رشوت کی رقم میں سودی رقم کا استعمال درست ہوجائے گا،جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا بھی ہے کہ اجتماعی نہیں بلکہ ذاتی، انفرادی حق کے لیے بھی سودی رقم دیدی جائے، حالانکہ بعض دفعہ بڑی بڑی رقمیں سود میں جمع ہوتی ہیں،تو کیا اتنی وافر مقدار میں سودی رقم رشوت میں دی جائے گی؟ دوسری چیز یہ ہے اور جو بات دوسروں کی طرف سے بھی آئی ہے اور جن حضرات نے اس کو جائز قرار دیا ہے اس بنا پر کہ ملازمین خزانے میں جمع کرتے ہیں تو وہ رشوت کا مطلب ہی نہیں سمجھ رہے ہیں، رشوت کہتے ہی اسے ہیں جو خلاف قانون لی جارہی ہو، قانوناً جو لی جائے گی وہ حکومت کے پاس جاتی ہے، جبکہ جو غیر قانونی طریقہ پر لی جاتی ہے، وہ پرسنل جیب میں جاتی ہے چاہے وہ حکومت کا آدمی ہو، اس کی حیثیتیں الگ الگ ہیں، ایک وہ حکومت کا نمائندہ ہے اور ایک پرسنل اس کی حیثیت ہے، اس لئے ہمیں اس فرق کو سمجھنا چاہئے اور یہی یہاں ہمارے کہنے کا مقصد ہے اور سوالنامہ میں سودی رقم سے مراد وہ سود وہ انٹرسٹ ہے جو بچت کھاتوں کے اندر ہوتی ہے، وہ بہت معمولی ہوتی ہے، وہ اتنی مقدار میں کیسے ہوسکتی ہے یا آپ کہہ رہے ہیں کہ سودی رقم فکسڈ ڈپوزٹ وہ تو ہمارے یہاں پہلے سے ہی ناجائز ہے، فکسڈ ڈپوزٹ کرانا ہی ناجائز ہے، اس میں زیادہ مقدار میں گویا کہ رقم آجاتی ہے، تو اس لیے حلال مال سے تو وہ مجبور ہے اپنا حق لینے کے لیے، علماء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن سودی رقم سے رشوت دینا یہ جائز معلوم نہیں ہوتا ہے شرعاً، فتاوی دارالعلوم وغیرہ میں یہی لفظ ہے، واللہ اعلم۔

نامعلوم آواز:

حضرات! ایک وضاحت ضروری ہے کہ جو سوالنامہ ہے ہمارا کہ رشوت میں سودی پیسے دے سکتے ہیں، اس میں یہ ہے کہ مدارس کی عمارت ہے یا کوئی نقشہ کی منظوری ہے وہاں پر ایک بہت خطیر رقم دینے کی مجبوری ہے تو اس میں رشوت کی رقم دی جاسکتی ہے یا نہیں، یہ ایک خاص سوال ہے، مطلقاً رشوت کے پیسے کس چیز کے اندر سود کا پیسہ دینا یہ سوال نہیں ہے۔

مفتی عثمان صاحب بستوی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ موضوع چل رہا ہے مال حرام اور اس کے منافع، لیکن جزئیات اتنے زیادہ اس میں ہوگئے کہ اصل موضوع سے وہ جزئیات کچھ ہٹتے ہوئے نظر آئے، بات ہونی چاہئے کہ عین حرام یعنی ایک مال مملوک ہوتا اور ایک مال غیر مملوک ہوتا ہے، جو مال غیر مملوک ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک غیر مملوک جو عروض کے قبیل سے ہوتے ہیں اور ایک غیر مملوک جو فلوس یا نقود کے قبیل سے ہوتے ہیں، یہ مملوک، غیر مملوک چاہے نقود کے قبیل سے ہوں یا عروض کے قبیل سے ہوں، جتنا غیر مملوک ہے کسی حال میں حلال ہو نہیں سکتا، اس کا تو مصرف متعین ہے، لیکن اگر وہ تصرف سے ملکیت میں

تبدیل ہوجائے تو پھر وہاں تفصیل کی جاتی ہے، حضرات فقہاء نے بہت تفصیل کی ہے کہ اگر عروض تصرف کے بعد ملکیت میں تبدیل ہوجائیں، تو پھر اس کے منافع کا کیا حکم ہوگا، اور اگر نقود ملکیت میں تبدیل ہوجائیں تو اس کے منافع کا کیا حکم ہوگا، اگر نقود تصرف سے ملکیت میں تبدیل ہوجائیں تو اس کے منافع کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ حلال ہیں، طیب ہیں اور اگر عروض ملکیت میں تبدیل ہوجائیں تصرف کی وجہ سے، تو اس کے ربح میں راجح قول خبث کا ہے، لیکن بہر حال وہ مختلف فیہ ہے تو اس لیے پیش نظر بحث تو اس موضوع کو لے کر ہونی تھی، پھر اس کے بعد ہم کو بحث اس پر کرنی چاہئے کہ سود کا جو مال ہے جس کا سوالنامہ مرتب ہوا کہ یہ مملوک یا غیر مملوک ہے، اگر اس کو مملوک مان لیا جائے، تو پھر اس کے ربح کے بارے میں کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا، اور اگر اس کو غیر مملوک مانا جائے تو پھر مسائل کھڑے ہوتے ہیں، تو اس لیے میری رائے ہے کہ اصل بحث جو پیش نظر ہونی چاہئے، وہ ملکیت اور عدم ملکیت ہے، پھر تصرف کے بعد جو ربح حاصل ہو اس کے خبث اور طیب کے متعلق جو فقہاء کے درمیان بحث ہے وہ پیش نظر ہونے چاہئیں، دوسری بات اس میں یہ کہنا جیسا کہ مفتی امانت علی صاحب نے فرمایا کہ دیکھیے دو چیز ہے، ملکیت میں تبدیل ہوجائے، مال خبیث ہے، مال مغصوب ہے وغیرہ وغیرہ، اگر مال حرام ملکیت میں تبدیل ہوجائے تو ملکیت میں آنے کے بعد فیس وغیرہ میں، اجرت وغیرہ میں دیا جانا تو اس کے جواز کی بات کہی جاسکتی ہے اور فقہاء نے اور مفتیان کرام نے کہا، لیکن جب تک وہ عین حرام کی شکل میں موجود ہے ملکیت تبدیل نہیں ہوسکتی ہے، اس وقت تک کسی نے جائز نہیں کہا کہ اس کو فیس میں دیدیا جائے، اجرت میں دیدیا جائے، ورنہ تو حرام کا ایسا دروازہ کھل جائے گا کہ کوئی حرام، حرام رہ ہی نہیں جائے گا، فیس میں دے سکتے ہیں عین حرام کو، اجرت میں دے سکتے ہیں اور ثمن میں دے سکتے ہیں تو پھر جو ہے حرمت کا حکم کہاں باقی رہے گا، اس لیے اس پر جب بحث ہو تو یہ پیش نظر رہے، تیسری بات مجھے یہ کہنی تھی کہ عرض مسئلہ میں یا تلخیص میں میری طرف سے جو نسبتیں کی گئی ہیں وہ کہیں صحیح ہیں، کہیں غلط ہیں، اس کی وجہ سے بہت بڑا اشتباہ پیش آیا جس کی تفصیل مفتی امانت علی صاحب کو معلوم ہے، ٰاخر دعوانا اَن الحمد اللہ رب العالمین، والسلام علیکم۔

نامعلوم آواز:

حضرات! جیسا کہ مفتی صاحب کہہ رہے ہیں کہ عرض مسئلہ میں میرے نام کے سلسلہ میں اشتباہ ہوا ہے، وہ اس طرح ہوا کہ جونپور گورینی سے دو عثمان کا مقالہ آیا، ایک مولانا عثمان صاحب قاسمی ہیں، ایک مولانا عثمان صاحب بستوی ہیں، بعض حضرات نے مولانا عثمان صاحب کا نام دیکھ کر کے قاسمی صاحب کے اقوال کو حلیمی صاحب کی طرف نسبت کردیا ہے، ان کو اس سے اشکال ہے کہ میری وہ نسبتیں غلط ہیں، جہاں تک حضرت نے کہا کہ مال حرام کو فیس وغیرہ میں دینے کا مسئلہ ہے، دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک تو ہے دینا تو ظاہر سی بات ہیکہ اگر دینا عین حرام ہے تو کسی نے جائز نہیں کہا ہے، لیکن سوال لینے

والے کا ہے، لینے والا اسکول یا ادارہ وہ فیس وصول کرے گا یا نہیں کرے گا، اسکول کو تو پیسے چاہئے ورنہ وہ بچہ نہیں پڑھے گا اور دشواری پیدا ہوگی، تو ادارہ کو اس سے بحث نہیں ہے کہ جو پیسہ دے رہا ہے وہ کونسا پیسہ دے رہا ہے، دینے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ حلال پیسہ دے، اگر اس کا پیسہ حلال وحرام سے مخلوط ہے یا حرام ہے، لیکن لینے والا یہ تحقیق نہیں کرتا ہے وہ لے لیتا ہے تو بہر حال لینا اس کے لیے درست ہوگا، یہ ذہن میں میرے بات آئی۔

مولانا محمد ریاض ارمان قاسمی صاحب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، ملکیت کی تبدیلی سے حرمت کا تعدیہ ہوگا؟ یا نہیں ہوگا تو اس سلسلہ میں دو دلیلیں دی گئی ہیں: ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہودیوں سے قرض لینا، خرید وفروخت کرنا یا دعوت قبول کرنا، اس سلسلہ میں ذہن میں یہ بات آرہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھا، یہودیوں کے ساتھ تھا، یہودی اسلامی احکام کے پابند نہیں تھے جب یہودی اسلام کے احکام کے پابند نہیں تھے تو وہ مال ان کے نزدیک حلال تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے استفادہ کیا تو اس کو مسلمانوں کے لیے دلیل بنانا درست نہیں ہے، دوسری بات حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "لک صدقة و لنا هدية" تو اس دلیل کو بھی تبدیلیٔ ملک پر پیش کیا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہ چیز حلال ہوگئی تو دوسروں کے لیے بھی وہ حلال ہونی چاہئے، میرے ذہن میں یہ بات آرہی ہے کہ جو مال حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو دیا گیا صدقہ کے طور پر تو وہ صدقہ ان کے لیے حلال تھا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہدیہ کیا گیا تو بطور ہدیہ کے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال ہوگیا، لیکن یہاں جو مسئلہ زیر بحث ہے کہ وہ جس کے پاس مال ہے وہ مال حلال ہی نہیں ہے تو اس کے لیے جب مال حلال نہیں ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

بس ایک بات ذہن میں آئی، کوئی محقق بات نہیں ہے، مولانا نے بڑی اچھی بات کی، اصولی بات کی، اور اس بات سے استدلال کیا کہ چونکہ غیر مسلم مخاطب بالفروع نہیں ہوتے ہیں، اس لیے اگر ان کا کاروبار سودی بھی رہا ہو تو مسلمانوں کے لیے اس کی دعوت کھانا جائز ہے، مگر ایک اشکال میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کو اس سے مستثنیٰ فرما دیا تھا، اسی لیے بنو نجران سے جب معاہدہ ہوا تو اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "إلا من أربى" ساری چیزوں کو اپنے مذہب کے مطابق انجام دینے کی اجازت دی، مگر سودی کاروبار کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی، تو یہ پہلو بھی

قابل غور ہے کہ یہ جواصول ہے کہ وہ مخاطب بالفروع نہیں ہے کیا سود کا مسئلہ بھی اس میں شامل ہے، صرف ایک اشکال میرے ذہن میں پیدا ہوا اس کو میں نے پیش کر دیا۔

مفتی محمد اسعد صاحب پالن پوری:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، ادارہ مباحث فقہیہ کا سمینار جو اس سال منعقد ہوا تھا اس میں جو سوالات زیر بحث آئے تھے اور جو تجاویز پاس ہوئی تھیں تو وہاں کے سوالات اور یہاں کے سوالات میں قدر اشتراک ہے، بعض سوالات ایسے تھے کہ جن تجاویز وہاں پاس ہوگئی تھیں، اس لیے میں نے چاہا یہ کہ تجاویز مرتب کرنے والے کے لیے تھوڑی آسانی رہے تو تین اہم تجاویز پر وہاں بات ہوئی اور پاس ہوئیں وہ میں پڑھ کر سنا دیتا ہوں، نمبر ۴ پر ہے ''خریدار پر حلال مال سے ہی ثمن ادا کرنا لازم ہے، لیکن اگر کسی وجہ سے حرام مال سے ادائیگی کر دی تو اگرچہ خریدے ہوئے مال منافع اس کے لیے حرام نہیں ہوں گے، البتہ خریداری میں صرف کردہ حرام مال کے بقدر اصل مالک تک پہنچانا، ورنہ فقراء پر خرچ کرنا ضروری ہوگا، نمبر ۵ ہے فروخت شدہ سامان کی قیمت، گاڑی یا مکان کا کرایہ، اسکول یا مدرسہ کی فیس وغیرہ ایسے شخص سے وصول کرنا جائز ہے جس کا ذریعۂ آمدنی بظاہر حرام ہو۔ نمبر ۶ جیسا کہ ابھی مفتی عبدالرشید کانپوری صاحب نے اسی پر بات کہی تھی کہ اگر کسی شخص کے پاس حرام اور حلال مال الگ الگ ہو اور یہ معلوم ہو کہ وہ حلال مال میں سے ہی خرچ کر رہا ہے تو اس کی دعوت قبول کرنا اور اس سے ہدیہ وغیرہ لینا جائز ہے، اور اگر متعین طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ حرام مال پیش کر رہا ہے تو اس کے لیے لینا جائز نہیں ہوگا، حلال اور حرام مال مخلوط ہو تو جو وہ اپنے حصہ کے بقدر حلال مال میں سے پیش کرے تو قبول کرنا درست ہے اور اگر اس کا علم نہ ہو اور حرام مال غالب ہو تو اس کے یہاں دعوت کھانا اور ہدیہ وغیرہ لینا جائز نہیں ہوگا، تجاویز مرتب کرنے والے ان نکات کو بھی پیش نظر رکھیں، ان شاء اللہ اس سے فائدہ ہوگا۔ جزاکم اللہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب:

بس ایک بات کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں، بڑی اچھی بات مولانا اسعد صاحب نے پیش فرمائی، ادارہ مباحث فقہیہ ہو یا مجلس تحقیقات شرعیہ ہو یا اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا ہو، ہم سب ایک ہی ٹرین کے مسافر ہیں اور ہم سب کا منزل بھی ایک ہے، اور توشۂ سفر بھی ایک ہے، اس لیے جن اداروں میں جو محنتیں ہو رہی ہیں وہ سب قابل قدر ہیں، اکیڈمی میں عام طور پر یہ کوشش کی جاتی ہے کہ جو موضوعات ان داروں میں پہلے زیر بحث آ گئے ہوں ان کو ہم اکیڈمی کے سمینار میں زیر بحث نہیں لائیں، لیکن اکیڈمی کا یہ سوالنامہ کافی پہلے مرتب ہوا اور میزبانوں کی طرف سے یہ بھیجا گیا تھا اور جو تجویزیں مولانا اسعد صاحب

نے پڑھ کر سنائیں وہ بہت ہی متوازن معتدل اور قابل عمل ہیں، اور میرے پاس آئی بھی تھیں، ہمیشہ ادارہ مباحث فقہیہ کی تجاویز مولانا سلمان صاحب بھیجتے بھی ہیں، لیکن اتفاق سے میرے ذہن میں نہیں تھا، تو میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس تجویز کا متن یہاں تجویز کی کمیٹی کے کنوینر کو دیدیجئے، تاکہ وہ جب اس پر تجاویز مرتب کریں، تو وہ ان کے سامنے رہے۔

نام (غیر واضح):

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، میں عرض کر رہا ہوں، کہ ہمیں مال حرام اور مال وسخ میں فرق کرنا چاہئے، ایک خبیث مال ہوتا ہے ایک وسخ مال ہوتا ہے، ہمارے مقالہ نگاروں کو تلبیس ہوئی کہ وہ وسخ مال کو خبث مال میں شمار کر دیا تو اس کی وجہ سے پریشانی ہوئی، مثلاً فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے، کتب فقہ میں یہ موجود ہے کہ خبث مال تداول ایدی سے اس کا خبث نہیں جاتا اور وسخ مال اگر ہے تو تداول ایدی سے اس کا وسخ ختم ہو جاتا ہے، حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ وسخ مال سے متعلق ہے، خبث مال سے متعلق نہیں ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جیسے غیر مسلمین ان کے یہاں بہت سارے معاملات جائز ہیں، جیسے بنو نجران کے ساتھ یہ معاہدہ ہوا تھا، مگر حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ ان معاہدوں میں یہود کے ساتھ کوئی تذکرہ نہیں، یہودی کے معاملات ہوتے تھے، وہاں مدینہ منورہ میں تو ان کے ساتھ سود کا کوئی استثناء بھی نہیں تھا، نجران سے جو معاہدہ ہوا ہے وہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر عمر شریف میں ہوا ہے تو اس لیے اس کو استشہاد اور استدلال میں پیش نہیں کیا جانا چاہئے اور ان چیزوں کو تجاویز کمیٹی ملحوظ خاطر رکھے۔

گفتگو: مولانا عتیق احمد بستوی صاحب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ بہت سے نکات ہمارے سامنے آئے، لوگوں نے مطالعہ کیا ہے، پڑھ کر آئے ہیں، پہلی بات تو وہی ہے جو مولانا نے ابھی فرمایا ہے، مباحث فقہیہ میں یہ موضوع آیا ہے، سارے سوالات نہیں آئے ہیں، کچھ سوالات آئے ہیں، کمیٹی کے سامنے ان شاء اللہ وہ تجاویز ہوں گی، اور ان شاء اللہ اس کا خیال رکھا جائے گا، نئے سوالات جو اس سوالنامہ میں ہیں جس کا لانا ضروری ہے ان شاء اللہ اس کو لایا جائے گا، لیکن ہم لوگوں کی کوشش یہی ہے کہ جو ہمارے ادارے کام کر رہے ہیں، آپس کے تال میل سے کام کر رہے ہیں، باہمی اعتماد کے ساتھ کام کر رہے ہیں، اگر کسی موضوع پر کوئی فیصلہ ہوا ہے، اس فیصلہ کو سامنے رکھنا دوسرے اداروں کے لیے یہ اخلاقی ذمہ داری ہے، اس کا خیال رکھا جاتا ہے، غور وخوض کے ساتھ اور بحث وتمحیص کے بعد مباحث فقہیہ نے جو فیصلے کئے ہیں، ان شاء اللہ وہ سامنے رہیں گے، کمیٹی کو باقاعدہ پرنٹ نکال کر دیدیجئے، تاکہ وہ سامنے رہیں اور باقی ان شاء اللہ نئے سوالات جو اس میں قائم کیے گئے ہیں اس کے بارے

میں کمیٹی اپنی تجاویز مرتب کرے گی، دیکھیے مجھے عرض کرنا ہے، دو تین باتیں، مولانا خالد نیموی صاحب نے ایک موضوع چھیڑ دیا، اگر ان کی بات پر آئے تو بہت پیچھے چلے جائیں گے، یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا فتوی تھا دارالحرب کے تعلق سے کیا وہ منسوخ ہوگیا ہے، ختم ہوگیا تو بہت بڑا سوال ہے، ظاہر ہے علماء بیٹھے ہوئے ہیں، تو آزادی کے بعد صورت حال کیا ہے، یہاں جو سوالات بھیجے گئے وہ اس پس منظر میں کہ انگریزوں کے زمانے میں فتوی مشہور ہوا، اس کے بعد سودی کاروبار بہت سے مسلمان بھی کرتے تھے، پٹھان لوگ خاص طور سے شہروں میں جاتے تھے، قرض دیا کرتے تھے اور ڈنڈے کے زور پر وصول کیا کرتے تھے، تو اس زمانے میں باقاعدہ اس کا رواج تھا، فتوی کی بنیاد پر لیکن وہ فتوی اس معنی میں ختم ہوگیا ہے کہ حضرت تھانویؒ اور دوسرے حضرات نے یہ بات محسوس کی کہ اگر سود کی شناعت ختم ہوجائے گی، تو اسلام کا ایک قطعی حکم جو بہت واضح ہے، اس سے مسلمان مانوس ہوتے جائیں گے، یہ اچھی بات نہیں ہے تو تبدیلی فتووں میں آئی، ہمارے علماء نے، اکابر نے گویا اس کے اندر تبدیلی کی ہے۔ اگرچہ آپ کو فتوی ملیں گے اس کے بعد بھی دارالحرب والے اور بہت سے معاملات میں جب جواز کی بات کہی جاتی ہے، ایک بڑی وجہ دارالحرب کی بھی آتی ہے، دارالحرب ہے، فلاں ہے تو یہ موضوع بہت حساس ہے، ظاہر ہے کہ ملک کے نئے منظر نامے میں جو صورتحال موجودہ ہے اس کے بارے میں ہم مکمل بحث کریں اور نئے فتوی مرتب کریں، یہ مستقل کام ہے جو ضمنی طور پر نہیں ہوسکتا کہ ہم ضمناً اس سلسلہ میں کوئی بات کریں، بہرحال ایک بات ہم سب کو سامنے رکھنی چاہئے کہ جن حالات میں ہم جی رہے ہیں، جو مسائل ہمارے سامنے ہیں، ان حالات کا بھی لحاظ ضروری ہوگا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اب جو صورت حال بن رہی ہے کہ ہر کام کے لئے آپ کو بینک سے جوڑا جارہا ہے، آپ گاڑی خریدتے ہیں، فلاں کام کرتے ہیں، کوئی بھی گاڑی خرید لیجئے، پندرہ بیس لاکھ کی، معلوم ہوا کہ کل انکم ٹیکس والے آپ کے گھر پہنچ گئے، پیسہ آپ کے پاس ہے، خرید سکتے ہیں، لیکن کیا کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں، مجبوری کے تحت گاڑی خریدنے کے لیے بسا اوقات مکان کی تعمیر کے لیے لوگ مجبور ہوتے ہیں، اس طرح کہ بینک سے رابطہ کریں، اب اس بنیاد پر ہم فتوی دینے لگے کہ بھائی جس شخص نے بینک کا لون، قرض لے کر کے مکان بنوایا ہے اس کے مکان میں بیٹھنا، ان سے دوستی کرنا یہ سب ناجائز ہوگا، خلاف زمانہ فتوی ہوگا، یہ چلنے والا نہیں ہے، اس وقت حکومت کے جو فیصلے ہیں جو طرز عمل ہے ان حالات کا بھی ہمارے فیصلوں میں لحاظ ہونا چاہئے، اور مسلمانوں کے لیے گویا کام کی راہیں بند کی جارہی ہیں، باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ جو راستے کھلے تھے، جو دروازے کھلے تھے، کاروبار کے وہ راستے بھی بند کیے جارہے ہیں، اور مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا ہورہی ہیں، تو ہمارے اصحاب افتاء کو، ہمارے علماء کو مجبوریوں کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے، اگر ہم گویا اس تقوی پر آجائیں کہ بھائی تقوی یہ ہے کہ ایسا کیا جائے تو فتوی پر عمل کرنا مشکل ہوجائے گا، تقوی تو بڑی چیز ہوا کرتی ہے، تو بہرحال ان مسائل میں کوئی

فیصلہ کرتے وقت ہماری یہ ذامہ داری ہے کہ موجودہ حالات کی نزاکتوں کو بھی ہم سامنے رکھیں، ان شاء اللہ جو گفتگو یہاں ہورہی ہے اور جوتو جیہات سامنے آئی ہیں ان کی روشنی میں مسئلہ کوحل کرنا آسان ہوگا، مباحث فقہیہ کے جو طے شدہ تجاویز ہیں اور وہ منقح ہیں تجویز کمیٹی غور کرے کہ ان میں سے کیا کیا چیزیں ہم اپنی تجاویز میں شامل کرسکتے ہیں، رہا رشوت کا مسئلہ تو اس سے بچنے کی ضرورت ہے، قراردادوں میں اس کا ذکر ہونا اور اس کے تعلق سے ہمت افزائی کی بات نہیں ہونی چاہئے، اگر ممکن ہو۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ جو گفتگویں ہوئی ہیں وہ تحقیق کی بنیاد پر ہیں، ان شاء اللہ کمیٹی جو بیٹھے گی ان مناقشوں کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی اچھا فیصلہ کرے گی، والسلام علیکم۔

نامعلوم آواز:

حضرات! ایک دو بات عرض کرنی ہے، ایک تو مفتی سلیم الدین قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ سوال نمبر ۱۱ کے تعلق سے میرے حوالہ سے جو بات لکھی گئی ہے کہ اگر رنجش کا ڈر ہو تو حسن تدبیر سے ٹال دے، یہ صحیح نہیں ہے، صحیح یہ ہے کہ اگر رنجش کا ڈر نہ ہو تو حسن تدبیر سے ٹال دے، اور اگر رنجش کا ڈر ہو تو ہدیہ قبول کرنے کے بعد کسی غریب کو صدقہ کردے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا جو پروگرام ہے وہ بالکل اپنے ٹائم سے باہر ہوتا جارہا ہے اور ابھی صدر صاحب کا خطاب بھی باقی ہے، اور کچھ ناموں کی ابھی اور پرچیاں آئی ہیں، درخواست یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے کوئی رائے ہو تو اپنی رائے کو تحریر فرمادیں، ان شاء اللہ تجویز کمیٹی میں اس کو ملحوظ رکھا جائے گا، درخواست کرتا ہوں مولانا شاہد علی صاحب حیدرآباد سے کہ وہ انتہائی مختصر وقت میں اپنی بات پیش فرمائیں۔

مفتی شاہد علی قاسمی صاحب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، بنیادی طور پر دو باتیں پیش کرنی ہے، ایک تو یہ ہے کہ مال حرام کا دوخانہ کرنا پڑے گا، یہ باتیں کئی مسئلوں میں آئی ہیں، مال حرام سے دعوت کی جارہی ہے، مال حرام سے بائک خریدی جارہی ہے، مال حرام سے قسط ادا کی جارہی ہے، تو میں عرض یہ کرنا چاہ رہا ہوں کہ مال حرام کا دوخانہ رکھنا پڑے گا، ایک مال حرام وہ ہے جو عرض، یعنی ایک مال حرام سامان تھا اور اس کے بدلے میں ایک دوسرا سامان حلال والا آیا، چوری کی ہوئی چیز، غصب کی ہوئی چیز کو دے کر دوسری چیز حاصل کرنا تو اس میں حرمت کی منتقلی بالکل واضح ہے اور ایک مال حرام وہ ہے جو کہ فساد ملک سے اس کو تعبیر کرتے ہیں اور اس سے منشاء یہ ہے کہ مثال کے طور پر ایک چیز ہمارے پاس حرام آئی بیع فاسد کے راستہ سے، ایک چیز ہمارے پاس آئی اجارۂ فاسدہ کے راستے سے، تو ملازمت، نوکری وغیرہ اگر ناجائز چیز کی ہو اور تنخواہ ملتی ہے تو مال حرام کے کس زمرہ میں

رکھیں گے، اسی طرح سے بیع فاسد کے راستے سے کوئی تجارت کرتا ہے اور اس سے نفع حاصل ہوتا ہے تو اس مال حرام کو کس خانے میں رکھیں گے، فقہاء نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، جب عروض کا تبادلہ عروض سے کیا جائے اور حرام ہو تو وہاں پر خبث منتقل ہوتا رہے گا، اور جب یہ خبث اور حرام ہونے کا معاملہ بیع فاسد کے راستے سے آئے، ملازمت ناجائز چیز کی اس سے راستے سے آئے تو اس میں تخفیف ہے اور ایسے روپیوں سے کوئی چیز خریدی جاتی ہے تو اس میں گنجائش کا پہلو بھی موجود ہے، تو یہ بات جو آتی ہے مال حرام سے دعوت وغیرہ تو یہ چیز اہم ہے کہ مال حرام اس کے پاس کس ذریعہ سے آیا ہے، سوال آتا ہے میرے پاس تو میں پوچھتا ہوں کہ حرام آمدنی ہے اس کی تو اس کا سورس کیا ہے، کبھی عدم ملک، کبھی فساد ملک، عدم ملک کے احکام الگ ہیں، فساد ملک کے احکام الگ ہیں، ایک بات تو یہ تھی اس پر کئی شقوں پر روشنی پڑ سکتی ہے، اور دوسری بات بائک کے سلسلہ میں ہے کہ بائک کی خریداری مال حرام سے ہے، تو اس میں مقالہ نگار کو اشتباہ ہوا ہے، ایک تو ہے کہ ایک کے پاس مال حرام پہلے سے موجود ہے اور مال حرام سے خریداری کر رہا ہے اور ایک یہ ہے کہ لون پر خریداری کر رہا ہے تو اگر ہم نے لون سے خریداری کی ہے تو بہت سارے مفتیان اس وقت ملک میں ہیں جو کہتے ہیں کہ لون پر جو ہم نے خریداری کی ہے وہ گاڑی میں خبث نہیں ہے جو روپیہ لون پر لیا اس میں خبث نہیں ہے، بلکہ ہم جو سود ادا کرتے ہیں قسطوں پر اور سود جاتا ہے اس فائنانس ادارے کو تو خبث جا رہا ہے اس کے پاس، خبث ہمارے پاس نہیں ہے، لہٰذا اس بائک، گاڑی میں خبث نہیں ہے، لہٰذا اس پر سواری کرنا، اس پر چلنا وہ سارے مسئلے حل ہو جائیں گے، لہٰذا حرام کس ذریعہ سے آیا ہے اس ذریعہ کو دیکھ کر حکم لگانا چاہئے، عدم ملک کا، فساد ملک کا جو فقہاء نے حکم بیان کیا ہے اس کو ملحوظ رکھیں گے تو بہت سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

نامعلوم آواز (شاید مولانا امانت علی صاحب):

حضرات! مفتی شاہد صاحب نے بڑی اچھی بات کی طرف رہنمائی کی اور یہ ضروری ہے کہ جو بینکوں سے ہم گاڑی خرید رہے ہیں تو ظاہر سی بات ہے کہ ہمارے خریدنے میں عدم جواز کا پہلو ہے، لیکن اس مال کے اندر کوئی خبث نہیں ہے اور اس مال سے اگر گاڑی خریدی جا رہی ہے تو گاڑی پر یا گاڑی پر بیٹھنے عدم جواز کا فتوی نہیں ہونا چاہئے، ایک بات اور یہاں پر آئی ہندوستان میں دار الحرب ہونے کے حوالہ سے تو ہندوستان دار الحرب ہے یا نہیں ہے یہ ایک علمی اور تحقیقی بحث ابھی تک باقی ہے، لیکن ہندوستان کے اندر سود کا لینا جائز نہیں ہے، خود اسلامک فقہ اکیڈمی کا متفقہ فیصلہ ہے اور جو ایک رائے ہے امام صاحبؒ کے حوالہ سے اس کا اطلاق ہندوستان جیسے ملک پر نہیں ہوتا ہے، اس کو بھی ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے، میں درخواست کروں گا مفتی صالح الزماں صاحب اڑیسہ سے کہ مختصر وقت میں اپنی بات کو ختم کریں۔

مفتی صالح الزماں صاحب:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ پہلی بات تو مجھے عرض کرنی ہے دارالحرب کے تعلق سے جو سوال نمبر ایک میں آیا ہے کہ آزادی سے پہلے مورث نے جو رقم کمائی تھی یا بعد میں وہ رقم ملی ہے وارث کو تو وہ جائز ہے یا ناجائز۔ تو اس کا مدار دارالحرب پر ہے اور دارالحرب کے تعلق سے جیسا کہ متفقہ فتوی بتایا گیا ہے عدم جواز کا ہے، ایک بنیادی بات یہ ہے کہ حرمت کا تعدیہ ہوتا ہے یا نہیں جیسا کہ حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی دامت برکاتہم نے شروع ہی میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا، اور دوسرا ضابطہ ہے تبدل ملک کا، یہ جو مورث والا مسئلہ ہے اس کے اندر علامہ شامیؒ نے درمختار کی عبارت کو نقل کر کے یہ واضح کیا ہے کہ اس مسئلہ کے اندر حرمت کا تعدیہ نہیں ہوگا، اور جہاں تک بات ہے تبدل ملک کی تو یہ بھی ایک خاص شکل کے اندر ہے کہ اگر مورث نے جو حرام مال کمایا ہے وہ متعین ہو اور وارث کو معلوم ہو، اس کے علاوہ جو دوسری شکلیں ہیں اس سلسلہ میں گنجائش دی ہے اور اس میں ایک تیسرا ضابطہ ہے جس کو ہمارے فقہاء کرام نے خصوصاً امداد الفتاوی اور امداد الاحکام کے اندر مختلف فتاوی کے حوالہ میں نقل کیا گیا ہے..... استہلاک ہے، استہلاک موجب ملک ہے، اگر اس طرح کے ضابطے ہمارے پیش نظر رہیں گے تو تقریباً سارے مسائل میں گنجائش نکلتی ہے، سوائے متعین شکل کے، ایک اور مسئلہ یہ آیا تھا کہ مدرسوں وغیرہ کے نقشوں کی منظوری میں جو سودی رقم دی جاتی ہے تو سودی رقم دینا جائز ہے یا ناجائز ہے، آپ کے مسائل اور ان کے حل کے اندر ایک فتوی کے جواب میں ہے کہ رشوت کے اندر یہ سودی رقم دینا دوہرا گناہ ہے، لہٰذا اگر مجبوری ہے تو مجبوری میں تملیک وغیرہ کی شکل اختیار کی جائے، جو بے غبار شکل ہے اس کو اختیار کر کے مدرسہ وغیرہ کے نقشہ کی منظوری حاصل کی جائے، بہرحال وہ بھی قوم وملت کے دین وایمان کے تحفظ کے بہت مضبوط ذریعے ہیں، لہٰذا ان کے لیے دوسری شکلیں اختیار کی جائیں، میں اخیر میں یہ نقل کرنا چاہوں گا کہ یہ ایک بات یہاں آرہی ہے کہ اگر مال مغصوب کسی کے پاس ہو اور وہ اس کا ضمان ادا کردے تو اس کا مالک ہوگا یا نہیں، اس بحث کو شرح عقود رسم المفتی کے اندر علامہ شامیؒ نے ان مسائل کے ذیل میں ذکر کیا ہے، جن مسائل کے تعلق سے بہت سارے علماء کرام کو شبہ ہوا ہے کہ اس طرح کی چیزوں میں یہ چیز بنیاد ہے، یعنی غاصب اگر ضمان ادا کر دیتا ہے تو وہ مالک ہو جائے گا، حالانکہ شارح اشباہ کے حوالہ سے غالباً علامہ شامیؒ نے اس پر رد نقل کیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ یہاں پر ایک دوسرا ضابطہ یہ سامنے آجاتا ہے کہ ایک آدمی عوض اور معوض دونوں کا مالک نہیں بن سکتا، لہٰذا اس مجبوری میں غاصب کو مالک مانا جاتا ہے، ورنہ یہ دیکھا جائے کہ اس نے مال کو غصب کر لیا ہے تو اب اس کے حق میں یہ ناجائز ہے، بس اسی

بات پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ و اٰخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

مولانا ابوالکلام شفیق قاسمی:

ایک مختصر سی بات عرض کرتا ہوں کہ حضرت نے فرمایا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کے بعد کسی نے اس کے دارالحرب ہونے کا انکار کیا ہے یا نہیں کیا ہے تو حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہیؒ سے سنا ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دار الحرب نہیں ہے۔

مفتی نذیر احمد کشمیری صاحب:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ مال حرام سے متعلق جو چند باتیں مجھے عرض کرنی تھیں ان میں سے ایک قیمتی بات حضرت مولانا عتیق احمد صاحب دامت برکاتہم نے ارشاد فرمادی، دوسری بات مولانا صاحب ارشاد فرمادی اور تیسری بات جو حضرت مفتی ابوالکلام صاحب نے فرمائی حضرت اقدس مفتی محمود صاحب نور اللہ مرقدہ، ذات اقدس سے متعلق اس کی تائید میں بھی کرتا ہوں اور فتاوی محمودیہ میں بھی ہے، اس میں حضرت نے صراحتاً فرمایا کہ دارالحرب نہیں ہے، آخری بات جو مجھے عرض کرنی ہے وہ یہ کہ مال حرام کی جو شکلیں بیان کی گئی ہیں، اگرچہ وہ بہت کافی ہیں، لیکن کچھ شکلیں اور بھی ہیں حرام کی جو پائی جاتی ہیں، مثلاً مختلف علاقوں میں خاندانوں میں وراثتیں تقسیم نہیں ہوتیں اور وارثوں کو مان کا حصہ نہیں ملتا، اب بعد میں آ کر کے اگر کسی فرد کے اندر دینی مزاج پیدا ہوجاتا ہے تو وہ پوچھتا ہے، اس وقت سے اب تک جو وراثت تقسیم نہیں ہوئی ہے اب اس میں سے میرا حصہ کتنا ہے، دوسروں کا کتنا ہے، یہ تو بہت آسان ہے کہ مناسخہ کی بنیاد پر تقسیم کردیا جائے، لیکن جو اضافے ہوئے ہیں ان کی محنتوں کے نتیجے میں تو وہ سارا مال مغصوب ہوجاتا ہے، اگر تجویز کمیٹی میں اس نکتہ پر بھی غور ہو اور یہ نکتہ اس میں آجائے تو بہت بہتر ہوگا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ ہر علاقہ میں ہوسکتا ہے، ہمارے علاقے میں زیادہ ہے، بہت سارے افسران ایسے ہیں جو رشوتوں کی بنیاد پر بڑی بڑی بلڈنگیں کھڑی کی ہیں، مکانات ہیں، گاڑیاں ہیں، سہولیات ہیں، دین دی دوری کی وجہ سے اب اگلی نسلوں میں کوئی دین کے قریب ہوا کسی بزرگ سے واستہ ہوگیا، تبلیغ سے جڑ گیا اور اس کے بعد اس کے اندر دینی مزاج پیدا ہوا تو وہ پوچھتا ہے کہ اس مال حرام میں سے کتنا نکالوں گا اور کس طرح، تو کیا اس اشتباہ کے لیے ہم کوئی ضابطہ بنا سکتے ہیں یا نہیں، اس سلسلہ میں اگر تجویز کمیٹی کوئی جزء لا سکے تو بہت بہتر ہوگا، بس اسی پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہمیں صواب وسداد تک پہنچائیے۔ واٰخر دعوانا أن الحمد رب العالمين۔

صدارتی خطاب:

مولانا مفتی محمد عبید اللہ اسعدی صاحب

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی أما بعد!

ہم اس سمینار کے پہلے موضوع سے الحمدللہ فارغ ہوگئے ہیں، یہ موضوع کیوں رکھا گیا، حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے اس کی وضاحت فرمادی ہے اور اس میں بہت سی جزئیات ہیں، بجائے اصولی سوال کے، وہ دراصل یہاں سے جو سوالنامہ پیش کیا گیا تھا اس کی وجہ سے ہے، بہرحال گفتگو ہوئی، شکلیں تو اور بھی ہوسکتی ہیں اور اس قسم کی صورتیں ظاہر ہے کہ آج کے ماحول میں کسی ایک علاقے کے ساتھ خاص نہیں ہیں، کم وبیش دوسری جگہوں میں بھی ہوسکتی ہیں اور یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں ان لوگوں کے ذہن میں جو لوگ حلال حرام کی نسبت سے کچھ فکرمندی رکھتے ہیں، عوام ہی کو نہیں خواص کو بھی ہوتی ہے، کچھ تو جو سابقے ہوتے ہیں خواص کے، کام کرنے والوں کے اس کی وجہ سے، سوالات آئے ہیں، ہدیہ، تحفہ، دعوت اور بعض مرتبہ یہ وجوہات بھی ہوسکتی ہیں، حدیث جس کا ذکر آیا ہے بار بار "**الحلال بین والحرام بین و بینهما أمور مشتبهات**"، اس کے ساتھ ایک ٹکڑا اور ہے "**لایعلمها کثیر من الناس**"، اور اس کثیر کا مصداق متعین طور پر عوام نہیں ہے، خواص بھی ہیں، اشتباہ ان کو بھی ہوتا ہے، اشکال ان کو بھی ہوتا ہے، چنانچہ اس کی وضاحت اپنے موقع پر موجود ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، ہاں اس حدیث کی مناسبت سے ایک بات ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ایک تو یہ حدیث ہے جو صحیحین وغیرہ میں ہے: "**الحلال بین والحرام بین و بینهما أمور مشتبهات**"۔

دوسری حدیث ہے جو سنن ترمذی وغیرہ میں ہے: "**الحلال ما أحله الله و الحرام ماحرمه الله و ما سکت عنه فهو عفو**"۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز ہے تھوڑا سا تعبیر کا فرق ہے، لیکن دقت نظر والوں کے لیے الجھن پیدا کرتی ہے، حضرت شیخ مولانا زکریا صاحبؒ، حضرت تھانویؒ سے استفسار فرمایا، اشکال لکھ کر بھیجا کہ حدیث تو بظاہر ایک ہے لیکن دونوں میں تیسری چیز کا حکم مختلف ہوگیا ہے، ایک جگہ ممانعت کی اور احتیاط کی بات ہے اور دوسری جگہ گنجائش کی بات ہے، تو حضرت تھانویؒ نے جو جواب لکھا اس کا حاصل یہ ہے کہ اصل میں دونوں حدیثوں میں مذکور تیسری چیز کو ایک سمجھا جارہا ہے، ایسا نہیں ہے، صحیحین کی روایت میں ہے: "**بینهما أمور مشتبهات**" اور ترمذی وغیرہ کی روایت میں ہے: "**ما سکت عنه فهو عفو**"، تو چار چیزیں ہوگئیں تو اب چار چیزوں میں سے دو کے بارے میں حلال ہے خالص، حرام ہے خالص، اشتباہ والی چیز سے بچنا ہی بہتر ہے اور ماسکت عنہ جو ہے وہ اشتباہ والی نہیں ہے، لہٰذا وہ چوتھی چیز ہوگئی، جہاں تک مجھے یاد ہے یہ حضرت شیخ

کی ڈائری یا اس قسم کی کچھ چیزیں چھپی ہیں، اس میں ہے، بہر حال ہم لوگ اس موضوع سے فارغ ہوئے اور یہاں کے حضرات نے ضرورت محسوس کی، یہاں سوالات پیدا ہو رہے تھے، اتفاق سے مباحث فقہیہ میں بھی یہ موضوع زیر بحث آیا ہے اور تجاویز بھی پاس ہوئی ہیں، بات آجائے گی، ابھی مولانا عتیق صاحب نے بھی توجہ دلائی ہے اور ہے بھی یہی کہ ہمیں بہت سی تجاویز ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے لانی پڑتی ہے، بہت سے موضوعات پر صرف نظر بھی کر لینا پڑتا ہے، ممبئی میں اکیڈمی کا سمینار تھا، وقف کا موضوع تھا، مسجدوں سے متعلق بحث تھی، عرب حضرات کی ایک بڑی جماعت تھی جو تجویز کا ذہن بن رہا تھا، اس پر ان کو اشکال تھا، ان کے یہاں وسعتیں ہیں، بابری مسجد کا قضیہ پیش آچکا تھا، حضرت قاضی صاحبؒ نے ان کو پوری بات سمجھائی تو ان سب نے کہا کہ تب پھر آپ کی یہ تجویز ٹھیک ہے، ہم کو تجویز میں بھی لحاظ کرنا ہے اور الفاظ میں بھی، آپ جوش میں کہیں کہ سرکاری خزانہ کوئی چیز نہیں ہے، وہ سرکاری ملازمین کی جیب ہے، ایک تو تعجب کی بات ہے کہ اس طرح کی بات کوئی کہے، ایسا نہیں ہے، ایسا کیسے ہوسکتا ہے، پھر آپ حکومت کے ذمہ داروں تک پہنچ جائیں اپنی زبان میں تو یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، ہم یہاں بیٹھے ہیں جو کچھ باتیں کر رہے ہیں، کیا یہ سمجھتے ہیں کہ یہیں تک محدود ہے، اس سے آگے نہیں جارہی ہیں، ہوسکتا ہے کہ آپ کے کانپور پہنچنے سے پہلے آپ کی بات پہنچ جائے، یہ بھی تو سوچیے، یہ برملا کہنا ان چیزوں کی حوصلہ افزائی فتوی دیکر نہیں کی جاسکتی اور یہ بھی ہے کہ یہ چیزیں ہم برملا نہیں کہہ سکتے، آپ نجی مجلس میں کہہ لیجئے کہ پیسہ کہاں جاتا ہے، لیکن یہاں ایک اصول و ضابطہ ہے، کچھ بھی ہو حکومت اس کا اپنا نظام ہے، ہمیں ان چیزوں کا خیال رکھنا چاہئے، جوش میں اس حد تک نہیں جانا چاہئے۔

ابھی دار الحرب اور سود پر بحث ہوئی ہے بہر حال وہ تو ہمارے یہاں اس پر گفتگو بھی ہو چکی ہے، بڑی بحث ہوئی ہے اور اتفاق سے صحیح لکھا غلط لکھا، کیا لکھا، دار العلوم میں جب میں شعبۂ افتاء میں تھا تو حضرت مفتی صاحبؒ جو مشورے دیتے رہتے تھے، مشورہ دیا کہ سود سے متعلق پڑھ ڈالو، مطالعہ کر ڈالو، افتاء میں تو طالب علم لکھتا ہی لکھتا ہے اور میں پہلے سے لکھنے کا مریض تھا، تو وہ جو چیزیں پڑھی جمع بھی کی، اس میں دار الحرب کی بحث اچھی خاصی ہے اور دار الحرب میں سود کی بحث بھی اچھی خاصی ہے اور وہ تحریر بعد میں شائع بھی ہو چکی ہے، اکیڈمی کی طرف سے اور دوسری جگہوں سے حضرت قاضی صاحب کی نظر کے بعد، تو یہ دار الحرب اور سود کی بحث مفتی محمود نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتیؒ صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی، انہوں نے دیکھا، بات ابھی آگئی کہ نہ فقہ حنفی میں متفق علیہ مسئلہ ہے اور نہ ہمارے اکابر کے درمیان متفق علیہ مسئلہ ہے، بلکہ آراء بدلی ہیں، تفصیلات موجود ہیں امداد الفتاوی اور دوسری جگہوں میں، ایسا نہیں ہے کہ آزادی سے پہلے سود جائز تھا، اب سوال میں یہ لفظ کیسے آیا یہ الگ بات ہے، لیکن آزادی سے پہلے عام خیال رہا ہو، مثلاً ہمارے حلقہ کا یا عام علماء کا کہ ہندوستان دار الحرب ہے اور یہاں سود جائز ہے، یہ بات متفق علیہ نہیں تھی، نہ آزادی سے پہلے نہ آزادی کے بعد اور پھر یہ فتوی نہیں تھا، اور یہ بھی سوچنے کی

بات ہے کہ بسا اوقات بات آ جاتی ہے کہ دار الحرب ہے تو سود جائز ہے تو کیا دار الحرب کا ایک ہی حکم ہے سود کا جواز، دار الحرب میں قیام کا کیا حکم ہے پہلے یہ سوچو، پہلے یہ سوچئے کہ پہلے مسئلہ ہجرت کا ہے، ترک وطن کا ہے، وہ بھی تو مسئلہ ہے، اس کا نہیں تذکرہ کرتا ہے آدمی، صرف سود کا تذکرہ کرتا ہے، ہمارے یہاں ایک فرق ہے ہندوستان میں جس نے کافی فروغ دے رکھا ہے، لیکن سود کی شناعت عامۃ المسلمین کے ذہنوں میں اتنی ہے کہ خود ان کے حلقہ کے عوام ان کے اس فتوی کو قبول نہیں کرتے، ان کا فتوی ہے کہ تمام بینکوں سے یہاں سے وہاں سے سب جائز ہے، اور اس میں عجیب لطیفہ ہے کہ ہندوستان دار الاسلام ہے اور یہاں کے غیر مسلم ذمی ہیں، جی سر براہ اعلیٰ نے ہندوستان کو دار الاسلام کہا اور لکھا تو اب اس کی حفاظت بھی ضروری ہے اور اس کی بھی حفاظت ضروری ہے، لیکن سود کی شفاعت ایسی ہے، وعیدیں ایسی ہیں کہ اسی کے پیش نظر ہمارے اکابر یہ رخ نہیں اختیار کر سکے، آراء مل جائیں گے عام طور سے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے فتوی دیا ہے، شاہ عبد العزیز کے تو بہت سے فتاوی محل نظر رہے ہیں، لیکن ٹھیک ہے انہوں نے فتوی دیا اپنی جگہ، لیکن اب وہ حالات نہیں ہیں ان چیزوں کی، ظاہر بات ہے کہ گفتگو آتی ہے لوگ سوال بھی کرتے ہیں، جاننا بھی چاہتے ہیں، تو اب یہاں ہم بیٹھ کر کے، مذاکرہ کر کے ذہن بنا کر کے اس کے مطابق پوچھنے والے کو حسب موقع جواب دیدیں یہ اور بات ہے اور تجویز کی شکل میں لانا عمومی طور یہ اور بات ہے، پر بہت سی چیزوں کو تجویز میں لا کر شائع کرنا یہ مصلحت کے خلاف ہے، یہ لحاظ رکھنا ہوگا، بات ابھی آ گئی تھی تجویز کمیٹی بیٹھے گی سب ہوں گے، مجلس میں جو گفتگو ہوگی اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، ایک موضوع سے ہم لوگ فارغ ہو گئے، اللہ تعالیٰ بحسن وخوبی بقیہ مجالس اور موضوعات کو تکمیل تک پہنچائے اور معمول کے مطابق ہمارا یہ سیمنار کامیابی سے ہمکنار ہو۔ وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆